Price Rs. 2/-

Jan. 1982

(فرش پر بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں) ارتضیٰ کریم، اقبال واجد، جاوید حیات، انجم فاطمی، حسین الحق، احمد حسین آزاد، شجر مسکاروی
(کرسی پر بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں) معین شاہد، ادیب حسن ادیب، قیم الحق گیاوی، م ق خان، فرحت قادری، بدنام نظر، شاہد احمد شعیب
(کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں) محبوب علی قریشی، نثار احمد صدیقی، رحمن حمیدی، کلام حیدری، نواب حسن نواب، شکیل علائی، احسان تابش
خورشید حیات، عین تابش۔

دی کلچرل اکیڈمی، ریسٹ ہاؤس، جگ جیون زوڈ گیا
قائم شدہ ۱۹۹۲ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

ایک سال کے لئے ــــــــ چوبیس روپے
فی کاپی ــــــــ دو روپے
فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹر
نوشابہ حق

رفقاء ایڈیٹرز
شفق
عبدالصمد

شمس الرحمٰن فاروقی

علومِ بلاغت

بَلاغت کی کیفیت کلام میں کس طرح پیدا کی جائے، اس سوال کا جواب حاصل کرنے میں بعض علوم کار آمد ہیں۔
ان علوم کو عام طور پر علومِ بلاغت کہا جاتا ہے۔
ان میں سب سے پہلا علم "بیان" ہے۔ "بیان" کو موٹے طور پر DISCOURSE کہہ سکتے ہیں۔
لیکن "بیان" DISCOURSE سے بہت زیادہ بسیط اور عمیق علم ہے، کیوں کہ اس کی بنیاد منطق اور علم العلم EPISTEMOLOGY پر ہے۔ "بیان" کو کبھی کبھی RHETORIC بھی کہا گیا ہے۔ لیکن RHETORIC میں بیش تر عمل دخل صرف منطق کا ہوتا ہے۔ "بیان" کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اس میں ان طریقوں اور امکانات کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ ایک ہی معنی (یعنی ایک ہی اطلاع یا ایک ہی معلومات یا ایک ہی علم KNOWLEDGE کو کئی طرح ادا کر سکتے ہیں۔
دوسرا علم "بدیع" کا ہے۔ اس میں الفاظ کے معنوی اور صوری حسن اور ان طریقہ ہائے استعمال کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جن کے ذریعہ کلام کی معنوی یا ظاہری خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ کسی کلام میں ایک سے زیادہ معنی کس طرح پیدا ہوتے ہیں یا کسی ایک معنی کو مختلف پیرایوں میں کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف علم "بدیع" میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ معنی کی وہ خوبیاں جو بیان کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں، ان کے علاوہ اور کون سی خوبیاں ہیں اور کس طرح پیدا کی جائیں یا پرکھی جائیں؟ - ان کو "صنائعِ معنوی" کہتے ہیں۔ علم "بدیع" کا دوسرا پہلو کلام کی اُن خوبیوں کا مطالعہ کرتا ہے جو کلام میں معنوی اضافہ اس حد تک اضافہ نہیں کرتیں جس حد تک صنائعِ معنوی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ لیکن اُن کے ذریعہ الفاظ میں ایک جدت، بانکپن یا تازگی آجاتی ہے (جو، ظاہر ہے کہ اپنی جگہ پر ایک معنوی حسن پر بھی ہے) ان لفظی خوبیوں کو "صنائعِ لفظی" کہتے ہیں۔
"بدیع" کے تحت کلام میں لائے گئے تمام خواص کو عام زبان میں "صنائع اور بدائع" کہتے ہیں۔
بلاغت کا تیسرا علم "عروض" کہلاتا ہے۔ "عروض" وہ علم ہے جس میں زبان میں اصوات کی اور خاصیت کے اعتبار سے ان میں نمونوں یعنی PATTERNS کی تلاش و تعین کی جاتی ہے اور ان تمام نمونوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن میں "موسیقی" یا "موزونیت" ہوتی ہے۔ "عروض" ہمیں زبان کے آہنگ، شعر میں صوتی تنوع، پیچیدگی اور

شعری آہنگ کے نئے امکانات اور موجودہ نمونوں کی توجیہہ اور تفصیل بیان کرنا سکھاتا ہے۔ "عروض" اپنی جگہ انتہا مفصل اور باریک علم ہے کہ اسے بلاغت سے الگ بھی مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

بلاغت کا چوتھا علم "قافیہ" کہلاتا ہے۔ اس میں ان الفاظ کی آپس میں موسیقیاتی ہم آہنگی کا مطالعہ ہوتا ہے جو مصرعے کے آخر میں آتے ہیں اور تکرار صوت کے ذریعہ شعر میں حسن پیدا کرتے ہیں۔

بعض علماء نے تاریخ گوئی، معما، توارد، سرقہ کے تعین وغیرہ کو بھی علوم بلاغت میں قرار دیا ہے۔ لیکن اگر بلاغت کی صحیح تعریف ذہن میں رکھی جائے تو یہ معاملات، جن میں بعض کا تعلق ادب سے بہت دور کا ہے (یعنی تاریخ گوئی اور معما) اور بعض کا تعلق تحقیق سے ہے (توارد، سرقہ) بلاغت سے چنداں متعلق نہیں معلوم ہوتے۔

بسا اوقات طالب علموں کی آسانی کے لیے بعض اور چیزیں جن کا تعلق کلام کی PHENOMENOLOGY سے ہے، مطالعۂ بلاغت میں شامل کر لی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں اقسام کلام سے تعلق رکھتی ہیں، یعنی نثر کیا ہے، نظم کیا ہے اور نثر کے کتنے اقسام ہیں، نظم کے کتنے اقسام ہیں؟ چوں کہ اس مطالعہ میں مختلف اقسام کی خوبی یا خرابی سے بحث نہیں ہوتی، بلکہ ان کا صرف تفصیلی بیان ہوتا ہے، اسی لیے ان کا تعلق تنقید سے اتنا نہیں جتنا کلام کی PHENOMENOLOGY سے ہے۔

علم بیان کو "علم ادب" اور "علم کتابت" بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح علم بدیع کو "علم معنی" بھی کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں "ادب" کو "لٹریچر" کے معنی میں نہیں لیا جاتا تھا۔ (قدیم یونانی میں بھی "لٹریچر" کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔) لہٰذا جب ہم "زبان و ادب" کا فقرہ استعمال کریں تو ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ یہاں "ادب" سے دراصل "بیان" مراد ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جب ہم "معنی و بیان" کا فقرہ استعمال کرتے ہیں تو اس میں بھی "معنی" سے دراصل "بدیع" مراد ہوتی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے پرانے علوم کو اس قدر بھلا دیا ہے کہ ہم اپنی اکثر اصطلاحات کے اصل تصورات CONCEPT سے ہی بیگانہ ہو گئے ہیں۔

——

ممتاز احمد خاں (کراچی)

تین ناولوں کا مثلث

آدرش کی اسیری اور نشار عزیز بٹ

محترمہ نشار عزیز بٹ کا پہلا ناول "نگری نگری پھرا مسافر" آج سے تقریباً چھبیس[۲۶] سال پہلے یعنی ۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آیا ساتویں دہائی کے آغاز میں دوسرے ناول "نے چراغے نے گلے" نے اشاعت کی منزل طے کی۔ اور اب ۱۹۸۰ء کے اخیر میں انہوں نے "کاروان وجود" پیش کیا ہے۔ کسی بھی ناول نگار کے لئے یہ بات باعث فخر ہے کہ وہ تقریباً ایک ربع صدی کے دوران ذہنی فکری اور عملی طور سے تخلیق ناول کے عمل سے وابستہ رہے لیکن یہ حقیقت کافی افسوس ناک ہے کہ فکشن کے ناقدین نے نشار عزیز بٹ کو وہ مقام نہیں دیا جس کی کہ وہ مستحق تھیں۔ اس کی بہت سی وجوہات میں ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ناقدین کی تمام تر توجہ شاعری کی جانب مائل رہی۔ اور فکشن پر شاعری کی تنقید کا عشر عشیر بھی نہیں تحریر کیا گیا جس کی بنا پر فکشن کی تنقید خاص طور سے ناولوں پر اچھے تجزیاتی اور معروضی مضامین کی کمی کی وجہ سے اب تک نظر انداز شدہ شعبہ ادب ہے۔ جب کہ یورپ اور امریکہ میں فکشن کی تنقید کی ترقی و ترویج کے لئے مربوط کام ہوا۔ اور اب اس کو تنقید کے علیحدہ اہم شعبے یعنی کرکشن[۱] (CRITICISM + FICTION = CRICTION) کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔ ایک اور وجہ ناقدین کا وہ رویہ ہے جس کے تحت وہ مخصوص نظریات کی عینک لگا کر بعض اچھی تخلیقات کو رد کر دیتے ہیں۔ یا ان کے سلسلے میں انہیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔ اس رجحان پر برصغیر کی مشہور و معروف ادیبہ قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک مضمون "کچھ عزیز احمد کے بارے میں" کڑی تنقید کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے پرانے ادیبوں کو محض پریڈ پیس (PERIOD PIECE) سمجھ کر ایک سرپرستانہ رویئے کے ساتھ ادبی میوزیم میں داخل کر دینا صرف ہمارے یہاں ہوتا ہے۔ اور نزدیک آئے تو ایک۔ وہ بہت ذہین اور پڑھی لکھی خاتون

---

[۱] ہمیں ایسی کسی علمی اصطلاح کا علم نہیں ہے۔ شپلی کی کتاب "لٹریری ٹرمز" میں بھی ایسی کوئی اصطلاح نہیں۔ اگر کسی امریکی نے کہیں استعمال بھی کیا ہے تو اسے اعتبار حاصل نہیں اور یہ شاید سلینگ ہو تو ہو ادبی اصطلاح نہیں ——— ادارہ

نثار عزیز بٹ کا ناول "نگری نگری پھرا مسافر" آج سے سولہ سترہ سال قبل شائع ہوا تھا۔ وہ ایک قابل ذکر ناول تھا۔ اس کے بارے میں بھی سکوت طاری رہا۔ بہر صورت یہ فضا زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ زندگی سے کہانی بہت قریب ہے اور انسان کی جبلت میں چونکہ کہانی سے قربت اور الفت موجود ہے۔ اس لئے آنے والی نئی صورت حال میں نثار عزیز بٹ کے کنٹری بیوشن (CONTRIBUTION) کو نظر انداز کرنا ناممکن ہوگا۔

نثار کا پہلا ناول "نگری نگری پھرا مسافر" پاکستان کے فکشن کی دنیا میں ایک اہم ناول ہے۔ اسے ہم ایک کردار کا ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی ہیروئن افگار پورے پلاٹ پر چھائی ہوئی ہے۔ باقی کردار بھی اپنی اپنی جگہ اہم ہیں لیکن کہانی کی تخلیق کچھ اس طرز پر کی گئی ہے۔ کہ ہم ان کو افگار ہی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ افگار کا کردار بڑے سلیقے اور حسن سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ناول میں کوئی ایسا مرکزی کردار تخلیق کرنا جو بھرپور جاندار اور دائمی ہو ایک مشکل فن ہے۔ افگار ہمارے فکشن کے ان زندہ کرداروں میں سے ایک ہے جنہیں قاری بھلا نہیں سکتا۔

اس ناول کی کہانی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا مرکزی خیال آدرش کی اسیری کے تحت خود پرست کردار کی شخصیت کا تحفظ ہے پورے ناول میں کوئی مقام ایسا نہیں جہاں افگار نے زمانے حالات یا مضبوط سے مضبوط مدمقابل شخصیت کے آگے ہتھیار ڈالے ہوں۔ اس کی نفسیات کی پرت در پرت تہیں وہ طلسم ہے جو اس کی دکھ بھری زندگی میں جھانکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

افگار کی زندگی کا سفر دو محاذوں پر جاری و ساری دکھایا گیا ہے۔ داخلی محاذ پر وہ اپنے سے برسر پیکار ہے۔ اور خارجی محاذ پر بھی وہ کسی کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں۔ یہ وہ سفر ہے جو اس کی زندگی کے آخری سانس تک جاری رہے گا۔ یہاں سفر کوئی منزل نہیں تراشتا۔ بلکہ خود ہی منزل و مقصود بن جاتا ہے۔

افگار ــــ بچپن کی محرومیوں کا شکار ــــ وہ لڑکی ہے جسے تقدیر نے مایوس حالات کے بھنور میں لا پھینکا ہے قدرت نے اسے زبردست حساس ذہن عطا کیا ہے۔ وہ ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہے۔ مختلف قوتیں اس کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کے لئے اسے اپنے حصار میں لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن وہ موت کے تصور کا حوصلہ مندی کے ساتھ چیلنج سمجھ کر مقابلہ کرتی ہے۔ اس طرح شعوری طور پر وہ اپنی عمر سے آگے دوڑتی نظر آتی ہے۔ اور اپنی تمام تر محرومیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے اپنے لئے جو آدرش تخلیق کیا ہے۔ اسے پانے کے لئے وہ داخلی اور خارجی دنیاؤں میں مائل بہ سفر ہے گو کہ وہ دیگر کرداروں سے سماجی طور سے مربوط ہے۔ لیکن کسی طرح بھی ان کی انفرادی زندگیوں میں دخیل نہیں۔ البتہ دیگر تمام کردار اس پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ ایک ہی حیثیت میں ہر حصار سے باہر نکل جاتی ہے۔ جیسے کہ وہ کوئی بے قرار و بے چین روح ہو۔

افگار کے داخل کی دنیا تلاش اور کھوج کی کسک سے عبارت ہے۔ خارج میں افسردگی کا ماحول ہے۔ اور سینی ٹوریم اس سفر کی بڑی گذر گاہ ہے۔ جو اس کے دکھوں میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ سینی ٹوریم کا ماحول موت سے مقابلہ کرنے دیگر

کرداروں سے ربط ضبط اور ان کے المناک انجام کے تصور سے وہ لرز جاتی ہے۔ تاہم اسے اطمینان ہے کہ اس دکھ بھری دنیا میں وہ تنہا نہیں۔ بلکہ اس کے جلو میں دیگر لوگ بھی چل رہے ہیں۔ پھر اس کا آدرش بھی اسے موت کے کرب کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جہاں ایک بے بس و مجبور انسان فنا کی تمام قوتوں کے آگے خود ایک بڑی طاقت کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس کی مثال انگار کی اپنی سوچ ہے۔ کہ اس کی قبر کے گرد بھرے ہوں گے۔ صاف چمکیلی صبحوں کو ہوا کے جھونکوں سے شگوفوں کے درختوں میں سے چھم چھم سفید گلابی پنکھڑیاں اس کی قبر پہ گرا کریں گی۔ اور کائنات مسکراتی رہے گی۔

عام آدمی آدرش کے بغیر زندگی گذار دیتا ہے۔ لیکن ایک حساس شخص جو زندگی کے تمام محرکات کو اپنی ذات کی شکست و ریخت کے لئے برسرپیکار دیکھتا ہے۔ لاشعوری طور سے محرومی کے احساس کو کسی خواہش یا آدرش میں بدل دیتا ہے۔ جو اسے زندگی گذارنے کا وسیلہ مہیا کرتا ہے۔ انسانی کردار میں یہ وسیلہ ایک سہارا ہے۔ جس کا پودا احیاناً اصول کے بطن سے پھوٹتا ہے۔ عمرانی تقاضوں سے قطع نظر لڑکی کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ مخالف جنس میں ضم ہو جائے خود زندگی کا ارتقا اسی عمل میں پوشیدہ ہے۔ لیکن انگار اس قدر محتاط ہے کہ اس کا آدرش اسے تشکیک کی سرحدوں تک لے آیا ہے ــــ اور بجائے پیچھے ہٹنے کے وہ آگے بڑھتی جاتی ہے۔ یہ تشکیک اس کی عینیت پسند فطرت پر غالب آ جاتی ہے۔ اور ایک سوال اس کے احساس کو کچوکے لگاتا رہتا ہے "اگر وہ میرے معیار پر پورا نہ اترا تو کیا ہو گا۔؟" لیکن جواب اس کے پاس نہیں کیونکہ اس کی قوتِ فیصلہ تشکیک کے دھند میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ آدرش کی اسیری نے حال کو روگ اور مستقبل کا المیہ بنا دیا ہے۔ مگر یہ روگ اس کی شخصیت کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر سکتا البتہ استحکام بخش سکتا ہے۔

منصور اس کی پہلی چاہت ہے۔ وہ خاموشی سے اس کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس کا آدرش اسے روحانی مقام تک لے آیا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ محض روحانی راستوں کا مسافر ہے۔ وہ اس کے لئے دیوتا بن جاتا ہے۔ لیکن ایک دن اس کے خواب ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ وارفتگی کے عالم میں اس کی سانسوں کے قریب آ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ دونوں مخالف سمتوں میں کھو جاتے ہیں۔ اور ایک سوال اس کے دل کی پھانس بن جاتا ہے ــــ "کیا منصور کے دل میں روحانی قربت کے تصور کی جگہ محض جسمانی قربت کا تصور چھا گیا ہے"۔؟ اب چونکہ وہ فطری طور سے بے قرار روح ہے۔ اس لئے وہ چند قدم آگے بڑھتی ہے۔ اس سفر میں عرفان، عابد، اور نعیم ملتے ہیں۔ عرفان جذباتی ہے اور اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ٹی بی کا مریض ہے۔ اپنی چاہت کو اندیشوں اور وسوسوں پر فوقیت دیتا ہے۔ اس طرح عرفان آدرشی کردار انگار کے مقابلے میں ایک غیر آدرشی کردار ہے۔ جو اپنے طرزِ عمل سے انگار کو اس کی خود پسند دنیا سے نکالنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن ناکام ہو کر اپنی الگ دنیا بسا لیتا ہے۔ نعیم کے بارے میں وہ سوچتی ہے "یوں ہی سا ہے ایک تو مغرور لگتا ہے۔ خاموش رہتا ہے۔ یا غیر دلچسپ باتیں کرتا ہے" ــــ اس طرح وہ عابد کو بھی مسترد کر دیتی ہے۔ اور تنہائی میں خود کلامی کرتے ہوئے کہتی ہے:-

"جانے کیوں میں اس کے پاس بیٹھتی ہوں۔ تو بزرگ محسوس کرنے لگتی ہوں۔ اس طرح تو اس کی زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔ کتنے شوق سے وہ آسائش عام زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ جس میں موٹریں ہوں۔ فریجیڈیر ہوں ایرانی قالین ہوں اور کیا کیا؟ کیا کوئی بھی کوئی لڑکی اس کے لئے زیادہ آرائشی اور موزوں ثابت نہیں ہوگی؟ میں تو خواہ مخواہ اس کی قدریں گڈمڈ کردونگی اور نتیجتاً خود بھی گڈمڈ ہو جاؤں گی"۔

غرض یہ کہ اس کے کردار میں مفاہمت کا کوئی پہلو نہیں۔ زندگی کو جیسے کہ وہ ہے وہ قبول کرنے کو تیار نہیں۔ وہ قدروں اور زندگی کے تمام مروجہ اصولوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں وہ زمانے کی گرفت سے آزاد ہے۔ اس کے ارد گرد کے کردار اسے دنیاوی پابندیوں میں جکڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ سب کی خواہشات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ وہ اپنے سفر کو روک نہیں سکتی۔ البتہ جب وہ زیادہ نروس اور فرسٹریٹڈ ہو جاتی ہے۔ تو ماحول کے بدلنے کو ترجیح دیتی ہے۔ اور ملک چھوڑ جاتی ہے۔ جو کہ آدرشی ذات کی فراریت پسندی کا اشارہ ہے۔ ہو سکتا ہے اس فراریت میں اسے سکون کے لمحات میسر آنے کی امید ہو ویسے بھی وہ سکون، امن، اور پناہ کی زبردست خواہش رکھتی ہے۔ جو ازلی ہے۔ اسی لئے وہ ایک دن چیخ اٹھتی ہے، اے مالک مجھے بانسری کی طرح سیدھا اور سادہ بننے دے۔ کہ تو مجھ میں اپنی موسیقی جگا سکے" یہ خواہش بظاہر معصوم ہے۔ لیکن تصوف کی سطح پر یہ انسان کی اپنی ذات اور کائنات سے بلندتر ہو کر آپ کو دیکھنے کی ازلی خواہش کا اظہار ہے۔ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا کوئی انسان ماحول کے تمام تر جبر کے باوجود سماجی رشتوں اور تقاضوں کو ٹھکرا کر حیاتیاتی ضروریات کو کچل کر اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو حقیر سمجھ کر اپنے آدرش کو پا سکتا ہے؟ جب کہ ایمرسن EMERSON کا خیال ہے کہ زندگی میں قانون تلافی کا عمل جاری ہے۔ اور اس عمل کے تحت ہم دیکھتے ہیں کہ کسی شخصیت کی کمتری کے خلا کو دوسری شخصیت کی برتری پُر کر کے اسے کامیاب بناتی ہے۔ یا پھر یہ کہ انسان کے دکھوں، غموں اور بد نصیبیوں کی تلافی خود ہمارے مذہبی عقائد میں موجود ہے۔ دراصل انگارہ چٹان کی طرح مضبوط علینیت پسند کردار ہے جو مفاہمت کے بجائے آدرش کے ہاتھوں فنا ہونے میں اپنی بقا تلاش کرتی ہے۔ جسے ہم آدرش کی اسیری کا المیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

نثار کا دوسرا ناول "نئے چراغ نئے گلے" ساتویں دہائی کے اوائل میں منظر عام پر آیا۔ اس دوران کئی اور ناول مثلاً آبلہ پا، خدا کی بستی، اداس نسلیں، تلاش بہاراں، آگ کا دریا وغیرہ بھی چھپ چکے تھے۔ ناول کے سنجیدہ قارئین میں "نئے چراغ نئے گلے" بھی پسند کیا گیا۔ اس ناول کا کینوس "نگری نگری پھرا مسافر" کے مقابلے میں کافی وسیع ہے نثار نے اس میں برصغیر کے، تمام سیاسی، معاشرتی، تاریخی اور سماجی رجحانات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہاں کئی

کردار ہیں۔ اور کہانی کئی سطحوں پر پھیل گئی ہے۔ ہندوستان سے لے کر انگلستان تک۔

تحریک پاکستان اور انگریزوں سے نفرت کا پہلو حد بچ کے ناول "آگمن" کی طرح یہاں بھی موجود ہے۔ تاہم سیاسی و تاریخی حقائق کا بیانیہ انداز سے تذکرہ اور مورخ کی طرح اپنے ذاتی خیالات کو اس میں گڈ مڈ کر دینے کے عمل کو قاری شدت سے محسوس کرتا ہے لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اس عمل کو وہ اپنے شعور کی کوشش کا ذریعہ بھی سمجھتا ہے۔ کچھ ناقدین اسے فنی کمزوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاہم اس سے ناول کے مجموعی تاثر پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

نثار کے یہاں ہر کردار اپنے آدرش[۱۵] کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جمال افروز سیدھی سادھی سی لڑکی ہے اور اس کا آدرش اس کا شوہر ضیاء اللہ ہے جس کی خدمت کرنا اس کا اولین فرض ہے۔ ضیاء اللہ کا باپ پرانے خیالات کا حامل ہے۔ عبادت اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا احترام اس کا آدرش ہے۔ نثار نے یہاں انسانی زندگی کے مکمل پس منظر کی خاطر آدرش کی اسیری اور اس اسیری سے رہائی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے مثلاً دیوان چند کا لڑکا من موہن اسی اوتار کی شخصیت کا پرتو ہے۔ وہ لوتر بدست عنیمت پسند ہے۔ اور زندگی سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس اس کی بہن پدمنی اپنی سوچ کے دائرے سے باہر آ کر اپنے آدرش کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ اور اس عمل میں مذہب تبدیل کر کے ائی سی ایس افسر منیر سے شادی کر لیتی ہے۔

اس ناول میں آدرش بذات خود بڑا وسیع پس منظر رکھتا ہے۔ نثار نے ہندوستان میں بسنے والی دونوں بڑی قوموں یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کا مجموعی آدرش آزادی بتایا ہے۔ دوسری جانب من موہن کا آدرش اس کے لئے ساتھ کے منہ میں چھچھوندر والا معاملہ ہے۔ وہ جمال افروز کے سحر میں گرفتار ہے۔ مذہب ان دونوں کے راستوں میں حائل ہے۔ جمال افروز کی شادی کے بعد بھی وہ اس سحر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ آئیوی سے قربت کے باوجود وہ اسے نہیں بھولتا۔ غرض یہ کہ مایوسی اور کنفیوژن ہر آدرشی انسان کی طرح اس کی نفسیات کے اہم عناصر ہیں۔ اس پر پورے معاشرے اور قوم پر پڑنے والے حالات کا بھی اثر ہے۔ ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے غلامی کے آخری دور کے سیاسی و سماجی مصائب کا اسے شدت سے احساس ہے۔ پھر انگلستان میں حصول تعلیم کے دوران اپنے آقاؤں کے آزاد سماج کا مشاہدہ اس کی مایوسی میں گہرائی کا سبب بنتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ آئیوی سے قریب ہونے کے باوجود اس سے اسی قدر دور تھا۔ جس قدر انگریزوں سے ہندوستانی قوم دور تھی۔ بہرحال من موہن کا آدرش اسے نہیں مل سکتا اس لئے کہ وہ اوتار ہی کی طرح ایک بے چین و بے قرار روح ہے۔ جس کی شخصیت کا استوکام شاید آدرش کی اسیری ہی میں پایا جاتا ہے۔

---

[۱۵] کردار کو آدرش کے آئینے میں ڈپٹی نذیر احمد نے دیکھا اور دکھایا تھا۔ اور یہ کردار کا تخلیقی مرتبہ نہیں۔ آدرش کو کردار میں دکھانا بہتر بات ہے ـــــ ویسے آدرش خود ہی تخلیق کیلئے زہر ہے ـــــــــــ ادارہ

گیا۔

پدمنی نسائی کرداروں میں جمال افروز کے بعد اہم کردار ہے۔ اور وہ منوہر سے محبت کرتی ہے جو مہر جائی نکل جاتا ہے۔ نثار عزیز نے پدمنی کو روایتی سوچ میں تبدیلی اور آدرش کی اسیری سے رہائی کی علامت کے طور پہ پیش کیا ہے۔ جب منوہر نے اسے جذباتی صدمہ پہنچایا تو وہ ردعمل کے طور پہ اپنے ہندو سماج سے بغاوت پہ آمادہ ہو گئی۔ اور مذہب تبدیل کر کے منیر سے شادی رچالی۔ منیر ـــــ جس کا آدرش ہندوؤں پر حکمرانی ہے۔ اس کے معیار پہ پورا اترتا ہے۔

ناول کے آخری باب میں ان مسائل کا تفصیلی تذکرہ ہے جو آزادی سے متعلق ہیں۔ اس میں بے راہ روی فرقہ وارانہ فسادات عورتوں کا اغوا اور ڈکیتی کی وارداتوں کا تذکرہ ہے۔ اس کی سوچ نثار عزیز بٹ کے خیالات کی ترجمان ہے۔ خورشید بھی دیگر اہم کرداروں کی طرح آدرشی کردار ہے۔ اس کا آدرش مذہبی تعصبات، نسلی منافرتوں اور زبان و رنگ کے فرق سے آزاد انسانیت پرست معاشرہ ہے جو اسے کہیں نظر نہیں آتا۔ اسی لئے وہ کہتا ہے :۔

"انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے جب گرنے پر آئے تو گدھوں، سانپوں،
بچھوؤں، درندوں اور کیڑوں مکوڑوں سے نیچے جا گرتا ہے ـــــ اوپر
اٹھے تو پیغمبر، ولی، فلاسفر، مسیحا، فنکار اور معمار ہے۔ خدا اور راہرمن ـــــ"۔

پہلی مرتبہ وہ ان دو الفاظ کے تضاد کو اپنی روح کی گہرائیوں سے محسوس کرتا ہے۔ خورشید کی یہ سوچ نثار عزیز بٹ کے فلسفیانہ مزاج کو ظاہر کرتی ہے۔ گو کہ کہیں کہیں خورشید کی طویل گفتگو قاری کے مزاج پر بھاری بھی پڑتی ہے لیکن ہر اچھے ناول میں فلسفیانہ گفتگو ایک لازمی امر بھی ہے۔ اس کے ذریعہ خود قاری کے شعور اور سوچ دونوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور زندگی کے بارے میں ناول نگار کے ذاتی خیالات بھی آشکار ہوتے ہیں ٹالسٹائی کے ناول وار اینڈ پیس (WAR AND PEACE) اور دیگر بڑے ناولوں میں کوئی نہ کوئی ایسا کردار ضرور ملتا ہے۔ جو ناول نگار کے مشاہدات و تجربات کے فلسفیانہ پہلو کو واضح کرتا ہے۔

نثار کا تیسرا ناول "کاروان وجود" ایسے دور میں منظر عام پر آیا، جب کہ ایک عرصے سے ناولوں کی شدت سے کمی محسوس کی جارہی تھی۔ ویسے اسی دور میں دیگر ناولوں کی اشاعت بھی نیک شگون ہے۔ مثلاً انتظار حسین صاحب کا ناول "بستی" انیس ناگی کا ناول "دیوار کے پیچھے" اور بیگم حجاب امتیاز علی تاج کا "پاگل خانہ" جو اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے ادیبوں نے ناول کی جانب توجہ دینا شروع کر دی ہے اور ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں اٹھتوں عشرہ ناولوں کا عشرہ قرار دیا جائے۔

نثار کے تیسرے ناول "کاروان وجود" کا کینوس بہت محدود ہے بلکہ یہ ناول ان کے "نگری نگری پھرا مسافر" کی جانب مراجعت کے سفر کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک طرف اس میں وہ کردار ہیں۔ جو "نے چراغے نہ گلے" کے آخر میں میری لشنگ

کے طور سے ابھرے تھے۔ یعنی سارہ اور سراج۔ یوں اس طرح یہ ناول "نئے چراغ سنے گلے" کی ایک قسم کی منطقی توسیع ہے۔ اور دوسری طرف ثمر صالح کا کردار "نگری نگری پھرا مسافر" کی افرگا کی دوسری شکل ہے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ افگار عینیت پسند اور خود پرست ہے۔ اور اپنے ہی آئینے میں اپنی شخصیت کے خدوخال سنوارتی ہے۔ جب ثمر صالح اس کے برعکس اپنے آپ کو کائنات کے مقابلے پر رکھ کر سوچوں کے الاؤ میں جلتی رہتی ہے۔ وہ خوف زدگی کا شکار ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ کہیں کہیں وہ وجودی دکھائی دینے لگتی ہے۔ جیسے اپنے ہونے کے عذاب کا گلہ کر رہی ہو۔ کبھی وہ سوچتی ہے کہ وہ اپنی روح کے دائرے میں سفر کر رہی ہے اور یہ دائرہ اس کا جسم ہے۔ اور ان دونوں میں کوئی رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ خود کہتی ہے کہ وہ کیسے کسی کو بتائے کہ وہ ایک روح محض ہے۔ اور اپنے جسم سے اس کا ناطہ نہیں جڑا۔ چنانچہ اس کا کوئی مخصوص جسم کوئی مخصوص وجود نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اس گھر کے باسیوں کی زندگیوں کے کنارے سے چپکی اپنے لئے کوئی ہیئت کوئی خاکہ حاصل کر رہی ہے۔ اس طرح کائنات اور اپنے ہی جیسے دیگر لوگوں کے مقابلے میں اس میں اپنے نامکمل ہونے کا احساس پایا جاتا ہے۔ اور یہی احساس اسے دوسروں سے مکمل طور سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ بالکل افگار کی طرح جس کا ایک اعلیٰ آدرش واضح ہے۔ لیکن قاری ثمر صالح کے آدرش کی تفہیم نہیں کر پاتا۔ اس کے نزدیک وہ ایک ہیولہ سا ہے ایک نامکمل تصویر کا احساس جو نقطے نقطے جوڑ کر بنائی گئی ہو۔ ثمر صالح خود اس تصویر کا نامکمل ادراک رکھتی ہے۔ لیکن اسے بیان نہیں کر پاتی۔ اس کے ارد گرد بجھا بجھا سا ماحول ہے۔ غالباً یہ ماحول نثار عزیز بٹ نے ثمر صالح کے گھٹے جذبات اور مالوسانہ احساسات کی خارجی تصویر کے طور سے پیش کیا ہے حالانکہ سارہ کے بھی اس کے مدمقابل ہے جو "نئے چراغ سنے گلے" کی پدمنی کا عکس ہے وہ ثمر صالح کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی ہے۔ تاکہ اسے یہ احساس دلائے کہ وہ اوروں ہی کی طرح ایک ایسی شخصیت ہے جسے وجود کی اندھی سرنگ سے باہر نکل کر روشنی حاصل کرنا ہوگی۔ اسی لئے وہ بار بار ڈیں بھی بدلے ہوئے ماحول میں اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن ثمر صالح اسے جھاڑ دیتی ہے کیوں کہ اسے اپنی انا کے مجروح ہونے کا احساس ہے۔

> "تم جیسے دوست پر میں دشمن کو ترجیح دیتی ہوں۔ تم باز کی سی نظروں سے
> مجھے تاڑتی رہتی ہو کیا تم سمجھتی ہو مجھے اس نگرانی کا احساس نہیں جو میرے
> مفادات کے سلسلے میں تم اپنے ذمے لئے ہوئے ہو۔"

ثمر کو لوگوں سے دور رہنے کے باوجود ایسا لگتا ہے جیسے وہ محبت کی متلاشی ہے ایک سہارے کی جو اس کی ذات کو مکمل کر دے۔ جو اسے ابدی سکون عطا کر دے۔ لیکن اس کا یہ ہیولہ نما آدرش اس قدر اونچائی پر فائز ہے کہ انسان کی نظریں اس تک نہیں پہنچ پاتیں۔ پر ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے جب وہ اپنی بے قراری اور تنہائی کے کرب کی شدت سے مغلوب ہو کر اندھیرے میں چھلانگ لگا دیتی ہے لیکن محبت کا پہلو یہاں بھی مفقود ہے۔ نثار عزیز نے ناول

کے آخری حصے میں خود بنایا ہے کہ محبت سے مغلوب ہو کر سرنگوں ہونے کی روایت تو دنیا میں ہمیشہ سے موجود ہے لیکن ثمر محبت سے نہیں نفرت سے مغلوب ہو گئی۔ دنیا سے، انسانوں سے، حیوانات و نباتات سے اس کا نرم و نازک رشتہ اور کائنات سے اس کا گہرا رابطہ جب وقت اور تجربے کے ہاتھوں مجروح ہوا تو اس کی ہستی پوری کی پوری ایک عظیم الشان شکست اور ایک زبردست نفرت سے دوچار ہو گئی۔ اور پھر اس نے اپنی ہی قریبی سہیلی سارہ کے شوہر رضا سے خفیہ طریقے سے شادی کر لی۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ جب بھی کہے گی وہ اس سے علیحدہ ہو جائے گا۔

ثمر صالح کی یہ تبدیلی ناول کے ایسے حصے میں وقوع پذیر ہوتی ہے کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب اصل کہانی شروع ہوگی۔ کیونکہ ناول میں کلائمکس کا یہی نقطہ تھا۔ اور ہر ناول میں کلائمکس بار بار آ کر لوٹتا ہے یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ لیکن کاروان وجود میں سیدھی سیدھی کہانی لکیر کی طرف بڑھتی آتی ہے۔ اس کا پلاٹ خمدار اور پُر پیچ نہیں۔ بہر صورت یہ شادی لمحہ بھر کی شادی کی طرح ہے۔ ثمر کو اس فیصلے پر پچھتاوا ہے۔ وہ چند دنوں کے لئے سوچتی ہے۔ اور پھر اچانک رضا سے کہے بغیر وہ ایک غیر ملک کے لئے روانہ ہو جاتی ہے۔ یہ صورت حال افگار کی طرح اس کی فراریت پسندی کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک ماحول سے گھبرا کر دوسرے ماحول میں چلے جانا آدرشی مسافروں کا خاص طرز عمل ہوتا ہے۔ ثمر صالح بھی ایسا کرتی ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کے مدمقابل سارہ کے کردار کو نثار نے اچھے طریقے سے ابھارا ہے۔ اور تینوں ناولوں میں آدرش کے سلسلے میں انہوں نے بین السطور جس نقطہ نظر کو واضح کیا ہے اس کا دائرہ سارہ کے خیالات پر آ کر تکمیل حاصل کر لیتا ہے۔ آدرش کی اسیری اور زندگی سے مفاہمت کے درمیان ایک ازلی کشمکش پائی جاتی ہے۔ نثار عزیز بٹ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے حقائق کا منفی تاثر قبول کرنے کے بجائے زندگی کی گہرائی کا شعور حاصل کر کے اس گہرائی سے ایک آفاقی حقیقت (UNIVERSAL TRUTH) دریافت کی ہے۔ خاص طور سے بیسویں صدی کے سائنسی عہد کی دکھی اور ان دیکھی بے رحمانہ قوتوں کے جبر میں مبتلا فرد کی بے بسی، عالمگیر تنہائی، بے معنویت اور داخلی انتشار کی کیفیات کے مدنظر ہوتے ہوئے بھی نثار نے بیرونی ناول نگاروں کے زندگی کے بارے میں منفی نقطہ نگاہ سے قطع نظر زندگی کے رجائی پہلو پر زور دے کر اپنے دانشورانہ وژن (INTELLECTUAL VISION) کا ثبوت دیا ہے۔ جو سارہ کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے:۔

> "بلاشبہ شیطان بہت طاقتور ہو گیا ہے۔ شر کی قوتیں خیر کی قوتوں پر حاوی ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ لیکن تہہ میں انصاف کی تلاش جاری ہے۔ تو پھر کیا معلوم جیت خیر کی قوتوں کی ہو۔"

بیسویں صدی ——— میری صدی ——— میں اپنے آپ سے اپنے ستاروں سے، اپنے ہم جنسوں سے، اپنی صدی سے نفرت نہیں کروں گی۔ مجھے خود تعارفی

سے نفرت ہے۔ کہ ایک خاص حد سے گزر کر خود نفرتی تخلیق کش ہو جاتی ہے۔

عزیز نثار کے یہاں آدرش کی اسیری ایک اہم تھیم ہے جس کے تجزیئے کو انہوں نے تین ناولوں کے مشترک کینوس پر کامیابی سے پھیلا دیا ہے۔ جس کی زد میں گذشتہ کئی دہائیوں کا پرآشوب سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تاریخی ماحول فرد کی نفسیاتی تحلیل اور اس کے نازک خیالات و احساسات لمحہ بہ لمحہ بدلتی زندگی و قدریں سبھی کچھ آگیا ہے تاہم ناول بھی ایک سمندر ہے۔ جہاں موضوعات کے پھیلاؤ کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ نثار عزیز بٹ ابھی تک اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور امکانات کے ساتھ فکشن کے پل صراط پر رواں ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ کب اس پل صراط کو عبور کرتی ہیں۔

طارق سعید کے مقالے مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۱ء میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں ہم معذرت کے ساتھ یہ تصحیح نامہ شائع کر رہے ہیں۔ ——— ادارہ

تصحیح نامہ

نمبر شمار	سطر	صفحہ	غلط	صحیح
۱	۶	۶	حرف	صرف
۲	۱۱	۱۲	سر	نیز
۳	۲۰	۱۷	بے کار تبصرہ	بے باک تبصرہ
۴	۱۰	۱۸	آگ کا دریا خالق	آگ کا دریا کا خالق
۵	۲۸	۱۹	اس بھی	اس لئے بھی
۶	۲۷	۲۰	وہ خدا اس کے بل	وہ خدا کے بعد
۷	۱	۲۰	آدھی سطر کی کتابت ہی نہیں ہو سکی۔	

غلام حسین ملک (کراچی)

مختصر افسانہ اور نظریئے کی پیخ

مختصر افسانہ ایک فن ہے۔ اور نظریہ اس کی پیخ!

لیکن تسمہ سے پیر تحد تو افسانے کی بات تو بعد میں آتی ہے پہلے تو اس بات پر غور اور بحث کی ضرورت ہے کیا کسی خوبیانہ لطیفہ کا مقصد نظریئے کا اظہار ہوتا ہے۔ اور کیا یہ دونوں یعنی فن اور نظریہ لازم و ملزوم ہیں؟

موجودہ دنیا میں تقریباً ہر جگہ اور ہر زبان میں جہاں کچھ ایسے فنکار نظر آئیں گے جنہوں نے اپنی نظریاتی بنیاد پر کام کیا ہے وہاں بے شمار ایسے فنکار بھی دکھائی دیں گے جن کے ہاں کسی نظریہ کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں ہے۔ بظاہر اس سے معاملہ الجھا نظر آتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو کم سے کم یہ بات تو ثابت ہو ہی جاتی ہے کہ نظریہ فن کی سرشت میں شامل نہیں ہے۔ اور یہ فن سے الگ ایک چیز ہے۔ ورنہ دوسری قسم کے فنکاروں کا سرے سے کہیں وجود نہ ہوتا۔

نظریہ کوئی بھی ہو اور کیسا بھی ہو مگر ہر نظریہ ساز یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے زندگی کی مکمل تشریح و تعبیر کر دی۔ مگر زندگی زبان حال سے ہر ایسے دعوے کو پیہم جھٹلاتی اور باطل قرار دیتی رہتی ہے کیونکہ زندگی تو بتوں کی مانند بلکہ ان سے بھی زیادہ بہت سے ایسے شیوؤں اداؤں خالق واہن ہے جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ زندگی کی بوقلمونی اور بے کرانی کسی فارمولے میں قید نہیں ہو سکتی۔ ہر جامہ اس پر تنگ نظر آتا ہے۔

اب آیئے مختصر افسانے کی طرف۔ مختصر افسانہ ادب کی ایک صنف ہونے کے باوجود اپنی ماہیت اور تقاضے کے اعتبار سے دیگر اصناف سے مختلف ہے۔ اس میں فنی طور پر جتنی بھی تبدیلیاں رونما ہو جائیں لیکن اس کی اس بنیادی صفت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ کہ یہ زندگی کا صرف ایک رُخ پیش کرتا ہے اسی لئے افسانہ افسانہ نگار کو زندگی کے ہر گوشے ہر رنگ کا عکاسی پر آمادہ اور قادر ہونا چاہئے۔ نظریئے کی عینک سے ایک طرف جہاں وہ کلر بلائنڈ ہو جاتا ہے وہاں دوسری طرف وہ یکسانیت کا بھی شکار ہوتا ہے۔ افسانہ اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس میں انسان کے ان اعمال اور زندگی کے ان مظاہر کا بھی احاطہ کیا جائے۔ جو اپنی تفسیر یا جواز آپ ہی ہیں۔ ایک خدا پرست شخص کی خدا پرستی کے علاوہ اس کی زندگی میں

آنے والے لمحۂ کفر کو بھی موضوع بنایا جائے۔ ظالم کی زندگی کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی جائے جس میں مظلوم نظر آتا ہے سرمایہ دار کی مزدور دشمنی کے ساتھ مزدور کی مزدور دشمنی کو بھی بے نقاب کیا جائے۔ گویا افسانے کی صنف اپنی نوعیت کے لحاظ سے جزو کو پیش کرتی ہے۔ اور ضروری نہیں کہ جزو ہمیشہ کل سے مطابقت ہی رکھتا ہو۔

نظریہ سازی اور نظریہ بازی رواں صدی کی دین ہے مگر ہمارے ادب میں اس کا غلغلہ بعض وجوہ کی بنا پر چوتھی دہائی میں بلند ہوا ——— مگر پھر بہت جلد ہی اس کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

اردو افسانے کی تاریخ میں ہم نے دیکھا کہ منٹو، بیدی، اور غلام عباس کو ابتدا میں خاطر خواہ اہمیت نہیں دی گئی۔ جس کا سبب ان کا نظریے کی بجائے اپنی نظر پر اصرار تھا۔ گرد ذرا بیٹھی تو یہی لوگ جو نظریہ پسندوں کی نظر میں معتوب تھے اردو افسانے کے بلند ترین مینار قرار پائے۔ پریم چند اور کرشن چندر کی تمام خوبیوں کے باوجود جس چیز نے انہیں نقصان پہونچایا وہ یہی نظریہ بازی تھی۔ اگر یہ اپنے نظریے پر اس قدر اصرار نہ کرتے تو یقیناً ان کا فن زیادہ بلند اور وسیع ہوتا۔ اب بھی دراصل ان کی عظمت کا دارومدار بیشتر ایسی کہانیوں پر ہے۔ جن میں انہوں نے اپنے نظریات کو یا تو بھلا دیا ہے یا انہیں پس پشت ڈال دیا ہے۔

آج کل ہر طرف کومٹ منٹ کی اصطلاح سننے میں آ رہی ہے جس کو دیکھو نئے لکھنے والوں پہ الزام لگا رہا ہے کہ ان کی کوئی کومٹ منٹ نہیں ہے۔ ہائے واویلا کر رہا ہے۔ کہ دیکھو یہ کیسے ادیب و شاعر ہیں۔ جو کومٹ منٹ سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ کومٹ منٹ بھی دراصل نظریے کا شاخسانہ ہے ہوا یہ کہ نظریے کی اصطلاح جب ادب کے بازار میں پٹ گئی تو ایک ذرا نرم اور نئی اصطلاح کے ذریعہ حصول مقصد کی کوشش از سر نو شروع کر دی گئی۔

نئی نسل کے لوگ جب اپنے نان کومٹیڈ ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سیاسی نظریے یا جماعت سے وابستہ نہیں ہیں۔ نئی نسل نے یہ موقف تاریخ کے مطالعے اور تلخ تجربات کی روشنی میں اختیار کیا ہے۔

کومٹ منٹ کا واسطہ دینے والوں کا یہ کہنا کہ کومٹ منٹ کا اطلاق صرف سیاست پر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر بات پر ہوتا ہے۔ کج فہمی کی دلیل ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ایک مثال پر غور کیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض مساوات کے قائل ہیں۔ جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اقتصادی مساوات چاہتے ہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمام انسانوں کو ہر معاملے میں مساوی سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کیا وہ شاعری میں بھی مساوات کے اصول کے تحت غالب اور داغ کو ایک ہی صف کا شاعر قرار دیں گے۔؟ ظاہر ہے کہ ایسا ممکن نہیں۔ مساوات کا تصور منیق کے ہاں ایک خاص شعبے تک محدود ہے۔ اسی طرح کومٹ منٹ کا مفہوم بھی محدود ہے۔ بغیر سوچے سمجھے ہر جگہ اس کا استعمال اور مطالبہ کوئی دانشمندانہ بات نہیں۔

اسی ضمن میں سیاسی شعور کا سوال اٹھانے والے حضرات کو بھی یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ کہ سیاسی شعور اور

چیز ہے اور سیاسی وابستگی اور چیز۔ اور نئے ادیبوں نے سیاسی شعور ہی کی بنا پر اپنا ذہن کسی سیاسی نظریے یا جماعت کے پاس گیروی رکھنے سے انکار کیا ہے۔

یہاں تک تو گفتگو اصولی بنیاد پر ہو رہی تھی۔ اب آیئے دیکھیں کہ مختصر افسانے اور نظریے کے تعلق سے ہمارے افسانہ نگار کیا کہتے ہیں۔ سب سے پہلے انتظار حسین کو لیجئے فرماتے ہیں:۔

"حاصل کی پیداکرنے والے کہتے ہیں کہ صرف وہ عمل بامعنی ہے جس کا کچھ حاصل ہو۔ اور کہانی کا کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ لیکن میں اپنی بکھری ہوئی مٹی کا اسیر ہوں۔ مجھے اس سے مفر نہیں ہے۔"
(دملیب۔ شہر افسوس)

جوگندر پال اعلان کرتے ہیں کہ:۔

"میرے ان گنت نظریات ہیں۔ تاہم میرا ادبی نظریہ ایک بھی نہیں۔ ادبی نظریوں سے ادیب تعصبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی زندہ افسانے میں نظریئے افسانہ نگار کے نہیں۔ اس کے کرداروں کے ہوتے ہیں۔"
(پیش لفظ۔ رسائی)

محمد منشا یاد کا خیال ہے کہ:۔

"ادب کتابوں کا مطالعہ، علم اور مشق سے بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اور لکھا جا رہا ہے لیکن تخلیقی ادب کے لئے ضروری ہے کہ وہ براہ راست زندگی کی کتاب کے مطالعہ کے نتیجہ میں پیدا ہو۔ ایسے مخصوص نظریات کے گملوں کی بجائے زمین پر آزادانہ نشو ونما کا موقع ملے۔ اور اس کی دیکھ بھال تراش خراش میں خون جگر شامل ہو"
(کچھ باتیں۔ بند مٹھی میں جگنو)

تقی حسین خسرو کہتے ہیں کہ:۔

اب یہ کہنا شاید ضروری نہیں کہ میں نے افسانہ نگاری کسی تحریک سے متاثر ہو کر یا محض بطور فیشن اختیار نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں منصوبہ بندی کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اور یہی 'کوندے' کی وجہ تسمیہ بھی ہے۔
(حرف آغاز۔ کوندے)

اس طرح کے بے شمار اقتباسات اور بھی دئے جا سکتے ہیں۔ لیکن طوالت کے خوف سے اس سلسلے کو یہیں ختم کر دیتا ہوں۔

اب ایک فطری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فن افسانہ کے عاملین جب نظریئے کے قائل نہیں ہیں۔ تو پھر وہ کون لوگ ہیں جو اس پر اصرار کرتے ہیں؟ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ بیشتر صورتوں میں وہ یہ نیم ادیب، صحافی اور سیاسی کارکن ہوتے ہیں۔ جو تخلیق کی نئی نوعیت اور جمالیاتی قدروں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ اور اپنی گھسی پٹی سطحی باتوں میں زندہ

اور وزن پیدا کرنے کے لئے مستقل نظریہ نظریہ کی ہانک لگاتے رہتے ہیں ۔
کبھی کبھی یہ لوگ اپنا اصل مدعا پوشیدہ رکھکر بڑی دردمندی بلکہ رقت کے ساتھ زندگی اور معاشرے
دہائی دینے لگتے ہیں یہ لوگ کہتے ہیں کہ ادیب یا افسانہ نگار کو معاشرے کا ایک باشعور فرد ہونے کے ناطے یہ چاہئے
وہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرے ۔ انسانوں کے درمیان عدل و مساوات اور اخوت کو فروغ دے وغیرہ وغیرہ ۔ یہ بات
پیش پاافتادہ ہونے کے باوجود بہت صحیح ہیں لیکن کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ ادیبوں کے علاوہ بقیہ تمام لوگ ظا
کے حق میں ہیں ۔ یا وہ بے عدلی، عدم مساوات، اور انسانوں کے درمیان عداوت کے پیرو ہوتے ہیں ۔ یا ہوتے
ہیں ۔ ؟

بات یہ ہے کہ ادیب کیلئے جو صفات ضروری قرار دی جاتی ہیں وہ اصل میں ہر انسان ہر صحیح الدماغ اور باشعور اد
کے لئے لازمی ہیں ۔ اس کے لئے ادیب یا افسانہ نگار ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے ۔ افسانہ نگار بھی معاشرے کا فرد ہونے
کی حیثیت میں دوسرے لوگوں کی طرح حق کا پرستار، ظلم کا مخالف، اور امن کا خواہاں ہوتا ہے ۔ افسانہ نگار ہو
کے ناطے اس پر کوئی اضافی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ۔

افسر آذر نے لکھا ہے کہ :۔

" مجھے ظلم کی ہر شکل سے نفرت ہے ۔ خواہ وہ انفرادی سطح پہ ہو یا اجتماعی سطح پہ
قومی سطح پہ ہو یا عالمی سطح پہ ۔" (شرکائیں ۔ اجلا انسان میلی روحیں)

بلاشبہ ان الفاظ کے ذریعہ افسر آذر نے ایک باشعور فرد ہونے کا ثبوت دیا ہے ۔ لیکن کیا وہ لوگ جو نظریہ
اہمیت کے قائل ہیں اس کی بنا پر اسے نظریاتی فنکار ماننے پر تیار ہوں گے ۔؟ —— ہرگز نہیں ۔ اس لئے کہ نظریے
مراد وہ ہمیشہ سیاسی نظریہ لیتے ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ افسر نے "شرکائیں" میں کسی سیاسی نظریئے کا نہیں اپنے ضمیر کا اظہار کر
کیونکہ —— " کالن ولسن نے آرٹ سائنڈر میں فنکاروں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ خود کو کسی سے وابستہ نہ کریں
اپنے ضمیر کے " (جدیدیت کی فلسفیانہ اساس —— شمیم حنفی)

اور ضمیر دنیا کی ہر شئے سے اعلیٰ وارفع ہوتا ہے
وہ ضمیر ہی کیا جو کسی نظریئے کا اسیر ہو ؟

قیدی

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

خط لکھتے لکھتے اچانک عارف چونک اٹھا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کبوتر اس کے بغل میں پھڑپھڑا رہا ہو اور اس کے نرم گداز لمس سے اس کے سارے جسم میں ہلکی ہلکی گدگدی ہو رہی ہو۔

عارف نے مڑ کر اپنے دائیں طرف دیکھا اور جیسے کبوتر پھر سے اڑ گیا۔

اس کے دائیں طرف زرینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا صرف چند انچ پرے کھاٹ کے کنارے بیٹھی ہوئی بڑے انہماک سے اس کی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

زرینہ چند برسوں تک گاؤں کے مدرسہ میں زیر تعلیم رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا وہ حروف پہچانتی تھی اور ہجے کر کے جملے پڑھ سکتی تھی

عارف کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا وہاں تو کوئی کبوتر نہیں تھا!

اس نے ایک نظر مہرن کی طرف دیکھا وہ بڑے اطمینان سے پلنگ پر بیٹھی ہوئی عارف کے ہاں کہنے کی منتظر تھی۔

عارف جب خط لکھنے بیٹھا اور مہرن ایک ہی سانس میں بہت ساری باتیں کہہ گئی تو عارف نے اسے روک دیا تھا۔

تم اس طرح بولتی جاؤ گی تو میرے لئے لکھنا مشکل ہو جائے گا۔

پھر مہرن خاموش ہو گئی تو عارف نے کہا ــــــ

تم پہلے ایک جملہ بولو گی اور میں لکھنے کے بعد جب ہاں کہوں تو دوسرا جملہ بولو گی۔ اس طرح مجھے لکھنے میں آسانی ہوگی

اس کے بعد مہرن عارف کے سمجھائے ہوئے طریقہ پر ایک ایک جملہ بولتی جا رہی تھی اور عارف لکھتا جا رہا تھا اور ہاں ہاں کرتا جا رہا تھا خط شروع کرتے وقت مہرن نے میرے پیارے کے القاب بتائے۔ اور عارف نے لکھنے کے بعد ہاں کہا تو مہرن نے دوسرے جملے میں تم اتنے سنگدل کیوں ہو؟ کہا تو عارف لکھتے لکھتے رک گیا۔

تم نے میرے پیارے کے بعد نام تو بتایا ہی نہیں

کیسا نام؟ مہرن نے حیرت سے پوچھا؟

جس کو تم خط لکھوا رہی ہو اس کا نام

مہرن مسکرا دی۔ نام لکھنے کی ضرورت نہیں اتنا ہی کافی ہے وہ خود سمجھ لے گا۔

یہ خود سمجھ لینے والی بات عارف کی سمجھ میں نہ آئی

پھر بھی اس نے اصرار نہیں کیا۔ اور دھرن جو کچھ بتاتی گئی وہ
لکھتا گیا۔

جب عارف کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تو اس نے اپنے
ذہن سے پھڑپھڑاتے ہوئے کبوتر کے خیال کو جھٹک کر دھرن
سے پوچھا ـــ ہاں اس کے آگے کہو۔ کیا لکھوانا ہے ؟

دھرن گڑبڑا گئی مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ اس کے بعد
کیا لکھوانا ہے۔ ذرا مجھے پڑھ کر سناؤ نا چھوٹے میاں کے
آخر میں تم نے کیا لکھا ہے۔؟

عارف کو یہ بات ہمیشہ ناگوار گزرتی تھی کہ ایک بار
تو وہ ساری باتیں تحریر میں لائے۔ اور دوسری بار اسے
پڑھ کر بھی سنائے۔ یہ تو بے یقینی والی بات ہوئی جیسے
خط لکھوانے والے کو یقین نہ ہو کہ اس نے جو کچھ بتایا ہے وہ
ضبط تحریر میں آیا ہے یا نہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی یقین نہ
ہو تو مت لکھواؤ۔ یہ بھی تو نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے سے
لکھوالیں۔ خط لکھنے سے پہلے تو ہزاروں منتیں اور خوشامدیں
کی جاتیں۔ اور جب خط لکھ دو تو پڑھ کر بھی سناؤ یہ تو بڑی
تکلیف دہ بات ہوئی

اس کے علاوہ عارف کو دوسروں کے خطوط لکھنے
میں بھی بڑی الجھن ہوتی تھی۔ اور وہ بڑی بےزاری سی
محسوس کرتا تھا۔ وہ بھی سیدھا سادا خط ہو تو کوئی بات نہیں
وہ تو پوری پوری داستان ہوتی گلے شکوے ہوتے۔ خیر
نامے ہوتے۔ تعریفیں اور خوشامدیں ہوتیں۔ کس کے یہاں
بچہ پیدا ہوا کس کی بیوی حاملہ ہوئی۔ کس کی شادی ہوئی کس
کی منسوب لگی۔ کون بیمار ہوا۔ کون مر گیا۔ کس ڈاکٹر کا علاج ہوا
علاج پر کتنے روپے خرچ ہوئے کس کی بیوی اپنے آشنا
کے ساتھ بھاگ گئی۔ کس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ اور
اس کے بعد سلام و دعا کی ایک طویل فہرست ہوتی۔

اتنی ساری باتیں وہ لکھتے لکھتے پریشان ہوجاتا۔

اس پر ستم یہ کہ خط لکھوانے والی عورتوں کا تانتا بندھا
رہتا۔ جس کو دیکھو وہی منہ اٹھائے خط لکھوانے چلی آرہی
ہے۔ انکار کرنے پر خوشامدیں کرنے لگتیں ـــ تمہاری
طرح کوئی خط نہیں لکھتا چھوٹے بابو۔ پتہ بھی غلط لکھ دیتا
ہے کہ خط پہونچتا ہی نہیں۔ اگر پہونچ گیا تو پڑھا نہیں جاتا۔
تمہیں ہزاروں سال کی عمر ملے چھوٹے بابو۔ دودھوں نہاؤ
پوتوں پھلو، زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ملے۔ اس نیکی
کے بدلے خدا تمہیں علم سے مالا مال کرے۔ بڑے افسر بن کر حکومت
کرو ـــ عارف کے لئے ان عورتوں سے پیچھا چھڑانا
مشکل ہوجاتا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ ان عورتوں کی باتیں سمجھنے
سے قاصر رہتا۔ اور ایسے موقعہ پر اسے بڑی ذہنی کوفت ہوتی
ایک بار ایک عورت نے جب عارف سے کہا کہ
اب اس کے آگے لکھو ـــ آپ کے گھر میں پاؤں
بھاری ہے۔ دو تین ماہ بعد ہی خرچ بڑھ جائے گا۔ ابھی
سے خیال کیجئے گا ـــ تو وہ دیر تک اس عورت کا
پاؤں دیکھتا رہ گیا۔

عورت نے عارف کو غور سے اپنے پاؤں کی طرف
غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا ـــ کیا ہوا چھوٹے بابو
تم اس طرح میرے پاؤں کیوں دیکھ رہے ہو۔؟

لیکن تمہارا پاؤں تو ٹھیک ہے بھاری کہاں ہے؟

عورت کچھ جھجکی، کچھ شرمائی اور دھیرے سے
مسکرادی ـــ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں چھوٹے
میاں!

اتنے میں عارف کی امی آگئیں، اور انہوں نے عارف
کی الجھن دور کردی تھیں۔ ورنہ جانے کب تک وہ اس
عورت سے بحث کرتا رہتا۔

ان عورتوں کی خوشامدانہ باتوں سے عارف کو

خوشی بھی ہوتی۔ اپنی تحریری فن کی ستائش پر اس کا سر فخر
سے تن جاتا اور جب ماہ اپنی بھینس کا خالص دودھ اور شریفن
قصابن بہترین گوشت خاص طور پر عارف کے لئے پہونچا
جاتی تو اس کے انکار میں لچک پیدا ہو جاتی۔

خط لکھنے کے لئے سب سے زیادہ اسے شریفن
قصابن ہی تنگ کیا کرتی تھی۔

شریفن کی چھوٹی بہن شہر میں رہتی تھی۔ اس کی مالی
حالت بہت اچھی تھی۔ اس لئے وہ ہر ہفتہ شریفن کو خط لکھتی
اور تحفے تحائف بھیجواتی رہتی۔ اور اس کے جواب میں شریفن
بھی بڑی باقاعدگی کے ساتھ خط بھیجتی رہتی۔

شریفن کا گھر بھی عارف کے مکان سے زیادہ دور
نہیں تھا۔ عارف کے مکان کے سامنے ایک کچی سڑک تھی
جو ایک طرف بازار کو جاتی تھی اور دوسری طرف
ضلع بورڈ کی پختہ سڑک سے ملتی تھی۔ کچی سڑک پر چلتے ہوئے
شمال کی طرف چالیس گز کے فاصلے پر ایک بانس کا جھاڑ
تھا۔ اس کے بعد ایک بڑا سا قبرستان کا احاطہ تھا اور
قبرستان کے احاطہ سے نکلنے کے بعد ہی جہاں پر کچی سڑک
ضلع بورڈ کی پختہ سڑک سے گلے ملتی تھی۔ عین اسی جگہ شریفن
کا مکان تھا۔

شریفن گوری چٹی سی متناسب جسم کی عورت تھی
اور جمن قصاب اس کا تیسرا شوہر تھا۔ جو اسے دوسرے شوہر
کے گھر سے بھگا کر لے آیا تھا۔

پہلے دو شوہروں سے اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔
جمن قصاب سے دو لڑکیاں تھیں۔ چھوٹی زرینہ بالکل اپنی
ماں پر گئی تھی۔ لیکن بڑی دھرن پتہ نہیں کس پر گئی تھی۔
ناک و نقشہ تو اس کا بھی بڑا تیکھا تھا۔ مگر رنگ سانولا
تھا۔ سانولا رنگ نہ تو شریفن کا تھا۔ نہ جمن کا۔ پتہ نہیں یہ رنگ
دھرن کہاں سے آئی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ رنگ شریفن
نے کسی سے مستعار لیا تھا۔ حقیقت کچھ بھی ہو۔ دھرن سانولی
رنگت کے باوجود ایک ایسی تیز شراب تھی جو حلق سے
نیچے اترے بغیر جسم کے سارے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ
دیتی تھی۔

ابتدا میں شریفن خط لکھوانے کے لئے عارف کے گھر
آتی رہی۔ اس کے بعد اس نے عارف کو اسکول سے لوٹتے
وقت گھیرنا شروع کیا۔ پہلے دن تو عارف کو شریفن کی یہ بات
بڑی ناگوار لگی۔ لیکن ایک خط لکھوانے کے لئے اپنے گھر میں
بٹھا کر شریفن اس کی اتنی آؤ بھگت کرتی اتنی خاطر داری
کرتی کہ اس کے حسن اخلاق سے عارف موم کی طرح پگھل کر
رہ گیا تھا۔

شریفن کے حسن اخلاق کے علاوہ عارف کو دھرن کی
آنکھیں بے حد پسند تھیں۔ جب شریفن خط لکھوانے میں محو
ہوتی دھرن ایک ٹک عارف کی طرف دیکھتی رہتی۔ اور
عارف کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اس کی آنکھوں کی گہرائی
میں ڈوبتا جا رہا ہو۔ ڈوبتا جا رہا ہو۔ اس کے سارے جسم
میں بڑی لطیف سی گدگدی ہونے لگتی۔

عارف کو دھرن کی آنکھیں بولتی ہوئی محسوس ہوتیں
جیسے اس کی کھلتی اور بند ہوتی ہوئی پلکیں اور اپنے حلقے
میں گردش کرتی ہوئی آنکھوں کی پتلیاں اس سے کچھ کہہ
رہی ہوں۔ سرگوشیوں میں اس سے کوئی سوال کر رہی ہوں۔ اور
عارف تو الجھ کر رہ جاتا اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا حالانکہ
وہ ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اور اس کی مسیں بھیگنا شروع
ہو گئی تھیں۔ لیکن آنکھوں کی زبان سمجھنے سے وہ اب بھی
قاصر تھا۔

زرینہ کا انداز جداگانہ تھا۔ وہ خط لکھتے وقت
کبھی اس کے قریب آکر نہ بیٹھتی تھی۔ سارا وقت گھر کے
کام دھندے میں لگی رہتی۔ لیکن اکثر و بیشتر وہ اپنے گھر

کے سامنے کھڑی رہتی۔ اور عارف کو ہاتھ میں کتاب لئے
اسکول جاتے ہوئے خاموش نگاہوں سے دیکھتی رہتی
عارف کے سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آتی تھی کہ وہ اس کے
اسکول جاتے وقت اپنے گھر کے سامنے کس کے انتظار میں
یوں کھڑی رہتی ہے۔

عارف نے بڑی ناگواری سے اپنی تحریر پڑھ کر
مہرن کو سنائی۔

میرے پیارے! تم اتنے سنگ دل کیوں ہو۔
صورت سے تو تم ایسے نہیں دکھتے۔ میں دن رات سوتے
جاگتے تمہارے ہی سپنے دیکھتی رہتی ہوں۔ مگر تم ہو کہ
جیسے تمہیں کچھ خبر ہی نہیں۔

مہرن مسکرا دی ـــــ ٹھیک ہے اب آگے لکھو
پھر مہرن بتاتی گئی اور عارف لکھتا گیا۔

جی چاہتا ہے تم ہر وقت نگاہوں کے سامنے بیٹھے
رہو۔ اور میں تمہیں دیکھتی رہوں۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں
میں اپنے دل کا سارا حال تمہیں کہہ سناؤں۔ مگر مشکل یہ
یہ ہے کہ تم آنکھوں کی زبان سمجھتے بھی تو نہیں!

خط لکھتے لکھتے عارف ایک بار پھر رک گیا۔ اسے
پھر اپنے بغل میں ہلکے ہلکے کبوتر پھڑپھڑاتے ہوئے محسوس ہوئے
عارف نے مشکوک نگاہوں سے زبین کی طرف
دیکھا۔ ضرور اسی نے کہیں پر کبوتر چھپا رکھا ہے؟

یکایک عارف کو چند دنوں قبل ایک پہر کا واقعہ
یاد آ گیا۔

محلے کی چھ سات لڑکیاں زبین کے گھر میں جمع تھیں
عارف اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد گھر لوٹ رہا تھا ابھی
وہ ضلع بورڈ کی سڑک سے نیچے اتر کر زبین کے گھر تک پہنچا
ہی تھا کہ زبین نے اسے دونوں ہاتھوں کے گھیرے میں لے
کر دبوچ لیا۔

اچانک عارف کو ایسا محسوس ہوا جیسے دو کبوتر اس کے
سینے سے دب کر پھڑپھڑانے لگے ہوں۔ اور اس کے نرم و گداز
لمس سے اس کے سارے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی ہو عارف
نے گھبرا کر زبین کو پرے ڈھکیل دیا۔ اور چونکہ زبین کی
کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی وہ دھپ سے زمین
پر ڈھیر ہو گئی۔

عارف کی اس حرکت پر ادھر ادھر چھپی ہوئی
لڑکیاں باہر نکل آئیں اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں
پھر ایک لڑکی نے عارف کو چھیڑتے ہوئے پوچھا
ـــــ کیا ہوا چھوٹے میاں!

کبوتر۔ عارف کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

کبوتر۔؟ لڑکی نے بھنویں سکوڑ کر پوچھا۔

وہ تو اڑ گیا۔ دوسری لڑکی نے دور آسمان کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ وہ دیکھو دور آسمان پر
اڑا چلا جا رہا ہے۔

تم نے اڑنے کیوں دیا چھوٹے میاں۔ تیسری لڑکی
نے چھیڑا ـــــ دو ہاتھ تو ہیں تمہارے۔ پکڑ لیا ہوتا۔

پھر تمام لڑکیاں ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور
ان لڑکیوں کی ہنسی عارف کو اپنے سینے میں چبھتی ہوئی محسوس
ہوئی۔ وہ خجل سا ہو کر رہ گیا تھا۔

عارف چند لمحوں تک زبین کی طرف دیکھتا رہا۔
مگر اسے کہیں بھی کوئی کبوتر دکھائی نہیں دیا۔ اس نے اڑنے
کی آواز بھی تو نہیں سنی اگر کبوتر کھڑکی کے راستے اڑ بھی
گیا ہوتا تو اس پر پھڑپھڑانے کی آواز کمرے میں ضرور ابھرتی
وہاں تو مکمل خاموشی تھی۔

عارف کا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا۔

تم کیا سوچنے لگے چھوٹے میاں؟ مہرن نے اسے
خاموش دیکھ کر پوچھا!

نہیں کچھ نہیں ۔ عارف ٹال گیا اسے ڈر تھا کہ اگر وہ سچی بات کہہ دے گا تو وہ دونوں بہنیں قہقہہ لگا کر ہنس دیں گی اور وہ اس قہقہہ کی گونج میں مذاق بن کر رہ جائے گا۔

آج اگر زبین اسے اگر زبردستی کھینچ کر یہاں نہ لاتی تو کبھی نہ آتا ۔ اس دن سہ پہر کو گونجتے ہوئے لڑکیوں کے قہقہے اب تک اس کے ذہن میں گونج رہے تھے ۔ اور اس کی "تلخی" عارف ابھی تک نہیں بھولا تھا ۔ اسے زبین پر بھی غصہ تھا کیونکہ اگر اس دن وہ اس کے جسم سے یوں نہ ٹکراتی تو وہ لڑکیاں یوں کھلکھلا کر کبھی نہ ہنستی ۔

ضلع بورڈ کے سڑک سے نیچے اتر کر کچی سڑک پر آتے ہی اس نے دیکھا کہ زبین اپنے گھر کے سامنے کھڑی ہے عارف اسے نظرانداز کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ اس نے آواز دی ۔

میرا ایک کام کر دوگے چھوٹے میاں ؟

عارف نے کوئی جواب نہ دیا وہ آگے بڑھتا گیا ۔

اتنے میں زبین دوڑ کر اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ۔

عارف کا دل تو جواب دینے کو نہ چاہا پھر بھی اس نے بڑی رکھائی سے پوچھا ۔ کون سا کام ؟

ایک خط لکھوانا ہے ۔

مجھ سے نہیں ہوگا ۔ عارف نے خفگی آمیز لہجہ میں جواب دیا ـــــ

بہت ضروری خط ہے لکھ دو نا چھوٹے میاں ، زبین خوشامد پر اتر آئی ۔

دیکھتی نہیں میں ابھی اسکول سے لوٹ رہا ہوں مجھے گھر پہونچنا ہے ۔ عارف نے اس کی خوشامد کا کوئی اثر نہیں لیا ـــــ

تو کیا ہوا میرے گھر جانے سے تھوڑا ہی رک رہی ہوں ۔ خط لکھ کر چلے جانا ۔ زبین نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا ۔ میں بڑی دیر سے کھڑی کھڑی تمہاری راہ دیکھ رہی تھی ۔

پتہ نہیں زبین کی گرفت میں کون سی کشش تھی کہ وہ سر سے پاؤں تک نرم پڑ گیا ۔

میں زیادہ دیر نہیں کروں گا ۔

دیر کرنے کو کون کہہ رہا ہے ۔ بس خط لکھ کر چلے جانا ۔

چلچلاتی دھوپ میں دو میل پیدل چلنے کے بعد وہ پسینے میں تر تھا ۔ اور اس کے چہرے پر گرد و غبار کی ہلکی سی تہہ جم گئی تھی اور سر کے بال بھی الجھ گئے تھے ۔

تم تھک بھی گئے ہو ۔ زبین نے ہمدردی جتائی ۔ منہ ہاتھ دھو کر تھوڑی دیر آرام کر لو اتنی دیر میں خط بھی مکمل ہو جائے گا پھر چلے جانا ۔ تمہارا گھر کوئی دور بھی تو نہیں ۔

پھر زبین اسے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی اور وہ کسی مقناطیسی طاقت کے زیر اثر کھنچا ہوا چلا آیا ۔

کمرہ نیم تاریک تھا ایک طرف ایک بڑا پلنگ بچھا ہوا تھا ۔ جس پر موٹا سا ایک گدا تھا گدے پر کشیدہ کاری کی ہوئی ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی ۔ سرہانے دو گاؤ تکیے تھے ۔ اور ایک گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے نہرن بستر پر نیم دراز تھی ۔

عارف کو دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی ۔

زبین نے کہا ـــــ یہ لو آپا میں چھوٹے میاں کو پکڑ کر لے آئی ہوں ۔ اب جلدی سے خط لکھوا لو ۔ یہ لوگ آنا ہی نہ چاہتے تھے ۔ میں زبردستی کھینچ لائی ہوں ۔

پلنگ کے سامنے دیوار سے لگا ہوا ایک سنگار میز تھا ۔ جس پر ہیر آئل کی شیشی ۔ پوڈر کا ڈبہ ۔ اور اسنو رکھا ہوا

تھا اور سنگار میز کے قریب ہی ایک چھوٹا سا لوٹا پڑا ہوا تھا
عارف اس سے قبل کتنی ہی بار آ چکا تھا لیکن
شریفن ہمیشہ اسے برآمدے میں بٹھوا کر خط لکھواتی تھی ۔
کمرے کے اندر آنے کا عارف کے لئے پہلا اتفاق تھا ۔
عارف نے کمرے کی تاریکی سے گھبرا کر کہا ـــــ

یہاں تو بڑا اندھیرا ہے ۔
ابھی روشنی ہو جائے گی ، زبین نے بڑے اطمینان
سے جواب دیا ۔ وہ ـ
وہ سنگار میز کے قریب سے لوٹا اٹھا کر کھڑکی کے
پاس لے گئی ۔ اور اس پر چڑھ کر اس نے کھڑکی کے اوپر کا
پٹ کھول دیا ۔ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی ۔ اور تب عارف
نے دیکھا کھڑکیاں دو تھیں تاریکی کے سبب اسے کھڑکیاں دکھائی
نہیں دی تھیں ۔
زبین تھوڑی دیر کے لئے برآمدے پر چلی گئی اور
عارف ، پلنگ کے کنارے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا ۔
میں نے لوٹا میں پانی اور تولیہ رکھ دیا ہے برآمدے
پر جا کر منھ ہاتھ دھو لو چھوٹے میاں ۔ زبین نے واپس
آ کر کہا ۔
عارف جب منھ ہاتھ دھو کر آیا تو زبین نے اس
کے ہاتھ میں کنگھی تھما دی ۔
سر کے بال سنوار لو ۔ بری طرح الجھ گئے ہیں ۔
سر کے بال سنوار کر جب عارف پلنگ پر بیٹھا ۔
تو زبین اسے پنکھا سے ہوا کرنے لگی ۔
اب عارف کے لئے انکار کے لئے کوئی گنجائش نہیں
تھی ـــــ
کس کو خط لکھنا ہے ۔ عارف نے پوچھا ۔

زبین مسکرائی ـــــ نام پوچھ کر کیا کرو گے ـ
ایک آدمی تمہاری طرح ۔
عارف نے پلٹ کر زبین کی طرف دیکھا وہ اب بھی
خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔
اچھا تو پھر لاؤ کاغذ
کاغذ ؟ کاغذ میرے پاس کہاں ـــــ زبین
کہا ـــــ تمہارے پاس کاپی تو ہوگی اسی میں ایک
ورق پھاڑ کر لکھ دو نا !
یہ نہیں ہوگا ۔ عارف نے صاف انکار کر دیا ـــ
میری کاپی خراب ہو جائے گی ۔
جب بڑی رد و کد کے بعد عارف رضامند ہوا تو زبین
کو ایک ترکیب سوجھی ۔
کتنے کی ہے تمہاری کاپی ۔؟
دو روپے کی ۔
ٹھیک ہے پھر مجھ سے دو روپے لو نئی کاپی
خرید لینا ۔
زبین کا یہ وار کام کر گیا ۔ ایک ورق کاغذ کے
دو روپے لینا ۔ بڑی گری ہوئی بات تھی ۔ عارف
کیسے برداشت کر سکتا تھا ۔
اس نے کاپی کھولی جیب سے قلم نکالا اور بڑی
حقارت سے بولا ـــــ ایک ورق کاغذ کے
میں دو روپے نہیں لے سکتا ۔ روپے اپنے پاس ہی رکھو
بتاؤ کیا لکھنا ہے ۔ ؟
اب کے زبین سنبھل کے عارف کے سامنے بیٹھ
گئی ۔
پھر عارف خط لکھنے لگا تو زبین اس کی پشت

طرف پلنگ کے ایک کنارے بیٹھ کر بڑے انہماک سے اس کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

اتنی دیر میں عارف کا پسینہ خشک ہو گیا تھا۔ اور دو میل پیدل چل کر آنے کی تھکن بھی دور ہو گئی تھی۔ اور پنکھے کی ہوا کھا کر وہ فرحت [illegible] کرنے لگا تھا۔

عارف نے ایک بار پھر اپنے ذہن سے کبوتر کا خیال جھٹک دیا۔ اور زہرہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ——

ہاں اب اس کے آگے [illegible]

زہرن [illegible] بولتی گئی اور عارف لکھتا گیا۔

کاش تم مجھے [illegible] تنہائی میں ملتے اور میں تمہیں اپنے دل کی دھڑکنیں [illegible] سکتی۔ شاید تم میرے دل کی دھڑکنوں کی آواز سمجھ سکو۔

عارف نے [illegible] کر کے پوچھا —— ہاں آگے بتاؤ

اب کچھ اور [illegible] لکھنا ہے آخر میں تمہاری جان لکھ دو

عارف نے سوالیہ نگاہوں سے زہرن کی طرف دیکھا

یہ تمہاری جان کیا ہوا آخر میں تو خط لکھنے والے کا نام ہوتا ہے۔

زہرن مسکرا دی —— تم وہی لکھ دو جو میں کہتی ہوں

عارف نے بادل نخواستہ وہی لکھ دیا

خط مکمل کرنے کے بعد عارف نے کہا —— لفافہ کہاں ہے لاؤ پتہ لکھ دوں۔

لفافہ موجود نہیں۔ زہرن نے جواب دیا۔ میں پتہ کسی سے بھی لکھوا لوں گی تم فکر نہ کرو۔

اتنا کہہ کر زہرن کمرے سے باہر چلی گئی۔

عارف نے اپنا کاپی سے ایک ورق پھاڑ کیا اور اسے تہہ کر کے زہرن کے حوالے کرتے ہوئے پوچھا۔ تمہاری ماں کہاں ہے ؟

وہ اپنی بہن سے ملنے شہر گئی ہے۔ زہرن نے جواب دیا۔

عارف نے قلم بند کر کے جیب میں رکھ لیا ——

اور تمہارا باپ ؟

وہ مویشی خریدنے دیہات گیا ہوا ہے۔

اتنی دیر میں کمرہ سورج کی تیز روشنی سے بھر گیا تھا۔ اب سورج عین کھڑکی کے سامنے آگیا تھا۔

دھوپ کی تپش سے عارف بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تو زہرن نے اسے جلدی سے ہاتھ پکڑ کر بٹھانا چاہا۔

تمہیں بھوک لگی ہو گی۔ بیٹھو کچھ کھا کر جانا۔

نہیں اب میں گھر جا کر ہی کھاؤں گا۔ عارف پلنگ پر بیٹھنے کی بجائے کھڑا رہا۔ اب تو اس کمرے میں بھی گرمی محسوس ہونے لگی تھی۔

ٹھہرو میں کھڑکی کے پٹ بند کر دیتی ہوں۔

زہرن بستر سے نیچے اتری۔ اور ٹول پر چڑھ کر اس نے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ کمرے میں نیم تاریکی پھیل گئی۔

عارف نے اپنی کتابیں سمیٹیں اور دروازہ کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ ٹول پر کھڑی ہوئی زہرن کا توازن بگڑ گیا اور وہ ٹول پر سے کود کر گرتے گرتے عارف کے جسم سے جا لگی۔ اور اپنا توازن سنبھالنے کے لئے اس نے دونوں ہاتھوں سے عارف کو دبوچ لیا۔

عارف کے سینے پر پھر دو کبوتر پھڑپھڑائے اور اس کے نرم و گداز لمس سے اس کے سارے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ اس نے گھبرا کر زہرن کو [illegible] ڈھکیل دیا۔ اور دروازے کی طرف بڑھا۔ مگر دروازہ باہر سے

بقیہ صفحہ

بند تھا۔

عارف کو نیم تار یک کمرے میں اتنے نئے تجربات سے گذرنا پڑا کہ دو میل پیدل نہ چلنے کے باوجود اس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ اور جسم پسینے میں تر ہو گیا۔

پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور اس نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی دیکھا کہ ہرن کے باہر نکلتے ہی از بین کمرے میں آ گئی اور دروازہ پھر باہر سے بند ہو گیا۔

عارف کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ قید میں ہو اور اس کی رہائی اس کے بس میں نہ ہو۔ ●●

م قی خیال

ہم چلن بزرگوں کا نوحہ[1]

منّا ؟

بھائی جان : منا پھدک کر قریب آگیا

اچھا، اچھا ! منے تم بھی ہو نا ؟

جی بھائی جان، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ منا قدم ملا کر چلتا ہوا بولا اور آگے ساتھ ساتھ چلنے پر اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔

بات یہ ہے منے کہ ....

کیا بات ہے بھائی جان ؟ منا لپک کر سامنے آگیا۔

در اصل میں یہ دریافت کر رہا تھا۔ یعنی یہ جاننا چاہتا تھا کہ تم میرے پاس ہو یعنی میرے ساتھ ہو یعنی یوں کہ تم مجھ سے قدم ملا کر چل رہے ہو۔

بالکل بالکل بھائی جان ! آپ کے نقش قدم پر چلنا میرا ایمان ہے۔ آپ کے ہر لفظ کو میں صحیفۂ آسمانی سمجھتا ہوں۔ منّا نے دوڑ کر اپنی سعادت مندی کا یقین دلایا۔

ہاں جیتے منے ! جب تم قدم ملا کر چلنے کے قابل ہوگئے تو میری فکر بالکل ختم ہوگئی۔ جب ہم ساتھ ہیں تو پھر....

آخر آپ پریشان کیوں نظر آ رہے ہیں منے نے دریافت کیا !

اب میں پریشان نہیں ہوں۔ تم جو میرے ساتھ آگئے ورنہ میں ....

ورنہ کیا مطلب۔ جی بھائی جان ؟

ورنہ میں تنہا تھا۔ لیکن چھوڑو ان باتوں کو، کل کی باتیں، ماضی کی داستان !

کل کی باتیں، ماضی کی داستان، کیا مطلب۔ بھائی جان آپ جملوں کو درمیان میں معلق کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔ کہ میں پزلڈ ہو جاتا ہوں۔ فرمائیے کہ ماضی کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہتے تھے۔ ؟

میں کہنا چاہتا تھا کہ ماضی جھوٹ ہے۔

اچھا ماضی محض جھوٹ ہے ؟ یہ آپ کا انکشاف ہے ؟ ؟

منے کا لہجہ تعجب سے زیادہ سوالیہ تھا

نہیں، نہیں منے ماضی سچ ہے

کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟ ابھی جھوٹ تھا اور اور ابھی سچ ہو !

---

[1] عنوان زبیر رضوی کی نظم سے مستعار ہے۔

آپ کے بیان میں ایسا تضاد ؟
منّے! دنیا بہت بڑی ہے اور تم بہت چھوٹے!
ہاں ہاں یہ حقیقت ہے لیکن آپ کو دنیا کی عظمت
اور بڑائی اور میری تحقیر اور چھوٹائی کا احساس کیسے پیدا نہ
ہوگیا؟ بہرحال آپ فرما رہے تھے کہ ماضی ——— یعنی
پہلے ماضی جھوٹ تھا اور پھر آپ نے کہا ماضی سچ ہے
حقیقت ہے۔

ماضی ایک ایسا پتھر ہے جو وقت کے سینے پر نصب
ہے اور اس چوراہے سے سارے راستے پھوٹتے ہیں۔ لوگ
سمجھتے ہیں یہ سنگِ میل ہے ان کی منزل ہے۔ ان کی طے
کردہ مسافت کا پتہ دیتا ہے لیکن جس نے اس چوراہے
پر پہلی بار آنکھیں کھولی ہیں .... ؟ ان کے لئے
تو یہ نقطۂ آغاز ہے۔ اور یہی اس کے لئے برتری کی بات
ہے۔ اس جگہ پر کھڑا مسافر منزل پر پہنچا ہوا شخص بھی ہو
سکتا ہے۔ اور سفر کی تیاری میں کھڑا شخص بھی، بس رُخ
بدل کر کھڑا ہونے کا سلیقہ ہونا چاہئے۔

آپ نے تو سفر اور منزل کی اخلاقیات پر تقریر شروع
کردی ہے دراصل آپ کو تقریر کا بہت شوق ہے مجھے ان ساری
باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور نہ آپ کے فرمائے ہوئے
جملے سے کہ ماضی سچ یا ماضی جھوٹ ہے مجھے ماضی کی بازیافت
نہیں چاہئے۔ مجھے حال، محض حال سے دلچسپی ہے۔

نہیں منّے! ماضی کی بازیافت یا DISCOVERY
ضروری ہے۔

جس کا ماضی ہو وہ اس کی بازیافت کا ثبوت
کندھوں پر اٹھائے پھرے۔ اپنے پاس حال ہے۔ ہاں
مستقبل کے حسین خواب ضرور ہیں۔

اب میں تمہیں کیا سمجھاؤں، کیسے سمجھاؤں؟ آؤ میرے
قریب آؤ لاؤ اپنا دایاں کان!

منّے کے چہرے پر ناگواری کا عکس ہے۔ لیکن وہ
اپنا کان قریب کر دیتا ہے۔ بھائی کان میں کچھ کہتا ہے
اور اس کے بعد زور دیتا ہے ہاں ہاں! دراصل بات
یہ ہے۔

منّے کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ مسکراہٹوں کی کرنیں
مترشح ہو جاتی ہیں۔ بڑی پتے کی بات کہی آپ نے،
سچ مچ آپ بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ اپنا ماضی دھند
میں ہو تو حال کا نقش نامعتبر ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت
ہے کہ حال پر ملمع اور رنگ و روغن نہیں چڑھایا جا سکتا
حال کی تصویر کو ENLARGEMENT
کرنے سے صورت مسخ ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے ماضی
——— ماضی تو اندھیرا ہے۔ اندھیرے میں
جیسا نقش چاہو اگالو۔ سانپ کو رسی کہو یا رسی
کو سانپ!

اب تو تم سمجھ گئے؟
بالکل بھائی جان!

بہت خوب! تم سمجھ گئے تو پھر کس کی پروا۔ جو لوگ
کم فہمی کی فصیلوں میں بند ہیں۔ یا جو کج فہمی کی زرہ اوڑھ
کر آج تک محفوظ رہے ہیں۔ ان پر ہم آسانی سے شب خون
مار سکتے ہیں۔ ان کو سمجھائیں گے۔ یہ بڑے ہی دقیانوسی
خیالات کے لوگ ہیں۔ جلدی راہ راست پر نہیں لگتے

اچھا ذرا پلٹ کر دیکھو تو ہمارے عقب میں بھی
کوئی آرہا ہے۔ نہیں نہیں۔ میں آگے جانے والوں پر نظر
رکھتا ہوں کہیں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے.......

کیوں یہ ماہی کی پوشاک میں کئی رنگوں کے STRI
PES ہیں؟
ہاں اس کے پاس کتنے تھیلے ہیں۔ دیکھ سکتے ہو؟
تھیلے کیوں وہ پھیری والا ہے کیا؟
ہاں برخوردار! ہیرا پھیری ہی کرتا ہے لیکن پھیری والا
نہیں۔ اس کی دوکان پر تو دو کر RETAILERS
بیٹھتے ہیں!
تو پھر اتنے سارے تھیلوں کو ساتھ ساتھ لئے پھرنے کا
حاصل؟
آؤ میرے آؤ میں بتاؤں،
لیجئے آگیا ______ میں نے منہ بنا کر حکم کی تعمیل
کی۔
دیکھو ان تھیلوں میں پوشاکیں ہیں۔
پوشاکیں۔ کیا معنی؟ منا نے سوال کیا۔
ہاں عزیزمن، پوشاکیں۔ قدیم، جدید، ملکی، غیر ملکی
یہ ساری پوشاکیں اسے کہاں ملیں گی۔ وہ تو چلتا پھرتا
MUSEUM ہے۔
یہ چیزیں ملتی نہیں ہیں۔ یہ سب ہاتھ کی صفائی ہے۔
یہ سب نقلی ہیں لیکن اصلی دکھتی ہے۔ جس نے وہی تجزیہ کر سکتا
ہے۔ دوسرے تو فریب کھاتے ہیں۔ اس لئے میں ان کا
پیچھا چھوڑ دیا ہے مجھے صرف اس کے شانہ بشانہ چلنا ہے۔
جو اونٹ پر سوار ہے یہ بھی جان لو کہ وہ موٹر پر سوار ہے
لوگ موٹر کہتے ہیں لیکن وہ بضد ہے کہ یہ اونٹ ہے۔ میں
بھی کہتا ہوں بالکل اونٹ ہے۔
بھائی جان گستاخی معاف ہو تو عرض کروں کہ اونٹ کو
اونٹ اور موٹر کو موٹر ہی کہنا چاہئے کیوں کہ call
a spade a spade

منا نے دوبارہ ... بولا۔ یہ [illegible]
یہ عام شاہراہ ہے بھیا۔ بولا کہ مجھے نشانہ کرے۔ ... ظاہر
اس کی خوشنودی کے لئے کہتا ہوں۔ وہ خوش ہوگا تو
مجھے منزل تک پہنچا دے گا
منزل تک۔ ؟ وہ کیا پہنچائے گا۔ میں چاہوں تو
اسے موٹر سے اتار لوں۔
خبردار میں نے تمہیں منع کیا ہے کہ کھلا بندوں تم
اپنے بچکانہ خیالات کا اظہار نہ کرو۔
اس کا مطلب یہ ہے میں منہ پر خاموشی لگالوں۔
تم تو ہر بات کا برا مان لیتے ہو۔ ابھی حالات کا
یہی تقاضا ہے۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ دیکھتے ہو
وہ ملکہ جا رہی ہے۔ جلدی کرو ورنہ وہ کسی وقت
نظروں سے اوجھل ہو جا سکتی ہے۔ عجیب عیار
ہے وہ۔
آپ تو اس ملکہ کے نام سے ہی چڑتے تھے۔
افوہ تمہاری بچکانہ حرکتیں نہیں رکتی۔ چڑنا مثل
کرنا اپنی بقا کے لئے ضروری ہے کچھ تو اپنی ضرورت
ہوتی ہے۔ کچھ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے کرنا پڑتا
ہے۔ میں جس سے نفرت محسوس کرتا ہوں اس کے لئے یہ ضروری
محسوس کرتا ہوں کہ پہلے وہ عینک لگالوں۔ جس سے
ہر چیز چھوٹی نظر آتی ہے۔
آپ کی باتوں میں بڑا تضاد ہے۔ ساری بنیاد
جھوٹ، دغا، عیاری، مروجہ اصول اخلاقیات کی
شکست وریخت، مطالب ومعنی کی توڑ پھوڑ اور طرح
طرح کی فرضی باتوں کی ہے۔
اس طرح آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لوگ
اپنی شناخت اپنے چہرے سے کرواتے ہیں۔ اور آپ

[illegible] چہرے کا ماسک پہننا
چاہتے ہیں ۔
منّا ! افسوس کہ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے !
تم [illegible] ہیں اپنی بے چہرگی کا المیہ
[illegible] ؟
مجھے [illegible] کی کوئی ضرورت نہیں ۔ میں اور آپ
[illegible] نہیں دے سکتا ۔ [illegible] !
[illegible] میرے بھائی [illegible] کہاں [illegible] رہا ہے ؟
[illegible] بھاگتے ہوئے پیچھے ہوئے منے کو [illegible] چاہا
[illegible] اور [illegible] کر لیجیے ، کہ میں ہر
لمحہ بدلتے چہرے کا ساتھ نہیں دے سکتا ۔ آپ کو ماضی
کی بازیافت کی تلاش ہے ۔ طرح طرح کی پوشاک والے
کی ہمسری کی ضرورت ہے ۔ موٹر میں بیٹھے انسان کو اونٹ
پر بیٹھا کہنے کی مصلحت ہے ۔ ملک کے چہرے کے ماسک
کی ضرورت ہے ۔ تو مجھے ایسے بھائی کی ضرورت نہیں
میں برابر منا رہنے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہوں ۔

منّا ، منّا ، منّا ، ذرا سنو بھی

بھائی نے منا کو روکنا چاہا ۔

چیختے رہے ۔ منّا ، منّا ، منّا ....

میرا راستہ الگ ہے !

●●

احمد رشید علیگ

صدیوں پر پھیلی کہانی

کہانی کی آخری کڑی

سورج نے اپنا جال بچھا دیا تھا۔ کائنات نے گرم سنہری لباس پہن لیا تھا۔ آسمان اور زمین کے درمیان پانی بہہ رہا تھا اس کی روانی بڑی تیز تھی۔

تمہاری کہانی کے ہر نقطے سے ایک ایک حرف میری کہانی سے ملتا ہے۔ یہ مماثلت شاید اس لئے ہے کہ کرّہ کے درمیانی نقطوں میں سمتوں کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ لیکن فاصلے کے دائرہ کے نقطہ مرکز سے "نصف قطر" جیسا درمیان میں بالکل برابر ہوتا ہے ...... اور وہ نقطہ مرکز "کلائمکس" نقطۂ آخر ہے۔ وہ ؟ ہے ....." ! " ہے اور نقطۂ آغاز ہے۔

تم نے ابھی کہا نا ! اسے میرے پسینے سے پیار تھا۔ ! اسے میرے دماغ سے پیار تھا۔ اور میری روح سے پیار تھا یعنی ابدی پیار۔ اسی اس پیار کو چاہتی۔ اور میں نے اس کے عوض اس کو سر سے پیر تک چاہا۔ کتنی مٹھاس تھی جسم کے ان کانٹوں میں جبکہ وہ اُگ آتے تھے۔ میری تجربت کے احساس سے .... لیکن اب تم کہتے ہو کہ میری زبان ہولناک ہو گئی ہے اور اس کا ذائقہ اس قدر نمکین تھا کہ شروع میں زہر لگا۔ اور جو تمہیں یعنی اس وقت بڑا ہی سوندھا سوندھا لگتا ہے۔ جبکہ تم نے انہیں پہلی بار ناقابل برداشت حالت میں دیکھا۔ تو وہ دونوں ایک دوسرے میں سمٹے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے میں اس قدر پیوست تھے کہ درمیان میں بال برابر بھی گنجائش نہیں تھی کہ ہوا بھی گذر سکے۔ اور انہوں نے اس حد امتیاز کو پار کر لیا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے عبوری دور میں بے حد اور بڑی بے چینی سے بے قرار تھے۔ شاید صرف اس مقام پر آ کر عورت کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے سر کے بال ٹھوڑی پر آئے ہیں اور کچھ ناک کے نیچے۔ اور یہاں سے فرد کی شکست شروع ہوتی ہے .... یہیں پر کہانی ختم بھی ہوتی ہے .... اور کبھی کبھی بعض کہانیوں کا یہی نقطۂ آغاز بھی ہوتا ہے۔ لیکن میری کہانی کلائمکس کے بعد ختم ہوتی ہے .... یا یوں سمجھو ہر کہانی لامتناہی سلسلہ ہے نہ ختم ہونے کا .... بس کہے جاؤ۔

ہاں جبکہ تم نے یہ پوچھا کہ "کون تھا وہ ؟" تو اس نے کیا کہا۔

اس نے کہا میرا دوست تھا وہ۔ بالکل تمہاری طرح

ہنگ۔

تمہارا جیسا ہی پسینہ ہے، تمہاری جیسی روح ہے اور جسم بھی تمہارا جیسا ہے۔

دیکھو تمہاری کہانی وہ ہے جو کلائمکس سے شروع ہوتی ہے۔ اور میری کہانی۔ میری کہانی جواب کہانی ہے پہلے حقیقت تھی اور سچ کو سچ کہنے کے لئے دلیل کے طور پر اس کہانی سناؤں۔

کہانی کی پہلی کڑی

ہاں تو قصہ یوں اس نے بیان کیا تھا کہ جب خدا کو اپنا جلوہ دکھانا مقصود ہوا تو اس نے آسمان بنا دیا۔ زمین بنائی ستارے پھیلائے ...... زمین کو گلزار کیا۔ آسمان کو چمکایا اور آسمان کے اس طرف ایک خوبصورت سی جنت بنائی۔ جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہائی۔ اور اس جنت میں حور و غلمان ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں کو حوریں اور نیک عورتوں کو غلماں ملیں گے۔ ..... لیکن ان سے کوئی نسل نہیں ہوگی۔ ..... چونکہ .... ؟ ہاں تو انہی میں ان کی تخلیق ہوئی۔ فرشتوں نے اسے سجدے کئے فضائیں بڑی ہی پُر لطف اور خوبصورت تھیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس میں اس کی طبیعت نہیں لگی۔ وہ سست رہنے لگا۔ وہ اکیلا تنہا ایک خوبصورت پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ کہ شاید سکون ملے اسے دیکھ کر خالق بھی پریشان ہوگیا اور پھر اس نے اس کے سینہ سے ایک عورت پیدا کی۔ ... وہ پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔ اور پسلی ٹیڑھی تھی۔ اس طرح اس کی تنہائی کا علاج تو ہوگیا۔ لیکن اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اس عورت کو چھو لیا۔ .... پھر کیا تھا ؟ زمین ہل گئی۔ آسمان کانپ گیا۔ خالق کا جلال زوروں پر آگیا۔ اور ان کو زمین پر پھینک دیا گیا۔ .... وہ بیچارے ان

گیا

جنت اور رنگین فضاؤں ہمیشہ قیامت تک کے لئے محروم کر دیئے گئے۔ کون جانتا ہے کہ یہ سزا ہے یا آزمائش ہے۔ ؟ اور اگر ان سے غلطی ہوئی بھی تو ....

”چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا“

عورت کو یہ سزا ملی کہ وہ زندگی بھر اولاد کا بوجھ ڈھوئے گی۔ اور مرد اس کو اپنا پسینہ پلائے گا۔ اور خون کھلائے گا۔ پہلے جس جرم کی پاداش میں اسے زمین پر پھینکا گیا اب وہ جرم ان کو اوپر حلال کر دیا گیا۔ اور اس طرح وہ عورت اور وہ مرد ایک دوسرے میں جذب ہوئے۔

پھر یوں ہوا۔ ہابیل اور قابیل ہوئے اور ایک خوبصورت عورت پیدا ہوئی۔ بس پھر وہی روایت دہرائی گئی۔ پہلے اس نے اس کو بہکا دیا۔ گندم کھلا دیا۔ اور بعد میں ان دونوں کو لڑا دیا۔ ایک بھائی نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ اور زمین میں دبا دیا۔ تاکہ وہی مٹی جو اس کی تخلیق کے وقت استعمال ہوئی تھی۔ اسی مٹی میں مل کر ایک اکائی بن جائے۔

بہرحال پانی بہتا رہا۔ اور اس کی ہر لہر میں سینکڑوں کہانی پوشیدہ ہوتی رہیں۔ جو وہ روانی کے ساتھ گنگناتا ہے اور کبھی دھاریں مار مار کر ڈکراتا ہے۔

اب تم کو میری کہانی سن کر ذرا بھی شک نہ ہوگا چونکہ میں تم کو وہ باتیں بتاؤں گا جو بتانے کی نہیں ہونگی اور وہ باتیں نہیں کہوں گا جو کہنے کی ہیں۔

کہانی کی درمیانی کڑی

ہاں تو ہوا یوں۔ اور میں بھی ایک مجرم ہوں اس لئے کہ میں نے اس تصویر کو رک کر دیکھا تھا۔ یہ بات قاضی نے کہی۔

لیکن سرکار یہ کیسے ممکن ہے مجرم تو نہیں ثابت ہو گیا تم اس شہر کے پہلے آدمی ہو جس نے اس تصویر کو دیکھ کر یہ کہا۔ لگتا ہے تمہارا اس تصویر سے کوئی سلسلہ ضرور ہے۔

حضور میں آپ کی ذہانت کا داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور چونکہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے میں کہے دیتا ہوں کہ میں اس عورت کو جانتا ہوں۔ اور چونکہ میرا اس سے تعلق تھا۔ اسی لئے اس کو میں نے قتل کیا ہے لیکن قتل کرتے وقت میرے ذہن میں ایک نیک ارادہ تھا نیکی کا سب سے پہلا ثبوت یہ ہے کہ جس حالت میں مقتولہ میرے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ اسی حالت میں مری بھی ہے۔ میں اس عورت کا قاتل ضرور ہوں۔ لیکن اس کی عصمت کا قاتل نہیں ہوں۔ اب میں یہ نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ اس میں بڑا قصور کون سا ہے؟ دوسرے یہ جو مال و اسباب لے کر میرے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ اس کی بھی میں نے حفاظت کی ہے

ہاں یہ بات تو سچ ہے اس تصویر سے بھی یہ بات ظاہر ہے۔ قاضی نے کہا

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

لیکن ایک بات بتاؤ کہ آخر تم نے۔

ہاں سرکار وہی بات میں بتاؤں گا کہ اصل واقعہ یوں ہے کہ ایک دن میں اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور ایک پیغام سلطان کو دے کر محل سے واپس ہو رہا تھا۔ میں نے صدر دروازہ عبور کیا اور میں دائیں ہاتھ کی طرف مڑ گیا۔ ابھی محل کی سڑک کو عبور بھی نہیں کر پایا تھا کہ ایک پیغام چھت پر سے گرا۔ دیکھئے وہ یہ ہے۔

قاضی نے ہاتھ بڑھایا۔

خوبرو نوجوان! تم پر رحمت

اچانک تم کو دیکھا اور دل دے بیٹھی۔ تمہارا یہ چوڑا چکلا سینہ، تمہارے یہ گھنگھریالے بال۔ تمہارے یہ لمبے لمبے بازو مضبوط ٹانگیں مجھے اس قدر پسند آئیں کہ میں نے تم کو اپنا شریک حیات منتخب کر لیا۔ تم آج آدھی رات کو محل کی پشت پر آ جانا اس طرف کوئی پہرے دار نہیں ہوتا میں مع اسباب کے تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اور پھر ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔ .... والسلام

جس وقت قاضی اس خط کو پڑھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی پر بیٹھنے والوں کے لئے کیا کوئی قانون نہیں۔ کسی کے ذاتی خطوط کا پڑھنا اگر جرم نہیں۔ تو اخلاقی جرم ضرور ہے بلکہ جرم، جرم بہرحال جرم ہے۔ اور میں نے بھی یہ جرم کیا کہ اس کو ساتھ لے کر شہر سے دور چل دیا۔ رات کے آخری حصہ میں ہم لوگ ایک جنگل سے گذر رہے تھے۔ کافی چلنے کے بعد میرے گھوڑے کو آرام کی ضرورت محسوس ہوئی میں بھی کچھ تھک سا گیا تھا تھکن کے آثار اس عورت کے چہرے سے بھی نمایاں ہو رہے تھے۔ میں نے اس عورت کو گھوڑے پر سے اتارا۔ گھوڑا قریب ہی باندھ دیا۔ گھوڑے کی زین زمین پر بچھائی اور اس عورت کو اس پر سلا دیا۔ اس وقت اس عورت نے اپنا نقاب الٹ دیا۔ مجھے لگا جیسے بجلی کوند گئی۔ ایک لمحہ کے لئے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے بجلی سے میرے بدن میں سرایت کر گئی ہو۔ میں نے فوراً جلتی مشعل پر اپنی انگلیاں جھلسا لیں۔ جب تھوڑا سا سکون ہوا تو اس کی طرف کمر کر کے بیٹھ گیا۔ ایک پیڑ کے نیچے اور سنگریزوں پر ندے میرے ذہن کے آسمان پر پھڑپھڑانے لگے۔ اچانک ایک پرندہ میرے ذہن سے نکل کر میرے

کانوں کے قریب اڑنے لگا۔ اس عورت سے میں شادی کروں گا
اس سے اولاد ہو گی۔ ممکن ہے لڑکی ہو۔ تو وہ بھی کسی خوبرو
نوجوان کے ساتھ اسی طرح رات کے اندھیرے میں۔۔۔۔
نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔

اچانک دوسرا پرندہ اڑا۔ جو عورت اپنے باپ کے
دامن میں داغ لگا سکتی ہے جس سے خون کا رشتہ ہے اور
میں جس سے صرف ریشمی دھاگے سے بندھا رشتہ ہو گا اس
کے دامن میں وہ داغ لگانے سے کب چوکے گی

اچانک لگا تمام پرندے میرے ذہن سے نکل کر میرے
چاروں طرف اڑنے لگے۔ میں نے تلوار کھینچ لی اور اس عورت
کو کتنے ہی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سرکار میرا قصور صرف اتنا ہے
کہ میں نے نسل در نسل چلنے والے گناہ کو قتل کر دیا ہے۔

ہاں نوجوان تم نے بالکل سچ کہا۔ دراصل اس کی ماں
بھی میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ جبکہ بادشاہ نے ایک جنگ
میں اس کے باپ کو فتح کیا تھا۔ عورت کے باپ نے کہا
جو کہ قاضی تھا

قاضی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرایا اور اس نے مجھے
آزاد کر دیا۔۔۔۔۔۔۔ خون کے بدلے خون والی سزا میرے
اوپر معاف کر دی گئی

اب تم کو میری کہانی کے ایک ایک حرف پر یقین آ گیا
ہو گا۔ اور چونکہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اور سچ بولنے کی مجھے
عادت نہیں۔ اس لئے کہ سچ بولنے کی مجھے ہمت نہیں ہے
اس لئے نہیں کہ تمہیں سچ سننے کی طاقت نہیں۔ سچ دیکھنے کی
برداشت نہیں۔ نہیں! نہیں!! سچ دیکھنے کی برداشت
ہے۔ تب ہی تو میں نے سچ کو سچ ثابت کرنے کے لئے

دلائل کا سہارا لیا۔ کتنے بزدل ہیں۔۔۔۔۔۔ ہم سب ہی
لوگ میں سے سچ دیکھا اور سب نے سچ سنا پھر بھی ہم
زندہ ہیں۔۔۔۔۔ ہم متحرک ہیں۔

اب وہ آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔۔۔۔۔۔
اب تم سوچو گے میری کہانی کا کلائمکس کیا ہے؟ جبکہ میری
کہانی کلائمکس کے بعد شروع ہوتی تھی۔ جیسا کہ میں ذکر
کر چکا ہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بے چین ہو رہے ہو
کہانی کے اختتامیہ جملے سننے کے لئے تمہارا تجسس بڑھ
رہا ہے۔ بڑھ رہا ہے تجسس تو تمہارا ابھی ختم نہ ہو گا
جب تک پانی بہتا رہے گا۔ سورج نکلتا رہے گا۔ لیکن
پھر بھی میں یہ بتا دوں کہ کہانی لکھنے کا محرک میری بیوی کا
کہا ہوا وہ آخری جملہ تھا جو میری کہانی کا آخری جملہ ہے
لیکن میری کہانی کا آخر نہیں۔

دیکھو تمہیں آگ اگلنے کی ضرورت نہیں۔ تم بھی
ڈھونڈ لو آخر کب تک ایک ہی راستہ پر مسلسل چلا جائے
ہم زندہ ہیں۔۔۔۔۔۔ متحرک ہیں۔ بیوی نے کہا۔

شروع شروع میں تو یہ الفاظ لوہے کی سوئیاں
بن کر کانوں کے پردے پھاڑتے تھے پھر لگا جیسا ان
سوئیوں نے پردوں کو رفو کر دیا ہو۔

اور پانی معمول کے مطابق بہتا رہا۔ اس میں
بڑی روانی تھی۔ بڑی تیز کاٹ تھی۔ بڑی سرخی تھی، جو نہ
رکنے کا نام لیتا تھا نہ ہی ٹھہرنے کا اور نہ ہی پلٹ
لوٹنے کا!

●●

انشائیہ

تماشائے ادب

احمد جمال پاشا

تماشا دکھانا فنکاری، مہارت، اور جسارت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لئے ایسے فنکاروں کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے جتنی کہ مداریوں کی مداری کا ذکر خیر اس لئے ناگزیر ہے کہ وہ بھیڑ اکٹھی کرنے، پبلک جمع کرنے، راہ گیروں کو خوش کرنے کے لئے نہ دعوت نامے جاری کرتے ہیں نہ گیس بتی اور لاؤڈ اسپیکر کا اہتمام کرتے ہیں۔ اہل تماشا کے سفر خرچ اور تفریحی ٹیکس کا حصول پا لیتے ہیں۔ بس میں بھائی ایک آدھ لکچر جھاڑا تماشائیوں میں سے کسی کو جمہورے بنایا، خراج وصول کیا۔ دل شاد ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔

یوں تو زندگی خود نہ ایک ختم ہونے والا مسلسل تماشا ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے جس میں ادب کم اور تماشا زیادہ نظر آتا ہے پھر میں ادب کو تماشا نہیں سمجھتا اس کے باوجود مجھے اس کے تماشے دیکھنے اور سہنے پڑتے ہیں۔ گذشتہ تجربات اور مشاہدات اور صدمات کی بنیاد پر یہ بانگ دہل دعویٰ کر سکتا ہوں کہ ؎

ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

میں اسے اہل نظر کی طرح اس وضع احتیاط سے دیکھتا ہوں کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم، ادب میں تماشہ بعد میں اور بھیڑ چال شاعری پہلے وارد ہوتی ہے جسے عام طور پر مشاعرہ برپا کرنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ جو اہل ستم ان کے محرک داعی ہوا کرتے ہیں وہ خود کسی تماشے سے کم نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں وہ بڑی تیاریاں کرتے ہیں۔ جس مسخرے کو بھی اپنے شاعرانہ عظمت اور مالی حیثیت زیادہ ہی نظر آتی ہے۔ اسے ابھارنے، بڑھانے اور تعلقات عامہ استوار کرنے کے لئے ایک اور مشاعرہ برپا کر دیتا ہے۔ از قسم فلمی مشاعرہ، کرکیٹ یا فٹ بال مشاعرہ قوالی مشاعرہ، مسخرہ مشاعرہ، وصیتی مشاعرہ وغیرہ

انتظامی اور مالی پل صراط سے سلامتی کے ساتھ گذرنے کے بعد وہ نوک پلک سے درست ہو کر صدر مشاعرہ یا اناؤنسر سے چیک کر ریڈیو پروگراموں یا کٹھ پتلی کے تماشے کی طرح مشاعرے کو اس کے فطری انجام تک پہونچاتا ہے۔ جس کے لئے وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک محترمہ ہستی از قسم لوٹا بجانی گوٹا والا کی خدمت میں مسند صدارت پیش کرتا ہے۔ وہ صدر اور اناؤنسر میں فاصلہ اس لئے رکھتا ہے۔ تاکہ صدر محترم کے خراٹے نشر ہو کر صدر اور شاعر میں تصادم کا باعث نہ بن جائیں۔ صدر کے سر پر سے پورا مشاعرہ گذر جاتا ہے مگر وہ آہ کرتا ہے نہ واہ، شاعری کے میدان میں اس کی حیثیت خالی ٹپاریوں کے مداریوں کی ہوتی ہے۔ اس کے دائیں اور بائیں پان کھلانے اور سگریٹ پلانے اور چہرے پر عذاب قبر کے آثار پیدا کرنے کے لئے وہ دو عدد ریٹائرڈ حکام بہ حیثیت مہمان خصوصی بٹھال دیتے ہیں۔ تاکہ ان کے رعب داب سے مشاعرہ بازاری منڈی میں نہ تبدیل ہونے پائے۔ ہر اندو ایک شاعر اپنی آزمودہ غزل سے چھینٹیں اڑا دیتا ہے۔ اساتذہ اور اناڑی اپنے بہترین کلام اور بدترین گلے سے مشاعرے کو ہڑبونگ میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ پورا مشاعرہ سمٹ کر صاحب مشاعرہ کی شخصیت میں جذب ہو جاتا ہے۔ شعرائے کرام معاوضے کے لئے منتشر ہو جاتے ہیں۔ تماشا کی تحلیل ہو جاتے ہیں۔ کامیاب شاعر صاحب مشاعرہ کے ساتھ غرق مے ناب ہو جاتے ہیں۔ تماشا ختم، پیسہ ہضم۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

ادبی کانفرنس بھی کسی تماشے کم نہیں ہوتیں۔

ادیبوں میں کچھ ایسے بھی مفکر ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو رنگار ادب۔ ادیبوں کے یوم پیدائش، وفات، جشن جبلی کا براہ راست ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہیں بڑے لکھاڑا اور منہ زور ادیبوں اور ادب نوازوں کو خیر سگالی تبادلے کے لئے انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

دعوت نامہ ایک تہذیبی اور معاشی عمل ہے۔ جس میں من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔ اور بل آف ایکسچینج کے اصول پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ کانفرنس کے تمام ہی اجلاسوں کا پروگرام بڑی احتیاط سے تیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ دور دراز سے آنے والوں یا شامت کے ماروں پر میزبانوں کی ادبی حیثیت و عظمت مسلم ہو سکے۔ مجلس الصدور میں میزبان، نظامت میں میزبان ہر اچھے موقع پر میزبان اور برے کے لئے مہمان یا مندوب کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے لئے میزبان کی بزرگانہ جھڑکیوں اور داد بیانہ پینتروں سے کام لیا جاتا ہے۔

گذشتہ ہفتہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں بہ نفس نفیس مجھے شرکت کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ جس کی خبروں اور تصاویر سے بڑے بڑے اخبارات تک کے پیٹ پھول گئے تھے۔ اس کانفرنس میں بشمول ۲ لاؤڈ اسپیکر اور مجھے ملا کر کل چھ نفوس تھے۔ جن میں پانچ اللہ کے بندے کانفرنس کے کارکنان قضا و قدر تھے۔ اس کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لئے ایک ممتاز اور انتہائی ہر دل عزیز فلمی ستارہ تشریف لا رہا تھا۔ اس کی تشریف کا ٹوکرا جب کانفرنس ہال کے پھاٹک سے دو چار قدم رہ گیا اور دو چار ہاتھ لب بام والا معاملہ ہوا۔ تو قسمت کی کمند ٹوٹ گئی۔ استقبال کرنے والے ہزاروں شرکا کے ہجوم سے اس کی حرکت قلب بند ہونے یا حبس دم کا عمل شروع ہو گیا۔ پرستاروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ صدر اسپتال پہونچا دیا۔ اب صورت حال کچھ یوں

تھی کہ علمی ستارہ کے جھرمٹ بھی پوری کانفرنس اسپتال
کے راستے کو جام کئے ہوئے تھی۔ اور کانفرنس ہال میں
اسپتال والا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مایوسی کے عالم میں منتظمین
میں نے یہ تجویز رکھی کہ کانفرنس اسپتال ہی میں شروع کر دی
جائے۔ جسے اسپتال والوں نے بعد رشک یہ مسترد کر دیا۔ ادبی
کانفرنس دراصل ایک جوا ہوتا ہے جس میں بازی ہاری بھی
جا سکتی ہے جیتی بھی۔ اور پیسہ پھینک کر تماشہ بھی دیکھا جاتا
ہے۔

سمینار، سمپوزیم، ادب کے ایک اکھاڑے ہلکی پھلکی
ادبی مشقوں کے لئے برپا ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ذہنی جسمانی
ورزش کی تکمیل فی الفور ہو جاتی ہے۔ اگر سمینار اور سمپوزیم
نہ ہوں تو غالب اور اقبال کی چھاؤں تلے بیٹھ کر یہ کیسے
ہو سکے کہ فلاں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دلانے کے لئے کس کی
جگہ کس کو بلوایا جائے۔ جو رائی دا میں کاٹ نہ ہو سکے۔
کس کی لکچررشپ عارضی سے مستقل کیسے ہو۔ کس کی ریڈر
شپ کیسے ہڑپ کر لی جائے، پروفیسرشپ کے لئے کون سی
تکڑم کی جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے
ہر کانفرنس میں مذہبی، علاقائی، خاندانی اور ریاس
ٹیائی بنیادوں پر صد ہا مرحلہ شوق طے ہوتے ہیں۔ سامنے
معصوم دھار تقریریں ہوتی ہیں۔ چبا چبا کر مقالے پڑھے
جاتے ہیں۔ بڑھ چڑھ کر اسٹیج چڑھا چڑھا کر فکر و نظر
کے دریا کئے جاتے ہیں۔ مگر اصل سمینار اور سمپوزیم
رات کو مہمان و میزبان کے کمرے میں ہوتے ہیں۔ بقول شخصے
سمینار اور سمپوزیم کا اصل سٹنڈ رات کی تنہائی میں ہوتا
ہے۔ اور بڑے بڑے سودے اشاروں اشاروں میں ہو
جاتے ہیں۔

ادبی تماشوں میں ٹیپ کا بند ادبی تقریب، یا
شعری، ادبی، ہنگامی نشستوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا
ہے۔ جس کے لئے ڈھونڈ ڈھانڈ کر عذر ہنگامہ وجہ بلوہ
تلاش کی جاتی ہے۔ چن چن کر برسر اقتدار اور صاحب کرسی
عزت مآبوں کو برآمد کیا جاتا ہے۔ چونکہ مجمع اہل زبان کا
ہوتا ہے۔ اس لئے بے زبان کرسیوں پر بیٹھا دیئے جاتے ہیں
گوشت کے بورے سجا دیئے جاتے ہیں احتیاطاً اس لئے
بھی ضروری ہے کہ اگر پڑھا لکھا لے آئے تو اس کی رائے
خراب نہ ہو جائے۔ پڑھائی لکھائی کا بھرم نہ کھل جائے۔ اگر
اس نشست یا تقریب کا تعلق اردو مرحوم سے ہے تو صدارت
کرنے والے مہمان یا مدعوین خصوصی یا وی آئی پی حضرات
راجستھانی جانے ہوں گے۔ گجراتی کے ماہر ہوں گے۔ اڑیہ
کے عالم ہوں گے، انگریزی میں فاضل یا پشتو میں فاضل
اجل ہوں گے۔ بلوچی، بنگلہ، یا سندھی ادب کے کل سرسبز
ہوں مگر ٹوٹی پھوٹی اردو پر بھی قادر نہ ہوں گے۔ عموماً
ہر وی آئی پی جب یہ فرماتا ہے کہ:-

> میں اردو بھاسا کا جانکار نہیں......
> اخبال صاحب سے مسٹر بھاسکر نے پچھلے
> سیتمبر میں میل ملاپ کرا دیا تھا۔ ان کی ساری
> تو بڑے اونچا پائے کی نکل گئی ہے....
> .....گالب صاحب کی آپ نے تصویر
> تو بڑھیا لگا دی۔ ایسا کلاسیکل آدمی
> اس کو تو یہاں ہونا چاہئے تھا ریاستی
> پنشن دیتے مگر اسے جرور بلواتے۔ بڑی
> خراب بات ہے آرٹسٹ کو کھیال رکھو
> ہاتھوں ہاتھ لو۔ میں ساہر ساہتہ کار کوئی
> لوگ باگ کر ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں
> سکسپیر کا کھیال کیا گیا کیا تاپ کا نکل

گیا۔ میں اردو نہیں جانتا۔ مگر سائیں ! فیض
صاحب آپ کے اچھے شاعر گذرے ہیں آج
آپ ان کا یہاں پر ڈے منا رہے ہیں۔
بڑی خوشی کی بات ہے آپ کو ان کے
دکھائے ہوئے راستے پر چلنے رہنا ہے

............!

تک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا یہ زبردست تالیاں
ہیں۔ اہل جلسہ میں غالب اور اقبال سے ملاقات کا
ن اور فیض کے ادبی عرس کا جذبہ انگڑائیاں لینے

...

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ گردون عمر کی گھڑی
ہ اور غافل عمر کے بڑھنے اور بڑائی کا پہاڑ بنانے
ی نہ فرصت ملی ہے نہ ملے گی۔ جب بربادی وقت کی
لذت فکر و نظر کے بجائے ہاتھ آئے تو خود بخود طبیعت
کی جانب مائل ہونے لگتی ہے۔ لیکن دہشت پسندی
ل سے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ میں اپنی لائبریری
نہ گیر ہو جاتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ باہر کی
ی تنگ و تاریک تھی جس میں بسم اللہ کے گنبد میں
پاول پر قل ھو اللہ لکھ رہا تھا۔ مگر میری لائبریری
سیع اور بے کراں کائنات ہے۔ علم و عقل سے
، ہر کتاب مان ٹیسن سے وزیر آغا تک سر ابنیٹر
یالان کپور تک بے شمار پیر روشن ضمیر جن کی ہر
دانش کا ایک نیا باب جس بصیرت اور مسرت
ن تازہ ہے۔ دنیا کا ہر موضوع ہر میدان، علم کی ہر
۔ ادب۔ فلسفہ۔ مذہب اور فنون لطیفہ میں گھتال
کشائی ہوتی ہے۔
میرا وجود ایک رنگ برنگ خوشنما غبارے کی طرح

یا
عالمی فضاؤں میں اس وقت تک قندیل کی طرح پرواز کرتا
رہتا ہے۔ جب تک کہ تلاش ادب میں بھٹکتا ہوا کسی نئے
ادبی تماشے کی صف سامعین میں نہ پہونچ جاؤں۔ پھر
قندیل بجھ جاتی ہے۔ غبارے کی طرح ہوا نکل جاتی ہے
کیونکہ میں غلطی سے باہر کی تنگ و تاریک دنیا میں بھٹک
کر پہونچ گیا تھا۔ اور پھر میں اپنی دنیا میں واپسی کے لئے جلد
جلد شروع کر دیتا ہوں۔ ●

مطبوعات دی کلچرل اکیڈمی، گیا

زاویۂ نگاہ	خلیل الرحمٰن اعظمی	-/۲۰
درخشاں	حفیظ بنارسی	-/۵
بابا لوگ	غیاث احمد گدی	-/۱۰
اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	-/۳۰
انتخاب کلام جمیلؔ	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	-/۷
لمحوں کا سفر	ڈاکٹر نرمدیشور پرشاد	-/۱۰
عکس	نثار احمد صدیقی	-/۱۰
احتشام حسین نمبر	مرتب: کلام حیدری	-/۲۵
آہنگ کا فکشن نمبر	مرتب: کلام حیدری	-/۳۵
صفر	کلام حیدری	-/۱۰
الف لام میم	کلام حیدری	-/۱۵
فراز دار	کلام حیدری	-/۳۰
برملا	کلام حیدری	-/۱۵
مزامیر	کلام حیدری	-/۱۰

دی کلچرل اکیڈمی، جگجیون روڈ، گیا

اختر یوسف

دھوپ

۷ نظمیں

(۱)

دھوپ
جنگلوں میں
شاخ در شاخ
مکڑیوں کے جالوں سے لپٹی ہے
مکڑیوں کے جالوں سے
جانے کتنے قدیم قصے جھانکتے ہیں

(۲)

بارش کے بعد
تمہیں چھت پہ دیکھا
کتنی پیاری
دھوپ کھِلی تھی

(۳)

بوڑھی دھوپ
سرِ شام
لاٹھی ٹیکتی
لمبے چوڑے میدانوں سے ہوتی ہوئی
دور گھنے اندھیرے جنگلوں کی طرف
دھیرے دھیرے جا رہی ہے

(۴)

دھوپ کی ایک فاختہ
اونچی ٹہنی پہ بیٹھتی ہے
زور سے ہوا ..... چلتی ہے
پتوں پہ فاختہ
ناچتی ہے

(۵)

دھوپ
نیم کے پیڑوں سے ہو کر
آئی ہے
بہت کڑوی ہے

(۶)

تاریک کمرے میں
چڑیا
کھڑکی کی جھلیوں کو
لانگ آئی
کمرہ چمکنے لگا
چڑیا کی چونچ میں
دھوپ کا ایک ٹکڑا تھا

(۷)

دھوپ دھوپ چلتی ہوئی
گاؤں کی گوری
سبز سبز کھیتوں کے بیچ
لال لال گلاب سی

آب زم زم

روم کی بتی بجھائی، ریک پر رکھدی کتاب
مون لائٹ آف کرکے میں نے چاہا سو رہوں اب تھک گیا ہوں
دیکھتا ہوں
ایک عورت سو رہی ہے بے خبر
اور اس کے جسم پہ
ٹوٹ کر بکھرا ہوا ہے خواب کا اک ریگزار
سینے سے لپٹا ہوا ہے شیر خوار
یوں ہی تو حیرانیاں دیتا ہے عزرائیل کو
آب زم زم جب عطا کرتا ہے اسمٰعیل کو
نیند آنکھوں میں نہیں پر تو رد کا ! !

فسادزدہ ۱۹۸۱ء کی نظم

کراں تا کراں پھیلا یہ کرّہ باد ہے صحرا
زمیں ایک بھٹکا مسافر
زمیں
سرد تاریک میں
چمکتی امیدوں کو مرکز بنائے
لپکتی ہوئی ڈالیوں، پتیوں سے الجھتے ہٹاتے ہوئے
راستہ ڈھونڈتی چل رہی ہے
کراں تا کراں پھیلا یہ کرّہ باد ہے ایک صحرا
کہیں گونجتی ہیں درندوں کی بھوکی صدائیں
کہیں غول در غول ہیں وحشی کتے کہ مٹی کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔
زمیں ایک بھٹکا مسافر ہے کتوں سے بچتی ہوئی راستہ ڈھونڈتی ہے
عراق اور ایران، برطانیہ اور بیروت، ہندوستان
پڑے سڑ رہے گوشت کے لوتھڑے ہیں۔
زمیں کے دریدہ بدن کی،
یہ کتوں کی نوچی ہوئی دھجیاں ہیں۔

صفدر

قطعات — کرشن موہن

نیا انداز

قوافی کے سہارے جی رہے ہیں
ردیفوں کی گلابی پی رہے ہیں
غزل کا چاک داماں کرشن موہن
نئے انداز سے ہم سی رہے ہیں

سوداگر الفاظ

کیوں نہیں تجھکو مفاہیم و معانی کی تلاش
کرشن موہن عاشق مضطر ہے تو الفاظ کا
شاعری میں منصب سودائی ہے ارفع مگر
اس کا کیا کیجئے کہ سوداگر ہے تو الفاظ کا

کلاسیکی موسیقی

میں ہوں موسیقی کلاسیکی ہے باریکی مری
مرا حسن ناز پروردہ بہت غمگین ہے
میں چمکتی ہوں مگر مغلوب ہے میری چمک
دوپہر کو جیسے پورا چاند تکتی نہیں ہے

محیط و بسیط

کتنا پُر موضوع و پُر فن تیرا بوقلموں سخن
ترجمان عشق کاوش مشرب و جنون نشیط
داستان رنج و غم روداد آہنگ و سرود
کرشن موہن شعر تیرے سارے عالم پر محیط

مُنادِر میں بُنادِر

نگاہوں میں شباب فتنہ خو کے
وہی مچلے مناظر ناچتے ہیں!
دلوں میں منزلوں میں کرشن موہن
تمنا کے نظارے ناچتے ہیں!
یہ تشبیہہ اور یہ الفاظ کیا خوب
"مُنادِر" میں "بنادِر" ناچتے ہیں

غزل

تری ہوس، مری بیچارگی سلامت ہے
بہ ایں تضاد، بہت کچھ ابھی سلامت ہے

جلا ہے شہر تو کیا، کچھ نہ کچھ تو ہے محفوظ،
کہیں پہ راکھ، کہیں روشنی سلامت ہے

کہیں کہیں کوئی چہرہ سجا بجا یا ہوا !
کہیں کہیں کوئی کھڑکی گلی سلامت ہے

نہ پوچھ جو گزری شمشاد قامتوں پہ یہاں
کہیں کہیں کوئی سرو سہی سلامت ہے

یہ دور پاس جنازوں کے پھول کی بارش
خدا کا شکر، بہار آج بھی سلامت ہے

حساب کون کرے روح کی خراشوں کا
ہیں مطمئن کہ لبوں کی ہنسی سلامت ہے

یتیم ہی سہی، سپنوں سے دل کو بہلائیں
کہ باغ اجڑ تو گئے تازگی، سلامت ہے

نصیب تو اب ہے اسی آنگن کی دھوپ میں جلنا
کہاں وہ چھاؤں بھی دیوار کی سلامت ہے

دلوں کی دھڑکنیں بازار چل کے بیچ آئیں
کہ اپنے پاس تو پونجی یہی سلامت ہے

تو زاد دشت ہے ہمیں رخت بے مکانی کا
یہ کم نہیں، غم آوارگی سلامت ہے

ہوا تھی تیز، چھتیں اڑ گئیں مکانوں کی
وہ اک چٹان سروں پر جو تھی سلامت ہے

اذاں کے بول نے دہلیز خوں پہ دم توڑا
کہاں دعاؤں کی پاکیزگی سلامت ہے،

نہ ٹوٹا سلسلۂ رائیگانی بسیار !
یہی بہت ہے ابھی آدمی سلامت ہے

رہو نہ بے خبر اتنے، کہ جان لے لے گی
وہ آگہی، جو پس آگہی سلامت ہے

ابھی تو آگے نئے سلسلے ہیں ہجرت کے
ملیں گے تم سے اگر زندگی سلامت ہے

میں پھر بھی زندہ ہوں یہ بھی ہے ایک المیہ
جسے تھا ٹوٹ بکھرنا وہی سلامت ہے

فضا ابن فیضی

غزلیں

ہنر جو طالبِ زر ہو، ہنر نہیں رہتا
محل سرا میں کوئی کوزہ گر نہیں رہتا

بچھڑتے وقت کسی سے، ہمیں بھی تھا یہ گماں
کہ زخم کیسا بھی ہو عمر بھر نہیں رہتا

وہ کون ہے جو مسافر کے ساتھ چلتا ہے
خیالِ یار بھی جب ہم سفر نہیں رہتا

میں اپنے حق کے سوا مانگتا اگر کچھ اور
تو میرے حرفِ دعا میں اثر نہیں رہتا

جسے بناتے سجاتے ہیں جس میں رہتے ہیں
سویرے آنکھ کھلے تو گھر نہیں رہتا

ہم اک شب میں کئی خواب دیکھتے ہیں سو اب
وہ آ کے خواب میں کبھی رات بھر نہیں رہتا

کچھ اور بھی گزر اوقات کے وسیلے ہیں
گدا خزینۂ کشکول پر نہیں رہتا

کمال لوگ بھی کیا ہیں گماں یہ رکھتے ہیں
جو بس گیا ہو کہیں در بدر نہیں رہتا

ان ہی لکیروں میں گم ہیں کہانیاں کیسی
خزانہ دار ہیں خالی ہتھیلیاں کیسی

گھروں کی جاگتی راتوں سے دور پانی میں
گزار دیتے ہیں راتیں جہازراں کیسی

یہاں دھواں ہے مشینیں ہیں اور انساں ہیں
زمین اب تجھے لگتی ہے آسماں کیسی

یہ کیسے زخم سرِ شام جاگ اٹھتے ہیں!
گڑی ہیں دل میں یہ نادیدہ برچھیاں کیسی

ہمارے ہونے نہ ہونے سے ہیں یہ سب موسم
رہے نہ ہم تو کہاں فصلِ گل، خزاں کیسی

صنوبروں کے تنوں پر کھدے ہوئے یہ نام
سنے کوئی تو سنائیں کہانیاں کیسی!

کراں دلی ہے کہ یادوں کا اک پری خانہ
ہیں رقص میں یہ پری زادیاں یہاں کیسی!

حسن اکبر کمال (پاکستان)

تین غزلیں

عین تابش

خود غرضیوں کا قہر ہے نفرت ہے شہر میں
معدوم اب کے جنسِ محبت ہے شہر میں

مدت سے خواہشوں کا دریچہ کھلا نہیں!
مجبوریوں کا نام ضرورت ہے شہر میں

جی کھول کر کسی سے بھی ملتا نہیں کوئی!
اک رسم ہے کہ جینے کی صورت ہے شہر میں

ہر آدمی ہے لمحۂ موجود کا نقیب
گزرے دنوں کی یاد قیامت ہے شہر میں

ہر شخص مبتلا ہے مشینوں کے قہر میں
اب کس کو عشق کرنے کی فرصت ہے شہر میں

ویرانیاں ہیں، خوف ہے آنسو ہے شہر میں
ایسا خشوعِ وقت کا جادو ہے شہر میں

کس کس سے اپنے شوق کا دامن بچاؤ گے
مکاریوں کی دھوپ تو ہر سو ہے شہر میں

بس ایک لمحہ راحتِ جاں اور سکونِ دل
جب یہ لگے کہ ساتھ مرے تو ہے شہر میں

اے موسمِ جنوں مرے دے لذتِ فراق
اب تو ہے ساتھ نے تری خوشبو ہے شہر میں

سب جا چکے ہیں گزرے ہوئے موسموں کے ساتھ
اب کوئی گلبدن نہ پری رو ہے شہر میں

اک بددلی سی سب کو گوارہ ہے شہر میں
جھوٹی رفاقتوں پہ گزارہ ہے شہر میں

لوٹ چکی دیارِ غریبی میں اب تجھے
اے میری جان کس کا سہارا ہے شہر میں

کوئی کسی سے حال یہاں پوچھتا نہیں
کیسی اداس شام گزارا رہے شہر میں

ایسا نہ ہو کوئی ہمیں پہچان لے یہاں
ہم نے بھی خود کو کتنا سنوارا ہے شہر میں

غزلیں

بھیڑیے اور اشتراک شدہ!
بیچ میں اک ہرن ہلاک شدہ

قطرہ ہائے لہو تمام ہوئے
دوستوں کا حساب پاک شدہ

دن ملائم ہوا زخموں سے
رات اشکوں سے تابناک شدہ

زلزلہ بال و پر میں آیا ہے
اور اک آسماں خاک شدہ

یوں بھی دلّی میں لوگ رہتے ہیں
جیسے دیوان میر چاک شدہ

اے مظفر سبھی ہیں بستی میں
ناوکِ غم سے انسلاک شدہ

مظفر حنفی

تیری بزمِ ناز سے پہلے جہاں ایسا نہ تھا
یہ زمیں ایسی نہ تھی یہ آسماں ایسا نہ تھا

قید کر لیتے جسے ہم یاد کی زنجیر میں!
اک لمحہ بھی کوئی آرامِ جاں ایسا نہ تھا

وہ تو یہ کہیے کہ تھی غم آشنا فطرت مری
ورنہ تیرا غم حقیقت میں گراں ایسا نہ تھا

کون دیتا پھر مرے بے ربط خوابوں کو زباں
اس زمانے میں کوئی تعبیر داں ایسا نہ تھا

ایک بستی سی بسی تھی مری آنکھوں میں مگر
میں جسے اپنا کہوں کوئی مکاں ایسا نہ تھا

سیّدہ شان معراج

غزلیں

تخئیل کے صدف پہ نہ اظہار یار لکھ!
ہاتھوں پہ رنگ خوں سا لیکن غبار لکھ!
تجھ کو ہے ناگوار اگر بات میری
مجھ کو بھی بار بار فقط ناگوار لکھ

ایسا ستم نہ سوچ فقیروں کی بات پر
تو وقت کی کتاب پہ میرا شمار لکھ
رکھو نہ دامن پہ کوئی ایک حرف بھی
ہنستی تو ہے قریب اسے بار بار لکھ!

اڑتا ہوں میں غبار کی صورت لہولہان
مجھ کو رہ فلک پہ کوئی پا فگار لکھ
بکھرا پڑا ہے آنسوؤں کا جسم جابجا
اب فکر کی تلاش کو دل کا غبار لکھ

اڑتی ہیں خوشبوئیں سی جو وادی میں بےقرار
ان کو نشان آمد فصل بہار لکھ!
سر پر ازل سے تاج صعوبت ہے جلوہ ریز
تخت غم و الم کا مجھے شہریار لکھ

احمد، ساحل

ستارۂ ہجر بھی تیرے وصل کا نشاں تھا
مجھے تو ہر ایک پھول پر شمع کا گماں تھا
قدم کسی لہر کی روانی پہ رک گئے تھے
مگر وہ دریا بھی اسی شان سے رواں تھا

تمام بستی سکوں کا سانس لے رہی تھی
یہ شام تھی یا تیری محبت کا سائباں تھا
چراغ کی لو ذرا سی اونچی ہوئی تو دیکھا
میں اپنے گھر میں تھا اور اپنا ہی مہماں تھا

ستارے اپنے وجود میں راکھ ہو رہے تھے
مگر ابھی روشنی کا امکان ہی کہاں تھا
میں اپنی آنکھوں کو اپنے ہمراہ کیوں نہ لیتا
کہ اس اندھیری گلی سے باہر بھی آسماں تھا

اسے بھلانے چلا ہوں تو سوچتا ہوں ساجد
کبھی کبھی تو وہ شخص بھی کتنا مہرباں تھا

غلام حسین ساجد (پاکستان)

غزلیں

صحنِ گلشن میں ہوا کے جھوم کر صرصر چلی
چھیڑتی پھولوں کو دل کو صورتِ خنجر چلی

جسم کو جب میں نے غم کے پیرہن سے ڈھک لیا
ہر خوشی دنیا کی مجھکو ڈھونڈتی گھر گھر چلی

زخمِ دل مہکا تو خوشبو سے فضا بوجھل ہوئی
میرے گھر میں فصلِ گل کی رسم یہ اکثر چلی

شہر میں تنہا کھڑا اِتنا عزمِ محکم کا وجود
سب ہوائے تیز لے کر ہاتھ میں پتھر چلی

بھولی بسری یاد میرے دل میں آوارہ پھرے
در بدر کوچہ بکوچہ جھانکتی شب بھر چلی

درد کی تصویر آویزاں لگا ہوں میں رہا
سر خوشی کی لہر جب احساس کے اندر چلی

کاروانِ شوق [illegible] سوئے منزل جب چلا
راہ خود منزل بہ منزل پیش رو بن کر چلی

احمد سعدی بنگلہ دیش

آنے والا ہے کوئی شہر میاں!
جھیل ہی لیں گے یہ بھی قہر میاں!

راستہ اب طویل جتنا ہو
پالو تو سے پی چکے ہیں زہر میاں

ہم کہ اس رات کا زیاں ٹھہرے
نیند کیوں ہو گئی بے مہر میاں

دھند میں گم ہوئے سبھی منظر
خواب آنکھوں میں لہر لہر میاں!

رات بھر سر میں گونجتے لمحے!
میں ساکت خنک سی لہر میاں!

پیچ در پیچ سوچ رہا ہوں پھر!
بھیڑ کی سمت سارا شہر میاں

میں ہی صحرا قدم رہا ورنہ!
وہ تو پھیلا تھا بحر بحر میاں

عبداللہ کمال

ہجر کی راہ میں یادوں کا حصار آ جائے
جیسے "شب جھیل" میں دیپوں کی قطار آ جائے
ساری آنکھیں کسی بے خواب چمک میں کھو جائیں
شام ان ملگجے کپڑوں کو اتار آ جائے
ایک شاعر اب کہسار پہ سوچیں لکھے
اور اک سنگ کے سینے میں ابھار آ جائے
لوگ احباب کی فہرست لکھا کرتے ہیں
کاش ہم کو بھی رقیبوں کا شمار آ جائے
چاند کا رات کے پانی سے بہلنا دیکھیں
اس سے کہنا کہ وہ اس جھیل کے پار آ جائے
بعد مدت کے یوں لوٹا ہوں وطن میں جیسے
پالکی راہ میں لٹوا کے کہار آ جائے
جسم سے جسم لڑیں اور شرارے پھوٹیں
آج جنت کے خرابوں میں بہار آ جائے
شاخ اس وہم میں رہ رہ کے لچکتی ہوگی
شاید اس کرب پہ طوفاں کو پیار آ جائے
غرق جب ہونے لگوں بحر خودی میں شہپر
بحر کے خشک جزیروں سے پکار آ جائے
میرے گھر سر بہ زمیں وقت یوں آیا شہپر
جیسے اک بھیل کی کٹیا میں شکار آ جائے

شہپر رسول

غزلیں

خود اپنی زد پہ جو اک عمر بھر رہا تو میں
اگر شکار گمان خطر رہا تو میں

وہ آنکھ دیکھتی کیا تھی تمام آئینہ بند
شکست شیشہ پہ قطرہ نظر رہا تو میں

وہ خواب نذر خوش ہو کہ لمس موسم سخت
زوال خوردہ ریزہ سفر رہا تو میں

تمام ہجر کے موسم، تمام وصل کی رت
اک اضطرار صفت شعلہ سر رہا تو میں

سمو لیا ہے طور اب دل نفی آباد
خود اپنی نظروں میں جو معتبر رہا تو میں

کرشن کمار طور

تبصرہ

نام کتاب : بے ارادہ (افسانہ)
مصنف : جوگندر پال
قیمت : ۳۵ روپے
ناشر : زمزم بک ٹرسٹ وشواکرمانگر شاہدرہ دہلی
مبصر : علی احمد فاطمی

جوگندر پال اردو کے ان اہم افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو عرصہ طویل سے اپنے آپ کو افسانوی ادب سے وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اس درمیان انہوں نے اردو کو بہت اچھے اچھے افسانے دیئے ملک سے باہر نکلے تو ایسی جگہ رہے جس نے خوب خوب تجربے دیئے احساسات کو جگایا اور تخلیقیت کو بیدار کیا۔ پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کے خوب خوب مواقع دستیاب ہوئے۔ نتیجتاً صرف افسانے ہی نہیں لکھے بلکہ افسانہ سے متعلق بحیثیت تخلیق کار ایک رائے رکھنے کی اور بلا حجاب و تکلف اظہار کرنے کی کوشش کی۔ جس کی وجہ سے جوگندر پال کو اپنے عہد کے دیگر افسانہ نگاروں کے مقابلہ قدرے انفرادیت ملی۔ لیکن جوگندر پال نے اس انفرادیت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ بڑے سلیقے سے اس کا استعمال کرتے رہے ــــــــ درمیان میں افسانے سے متعلق کافی اتھل پتھل مچ گئی۔ بیچارہ افسانہ جو بڑی تیزی اور چابک دستی کے ساتھ اپنا فنکارانہ سفر طے کر رہا تھا۔ اکدم سے الجھ گیا اور اچانک اسے بڑی اونچ نیچ کا سامنا کرنا پڑا۔ تمام افسانہ نگار بھی الجھ گئے۔ معقول فنکار بھی الجھے اور جوگندر پال بھی الجھے۔ اس نام نہاد الجھن کا جس کا سلسلہ اب تک برقرار ہے اچھے بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے۔ کم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اس دریائے غلاظت سے بچا رکھا ہو۔ جو نہ بچا سکے ڈوب گئے یا کسی دوسری راہ پر لگ گئے۔

جوگندر پال کے ساتھ ایسا تو نہیں ہوا۔ کہ وہ اس دلدل سے صاف بچ نکلے ہوں۔ پھنسے وہ بھی، اور ایک زمانے میں گلے گلے تک اتر گئے تھے۔ لیکن ذہین اور طباع ہونے کی وجہ سے ساحل پہ آ لگے۔ اور اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ "بے ارادہ" کی اشاعت اس بات کی ثبوت ہے جو اپنی نسل کے افسانہ نگاروں کا اس وقت اکیلی تازہ ترین اشاعت ہے۔

جوگندر پال کا گزشتہ مجموعہ "بے محاورہ" کچھ دنوں قبل چھپ کر آیا تھا۔ اور اس سے چند دن قبل لیکن اور اب "بے ارادہ" تیزی سے ان مجموعوں کی اشاعت، ان کے عنوانات، ایک عمدہ کہانی، ایک کمزور کہانی، پھر ایک عمدہ کہانی، پھر ایک کم عمدہ کہانی، پھر ایک خراب کہانی کا یہ ربط سا تسلسل ہمیں بتاتا ہے کہ جوگندر پال ابھی تک

گیا

دورا ہے [illegible] نہیں رہا۔ جہاں آج سے قبل "لیکن" اور "بے محاورہ" کی کہانیاں لکھتے وقت کھڑے تھے
ذرا سا تھکے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دورا ہا صرف جوگندر پال کے لئے نہیں بلکہ اس وقت کے تمام
انہ نگاروں کو پریشان کئے ہوئے تھا ــــ ایک ایسا دورا ہا جس کا ایک راستہ اس میدان کی طرف جاتا ہے
ماضی قریب کے تذ آور انسانوں کی تذآور قطار در قطار کھڑی ہے جو اپنے فنکارانہ رس اور افسانوی حظ میں ڈوبے
تک فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ان کا خالق بڑا ہے یا وہ جس نے ان کے خالق کی تخلیق کی ہے ــــــــــــــــــــ
سری طرف وہ افسانے ہیں جن پر انحراف اور انتشار، کا رنگ اس قدر غالب ہے اور اس پر دھوئیں، گرد، خون
پرتیں اس قدر جمی ہوئی ہیں۔ دھوکہ اور فریب کی ایسی چادر چڑھی ہوئی ہے کہ جس کی اصلیت کی پہچان مشکل ہے
سب کچھ ہے لیکن ماضی قریب کے افسانوں جیسی کوئی بات نہیں ہے پھر بھی وہ افسانہ ہے اس سے انکار تو
مشکل ہے کہ وہ افسانہ نہیں ہے۔ لیکن کیسر مختلف اپنی ایک شکل لئے ہوئے جسے ہم نے جدید زندگی اور رجحان
[illegible] دین سمجھ کر خواستہ یا ناخواستہ گلے سے لگا لیا ہے۔ لیکن یہ بے دلی اور بے نیازی کب تک ؟

جوگندر پال اپنی ذہانت اور تیزی سے تبدیلی صورت کو سمجھ لینے کی ہنرمندی کی وجہ سے اور ایماندارانہ طور پر
اپنے آپ کو وقت کے ساتھ بدل لینے کی کیفیت کو دوچار ہو کر ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بن گئے۔ لیکن
زندگی کے بے پناہ تجربے اور مشاہدے، اکیثر مطالعے نے شخصیت کی ایمانداری نے ان کے ذہن کو گرم اور تخلیقی رو کو
طرح بھی بے حد تیز اور شارپ (SHARP) کر رکھا ہے۔ جس کو وہ اپنے ہم عصروں کی طرح زنگ لگنے کے بجائے اپنے
[illegible] کے ساتھ استعمال کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ ایک فنکار کا دیانت دارانہ تخلیقی عمل ہے۔ جو اسے اپنی
باصرت اور عبادت کے ذریعہ بلا تکلف جدوائمیت کے قریب لاکھڑا کرتا ہے "چھوا، بازیافت، کتھا ایک پہیلی
اور اب جادو، پناہ گاہ، بے گوراہ" کی مثالیں ہیں۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ "بے ارادہ" "میں بھی" لیکن "اور "بے محاورہ" کی طرح ملی جلی کہانیاں ہیں۔ مجموعے کا
پہلا افسانہ قیامت، کا اثر انگیز افسانہ ہے۔ اس افسانے کو پڑھنے کے بجائے کبھی جوپال کی زبان سے سنئے خود بخود
[illegible] معلوم ہوگی۔ نچلے طبقہ کا کردار بھابھو کی نفسیات کی ایسی بھرپور گرفت جوگندر پال کے افسانوں
میں ہی نہیں بلکہ اس عہد کے تمام افسانوں میں مشکل سے نظر آتی ہے۔ ایک دکھی اور غریب زدہ عورت کی بے بسی
اور بے بسی میں ڈوبی خود کلامی اور ساتھ میں بے جان اشیا سے جاندار گفتگو ــــ لاچاری میں ڈھلتی ہوئی سوچ
عادتوں کی سوچ۔ ان سب کا فنکارانہ طور پر مصور ہونا ایک زندہ فنکاری کا ثبوت ہے۔ جس کے لئے جوگندر
پال مبارکباد کے مستحق ہیں پہلا افسانہ سے جو تاثر ملتا ہے وہ غیر معمولی ہے دوسرا افسانہ بھی تقریباً اسی طرح کے
کردار کے ارد گرد گھومتا ہوا افسانہ ہے۔ لیکن اس میں وہ جادو نہیں پیدا ہو پاتا جو پہلے افسانے میں ہے۔ تیسرا افسانہ
نسبتاً کمزور ــــ ممکن نہیں کہ یکے بعد دیگرے تمام افسانے اچھے ہوں۔ اچھے اور کم اچھے افسانوں کا ہونا فطری ہے

لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک کا کم اچھا ہونا دوسرے اچھے افسانوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب پہلے افسانے نے دل و دماغ جیت لئے ہوں۔ آنکھوں میں اعتبار جاگ اٹھا ہو۔ جس طرح سے افسانہ نگار کے تخلیقی مراحل ہوتے ہیں۔ اسی طرح قاری کی قرات کی بھی نفسیاتی گتھیاں ہوتی ہیں۔ جنہیں افسانہ ہی سلجھاتا ہے۔ اور پھر افسانہ ہی الجھا بھی دیتا ہے۔

پناہ گاہ پڑھ کر منٹو کی یاد آ گئی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ ذہن میں دوڑ گیا۔ پناہ گاہ کو پڑھنے کے بعد ایک بار پھر ذہن ماضی قریب کے افسانوں کی طرف چلا گیا۔ جب تقسیم ہوئی تھی، کشت و خون ہوا تھا۔ تعصب کے دریا میں انسانیت بہہ گئی تھی۔ وہی زبان، وہی لہجہ، سب کچھ وہی۔ متوسط قصبات کی زندگی۔ اس کے کردار، ان کا اٹھنا بیٹھنا، آپس میں میل محبت، لیکن ان سب پر اس وقت کی زہریلی فضا غالب تھی۔ جس کی دھند میں سب چھپ جاتا تھا۔ اس کہانی میں بھی یہی ہوا۔ آپسی محبت، بھرا ہوا کلیجہ بھرے بازار میں ذرہ سی بات پر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اور خون کی ہولی کھیلے جانے لگی۔ اس پر جوگندر کے پال کے یہ جملے:-

"میلے کا میدان دیکھتے ہی دیکھتے خون میں لت پت ہو گیا۔ ہندو اور مسلمان تو ٹوٹتے رہے۔ مگر ان کے خون کی لکیریں زمین پر بہہ بہہ کر یکجا ہوتی رہیں"۔
"اور جانور جو ان کی بیل گاڑیوں اور بگھیوں کو کھینچ کھینچ کر جو یہاں لائے تھے، اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو جھپکے کے بغیر چپ چاپ انسانیت کی بربریت کا تماشا کرتے رہے۔ اور شاید حیران ہوتے رہے کہ بھوک مٹانے کے مارنا ضروری کہا ہے۔
تو جسے مار [illegible] رہے پہلے اسے تو اٹھالیں۔ یہ تو مار [illegible] چلے جا رہے ہیں اور کوئی کسی کو کھاتا بھی نہیں"۔ (ص ۵)

لڑائی کا انجام۔ الگاؤ، ویسا ہی درد، ایسی ہی بھیس ایک بار پھر ذہن میں رقص کر گئی جو آج سے تیس بتیس برس قبل ہندوستا میں پھیلی تھی۔

"پناہ گاہ" جوگندر پال کا ایک ایسا خوب صورت افسانہ ہے جو انہیں مدتوں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

ان دو تین افسانوں میں وہ جوگندر پال نہیں ہیں جو آج کے جوگندر پال ہیں۔ ان افسانوں میں انہوں نے زندگی کا تخلیق کا رس نچوڑ کر رکھ دیا اور رچی لگا کر افسانہ لکھا۔

بعد کے افسانوں میں کسی ایک میں بھی پرانے جوگندر پال نظر نہیں آتے۔ ان میں آج کے جوگندر پال ہیں۔ اسی لئے ان سب افسانوں میں آج کی فضا ہے آج کی تکنیک ہے۔

"کھلونے" اپنے کردار پر گھومتا ہوا اپنی نوعیت کا [illegible] الگ سا افسانہ ہے۔ جس میں ایک کردار کے ذ [illegible] جس میں کرداروں کا نہ صرف تعارف ہوتا ہے۔ بلکہ امارت اور غربت کا تصادم بھی دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے کی تقسیم زیادہ اچھا اس کی تکنیک ہے۔

'کٹھ پتلیاں' سے لیکر 'اسٹاپ' اور 'بے مراد' تک متوسط طبقہ کی متوسط درجے کے افسانوں کی بھیڑ میں دو ایک افسانے ایسے بھی ہیں جو تمام نیا پن سمیٹنے کے باوجود افسانے نظر آتے ہیں۔ جو اپنی تمام تر حیاتی تبدیلیوں کے ساتھ روایات سے رشتہ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی افسانوں کی بہترین نمائندگی کرتا ہے ان کا ایک افسانہ بے گور
ایک امریکی ڈاکٹر کو بعض تجربوں کے لئے پچاس مردوں کی ضرورت ہے اس کا ہندوستانی ملازم اسے ایک ایسی بستی میں لے جاتا ہے۔ جہاں غربت، مفلسی سے نہ جانے کتنے زندوں کو مردہ درگور ڈال رکھا ہے۔ جھنجھلا کر ڈاکٹر بولتا ہے:

"مجھے یہ مذاق پسند نہیں رام دین"

میں مذاق نہیں کر رہا ہوں صاحب! مُردوں کو اپنے مر چکنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ مگر انہیں غور سے دیکھئے ہر ایک کو پورا احساس ہے کہ وہ مر چکا ہے۔

اور جب ڈاکٹر انہیں زندہ سمجھ کر واپس چلا جاتا ہے تو رام دین ان زندہ مردوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

بڑے بد قسمت ہو ...... اگر تم واقعی مر چکے ہوتے تو ٹھاٹ سے امریکہ جا پہنچتے

یہ پورا افسانہ زہر کی طرح دماغ میں اتر جاتا ہے۔ ملک کی غریبی، معاشی بدحالی کی ایسی گھناونی تصویر دماغ میں اتر جاتی ہے کہ اسے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ اس افسانہ کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ افسانہ آج کا افسانہ ہے۔ اور اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر قلم میں طاقت، دماغ میں تخلیقی آرٹ خلوص کے ساتھ جلوہ گر ہے تو اسے چلتے ہوئے موضوعات پر زندہ افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ بے گور بلاشک و شبہ اس دور کا ایک اچھا اور زندہ رہنے والا افسانہ ہے۔

اس مجموعے میں اور بھی اچھے افسانے ہیں مثلاً بے مراد، اسٹاپ وغیرہ، لیکن ان سب افسانوں میں جادو، پناہ گاہ، اور بے گور کا ایسا تاثر بنتا ہے۔ جو تمام افسانوں پر چھا جاتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے دوسرے افسانے پھیکے سے نظر آنے لگتے ہیں۔

اس مجموعے کا سب سے اہم پہلو جوگندر پال کے منتخب کردہ کردار ہیں۔ جن کو انہوں نے متوسط اور نچلے طبقے سے اٹھا کر افسانہ کے فریم میں جاذب کیا ہے۔ جادو کی بھابھو، ٹھیلے والا، پناہ گاہ کا کردار، کھلونے کا نوکر، کٹھ پتلی والے کا بیٹا، بے گور کے زندہ مردے، قبرستان کا چوکیدار، اور مندر کا پنڈت، تار گھر کا کلرک وغیرہ، یہ سارے کردار ہندوستان کے اس طبقے کے کردار ہیں۔ جن کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اور جن کی حالت بھی سب سے زیادہ قابل رحم۔ ایسے کرداروں کے ساتھ ہمدردی کرنا تو آسان ہے۔ لیکن ان کی نفسیات کو سمجھنا قدرے مشکل، لیکن جوگندر پال نے ان تمام کرداروں کو قریب سے دیکھا ہے اور ان پر قدرت حاصل کی ہے۔ ان کے مسائل و مراحل پر نظر رکھی ہے۔ اس وجہ سے وہ ان تمام موضوعات کو گرفت میں لے کر بڑی چابک دستی سے پیش کر گئے۔ کہیں کہیں تو غیر معمولی کامیابی ملی ہے۔ جس کے ذریعہ دور حاضر کی سچی تصویر ابھر آتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اصل فنکار وہی ہے جو اپنے آرٹ کے ذریعہ اپنے دور کی

سچائیوں کو کلچرل کو، سماجی و معاشی حقائق کو اپنی تخلیق میں جذب کر لے۔ جس سے قارئین ان افسانوں کے توسط سے زندگی اور سماج کی تصویر، و تقدیر اپنے سینوں میں اتار لیں۔ زندہ ادب کی یہی نشانی سمجھی گئی ہے۔ پریم چند، وغیرہ کی دائمی زندگی کا یہی راز بتایا جاتا ہے۔ جوگندر پال اپنے اس مجموعے کے بعض افسانوں کے ذریعہ ایسی ہی حد کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ جہاں ان کا کردار بھاگبھو نمائندگی کرتا ہے۔ ہزارہا معصوم عورتوں کی شیام بابو نمائندگی کرتا ہے۔ خالص ہندوستانی کلاسک کی

بے ارادہ یقینی طور پر جوگندر پال کا بڑھا ہوا قدم ہے۔ جس میں، جوگندر پال کے بعض افسانے انسانی ... کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ کچھ دنوں تک برقرار رہا تو کوئی شک نہیں کہ جوگندر پال اردو کے ان صف اول کے افسانہ نگاروں میں شامل ہو کر افسانوی ادب کی تاریخ کا ایک حصہ بن جائیں گے۔

(قارئین)

سواد وصوت

احمد رشید علیگ ــــــ علی گڑھ

مکرمی ! آداب ونیاز

آہنگ کا افسانہ نمبر خوب ہے۔ افسانہ نمبر داں کی یہ روایت رہی ہے کہ مشہور ادیبوں کی تخلیقات کا مجموعہ اور جو ادیب ادب میں کوئی مقام حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں ان کی تخلیقات کا انتخاب ساتھ ہیں افسانے کے موضوعات پر دو ایک مضامین جمع کر دیئے گئے۔ لو یہ ایک افسانہ نمبر تیار ہو گیا .... آہنگ کا افسانہ نمبر روایت سے ایک قدم آگے ہے۔ کیونکہ اس میں نئے افسانے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیا افسانہ ذہن میں ایک سوالیہ نشان بن کر آتا ہے۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ آہنگ کا افسانہ نمبر اس کا جواب ہے تو غلط نہیں ہوگا اسی لئے یہ ایک اہم نمبر ہے۔ بلکہ افسانوی ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

نئے افسانے کے سلسلے میں کچھ سوالات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ نیا افسانہ خود ایک سوال ہے ؟

۲۔ نیا افسانہ روایت سے بغاوت کا ایک نیا قدم ہے۔ ؟

۳۔ نیا افسانہ نئے قارئین پیدا کرے۔ ؟

یہ تینوں سوالات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ نیا افسانہ خود ایک سوال اس لئے ہے کہ روایت کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اسی لئے نئے قارئین کا متلاشی ہے اس لئے ضروری ہے کہ نیا افسانہ کو سمجھے اور سمجھانے کی سنجیدہ کوشش ہونی چاہئے تاکہ ادب اور قارئین کا رشتہ منقطع ہونے کے بجائے ہموار رہے۔ یہاں نہ صرف اردو رسائل کی زندگی اردو کی بقا کا بھی سوال ابھر کر آتا ہے۔

رحمٰن حمیدی ــــــ گوموہ

گرامی قدر ! ہدیہ سلام

آہنگ کا "فکشن نمبر" باصرہ نواز ہوا۔ آپ نے کلچرل اکیڈمی کی ادبی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ اسے اور آگے بڑھایا ہے۔ اردو افسانے پر جو تنقیدی سرمایہ ہے وارث علوی سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی تک — یعنی ظہیر من الشمس — ہے فکشن نمبر افسانوی ادب اور جدید تنقید میں سنگ میل کا حامل ہے۔ کہانی کاروں کے ناموں کو صیغۂ راز میں رکھکر آپ نے ادبی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ اردو ادب میں ایسے نقاد موجود ہیں جو فن کے بجائے فنکار کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور ذاتی مراسمت اور شخصی اثرات کی بنیاد پر تنقیدی مضامین قلم بند کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریر جانبداری کا نشانہ رہ جاتی

ہے۔ فکشن نمبر نے غیر جانبداری کی روایت کو آگے بڑھایا
ہے۔ میری جانب سے اس عظیم پیش کش پر مبارکباد قبول فرمایئے
جدید افسانوی ادب پر ایسے نمبروں کی مزید ضرورت ہے

ذاکر عزیزی ـــــ بنگلہ دیش

بھائی کلام حیدری صاحب! سال نو مبارک ہو
آپ کے جریدہ آہنگ کا فکشن نمبر احمد سعدی صاحب
کے توسط سے دیکھنے اور پڑھنے کو ملا۔ یہ رسالہ اپنی نوعیت
اور معیار کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے اس قدر کامیاب
فکشن نمبر نکالنے پر میں آپ کو اور محترمہ نوشابہ حق کو مبارک
باد پیش کرتا ہوں۔
شفیع مشہدی کا ہدایت نامہ نقادوں کے لئے ایک
چیلنج ہے۔ انہوں نے جس قرآنی انداز میں اپنا مدعا بیان کیا
ہے وہ قابل تحسین ہے۔ آپ کا "مزامیر" اس قدر تیز و تند
ہے کہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ بھی ادب کے میدان میں
ایک اکھاڑیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی اس بے باکی پر
مجھے خوشی ہوئی۔
مضامین تقریباً سبھی معلوماتی ہیں اور معیاری ہیں۔
افسانے سے پہلے ان پر تنقیدی مضامین کا سلسلہ مجھے بے انتہا
پسند آیا۔ خصوصاً اس لحاظ سے بھی کہ تنقید نگار کو افسانہ نگار کا
نام صیغۂ راز میں رکھا جائے۔
ہند و پاک افسانہ نگاری کے سلسلے میں جو گفتگو ہوتی ہے
میں یہ کہوں گا کہ پاکستان کے افسانہ نگاروں کے سلسلہ میں اور
ان کی ادبی تحریک سے متعلق جو گفتگو ہوئی ہے قطعی جانبداری
سے کام لیا گیا ہے۔ ورنہ پاکستان کی افسانوی صنف کسی طور پر
ہندوستان سے کمتر نہیں ہے۔
آہنگ کا فکشن نمبر اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل
ہے کہ اس میں تمام جدید افسانہ نگاروں کی تخلیقات یکجا کی
ہیں۔
مجموعی طور پر آہنگ کا یہ شمارہ ایک ادبی دستاویزی
حیثیت رکھتا ہے۔

اختر یوسف ـــــ رانچی

برادر محترم! سلام تحیات
تازہ آہنگ کل ہی ملا ہے۔ شکریہ۔ میرا خیال کہ
اب یہ REGULARISE ہو جائے گا۔
"مزامیر" میں اس بار آپ نے حسرت پرستوں کی اچھی
خبر لی ہے۔ دراصل اردو والے زیادہ تر پابندی رسوم
و قیود کے قائل ہیں۔ کچھ نیا کرنا نہیں چاہتے کہ اس میں محنت
درکار ہوتی ہے۔ ذہنی تساہلی کو جھٹکارنا پڑتا ہے اس کے
لئے تھوڑی ہمت چاہئے۔ لیکن ایسا بھی ہے کہ جس نے ہمت
کی مولوی حضرات فوراً اسے "پندرہ آنہ" کر دیتے ہیں

فضا ابن فیضی ـــــ مئوناتھ بھنجن

برادر محترم! سلام تحیات
آہنگ مختصر ہونے کے باوجود بھرپور تاثر دینے
میں کامیاب ہے۔ "مزامیر" کے تحت موجودہ ادبی معا
کی کم کوشی اور سہولت پسندی اور ارباب علم و تحقیق کی تن
آسانی اور غیر علمی روش و انداز سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں
وہ حقائق پر مبنی ہیں۔ اور بہتوں کی دل کی آواز۔ یہ حق گوئی
و بیباکی لاریب آپ کا حصہ ہے۔

R. N. Regd 4253/64
P. T. Regd No, Gy. 7
Phone—432

THE Aahang URDU MONTHLY

BAIRAGI, GAYA

دی کلچرل اکیڈمی، رسنہ ہاؤس جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۲ء

ماہنامہ آہنگ — گیا

شرح خریداری

ایک سال کیلئے ———— چوبیس ۲۴ روپے

فی کاپی ———— دو ۲ روپے

فون نمبر، 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹر

نوشابہ حق

رفقاء ایڈیٹرز

شفق — عبدالصمد

محتویات

اداریہ

کشکول

ہمیں مسرت ہے کہ "فکشن نمبر" اپنے معیار اور طریقۂ پیشکش کی ندرت کی بنا پر مقبولیت حاصل کر سکا۔ اور اس کے سلسلے میں ادیبوں، شاعروں دانشوروں اور ذہین و متین قارئین نے اظہارِ پسندیدگی میں بخل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہماری ہمت افزائی کی۔ ہم کام کو ہی کام کا انعام سمجھتے ہیں اور آہنگ کے دوستوں کو بیش گراں قدر سرمایہ ورنہ کہاں ہم اور کہاں گیا جیسی چھوٹی جگہ۔ آہنگ کا شائع ہونا

فکشن نمبر کے بعد یہ چوتھا شمارہ پیش خدمت ہے قارئین اور دوستوں نے محسوس کیا ہوگا کہ ہم ظاہری حسن کو بھی بڑھانے کی کوشش کے نتیجے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ ہم پر اخراجات کا بوجھ بڑھا ہے مگر اپنے آپ سے کی ہم نے کب فکر کی ہے۔

دہلی کلچرل اکیڈمی نے ایک اور اہم قدم بڑھایا ہے ہم نے ارتقا سیریز کا سلسلہ شروع کر دیا ہے ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک کے ہندو پاک کے اہم افسانوں کا انتخاب زیرِ طبع ہے۔ اس کے بعد سے ہر سال کے اہم افسانوں کا انتخاب ارتقا سیریز کے تحت شائع ہوتا رہے گا۔ اور ان اہم افسانوں کے انتخابات پیش کر کے ناقدین کو متوجہ کرتے رہیں گے کہ ناقدین [illegible] سے توجہ کرتے رہیں۔

اشاعتی پروگرام میں اس سال چند کتابیں شامل ہیں جن میں کم از کم ایک ناول اور دیویندر اسر کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ انشاء اللہ ضرور ہوگا۔

—— نوشابہ حق

۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک کے اہم مختصر افسانوں کا انتخاب بہت جلد منظر عام پر آ رہا ہے

نفاست حسن اور معیار کا نمونہ

زیر اہتمام دی کلچرل اکیڈمی جگ جیون روڈ گیا

عین، تابش

دو کتابیں ـــ ایک مطالعہ

[کسی رسالے میں کسی مقالے کا شائع ہونا یہ معنی نہیں رکھتا ہے کہ
ایڈیٹر (ز) مقالے میں کہی گئی باتوں سے متفق ہے یا یہ کہ وہ اس میں شریک ہے ہو سکتا ہے
ماضی میں یا حال میں یہی صورت حال رہی ہو مگر آہنگ کی یہ روایت نہیں رہی ہے۔ عین تابش
عین الحق کے بھائی ہیں ـــ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ پڑھنے لکھنے والے اتنا
تو جانتے ہی ہیں۔ اگر اس مضمون میں سخن فہمی کے بجائے "طرف داری" کی جھلک ہو تو نظرانداز
کر کے بھی کئی اچھی اور بعض بحث طلب باتیں نکل آئیں گی۔ ہم اس مضمون کو شائع کر رہے
ہیں ـــ ـــ گرچہ کہ ہمیں اسے پڑھنے کے بعد جینوئن طور پر یہ احساس ہوا کہ مضمون
میں نوجوانی کا تیور ہے۔ اور لہجے میں سیلابی کیفیت مواد پر غالب آگئی ہے۔ پھر بھی ـــ
پھر بھی ـــ پھر کبھی! ـــ ـــ (کلام حیدری)]

ادب، روحانیت، انسانی وجود، روحانی نظام، ادب سماجی توسیع کے اس تاریخی ارتقا سے عبارت ہے جو اپنے ساتھ انگنت کائناتی یا بین الاقوامی تحریکوں، نئے نئے سائنسی اور غیر سائنسی رجحانات نئے مادی اور وسیع امکانات، اور ان کی تشکیل یا تجدید اور تبدیلیوں کو لے کر چلتا ہے۔ افلاطونی اور ارسطوئی نظریوں، ژونگ اور فرائڈ کے ذریعہ کھولی گئی نفسیاتی گرہوں، ایرانی فلسفے ویدانت کے متصوفانہ تصورات، گوتم بدھ کے عرفان، خداوندی کے اصول اور مذاہب کے اصل الاصول کی ترغیب اور صلح کل کی دینے۔ یہی سب وہ بین الاقوامی اعتبارات ہیں جنہوں نے نئے مادی تصورات کے یکطرفہ کھوکھلے پن کے مقابلے میں مذہب، روحانیات، تصوف اور مابعدالطبعیاتی نظام نے لوث اعتبار کو زندہ رکھا اور اس کو ہمیشگی عطا کی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے اثرات نے ساری دنیا میں ادب کے نظریوں کے طور پر ایک قسم کی بے سکونی اور بے اطمینانی اور انتشار کا راستہ دیا۔ خوف، سراسیمگی اور دہشت انسانی محسوسات کا ایسا موضوع بن گئے جن سے دامن بچانا ادیب کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسا بھی ہوا کہ ادب میں اس انتشار اور بے سکونی کے نتیجے میں روحانی اور مابعدالطبعیاتی نظریے داخل ہونے لگے۔

یعنی اگر ایک طرف فرائڈ، ژونگ، اور اڈلر کے نفسیاتی رجحانات کو ادیبوں نے نقطۂ عروج تک پہونچایا تو دوسری طرف سر آربندو کی ساوتری اور اقبال کے فلسفۂ تصوف نے ذہن کو نیا راستہ دکھایا۔ اور وہ تھا مذہب اور تصوف کا راستہ، اور اب جبکہ آٹھویں دہائی ختم ہونے کے مسلسل بہ ارتقا سائنسی رویوں کے نتیجے میں دنیا آگے اور بہت آگے پہونچ چکی ہے خونی تکنیک اور تنہائی کے احساس نے اس کو بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ مذہب اور تصوف کی گود میں پناہ لینے پر مجبور ہو رہی ہے اور ادیب جو سماج کے باشعور حلقے کا نمائندہ ہے۔ ایک طرف نئے حالات سے باخبر ہو کر آج کی محسوسات کو اپنے میں پیوست کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف لاشعوری طور پر مادی اور میکانکی تصور سے فرار حاصل کرتا ہوا مذہب، تصوف، روحانیات اور مابعد الطبعیات کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اور اس طرح اپنے ان تجربوں کو جو آج کے خوف اور تشکیک سے تعبیر ہیں انسان کے اصل الاصول کی ان روایتوں کی طرف لوٹا رہا ہے۔ جو تحریکات اور شعور دشغف سے بے پرواہ ایک لافانیت کی مظہر ہیں۔ اور لافانیت ڈبلو بی ییٹس کی OECUTLISM میں بھی تلاش کی جاسکتی ہے اور ڈی ایچ لارنس کی PRI-MITINOM میں بھی۔ اور اسی طرح آگ الاؤ صحرا، اور پس پردۂ شب کے افسانوں میں بھی۔

اس بحث سے قطع نظر کہ نیا افسانہ اپنی تاریخ کہاں سے شروع کرتا ہے یہ بات تو ماننی ہی پڑتی ہے کہ اردو میں فکشن کی مکمل طور پر متعارف شکل افسانے ہی میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ کیونکہ گنے چنے آٹھ دس ناولوں کو چھوڑ کر اردو ناول کا دامن تنگ ہے۔ اور آگ کا دریا، آنگن، اداس نسلیں کے علاوہ اردو میں کوئی بہت بڑا ناول نہیں لکھا گیا جسے دنیا کے بڑے ناولوں کی صف میں رکھا جا سکے۔ اس کے برعکس اردو افسانہ مسلسل مائل بہ ارتقا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد لہجے کی نشاندہی ہونے لگی تھی ۱۹۶۰ء آتے آتے کئی اچھے اردو افسانے لکھے جا چکے تھے۔ انگارے کی اشاعت نے ایک طرف راہیں کھول دی تھیں۔ اور دوسری طرف قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے افسانے اردو افسانے کو نئے موضوعات نئے لہجے اور نئے اسلوب سے آشنا کر رہے تھے۔ "پت جھڑ کی آواز" ہاؤسنگ سوسائٹی اور جلاوطن (قرۃ العین حیدر) اور آخری آدمی (انتظار حسین) اور انتظار کے وہ سارے افسانے جو ایک طرف تقسیم اور ہجرت کے سہارے لکھے گئے اور دوسری طرف مقصود نہ ذہنی پس منظر کی عکاسی تھے۔ اردو افسانے کو انگریزی کی SHORT STORY سے واضح شکل عطا کر رہے تھے۔ ان افسانوں کے بعد منٹو، بیدی، کرشن، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، احمد علی، جیلانی بانو، ممتاز مفتی نے مل کر ۱۹۶۰ء تک اردو افسانے کو اس کے خدوخال عطا کر دیئے تھے ۱۹۶۰ء اردو کے اسلوب میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہونے لگیں اور بین الاقوامی حالات کی روز بروز بڑھتی ہوئی پیچیدگی نے اردو افسانے کے موضوعات اور ان کو اظہار کو بھی پیچیدہ بنانا شروع کیا۔ اور اس طرح ساتویں دہائی کے شروع میں ایسے افسانے لکھے گئے۔ جو ترقی پسندی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ اور میں علامتی تو نہیں کہوں گا لیکن استعاراتی نظام کی داغ بیل یہاں پڑنے لگی تھی۔ یہ لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر مغرب کے فکشن لکھنے والوں سے متاثر تھے۔ اس لئے ترقی پسندی سے انحراف اور جدیدیت کے استقبال نے انہیں دو قسم کا امتزاج عطا کیا۔ اور اسی لئے اس صف کے زیادہ افسانہ نگار موضوعاتی طور پر ترقی پسند تھے۔ اور اسلوبیاتی طور پر جدید۔ غیاث احمد گدی، جوگندر پال، رام لعل، غلام عباس اشفاق احمد، کلام حیدری

جیلانی بانو، قاضی عبدالستار، انور عظیم اس امتزاج کی دریافت کو اپنی شناخت بنایا۔ اور اردو ادب کو بہت اچھے افسانے دیئے۔ لیکن جہاں تک اردو افسانے کے باضابطہ نئے موضوعات اور نئے اسلوب سے ہم آہنگ ہونے اور نئے تجربات کی فنی دریافت سے اردو افسانے کے کینوس کو وسیع کرنے کا سوال ہے۔ یہ کام ۱۹۶۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے یا یوں کہیئے کہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس سے یا یہ کہ آٹھویں دہائی اردو افسانے کے نئے افق کی دریافت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ دہائی شروع ہوتی ہے اور بابا لوگ، اور بابے، والے غیاث احمد گدی، سنج دو تجدد اور پرندہ پکڑنے والی گاڑی۔ اور صفر والے کلام حیدری، انف نام میم، اور کس کی کہانی اور رسائی والے جوگندر پال کے ساتھ نئے اردو افسانے کے رجحانی سفر کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں صورت حال کچھ اور واضح ہوتی ہے۔ سریندر پرکاش، احمد ہمیش، بلراج مین را، احمد یوسف، ظفر اوگانوی، اور قمر احسن، حسین الحق شوکت حیات، رشید امجد، رضیہ فصیح احمد، زاہدہ حنا، شبیر احمد، اکرام باگ، سلام بن رزاق، شفق، انور خان، علی امام، انور قمر، کمار پاشی، بلراج کومل، کنور سین، حمید سہروردی، عبدالصمد اور مرزا حامد بیگ خان، شمس الحق عثمانی، اور سلطان سبحانی، ماجد رشید، احمد داؤد، اعجاز راہی اور طارق چھتاری وغیرہ یہ صنف کافی طویل ہے۔ اور اس میں لانبے اور درمیانی اور نئے ادوں کے مختلف حضرات شامل ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ان میں سے اکثر نے اردو کو اچھے افسانے دیئے ہیں۔

جن کتابوں پر باتیں کرنا مقصود ہے۔ وہ ایسے دو افسانہ نگاروں کے افسانوں کے مجموعے ہیں جنہوں نے ۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے کو وہی سمت عطا کی ہے۔ جو ۱۹۶۰ء سے پہلے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے عطا کی ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ کہ یہ دونوں افسانہ نگار ذہنی، موضوعاتی اور اسلوبی لحاظ سے بھی قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے قریب ہیں۔ اور ان کا وہ سرمایہ جو تخلیق کار کے ذہنی لسیر، منفرد اور روحانی ارتفاع پر مشتمل ہوتا ہے۔ مقدم الذکر دونوں افسانہ نگاروں کے ارتھ وسیع متصوفانہ مزاج سے مماثل ہے۔ یہ مطابقت اس لحاظ سے اردو افسانے کے لئے فال نیک ہے کہ ۱۹۶۰ء سے پہلے دو افسانہ نگاروں نے دو قسم کے رائج مفروضوں ترقی پسند تحریک اور فرائڈین تحریک سے اردو افسانے کو تقریباً نجات دلا کر ایک ایسا رویہ دیا جس کی جڑیں تاریخی تہذیب اور تصوف کی تہوں میں پیوست تھیں۔ اور ۱۹۶۰ء کے بعد دو افسانہ نگاروں نے فیشن زدہ اور برائے نام علامتیت سے اردو افسانے کو چھٹکارا دلایا۔ اور علامتی نظام کو ان ہی تین اصول تاریخ تہذیب اور تصوف کی بنیاد پر برتنے کا کامیاب طور پر آغاز کیا۔

قمر احسن اور حسین الحق کی دوسری انفرادیت وہ اساطیری اور ڈرامائی اسلوب ہے جہاں اظہار علامت کو تخلیقی بدل بنا کر ان گنت پیچ در پیچ حالوں کی سیر کرتا ہے یعنی اساطیری اور ڈرامائی کا استعمال ایک ساتھ (۳) لئے گیا کہ ایک طرف تو ہر دو افسانہ نگار کے یہاں محمد یاؤ بلیو بی ڈبلیو کی طرح ایک دیومالائی ماحول نظر آتا ہے اور اس ماحول کو علامتی نظام کی شکل عطا کرتے ہیں۔ وہ بائیس جوالسی کے لولیہ SYMCOLIOM MYTHOLOGY کی یاد دلاتے ہیں۔ اس طرح کا امتزاج ان کے افسانوں کو ان دوسرے تمام ہمعصر افسانہ نگاروں کے افسانوں سے مختلف لہجہ عطا کرتا ہے اس طرح مسلسل

ایک پُراسراریت بنی رہتی ہے۔ موضوعات انفرادی یا سماجی سے زیادہ بین الاقوامی ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح علامتی اسلوب اور نئے موضوعات ہیں جو ایک کائناتی مطابقت NIVERSIL SIGNIFICANCE پیدا ہوتی ہے وہ خاصے کی چیز ہوتی ہے۔

آگے کی باتیں دونوں افسانہ نگاروں کے موضوع اور اسلوب سے متعلق ہیں۔ انہوں نے کسی طرح روایت سے انحراف نہ کرتے ہوئے اور ایلیٹ کی طرح RESENCE OF THE PAST, NOT THE PASTNES OF THE-PAST میں یقین رکھتے ہوئے آج کی محسوسات کو اس اسلوب کا ملبوس پہنایا جو اساطیری اور دیومالائی بھی ہے اور افسانوی اظہار کے نئے امکانات کا نقیب بھی۔ جس میں تہذیب کا مرثیہ بھی ہے۔ تاریخ کا انکشاف بھی، تصوف کا اعتدال بھی، عالمی جنگوں کے بعد دنیا جس خوف، بے یقینی اور تشکیک کے سہارے پر کھڑی ہے اس کا اعتراف بھی ہے حسین الحق آج کی باتیں کہتے ہیں اور ان باتوں کے پس منظر میں گذرے زمانوں کے اسرار بولتے ہیں۔ جو کبھی سوانحی رنگ اختیار کر لیتے ہیں (مہوزہ) اور کبھی تسلسل (الی حسین) کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ کبھی مذہب اور تہذیب کے زوال کی کشمکش اور قدروں کی بازیافت کی کوشش سامنے آتی ہیں۔ قمر احسن کی باتیں شروع ہی ہوتی ہیں دیومالائی فضا میں اور تاریخ تہذیب اور روایت کا تسلسل انہیں آج حالات کے شعور تک پہنچاتا ہے۔ حسین الحق کا اظہار پُرسکون ہے اور قمر احسن کے یہاں اضطراب ہے اور یہ اضطراب ان کے یہاں، ماضی کے احساس کو حسین الحق سے زیادہ شدت عطا کرتا ہے۔

آگ الاؤ اور صحرا میں سترہ افسانے اور ایک ناولٹ کی شمولیت ہے۔ اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ سب قمر احسن کے منفرد اسلوب کی اکائی کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ افسانوں کو تین حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا حصہ آگ الاؤ، اور تیسرا صحرا ہے۔ ناولٹ کا عنوان آگ الاؤ صحرا ہے۔ سرسری طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ناولٹ ان تمام افسانوں ان کے موضوعات کی تلخیص ہے۔ لیکن مکمل طور پر ایسا نہیں ہے۔ ایک دلچسپ سلسلہ ضرور ہے یعنی آگ الاؤ اور صحرا ماضی اور روایت سے وابستگی کا اظہار ہیں۔ لیکن ناولٹ میں ایک قسم کی جھنجھلاہٹ ہے جو ماضی کی وابستگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کہی جا سکتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کہتے ہیں کہ قمر احسن اپنی اجتماعی تہذیب کو اپنے ذاتی حوالے سے پڑھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اجتماعی تہذیب کو ذاتی حوالے سے پڑھنے سے مراد یہ نہیں ہونی چاہیے کہ تہذیب اور روایت سے ان کی ایسی وابستگی ہے کہ اس کے زوال کا المیہ ان کا ذاتی المیہ بن جاتا ہے۔

پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایز اے ینگ مین TRIT OF THE ARTIST - IS A YOUNG MAN جوائس کا سوانحی ناول کہا گیا ہے حالانکہ شعور کی رو کی تکنیک پر اس کردار کے نفسیاتی مطالعے کے ذریعہ ہر فرد کے اندرونی نفسیاتی کشمکش کا مطالعہ کیا ہے اسی طرح قمر احسن جہاں جہاں ہیں۔ وہ صرف قمر احسن نہیں بلکہ ماضی اور اس کی روایتوں سے بچھڑا ہوا ہر شخص ہے جو حسین الحق کے یہاں بھی ہو بہو سرانظر آتا ہے۔

"مجھے تو احد کی ان سبز پوش وادیوں میں رہنا چاہئے جہاں عذرا رہتی ہے اور اس کے بہت سے اونٹ رہتے ہیں جہاں ایک ساتھ بہت سی خوشبوئیں رہتی ہیں۔ وادیوں کی، عذراؤں کی، بھیڑوں کی اور کھجوروں کی جہاں صبح و شام نخلستان کی ہوائیں چلتی ہیں"

(صدیاں)

یہاں احد ظاہری طور پر تو ایک مذہبی علامت بن کر ابھرتا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ ماضی اور اس کے حسن کی علامت بنتا ہے۔ وادیوں، عذراؤں، بھیڑوں اور کھجوروں کی خوشبوئیں ماضی کی جادوئی کشش کی علامت ہیں۔ اس افسانے میں احد عذرا اور اونٹ تین ماضی کی علامتیں ہیں۔ جو شراب، گدھ اور لاش تین عصری علامتوں سے ٹکراتی ہیں اور پورے افسانے کا ان چھ علامتوں کی تشریح اور تفہیم کے ذریعہ تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

"اف بنی مرزونہ کی کھوپڑیوں میں بنی کلیب شراب پی رہے ہیں اور ان کی عورتیں۔ چھن چھن چھن .... سب تلواریں ٹوٹ گئیں ایک گدھ نے اس کی ادھ کھلی ہوئی آنکھ نوچ لی تھی"

یہاں بنی مرزونہ ماضیت کی علامت ہے اور بنی کلیب عصر حاضر کی۔ گدھ عصر حاضر میں قساوت کا عنصر ہے۔ جو اس شخص کی ادھ کھلی آنکھ بھی نکال لینا چاہتا ہے۔ جو روایت کے دریچے سے جھانکتا ہے "صدیاں" صدیوں کا سفر ہے۔ جسے افسانہ نگار کا ذہن طے کرتا ہے۔ یہ صدیاں تہذیب کے عروج و زوال وقت کے اطمینان، انتشار اور وجود کے حفظ و انحطاط کی صدیاں ہیں۔ آج سے چار پانچ صدی قبل تک خوف اس طرح انسان کا مقدر نہیں تھا جیسا آج ہے۔ کل اسے دوسروں پر اعتبار کرنے کی عادت تھی۔ آج اپنے اوپر اعتبار کی دولت سے وہ محروم ہو گیا ہے۔ اور اس محرومی نے اس کے اندر جھنجلاہٹ پیدا کر دی ہے اور .....

"جھنجلاہٹ کی ابتدا میں اسے عذرا یاد آ گئی عزہ کی قسم اگر تم اس وقت میرے ساتھ ہوتیں تو کتنا مزہ آتا"

جھنجلاہٹ کی ابتدا میں عذرا کا یاد آنا آج کے فرد کی اس بے بسی کی نشاندہی ہے۔ جو ہر لمحہ اس سے دست گریباں ہے۔ اور ایسے میں ماضی ان ایک خوب صورت یاد بن کر سوئیاں چبھوتا ہے۔ ماضی اس کے لئے ایک اذیت ناک خیال ہے۔ جو آنکھ ہے اور رہتا ہے۔ لیکن وہ اس پر قابو نہیں رکھتا کہ اسے اپنی مٹھی میں قید کر لے۔ ایسے میں بس وہ عزہ کی قسم کھا سکتا ہے۔ جو ماضی کے کھوئے ہوئے حسن کی علامت ہے۔ اور حال کی المناکی کا اشارہ ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ قمر احسن اپنی باتیں اکثر و بیشتر ماضی اور روایت کی کریدیہ سے شروع کرتے ہیں۔ اور ایک شدید احساس کے تسلسل کے ساتھ وہ حال کی کرب ناکیوں فرد کی مجبوریوں، اور ان المناکیوں کی منظر نگاری کرتے ہیں۔ جو اس کے ساتھ ہیں۔ فرد کی بےبسی اس منزل پر پہونچ چکی ہے۔ کہ ماضی کی بازیافت کی کوشش میں حال کا ہیبت ناک گدھ اس کی

آنکھ بھی لوٹ لیتا ہے۔ تو اسے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

"نئے افسانے کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ نیا افسانہ نگار معاصر دنیا اور گرد و پیش کے ماحول کے جبر میں کچھ اس طرح گرفتار ہے کہ اپنے تہذیبی اور ذاتی ماضی کی گہرائیوں میں اترنے سے کچھ مجبور نظر آتا ہے"۔

قمر احسن اس جبر میں گرفتار ہونے کے باوجود ماضی کی گہرائیوں میں بڑی جاں فشانی کے ساتھ اترتے ہیں۔ لیکن اسی وقت ان کا احساس مجبوری شدید ہو جاتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس حال کی سفاکیوں سے نجات پانے اور ماضی کے سبزہ زاروں میں لوٹنے کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اور ایسے میں ایک قسم کی سمجھوتے والی کیفیت افسانہ نگار قمر احسن کے اندر ودلیعت ہوتی ہے جو فرد قمر احسن پہونچانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

نہ جانے کس منزل سے ایک لاش اس کے ساتھ گھسٹتی آ رہی تھی۔ جو اس کے رک جانے کے بعد بھی گھسیٹ رہی تھی اور نشانات دونوں کے مٹ چکے تھے ——
اس عریاں لاش کے کھلے منہ میں بہت سی بڑی والی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اور سیاہ رسی اس کی گردن میں پھنسی تھی۔ جس کا دوسرا سرا تابوت میں جاکر غائب ہو گیا تھا اس نے گنگنا کر اس رسی کو توڑ دینا چاہا مگر اس کا ہاتھ شل ہونے لگا۔ اور آنکھیں تابوت سے باہر آکر اسے گھورنے لگیں۔

رسی کو توڑنے کی کوشش مگر ہاتھ کا شل ہو جانا اسی سمجھوتے COMPROMISE کی علامت ہے۔ جو آج کے بے بس فرد کا مقدر ہے۔ اور جس سے چاہنے کے باوجود وہ نجات نہیں حاصل کر سکتا۔ کوشش اور بے بسی کا یہ تسلسل جاری و ساری ہے۔

"اور واقعہ یہ ہے دشت قراقرم کی جھلسا دینے والی دھوپ میں آشوب چشم کی شکار وہ پتھرائی ہوئی آنکھیں اب بھی آگے کے لئے کسی تیسرے شخص کا انتظار کر رہی ہوں گی —— لیکن چیلیں اب بھی منڈلا رہی ہوں گی۔ اور رتھ کی کوئی گڑگڑاہٹ نہ ہوگی"

(ہوزا، میم، منہ)

'سلیماں سر بزانو اور سبا ویراں' قمر احسن کا ایک بہت کامیاب افسانہ ہے۔ اس میں علامتوں کے کامیاب ترین استعمال اور اشتغال کی بات بعد کی سطروں میں آئے گی۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ افسانہ اپنے اندر کئی پرتیں اور پہلو دار عوامل رکھتا ہے۔ ظاہری سطح پر اس افسانے میں افسانہ نگار ماضی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوتا نظر آتا ہے۔ باطنی طور پر ماضی کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے پر وہی تاسف افسانہ نگار کے رویئے میں یہاں بھی نظر آتا ہے جو دوسرے افسانوں میں موجود ہے۔

باپ اندھا کیوں ہے؟ ماں روتی کیوں ہے؟ اور کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟

سیاہ و سرخ چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر کے خندق کیوں نہیں بناتے؟ پانی کیوں نہیں
نکالتے؟ کیا کرتے رہتے ہیں۔ خالی چپ چاپ بیٹھے ٹکر ٹکر دیکھا کرتے ہوں گے؟
خالی اندھے رہتے ہیں، صرف روتے رہتے ہیں۔ اور آسمان دیکھ کر ٹھنڈے ٹھنڈے
سانس لیتے رہتے ہیں۔ دھوپ تو بہت تیز رہتی ہوگی؟ بے چارے ماں باپ ــــ!

لیکن یہ تاسف ماضی کے منتشر ہونے پر نہیں ہے۔ حال کی مایوسی بھی اس میں صاف جھلکتی ہے۔ سماج کا کھوکھلاپن سماجی اصولوں کی غیر فعالیت، پورے نظام پر چھائی ایک طویل اداسی اور راور ایک اننت تھکاوٹ اس کہانی کا موضوع ہے۔ اور پر درج کیا ہوا اقتباس ایک بے راہ نظام، بے معنی طرز عمل تلاش صفت طریقۂ زندگی۔ اور چاروں سمتوں میں دوڑتی ہوئی ناآسودہ زندگی کا المیہ ہے۔ اور المیہ حال کا ہے۔ اس حال کا جو ماضی سے اپنا رشتہ توڑ کر ذہنی، اعتقادی، اصولی، نظریاتی اور عملی طور پر مفلس ہو چکا ہے۔

پھر یہ افسانہ ایک اور پہلو رکھتا ہے یعنی افسانہ نگار کی اس ہمدردی یا اس سے زیادہ اس کے بے بس کے جذبے کو نمایاں کرتا ہے۔ جو اس کے اندر ان لوگوں کے لئے موجود ہے۔ جو ایک حد تک حال کی سفاکیوں سے بے خبر ہیں۔ اور ماضی کے بت کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ خود بھی لوں لات وعزہ کی قسم کھاتا ہے۔ لیکن حال کی سفاکیوں اور درندگیوں کا اس کا شعور اتنا گہرا ہے۔ کہ وہ صرف آسمان دیکھ کر ٹھنڈے ٹھنڈے سانس نہیں لیتا۔ دھوپ تو بہت تیز رہتی ہوگی؟؟ بے چارے ماں باپ؟؟ یہاں ماں باپ اتنی کامیابی کے ساتھ پرانی اقدار کی بے چارگی کی علامت بنائے گئے ہیں۔ اور اس سے بے چارگی کا حال کی تیز دھوپ، سے ایسا ٹکراؤ پیش کیا گیا ہے کہ ان چند الفاظ نے بیک وقت افسانہ نگار کے کائنات کے دکھوں کو محسوس کرنے کے پیرائے اور ان دکھوں کے اظہار کی شدت پر مہر ندرت ثبت کر دی ہے۔ حالات روز بروز سخت ترین ہوتے جا رہے ہیں۔ قدریں اپنے پیراہن بدل کر نئے نئے انداز میں سامنے آ رہی ہیں۔ ہر فرد نیا پن اوڑھنے میں اتنا منہمک ہے کہ پس ماندہ قابل احترام قدریں قدیم عہد کا سکہ بن چکی ہیں۔ یادیں اپنا وجود کھو چکی ہیں۔ اور وہ مقامات جو یادوں کا مرکز ہو سکتے ہیں۔ آج کی بے مرکزیت کا شکار ہو چکے ہیں۔ کسی میراجی کو گھر یاد آتا ہے۔ لیکن فوراً ہی لمحۂ موجود کی اشتہار انگیزی اس کا رخ موڑ دیتی ہے۔ اور پھر وہ بھی ہجوم محرومی کا حصہ بن جاتا ہے۔ دھوپ تو بہت تیز رہتی ہوگی۔ ...... بے چارے ماں باپ اس افسانے کا قاری یہاں پر آ کر ٹھہر جاتا ہے کیونکہ وہ ایک کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ اور یہ کیفیت اس کے اور افسانے کے خالق کے درمیان ایک عجیب قسم کا وسیلہ بن جاتی ہے اکیلے پن کے احساس کی ترسیل کا۔ کیونکہ وہ جہاں پر وہ ماں باپ کے ساتھ بے چارے جیسا لفظ کا استعمال کرتا ہے۔ خود اپنے وجود کے مقام بے چارگی پر پہونچ جاتا ہے۔ یہ افسانہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے۔ کہ یہ نہ تو صرف ماضی کی بازیافت کی کوشش ہے۔ نہ صرف اس کو کھونے پر تاسف کی کیفیت بلکہ یہ ایک قسم کا موازنہ ہے۔ ماضی اور حال کے درمیان، یادوں اور ان کی بازیافت کے درمیان، اور کل کی طمانیت کے بکھر جانے اور آج کے انتشار کے مسلمہ امر بننے کے درمیان، اور ایک قسم کا موازنہ ہے مجبوری اور اختیار کے درمیان۔ اس طرح ماضی اور حال کے درمیان موازنہ انہیں آج کے حالات کا صحیح شعور دیتا ہے۔ جس کا اظہار بار بار ان کے افسانوں میں ہوتا ہے

آج کے لمحے جس بربریت کے عادی اور شکار ہیں ۔ اور جو وحشت ان کے قدموں سے قدم ملا کر چل رہی ہے جنگ کا خوف اپنے وجود کی بد دلی ، اور اپنے اعمال سے بے اطمینانی اس کا ثبوت ہیں ۔ اور یہی وہ عوامل ہیں ۔ جو آج انسانی زندگی کا جانا پہچانا عنصر بن چکے ہیں ۔

"ام الاجل رقص کر رہی تھی"
"ام الاجل سنگ کر رہی تھی"
"اور ام الاجل خود ہی قتل ہو رہی تھی"
"کسی گوشے سے کسی نے پکار کر کہا ، ہشیار ! یہ ام الاجل ہے ، تو تمام شہر میں کہرام مچ گیا"
(نیا منظر نامہ)

ام الاجل آج کے فرد کی بھی علامت ہے ۔ اور قتل و غارت گری کی بھی ۔ ویسے آج کا فرد بذات خود قتل و غارت گری کی علامت ہے ۔ جس نے معاشرے کا سکون اور کائنات کا حسن چھین لیا ہے ۔ یہ نیا منظر نامہ ہے زندگی کا ، کائنات کا ، قدروں کا ، اور تہذیب کے ارتقا کا ۔

ابتدا ہی میں عرض کیا گیا کہ حسین الحق اور قمر احسن کے یہاں مذہب اور تصوف ۔ اہم ترین عناصر ہیں ۔ قمر احسن کا افسانہ "یا مصطفیٰ" ان دو عناصر کا ضمیمہ ہے ۔ یا مصطفیٰ تباہی کے دہانے پر کھڑی ہوئی دنیا کی اس چیخ کی علامت ہے جو مذہب جو جنگ ، بدامنی ، خون خرابہ ، بھوک ، بداخلاقی ، بے اصولی سے ستائے گئے آدمی کی بے بسی کا اشاریہ ہے یا اس رویے کی توسیع ہے کہ سائنسی ترقیوں مارکس کی مادی تھیوری ، اور فرائڈ کی نفسیاتی تھیوری کے بے بنائے راستے پر چلتے ہوئے تھکے ہارے آدمی کے لئے ایک راستہ ہے ۔ مذہب کا یا تصوف کا ۔ اور یہ تصوف ہرگز ہرگز اسلامی تصوف نہیں ہے ۔ ہاں مذہبی تصوف کہا جاسکتا ہے جس میں قرآن کریم ، اسوۂ حسنہ ، انجیل مقدس اور ویدانت کے فاعول کی ملی جلی شکل نظر آتی ہے ۔ افسانہ نگار مادیت ، اس کی ماہیت زندگی اور اس کی حقیقتوں وغیرہ کو زیادہ تر ویدانت کے فلسفے کے ذریعہ سمجھنا چاہتا ہے ۔ اور بار بار ایسا لگتا ہے جیسے وہ تصوف کے راستے کا مسافر ہے ۔ جس نے حسین الحق کی طرح اپنے مرشد کا ہاتھ تھام رکھا ہے ۔

"وانی اور وناٹک نے الفاظ اور ان کے معانی ایجاد کئے ۔ اور ہری کے وجود سے یہ دنیا حقیقی نظر آتی جیسے ہم رسی کو سانپ سمجھ لیں ۔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے ، فضول فضول بے معنی .... سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات وشنو کا چہرہ کبھی کبھی ہاتھی جیسا ہو جاتا ہے ۔ بالکل ہاتھی جیسا ۔ شمس تبریز ناچنے لگتے ہیں ۔ اے شمس تبریز مجھ پر اپنا رحم کرنا ۔"
(یا مصطفیٰ)

یہ فلسفہ صرف تصوف کا نہیں ۔ کائنات کے ہر سچے ادرعمل رویے کا فلسفہ ہے ۔

"رات ہر شے کو مسخ کر دیتی ہے ہمیں رات سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ گیدڑ چلاتے ہیں اور دوسرے
کتوں کے مسلسل رونے کی آوازیں آتی رہتی ہیں"۔

یہ کائنات اسرار سے بھری ہوئی ہے اور تصوف ان اسرار کو روحانیت کا جامہ پہناتا ہے اور مذہب تصوف کو مہمیز عطا کرتا ہے۔ اسرار کی دنیا بڑی دلچسپ ہے۔ اور رات ہمیشہ سے ان کی آماجگاہ رہی ہے۔ رات کا تعلق خواب سے ہے۔ اور خواب روحانی تسلسل کی ایک کڑی ہیں۔ کائنات میں جو سر ہے وہ اس کے روحانی نظام سے عبارت ہے۔

"قبرستان میں بجو نئی قبریں کھود کھود اکرتے ہیں۔ بھوت، بدروحیں، اور
مستان کھوپڑیاں جمع کرتے ہیں۔ اور عفریت ان کھوپڑیوں کو ساز کی طرح بجاتے
ہیں۔" (یا مصطفیٰ)

اور رات اور رات ــــ سلسلہ روز و شب اس حیات و ممات، چھل پائیاں
اپنی ایڑیاں اٹھائے دروازہ دروازہ جھانکتی ہیں۔ اور اگیا بتیاں ساری رات
چھتوں پر قہقہے لگاتے ہیں۔ فضول، فضول، فضول، (یا مصطفیٰ)

اس افسانے میں کئی جگہوں پر فضول کی تکرار ہوتی ہے۔ جو تصوف کے مخصوص ترین نظریے کی تائید ہے جہاں اللہ بس باقی ہوس، ہر ایک مادہ، اعتبار، اطمینان ہے۔

کتاب کا سب سے پہلا افسانہ ہے "تعاقب" جو زیادہ تر افسانوں کے مزاج سے الگ ہے۔ یعنی اس میں عصری حیثیت تمام لوازمات کے ساتھ موجود ہے۔ بار بار اس کا احساس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار پر لمحۂ موجود کی گرفت بہت سخت ہے۔ اور آج کی خونریزی جس کا ہر فرد شکار ہے۔ اور خود غرضی جو آج چہروں کی پہچان ہے۔ پورے افسانے کی تعمیر کرتی ہے۔ آج کے حالات، جنگ، خون، گولیوں کے راؤنڈ میں گھرے ہوئے حالات ہیں۔ ایک ختم ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ دوسری جنگ کی آمد کا اشاریہ بنتا ہے۔ اور اسی طرح جنگ اور اس کی کارکردگی میں سماج بہت سارے مثبت افعال و اعمال کم ہو جاتے ہیں۔ جنگیں لامقصد لڑی جا رہی ہیں۔ اور ان کا حاصل صرف اور صرف بین الاقوامی بدامنی ہے

"اب اس میں بھرے جانے کے لئے کارتوس نہیں ہے بلکہ"......

"اب ان رائفلوں، مشین گنوں، اسٹین گنوں میں کیا بھریں۔ کیا یہی سوکھی گھاس
اور وہ دور بکھرے ہوئے پتھر؟ شاید سڑک بننے والی تھی"

یہاں سڑک کا بننا بین الاقوامی سطح پر ہونے والی بہت ساری تعمیری کوششوں کی علامت ہے۔ نہیں لیکن ساری کوششوں پر جنگ کی تیاریاں پانی پھیر رہی ہیں۔ ایسا ان میں بھرے جانے کے لئے کارتوس نہیں بلکہ انسانی ترقیوں کے وہ ارادے ہیں جو دنیا کو جنگ اور بدامنی کے خطرات سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ لیکن ناکام رہ جاتے ہیں اور اسی طرح سبھی خدشات ہیں جو آدمی کا مقدر بن کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ اپنی خدشات کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ صرف اپنے

تحفظ کے بارے میں سوچ رہا ہے اپنی سالمیت کے بارے میں. اجتماعی سکون یا عالمی امن و امان اس کے لئے ثانوی ہو کر رہ گئے ہیں۔

ابھی شہر بارہ میل دور ہے. اس نے سنگ میل دیکھ کر کہا. لیکن وہاں بمباری نہ ہو رہی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ شل ہونے لگا۔

آگ الاؤ اور صحرا ایک کامیاب ناولٹ ہے۔ جس میں بار بار آج کے فرد کی اس اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے جو مسلسل کربناک حالات کی ناامیدیوں نے اس کے اندر پیدا کردی ہے ایک کنفیوژن کی کیفیت ہے۔ جو اس پر حاوی ہے۔ وہ ماضی کی قید سے نکلنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ بھی اس کے بس سے باہر کی بات ہے ناولٹ سے حالات کا دست دگر بیان آج کا فرد ہے۔ جس کی شخصیت کی تعمیر، کش مکش، اثبات و انکار کے تضاد قبول و عدم قبول کے ٹکراؤ اور ایک نہ ختم ہونے والے انتشار سے ہوتی ہے اس طرح کاظم بھائی ماضی کی روایتوں سے لپٹا ہوا اسخطاطپذیر عکس ہے۔ جو ان روایتوں سے لپٹا ہوا ہے۔ اور ایک حد تک مطمئن ہے۔ اور غیر مطمئن ہے افسانے کا ہیرو جو آج کا نمائندہ ہے۔ اور جو کاظم بھائی کو روایتوں سے لپٹا ہوا دیکھ کر جھنجھلا جاتا ہے۔

"کاظم بھائی اب صرف ایک روایت ہے۔ جسے تم نباہ رہے ہو۔ ورنہ اب تمہیں بھی اپنے فلسفیوں کے کھوکھلے پن کا یقین ہو گیا ہے۔ لیکن تم بھی کیا کرسکتے ہو کہ سرگشتہ رسوم ہو اور سارے توہمات کو اس رسم سے باندھے چلے آرہے ہو"

"تعاقب" کا قمر احسن آج کے حالات کا اسیر ہے۔ عصری جھلکیوں کا اس کا احساس شدید ہے اور یہ شدید احساس اس افسانے کو یقینی طور پر اپنے عہد کی تشریح کے طور پر پیش کرتا ہے۔ درمیان میں' صدیاں، ہونا میمفہ، زد میں ہے رخش عمر، سیاسر پہ زانو اور بہار و بیراں' اور ابابیل کا قمر احسن ماضی کا ہوئے شدید احساسات سے ہم آہنگ ہے کبھی وہ ماضی اور حال کے درمیان کی خلیج پاٹنے کی کوشش کرتا ہے کبھی دونوں کا موازنہ کرتا ہوا۔ روایتوں اور آج کے حالات کے بیچوں بیچ کھڑی دیوار کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن آخرکار ناولٹ آگ الاؤ صحرا کا قمر احسن اکتا جاتا ہے۔ اور چیخ اٹھتا ہے۔

"جاؤ بھائی کاظم جاؤ نا! اور خانقاہوں میں تعلیم حاصل کرو، خودداری، اصول، تزکیہ نفس اور انفرادیت کے ڈھول پیٹو..........."

"کاظم بھائی اب صرف ایک روایت ہے........"

اور اس طرح تعاقب سے ناولٹ تک کا سفر ایک بڑا ہی ترتیب وار سفر ہے۔ جس میں افسانہ نگاری کی اپنی شخصیت کا نکھار بھی ابھرتا ہے۔ جس کا پس منظر ماضی اور روایت سے گہری وابستگی کا ہے اور عصر حاضر کی دو دیدہ پلڑاہیئ کا اس کا شعور بھی جھلکتا ہے۔

قمر احسن کا اسلوب انہیں افسانے کی بنیادی خصوصیتوں کے قریب کرتا ہے اور اس میں سب سے اہم داستانوی رنگ

ہے جو قمر احسن کا کمال ہے۔ ناقدین کہہ سکتے ہیں۔ نیا افسانہ داستان کے سحر سے آزاد ہو کر ایک صاف ستھرے اور سادہ اسلوب کا پیرو کار ہے ورنہ سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش کی سحر انگیزیوں سے آگے نہ بڑھ پاتا۔ تو عرض ہے کہ قمر احسن کی داستانویت "طوطا مینا" اور "بیتال پچیسی" کی داستانویت نہیں ہے۔ بلکہ کہانی کے موضوعات کو کہانی کے سچے اصول کی بات سے آگاہ کرنے کی بات ہے اور اس سچائی سے انکار شاید لیے ازامکان ہے کہ کہانی سب سے پہلے کہانویت کی طالب ہے۔ اور افسانہ افسانویت کا محتاج، اس سلسلہ میں یہ دلیل بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چونکہ آج کے حالات میں کہانویت افسانویت کے سحر کن عناصر یکسر غائب ہو چکے ہیں۔ اس فن بھی جو عنصر کی نمائندگی کرتا ہے ان تبدیلیوں سے متاثر ہوگا۔ یہ دلیل اس لئے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کہ اسلوب کی اہمیت بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور موضوعات کا تنوع اس پر اثر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور کہانی بہرحال کہانی تو رہنی ہی چاہئے۔ لہٰذا قمر احسن کا سب سے پہلی فنی خوبی ان کی افسانویت بلکہ داستانوی افسانویت ہے جو اساطیری اسلوب سے ہم رشتہ ہے اور جسے علامتوں کے استعمال نے مستحکم بنا دیا ہے بلا علامتوں کا قمر احسن کے اسلوب سے اٹوٹ سمبندھ ہے جسین الحق اور قمر احسن علامتوں کو تخلیقی بدل کے طور پر استعمال کرتے ہیں جہاں وہ اپنے ایک اہم معاصر شوکت حیات سے مختلف راہ اختیار کرتے ہیں۔ شوکت حیات کے یہاں علامتیں اور کہانی لازم و ملزوم ہو جاتی ہیں لیکن قمر احسن اور حسین الحق کہانی کے لئے علامتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے ایک اور معاصر شفق کے یہاں قصہ پن کے باوجود علامتوں کی اہمیت کہانی کی مرکزیت سے بڑھ جاتی ہے لہٰذا قمر احسن کے یہاں بھی علامتیں حسین الحق کی طرح افسانے کو تخلیقی حسن سے ہمکنار کرتی ہے۔ نہ کہ ان کو گو مجمل بناتی ہیں۔ اکثر اوقات علامتیں وسیع معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ اور لاشعوری اجتماعیت کا احساس دلاتی ہیں۔ لغاتب سے طلسمات تک علامتوں کا ایک پورا نظام ہے جس پر قمر احسن کے منفرد اسلوب کی چھاپ ہے۔

"پس پردۂ شب" انیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو سوانیزے حیات سے شروع ہوتا ہے۔ اور "صبا ویراں" پر ختم ہوتا ہے۔ یا جو حسین الحق کی فرد کی داخلی کیفیات پر گرفت سے شروع ہوتا ہے اور عالمی بحران کے احساس اور اس احساس کے ذریعہ پوری دنیا کے معاشرتی اور سیاسی تنزل کے مطالعے پر اختتام پذیر ہوتا ہے اور اس درمیان میں شاید کی لاسمتیت، شکستہ کہ تاریخی تسلسل کے حوالے سے کائنات کی بے اطمینانی، چہرہ پس چہرہ، کے پہلودار تہذیبی معاشرتی اور اخلاقی انہدام اور اخلاقی اقدار کے استحصال اور وقتاً عذاب اغاز کی مذہبی پس منظر میں عصری کشاکشوں کی بازیافت اور "الہیٰ تین" کے ارادۂ الہیٰ اور تقدیر کائنات اور مکافات عمل کے بظاہر منطقی مگر بباطن غیر منطقی یعنی وہ بانی اسباب و نتائج کے استنباط اور "لعنت لعنت" کے مذہبی پس منظر میں ورثے کے انہدام اور اس کے مناعاہ دماغ کی اجتماعی مضحکہ خیز کوششوں کی آئینہ داری وغیرہ کا مطالعہ ہوتا ہے۔

حسین الحق کا ذہنی پس منظر بھی تاریخ، تہذیب، مذہب اور تصوف کے مسلسل عمل سے عبارت ہے اسی لئے ان کے موضوعات پر تاریخ، تہذیب اور تصوف کی گرفت بے حد مضبوط ہے لیکن اس کے ساتھ ہی عصر حاضر

یہی عالمی پیمانے پر بڑھتی ہوئی بے چینی کی بحرانی کیفیت، اقدار کی شکست و ریخت کے نتیجے ہیں اور مادی ترقی ... کے اصل کے طور پر روحانی ارتقا کا جمود اور اخلاقی اور ذہنی افلاس۔ انسان کا کائنات کے اسرار سے بے خبر ہو کر لمحۂ موجود کی غلاظتوں میں ڈوبا ہونا اور عصر کی کثافتوں میں اٹ کر ماضی کے ورثے کی اہمیت فراموش کرنا۔ مادی اور عقلی دور میں آگے بڑھ جانے کے لئے انسان پر چھائی ہوئی بے حسی اور اسباب وجود کی بے ثباتی سے بے خبر مادی نظام کی پرستش وغیرہ ان کے موضوعات کو پہلودار بناتے ہیں۔ زندگی اور اس کے عوامل اور عہد کی کشمکش اور اس کے عناصر کا ان کا مطالعہ امتیازی وسیع ہے۔ جتنا اس پر اسرار کائنات اور اس کے مابعد الطبیعیاتی نظام کا، اور اسی لئے ان کے یہاں عصری آگہی کے ساتھ غیوب کی بڑی اہمیت ہے۔ پھر وہ تصوف اور تاریخ کے سہارے ہی زوال اقدار کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے افسانے میں تصوف ہر لحظہ سرگرم عمل ہے۔ تصوف بھی ان کے لئے معاشرتی حسیت کی دریافت کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح وہ بھی تاریخ، تہذیب اور تصوف سے تحریک لیتے ہیں۔ اور ان تینوں کے ایک خوبصورت تسلسل کے ذریعہ ان کے حوالے سے عصر حاضر کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حالانکہ قمر احسن بھی تصوف کے اثر میں قید ہیں۔ لیکن حسین الحق کے یہاں یہ جس شدت کے ساتھ رویے کی شکل اختیار کرتا ہے قمر احسن کے یہاں نہیں۔ قمر احسن کا اسلوب متصوفانہ ہے۔ اور حسین الحق کا رویہ۔ حسین الحق کے فن کا بڑا امتیاز مسائل پر ان کی گرفت ہے۔ یہاں تک کہ عصر حاضر میں مذہب اور تصوف میں بھی جو نام نہاد محرکات آج کام کر رہے ہیں۔ وہ ان پر چوٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔

مختصر یہ کہ روحانی نظام کائنات کے پر اسرار تسلسل، داخلی کیفیات اور صوفیانہ رجحانات سے لے کر سماجی اور اخلاقی تباہ کاریوں، بین الاقوامی مسائل کی پیچیدگی اور روز بروز بگڑتے ہوئے حالات، پر اندیشے کی کیفیت تک ان کا شعور سفر کرتا ہے۔ اور اسی طرح ان کے افسانے مختلف پہلوؤں کے ساتھ بڑی کامیابی سے مطالعہ کرتا ہے۔ ان کے لہجے میں ایک قسم کا روحانی اور وجدانی استدلال ہے جو انہیں ان کے دوسرے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ اور وجدان کی بازیافت کی تخلیقی کاوش اور تصوف کے مابعد الطبیعیاتی نظام پر ان کے اعتقاد کی مہر ثبت کرتا ہے۔ ان کے تخلیقی سفر کا مرکز برٹرنڈ رسل کی طرح ایک خواب عرفاں کی تلاش ہے۔ جو ذاتی بھی ہے اور سماجی بھی۔ یعنی وہ مادی نظام سے زیادہ روحانی نظام میں یقین رکھتے ہیں۔ اور کائنات کی پراسراریت کے ڈانڈے خارجی عوامل سے ملاتے ہیں اور یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تخلیق کی منزل پر صوفی ہیں۔ اور نظریاتی طور پر ایک ایسے معاشرتی نظام کے متلاشی ہیں جس میں افراد آزادانہ طور پر بڑھتے پھلتے ہیں۔ جہاں نفرت، لالچ، حسد اپنی موت آپ مر جانے۔ کیونکہ غذا انہیں نہیں ملتی۔ (برٹرنڈ رسل)۔ اور اس تلاش میں وہ جگہ جگہ روایت سے اور ماضی سے اور گذرے ہوئے زمانوں کے سحر سے استفادہ کرتے ہیں۔ کلام حیدری کہتے ہیں:

حسین الحق کے پاس روایتوں کا خزانہ ہے اور وہ انہیں جدید عہد کیلئے
RELEVEUL بنا کر پیش کرتا ہے۔ مذہب اس کی تربیت کا پس منظر

ہے۔ اور جدید دور میں اس پس منظر کو ہی افسانے میں FADE یا OUT FOCUS بناتا چلا جاتا ہے۔

اور روایتوں کا یہ خزانہ حسین الحق کی ہنر کاری کا مخزن لیکن وہ روایتوں کے جمود کے قائل یا طرف دار نہیں، بلکہ ان کو ایک تاریخی تسلسل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور اس پیش کش اقدار کی شکست و ریخت پر جوان کے اندر دکھ کی لہر ابھرتی ہے۔ اور نئی اقدار کے جھوٹ کو برداشت کرنے میں وہ جس اذیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس احساس کا اظہار ان کی انفرادیت ہے۔

"میرے اندر ستارے اوس کے دھندلکے میں کھوتے جا رہے ہیں۔ اور میرے باہر چاروں طرف رات سسکیاں لیتی پڑی ہے" (شائد)

"میں صدیوں سے یہاں خموش ٹھہرا ہوا ہوں .... صدیوں سے بہہ رہا ہوں .... صدیوں سے کہیں نہیں ہوں، جہاں بھی ہوں میرے چاروں طرف رات ہے۔ اور اس کے اسرار اور ندی کے سینے پر بہتے ہوئے تیرتا ہوا چراغ ...... صدیوں سے یہی رات ...... گہری سیاہ پراسرار رات......" (شاید)

رات اس کم مائیگی کی علامت ہے جس نے مادی علائق میں گھرے ہوئے ضابطوں کے ذریعہ فرد کو اس کے اپنے وجود سے بے خبر کرکے رکھ دیا ہے۔ بے خبری کا یہ اندھیرا روح کی روشنی سے عاری جس کا انسلاک اس ابدیت سے ہے جس کی جستجو میں سرگرداں ہے۔

"تو پھر یوں ہوا تھا کہ جب ہم نے لنگر اٹھایا تو یہ سمجھا تھا کہ اب اس کنارے اور اس کنارے سے ہمارا ہر تعلق ختم ہو چکا ہے۔ ہمارا جسم، ہماری روح، ہماری جلد ہمارے خون کے مسامات، ہماری صبحیں، ہماری شامیں، سب ہمارے ساتھ ہمارے نئے مکان تک جائیں گی۔ مگر یہ کیا ہوا کہ ہم جب ٹوٹ پھوٹ کر نئے درختوں کے سائے میں پہونچے، تو یہ احساس ہوا کہ سب کچھ وہی ہے، البتہ ہم .... کہ ہم اپنے کو محفوظ کرنا چاہتے تھے خود غیر محفوظیت کا شکار ہو گئے" (شکستیدہ)

اس غیر محفوظیت کے احساس کے ساتھ ہی حسین الحق کے یہاں وجود کی بے ثباتی ایک بڑی اہم چیز ہے جس کا اشاریہ ان کے مختلف افسانوں میں ملتا ہے۔ وجود کی بے ثباتی دراصل تصوف کے اصطلاح میں کائنات کے آغاز اور انجام کو پر اسراریت کی چادر اوڑھا دیتی ہے۔ 'ملبہ' اس بے ثباتی کا مظہر ہے۔ اور ساتھ ہی خارج سے داخل چھپتے رہنے کا استعارہ بھی ان کا ایک افسانہ کربلا (جو اس کتاب میں شامل نہیں ہے) بھی کم وبیش اسی رویئے کا آئینہ دار ہے۔

خواجہ مجھے واپس لے چلو۔ خواجہ مجھے واپس لے چلو ....
اور مرشد دروازے تک پہونچا کر خود واپس ہو چکا ہے۔ اور میری راہ گم ہے۔ اور

سینوں پر ہزاروں لولوں کی ٹاپ گونج رہی ہے۔" (کربلا)

"جنت، جہنم، اعراف، تمام مقامات کی کھڑکیاں بیک وقت کھول دی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ مجھ سے کہتا ہے میں نجی پرلتوں کی تہیں کھولنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ کھولتے ہوئے سمندر میں کود و" (بلبلہ)

نجی پرلتوں کی تہیں وجود کی پرتیں ہیں۔ اور یہ دعوت نظام فطرت کی طرف سے ہے جو وجود کو آگہی کی دولت بخشنا چاہتا ہے۔ اور ایسے میں کھولتے ہوئے سمندر میں کودنا لازم ہے کیونکہ انسان کا اپنا وجود خود اس کے لئے کھولتے سمندر کی مثال ہے۔ اور اس کھولتے سمندر میں کود کر ہی وہ آگہی کی دولت سے مالا مال ہو سکتا ہے۔ اور اس وقت اس کے لئے جنت، جہنم، اور اعراف یکساں اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ بلبلہ ظاہری طور پر تو ایک کامیاب علامت نہیں بن پاتا ہے۔ لیکن اس کی تہہ داری اس کی کامیابی کے لئے حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ افسانے کے اختتام کا معنوی حسن افسانے کو ایک خاص رُخ عطا کرتا ہے۔

"اسے دیکھ کر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا کہ میں اس سے لپٹ پڑا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، میں تم سے الگ ہو کر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا .... میں مر جاؤں گا، مر جاؤں گا میں نے سسکیوں میں کہا۔
وہ آہستہ آہستہ میری پیٹھ پر اپنے ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر میری گردن میں اس نے اپنے دانت پیوست کر دیئے۔ اور میرا خون چکنے لگا"

یہاں لپٹنا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا ہم رشتگی کی علامت ہے۔ اور یہ رشتہ ایسا ہے کہ میں تم سے الگ ہو کر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ لیکن جس سے الگ ہو کر ایک پل بھی نہیں رہا جا سکتا وہ گردن میں دانت پیوست کر کے خون پینے لگتا ہے۔ یعنی آج محبت اور دشمنی کے سارے اندازے غلط ہو چکے ہیں۔ اور آدمی ان غلط اندازوں کے درمیان گھرا ہوا زندہ رہنے پر مجبور ہے۔ رشتوں کے کھوکھلے پن، تعلقات کی مکاریوں، انسان اور انسان کے درمیان دلوں کا بُعد، محسوسات اور کیفیات پر چھائی ہوئی جھوٹ کی لہر یہ سب عوامل انسان کو اس کی روح کی پاکیزگی سے دور کر رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو قتل کرتا ہے۔ لیکن اسے خود اس کی خبر نہیں ہے۔

میں اپنے سینوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے اس کمرے میں تڑپ رہا ہوں اور اس کمرے میں ناف کے بیچ سے دو ٹکڑے کی ہوئی مریم خاموش پڑی .... اور پھر اچانک میرے کمرے کا دروازہ ٹوٹ جاتا ہے.....
میں، وہ، اور تم .... اور میں ..... صرف میں .... صرف میں

۔۔۔۔۔ ہر طرف میں ۔۔۔۔۔ لیس میں ہی ہوں۔

آج کا انسان بالکل ابتدائی انسان کی طرح وحشت، درندگی، اور بربریت کا شکار ہے اور یہی اس کی پہچان ہے کہ اس کے اندر سے محبت، رحم، اور اخلاقی قدروں کے عناصر مفقود ہو چکے ہیں۔ وہ خود اپنی پہچان کھو چکا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سفاک مناظر نے اس کی آنکھوں سے شعور کی بینائی چھین لی ہے۔ اور یہ اندھا پن سماج میں کھیلے جانے والے وحشیانہ کھیل کی علامت ہے جو ہر سطح پر کھیلا جا رہا ہے۔ اور جس میں زید، بکر سب ہی شریک ہیں:

"میں بے تابی سے ایک شگاف سے اس کمرے میں جھانکتا ہوں، ازلی اور ابدی
تنہا محصور عورت ۔۔۔۔۔۔ نہیں، میں نے غلط کہا ۔۔۔۔۔۔ تنہا بے سہارا
بچی ۔۔۔۔۔۔ اور ایک سہمی ہوئی مامتہ ۔۔۔۔۔۔ اور میرا ساتھی جو دودھیا
رشتوں سے اس کے آنے کا منتظر ہے۔"

افسانہ نگار نئے حالات کا اتنا گہرا شعور رکھتا ہے کہ معاشرے کی کنگنگی اور بے راہ روی دبے اور کچلے ہوؤں کے استحصال سیاسی، سماجی اور اخلاقی انتشار۔ اور انسانی قدروں کے زوال پر وہ ایک ایسے کردار کی طرح چیختے ہیں جو ان دکھوں کو بھوگ چکا ہے۔ اور مسلسل بھوگ رہا ہے۔ جس نے قدروں کو لٹتے، بکھرتے۔ اور نئی لیکن ظاہر ارتقا پزیر نہیں۔ بہ باطن زوال آمادہ قدروں کو ان پر غالب ہوتے ہوئے اور ماضی سے جڑے ہوئے روایتوں کو سینے سے لگائے انسان کو اس ملتوی اقدار کی بزم میں رسوا ہوتے دیکھا ہے۔ ان کا مطالعہ ایسے تجربوں پر مبنی ہے جن کا تعلق روحانیت اور مادیت کے بعد سے ہے۔ یعنی ان ذہنی اور مزاجی پس منظر آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے ان معاشرتی ضابطوں کا ہے جس پر مستقبل کی بلند و بالا عمارت کی بنیاد رکھی جانی چاہئے تھی۔ لیکن نہ رکھی جا سکی خود ہندوستان میں ایک صدی کے اندر حالات نے کیا سے کیا پلٹا کھایا ہے۔ اور حالات کی ان تبدیلیوں نے یہاں کی معاشرت اقتصادیات، اخلاقی حالات۔ اور تہذیبی صورت حال کے تسلسل پر کس طرح اس کا اثر ڈالا ہے۔ اس کا مطالعہ تقسیم سے اب تک کے ایک سرسری مطالعے سے بھی ہو سکتا ہے۔ ان تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ:

"پیغامبر مایوس لوٹا، کہ شام سر پر کھڑی تھی۔ اور پرندے کے جسم کا سارا لہو
اس کے بازوؤں میں سمٹ آیا تھا۔ دورت اور مماثلت میں سخت تھی
اور زہر ہوائیں ان کے تھپیڑوں کی ہم رنگ حصار پر دھند حاوی، باہر دلیزاد
اجداد کے جانشین جبلت کے ہر پہلو کو غلط ثابت کرنے کے مشن پر پابہ رکاب
اور میان دلوں و بیروں، کبھی ہاں، کبھی نہیں۔"

یہاں پیغامبر کا مایوس لوٹنا، تقسیم کے مایوس کن نتائج کی علامت ہے اور شام تمام قومی جذبوں اور سیکولر نظریوں کے حوصلوں کی تھکاوٹ کی علامت ہے۔ اور یہ پیغامبر مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہے۔ پھر اس کہانی کا کینواس اور وسیع ہوتا ہے اور یہ آزادی اور تقسیم سے اب تک ہندوستان، پاکستان، اور پھر بعد میں بنگلہ دیش

کے سیاسی بحران اور ان تینوں ممالک کے درمیان تعلقات اور ان تعلقات کے صرف سیاسی اصولوں پر ٹکے ہونے کی کہانی بن جاتی ہے۔

جہاں گرد نے آہستہ سے صفحات الٹ دیئے۔ جب بنوعبیات، اور بنو بلبک کے درمیان رشتہ اخوت قائم ہوا۔ تو قبیلے کے تمام افراد نے اس یکجائی کا جشن منایا کہ جشن وصال میں درد مہجوری کا کم ہونے کا امکان۔ مگر بنوعبیات جو مشرق سے ہجرت کر کے بنو بلبک کے شہروں میں داخل ہوئے تھے۔ اپنے احساس زیاں کے اہتمام کے جویا تھے۔ اور تب ایسے میں دیوار گریہ کی تجسیم نے سر اٹھایا جو ثئے اور لاشئی کے مابین قائم کی گئی" (الی حین)

اس سے قطع نظر کے افسانہ علامتی اور تمثیلی طور پر کتنا کامیاب ہے کہ اس کا ذکر بعد میں آئیگا یہ دیکھنا ہے کہ افسانے کا موضوع اپنے اندر کتنی تہہ داری رکھتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو اس کا سیاسی پس منظر ہے جس کو برتنے میں افسانہ نگار بے حد کامیاب ہے دوسری طرف جیسا کہ عرض کیا گیا ارادہ الٰہی، تقدیر کائنات، اور ان سب سے بڑھ کر مکافات عمل کے اصولوں پر اس افسانے کا انحصار ہے۔

بس ایک آواز گاہے گاہے ابھرتی پھر ڈوب جاتی......... بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ....
وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ .... وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ

تو ضرغام آفندی جہاں گرد آہستہ آہستہ بڑبڑایا۔ تمہارے الزام کے مطابق ذوالفقان کمنتبور نے سردار نقش تاب قصوری کو پیچھے کر صرامیں تربا تربا کر مارا۔ مگر شرعی عدالت کے نصف قاضیوں کی رائے ہیں۔ چونکہ ذوالفقان موقع واردات پر موجود نہیں تھا اس حد شرعی کا سزاوار نہیں ہوتا۔ لیکن تم اس اختلاف رائے کے باوجود اسے قاتل گردانتے ہو۔ تو تم اپنے کو کہاں پہ رکھو گے ضرغام آفندی؟

میں لکھدوں جہاں گرد؟ مؤرخ نے سر اٹھا کر پوچھا۔ تو جہاں گرد نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھدیا۔ ذرا اور ٹھہر جائیے، جہاں گرد نے اس سے کہا۔ تم کیوں تکلیف کر رہے ہو۔ ذوالفقان، کمنتبور اور ضرغام آفندی اپنے لئے خود ہی بعض کا بعض ہیں۔ اور خود ہی اپنے خلاف فیصلہ لکھنے میں مشغول ہیں

یہاں جو کچھ ہو رہا ہے قدرت کی ہدایتوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ مکافات عمل کا ایک تاریخی تسلسل ہے۔ اور یہی تسلسل "ہر عروج را زوال است ہر زوال را عروج" کی تصویری پر بھی جاری ہے۔ وقت کسی کو معاف کرنے

ئے تیار نہیں۔ اور ہر شخص کو اپنا حساب یہیں چکا کر جانا ہے۔ اور اس طرح ہر شخص اپنے مکر و فریب کے کھیل میں
دسے دشمنی کرنے اور اپنے خلاف گواہی دینے میں مصروف کار ہے۔ جہاں گرد اس منظر کو دیکھ رہا ہے۔ اور
یخ کے صفحات اسے اپنے اندر محفوظ کرنے کے لئے تیار ہیں تاکہ یہ عِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَار ہو سکے۔ یہ
نات کے HISTORICAL PROCESSES ہیں جن کے انضمام سے کائنات عبارت ہے اور یہ ارادۂ
، اور تقدیر کائنات نے ہر عمل کا ہر وقوع کا وقت مقرر کر رکھا ہے جس میں کسی دوسرے کا دخل نہیں۔ اس طرح
رادر جبر کے درمیان پوری کائنات ٹنگی ہوئی ہے۔ اور مورخ کے ہاتھ میں قلم ہے کہ فیصلہ اب ہوا ہی چاہتا ہے
...... شاید صرف وقت مقررہ کا انتظار ہے۔

حسین الحق کی یہ انفرادیت اور ان کا امتیاز ہے کہ وہ بیک لمحہ اس کائنات اور اس پر تقدیر کی حکمرانی اور
ادۂ الٰہی یا مشیت الٰہی کے اختیار، کائنات کے جبر، معاشرے کا موجودہ نظام اور اس کی سیاسی اور اخلاقی گراوٹ
نت و تاریخ کے لئے لڑائیوں، معرکوں اور ان سب میں دبے ہوئے درمیانی درجے کے معصوم لوگوں اور ان کی
نسیات اور ان کی الجھنوں اور ان کے مسائل اور ان مسائل کے حل کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ان سب کا احاطہ
رتے ہیں:

"ایک کتا، ایک بھیڑیا، ایک بلی، ایک خرگوش ...... ایک کتا، ایک
بھیڑیا، ایک بلی، ایک خرگوش ......"
اور تب میں آہستہ سے بڑبڑاتا ہوں۔ ایک جبار، راحیل، شرا ایک میں اور
میرا بیٹا، ..... اور ایک وہ غریب بہتر (چہرہ پس چہرہ)
اور رانچی جہاں کے میلے میں میری بہن کھو گئی ...... اور فرات کا لبِ
سو، خالو زادہ، اور لبنان کا آخری فلسطینی کیمپ ...... اور میرپور
اور محمد پور میں نالی کا پانی پیتے ہوئے بوڑھے، اور بجباتی نالیوں میں چھپ
کر جان بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بچے ...... اور مائی لائی لوا
کھائی اور جمشید پور میں مرتا ہوا ذکی الوز"

اور یہاں ذکی الوز ان تمام مشیت اقدار میں یقین رکھنے والے انسان اصلاح پسند اور امن دوست لوگوں
کی علامت ہے۔ جو مسلسل باطل اور ظلم و فسطائیت کے خلاف جنگ کرنے کے لئے برسرپیکار ہیں۔ اور یہاں حسین الحق
خود ذکی الوز ہیں۔ کیونکہ جس شدت کے ساتھ وہ ان دکھوں کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ان دکھو
ں بھوگ رہے ہیں۔ فرات سے جمشید پور تک حق اور باطل، ظلم اور انصاف امن اور بدامنی کی اس جنگ میں وہ خود
شریک ہیں:

میرے یہ بچے ...... کومل بھبک اور نازک سے پھول جنہیں میں نے

کبھی گرم نگاہی کے لذت سے اس لئے آشنا نہیں کیا کہ اگر ان آنکھوں میں
گرم نگاہی کا کوئی مدھم سا احساس جاگ پڑا تو کیا ہوگا۔؟ اور وہ بچے چاکلیٹ
خریدنے جائیں اور عیسیٰ بن جائیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ہمارے ہوتا؟ (شکستہ)

شکستہ، حسین الحق کی ایک شاہکار کہانی ہے یہ مشرقی پاکستان کے خونیں ڈرامے سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ لیکن یہ کہانی صرف مغربی پاکستان کی نہیں۔ بلکہ کربلا سے لے کر فلسطین اور رانچی اور جمشید پور تک کی کہانی ہے۔ بڑی اور فسطائی طاقتیں کہ امن دشمنی اور جنگ پسندی اور باطل نوازی حق کا مسلک ہے۔ روز ازل سے یہ کھیل کھیل رہی ہیں۔ اور تبھی ہی سے فنکار اس دکھ کو محسوس کر رہا ہے کہ واقعی یہ سارے میں کیسا اکھڑا آگ پھیلا ہوا کبھی تقدیر کے نام پر کبھی جبر و مشیت اور رضائے الہی کے نام پر اور کبھی حق و باطل کے ٹکراؤ کے نام پر۔ لیکن حسین الحق بھی آج کے ہر فرد مجبور کی طرح اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑتے ہیں اور منتظر آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھتے ہیں۔ اور یہ بھی پتہ نہیں چل پاتا ہے کہ ڈرامہ کی شروعات ہے کیا؟

اس سارے وقوعے میں سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کبھی ایسا لگتا ہے کہ
ڈرامہ اب شروع ہونے والا ہے۔ اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ سب
سامان سمیٹ کر رخصت ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔ (منظر کچھ یوں ہے)

حسین الحق کا اسلوب یا تو وجدانی ہے یا متصوفانہ، اور اس میں جو تاریخی اور تہذیبی تسلسل کا لمس ہے وہ اس میں اور نکھار پیدا کر دیتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ وہ کہانی لکھنے کے ساتھ کہانی کہتے ہیں۔ اس لئے کہانویت اور افسانویت جو فکشن کا لازمی عنصر ہے ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود رہتا ہے پھر اس افسانویت کو جو وہ اپنے خاص علامتی اسلوب سے جوڑتے ہیں۔ تو اردو کہانی میں علامت نگاری مستقبل میں پُر تغیر ہونے لگتا ہے۔ اور ڈاکٹر محمد عقیل کی اردو کہانی کے متعلق رائے مضحکہ خیز نظر آنے لگتی ہے:

آج کسی عظیم افسانے کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسے صرف شعلہ مستعمل کی طرح دیکھئے
اور پھر آگے دوسرے موڑ کے لئے تیار ہو جائیے۔ اور عظیم موضوع رہ گئے ہیں۔
اور نہ ہم میں اظہار قوت۔ اس علامتی اظہار کا رنگ اختیار کیا ہے۔

(جدید افسانہ اس کے مسائل از ڈاکٹر محمد عقیل)

یہ بات انہیں صرف ان افسانہ نگاروں کے لئے کہنی چاہئے تھی۔ جو علامتوں کو فیشن کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ ورنہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ کوئی بھی تخلیق بغیر علامتوں کا سہارا لئے خوب صورت اور بڑی یا ان کے مطابق عظیم تخلیق بن سکے

اس طرح حسین الحق کے اسلوب کی پہلی پہچان ان کی علامت نگاری ہے۔ وہ علامتوں کو تخلیقی بدل کے طور پر استعمال کرتے جس کا خوب صورت نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں قطعیت نہیں رہتی ہے۔ بلکہ وہ موضوع کے تسلسل

سے بڑھ کر ایک ایسا اسلوبی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ جو افسانے کی خوبی اور افسانہ نگار کی انفرادیت بن جاتا ہے بجران کی علامتیں کبھی سپاٹ نہیں ہوتیں۔ بلکہ تہہ دار ہوتی ہے۔ اور بیک وقت کئی پہلو رکھتی ہیں۔ ایک ہی علامت بیک وقت کئی تاریخی، تہذیبی، صوفیانہ مذہبی اور فنی مطابقت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ ان کے اظہار میں جو لہجے کی ندرت اور بیان کی قدرت ہے۔ وہ ان کے وجدانی یا علامتی اسلوب کی دین ہے۔ میں وجدان یا علامت اس لئے کہا کہ ان کے یہاں یہ دونوں ایک ہی حیثیت کے حامل ہیں۔ یعنی وجدانی لہجہ میں علامتی طرز بیان میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ضم ہوتا ہے اور یہ انضمام افسانہ نگار کے فنی احتیاط کی دلیل بن جاتا ہے۔ ان کے وجدانی لہجے کی جڑیں ان کے صوفیانہ استغراق میں پیوست ہیں۔ وہ ایک صوفی کی طرح کائنات کے "کالعدم" ہونے میں یقین رکھتے ہیں۔ لمحہ موجود کا شعور انہیں حاصل ہے لیکن اس پر وہ اعتبار نہیں کرتے۔ 'رات' ایک ایسی علامت ہے جو بار بار ان کے افسانوں میں دہرائی جاتی ہے۔ اور وجود کی بے ثباتی کی علامت ہے۔ اسباب وجود اور مظاہر وجود کا کھوکھلا پن ان کے تجسس کا نتیجہ ہے۔ جسے وہ ایک درویش کی طرح دنیا کے روبرو پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ 'سوز' (جو اس کتاب میں شامل نہیں ہے)۔ اردو کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس افسانے اور کئی دوسرے افسانوں میں وہ ملفوظات سے اکتساب کرتے ہیں۔ اور اس طرح متصوفانہ اسلوب ملفوظاتی اسلوب بن جاتا ہے۔ جو اردو میں بالکل نیا ہے۔ بہرحال اس صوفیانہ استغراق سے ان کا وجدانی لہجہ جنم لیتا ہے۔ جسے وہ علامتوں سے آراستہ کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانوں کا علامتی نظام ایک جداگانہ بن جاتا ہے۔ ان کی علامتیں ایڈگر ایلن پو اور ملارمے کی علامتیں نہ بن کر ڈبلیو۔ بی ییٹس کی علامتیں بن جاتی ہیں:

SOWE REVCLATION IS AT HAWD

THE TELOUD COMING IS AT HAND

(THE SEEOND COMING)

اور ہمارے پیچھے وہ قافلہ ہے جو بس اب شہر میں داخل ہونے والا ہی ہے

(پس پردۂ شب)

اس کے علاوہ ان کی علامتیں ABSTRAEL نہیں ہیں۔ ان میں زندگی کا ایسا احساس موجود ہے جو موضوعات اور دروں افسانہ کے تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ ان کی علامتیں ان کے اظہار میں الجھاؤ پیدا نہیں کرتیں۔ بلکہ وہ خالی نقوش میں رنگ بھرنے کا کام کرتی ہیں۔

مندرجہ بالا باتیں اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ حسین الحق اور قمر احسن "پس پردۂ شب" یا "آگ الاؤ اور صحرا" آٹھویں دہائی میں اردو افسانے کو ترقی پسندی جدیدیت یا مقصدیت اور علامتیت کی برائے نام جنگ کے حصار سے نکال کر ایک واضح سمت عطا کرتے ہیں۔ یہ دونوں افسانہ نگار اس لحاظ سے اپنے معاصرین کے درمیان انفرادیت کے حامل ہیں۔ کہ جہاں ان کے دوسرے معاصرین زیادہ تر صرف اور صرف عصر حاضر کی آگہی کی عذاب جھیلتے ہیں

اس کا اظہار اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ وہاں یہ دونوں افسانہ نگار اس قسم کی تمام قیود سے بے نیاز ہو کر اپنے موضوعات کو براہ راست حیات اور کائنات کی وسعت تک پہونچاتے ہیں۔ ان کا حیات و کائنات کا یہ مطالعہ تصوف کو اپنا آلۂ کار اور دیو مالائی ماحول اور طلسمی فضا کو اپنا طریق اظہار بنانا طے کرتا ہے۔

قمر احسن اور حسین الحق نے اردو افسانے کی روایت کو بلند و بانگ دعوؤں سے الگ ایسا ستھرا پن عطا کیا ہے۔ جس کی ابتدا انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر سے ہوتی ہے۔ جس کو غیاث احمد گدی، جوگندر پال اور کلام حیدری آگے بڑھاتے ہیں اور جس کی خوبصورت ترین توسیع حسین الحق، قمر احسن، زاہدہ حنا، اور ایک حد تک شوکت حیات اور علی امام کے یہاں ہوتی ہے۔ قمر احسن اور حسین الحق ماضی کے حصار میں گم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ عصر سے بے خبر نہیں۔ لیکن ان کے یہاں ماضی کی حسن اور حال کی کثافتوں کا تضاد اور ان کا موازنہ اپنے اندر ایسی تکمیلیت رکھتا ہے جو انہیں صنعتی بلندی اور وجدانی کمال کے ذریعہ آگے بڑھاتے ہیں ——————

علی حیدر ملک (پاکستان)

تیسری آنکھ

میں نے اسے حیرت کے زاویئے سے دیکھا وہ کوئی اور نہیں میری بیوی تھی۔

میں اپنے کنوارے جسم کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔

راہباؤں کی سی سنجیدہ یہ آواز اس عورت کی تھی جس سے میرا رشتہ ہی ازدواج کا ہے۔ اور جو گزشتہ تین سال سے بلا ناغہ ہر رات میرے بستر کی ایک ایک شکن کی شریک رہی ہے۔

اپنی بیوی کی یہ بات سن کر میری عقل کے سارے سوتے جیسے مفلوج ہو گئے اور میں بے بسی کے عالم میں بے تحاشہ قہقہے لگانے لگا ۔۔۔ ہاہاہا .... ہاہاہا

احمقوں کی طرح قہقہے نہ لگاؤ اس نے بے شکن لہجے میں کہا۔ اور دونوں ہاتھوں سے کنڈوم اور ڈایافرام کے کئی خالی بھرے پیکیٹ میرے چہرے کی طرف اچھال دیئے۔ تب میری دونوں آنکھیں ندامت کے پانی سے بھیگ بھیگ کر مندنے لگیں۔ اور تیسری آنکھ آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔ لیکن قبل اس کے یہ پوری طرح کھل پاتی دروازے پر بڑی بے چین سی دستک ہونے لگی۔ میں دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ دستک دینے والا شخص دھڑ بے دھڑک اندر آ گیا۔

میرے ساتھ چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ اس نے کہا!

لیکن کہاں؟

یہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

آخر کیوں؟

تم اس سے بھی واقف ہو جاؤ گے۔

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے ہم محل نما عمارت کے قریب پہونچ گئے۔ یہ ایک حسین اور فلک بوس عمارت تھی جس کے چاروں طرف محل کی دیواروں سے بھی اونچا سنگی حصار کھینچا ہوا تھا۔ اس سنگی حصار کے گرد مسلح اور چاق و چوبند سپاہیوں کی ایک فصیل کھڑی تھی۔

مجھے اس شخص نے محل کے اندر ایک بہت بڑے کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ میں نے اپنی نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ایک بہت بڑی اور اونچی سی کرسی پر ایک نہایت

پونا آدمی کرسی کے پیچھے مضبوطی سے تھامے بیٹھا تھا۔

میرے ساتھ والے آدمی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے
ولی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر کہا!

ظلِ سبحانی، حاکم جاودانی، سلطان عالم، معمارِ اعظم
رشتہ عنایات، عقلِ کائنات ....

وہ اسی طرح نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ لیکن میں یہ
الفاظ یاد نہ رکھ سکا کیونکہ ان میں بیشتر میرے لئے قطعی اجنبی
تھے۔ لفظوں کی برات رُکی تو اس شخص نے گہری سانس لی
اور پھر ذرا دم لے کر بولا، مژدہ ہو کہ یہ شخص اپنی ان دیکھی نسل
کے بوجھ سے بیزار ہے۔ اور خوش و خرم زندگی گذار رہا ہے جس
کا ثبوت یہ ہے کہ آج یہ قہقہہ لگاتے ہوئے رنگوں ہاتھوں پکڑا
گیا ہے۔

بہت خوب ـــ بہت خوب ـــ حاکم کے شہر
کے چھونے سے سر پر رکھے ہوئے بڑے سے تاج میں لرزش
پیدا ہوئی۔ اے میری خوشحال قوم کے زندہ دل فرزند!
ابدولت تجھ سے بہت خوش ہوئے ـــ مانگ تو کیا
مانگتا ہے؟

میرے مہربان آقا! بندہ جان کی امان کے بعد
ایک سوال کا جواب چاہتا ہے۔

بولو ـــ پورا ایوان نرم دل آقا کی کرخت آواز
سے لرزنے لگا۔

سوال یہ ہے کہ میری ذاتی اور نجی باتوں کا علم اس
آدمی کو کیسے ہوا؟

موذی مکھی کی مانند اس شخص نے جو مجھے اپنے
ساتھ لایا تھا۔ حاکم شہر کی طرف دیکھا۔

اس سوال کا جواب دیا جائے۔ حاکم نے حکم صادر کیا

اے میرے عزیز ہم وطن! تو نے سنا ہوگا کہ
دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ظلِ سبحانی نے شہر کی
تمام دیواروں میں سچ مچ کے کان اور آنکھیں لگوا دی ہیں
تاکہ رعایا کی خبر گیری کی جا سکے۔ تمہیں اس بات کے لئے حضور
پُر نور کا ممنون ہونا چاہئے کیونکہ اسی میں تمہارا اور
تمہاری قوم کی مفاد ہے۔

سو میں نے اپنے اور اپنی قوم کے مفاد میں سر
تسلیم خم کر دیا۔ اس کے عوض میری بھاری تنخواہ مقرر ہوگئی
اور مجھے یہ کام سونپا گیا کہ میں شہر کے ہر چوراہے پر
کھڑا ہو کر دن بھر قہقہوں کی بارش کرتا رہوں۔ تاکہ ان
نافرمان باغیوں کا منہ بند کیا جا سکے جو یہ کہتے تھے کہ ایک
بڑی نحوست ہم پر مسلط ہو گئی ہے جس نے ہمارے
لبوں سے ہماری مسکراہٹیں چھین لی ہیں۔ شہر کے لوگ ہنسنا
بھول گئے ہیں۔ اور بچے اس لفظ سے قطعاً نا آشنا ہیں
میں اس الزام کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے
ہر موڑ ہر چوراہے پر قہقہے انڈیلنے لگا۔ لوگ تعجب
سے مجھے دیکھتے اور ہمدردی کی سوئیاں میرے وجود میں
چبھو کر آگے بڑھ جاتے۔ جیسے میں کوئی پاگل ہوں۔ ایک
دن ایک بچے کو حیرت سے تکتے ہوئے اپنی طرف دیکھ کر
ہنستے ہنستے اچانک میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔
اور میں رونے لگا۔ حاکم شہر کو اس کی خبر ہو گئی اور
اس نے دربار میں بلا کر مجھ سے کیفیت طلب کی۔

کیا تم باغیوں سے مل گئے ہو۔ صاف صاف
بتاؤ ورنہ .....

بندہ پرور! آپ کو یہ گمان کیسے ہوا کہ آپ
کا غلام نمک کا ذائقہ بھول سکتا ہے۔

تو کیا یہ غلط ہے کہ قہقہوں کی بجائے سر بازار تمہاری
آنکھوں سے آنسوؤں بہنے لگے تھے ؟

حضور عالی ! یہ بالکل سچ ہے لیکن وہ خوشی
کے آنسو تھے ۔ انسان جب حد سے زیادہ خوش ہوتا ہے
تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ۔

میری یہ بات حاکم کے دل کو لگی اور اس نے
میری دانش مندی سے متاثر ہو کر مجھے اپنا مشیر خاص مقرر
کر لیا ۔ اب میرے سپرد یہ کام ہوا کہ شہریوں کے لئے معلومات
اور تفریح کا سامان فراہم کروں ۔

سو میں نے ہر گھر میں ایک شیشے کا گھر مہیا کر دیا
جس کے پردے پر سجیلی ، البیلی ، عورتیں جب اپنے شیشے
جیسے شفاف اور چمکتے ہوئے جسم کے ساتھ نمودار ہوتیں
تو دیکھنے والے اپنا دل تھام کر سسکاریاں بھرنے لگتے
ہوا کے دوش پر گھر گھر پہونچنے والی آوازیں کانوں
سے ہوتی ہوئی ناف کے نیچے تک جسم کے ہر رگ کو جھنجھوڑتیں
ورغلاتیں ۔

کورے کاغذ کا سینہ رنگ برنگ کے ناپاک
لفظوں کی سلاخ سے داغ داغ کر جھوٹ کے بے لباس
ہرکارے ہر طرف دوڑا دیئے گئے ۔

شہر اب شہر نہیں رہا بلکہ ایک آوارہ کشتی
اور ایک منہ زور جیپ کی علامت میں ڈھل گیا تھا ۔

ہر فرد کو راشن کے ساتھ وہ جھلیاں بھی مفت
تقسیم کی جا رہی تھیں جو ماں کی کوکھ کی خدمت انجام دیکر
گناہوں کے نشان مٹاتی اور انسان کا بوجھ کم کرتی تھیں
شرپسند باغیوں کی کسی بات کا اثر اب لوگوں پر نہیں
ہو رہا تھا ۔

حاکم شہر مطمئن و مسرور تھا لیکن میرے اپنے ہی
منصوبے کے مطابق جب شیشے کا گھر روشن ہوتا یا ہوا
کے دوش پر سفر کرنے والی آوازیں میری کانوں پر دستک
دیتیں ۔ یا اجلے کاغذ کا داغ داغ سینہ نظروں کے سامنے
آتا تو میرے پورے جسم میں ایک انجانے خوف کا سیال
گردش لگتا ۔ اور میرے ہونٹوں پہ ایک دعا ایک فریاد
تڑپنے لگتی ۔

اے سارہ ! اے سیتا !! اے مریم ! ! !
تمہیں تمہاری پاک دامنی کی قسم ۔ ہماری ماؤں ، بہنوں
اور بیٹیوں کی آبرو رکھنا ۔

لیکن ایک دن جب میں اپنے فرائض انجام
دے کر گھر واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری بیوی
گھر سے غائب ہے ــــــ اور سنگھار میز پر رکھی
ہوئی میری تصویر رنگ لنگ کی لجلجی جھلیوں میں
ڈوبی ہوئی ہے ۔

دکھ اور تاسف کے بوجھ سے میری دونوں
آنکھیں مندنے لگیں ۔ مگر ٹھیک اسی سمے تیسری آنکھ
کے دریچے جیسے اچانک روشن ہو گئے ۔ ●●

بقیہ بے چہرہ مخلوق

اس دن پہلی بار شہر کے لوگوں نے محسوس کیا جیسے ان
کے دلوں سے موت کا خوف زائل ہو گیا ہو اور ان کے
اندر زندگی کی نئی لہر کروٹ لے رہی ہو ●●

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

بے چہرہ مخلوق

کئی دنوں سے آسمان کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جھکڑ چل رہے تھے۔ فضا میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اور سارے شہر میں خوف اور بے چینی کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خوفناک طوفان آنے والا ہو۔ تمام لوگوں کی نگاہیں آسمان پر لگی ہوئی تھیں۔

یوں تو راستوں پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی بازار کھلے ہوئے تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں حسب معمول کام چل رہا تھا۔ لیکن لوگوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ اور ہر شخص ڈرا ڈرا سہما سہما سا دکھائی دے رہا تھا۔ راہ گیر راستوں پر چلتے ہوئے یکایک چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ کام کرتے کرتے گھبرا کر کان کھڑے کر کے لوگ کسی آواز کو سننے کی کوشش کرتے۔ اور پھر دھڑکتے دلوں کے ساتھ اپنے کام میں لگ جاتے۔

ہر شخص کے دل میں ایک ہی سوال تھا پتہ نہیں کیا ہوگا کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی بلا نازل ہونے والی ہے۔ کوئی خوفناک طوفان شہر کے اوپر سے گذرنے والا ہے۔ اب کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب دینے سے سبھی قاصر تھے۔ ہر آدمی کو اپنے انجام کی فکر پریشان کئے ہوئے تھی۔ ایک ایک پل پہاڑ کی صورت گذر رہا تھا۔ ایک ایک دن ایک صدی کی طرح طویل محسوس ہو رہا تھا۔ نہ دن کو چین تھا۔ نہ رات کو آرام گھروں میں بستر پر لیٹے ہوئے لوگ جاگتے رہتے۔ نیند میں سوتے سوتے چونک کر بیدار ہو جاتے۔ ہر طرف کچھ ایسی بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی کہ آدمی آدمی سے خائف تھا۔

گاؤں اور شہر دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ گاؤں کے لوگ جو اکثریت میں تھے۔ سرخ رنگ پسند کرتے تھے۔ اور شہر کے لوگ جو اقلیت میں تھے۔ سبز رنگ کے دلدادہ تھے۔ اور زندگی ان دو رنگوں کے درمیان الجھ کر رہ گئی تھی۔ شہر کے لوگوں کا خیال تھا کہ زندگی کو مشینوں اور کارخانوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ مشینیں اور کارخانے زندگی کو تمام سہولتیں اور آسائشیں مہیا کرتے ہیں۔ اور گاؤں کو ناز تھا کہ وہ دھرتی کے بیٹے ہیں زمینوں کے مالک ہیں، اکثریت میں ہیں۔ فصلیں اگاتے ہیں، اور زندگی کی خوراک فراہم کرتے ہیں۔ اس لئے زندگی کو ان کا رنگ اختیار کرنا چاہئے۔ دونوں زندگی کو اپنا رنگ دینا چاہتے تھے۔ دونوں اپنی ضد پر قائم تھے۔ اور زندگی بے رنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

ادھر جب سے آسمان کا رنگ بدلا تھا۔ حالات سنگین ہو گئے تھے۔ نیلا آسمان سرخی اور سیاہی کے تہوں میں چھپ گیا تھا۔ کالے کالے بادلوں کے نیچے دور تک سرخ بادلوں کی ایک تہہ ابھر رہی تھی۔ اور مٹ رہی

تھی۔ اور بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ جب آسمان پر سرخ
ہالہ دکھائی دے تو سمجھو کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے
پھر آسمان کا رنگ سیاہ ہو گیا۔ فضا تاریک ہو گئی
اور بڑا خوفناک طوفان آیا۔ اس طوفان نے سارے شہر کو
تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اور طوفان کے ساتھ ساتھ بہت
سارے پرندے جھنڈ در جھنڈ شہر میں داخل ہوئے۔ ان
پرندوں کی لمبی لمبی چونچیں اور نوکیلے پنجے تھے۔ دیکھتے ہی
دیکھتے ان پرندوں نے انسانی جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر
کے بکھیر دیا۔ ہر طرف چیخ و پکار کی لرزہ خیز آوازوں سے
شہر کی فضا گونج اٹھی۔ اور سارے شہر میں خون کے دھارے
بہنے لگے۔ ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ دروازے کھڑکیوں
سے بے نیاز، مکانات ویران ہو گئے۔ اور آباد علاقے
کھنڈر بن گئے۔

اس کے بعد طوفان تو رک گیا۔ لیکن سرخ پرندوں
کی یلغار جاری رہی۔ وہ شہر پر منڈلاتے رہے اور انسانوں
کو قتل کرتے رہے۔

جب طوفان رکا تو کتنے خاندان ایسے تھے جن کا
ماتم کرنے والا بھی کوئی زندہ نہ بچا تھا۔ کسی خاندان میں ایک
معصوم بچہ زندہ تھا۔ تو کسی خاندان میں ایک بوڑھی ماں۔
کسی خاندان میں ایک جوان بیوہ رہ گئی تھی۔ تو کسی خاندان
میں ایک کنواری لڑکی۔ ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا۔ اور
زندگی اپنے بال بکھرائے ماتم کر رہی تھی۔ کوئی کسی کا پرسان
حال نہ تھا۔ کوئی کسی کے زخم پر مرہم رکھنے والا نہ تھا۔ کہ ہر
فرد زخموں سے چور چور تھا۔ انسانی لاشیں کیڑے مکوڑوں
کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اور مذہبی کتابیں، آسمانی
صحیفے [illegible] کی طرح بکھرے پڑے

تھے۔ اور خدا جو حیات و موت کا مالک ہے جس کے
قدرت میں پوری کائنات ہے۔ بڑی اطمینان سے
فلک پر بیٹھا آسمان کی طرف حسرت سے اٹھی ہوئی نگا
کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مسجدوں میں مانگی ہوئی
اور شدت جذبات سے بھرائی ہوئی آوازوں میں
جانے والی مناجاتیں سب بیکار ثابت ہوئی تھیں

وہ رات بڑی بھیانک تھی۔ ہر طرف
تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور سارا شہر کسی اند
غار کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ فضا گہرے سکوت
لبادہ میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ
کبھی ختم نہ ہوگی۔ صبح کبھی نہ ہوگی۔ سورج کبھی نہ نکلے
زندہ بچ جانے والے لوگ اپنے گھروں میں چھپے ہو
اپنی سانسیں روکے بیٹھے تھے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ آنے
صبح ان کے لئے کیا پیغام لے کر آئے گی۔ اور آنے والا
کس طرح گزرے گا۔ زندگی اور موت کے درمیان
ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ
قدم کا فاصلہ کسی لمحہ بھی ختم ہو سکتا تھا۔

سرخ پرندے اب بھی زندگی کے سینے میں
گھونپنے میں مصروف تھے۔ اور زندگی پناہ کی تلاش
ماری ماری پھر رہی تھی۔ بھاگی بھاگی پھر رہی تھی۔

زندگی کی آرزو میں پہریں گننے والوں کی
کی ڈور طویل ہوتی جا رہی تھی۔ کہ یکایک چیتے کی کھ
پہنے ہاتھوں میں رائفل تھامے بہت سارے بے چہر
شہر گھس آئی۔ اور سرخ پرندوں کو قتل کرنا شروع
دیا۔ گولیوں کی آواز سن کر گھروں میں چھپے ہوئے
نے روزن در سے جھانک باہر کا منظر دیکھا۔ ف

میں چاروں طرف پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ان گنت گولیوں کی آوازیں ہوا میں تیر رہی تھیں۔ اور سرخ پرندے بے تحاشہ شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

باہر کا منظر دیکھ کر گھروں میں چھپے ہوئے لوگوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ مفلوج اعضا میں حرارت آ گئی۔ اور دلوں میں زندہ رہنے کی خواہش شدت سے ابھر آئی۔ وہ سب اپنے گھروں سے نکل کر سرخ پرندوں کے قتل پر خوشیاں منانے لگے۔

بے چہرہ مخلوق نے خوشیاں مناتے ہوئے لوگوں کے قریب آ کر کہا ——— ہم تمہارے دوست اور محافظ ہیں۔ اور تمہاری مدد کے لئے آئے ہیں ہم اپنی گولیوں سے سرخ پرندوں کو قتل کر دیں گے۔ لیکن تمہیں ہمارا ہر حکم ماننا ہوگا۔

لوگوں نے ان کے پاؤں میں بھاری بوٹ تھے ہاتھوں میں رائفل تھی۔ وہ چیتے کی کھال میں ملبوس تھے جسم پر گوشت بھی تھی اور سر بھی۔ باہر نکلی ہوئی دو خوفناک آنکھیں تھیں۔ لیکن ان کے چہرے نہیں تھے۔ یہ عجیب الخلقت مخلوق تھی جسے شہر کے لوگوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا پہلے وہ انہیں دیکھ کر ڈرے۔ پھر انہوں نے جھجکتے ہوئے حامی بھر لی ——— ٹھیک ہے ہم آپ کا حکم مانیں گے۔

تو پھر آؤ میرے ساتھ۔ بے چہرہ مخلوق نے کہا
زندہ رہ جانے والے تمام لوگ ان کے ساتھ ہو گئے ——— !

شہر میں زندگی معمول پر آ گئی۔ بند دروازے اور کھڑکیوں نے آنکھیں کھول دیں۔ سڑکوں پر آمدورفت شروع ہو گئی۔ بازاروں میں دکانیں کھل گئیں۔ اور ہر طرف بے چہرہ مخلوق کی حکمرانی قائم ہو گئی۔

گیا

دن بھر زندگی سرگرم عمل رہتی۔ لیکن شام ہوتے ہی سڑکیں سنسان ہو جاتیں۔ اور لوگ اپنے گھروں میں بند ہو جاتے۔ رات بھر خوفناک چیخیں تیز چھری کی طرح گہرے سکوت کے سینے میں اترتی رہتی۔ اور گھروں میں چھپے ہوئے لوگ کانپ اٹھتے۔ بے چہرہ مخلوق کے بوٹوں اور ان کی رائفلوں کی گولیوں کی آوازوں کا شور ابھرتا رہتا اور لوگ گھبرا کر خدا کو یاد کرتے رہتے۔

رفتہ رفتہ بے چہرہ مخلوق نے ان زندہ رہ جانے والے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ وہ ان لوگوں سے ہر وہ کام لینے لگی جو وہ خود نہیں کر سکتی تھی۔ یا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ لوگ اسٹیشن پر بڑے بڑے وزنی صندوق ریل کے ڈبوں سے اتار کر ٹرکوں پر لادتے اور فولادی سامان ٹرکوں سے اتار کر ڈبوں میں چڑھاتے۔ ناہموار زمین کاٹ کر ہموار کرتے۔ اپنے سروں پر مٹی کی ٹوکریاں ڈھوتے کچی سڑکیں بناتے۔ جنگل کاٹ کر راستہ صاف کرتے۔ اور راتوں کو جب بے چہرہ مخلوق اپنی رائفلیں سرہانے رکھ کر سو جاتی تو یہ لوگ شہر اور گاؤں سے ملنے والی سرحدوں پر پہرہ دیتے۔

وقت گذرتا رہا اور یہ لوگ حکم کی تعمیل کرتے رہے۔

کبھی ایسا ہوتا کہ بے چہرہ مخلوق ان لوگوں کے ہاتھوں میں مشعل دے کر ان بستیوں اور دھان کے کھیتوں میں آگ لگانے کا حکم دیتی جن سرخ پرندوں کے چھپے ہونے کا گمان یا شبہ ہوتا۔ اور جب بستیاں اور کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی فصلیں آگ کے شعلوں کی زد میں ہوتیں اور سرخ پرندے جائے پناہ کی تلاش میں بھاگ کھڑے ہوتے تو وہ اپنی رائفلوں سے ان کا سینہ چھلنی کر دیتی

احب سرخ پرندے زمین پر گر کر تڑپنے لگتے۔ یہ لوگ
تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگتے۔
یہ سلسلہ کئی مہینوں تک چلتا رہا۔ بے چہرہ مخلوق
زندہ رہ جانے والے لوگوں کے گھروں سے مرغیوں، بطخوں
کے ساتھ مویشی کھول کر لے جاتی غلے کی دکان سے اناج لے
جاتی۔ اور ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کی پیٹھ پر کوڑے
برساتی۔ دونوں کو ہاتھوں کو پھیلا کر اینٹیں رکھ دیتی
اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑا رکھتی۔ منہ پر کالک چونا
مل کر شہر میں گشت کرواتی۔ اور کوئی ان سے کچھ نہ کہتا
انہوں نے جگہ بہ جگہ بڑے بڑے خیمے لگا رکھے تھے۔ اور ان
خیموں کی اندر کی خبر کسی کو نہ تھی۔ کیونکہ وہ علاقہ لوگوں
کے لئے ممنوعہ علاقہ تھا۔ پھر وہ بے چہرہ مخلوق لوگوں
کے گھروں سے رات کے وقت جوان عورتوں کو اپنی
جیپ میں بٹھا کر لے جاتی اور صبح کا اجالا پھیلنے سے
پہلے واپس کر جاتی۔

اگر کسی کو اعتراض ہوتا تو بے چہرہ مخلوق ایک
ہی سوال کرتی ـــــ زندگی یا موت ؟

اس سوال کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا ـــــ
زندگی۔!

بے چہرہ مخلوق کہتی ـــــ نہ یہ زمین ہماری ہے
نہ یہ آسمان ہمارا ہے۔ ہمارا تو کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی ہم تمہارے
مال و اسباب اور تمہاری جانوں کی حفاظت کرتے ہیں
وہ بھی محض اس لئے کہ تم سبز رنگ پسند کرتے ہو۔ جو ہمارا
بھی پسندیدہ رنگ ہے۔ ہم خود اپنی جانیں خطرے میں
ڈال کر تمہاری رکھوالی کرتے ہیں۔ اور اس کے عوض ہم
تم سے کچھ بھی طلب نہیں کرتے ـــــ ہم غلط تو
نہیں کہتے ـــــ؟

نہیں نہیں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایک ساتھ
بہت ساری آوازیں بلند ہوتیں۔

اگر زندگی چاہتے ہو تو تمہیں ہمارا ساتھ دینا
ہوگا اور ہمارا ہر حکم ماننا ہوگا۔

ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور ہر حکم مانیں گے۔

وقت گذرتا رہا اور یہ لوگ حکم کی تعمیل
کرتے رہے۔

کبھی کبھی یہ لوگ سوچتے۔ آخر یہ کیسی دوستی اور
کیسی محافظت ہے۔ کہ یہ مخلوق ہمیں اپنا غلام سمجھتی ہے
یہ کیسی زندگی ہے جس میں سانس لینے کے ہر فعل و حرکت
پر پابندی ہے۔؟ سانس لینے کا نام زندگی تو نہیں ؟۔
زندگی تو بڑی حسین ہوتی ہے۔ اس کی صورت اتنی کریہہ
تو نہیں ہوتی۔؟ اس زندگی اور موت میں کیا فرق ہے ؟۔
لیکن موت کے تصور سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے
کیونکہ موت سے انہیں بہت ڈر لگتا تھا۔ اور وہ مرنا نہیں
چاہتے تھے۔

بے چہرہ مخلوق مسلسل سرخ پرندوں کو قتل کرتی
رہی۔ کھیتوں، کھلیانوں، اور بستیوں میں آگ لگاتی رہی
پھر ایسا ہوا کہ سرخ پرندے مقابلے پر اتر آئے۔ اور سب
سے حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سرخ پرندے بے چہرہ مخلوق کی
غلامی قبول کرنے پر موت کو ترجیح دیتے۔ سرخ پرندوں
کے جھنڈ بجلی کی سی سرعت سے بے چہرہ مخلوق پر حملہ آور ہوتے
اور گولیوں کی زد میں آ کر خاک و خون میں تڑپنے لگتے اور
ان کے خون سے مٹی بھیگ جاتی۔ ان مقابلوں میں بے چہرہ
مخلوق کم مرتی اور سرخ پرندوں کا زیادہ نقصان ہوتا
پھر بھی ان کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہ آتی۔ جیسے موت
ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔

مقابلے ہوتے رہے اور سرخ پرندے قتل ہوتے رہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سرخ پرندے بے چہرہ مخلوق کی پوری کھیپ کو قتل کر کے فرار ہو جاتے ان کے خیموں میں آگ لگا دیتے۔ ان کی جیپوں کو ناکارہ بنا دیتے۔ مگر پلڑا ہمیشہ بے چہرہ مخلوق ہی کا بھاری رہتا۔ سرخ پرندے رائفل کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔

بے چہرہ مخلوق کی ان تمام کارروائیوں میں سبز رنگ کے پرستار استعمال ہوتے رہے اور زرخرید غلام کی طرح خاموشی سے ان کے حکم کی تعمیل کرتے رہے۔

بے چہرہ مخلوق کبھی سڑک کی تعمیر کا حکم دیتی۔ تو یہ لوگ پوری پوری بستیوں کو مسمار کر کے سڑک تعمیر کر دیتے۔ شاہراہ بنانے کا حکم دیتی۔ تو یہ لوگ قبرستان کی زمین برابر کر دیتے۔ درختوں کو کاٹ کر گرا دیتے مکانات ڈھا دیتے، اور کھیتوں کی فصلوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتے۔ مٹی کھودتے، اینٹیں توڑتے، رولر کھینچتے اور شاہراہ تعمیر کر دیتے۔

ان دنوں بھی ایک شاہراہ تعمیر ہو رہی تھی اور اس کام پر شہر کے لوگ مامور تھے۔

ایک دن کسی شاعر نے بے چہرہ مخلوق سے کہا —— میں ایک شاعر ہوں۔ میرا کام ادب کی تخلیق ہے۔ مٹی ڈھونا اور درخت کاٹنا میرا کام نہیں۔

یہ شاعر کیا ہوتا ہے؟ بے چہرہ مخلوق نے حیرت سے پوچھا!

میں کالج میں پروفیسر ہوں۔ شاعر نے جواب دیا۔ میرے پاس یونیورسٹی کی ڈگری ہے۔ مجھے کوئی لکھنے پڑھنے کا کام دے دو۔

اس کی بات سن کر بے چہرہ مخلوق زور سے ہنس پڑی۔ اور شاعر کو رائفل کے کندے سے دھکا دیتے ہوئے کہا —— ہمارے یہاں کوئی شاعر یا پروفیسر نہیں ہوتا۔ چلو آگے بڑھو اور کام میں لگ جاؤ۔

پھر دن شاعر بہینوں درخت کاٹتا اور اپنے سر پر مٹی ڈھوتا رہا اور حالات کی ستم ظریفی پر آنسو بہاتا رہا۔

ابھی شہر کے لوگ شاہراہ کی تعمیر کر رہے تھے۔ کہ ایک روز شہر کے چار چوراہے پر چار لاشیں پڑی ہوئی پائی گئیں۔ جن کے سینوں میں رائفل کی گولیوں کے نشانات تھے۔ اور جن کے خون سے سڑکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

صبح کے وقت جب لوگ رات بھر کی قید کے بعد اپنے گھروں سے نکلے اور ان چاروں لاشوں کو دیکھا تو ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا شہر کے لوگ ان چاروں لاشوں کو پہچانتے تھے ان میں سے ایک کی ریڈی میڈ کپڑے کی دوکان تھی۔ دوسرا پٹ سن کے میل میں مزدور تھا۔ تیسرا بیاہ خر بنا لکھ تھا۔ اور چوتھا ایک چھوٹے سے مودی خانہ کا مالک تھا۔

شہر میں بے چہرہ مخلوق مائک پر اعلان کر رہی تھی۔ ہم نے چار غداروں کو جنھوں نے ہمارا حکم ماننے سے انکار کیا تھا قتل کر دیا ہے۔ اور ان کی لاشیں چوراہوں پر ڈال دی ہیں۔ تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔

یہ اعلان دیر تک ہوتا رہا۔ چاروں لاشیں، شام تک چوراہوں پر پڑی رہیں اور سورج غروب ہونے سے پہلے تک لوگ ان لاشوں کو دیکھنے کے لئے آتے رہے

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

رمبھا رمبھا

مشرف عالم ذوقی

— کردار —
پانچ آدمی —
ایک بوڑھا —
ایک بدصورت بھدّی عورت

(جس وقت پردہ اٹھتا ہے اس وقت اسٹیج پر پیچھے سے کچھ آوازیں گونجتی ہیں)

ایک آواز: شکسپیر نے کہا ہے یہ دنیا ایک اسٹیج ہے

دوسری آواز: اور ہم سب اداکار ہیں

تیسری آواز: قدرت نے ایک وقت متعین کر دیا ہے جس میں ہر اداکار اسٹیج پر آ کر اپنا رقص پیش کرتا ہے اور رقص کے خاتمے کے بعد اسٹیج سے باہر چلا جاتا ہے۔

چوتھی آواز: اس لئے آؤ ہم بھی رقص کریں

پانچویں آواز: ناچیں، جھومیں، گائیں

اور اس کے ساتھ اسٹیج پر پانچ آدمیوں کی آمد ہوتی ہے جھانجھریں بجتی ہیں پاپ سانگ — زہریلے سانپوں کی طرح اپنا اثر دکھاتا ہے۔ خشکی پر آئی مچھلیوں کی طرح تڑپنے ناچنے اور اٹھلانے کا بے ہنگم رقص شروع ہوتا ہے۔ پانچوں عجیب طریقے سے اپنے پیروں کو جنبش دیتے ہیں۔ وحشیوں کی طرح بے سرے انداز میں چیختے ہیں۔ اپنے لمبے اجھڑے جھاڑ جیسے بالوں کو دائیں بائیں جھٹکتے ہیں اور منہ سے عجیب عجیب آوازیں بلند کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ دیر تک چلتا ہے۔ اور ایک جھناک کی تیز آواز کے ساتھ رقص رک جاتا ہے پانچوں اپنی جگہوں پر منجمد ہو جاتے ہیں

پہلا: رقص کرتے ہوئے ہم سب کچھ بھول جا

دوسرا: اپنے وجود سے بھی پرے ہو جاتے ہیں

تیسرا: کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور کہاں ہیں

چوتھا: اور ذمہ داری کا پاگل کر دینے والا احسا بھی ہمارے پنجوں سے لوکھلائے ہوئے کی طرح فضا میں پھڑپھڑا کر اڑ جاتا ہے۔

پانچواں: (جھومتے ہوئے) ذمہ داری؟ کیسی ذمہ — ؟ — ؟ — (جھومتا ہے (وہ واحد ہے جو اپنی جگہ اچانک حرکت آ گیا ہے) — بس رقص کرو اور سب کچھ بھول جاؤ — مارو یاران س لغوی باتوں کو۔ آؤ رقص کریں۔

پہلا : (اس کی آنکھیں چمکتی ہیں) مگر ٹھہر ہمارے جو تھے
ساتھی نے ہمیں ذمہ داری کا احساس دلایا ہے
تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے ــــ یہ ذمہ داری
کیا چیز ہے ؟

پانچواں (بڑبڑا سا منہ بناتے ہوئے) سب ملیامیٹ
کر دیا۔

دوسرا: ملیامیٹ نہیں۔ ذمہ داری کہو۔ یہ کچھ تو ہے
کچھ تو ضرور ہے جس سے فرار کے بعد ہی ہم
سب یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔

تیسرا : (ٹھنڈی سانسیں لیتا ہے) ہاں ــ یہ ہے
یہ کچھ ضرور ہے (سوچتا ہے) ــــ ایک بار ایسا
ایسا ہوا جب میں تمہارے بیچ نہیں تھا ــــ
اور رقص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا ــ
اور ہواؤں کی سی تیزی کے ساتھ منزل کو پکڑنے
کی جستجو میں گم تھا ــــ پھر ــــ (آنکھوں
میں آنسو ہیں) ــــ پھر یہ ذمہ داری آگئی
(روتا ہے)

(اسٹیج پر اس کے رونے کی آواز گونجتی ہے اور ایک
سناٹا چھا جاتا ہے)

پہلا : پھر کیا ہوا ؟

دوسرا: چھٹا اور پانچواں ۔ ہاں ہاں پھر کیا ہوا ؟

تیسرا : (اپنے شرٹ کے بٹن کھولتا ہے اور اپنی پیٹھ کی
طرف اشارہ کرتا ہے اس کی پیٹھ پر زخم ہی زخم
ہیں۔ اور یہ زخم بڑے گھنونے ہیں۔ تیسرا اپنی پیٹھ
دکھاتا ہے۔)

تیسرا : یہ دیکھو !

(باقی لوگ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں)
وہی لوگ ۔ ایک ساتھ اف ــــ !

پہلا : تو یہ ذمہ داری یہ ہے ــــ یعنی تمہاری پیٹھ
کا یہ گھاؤ ۔ یہ گھناؤنا مواد سے بھرا زخم ــــ
تو ذمہ داری یہ ہے ۔

تیسرا : (ٹھنڈی سانسیں لیتا ہے) ہاں ذمہ داری
یہی ہے ۔

پانچواں: (جو کچھ دیر پہلے اچانک رقص کرنے لگا تھا)
میں نے کہا تھا نا ! یہ بڑی واہیات چیز ہے
اس سے فرار حاصل کرو

تیسرا : (کراہتا ہے) ــــ فرار ــــ ؟ (رقص کرنے
کی کوشش میں اپنے پیروں کو جنبش دیتا ہے)
مگر اس سے فرار کہاں حاصل ــــ اف ــــ
میری پیٹھ اب بھی زخمی ہے ۔
کراہتا ہے ۔ بیٹھ جاتا ہے ۔
(اسٹیج پر پردہ پھر گر جاتا ہے)

دوسرا اسین

(ایک ہلکے وقفے کے بعد پردہ دوبارہ اٹھتا ہے
(تیسرا بیٹھا ہوا ہے باقی لوگ اس پر جھکے ہوئے
ہیں اور اس کی پیٹھ پر پڑی ہوئی متعدد
لکیروں اور زخم کو دیکھ رہے ہیں)

پہلا : (افسوس ظاہر کرتا ہے) مگر میرے پیارے
دوست تم نے ذمہ داری کو ختم کیوں نہیں کر دیا

تیسرا : (آہیں بھرتا ہے) اسی کوشش میں تو میرا
یہ حال ہوا ذمہ داری نے میری پوری پیٹھ

لہولہان کردی اس وقت میں تنہا نہیں تھا
اس وقت میرے ساتھ ساتھ بہت سے چہرے
تھے ـــــ بھوکے سستے بجے ہوئے چہرے
ـــــ ان لوگوں نے اپنی ذمہ داری کی
چادر میرے ننگا جسم پر پہنا دی تھی۔ اور
اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں جھک رہا ہوں
پھر میں نے تننا چاہا۔ اس بھاری بھرکم مضبوط
چادر نے مجھے دوبارہ جھکا دیا میں نے کئی بار
اٹھنا چاہا اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے چاہے
مگر ہر بار سر چادر مجھ پر آڑے آجاتی۔ اور
بالآخر میں جھکتا چلا گیا۔ میری پیٹھ اس کشمکش
میں لہولہان ہوگئی اور پھر بڑی مشکل اور ہمت
سے کھینچا تانی کرنے کے بعد وہ چادر اپنے
انہی چہروں کو حوالے کر دیئے وہاں سے سرپٹ
کسی ریس کی گھوڑے کی طرح دوڑ پڑا۔
(تیسرا کھانستا ہے پہلا اس پر اب بھی جھکا ہوا
ہے)

پہلا: وہ چادر کس رنگ کی تھی

تیسرا: اس چادر کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ مگر اس
چادر میں بال بہت سارے تھے۔ اس طرح
وہ چادر بہت ساری روئیں والی چادر لگتی
تھی۔

پہلا: (اس کی پیٹھ کو غور سے دیکھتا ہے اور باقی لوگو
کو اشارہ کرتا ہے) ـــــ اُف ـــــ دیکھو!
اس کے گھاؤ کو ذرا غور سے دیکھو۔ اس نظر
نہیں آنے والی چادر کا رواں اس کے گھاؤ سے
اب بھی ساتھ ہوا ہے۔

دوسرا: ہاں صاف نظر آتا ہے۔

پانچواں: کیا مطلب ؟

چوتھا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نہ کسی صورت
ذمہ داری اس کے ساتھ اب بھی موجود

ایک آواز: ذمہ داری ہر آدمی کے ساتھ ہمیشہ موجود
ہے جب تک کہ اسٹیج کا پردہ نہ گر جائے۔
(اسی کے ساتھ اسٹیج پر ایک لوکھلائے ہو
بزرگ کی آمد جن کی ڈاڑھی اچھی خاصی بڑ
ہوئی ہے اور بال بھی بے قرینے ہوئے
اس کے ساتھ ایک بدصورت اور بھدی عو
بھی ہے۔ جو جتنی بھدی ہے اور بدصورت اس
بدن کے اعضا اتنے ہی خوب صورت متنا
ہیں)

بوڑھا: (ان پانچوں کی طرف دیکھتے ہوئے) ذمہ دار
تم سب کے ساتھ ہے (اشارہ کرتا ہے) تمہ
ساتھ بھی، تمہارے، تمہارے، اور تمہار
ساتھ بھی۔ فرق یہی ہے کہ تم نے اس تیسر
شخص کی نظر نہیں آنے والی ذمہ داری کو دیکھ
ہے۔

پہلا شخص: (چونکتا ہے) کیا ذمہ داری ہے ہمارے سا

دوسرا شخص: (چہرے پر پشیمانی ہے) نہیں ہمارے ساتھ کو
ذمہ داری نہیں۔

تیسرا شخص: (بس ہلکے سے کراہتا ہے)

چوتھا شخص: (سوچتے ہوئے) کیا واقعی تم ذمہ داری
بارے میں جانتے ہوئے ـــــ ؟ اگر ہاں ا
نہیں بتاؤ تاکہ ہم اس سے بچ سکیں۔ (سر پہلا
دکھاتا ہے) اف کس مزے سے ہمارا قیمہ چلا

ہے اور اس کمبخت ذمہ داری نے آکر سب کچھ
بگاڑ دیا۔ ہاں تو معزز مہمانو تم ہمیں اس کے بارے
میں بتاؤ۔ ہمیں آگاہ کرو (اچانک اس بھدی
اور بدصورت عورت کی طرف دیکھتا ہے
اور نفرت سے منہ سکوڑتا ہے تمہارے ساتھ
یہ کون ہے ــــ ؟

بوڑھا: (ہانپتا ہے پھر ٹھہرنے کے چند وقفے بعد مسکراتا ہے)
ــــ سنو ذرا غور سے اس کو دیکھو ــــ
ذمہ داری یہی ہے۔

پانچواں۔ (اچانک بڑے زوروں سے ٹھٹھاتا ہے) ہا...
ہا..... ہاہا..... ذمہ داری..... ہا...
اتنی بھدی، مکروہ اور بدصورت ــــ میں
کہوں تم سب پاگل ہو جو اس بھدی اور بدصورت
عورت کے پیچھے اپنا قیمتی وقت کا وقت ضائع
کر دیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ ہم کچھ دیر قبل والے
ٹھٹھوں میں مست رہتے ــــ (ٹھہرتا ہے
اور اپنی جیب سے شراب کی بوتل نکال کر سب لوگوں
کی طرف دیکھتا ہے ــــ پھر ــــ)

پانچواں: میرے معزز ساتھیو! تم ذمہ داری کو پکڑو اور
اگر ہو سکے تو لٹک بھی جاؤ مگر مجھے اب اجازت
دو میں اس ذمہ داری کی پکڑ میں آنے والا نہیں
میرے پاس کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور نہ ہی میں
اس بکھیڑے میں پڑنا چاہتا ہوں۔ تم رقص نہیں
کرتے۔ نہ سہی۔ میں تو چلا ــــ رقص کرنے ــــ
جھومنے۔ گانے، شراب پینے۔
منہ میں شراب کی بوتل انڈیلتا ہے پاگلوں کی طرح
اپنے پیروں کو جنبش دیتا ہے۔ گھٹی ہوئی مدہوش کن
آوازیں نکالتا ہے اور پھر لڑکھڑاتا جھومتا منہ
سے عجیب آوازیں نکالتا ہوا اسٹیج سے باہر چلا
جاتا ہے۔
سب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ وقفے بعد ــــ
جب چونکنا ختم ہوتا ہے)

بوڑھا: لو یہ تو چلا گیا
(ذمہ داری اب بھی اپنی جگہ ویسی ہی کھڑی ہے)

پہلا: پاگل تھا۔

دوسرا: اس کو ذمہ داری کا احساس نہیں تھا۔

بوڑھا: احساس تھا مگر یہ خود کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا کیا
تم نے دیکھا نہیں اس کے پاس شراب کی بوتل تھی یعنی
میں یہ خود کو بھولنا چاہتا ہے۔

تیسرا: (کراہتے ہوئے) کیا خود کو بھولنے سے آدمی ذمہ
داری سے دور چلا جاتا ہے۔؟

بوڑھا: قطعی نہیں اس طرح وہ ذمہ داری کے احساس سے
گریز کرتا ہے۔ وہ خود سے بھاگتا ہے۔
(ہانپتے ہوئے) ــــ وہ پاگل ہے ــــ
اسے نہیں معلوم کہ ذمہ داری اس کے ساتھ بھی گئی ہے
(چاروں چونکتے ہوئے) اور اس بدصورت بھدی
عورت کی طرف دیکھتے ہوئے) مگر ذمہ داری تو
یہاں کھڑی ہے۔

بوڑھا: (ہنستا ہے) ــــ یہ میری ذمہ داری ہے جو تمہاری
بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی اس کی ذمہ داری
تھی۔ جب وہ جاگے گا اور اس کا نشہ لوٹے گا تب
دکھائی دے گی اس کو ذمہ داری کی صورت ــــ

اس طرح تم لوگوں نے اس بے چارقص کے پیچھے اپنی اپنی ذمہ داری کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

چاروں: کیا ـــــ ہمارے ساتھ بھی ذمہ داری ہے

بوڑھا: ہاں بالکل ـــــ

وہی چاروں: نہیں مگر یہ نہیں ہو سکتا۔

بوڑھا: مگر ایسا ہے۔ کیوں تم لوگوں نے کبھی اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہا۔ اور تم اس پُر رونق شاہراہ سے بھاگ آئے۔ جہاں کے لوگ اپنی اپنی ذمہ داری اپنے اپنے کاندھوں پر لئے دن رات دوڑتے رہتے ہیں۔

(تیسرا کراہتا ہے) اف

بوڑھا: دیکھو! اس کی ذمہ داری نے اس کو ڈس لیا ہے۔

پہلا: تو کیا ذمہ داری ڈستی بھی ہے؟

بوڑھا: ڈستی ہی نہیں کاٹتی بھی ہے۔ اور پوری نہ ہونے کی صورت میں ختم بھی کر دیتی ہے۔

چاروں: (ایک ساتھ) اف اس بھدی اور بدصورت عورت کی جانب غصے میں دیکھتے ہیں۔ ان کی مٹھیاں بھنچی ہیں) ذمہ داری اتنی بدصورت اور کراہیت آمیز تو تم نے اسے ختم کیوں نہیں کر دیا ـــــ؟

بوڑھا: کیونکہ اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو ختم کرنے کی صورت میں آدمی خود ختم ہو جاتا ہے

پہلا: مگر یہ اتنی بدصورت اور مکروہ تو ہے۔

بوڑھا: (ٹھنڈی آہ بھرتا ہے) ذمہ داری کا ظاہری چہرہ بدصورت اور بھدا ہی ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اسے اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ جو اس کو اٹھا لیتے ہیں وہ اس کو کسی پھول جیسا نرم و نازک تر اور دیتے ہیں۔ اور جو اس کے قرب سے فرار حاصل کرتے ہیں۔ وہ اسے بدصورت ترین شئے ٹھہراتے ہیں۔

دوسرا: مگر یہ تو بتائیے میرے معزز مہمان! کہ یہ ذمہ داری آپ کے ساتھ آئی کیسے؟ آپ نے اس جیسی بدصورت کو اٹھانا کیوں گوارہ کیا۔

بوڑھا: ذمہ داری کو بلانے کی ضرورت نہیں یہ خود بہ خود آجاتی ہے یہ کسی صورت میں بھی آ سکتی ہے تم میرے بارے میں دریافت کر رہے ہو ـــــ
(ایک آہ کھینچتا ہے)

تیسرا: (چونکتا ہے، بوڑھے کی طرف ہڑبڑا کر دیکھتا ہے) (بوڑھا اسٹیج پر بیٹھ گیا ہے وہ چاروں اس پر جھک گئے ہیں۔ ذمہ داری اب بھی کچھ فاصلے پر ویسی ہی خاموش کھڑی ہے)

بوڑھا: (ٹھنڈی آہ دوبارہ بھرتے ہوئے) ان دنوں میں بھی تمہاری ہی طرح فضا میں بسنت کی طرح جھومتا۔ فضاؤں سے باتیں کرتا ہواؤں سے سرگوشیاں کرتا۔ اس وقت میرا گھر تھا۔ میرے گھر کے لوگ تھے۔ اور اس کے بعد (سسکیاں لیتا ہے) اس کی آنکھوں میں آنسو صاف نظر آ رہے ہیں) اس وقت میرے گھر کے لوگ مجھ سے کہا کرتے تھے۔ بیٹے! میں اپنی ذمہ داری کی چادر تجھے اڑھانا چاہتا ہوں۔ میں انہیں منع کرتا۔ کیوں اس وقت میں وہی ہواؤں کی سرگوشیاں اور بسنت کی طرح گیت گانے میں مست تھا۔ ان لوگوں نے ہزار بار مجھے ہواؤں سے سرگوشیاں کرنے اور بسنت کی طرح گیت گانے سے منع

گیا ہوگا۔ اور اپنی چادریں میرے جسم پر ڈالنے کی دھمکی دیں۔ مگر تب تک میں اسے کوری محض دھمکی ہی تصور کرتا تھا۔ (دوبارہ کراہتا ہے) مگر ایک روز وہی لوگ پر رونق شاہراہ پر وہ بھاری بھرکم چادر میرے جسم پر ڈال کر اس شاہراہ سے جانے کہاں رخصت ہو گئے۔ جب اس اچانک دھکے سے آنکھیں کھلیں۔ اور بسنت کی طرح گیت گانا بند کیا۔ جب اس اچانک دھکے سے آنکھیں کھلیں ہواؤں سے سرگوشیاں کرنی ختم کی۔ تب محسوس ہوا کہ یہ بدصورت اور بھدی عورت میرے ساتھ قدم سے قدم ملائے چل رہی ہے۔ میں اس سے جتنا دور بھاگتا وہ مجھے اتنا ہی زد و کوب کرتی۔ اور اسی کشمکش کا نتیجہ ہے کہ میرا پورا جسم لہولہان ہو گیا ہے۔ میری پوری پیٹھ زخمی ہو گئی ہے۔ یہ دیکھو!

(اتنا کہہ کر اپنی پیٹھ سے کپڑا ہٹاتا ہے۔ چاروں اس پر جھکتے ہیں)

چاروں ایک ساتھ۔ ارے تمہاری پیٹھ بھی

تیسرا: میری ہی طرح زخمی ہے۔

پہلا: اور تمہاری پیٹھ پر

دوسرا: میرے اس تیسرے ساتھی کی طرح نہیں نظر آنے والی چادر کا روں ستا ہوا ہے۔

بوڑھا: (خاموشی سے) ہاں —— (اس بدصورت اور بھدی عورت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بظاہر گونگی لگتی ہے) یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا۔ ان سب کی وجہ یہی ہے۔ یہ ذمہ داری۔

چاروں: (خوف سے) اف ذمہ داری اتنی خطرناک بھی ہے

بوڑھا: ذمہ داری خطرناک ہے مگر (کچھ یاد کرتے ہوئے) مگر میرے گھر کے لوگ کہا کرتے تھے کہ اس کا ظاہری چہرہ تو بڑا بدصورت ہے۔ مگر اسے اٹھا کے تو دیکھو۔ تمہیں کسی پھول سی گڑیا لگے گی۔

پہلا: (غصے سے) نہیں قطعی نہیں یہ بات تم ایک بار پہلے بھی کہہ چکے ہو۔ یہ ظالم ہے اس نے میرے تیسرے ساتھی کی پیٹھ بھی چھلنی کی ہے تمہارے جسم پر بھی بڑے بڑے گھاؤ بنائے ہیں۔ اس کا ظاہر اور باطن دونوں خراب ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اسے ختم کر دیں۔

دوسرا: اور اس ذمہ داری کے پاگل کر دینے والے بغیر ذمہ دارانہ احساس سے پرے ہو جائیں۔

تیسرا: (کراہتے ہوئے) مگر میرے پاس تو ہمت نہیں اس ظالم نے میری کمر توڑ دی۔ اف۔ (سوچتا ہے) —— کتنا اچھا تھا وہ رقص۔ وہ ہماری اچھل کود —— کچھ وقفے کے لئے تو ہم سب کچھ بھول گئے تھے۔

چوتھا: (کچھ سوچتے ہوئے اپنی مٹھیوں کو بھینچتا ہے) سنو! اس ذمہ داری کا احساس میں نے ہی سب سے پہلے تمہیں دلایا تھا۔ اور میں ہی اسے ختم بھی کروں گا۔ آؤ میرے ساتھ ——

(غصے میں ذمہ داری کی طرف بڑھتا ہے پہلے دوسرے دونوں اس کے شامل ہو جاتے ہیں تیسرا ابھی کراہتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کر غصے میں اپنی مٹھیوں کو باندھتا ہے۔ اور سب مل کر اس بھدی اور بدصورت عورت کو مارنے

منکے لئے آگے بڑھتے ہیں۔
(بوڑھا بیچ بچاؤ کرتا ہے)

بوڑھا: ارے ...... یہ تم لوگ کیا پاگل پن کر رہے ہو ذمہ داری کبھی نہیں مر سکتی۔ کیا تم نے سنا نہیں۔ میں نے اس سے قبل بھی کہا تھا۔ ذمہ داری ڈستی ہے۔ کاٹتی بھی ہے۔ اور ختم بھی کر دیتی ہے۔ رُکو! ٹھہرو اپنی جگہ۔

(چاروں غصے میں پاگل ہو کر اس بھدی بدصورت عورت پر لوٹ پڑتے ہیں۔ وہ عورت اچانک بڑی ڈراونی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ چڑیل جیسا بھیانک اور خوفناک دکھنے لگا تھا۔ اچانک وہ کسی شیر کی طرح اپنے منہ سے گھٹی ہوئی آدم خور چیخیں نکالتی ہے۔ اور اپنے زہریلے پنجوں کے ساتھ چاروں کے جانب جھپٹتی ہے۔ اور کسی آدم خور جانور کی طرح چاروں کو نوچنے لگتی ہے۔ اس بیچ بچاؤ کے دوران بوڑھا اچانک چکرا کر اسٹیج پر گر پڑتا ہے۔ اور دفعتاً چاروں چونک کر بوڑھے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

بوڑھا: (کراہتے ہوئے) الوداع میرے ساتھیو! الوداع دیکھا نا تم بھی خون میں رنگ گئے نا! میں نے پہلے ہی کہا تھا تم ذمہ داری کو ختم نہیں کر سکتے۔ ہاں محض اس کا احساس ہی تمہیں ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔ اچھا ہے کہ تم بھی میری اس چادر کو اوڑھ لو ـــــ میں اسے بہت اوڑھ چکا۔
اور اب تو میں رخصت بھی ہو چکا ہوں۔
(اپنی چادر ان چاروں کی طرف بڑھاتا ہے۔ اور آنکھیں موند لیتا ہے۔

پہلا: (ہانپتے ہوئے) ارے یہ تو ختم ہو گیا

دوسرا: اور اپنی چادر ہمارے لئے چھوڑ گیا

تیسرا: (کراہتے ہوئے) میں نے پہلے ہی کہا تھا

چوتھا: (سوچتے ہوئے) تو کیا اس چادر کو ہمیں اوڑھنا پڑے گا۔ کیا اس احساس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔

بدصورت عورت (غصے میں دیکھتی ہے ـــــ نہیں یہ چادر تمہیں اوڑھنا ہی پڑے گی۔ اب میں تمہارے ساتھ جو ہوں۔ تم جہاں جاؤ گے میں وہاں جاؤنگی۔ اب میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔

(اچانک ہڑبڑا نے دوڑنے اور چیخنے کی آواز آتی ہے۔ کوئی اسٹیج پر دوڑتا ہوا آرہا ہے۔

پہلا۔ ارے یہ تو ہمارا پانچواں ساتھی ہے۔

(اسٹیج پر اس پانچویں ساتھی کی آمد اس کے پورے چہرے پر عجیب عجیب لکیریں نظر آ رہی ہیں۔ اس کے کپڑے پھٹے ہیں۔ نچلے حصے پر بھی وہ وہ محض چیتھڑا لپیٹے ہوئے ہے۔ بال مولوی جیسا بکھرا ہوا ہے۔ پانچواں غور سے بوڑھے کی لاش کو دیکھتا ہے۔ اور ایک طرف بیٹھ کر زار و قطار رونے لگتا ہے۔

چاروں (ایک ساتھ) تمہیں کیا ہوا۔

پانچواں (بوڑھے کی لاش کی طرف اور کبھی بدصورت عورت کی طرف دیکھتے ہوئے) شراب کے نشے اور رقص میں محو ہو کر میں بھول گیا کہ میں تنہا ہوں۔ جبکہ ایسا نہیں تھا۔ اب میں تنہا ہوں

روتا ہے، کیونکہ شراب انسان کو دیوانہ کر دیتی ہے
اور رقص پاگل ــــــ (دوبارہ روتا ہے)
سنو ــــــ میری بات غور سے سنو ــــــ جب میں
یہاں سے گھر لوٹا تو میری بیوی مر چکی تھی۔ اور
اس کا چہرہ ٹھیک ایسا ہی ہو رہا تھا (ذمہ داری
کی طرف اشارہ کرتا ہے) وہاں میرے دونوں
بچے بیوی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے
(اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور اس بدصورت عورت
کی جانب بڑھتا ہے اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل
کر دیتا ہے۔

وہی پانچواں: (روتا ہوا) ...... تم بالکل میری بیوی کی طرح ہو
...... اور میں اب تک تم سے دور بھاگ رہا
تھا ...... تم میرے ساتھ چلو ...... میرے گھر
(شراب کی بوتل اپنی جیب سے نکال کر دور پھینک
دیتا ہے۔ اور اس بدصورت اور بھدی عورت
کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ چاروں دم بخود ہو کر دیکھتے
ہیں۔ اور بوڑھے کی لاش کے آگے عقیدت سے
جھک جاتے ہیں۔

پردہ گر جاتا ہے۔

بند دروازوں کی بستی

مصور سبزواری

صاعقہ بر دوش سی ایک رات، کالی رات
سنگ دل ڈائن کی صورت لپلپاتی سرخ جیبھ
مکلبھا کی پانچوں بوڑھی ہوتی جادوگرنیوں کی
اسمِ اعظم پر کمندِ بے شکست
اور بے ناموس ننگا ایک جھونکا
راکشس سنان مندر کا کوئی
اور عقب میں کوہ کے ایک سرکٹے سورج کی
اکیلی آنکھ کی پتلی پہ کالی جھیل سی
اور جلو میں بند دروازوں کی وہ بستی
جس کو کوئی ساحرانہ بازیافت
پچھلی صدیوں کی تباہی کی صلیبوں کے بدلنے شہر سے لے آئی تھی۔
بند دروازوں کے اندر جھانکتی آنکھیں نہ تھیں۔
مرگِ روز و شب کی بھی زندہ سند کوئی نہ تھی۔
صرف ایک جامد تصور پتھروں کے آر پار
چند پتھرائے ہوئے نقشِ قدم کی واپسی کا منتظر
کتنے ہی پہلے یہاں دروازہ، دروازہ
بے تحاشا خوب صورت عورتوں کے لذت آگیں جسم تھے
چہرے نہ تھے
ان کے پستانوں سے بہتی دودھ کی اجلی ندی
جنگلوں سے آنے والے اژدہوں کے واسطے ہی وقف تھی
ایک دن سب اژدہے مرجھا گئے
دودھ کی اجلی ندی تھی بد دعاؤں کی چٹان
سرکٹے سورج کی اکیلی آنکھ سے پیدا شدہ وہ جھیل
پاتال میں دھنسنے لگی
وقت کا بوڑھا رفو گر جانے والی آنے والی
زخم خوردہ ساعتیں سیتا رہا..... سیتا رہا

روشن پٹیالیوی

ستاروں سے گفتگو

تمام رات
ستاروں سے گفتگو ہوگی
کوئی نہیں ہے جہاں میں
رفیق تنہائی
امنگیں کروٹیں لیتی ہیں
دل میں رہ رہ کر
کسی مستی بھرے حسن کی
جو یاد آئی
قرار دل کا گیا
نیند بھی اچاٹ ہوئی
بس اب خیال سے ان کے
میں دل کا بہلاؤں
کہ ان سے ملنے کی
امید کوئی دل میں
تمام رات ستاروں سے گفتگو ہوگی
حسین چاند سے
کروں گا
راز کی باتیں
تمام رات ہی گزرے گی
اس تگ و دو میں
تمام رات

حمید الماس

ناطقہ سر بگریباں ھے....

اپنے ہاتھوں میں
اپنی زباں لے کے پھرتا رہا در بہ در
اجلے صفحوں پہ
آواز کی روشنی
تجربوں کی دھنک
خون دل کی لکیریں
بکھرتی رہیں
اور
وہ اپنے گھر ہی میں
حیوان بے نطق تھا عمر بھر

عہد نامہ

اور جب زرد سورج نے
ڈھلتے ہوئے
کالے آنچل سے منہ کو ڈھکا
چار سو جل اٹھے تیرگی کے کنول
ایک محفل سجی
نیند کی جستجو میں بھٹکتی ہوئی
بجتی آوازوں کا جشن ہونے لگا

اور پھر یوں ہوا
تیرگی کی فصیلیں کچھ اونچی ہوئیں
گرم سانسوں کی خوشبو نے انگڑائی لی
بت سنورنے لگے، رنگ گڈمڈ ہوئے
اور تب
سرخ قطروں کی بارش ہوئی
اور برسات نے خامشی سے کہا
ان اندھیروں کا رُخ موڑ دو
بجتی آوازوں کے جشن کی سرحدیں توڑ دو

اور پھر یوں ہوا
چند آوارہ سائے
بکھرے ہوئے خواب کے ننگے بازو پر سر رکھ کے رونے لگے
اور پھر سرخ قطروں کی چٹان سے
کھاری پانی کے چشمے ابلنے لگے

بھیڑ کے اس سمندر میں لفظوں کا اک قافلہ
آ کے ٹھہرا فقط چند لمحوں کو اور اس کے آنسو لئے
بہہ چلا اس طرف
کھاری پانی کی موجیں جہاں
زندگی کا کنول لے کے اٹکھیلیاں
کرتی پھرتی ہیں از شام تا بہ سحر

اور میں بجتی آوازوں کے جشن کو
آج بھی دیکھ کر
سوچتا ہوں
میرے اندر درد دکھ کا ساگر ہے
اس کی کوئی حد نہیں ہے ..... کوئی حد نہیں
پھر بھی میں عہد کرتا ہوں
اس جشن کی
آخری داستان
مجھکو لکھنی ہے ـــــ لکھوں گا
اب خواہ اس کے لئے
پھر مجھے
زرد سورج کے چہرے سے آنچل ہٹانا پڑے

علی عباس امید

فضا ابن فیضی

تم اپنے پاس ہی رکھو حکایتیں اپنی
خدا نے مجھ پہ اتاری ہیں آیتیں اپنی

فریب ٹھہریں نہ روشن بصیرتیں اپنی
کہ آئنوں نے بدل لی ہیں صورتیں اپنی

اسی عذاب کو کہتے تھے تم نئی دانش
اب آؤ خود ہی سنبھالو قیامتیں اپنی

کہاں وہ لوگ جو لوح و کتاب پڑھتے تھے
تم اپنے چہروں پہ لکھ لو عبارتیں اپنی!

اٹھا کے اب کسی دریا میں ڈال دو ہم کو
کہ نیکیاں، نہ بنیں پھر مصیبتیں اپنی!

فضول ہے کسی معیار کی تلاش یہاں
کہ سب کے پاس ہیں جھوٹی صداقتیں اپنی

یہ اس کا ظرف تھا انجان بن کے ٹال گیا
ہمیں تو یاد نہیں ساری حماقتیں اپنی

بہت ہے ایک یہی شغل رائیگانی کا!
میں سنگ سنگ بکھیروں لطافتیں اپنی!

پہناؤں ان کو نہ معنی پھر رہیں عریاں
فضا ہیں یہی لبس الفاظ خلعتیں اپنی

غزل

سلطان اختر

میں نے جس پہلو سے بھی دیکھا مجھے اچھا لگا
زندگی کا دوسرا رُخ آپ کو کیسا لگا!

جیسے سب کو چھو گئی ہوں تشنگی کی انگلیاں
جس سمندر سے ملے وہ پیاس کا صحرا لگا

کوئی خواہش بھی فصیلِ جسم سے اونچی نہ تھی
اپنے ہر احساس کا ماتھا مجھے ٹھنڈا لگا!

کیا بتاؤں کیسے گذری دوپہر سی زندگی
عمر بھر سورج سوا نیزے پہ ٹھہرا سا لگا

سب کی آنکھوں میں جلن سب کے لبوں پر زہر خند
غور سے دیکھا تو ہر چہرہ مجھے اپنا لگا

میرے چپ ہوتے ہی سارے لوگ کیوں چپ ہو گئے
جیسے سب کو خامشی کا ذائقہ اچھا لگا

رات دن اختر گھنی مشغولیت کے باوجود
میں بھرے گھر میں بھی اپنے آپ کو تنہا لگا

نہیں کہ اس سے فقط رابطہ بڑھانا ہے
یہ شہر بھی کسی بنیاد پر اٹھانا ہے
قدم قدم پہ کوئی یاد آکے رہ جائے
یہ سفر نیا ہے مگر راستہ پرانا ہے،
نظر اٹھاتے ہی منظر بدلتے جاتے ہیں
یہ کس نگر کی طرف قافلہ رواں ہے
چلے تو آئے ہیں ہم رزم عشق میں لیکن
خبر نہیں ہے کسے وار سے بچانا ہے
یہ کوئی اور ہے محرومیوں کے جنگل میں
یہ میں نہیں کہ میرے واسطے زمانہ ہے
تمام عمر تجھے کیسے بھول سکتا ہوں
اگر خوشی بھی تیرے غم کا شاخسانہ ہے
میں اس گھڑی کے تناظر کو یاد رکھوں گا
مجھے خبر ہے، مجھے لوٹ کر بھی آنا ہے،
غزل ہے اپنی حقیقت کا جاننا ساجد
مگر یہ راز کسی کو نہیں بتانا ہے

غلام حسین ساجد (پاکستان)

رہنما زردار ناداروں کے بیچ!
ہے عجیب کردار کرداروں کے بیچ
عاشقوں کا یہ تو ہے ادنیٰ کمال
کھیلتا ہے کون انگاروں کے بیچ!
اگلی ساری صورتیں گم ہو گئیں
شکل دیکھی ایسی دیواروں کے بیچ
مصلحت کے ہو گئے تھے سب شکار
بولتا تھا میں ہی سرداروں کے بیچ
زندگی کا تھا نیا اک تجربہ
وقت گزرا جو بھی بنجاروں کے بیچ
سر بہ پردہ تھا صف اعدا میں کون
گل کھلایا کس نے یوں خاروں کے بیچ
تکتے ہی رہتے ہو شاہین اس طرف
کیا نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

افتخار اجمل شاہین

وقارؔ واثقی

غزل

کررہا تھا میں سفر کی باتیں
لوگ سمجھے مرے گھر کی باتیں

اہل فکر، اہل نظر کی باتیں
لب ساحل ہیں بھنور کی باتیں،

شب گزیدہ ہیں پہ انکے لب پہ
شام ہی سے ہیں سحر کی باتیں،

عہد حاضر کا تجربہ ٹھہریں
عہد ماضی کی سفر کی باتیں!

کچھ زبانوں میں کشش ہی نہ رہی
یاد جب آئیں نظر کی باتیں،

اپنے ہی گھر کی کہانی نکلی
لب پہ تھیں گو ترے گھر کی باتیں

آج سننے کی کسے ہے فرصت
اہل دل اہل نظر کی باتیں!

اب غزل بھی نہیں کرتی برداشت
درد دل درد جگر کی باتیں

شانؔ بھارد

غزل

کون ہوں، کیا ہوں، بتاتی نہیں صورت میری
آئینے میں بھی ہے روپوش، حقیقت میری

برف سی یوں تو جمی رہتی ہے ہونٹوں پہ مگر
شعلہ بن جاتی ہے آنکھوں میں عداوت میری

دستکیں شور میں تبدیل ہوں اس سے پہلے
کاش مجھ سے لے جائے کوئی سماعت میری

یہ بھی موسم کا تقاضا ہے کہ غنچے کی طرح!
ہر نئی شاخ پہ کھل جاتی ہے حسرت میری

حادثہ میرے مقدر میں یہ لکھا ہی نہیں
ورنہ دم توڑ چکی ہوتی شرافت میری

غزل

میری چشمِ شوق جب ہر رنگ پہ چھا جائے گی
یہ تری تصویر لو اس دور دھندلا جائے گی

وہ بھی گرد و پیش کا لینے لگا ہے جائزہ!
دیکھنا اب جلد اس کی آنکھ پتھرا جائے گی

اگلے موسم میں تمہیں پہنائیں گے دھانی لباس
زرد پیڑوں کو ہوا یہ کہہ کے بہلا جائے گی

ہے یہاں چاروں طرف تاریک لمحوں کا حصار
روشنی میری طرف آئی تو گھبرا جائے گی

جی یہی چاہے گا کہ پیڑوں سے لپٹ کر رو پڑیں
جب کبھی بھی آنکھ تیری سوئے صحرا جائے گی

دے نہ پائے گا اسے اس شہر میں کوئی پناہ
گھوم پھر کر تیرگی میرے ہی گھر آ جائے گی

شام کی تاریکیوں میں دیکھنا ہوگا یہی
تیری پرچھائیں ہی تیری جسم کو کھا جائے گی

راہ میں ہوں گے مسافر قافلہ در قافلہ
زندگی منزل پہ اپنے پھر بھی تنہا جائے گی

خورشید طلب

غزل

عکس نے آئینے کا گھر چھوڑا
ایک سودا تھا جس نے سر چھوڑا

جھلکتے منظروں نے آنکھوں میں
جسم کو صرف آنکھ بھر چھوڑا،

ہر طرف روشنی سی پھیل گئی،
سانپ نے جب بھی کھنڈر چھوڑا

دھول اڑتی ہے، دھوپ بیٹھی ہے
اوس نے آنسوؤں کا گھر چھوڑا

کھڑکیاں پیٹتی ہیں سر شب بھر،
آخری فرد نے بھی گھر چھوڑا،

کیا کرو گے نظام راتوں میں،
زخم کی یاد نے اگر چھوڑا،

ش۔ک۔ نظام

غزل

جو درد کا شعلہ ہے میرے دل میں پلے ہے
پلکوں پہ دیا شام سے پہلے ہی جلے ہے

جنت کی سحر میری صراحی میں پلے ہے
واعظ ترے میخانے میں جب رات ڈھلے ہے

اس کو سحر و شام کی کچھ قید نہیں ہے
سائے کی طرح یاد تری ساتھ چلے ہے

گذری ہے عجب مجھ پہ محبت کی خرابی
دیکھے ہے جو مجھکو کف افسوس ملے ہے

ہم جی تو رہے ہیں اسی امید پہ خادم
کب دیکھیں شب غم کی بلا سر سے ٹلے ہو

خادم رزمی

غزل

وہ رنگ و نور کی بارش ابھی سلامت ہے
چراغ ہو گیا گل روشنی سلامت ہے

ہمارے ہونٹوں کو چھو کر گزر گیا دریا
مگر یہ کیا ہے کہ تشنہ لبی سلامت ہے

یہ سمجھو تجھ پہ کوئی حادثہ نہیں گذرا
کسی بھی طرح اگر زندگی سلامت ہے

تمام عمر دیا اس نے زندگی کا ثبوت
بوقت مرگ بھی زندہ دلی سلامت ہے

نہیں ہے تجسم کے تن میں لہو کا اک قطرہ
اگرچہ رخ پہ ابھی تازگی سلامت ہے

تجسم عثمانی

دو غزلیں

زندہ رہنے کی ہو صورت تو رہے زندہ کوئی
سینکڑوں غم ہوں تو پھر کیسے جئے تنہا کوئی

پہلے تو شہر میں کوئی نہ تھا اپنا، لیکن
اب تو خود اپنے ہی گھر میں نہیں اپنا کوئی

ایسا لگتا ہے مجھے درد کی آہٹ سے کبھی
دل کی دہلیز پہ جیسے کہ ہے ٹھہرا کوئی

کوئی چاند اور ستاروں میں قدم رکھنے لگا
ہاتھ کی ٹیڑھی لکیروں میں ہے الجھا کوئی

ہم نے مانا کہ بہار آئی ہے گلشن میں مگر
بات کیا ہے کہ کھلا گل نہ ہنسا غنچہ کوئی

اپنا تو حال ہے بالکل اسی طرح عرفاں
جیسے رہ کر کے بھی دریا ہو تشنہ کوئی

رہو کہیں بھی مگر دل سے رابطہ رکھو
دلوں کے درمیاں ہرگز نہ فاصلہ رکھو

دلوں کا رشتہ کہیں سرحدوں سے ٹوٹا ہے
بحث مقام سے نہیں، دل سے واسطہ رکھو

تمہاری سوچ سے آگے نکل گیا ہوں میں
تم اپنی سوچ کو اپنے ہی پاس سجا رکھو

کہیں تمہارا ہی چہرہ نہ دھوکا دے تم کو
تم اپنے ساتھ ہمیشہ اک آئینہ رکھو

جلائے ہم نے کئی بار آندھیوں میں چراغ
ہمارے ساتھ نہ اب کوئی شرط لگا رکھو

کبھی تو ہوگا گزر روشنی کا اس طرف عرفاں
دریچہ گھر کا اسی آس پہ کھلا رکھو

عرفان [illegible]

تبصرہ

نام کتاب : ریت ریت لفظ (افسانے)
مصنف : حمید سہروردی
ناشر : اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد
قیمت : پندرہ روپے
مبصر : کلام حیدری

حمید سہروردی کے سولہ افسانوں کا یہ مجموعہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۶ء تک کے افسانوں کا مجموعہ ہے

[illegible] کے لئے فلیپ پر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، رشید امجد کی رائیں بھی ہیں۔ اور مہدی جعفر نے پیش لفظ لکھا ہے۔ پیش لفظ کا پہلا جملہ ہے:

"میں حمید سہروردی کو ایک انوکھا فنکار کہتا ہوں"

وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

"اس لئے کہ انہوں نے اپنے پیش روؤں کی نقالی نہیں کی اور نہ ان سے متاثر ہوئے"

منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ جو افسانہ نگار اپنے پیش روؤں کی نقالی نہ کرے اور ان سے متاثر نہ ہو تو اسے مہدی جعفر صاحب انوکھا فنکار کہیں گے۔ نقالی تو خیر ہے ہی غیر تخلیقی کام اس لئے اس کے نہ کرنے پر انوکھا کہنا کوئی اہم بات نہیں۔ مگر پیش روؤں سے متاثر نہ ہونا بیا انوکھی بات سہی مگر کوئی معیاری بات نہیں۔ کہ پیش روؤں سے انحراف کرنا بھی متاثر ہونے کی دلیل ہے ورنہ قیمتی شے ہے اس پہ تکیہ کرنا اس خزانے کو خالی کرنا ہے۔ اور یہ کام اچھا نہیں ہے۔ مگر اس خزانے میں اضافہ کرنا اسے وسعت دینا تخلیقی عمل ہے۔

پیش لفظ میں مجموعے کی پہلی کہانی "کہانی در کہانی" کا ذکر نہیں۔ لگتا ہے مہدی جعفر نے اس کہانی کو قابل ذکر نہیں سمجھا۔ اور کوئی ضروری نہیں کہ پیش لفظ میں مجموعے کی ساری کہانیوں کا ذکر ہو۔ اس لئے یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ حمید سہروردی کی اس کہانی میں بڑا دم خم ہے۔ اگر اس میں فنکارانہ پختگی ہوتی تو...... [illegible] ہے۔ اس کے بغیر بات نہ بن پائے۔ اس کہانی کا لوداری، پہاڑ، ریچھ اور نوجوان اور وحشی اور تارکی، چوٹی، لڑکی ——— ان پر الگ الگ نگاہ ڈالنی چاہئے۔ کہ جن کے درمیان قاری کو ربط کی تلاش میں سرگرداں چھوڑ کر

افسانہ نگار یکایک چپ ہو جاتا ہے ۔
نوواردکے ساتھ آنے والا اربچہ نوجوان کو سوار کر کے لے جاتا ہے۔ اور نوجوان کو چھوڑ کر آتا ہے تو نو نوواردکو ہلاک کر دیتا ہے۔ بے شہادت روشنیوں کے درمیان حائل پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے تو :
"بستی کے سب ہی گھروں میں اجالا ہی اجالا پھیل گیا" (افسانے کا آخری جملہ)
تبصرے کی بساط چھوٹی ہے میں اتنا عرض کر کے ختم کر دیتا ہوں کہ حمید سہروردی کے افسانوں کو اشتیاق کے علاوہ احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔

نام کتاب :	میرے اندر ایک سمندر (شعری مجموعہ)
شاعر :	پریم وار برٹنی
ناشر :	اجنتا پریم وار برٹنی
قیمت :	تیس روپے
مبصر :	کلام حیدری

پریم وار برٹنی فیشن کے طور پر یا محلفوں میں نمایاں رہنے کے لئے شاعر نہیں بنا تھا۔ وہ شاعر پیدا ہوا تھا اور شاعری اس کے لئے عذاب اور ثواب دونوں کا درجہ رکھتی ہے ۔ دنیا، جیسی کہ نظر آتی ہے نہیں ہے مگر اس معمولی بات کا احساس ہر کسی کو نہیں ہوتا نہ ہو سکتا ہے ۔ یہ احساس دوسروں سے مستعار لے لینے سے بھی کوئی بات نہیں بن سکتی ۔ یہ تو فنکار ہی ہے جو اسے طرح طرح سے محسوس کرتا ہے ۔ اور اس اذیت کو سہتا ہے جھیلتا ہے ۔ اور الفاظ اور ترنم کے بکھرے عناصر کے بازیچۂ اطفال کے تماشائیوں کے لئے مسرت و انبساط کی ایک دنیا آباد کر دیتا ہے ۔
برٹنی منیر نیازی کے مطابق پریم ایسے شاعر بے معنی جہات کو معنی دینے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے مگر یوں شاعر اپنا سب کچھ گنوا کر بھی محسوس کرتا ہے۔ کہ اس سے کچھ نہ ہو سکا۔ یہ فرض کی ادائیگی اور پھر بھی خود کو مفرور محسوس کرنے کا عذاب پریم وار برٹنی نے بہت جھیلا ۔
حسن دائم کے جہاں کا یہ خواب ادھورا رہ جاتا ہے ۔ باقی حصے کی اذیت اور دیکھے ہوئے حصے کا انبساط — ان لمحوں کے بیچ میں کھڑا پریم وار برٹنی اور کیا کہہ سکتا تھا —

> دیتا رہوں گا روشنی بجھنے کے بعد بھی
> میں بزم فکر و فن کا وہ تنہا چراغ ہوں

یہ تنہا چراغ بجھ گیا ہے مگر روشنی — جن تاریکیوں کے کلیجے اس روشنی نے چیرے ہیں۔ وہ خود بخود بتا دیتے ہیں کہ یہ فنکار ہے ۔ یہی پریم وار برٹنی ہے یہی اس کی شاعری ہے ۔

اور دنیا ——— صرف انچاس (۴۹) سال کی عمر میں برٹنی جینے کے عذاب کو سہنے سے انکار کرتا ہوا چلا گیا۔ اور ہمیں یہ دھوکا دیتا گیا کہ چراغ بجھ گیا ——— حالانکہ فکری توانائی اور شاعرانہ رعنائی کا چراغ کبھی نہیں بجھتا، پریم وار برٹنی کا نام بدل جاتا ہے۔ اور عام طور پر یہ لگنے لگتا ہے کہ برٹنی نہیں ہے۔ باقی نہیں ہے ....!

اس شعری مجموعے کو ادب نواز دوستوں کے نام انتساب کرکے برٹنی نے ادب نوازوں سے اپنا اٹوٹ رشتے کا احساس ہی نہیں دلایا ہے۔ بلکہ ادب نواز دوستوں پر اپنے اعتماد کے اظہار کے ساتھ اپنے فن پر اعتماد کا جائز اظہار کیا ہے۔

اپنے جینے کی ادا بھی ہے انوکھی سب سے
اپنے مرنے کا بھی انداز نرالا ہوگا!

پریم وار برٹنی کے جینے کا انداز سچ مچ انوکھا تھا کہتے ہیں جو اس طرح جینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ کہ جس سے مرنے کا بھی انداز نرالا ہو جائے۔

یہ مجموعہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ جلتے پنکھ : قطعات و رباعیات
۲۔ سلگتے رنگ : نظمیں اور گیت
۳۔ اوس اور آگ : غزلیں۔

قطعات اور رباعیات میں جلتے پنکھ کی جان لیوا بو بھی ہے۔ اور یہ احساس بھی کہ یہ پنکھ جل جائیں تو طاقت پرواز ——— خود وجود ہی کتنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ پریم وار برٹنی نے دینا کو تنہا تھا اور جلتے ہوئے پنکھ کی بو کو سونگھا تھا۔ اور زندگی کے بے معنی ہونے پر خاموشی کے ساتھ سرگوشی میں رو رہا تھا۔ وہ چیختا اور دھاڑتا نہیں ہے۔ سسکیاں لیتا ہے۔ ان سسکیوں میں دنیائے احساسات آباد ہے۔ ان تک پہنچنا ادب نوازوں خصوصاً دوستوں کا فرض ہے۔

نظموں اور گیتوں میں تیور رہی ہیں، یہاں پھیلاؤ ہے۔ اور ٹوٹنے بکھرنے کے سارے عمل ہیں جو منضبط ہے وہ آداب فن پر گرفت کے بغیر ممکن نہیں۔ برٹنی کی گرفت مضبوط ہے۔ اور آہستہ آہستہ مگر سخت تشنج میں مبتلا کر دینے کا فن واضح اور متعین ہے۔ نظموں اور گیتوں میں برٹنی کی شخصیت یوں ابھرتی ہے جیسے کہرا سا پھیلتا جائے۔ اور کہرے کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔ اور روشنی کی تمنا جاگ اٹھے ——— اس تمنا کو جگانے کا کام فنکارانہ طور پر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ نظمیں اور گیت بتاتے ہیں۔

غزلوں میں برٹنی کلاسیکی تیور کو حال کے ساتھ یوں ہم رشتہ کرتا ہے۔ کہ بہت کم لوگوں سے یہ ہو پایا ہے۔ اس کتاب کا کوئی ایک باب ہی برٹنی کو اردو شاعری میں ایک مقام دے سکتا ہے۔ غزلیں، بہت سے بلند و بانگ دعویٰ کرنے والے ہم عصر غزل گویوں کو پیچھے چھوڑ گئی ہے ——— یہ بات سنجیدگی سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ سخن فہمی جس نقاد کا ایمان ہوگا وہ انہیں محسوس کر سکتا ہے۔ طرف داری تو ادب میں محض سیاست ہے۔

برٹنی کی شاعری سخن فہموں کے لئے ہے۔

قارئین ـــــــــ سوادو صوت

ظفر ہاشمی ـــــ بھاگلپور

مکرمی حیدری صاحب! خلوص

ایک عرصہ کے بعد "آہنگ" دسمبر ۸۹ء کا شمارہ میرے زیر مطالعہ آیا تو جی خوش ہو گیا۔

اس شمارے کی تمام چیزیں اپنی جگہ خوب ہیں۔ خصوصاً افسانوں میں "لکڑ بھگا ہنسا" اور شعری گوشوں میں جناب حرمت الاکرام، جناب حمید سہروردی، اور جناب عبداللہ کمال بے حد متاثر کرتے ہیں۔

جناب اختر لکھنوی کا یہ خیال کہ:

"ہندوستانی ادب کے مقابلے میں پاکستانی ادب زیادہ موثر اور زیادہ زندگی آمیز ہے" (آہنگ دسمبر ۸۹ء ص ۳۰)

سے میں اتفاق تو نہیں کرتا لیکن جب ڈاکٹر جمیل جالبی بھی یہ فرماتے ہیں کہ:

"پاکستان کی غزلوں میں تازگی ہے جب کہ ہندوستان کی غزلیں ہندو مسلم فسادات سے باہر نہیں نکلیں" (گلبن نومبر ۸۹ء)

تو مجھے شدت سے اپنے ادب کا جائزہ لینے کا احساس ہوتا ہے اگر ایسا ہے تو میرے خیال میں اس کے ذمہ دار نہ صرف شعرا داد ا رہی ہیں۔ بلکہ بیشتر مدیر بھی ہیں۔

حمید سہروردی ـــــــ

برادر مکرم! تسلیم

آہنگ کا فکشن نمبر ملا۔ شکریہ! تمام افسانوں کے تجزیے کروا کر آپ نے فکشن نمبر کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ البتہ مضامین کا انتخاب کمزور ہے۔ کسی مضمون میں کوئی فکر انگیز بات ہے اور نہ ہی کوئی نیا زاویہ نگاہ۔

سینئر مضمون نگاروں نے وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو عام طور پر جونیئر کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ تخلیقی صلاحیتوں پر بڑی عالمانہ قسم کی باتیں ہوتی ہیں مگر تخلیق کیا ہے وہی غائب رہتی ہے۔ اردو کا نقاد اور کیا کر سکتا ہے صرف مفروضے تیار کر لیتا ہے اور قلم چلاتا ہے۔ اللہ رحم کرے،

فکشن نمبر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ قبول فرمائیے

کمار پاشی ـــــــ دھلی

کلام حیدری صاحب! آداب

نیا سال مبارک ہو!

آہنگ کا فکشن نمبر شائع ہو گیا یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی۔ یہاں دو چار جگہ گیا مگر فراہم نہ ہو سکا۔ اگر ممکن ہو تو اس کی ایک جلد روانہ فرمائیں، ممنون ہوں گا۔

ڈاکٹر عزیزی ـــــــ (بنگلہ دیش)

محترمی کلام حیدری صاحب! خلوص و محبت

آہنگ کا فکشن نمبر بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جو اپنے طور پر معیاری اور دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ آپ

آپ نے اس کو جس طور پہ سنوارا ہے۔ آپ قابل مبارکباد ہیں

شاداب رضی ——— (بھاگلپور)

مخدومی کلام حیدری صاحب! تسلیم

آہنگ کا "فکشن نمبر" قدرے تاخیر سے کا ہاتھ آیا اسے دیکھتے ہی جی خوش ہو گیا۔ مشمولات اور حسن ترتیب پر مجھے حیرت نہیں کیونکہ آپ کی ان صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔

ناصر بغدادی ——— کناڈا

محترمہ نوشابہ حق صاحبہ! تسلیم و نیاز

ایک ہندوستانی ادیب دوست کی توسط سے، آہنگ پڑھنے کو ملا۔ میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ آپ سب اردو اور اردو ادب کی قدر و منزلت کو نقطۂ عروج پر لے جانے کی حتی المقدور کوشش کر رہے ہیں۔ ادیب ہونے کے ناطے کلام حیدری صاحب سے ایک عرصے سے میرا دلی تعلق رہا ہے۔ اس دوران انہوں نے جس ادبی دیانتداری سے ادب کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ یقیناً قابل صد تحسین ہے۔ خدا کرے ان کی آواز دوسروں کی طرح صدا بصحرا نہ ثابت ہو۔ یہ ایک ہنگامی دور ہے ادیب کی آواز فغان درویش کے سے کوئی دھیان ہی نہیں دیتا۔

قمر احسن ———

کلام بھائی! آداب

آج آہنگ کا نومبر کا شمارہ ملا لیکن اب تک "فکشن نمبر" کی زیارت نہیں ہو سکی ہے۔ چند دن قبل شمس الرحمن فاروقی صاحب نے بھی حکم دیا تھا کہ آپ کو ان کی طرف سے بھی لکھ دوں کہ انہیں بھی فکشن نمبر نہیں ملا ہے ...... یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے ہم لوگوں کو نظر انداز کیا ہوگا۔ یقیناً کچھ ڈاک کی خرابی ہوگی، بہرحال میں اور ارتقی صاحب بے چینی سے اس نمبر کے منتظر رہیں۔

فروغ صبا ——— پٹنہ

مکرمی! تسلیم

آہنگ کا فکشن نمبر ملا، صوری و معنوی لحاظ سے بہت خوب ہے۔ افسانے سبھی معیاری اور انفرادیت کے حامل ہیں۔ ابھی ابھی دوسرے رسالوں نے بھی افسانہ نمبر پیش کیا ہے۔ لیکن جو بات "فکشن نمبر" میں ہے وہ دوسرے افسانہ نمبر میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ آپ نے کافی محنت کی ہے۔ اس محنت کا صلہ آپ کو اردو ادب کیا دے گی؟ یہ اردو ادب پر آپ کا احسان ہے۔

افسانے پر جو تجزیاتی مضامین ہیں ان کی روشنی میں جدید افسانے کو سمجھا جا سکتا ہے۔ چند رسالوں میں فکشن نمبر پر تبصرہ بھی دیکھا۔ تبصرہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ تبصرہ نگار نے جھنجھلا کر تبصرہ کیا ہے۔ جو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

فکشن نمبر کے بعد دو عام شمارے اور دیکھنے کو ملے اس میں مواد کافی معیاری ہیں۔ کیا آئندہ یہی معیار رہے گا؟

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے

———

R. N. Regd. 4253/64
P. T. Regd. No. Gy. 7
Phone — 432

THE Aahang URDU MONTHLY
BAIRAGI, GAYA

Feb. 198

Price : Rs. 2/-

لچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ

آہنگ

گیا

شرح خریداری

ایک سال کیلئے ——— چوبیس روپئے
فی کاپی ——— دو روپے
فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹر

نوشابہ حق

رفقائے ایڈیٹرز

شفق، عبدالصمد

محتویات

کشکول

آہنگ کا نیا شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کتابت کی غلطیوں کی جانب جن حضرات نے ہماری توجہ مبذول کرائی ہے، ہم اُن کے ممنون ہیں۔ عذرِ گناہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ یہ بدتر از گناہ ہے۔ پھر بھی یہ عرض کر دیں کہ کتابت کرنے والے لوگ پہلے جتنے پڑھے لکھے ہوا کرتے تھے اب نہیں ہوتے۔ یہ تعلیمی معیار کی عام گراوٹ کا حصّہ ہے۔ اب جو کاتب حضرات مل رہے ہیں وہ عجیب و غریب قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ تصحیح کر دینے کے بعد بھی وہ غلطیوں کو درست نہیں کرتے اور تقاضا یہ ہوتا ہے کہ کئی کئی بار پروف پڑھیے۔

ہم نے احتیاط برتنے کی کوشش کی ہے شاید اس شمارے میں نسبتاً کم غلطیاں ہوں۔

نئے بجٹ کی چوٹ رسالوں اور اخبارات پر بھی پڑی ہے، ڈاک خرچ میں دو گنے سے زیادہ کا اضافہ اَدب کُشی کے برابر ہے۔ مگر اپنے ملک میں یہ دیکھنے کی کسے فرصت ہے؟ ایک طرف تو مشتہر کیا جاتا ہے کہ چھوٹے اور اوسط درجے کے اخبارات پر "کرم فرمائیوں" کی بوچھار ہو رہی ہے اور دوسری طرف عملی طور پر یہ ہو رہا ہے کہ کاغذ کی قیمت برابر بڑھ رہی ہے، ڈاک خرچ بڑھایا جا رہا ہے، سرکاری اشتہارات سے محروم کیا جا رہا ہے۔

کلچرل اکیڈمی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار **مورچہ** کو مہینوں سے ریاستی حکومت کا ایک اشتہار بھی نہیں دیا گیا ہے جبکہ منسٹروں کی تصویروں کے ساتھ دوسرے گمنام ہفتہ واروں اور برائے نام روزانہ اخبارات کو پوری فراخ دلی کے ساتھ ریاستی حکومت (محکمہ تعلقاتِ عامّہ) کے اشتہارات دئے جاتے ہیں —— وجہ؟ وزیروں کی چاپلوسی، شخصی وفاداریوں کی قسمیں — اور بڑے درباروں میں [illegible] صبح و شام حاضریاں —— !

ایسے عالَم میں کلچرل اکیڈمی سے شائع ہونے والے آہنگ جیسے ادبی رسالے کو کون پوچھے گا؟

حیدرآباد میں اُردو کانفرنس ہوئی ـــــــ ہم اپنی مجبوریوں کی وجہ کر باوجود دعوت نامے کے کلام حیدری صاحب کو وہاں نہ بھیج سکے۔ کانفرنس کے بعد حالات ونتائج معلوم ہوئے تو لگا کہ چلو اچھا ہی ہوا، وقت بچا۔ کیوں کہ وہاں ہوا کیا؟ کانفرنسوں سے اُردو زبان وادب کو کیا مل سکا ہے جو اِس کانفرنس سے ملتا؟ ہم کانفرنسوں کے مخالف نہیں ہیں مگر ان کانفرنسوں میں جس طور پہ بے بسی، خوشامد اور وظیفہ خواری کا اظہار ہوتا ہے اُس سے تکلیف ضرور پہنچتی ہے ـــــــ مطالبے، تجاویز ـــــــ اور شکریہ!

بس "شاہ" کو دعاؤں کے ساتھ کانفرنسیں ختم ہوجاتی ہیں!

اور ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے رہنے والے خیر سے گھر لوٹ آتے ہیں!

زمانہ عجیب آیا ہے! ابودھابی، دوبئی میں نامعلوم قسم کا بزنس کیجئے اور دہلی کے فائیو اسٹار ہوٹل میں جشن منایئے، رات رات بھر اول فول قسم کے ناول پڑھیۓ اور "اہلِ قلم" کو سنایئے۔ لکھنے والوں اور چھاپنے والوں پر ناقابل یقین "دولت" نچھاور کیجئے اور چشم زدن میں کافکا اور کامو کو میلوں پیچھے چھوڑ دیجئے ـــــــ دعویٰ کیجئے کہ یہ اُردو نظم ہے اور تین حصّے میں دنیا کی دوسری زبانوں کے الفاظ یہاں تک کہ بولیوں اور سلینگ کو اکٹھا کر دیجئے ـــــــ بس اقبال مُنہ تکتے رہ جائیں گے، میراجی، اخترالایمان، جاں نثار اختر گرد ہوجائیں گے ـــــــ!

مگر ـــــــ اقلیمِ ادب کے قوانین بڑے سخت ہوتے ہیں۔ وہی رہ جائے گا جو کھرا ہوگا اور کاغذ کا گلیز کسی کام نہیں آئے گا۔

ایک اہم سوال؟

[کیا اردو زبان و ادب کو شاعروں افسانہ نگاروں سے زیادہ اخبار بینوں اور اخبار نویسوں کی ضرورت ہے؟]

جواب۔ پروفیسر وحید اختر۔ علی گڑھ

میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے گھٹتے اور سکڑتے ہوئے حلقۂ قارئین کا مسئلہ شعر و افسانہ کے مقابل اخبار نویسی اور اخبار بینی کا نہیں۔ اردو کو ضرورت، اچھے شاعروں، افسانہ نگاروں اور باذوق تخلیقی مزاج کے آشنا ناقدین کی بھی ہے۔ اور اچھے صحافیوں کی بھی۔ اردو میں اخبار اور رسائل بھی کافی تعداد میں نکلنے لگے ہیں ادبی جرائد اور کتابیں بھی بہت چھپنے لگی ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اخبار و رسائل اور جرائد و کتب کو خریدار بہت کم ملتے ہیں۔ کیا نہیں ہے کہ اردو پڑھنے والے سب کے سب غریب ہیں کہ رسائل اخبار اور کتب خرید نہیں سکتے۔ ادبی رسائل و جرائد عموماً ادیبوں شاعروں ہی کے حلقے میں پڑھے جاتے ہیں۔ اور وہ بھی بیشتر اعزازی۔ کتابیں بھی لکھنے والوں کو بیشتر مفت ہی بیش تعدادوں اور ادیبوں میں تقسیم کرنی پڑتی ہے۔

اردو کی بیشتر کتابیں پانچ سو یا سات سو چھپتی ہیں۔ آدھے کے قریب اعزازی تقسیم ہونے کے بعد بھی باقی جلدیں برسوں میں نکل پاتی ہیں۔ حالانکہ اردو داں طبقے کے معمولی و متوسط افراد تقریبات، فلم بینی، کھیلوں کے مقابلے قوالیوں اور ثقافتی پروگراموں کے ٹکٹ گراں داموں پر خریدتے ہیں لیکن عموماً اردو اخبارات رسائل اور کتب کے لئے خوشحال گھرانوں میں بھی کوئی مد نہیں ہوتی۔ اخبار کے لئے تو یہ عذر پڑھے لکھے حلقوں میں ایک حد تک قابل قبول ہے کہ ان معیار شہروں کے احاطے اور دوسرے شہروں کی حد تک انگریزی اخباروں کا مقابلہ نہیں کر پاتا۔ حالانکہ اردو کے بعض اخبارات حیدرآباد، دہلی اور بمبئی میں اس معیار کے نکلتے ہیں جو علاقائی انگریزی اخباروں سے زیادہ ملکی اور بین الاقوامی خبریں بھی دیتے ہیں۔ طباعت کے لحاظ سے بھی بہتر ہوتے ہیں۔ اور انھیں دس پندرہ ہزار کی تعداد میں پڑھا بھی جاتا ہے۔ لیکن یہ اخبار بھی انگریزی کے قومی اخباروں کا مقابلہ کسی لحاظ سے نہیں کر سکتے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اردو کے بڑے اخبارات بھی انگریزی کی طرح دوسری دلچسپیاں

سکے۔ تین صفحات یا کم از کم کالم ہوں جیسے کھیلوں (SPORTS) کے لئے یا فلم کے لئے۔ اخباروں کے ادبی ضمیموں کی منظومات اور مضامین کا معیار ادبی جرائد سے بھی ہلکا ہوتا ہے۔ اگر ان اخبارات کا معیار بلند ہو تو وہ طبقہ جو انگریزی اخبار نہیں پڑھ سکتے اردو اخباروں کے ذریعہ نیا شعور، نئی عالمی آگہی پا سکتا ہے۔ لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ اردو کے بیشتر اخبارات بجائے نیا سیاسی سماجی شعور اور نئی دنیا کے نظریات و انکشافات سے قارئین کو آگاہ کرنے کے ان کے تعصبات ہی کو غذا فراہم کرتا ہے۔ اور اس کے سہارے اپنا حلقہ قارئین بڑھاتا ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آزادی کے بعد کے ذہن کی تشکیل میں ہماری صحافت نے وہ رول ادا نہیں کیا جس کی ضرورت تھی اس کا ایک سبب معاشی ہے اردو کے اخبارات انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں کے مقابلے میں اپنے صحافیوں کو اتنا کم معاوضہ دیتے ہیں کہ بہت پڑھے لکھے اور اچھے لکھنے والے اردو صحافت کی طرف آتے ہی نہیں۔

اردو زبان کی تعلیم کے کم بلکہ ایک دور میں خصوصاً شمالی ہند میں تقریباً منقطع ہو جانے سے زبان کے معیار پر بھی برا اثر پڑا ہے۔ اور نئی نسل میں اردو پڑھنے والے پیدا ہوئے یا تو بالکل نہیں ہوئے یا بہت کم ہو گئے۔ اب جبکہ بہار، یو پی اور آندھرا پردیش میں اردو کو برا بھلا مقام سرکاری حیثیت سے مل رہا ہے اور اردو پڑھنے والوں کے لئے ملازمت کے راستے بھی کھل رہے ہیں۔ تو امید کی جا سکتی ہے کہ اردو کے قارئین کی تعداد ابھی بڑھے گی۔ کیفیت کمیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اس اضافے کے ساتھ اچھی صلاحیت والے صحافی بھی اردو کو ملیں گے۔ اس وقت جو اہل قلم اردو صحافت سے وابستہ ہیں اتنے میں سے اکثر محض لگن یا قربانی کے جذبے سے کام کرتے ہیں۔ انہیں معاشی تحفظ حاصل ہونا چاہیئے محض شوق بہت دن تک آدمی کی ضروریات کی تلافی نہیں کر سکتا

انگریزی میں گزشتہ چند برسوں میں ماہانہ اور ہفتہ وار ایسے جرائد نکل رہے ہیں۔ اور مقبول ہو رہے ہیں جو اپنا خاص مزاج رکھتے ہیں۔ اردو میں ایسے رسائل کی کمی ہے۔ زیادہ تر ڈائجسٹ ہوتے ہیں یا فلمی یا نیم فلمی یا پھر مذہبی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ SUNDAY ایسے ہفتہ وار رسائل کے لئے شاید پڑھنے والوں کی بڑی تعداد اردو میں ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

افسانہ اور شاعری کی زبان کی بقا کے لئے ضروری ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ اردو اگر نامساعد حالات کے باوجود ہندوستان میں زندہ رہی تو اس کا ایک بڑا سبب اردو کے شعر و افسانہ کا وہ معیار ہے جو اسے بیشتر ہندوستانی زبانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ لیکن جدیدیت یا نئے فیشن کے نام پر زبان کے ساتھ جو تجزیے کئے جا رہے ہیں اور ابلاغ کے مسئلے کو جس طرح غیر اہم سمجھا جا رہا ہے۔ اس کی ادبی وقعت و اہمیت سے قطع نظر زبان اور قارئین میں مقبولیت کے لحاظ سے بڑی حد تک اس کا اثر منفی ہو رہا ہے۔ اردو کے عام قاری کو صحیح یا با محاورہ

زبان پڑھانی ضروری ہے۔ یہ کام اچھی صحافت کرسکتی ہے
صحافت میں بھی زبان اور نثر کا معیار آزادی کے بعد
گرا ہے ـــــ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ
ہے کہ اردو کو علمی زبان کی حیثیت سے ترقی دینے کی
پوری کوشش کی جائے۔ ترقی اردو بورڈ حکومت
ہند مختلف علوم پر اردو میں تراجم اور تصنیفات چھاپ
رہا ہے لیکن یہ کافی نہیں۔ ان کے لئے پڑھنے والے
کہاں سے آئیں گے جبکہ ہم خود بھی اور اپنے بچوں کو
بھی اردو میں مختلف موضوعات کتابیں پڑھنے کے اہل
نہیں بنائیں گے۔ ان کے لکھنے والے بھی نایاب ہوتے
جائیں گے۔ خود اس وقت یہ مسئلہ ہے کہ مختلف علوم
پر اردو میں ترجمہ کرنے یا لکھنے والے گنتی کے چند ہیں
وہ بھی عدیم الفرصت ہیں یا انگریزی میں اپنے موضوع
پر لکھنا پسند کرتے ہیں۔ کوئی زبان محض ادب و شعر
کی زبان بن کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے علمی اور کاروباری
زبان بھی بنانا ضروری ہے۔ یہ کام اپنے اپنے طور پر
شاعر ادیب اور صحافی بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن اس طرف
بالخصوص سائنسوں کے علما کو بھی متوجہ ہونا چاہئے۔
ادب سے دلچسپی ہمیشہ ایک حلقے تک محدود رہے گی۔
صحافت زیادہ بڑے حلقے کے لئے ہوتی ہے۔ دونوں
اپنے اپنے دائرے میں اردو کی بقا ترقی کے لئے کام
کر رہے ہیں لیکن دائرے کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے
ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کے ساتھ اردو کو قارئین
کی ضرورت ہے۔ ہمیں اخبار رسائل اور کتابیں خرید کر
پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ جب تک یہ نہ ہوگا
نہ ادب کام آسکتا ہے۔ نہ صحافت۔ ●

جواب　طارق سعید

ہاں۔ مگر کل ہاں نہیں۔ نصف ہاں!

سبب؟

اردو زبان و ادب تین حصوں میں منقسم ہے۔ اردو
زبان، اردو ادب، اور اردو تہذیب۔ یہ صحیح
ہے کہ ہمارا صحافی اردو زبان کی خدمت میں لگا
ہوا ہے۔ اور اخبارات کے ذریعہ اردو زبان
کی خدمت کر رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اخبار کیا ہے؟ اخبار سے مراد چند
جرائم، ڈکیتی، انقلاب اور فوج کشی، اور الکشن
تقریر، بحث، سنگ بنیاد اور احتجاج کا خوبصورت
امتزاج ہے۔ اور اسی طرح ایک ہی خبر چند ناموں
اور ملکوں کی تبدیلی کے ساتھ دو دفعہ چھپتی ہے۔ اور
ہم ان کو پڑھکر اپنی معلومات میں اضافہ سمجھتے ہیں
پھر بھی صحافی ملک اور اس کے جملہ سیاق و سباق کا
محافظ ہے صحافی بھی کیا ہے۔ ضمیر کے بجائے کسی
پارٹی (سب سے بڑی پارٹی مادیت ہے) سے متعلق
(COMMITED) ہے۔ مفاد کے لئے سب
روا ہے۔ چند مخیر العقول صحافی کی بات دیگر ہے
اکثریت کا حال ایک جیسا ہے۔ انہیں سے عوام کا واسطہ
ہے۔ عوام بیچاری کیا جانے کہ یہ جوتیوں میں دال
بانٹتے رہتے ہیں۔ اس دال بٹائی میں عوام بھی غیر محسوس
انداز میں شامل ہیں۔ عوام بھی کیا ہے؟ ایک بھیڑ جو
بے سمتی کا شکار ہے۔ کسی زمانے میں یہی عوام [illegible]
سے اردو پڑھ لیتی تھی۔ اور اب ہماری خاتون خانہ

ذں میں اپنی قابلیت کی نمود کے لئے یا محض منہ کا مزہ بدلنے
یہ پیپرز اردو میں باتیں کرتی ہے۔ اور نئی دنیا یا عوام جیسے
ے طوطے مینے فضا میں اڑاتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس قبیل
ندہ افراد جن کی ذات بابرکت سے اردو اخبار کی زندگی
ی ہے ایک ایک کر کے اس سرائے فانی سے کوچ کرتے
ہیں۔ اور اس طرح اردو اخبار بینوں کی تعداد میں برابر
چلی جا رہی ہے۔ یہ کمی ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں
ی ہونی چاہئے۔ مگر افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے
ساتذہ اخبار بینی کی نعمت سے محروم ہیں۔ دراصل
بینی عوامی مذاق ہے۔ یہ مذاق ہمیشہ قائم رہ سکتا ہے
ہے کہ اخبار بیں بھی موجود ہوں۔ اور اچھے اخبار بھی
ہیں۔ اخبار بینوں کی تعداد میں توازن رکھنے کا صرف
طریقہ ہے کہ اردو کی تعلیم پر خاص توجہ مرکوز کی جائے
ے عوام ہی نہیں، طبقہ اشراف اور حکومت بھی برابر
نظر سے کام لے رہی ہے۔ یہ نہایت ہی پیچیدہ اور
مسئلہ ہے جو مستقبل کے صحافیوں کے مقدر کو متعین
کا یقین جانئے کہ اگر صحافی اور اخبار بیں ناپید ہو گئے
ر زبان و ادب میں یقیناً جمود پیدا ہو جائے گا۔ یہ چیز
سے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا ہم کو نہایت
ے مقابلہ کرنا ہوگا۔ اور اس کا علاج صرف یہ کہ تعلیمی
ں میں اردو کی تعلیم میں کسی قسم کی کوتاہی نہ برتی جائے۔
بدا اندازاً ہے۔ ہر لحاظ سے ہر نوع کی کوتاہی روا ہے۔
حکومت بھی اچھا خاصا حصہ لے رہی ہے۔ لہذا اردو
لی کا حال کچھ دھندلا دھندلا نظر آ رہا ہے کیونکہ
یوں میں پڑھنے والے نہ رہیں گے۔ تو اردو ادب کے
ے گا پھر بھی یہ صحیح ہے کہ فی زمانہ اردو کی خدمت

گیا

صحافیوں اور اخبار بینوں سے زیادہ ہو رہی ہے

جواب۔ شرون کمار ورما

آدمی کی یہ خواہش شروع سے رہی ہے کہ وہ اپنے
خیالات، احساسات اور تاثرات، دوسروں
تک پہونچا سکے طویل عرصہ تک۔ وہ اپنے غم و غصہ
مسرت، شادمانی، حیرت و استعجاب کا اظہار
اشاروں میں یا اوکرا ہنس کر یا ناچ کر کرتا رہا ہے
لیکن جب اس کے عمل کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔
اور فاصلے بڑھنے لگے تو آپسی رابطہ قائم رکھنے
کے لئے یا اطلاع پہونچانے کے لئے مختلف آوازوں
کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اسے الفاظ تراشنے لازمی
ہو گئے۔ شاید سب سے پہلا بامعنی لفظ آدمی
نے "ماں" کہا تھا۔ اور پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔
جب فاصلے اور بڑھے تو تقریر سے اگلا قدم
تحریر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کہنے کا مطلب یہ
کہ زبان (تقریر و تحریر دونوں صورتوں میں) آدمی
کی سماجی ضرورت بنی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب
آدمی نے ترقی کی دوسری منازل طے کیں۔ وہ تقریر
و تحریر میں بھی نمایاں تبدیلیاں کیں۔ یہ عمل انسان
کے ساتھ جاری ہے اور رہے گا

اب زبان محض سماجی نہیں۔ تہذیبی اور ثقافتی
ضرورت بھی ہے۔ اس قدر طویل تمہید کے بعد
اردو زبان کو بھی اس پس منظر میں رکھ کر کچھ کہا
جا سکتا ہے۔ اطلاع، خبر اور ادب اپنے معنی اور
اپنے تاثر اور اپنے تہذیبی ورثے اور ضرورت کے

سے الگ الگ دائرہ عمل رکھتے ہیں ۔ کسی مرگ کی اطلاع
یا خبر بہت سے قارئین یا سامعین پر وہ گہرا اور دیرپا
اثر نہیں چھوڑتی جو ایک مرثیہ یا افسانہ چھوڑتا ہے
اور ہمارے ادب میں اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں ۔
خبر اور ادب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔
لیکن جبکہ خبر ایک وقتی چیز ہے ادب اس (وقت)
کی قید سے بالکل آزاد ہے ۔ میر، اور کالیداس
فلابیر، اور ٹالسٹائی آج بھی زندہ ہیں ۔ اور جب تک
انسان ہے زندہ رہیں گے ۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ اخبار نہ ہو تو کام چل سکتا
ہے ۔ زیادہ اخباروں اور اخبار نویسوں کا ہونا اچھے
شاعروں اور ادیبوں کی سماج میں وجود، اس سماج،
قوم اور ملک کے لئے اور زبان کے لئے قابل فخر بات
ہے ۔ اس کی ذہنی، تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی ترقی
کا ثبوت ہے ۔ لیکن ایک کو دوسرے پر بے جا ترجیح نہیں
دی جا سکتی ۔

سماج میں (ہر دور میں) مختلف ذہنی سطح کے
افراد ہوا کرتے ہیں ان کی مختلف ادبی و ثقافتی ضرورتیں
ہوا کرتی ہیں ۔ اگر ذمہ داری کے احساس سے اور
سیاسی اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ EXPLOITETION
سے بالاتر ہو کر اخبار نویسی کی جائے تو وہ بھی سماج کی خدمت
ہی ہو گی ۔ ہر فرد سے یہ امید رکھنا کہ بیدی، فراق
اقبال کو ہی پڑھے اور انہیں سمجھے شاید درست نہ ہوگا
اسی طرح کسی قوم کو محض اخباروں اور اخبار نویسوں
کے حوالے کر دینا ان پر ظلم کرنا ہو گا ۔ اخبار نویسوں نے
بھی سماج کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔ عوام کو

نئی زندگی کے لئے نہ صرف تیار کیا ہے ۔ بلکہ انہیں راستہ
بھی دکھایا ہے ۔ ادب کا راستہ دیرپا تو ہے لیکن
آہستہ رو بھی ہے ۔ ادب سے اثر قبول کرنے کے
لئے وقت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تربیت یافتہ ذہن
بھی چاہئے ۔ جبکہ اخبار یہ کام بہت کم وقت میں
کر لیتے ہیں ۔ ادب کبھی صرف آج یا ایک لمحہ کی بات نہیں
کرتا ۔ جبکہ کبھی کبھی ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے ۔
اور یہ کام اخبار نویس ہی کر سکتے ہیں ۔ عوام کو
دور دراز علاقوں میں ... سے بدلتے ہوئے سماجی
و اقتصادی حالات سے آگاہ کرنا اور انہیں ایک
آخری لڑائی کیلئے تیار کرنا اخبار نویس کی ذمہ داری
ہے ۔ دلی میں بیٹھی حکومت کیا فیصلے طے کر رہی ہے
اور ان کا اثر عوامی زندگی پر کیا ہوگا ۔ اس احساس
کو فوراً لوگوں تک پہنچانا اخبار کا کام ہے کوئی نظم
یا افسانہ یہ کام اخبار کی سی تیزی اور مقبولیت سے
بہتر طور پر نہیں کر سکتا آج ہم شدید بحرانی دور سے
گزر رہے ہیں ۔ واشنگٹن اور ماسکو میں ہونے
والے فیصلے ہماری زندگی پر بھی تیزی اثر انداز
ہو رہے ہیں ۔ ان سے آگاہی اور حفاظت کے
لئے ہر جگہ ہر آدمی کا خبردار رہنا لازمی ہے ۔ اور
یہ کام صرف اخبار کر سکتے ہیں ۔

میرے خیال میں اردو زبان کو آج دونوں
طرح کے لکھنے والوں کی شدید ضرورت ہے
کسی کو دوسرے پر فوقیت دینا غلط ہوگا ۔ بنیادی
بات ذمہ داری کا احساس ہے کہ ہمارے ادیب و
شاعر یا اخبار نویس عوام کے تئیں اپنی ذمہ داریوں

بقیہ بر صفحہ

محمد حسن

تنقیدی وحدت کی تلاش

ادبی تنقید کے مختلف دبستانوں کا حال کچھ ان اندھوں کا سا ہو گیا ہے۔ جو ہاتھی کو ٹٹول ٹٹول کر پہچاننے کی کوشش میں کبھی سونڈ کی لمبائی کو کبھی اس کے پیٹ کی گولائی کو کبھی اس کے پاؤں کی چوڑائی کو پورا ہاتھی سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ اپنی اپنی رسائی فکر اور اپنی اپنی نظر اور استطاعت کی بات ہے۔ البتہ ہر دبستان کا یہ اصرار کہ صرف اسی کا طریق کار صحیح ہے۔ اور دوسرے تمام طریق کار ناقص اور گمراہ کن ہیں۔ مجھے خاصہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

ادب ایک ست رنگی حقیقت ہے جس کے کسی ایک رنگ کو دوسرے سبھی رنگوں پر نہ ترجیح دی جا سکتی ہے نہ دوسروں کو نظر انداز کر کے ایک ہی رنگ کی رنگینی میں کھو رہنا بیجا ہو گا۔ کسی ایک جز یا کسی ایک طریق کار کو بھی خواہ وہ کتنا ہی اہم اور جامع کیوں نہ ہو۔ باقی تمام طریق ہائے کار کا نقیض بنا کر پیش کرنا یا ادبی تنقید میں کسی ایک طریق کار کی اجارہ داری پر اصرار نامناسب ہے۔ مختلف نظریئے اور طریق کار ادب کی تفہیم میں ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور ادبی تنقید ان سبھی نظریوں سے اور طریقوں سے فیض اٹھا کر ادب کی کلیت اور سالمیت کا عرفان حاصل کرتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس اجارہ داری اور ادعائیت کے مخالفت اور ادب کی کلی اور جامع تر ہشت پہلو تفہیم کی حمایت کی جائے (کوشش ہے) اور مختلف انداز نظر اور مختلف تنقیدی طریق کار کے تضادات کو دور کر کے ان کو ایک وسیع تر کل میں ڈھالا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادبی تنقید لازمی طور پر متن سے شروع ہوتی ہے۔ ادب پارے کا ہر لفظ اہم ہے اور ہر ادب پارے کے متن کے لفظ کی تہہ داریاں، ان الفاظ کے باہمی رشتے، ان الفاظ کے صوتیاتی اور معنیاتی عناصر اور معنوی رنگا رنگی اور ان سے بنتے ہوئے زاویئے ادبی تنقید کا پہلا موضوع ہیں۔ متن کے اس باطنی اور گہرے مطالعے پر جتنی توجہ صرف کی جائے کم ہے۔ اگر کوئی متن کی خود مختاری پر اصرار کرے تو وہ بھی کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے (مگر خود مختاری کو خود کفالتی سے تعبیر کرنا مناسب نہ ہو گا) ظاہر ہے متن کا یہ باطنی اور گہرا مطالعہ خاصہ وسیع موضوع ہے۔ اور

اس کے لاتعداد پہلو ہیں۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ متن کیا ہے؟ اور اس کی تفہیم کے اگر مختلف پہلو اور مختلف سطحیں ہیں تو کیا ان میں سے کوئی ایک یا ان سب کا کوئی اوسط ممکن ہے یا نہیں؟ اور یہ سب ہو تو ابھی یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ متن کے باطنی اور گہرے مطالعے پر زور دینے والا نقاد خود کو (اور دوسروں کو) اس طریق کار کے علاوہ دوسرے تمام تنقیدی طریق ہائے کار سے حاصل ہونے والی بصیرتوں اور انبساط سے محروم رکھنے پر بھی اصرار کرے تو ان کو رد کرے اور ان کی تضحیک پر اتر آئے۔

پہلے اس سوال کو لیجئے کہ خود متن کیا ہے؟ گولڈمان نے بجا طور پر متن کو وسیع تر حقیقت قرار دیا ہے جو مصنف کی سبھی تحریروں پر محیط ہے جو سماجیات کی اصطلاح میں ان کے سیاق و سباق Frame of Reference کی تشکیل کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر ادبی فن پارہ الفاظ سے عبارت ہوتا ہے۔ اور لازم نہیں ہے کہ فن کار نے اسے تحریر ہی کیا ہو۔ یا طباعت اشاعت (یا تحریر) کے لئے لکھا ہو۔ لاتعداد گیت ہیں جو گانے کے لئے لکھے گئے، بے شمار لوک کتھائیں اور داستانیں ہیں جو فی البدیہہ تصنیف ہوئیں گانے اور سنانے کے آداب کچھ اور ہوتے ہیں۔ اور تحریر کے کچھ اور، گاتے وقت ترنم، موسیقی، آواز زیر و بم، لہجہ، بلیغ خاموشیاں، لفظوں کی ادائیگی، سبھی الگ کیفیت رکھتی ہیں۔ اور یہ سب تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔ استعجاب اور استفہام تک کی علامتیں خاطر خواہ طور پر تحریر میں (اکثر نظم میں) واضح نہیں ہو پاتیں۔ (مثلاً غالب کے شعر)

کون ہوتا ہے حریف مرد مئے افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

کا دوسرا مصرعہ مکرر کے لفظ کے اشارے کے مطابق دو بار پڑھا جانا چاہئے۔ پہلے اس انداز سے کیسے ساقی دعوت دے رہا ہے کہ کوئی ہے جو حریف مرد مئے افگن عشق ہو دوسرے بار اس انداز سے کہ افسوس بھلا کون ہے جو حریف مرد مئے افگن عشق ہو) گفتگو کی یہ لطیف نزاکتیں ضابطہ تحریر میں نہیں آ سکتیں۔ اس اعتبار سے متن ادھورا ہے۔ کیونکہ تحریر الفاظ کی ادائیگی، صوت اور آواز کے لہجے اور اس کے لطیف ہیر پھیر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اور اس طرح متن گویا صحیح معنوں میں متن نہیں رہ جاتا یہ مسئلے کا صرف ایک پہلو ہے۔

اب گولڈمان والے خیال کو لیجئے ہر متن بلکہ ہر لفظ اپنا سیاق و سباق رکھتا ہے۔ اور سیاق و سباق کے بغیر متن کی تفہیم ادھوری ہے۔ اگر کوئی کسی گفتگو کا کوئی ٹکڑا بیچ سے اڑا لے تو اس کا مفہوم اور کیفیت دونوں غت ربود ہو جائیں گے۔ جیسے قرآن مجید سے کوئی لاتقربوا الصلوٰۃ (نماز کے پاس نہ جاؤ) کا حکم برآمد کرے اور اس کا اگلا حصہ حذف کر دے، (کہ یہ حکم صرف نشے کی حالت کے لئے ہے) اس طرح ہر ادبی فن پارے کا رشتہ مصنف کی دیگر تحریروں تک لازمی طور پر پھیلا ہوتا ہے۔ مثلاً اقبال کی کسی نظم میں خودی کا لفظ آئے تو اس کو سمجھنے کے لئے اقبال کی دیگر نظموں میں (اور پھر نظموں ہی میں کیوں دیگر تحریروں میں، جن میں غیر ادبی تحریریں بھی شامل ہوں گی) اس لفظ کے

ستعمال اور اس کی معنویت پر غور کرنا لازم آئے گا۔ گویا خود متن کے خاطر خواہ گہرے اور باطنی مطالعے سے انصاف کرنے
نے کی کوشش میں متن کی محدود چار دیواری سے فوراً ہی باہر آنا لازم ہوگا۔ یہ ان سب نقادوں کیلئے قابل غور ہے
جو یا تو سرے سے ادبی فن پارے کی حد بندیوں سے باہر نکلنا ہی جرم سمجھتے ہیں۔ یا اس کے صرف سماجی سیاق و سباق ہی
میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اور اس کے باطنی رشتوں اور متن کی ساختی لطافتوں پر ضروری حد تک توجہ نہیں کرتے۔ اس طرح
متن کی تعریف یہ ہوئی کہ کسی ایک ادب پارے کا متن اس وسیع تر متن کا جز ہوتا ہے کسی بھی فنکار کی سبھی تصانیف متن
کی تشکیل کرتی ہے۔

اس سے آگے قدم بڑھائیے تو تنقید کے مختلف دبستانوں کے باہمی اختلافات میں ایک حیرت انگیز یکسانیت نظر
آتی ہے۔ خواہ کوئی ادب کو شخصیت کا اظہار مانے یا اسے غیر شخصی عمل قرار دے، ہر دبستان اس پر ضرور متفق ہے کہ ادب
کا رشتہ وسیع تر حسیت سے ہے۔ جو بعض کے نزدیک فن کار کی شخصیت کے راستے سے ہو کر بعض کے نزدیک اس کے
باوجود اور بعض کے نزدیک اس پر منتقل ہو کر ادب میں راہ پاتی ہے اسے کبھی روح عصر قرار دیا گیا۔ بلکہ درد عالم
WALTEUSTUNM، کہا گیا۔ کبھی روایت، کبھی مانوس اجنبیت، کبھی روایت آفرینی، کبھی الہام کا عمل
جس طرح کسی ایک شاعر کے برتے ہوئے الفاظ اور علامتوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بار بار اس کی دوسری
نظموں اور تحریروں سے رجوع کیا جائے۔ اسی طرح ہر دور کے لسانی، فکری، اور حسیاتی محاورے کی طرف بھی بار بار رجوع
کرنا لازم ہے۔

اب اگر کوئی نقاد متن کے مضمرات کو سمجھنے میں ان وسائل سے بھی مدد لے تو متن پرستوں کے لئے اعتراض کی
کوئی گنجائش نہیں۔ تنقید کا کوئی دبستان ذرا آگے بڑھ کر ادب کو ادیب کی شخصیت کی مدد سے سمجھنا چاہے یا پھر اس
کے دور کے آئینے میں عصری حسیت کے سیاق و سباق میں دیکھنا چاہے تو وہ تنقیدی بصیرت میں نئی جہتوں کا اضافہ
ہی کرے گا۔ ان کوششوں سے دوسرے دبستانوں کے متصادم ہونے کا سوال نہیں اٹھتا۔

تنقید کے بعض دبستان اگر متن کے حوالے سے ادب پارے کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ تو ان کا تقاضا بجا ہے۔
اگر اعتراض ہے تو محض ایک ہی طریق کار کے اصرار پر ہے۔ دوسرے طریق ہائے کار تنقیدی بصیرت اور تفہیم میں اضافے
کا سبب ہو سکتے ہیں۔ اور ان سے خود کو محروم کرنا نہ ادب کے ساتھ انصاف ہے نہ تنقید کے ساتھ۔ کیونکہ ادب
بہر حال وسیع تر حسیت کا جز ضرور ہے۔ خواہ اس کی نوعیت دوسرے اجزا سے کتنی ہی اور کیسی ہی امتیازی کیوں نہ ہو
اور وہ تمام وسائل اور ذرائع جو اس وسیع تر حسیت کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں لازمی طور پر ادب کی تفہیم اور تنقید
میں بھی کسی نہ کسی زاویے سے معاون ہوتے ہیں۔ یہ زاویئے ادبی سماجیات اور تقابلی تنقید کے دائروں تک بھی
پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ان وسیلوں سے بھی حاصل ہوتے ہیں۔

اسی طرح مختلف تنقیدی دبستانوں کی جمالیاتی اور عمرانی وابستگیوں پر غور کیجئے تو ان میں بھی ظاہری

اختلافات کے پیچھے باطنی ہم آہنگی نظر آئے گی۔ بعض تنقیدی دبستاں ادب کو اخلاقی اصلاح، تہذیبی بہتری، تزکیۂ نفس، یا ترسیل اقدار کا ذریعہ جانتے ہیں۔ بعض دوسرے دبستاں ادب کو محض جمالیاتی کیف سے متعلق کرتے ہیں۔ بعض ادب کو محض ذات کی شناخت قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی ادبیت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو اعلیٰ ادب کے بہترین نمونوں میں ان سب تقاضوں کی تکمیل ملے گی۔ وہ ادب پارے بھی ہیں جو جمالیاتی کیف ہی کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور وہ بھی جنھوں نے بلاواسطہ انداز تخاطب اختیار کیا ہے۔ ترسیل اقدار کو اپنا مقصد بنایا ہے۔ اور وہ بھی جو ذات کی شناخت اور علامتی تجریدی انداز نظر اور اسلوب بیان سے عبارت ہیں۔ دوسرے افراد اور معاشرہ اگر ادب کے ذریعہ اپنی شناخت حاصل کرے یا جمالیاتی بالیدگی پائے تو کیا اسے سماجی افادیت ہی کی ایک شکل نہیں کہا جائے گا۔ براہ راست نہ سہی، بالواسطہ سہی جمالیاتی بالیدگی فرد اور معاشرے دونوں کی تکمیل کرتی ہے۔ اور ایک بہتر انسان اور بہتر معاشرے کی بنیاد بنتی ہے۔ اس طرح مختلف دبستان تنقید میں ایک فکری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اور ان کے ظاہری اختلافات کے پیچھے بنیادی وحدت موجود ہے۔ اور ان کی ہمہ گیری اور جامعیت سے ادب اور تنقید دونوں کو زیادہ وسعت نظر کے ساتھ مدد مل سکتی ہے۔

فارم ۴ بابت ملکیت وغیرہ

رول ۸ دیکھیں

مقام اشاعت	ـــــــــ	بیراگی گیا (بہار)
میعاد اشاعت	ـــــــــ	ماہنامہ
پرنٹر، پبلشر و مالک	ـــــــــ	کلام حیدری
قومیت	ـــــــــ	ہندوستانی
اڈیٹر	ـــــــــ	نوشابہ حق
قومیت	ـــــــــ	ہندوستانی
پتہ	ـــــــــ	بیراگی، گیا (بہار)

میں کلام حیدری مالک ماہنامہ آہنگ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست و صحیح ہیں ـــــ دستخط کلام حیدری

صفدر

تعریف تنقید

میں تنقید پر گفتگو کرتے ہوئے آپ کو شاپنگ سینٹر نہیں لے جاؤں گا۔ کہ وہاں آپ سرخ اور زرد دو رنگوں کے کپڑوں میں سے سرخ کا انتخاب کریں۔ کہ سرخ انقلاب کی علامت ہے اور زرد کو مسترد کر دیں کہ یہ پسپائی کی علامت ہے۔ اور اس طرح آپ کو اپنے ہی عمل سے تنقید کی اہمیت کا قائل کر دوں۔ میں یہاں براہ راست ادبی تنقید بلکہ شعری تنقید پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

بقول ایلیٹ تنقید سانس کی طرح ناگزیر ہے۔ رد و قبول اور خوب سے خوب تر کی جستجو تہذیب کے بدن میں سانس کی طرح رواں دواں ہے۔ بنی نوع انسان کا پورا امکان تسلسل حیات و تہذیب نقد و انتقاد کے اجالے میں چلتے ہوئے تلاش و یافت کے عمل میں مصروف ہے۔ جس طرح رد و قبول کا عمل زندگی کے عام معاملات میں نامعلوم طریقہ سے اپنے طور پر انجام پاتا ہے۔ اسی طرح شعر و ادب میں نامعلوم طور پر تنقید کی کونپل اُگی اور نامعلوم طور پر پرورش پاتی رہی۔ جب تنقید کا پورا برگ و بار لایا۔ "غیبت" کی موجودگی کے احساس نے اہل ادب کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور اس کا نام و پتہ پوچھا جانے لگا۔ شاعری کے مقابلے میں تنقید کی عمر زیادہ نہیں ہے یہ ممکن ہے کہ تنقید نے تخلیق کے ساتھ ہی جنم لیا ہو۔ لیکن تنقید کی تقدیر یہی ہے کہ تخلیق کی پیروی کرے۔ چنانچہ ہر زبان میں شاعری پہلے ترقی کرتی ہے۔ اور تنقید کے وجود کا احساس بعد میں ہوتا ہے۔ غالباً اس وجہ سے بھی تنقید کے ساتھ غیبت کا برتاؤ ہوتا رہا ہے۔ تنقید ایسی سخت جان ہے کہ ہر طرف وار سہتی ہے۔ اور زندہ ہے شاعروں نے ہی نہیں۔ نقادوں نے بھی اسے پھٹکارا ہے۔ مگر یہ برابر اپنا کام کئے جا رہی ہے۔ آج اس کی اہمیت کا اقرار ہونے لگا ہے۔ اس کے باوجود S. H. BEYLEL کی تنقید کے تعلق سے رقم طراز ہے۔

NO WONDER IT WAS SCORNED
AS A PARASITE UPON CREATIVE
LITERUTURE .... IT IS IN OUR ONE
TIME THAT CRITICISM HAS SHOWN

ITSELF TO BE IMPORTANT AND
ITS BEST DAYS ARE PROBEBLY
YET TO COME (1)

اردو ادب میں تنقید انگریزی لفظ (CRITICISM) کے بدل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لفظ تنقید عربی لفظ نقد اور انتقاد سے مشتق ہے۔ مگر عربی زبان میں لفظ تنقید مستعمل نہیں ہے۔ اسی لئے بعض اہل قلم تنقید شعر کے بجائے نقد الشعر (غالباً قدامہ بن جعفر کے اتباع میں) زیادہ بہتر خیال کرتے ہیں۔

اردو زبان میں تنقید ہنوز ابتدائی دور میں ہے۔ لیکن مغرب میں تنقید دنیا کے علم و ادب میں صدیاں گذار چکی ہے۔ بہتیرے علوم و فنون کی طرح فن تنقید کی بھی ابتدائی جھلکیاں اہل یونان کے یہاں دکھائی دیتی ہیں۔ ارسطو سے قبل مختلف شعرا کے یہاں شعر کی ماہیت اور شعر کی حسن و قبح سے متعلق اشارات ملتے ہیں۔ ارسطو کے یہاں آکر تنقید ایک باقاعدہ اور منضبط علم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ فن شعر پر ارسطو کی بوطیقا اہمیت اور افادیت کی صدیاں گذار چکی ہے۔ اور آج بھی اہل نظر کی آنکھوں کا سرمہ ہے۔

اہل یونان کی طرح اہل عرب میں بھی ابتداً تنقیدی شعور کا انحصار ذوق پر رہا ہے۔ اسواق عرب میں مجالس شعر منعقد ہوتی تھیں۔ جن میں شعرا کے کلام پر تنقیدی مباحثے بھی ہوا کرتے تھے۔ قریش کی "مجلس نادی" اور جوار کعبہ کی "مجلس دار الندوہ" نے بھی عربی تنقید کو بنیادیں فراہم کیں۔ اردو انتقادیات کی تاریخ میں تذکروں کو تاثراتی تنقید کا ابتدائیہ کہا جا سکتا ہے۔

لغت کے اعتبار سے نقد کے معنی کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کے ہیں۔ چونکہ ادبی تنقید میں شعر و ادب کے ضمن میں شعر کی ماہیت اور اس کے عیوب و محاسن کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس لئے ادب پاروں کی پرکھ کے اس فن کے لئے تنقید کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے۔ صدیاں گذرنے کے بعد بھی اور اس کی اہمیت کا اعتراف کئے جانے کے بعد بھی کہا جاتا ہے ITS BEST DAYS ARE PROBABLY YET TO COME تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ تنقید کو شعر و ادب کی دنیا میں ایک غیر ادبی سرگرمی کے طور پر بھی پیش کیا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا تنقید کی ایسی تعریف اخذ کرنے کی ضرورت ہے جس کی روشنی میں فن تنقید کو فن شعر

---

(1) S.H. BETHEL "ESSAYS ON LITERARY CRITICISM AND ENGLISH TRADITION" LONDON 1948 - P. 10

کے شانہ بہ شانہ کھڑا کیا جاسکے اور اس طرح کہ اجنبیت کا احساس زائل ہوجائے۔ تنقید کی صحیح ماہیت معلوم کرنے اور اس غلطی کے ارتکاب سے بچنے کے لئے کہ تنقید کو وہ کچھ سمجھ لیا جائے جو وہ بذاتہٖ نہیں ہے۔ ایک بہتر طریقہ یہ ہے کہ تنقید کیا ہے یہ سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ تنقید کیا نہیں ہے۔ اس ضمن میں آل احمد سرور رقم طراز ہیں :

> تنقید نہ وکالت ہے نہ عدالتی فیصلہ، یہ پرکھ ہے ...... نقاد مبصر ہوتا ہے۔ مبلغ یا مفتی نہیں ہوتا۔(۱)

شمس الرحمٰن فاروقی تحریر فرماتے ہیں :

> تنقید عمومی اور سرسری اظہار رائے نہیں ہے۔ غیر قطعی اور گول مول بات کرنا نقاد کے منصب کے منافی ہے۔

نورالحسن نقوی کی رائے ہے :

> ادب سائنس نہیں ہے۔ اور تنقید سائنسی طریقہ کار اختیار کرسکتی ہے۔ مگر ریاضی کا وہ عمل نہیں ہوسکتی۔ جس میں ہمیشہ دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں۔(۲)

جو حال ان شاعروں کا ہے جو شاعروں کی پیداوار ہیں۔ وہی حال ان ناقدین کا ہے جو امتحان کا پرچہ حل کرنے اور تنقید لکھنے کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ اردو تنقید میں جذبہ تبلیغ سے سرشار ناقدین نے خوب خوب ڈھول اڑائی ہے۔ فتویٰ بازی کا یہ حال ہے کہ مفتیان کرام نے بزعم خود بہتوں کو اقلیم سخن سے نکال باہر کیا۔ حالانکہ تاریخ کا فیصلہ ان فتووں کے خلاف رہا ہے۔ وکالتیں اور طرفداریاں احتساب کی زد پر آئیں۔ تو سخن فہمی کے جوہر سے عاری پائی گئی۔ غیر قطعی اور گول مول بات کہنے والے عجب قسم کے لوگوں نے جسے چاہا جنت الفردوس بخش دی۔ اور جسے چاہا اسفل السافلین میں پٹخ دیا۔ فلسفہ، تاریخ، نفسیات، اسلامیات میں جس کی دال نہ گلی وہ تنقید بگھارنے میں عافیت محسوس کرنے لگا۔ لہٰذا اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ تنقید وکالت، فتویٰ بازی، اور تبلیغ نہیں ہے۔ یہ عمومی اور سرسری اظہار رائے بھی نہیں ہے۔ تعمیم زدہ بیانات کی یہ کیفیت ہے کہ کسی فنکار کی شکل نظر نہیں آتی۔ چاروں طرف دھند پھیلی ہوئی ہے۔ یہی وہ عیوب ہیں جن کے سبب تنقید کو ادبی دنیا میں ہنوز "غیر" سمجھا جاتا ہے۔

اب آئیے یہ دیکھیں تنقید کیا ہے۔ ایک سیدھی اور سامنے کی بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ فن پاروں کی

---

(۱) آل احمد سرور، دیباچہ ادب و نظریہ، بحوالہ شب خون، (الہ آباد) شمارہ ۸۶، بابت ستمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۱۷
(۲) نورالحسن نقوی۔ آل احمد سرور کی تنقید، دو ماہی الفاظ علی گڑھ شمارہ بابت مارچ تا جون ۱۹۸۰ء ص ۷۸۔

کی تفہیم و تقدیر کا نام تنقید ہے۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

کسی فن پارے کے بارے میں رائے، کوئی نقطۂ نظر، کوئی وضاحت مختلف
فن پاروں سے اس کا مقابلہ اور ان کے باہمی فرق کا اظہار تنقید ہے (۱)

اس تعریف میں تنقید کے جو وظائف بتائے گئے ہیں۔ وہ سب صحیح ہیں کہ تنقید ان سب امور کا احاطہ کرتی ہے مگر اس عمومی تعریف میں پھر ان عیوب کے در آنے کی گنجائش ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے تعصبات اور معتقدات کی روشنی میں شاعر اور جسے چاہیں ناشاعر ثابت کر سکتے ہیں۔ نظریاتی تنقید میتھو آرنلڈ کو بیساکھی کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ آرنلڈ کے نزدیک شاعری زندگی کی تنقید ہے۔ اس کا نظریۂ تنقید بھی اسی نظریہ کی بازگشت ہے:

تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ خیالات کا نظام قائم کرتی ہے۔
فرسودہ بے معنی اور از کار رفتہ خیالات کو اکھاڑ پھینکتی ہے۔ اور ان کی جگہ
زندہ اور ترقی پسند خیالات کو مروج و عام کر کے اس طور پر سامنے لا کھڑا
کرتی ہے کہ ان کی شعلہ سامانی ان کی لپک مختلف ذہنوں کو ترغیب دلاتی
ہے تنقیدی عمل کے ذریعہ یہ خیالات معاشرے تک پہونچتے ہیں۔ اور چونکہ
صداقت کا احساس خود زندگی کا احساس ہے اس لئے نتیجہ کے طور پر عمل
اور ردعمل کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ خیالات کا ایک زندہ نظام
نشوونما پانے لگتا ہے۔ اور حرکت و نمو کے اس عمل کی کوکھ میں ادب تخلیقی
ادوار جنم لیتے ہیں۔ (۲)

ممکن ہے تنقید خیالات کا نظام قائم کرتی ہو۔ فرسودہ بے معنی، اور از کار رفتہ خیالات کو (ادب و شعر کے وسیلے سے) اکھاڑ پھینکتی ہو۔ اور ان کی جگہ ترقی پسند خیالات کو مروج عام کرنے کی سعی کرتی ہو۔ مگر اس نقطۂ نظر کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ نقادوں نے ادب کے وسیلے سے معاشرے اور اقدار کی شکست وریخت اور تعمیر و تنظیم کا مطالعہ تو نہیں کیا۔ شاعر کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح ذاتی معتقدات کو شاعر اور شاعری کے سر تھوپنے کا آسان نسخہ اردو ناقدین کے ہاتھ آگیا۔ مجھے یہ کہنا نہیں کہ ترقی پسند خیالات کو مروج و عام کرنا کوئی گناہ ہے۔ یا زندگی سے شعر و تنقید کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ زندگی سے فرار تو کسی مخبوط الحواس شخص کو حاصل ہوسکتا ہے۔ یا کسی تارک الدنیا فقیر کو۔ میں شاعر کو زندگی کے قریب سے دیکھنے والے اصحاب بصیرت میں فلسفی پر ترجیح دیتا ہوں۔ فن کا زندگی سے اور تنقید کا فن سے کیا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں ملٹن مرے نے مختصر الفاظ میں بڑے کام کی بات کہی ہے:

---

(۱) جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک، دہلی ۱۹۷۸ء ص ۳۔
(۲) میتھو آرنلڈ، تنقید کا منصب، ترجمہ جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک، مرتبہ جمیل جالبی، دہلی ۱۹۷۸ء ص ۳۶۲۔

جس طرح زندگی کا شعور احساس فن ہے اسی طرح فن کا شعور احساس تنقید ہے (۱)

بلاشبہ شاعری اور تنقید دونوں زندگی کے مختلف تجربات سے جو اس حواس کے ذریعہ حاصل ہوئے ہوں۔ یا مطالعہ کے ذریعہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن شعر و ادب کے مختلف علوم کے درمیان اپنی علیحدہ شناخت عزیز ہے۔ اس لئے تنقید کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے یہ پتہ لگائے کہ شاعری بحیثیت شاعری اپنے وجود کا اثبات مہیا کر رہی ہے یا نہیں۔ بقول ایلیٹ:

ادب کی عظمت کو محض ادبی اصولوں سے نہیں جانچا جا سکتا۔ لیکن ادب
کے عدم یا وجود کو صرف ادبی اصولوں سے جانچا جا سکتا ہے۔ (۲)

لہذا انتقاد کے لئے یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے اور جس کی تلاش شعر و ادب میں ضروری ہے۔ کہ وہ کیا چیز ہے کہ جس کے ذریعہ زندگی کے چھوٹے بڑے تجربات ایک عمومی بیان نہ ہو کر فن پارہ بن جاتے ہیں۔ چارلس مارگن لکھتے ہیں:

THIS STRIVING TO CEE AND TO INTE-
-RPRETE WORKS OF ART AS THEY
ARE INTHEMSELVES AND NOT IS THEIR
RELATIONSLIP TO SOME DOCTRINE,
RELIGION, POLILICAL OR ECDNOMIL ALIER
TO THEIR ACSYLOTIC PURPOSE .IS, AS I
UNDESTAND IT, THE KEY TO HONEST
CRITI CISM (3)

لہذا اولاً تنقید کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جمالیاتی شعور ہے۔ نظریہ ہرگز ادب کی کسوٹی نہیں بن سکتا کہ نظریہ مختلف لوگوں کے لئے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ مارگن آگے لکھتے ہیں:

IF I NOT BENIG THE CHUREL OF ROME

---

(۱) میتھیو آرنلڈ، بحوالہ خلیل الرحمٰن اعظمی، زاویۂ نگاہ، (گیا) ۱۹۶۶ء ص ۱۰

(۲) ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ بحوالہ نورالحسن نقوی، آل احمد سرور کی تنقید نگاری، مطبوعہ دو ماہی الفاظ، علی گڑھ، شمارہ بابت، مارچ تا جون ۱۹۸۳ء ص ۹۔

(3) MR. CHARLES MORGAN — QUOTED BY S.H. BETHCL., ESSAYS ON LITERARY CRITICISM AND EYLISH TRADITOON LANDON 1948. P.20

were to attack the novel or the
norm of a catho lic, because I did
not share its religior: out look, I
should be guilty of stupid irrelevance(1)

تنقید کی بنیاد یا تنقید کی روح کیا ہے۔ اے آئی، اے رچرڈس اس طرح بیان کرتا ہے۔

وہ کون سی شئی ہے جو کسی نظم کو پڑھنے کے تجربے کو قیمتی بناتی ہے۔؟ یہ تجربہ کسی اور تجربہ سے کیوں بہتر ہے۔ ایک تصویر کو دوسری پر کیوں ترجیح دی جائے؟ موسیقی کو ہم کن طریقوں سے سنیں کہ قیمتی ترین لمحات حاصل ہو سکیں؟ فن پاروں کے بارے میں ایک رائے دوسری رائے کے اتنی اچھی کیوں نہیں ہوتی؟ یہ ہیں وہ بنیادی سوالات جن کے جوابات تنقید کو دینے ہوتے ہیں۔ (۲)

شمس الرحمن فاروقی شدت سے یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ تنقید عمومی اور سرسری اظہار رائے نہیں ہے۔ وہ غیر قطعی اور گول مول بات کہنا نقاد کے منافی خیال کرتے ہیں ان کے نزدیک تنقید کی تعریف یہ ہے کہ:

اول تو یہ خارجی دنیا کے اہم ترین مظہر یعنی ادب کو بیان کرنے کے لئے ایسے الفاظ تلاش کرتی ہے جن کا استعمال درستی اور صوت بیان کے لئے ناگزیر ہو۔ یہ اس لئے کہ جو الفاظ ناگزیر ہوں گے۔ ان میں حقیقت کا شائبہ یقیناً ہوگا کیونکہ ہر وہ لفظ جسے پس پشت ڈالنا ممکن ہو یقیناً اس شئی سے قریبی تعلق نہ رکھتا ہوگا۔ جسے بیان کیا جارہا ہے۔ دوسرا کام تنقید یہ کرتی ہے کہ صحیح ترین بیان کی تلاش کے ذریعہ ایسے اصول دریافت کرتی ہے۔ کہ جن کی روشنی میں صحیح بیان تک پہونچنے میں مدد ملتی ہے۔ پہلا کام عملی تنقید، دوسرا کام نظریاتی تنقید کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ لیکن اکثر یہ دونوں کام ساتھ ساتھ ہوتے رہے ہیں۔ (۳)

شعری تنقید کی ایک اور تقریباً جامع دیکھتے چلیں۔ آر۔ پی۔ بلیک مر لکھتے ہیں:

---

(1) MR. CHARLES MORGON, QOUTED by S.H. BETHEL — ESSAY ON LITERARY CRITICISM AND ENGLISH TRADITION LONDON 1948. P 21

(۲) آئی۔ اے رچرڈس۔ بحوالہ شمس الرحمن فاروقی۔ رسالہ شب خون، شمارہ ۱۱۰، ص ۳۷۔

(۳) شمس الرحمن فاروقی، ایضاً، ص ۱۷۔

گیا۔

میں تنقید کو ادب میں شوقیہ دلچسپی رکھنے والے کسی شخص کی منظم اور منضبط گفتگو سمجھتا ہوں۔ جب اس گفتگو میں شوق اور علم کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ تو یہ ایک خود کفیل فن بن جاتی ہے۔ لیکن اسے یک و تنہا دوسروں سے لاتعلق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنی ہی زندگی میں دوسرے فنون پر اپنے مسلسل انحصار کی شاہد ہوتی ہے۔ یہ خارج کے سمت سے تحسین و تعین کی اصطلاحیں اور نظریں پڑھنے والے کے سامنے لاکر رکھتی ہے۔ تاکہ اسے اپنے داخلی شناسا کا ثبوت مل سکے .... شاعری زندگی ہے، ہیئت اور معنی کے فاصلے کے ساتھ۔ ایسی زندگی نہیں جیسے جیا گیا ہو۔ بلکہ ایسی زندگی جسے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہو۔ پہچان لیا گیا ہو، نام دے دیا گیا ہو۔ اس نئے شاعری کی تنقید لامحالہ بیک وقت ان طریقوں شرائط اور اصطلاحوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ جس کے ذریعہ اصل زندگی اور شعر میں پائی جانے والی زندگی کے درمیان) یہ فاصلہ خلق کیا گیا تھا۔ اور چالو مبہم فقرے کی زبان میں اس رشتے کا بھی جو ہئیت اور موضوع میں ہوتا ہے (۱)

غرض شعری تنقید شعر کا شناخت نامہ ہے۔ یہ شعری جمالیات کو قریب کرتی ہے۔ اس کی روشنی میں دیگر علوم سے اکتساب فیض کرتے ہوئے فن پاروں کے عیوب و محاسن سے بحث کرتی ہے۔ ان کی تفسیر اور تقدیر کا بھار اٹھاتی ہے۔ ایسے الفاظ کا استعمال کرتی ہے۔ جو ناگزیر ہوں تاکہ تعمیم کی بھول بھلیاں میں بھٹکنے کے امکانات ختم ہو جائیں اور حقیقت اور سچائی تک رسائی آسان اور بڑی حد تک یقینی ہو جائے۔ یہ انفرادی تعصبات و معتقدات کو کی کال کوٹھری نہیں ہے۔ یہ تبلیغی مرکز یا دارالافتاء نہیں ہے۔ تنقید کے ایوان میں عمومی اور سرسری اظہار رائے اور غیر قطعی گول مٹول باتیں بے وقعت ہیں۔ اور ایسی ہی گفتگو کرنے والوں سے ان کا نام و پتہ پوچھا جاتا ہے۔ جب تک تنقید کو ان عیوب سے چھٹکارا نہیں ملتا ہر زبان میں ہر زمانے میں یہی کہا جاتا رہے گا۔

yes best days are probbly yet to come

نیا گھر

ساجد لطیف ارمان

رات بھر نیند اس سے آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ بستر پر کتاب لے کر لیٹ گیا تھا۔ کتاب پڑھتے پڑھتے حروف دھندلے لگنے لگے۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تو وہ ہاتھ بڑھا کر سرہانے والے اسٹول پر رکھے لیمپ کا بٹن دبا دیتا۔ زیرو بلب کی خواب آور نیلی نیلی روشنی میں نیند فوراً آجاتی تھی۔ لیکن رات میں ایسا نہ ہوا۔ تا گیارہ بجے تک تو نیند ہی نہ آئی وہ کتابیں، رسالے نکال نکال پڑھنے لگتا۔ آنکھیں دکھنے لگیں، سر بھاری ہو گیا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ پڑھنے میں بھی لطف نہیں آرہا تھا۔ بس پڑھتا جا رہا تھا۔ ایک شدت تھی بے مزہ آنکھیں مندنے لگیں۔ وہ لیمپ بند کرنے کا سوچتا کہ نیند اچٹ جاتی۔ نیند آئی بھی تو دو گھنٹے بعد، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کوئی ڈراونا سا خواب دیکھا تھا جس کی تفصیل اسے یاد نہیں آرہی تھی عجیب۔ گڈمڈ سا خواب تھا بس اتنا یاد آرہا تھا کہ خواب ڈراونا تھا۔ اور اسے نیند سے جگا گیا تھا۔ کھڑکی کھول کر وہ سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اکا دکا آدمی آجا رہے تھے وقفے وقفے سے تین تین چار چار کی ٹولیاں آہستہ آہستہ باتیں کرتی گذر جاتیں۔ شاید ... کہ آخری شو سے لوٹ رہے تھے۔ وہ یوں ہی دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ سڑک ویران ہو گئی تھی۔ رات کی تاریکی میں سڑک کے کنارے والے گھنے

گھنے درخت پراسرار لگ رہے تھے۔ کھڑکی بند کر کے وہ پھر پلنگ پر آکر لیٹ گیا۔ اور چھت کو گھورنے لگا۔ چھت بوسیدہ تھی، مکڑی کے جالے جگہ جگہ تنے ہوئے تھے۔ کھڑکی بند کر کے وہ پھر پلنگ پر آکر لیٹ گیا۔ سوچا کہ صبح ان جالوں کو صاف کر دے گا۔ دیواروں پر بھی دھول کی تہیں چڑھ گئی تھیں۔ کئی دنوں سے کمرے کی صفائی نہیں ہوئی تھی یہ سب کام کرنے کا اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ چھٹی کا دن اسی مصروفیت میں گزر جائے گا۔ تین سال اس کمرے میں گزر گئے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہو۔ بیوی بچوں کا خیال آیا۔ پندرہ دن سے ان کا خط نہیں آیا۔ خیر پندرہ دن سے ... تب تو خط نہیں آیا۔ وہ اپنے معمول کے مطابق ہفتے میں ایک خط لکھتا۔ لڑکے کو ہدایتیں، لڑکی کو نصیحتیں، اور بیوی کو بچوں پر کڑی نظر رکھنے کی تاکید۔ اور روپیہ احتیاط سے خرچ کرنے کا مشورہ، وہ خود بھی ہاتھ روک کر خرچ کرتا تھا۔ مہینے میں ایک بار گھر ... آتا تھا۔ بچوں سے پچھلے مہینے کے ... کے لئے ہدایتیں دیتا۔ کفایت ... حاصل تھی اس نے اپنی زندگی ... اصولوں کے مطابق ڈھال لی تھی۔ ایک مقررہ پروگرام کے تحت دن

گئندہ رہا تھا۔

گزشتہ چار سال سے وہ نیا گھر بنانے کی کوشش میں سرگرداں تھا۔ آبائی مکان بہت بوسیدہ ہوگیا تھا۔ دیواریں گر رہی تھیں۔ چھتیں بیٹھ رہی تھیں۔ اور ہر سال بارش آنے سے پہلے مرمت پر کافی روپیہ لگ جاتا تھا۔ پھر بھی بارش میں کچھ نہ کچھ ڈھ ہی جاتا تھا۔ بیوی الگ ناراض ہوا کرتی تھی۔ طعنے دیا کرتی تھی۔ وہ مسکرا کر بیوی کی جلی کٹی باتیں سن لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا نیا گھر بنانا آسان نہیں۔ اب وہ اندازے سے مطابق روپیہ حاصل کر چکا تھا۔ اور پرانے گھر کی جگہ نیا گھر بنانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

پراویڈنٹ فنڈ، لائف انشورنس کی پالیسی، بینک میں میں جمع شدہ رقم، اور بینک کا قرض کل ملا کر چالیس ہزار روپیہ اس کے پاس تھا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر والا گھر بن سکتا تھا۔ اس کے خوابوں میں بسا گھر کوئی عالیشان بنگلہ نہیں تھا۔ بلکہ چار کمرے، ایک دالان، ایک آنگن، کہ چھوٹا سا باغیچہ لگایا جا سکے۔ اور اتنی جگہ ہو کہ گرمیوں کی راتوں میں چار پانچ پلنگ ڈالے جا سکیں۔ اس کا اپنا ایک سادہ سا کمرہ ہو، دیواروں میں کتابوں کی شیلف ہو، ایک صوفہ سیٹ ہو، اور لمبا چوڑا دیوان ہو، سفید چادر اور گاؤ تکیوں سے آراستہ۔ اور اس کے پلان کے مطابق نیا گھر پینتیس ۳۵ ہزار میں بن سکتا ہے۔ جگہ تو تھی ہی۔ پرانے مکان کا ملبہ، لکڑی اور دروازے کھڑکیاں بھی کام میں لائی جا سکتی تھیں۔ لیکن روز بروز بڑھتی ہوئی گرانی اس کی ہمت پست کئے دے رہی تھی۔ اور وہ شدت سے بچت کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اندازے سے پانچ سات ہزار روپیہ زیادہ تو ہونا ہی چاہئے۔ شادی اور گھر بنانے میں دس قسم کے خرچ نکل آتے ہیں جن کا گمان بھی نہیں کیا جاتا۔

اس نے روزمرہ کا ایک پروگرام بنا لیا تھا۔ اس پر عمل کیا کرتا۔ تین سال پہلے وہ اس شہر کے آفس میں آیا تھا ترقی پر تبادلہ ہوا تھا۔ لڑکا وطن میں انجینئرنگ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ لڑکی نویں کلاس میں تھی۔ بیوی اکثر بیمار رہا کرتی تھی۔ اس لئے انہیں وطن میں ہی رہنے دیا تھا۔ یہاں پچاس روپیہ ماہانہ کرایہ پر کمرہ مل گیا تھا۔ صبح اٹھ کر نماز پڑھتا چائے بناتا اور دو سلائس کے ساتھ چائے پی کر سیر کو نکل جاتا۔ سیر سے لوٹ کر بتی والے اسٹو پر آملیٹ بنا لیتا۔ اور پانچ سات سلائس کے ساتھ آملیٹ کھا کر آفس کے لئے نکل پڑتا۔ بیس پچیس منٹ پیدل چل کر آفس پہونچتا اور اپنے کام میں جٹ جاتا۔ دوپہر میں ایک ڈوسہ کھا کر چائے پی لیتا۔

آفس سے واپسی پر ہوٹل میں کھانا کھا لیتا۔ اور میونسپل لائبریری میں اخبار دیکھتا۔ اور کوئی کتاب لے کر گھر آجاتا اور ساڑھے نو بجے تک کتاب پڑھتا۔ پھر سو جاتا۔ چھٹی کے دن آفس کے کسی دوست کے یہاں چلا جاتا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھا لیتا۔ اس دن رات کا کھانا ناغہ کر دیتا۔ بس ایک پیالی دودھ پی کر پڑا رہتا تھا۔ ایک بندھی ٹکی ڈگر پر زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔ بیوی اور بچے بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان کی زندگیاں بھی اس ڈگر پر گھسیٹ رہی تھیں۔ سب کا ایک ہی نشانہ تھا نیا گھر بن جائے۔ بے بی کی شادی ہو جائے، گھر بنانے کا ذمہ اس نے لیا تھا۔ اور بے بی کی شادی کا ذمہ لڑکے نے۔ جب بھی وہ وطن جاتا بیوی سے مستقبل کے بارے میں باتیں

پہنچتے۔ وہ ان آنے والے خوشگوار دنوں کے تصور سے نہال ہو جاتے۔

اب اس کی نیند اچٹ گئی تھی۔ تو اس نے حساب والی ڈائری اٹھالی، اور جمع شدہ رقم اور گھر پہ ہونے والے خرچ کا حساب لگانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں جماہیاں آنے لگیں۔ اور پپوٹے نیند کے بوجھ سے جھکنے لگے۔ اور بستر پہ لیٹتے ہی وہ سو گیا۔

وہ طے کر چکا تھا کہ اپریل اور مئی ان دو مہینوں کی چھٹی لے کر گھر کی تعمیر کا کام مکمل کرلے گا۔ ورنہ اس بارش میں پرانے مکان پہ مزید روپیہ لگانا پڑے گا۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اندازے کے مطابق رقم میں نیا گھر بن جائے تو پانچ سات ہزار روپیہ لگا کر پرانے مکان کے تین کمروں کو درست کرائے گا۔ اور انہیں کرایہ پر اٹھا دے گا کہ قرض کی ادائیگی میں سہولت ہو جائے۔

مارچ کے آخری ہفتے میں اس نے دو مہینے کی رخصت منظور کروائی اور ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ لے کر گھر آ گیا۔ کاریگروں سے وہ پہلے ہی وعدے لے چکا تھا، اینٹ، ریت اور سریا دینے والوں سے بھی معاہدہ ہو چکا تھا۔ منصوبے کے مطابق نئے گھر کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ دن تمام وہ کام کی نگرانی کیا کرتا۔ جس چیز کی ضرورت پڑتی دوڑ کر لے آتا۔ لڑکا بھی فارغ وقت میں ساتھ دیا کرتا۔ شام کو تھک کر گھر آتا۔ کھانا کھا کے دن بھر کے خرچ کا حساب کاپی میں لکھتا۔ اور پڑ کر سو رہتا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ نے اس کا رنگ سنولا دیا تھا۔ توند بھی چھٹ گئی تھی۔ اور جوں جوں مکان کی دیواریں اونچی ہوتی گئیں۔ اس کا جوش اور ولولہ بھی بڑھتا گیا یوں لگ رہا تھا جیسے پھر سے جوانی آ رہی ہے۔ بیوی اور بچے بھی خوش تھے۔ سب ہی کسی نہ کسی طور پر نئے گھر کی تعمیر میں حصہ لے رہے تھے۔ رات میں کھانے کے لیے دسترخوان پہ بیٹھتے تو چہروں پہ تھکن ہوتی۔ لیکن دل میں ترنگ ہوتی۔ بات بات پہ قہقہے لگتے۔ چوٹیں چلتیں، ڈیڑھ مہینے میں ہی نیا گھر بن گیا۔ دیواروں پہ پلاستر اور دروازے کھڑکیوں پہ رنگ کرنا باقی تھا۔ پرانے والے مکان کے تین کمرے درست کروا کے ایک اچھا بلاک بنوا دیا گیا تھا۔ سب کام اس کے پلان کے مطابق ہوا تھا۔ زیادہ ضرور صرف ہو گئے تھے۔ لیکن وہ پریشان نہیں تھا۔ باپ بیٹے نے دروازے کھڑکیاں رنگ دیں۔ لڑکی بھی ہاتھ بٹاتی رہی۔ تین دن میں سامان بھی نئے گھر میں منتقل کر دیا گیا۔ پھر سب نے بیٹھ کر رشتہ داروں اور ملنے والوں کی فہرست بنائی۔ دو سو آدمیوں کے کھانے پہ ہونے والے خرچ کا حساب لگایا۔ اور گھر بھروائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آخر وہ دن بھی آ ہی گیا۔ صبح سے ہی گھر کی صفائی ہونے لگی۔ لڑکے کے دوستوں نے رنگین کاغذ کے پھریرے اور پھول کتر کتر لگائے۔ دیگوں میں بریانی دم دی جانے لگی۔ قورمہ پکنے لگا۔ تنوری نان لگنے لگے۔ شام کے آتے آتے گلی کھانوں کی خوشبو سے مہک اٹھی۔ بڑا دالان عود اور اگربتی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ قرآن خوانی ہوئی، اور مغرب کے بعد روشنی سے جگمگ کرتے دالان میں مردوں نے، اور کمروں میں عورتوں نے کھانا کھایا۔ خوشبودار ڈکاریں لیتے ہوئے مہمانوں نے گھوم پھر کر گھر کا معائنہ کیا۔ اور نئے گھر کی مبارکباد دی۔ سب ہی خوش تھے لیکن وہ سب زیادہ خوش تھا اس کے چہرے پہ بڑی تازگی تھی۔ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ مہمانوں سے فارغ ہو کر وہ سب دالان کے اجلے فرش پر لیٹے بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ

اپنے کمرے میں آ گیا۔ جیسا اس نے خوابوں میں دیکھا تھا ویسا ہی
کمرہ تھا۔ تخت پر موٹا سا گدا، سفید بے داغ چادر، سفید
سفید تکیے، دیواروں میں بنے شیلف کے شیشوں سے جھانکتی
ہوئی کتابیں، سرہانے اسٹول پر رکھا ٹیبل لیمپ، تپائی
پر تازہ اخبار، پاندان اور تخت کے نیچے رکھا جگمگ
کرتا اگالدان، ایک کونے میں میز پر پانی کا جگ۔ اور
لوٹا، سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اس نے بار بار ان چیزوں کو
دیکھا۔ اور اطمینان کا سانس لیا۔ سب کچھ مکمل تھا۔ اس نے
خدا کا شکر ادا کیا۔ آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ قرآنی آیتیں
پڑھیں۔ اور لیٹ گیا۔ بیوی آ کر اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔
اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھوں
کے آگے ازدواجی زندگی کے بیس سال کے مختلف واقعات
خوشی کے، غم کے، محبت کے، رنجش کے ناچنے لگے۔ اس
عورت نے میرے ساتھ کتنے دکھ اٹھائے۔ لیکن ہمت نہیں
ہاری۔ بیمار رہی لیکن مسکراتی رہی، کبھی کچھ چڑ کر کہا بھی
تو ہنس کر ٹال گئی۔ اب میں نے اس کی آرزو پوری کر دی۔
وہ نیا گھر چاہتی تھی وہ اس کے حوالے کر دیا۔ اب میں اس
سے شرمندہ نہیں ہوں۔ اب کوئی فکر نہیں۔ دل پر کوئی بوجھ
نہیں۔ بس ایسے ہی خدا نے چاہا تو بے بی کی شادی بھی ہو جائے گی
پانچ سال بعد، بابو دو سال بعد انجینیر بن جائے گا۔ پھر میں
بھی پنشن لے لوں گا۔ بس اطمینان سے اللہ اللہ کرتا رہوں گا
اور انشاء اللہ ہم حج بھی کر آئیں گے۔ اس نے محبت سے
بیوی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ بیوی بھی اس پر جھک گئی۔
دونوں کی آنکھوں میں محبت کے جگنو چمک رہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد بیوی اٹھ کر چلی گئی۔ وہ بھی لیمپ بجھا
کر سو گیا۔ دو بجے کسی نے اسے جیسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا سینے
میں درد ہو رہا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اور سانس
لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ لیمپ کا بٹن دبایا اور
آہستہ آہستہ میز تک گیا۔ پانی کا مگ اٹھایا تو ہاتھ کانپنے
لگا۔ سینے کے درد میں شدت آ گئی۔ آنکھوں کے آگے
اندھیرا چھانے لگا۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ اور
بدن سے پسینہ چھوٹ بہا۔ بمشکل کٹورے میں پانی انڈیلا
چار گھونٹ پیا۔ سر چکرانے لگا۔ وہ میز کا سہارا لے کر
کھڑا ہو گیا۔ لیکن اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اور
دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ پانی کا جگ بھی لڑھک کے
گرا۔ رات کی خاموشی میں دھماکہ سا ہوا۔ بازو والے
کمرے میں سوئی بیوی اور لڑکی دوڑ کر آ گئے۔ وہ بے
سدھ پڑا تھا۔ بیوی نے لڑکے کو جگایا وہ آنکھیں ملتا
حیران پریشان کھڑا باپ کو دیکھے جا رہا تھا۔ بیوی
بھی کراہ رہی تھی۔ لڑکی ہچکیاں لے کر رو رہی تھی
چند لمحوں تک لڑکا ہکا بکا کھڑا یہ سب دیکھتا رہا پھر
وہ باہر کی طرف لپکا۔ اور ڈاکٹر کو لے آیا۔ ڈاکٹر نے
نبض دیکھی۔ سینہ ٹھونک ٹھونک کر دیکھا۔ منہ
پر منہ رکھ کر پھونکیں ماریں۔ اور خاموش کھڑا ہو گیا
بیوی نے ایک وحشت ناک چیخ ماری اور لڑکی کو لپٹا
لیا۔ لڑکا بھی ماں سے لپٹ کر رونے لگا۔ ڈاکٹر نے
بکس اٹھایا اور باہر چلا گیا۔

دوسرے دن وہ منوں مٹی تلے اپنے نئے گھر میں
اطمینان سے سو رہا تھا۔

اسرار گاندھی

ہاروت ماروت

وہ شخص جو کنویں کی جگت سے اپنی پیٹھ ٹکائے بیٹھا
ئے تھا۔ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا نظر آرہا تھا۔
اس کے بال بے ترتیب تھے۔ اور اس کے جسم سے نکلنے والے
پسینے اور مٹی نے مل کر اس کے سارے جسم پر ایک لیپ
سا چڑھا دیا تھا۔ اس لیپ سے بو پھوٹ پڑ رہی تھی۔ اسے
دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے کسی ہڈیوں کے پنجر پر کھینچ تان کر
کھال چڑھا دی ہو۔ اس پنجر میں چپکی ہوئی اس
کی دو آنکھیں ہی اس کے زندہ ہونے کا ثبوت پیش
کر رہی تھیں۔ بغیر جوتوں کے پیر جگہ جگہ سے لہولہان ہو گئے
تھے۔ اور اس کی عریاں انگلیاں تلوؤں میں چھپے ہوئے
کانٹوں کو خاموشی سے تلاش کرنے میں مصروف تھیں۔

وہ تھوڑی دیر تک یوں ہی کانٹے تلاش کرتا رہا
پھر اپنے چیتھڑے چیتھڑے دامن سے پیروں کو رستے
ہوئے خون کو پونچھ کر صاف کرنے لگا۔ خون کی پہلی پرت
ابھی پوری طرح سے صاف بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسری تازہ
پرت ابھر آئی۔ اچانک اس نے اپنے ہونٹ اپنے خون
آلودہ تلوؤں پر رکھ دیئے۔ اور پھر جب اپنا سر اٹھایا تو
اس کے ادھ مرے جسم میں زندگی ایک بار پھر داخل ہو چکی
تھی۔

اس نے اپنی بجھی بجھی سی آنکھوں کو حرکت دی۔
اور آنکھیں چہار سمت کا جائزہ لینے لگیں۔ ہر طرف تپتے
میدانوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اس کی آنکھیں دیر
تک ان میدانوں میں بھٹکتی رہیں۔ اور پھر کچھ نہ پاکر
واپس لوٹ آئیں۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ جیسے بہت دیر سے
اس کی ناک میں دھواں گھس رہا ہو۔

اس نے سوچا یہ دھواں کیسا ہے۔ اور کہاں
سے آرہا ہے۔ پھر تھوڑی دیر تک لمبی لمبی سانسیں لینے
کے بعد اسے پوری طرح یقین ہو گیا کہ فضا میں ایک غلیظ
سا دھواں پھیلا ہوا ہے۔ اور وہ دھواں کہیں اور
نہیں بلکہ اس کنویں کے اندر یلغار کر رہا ہے۔ کہ جس
کی جگت سے وہ پیٹھ ٹکائے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔

یک بیک وہ کھڑا ہو گیا اور کنویں کی اونچی جگت
پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر کنویں کے اندر جھانکنے لگا۔ کنویں
کے اندر نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ
نیم تاریکی بھی ختم ہو گئی۔

اچانک اس کی آنکھیں بے پناہ خوف سے پھیل
گئیں۔ اور اس کا پورا وجود کانپ سا گیا۔
کنوئیں کے اندر دو آدمی الٹے لٹکے ہوئے تھے۔
اسے اپنی طرف جھانکتے دیکھ کر کنوئیں میں لٹکے
ہوئے آدمیوں میں سے ایک بولا۔
تم کون ہو بھائی!
اس کے سارے جسم پسینہ سے بہہ نکلا۔ اس نے ڈر
کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔
تم کون ہو بھائی؟ وہی بھاری بھاری آواز پھر
ابھری۔
اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کنوئیں
میں لٹکے ہوئے آدمیوں کی آنکھوں میں وہی سوال تھا۔
ایک مسافر۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب
دیا۔
یہاں کیسے پہونچے؟ آواز پھر ابھری۔
میں ان ریتیلے میدانوں میں نہ جانے کب سے بھٹک
رہا ہوں۔ اور راستہ ہے کہ ملتا ہی نہیں۔ اب بھٹکتے ہوئے
اس کنوئیں تک آنکلا ہوں۔
تنہا ہو ——— ؟
نہیں! میرے پیچھے بے پناہ لوگوں کا ایک ہجوم بھی
ہے۔
وہ سب کہاں ہیں؟
وہ سب بھی میری طرح ریتیلے میدانوں کی اس
بھول بھلیاں میں کہیں بھٹک رہے ہیں ہوں گے۔
چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی پھر دوسری بار
اس نے خاموشی کا گلا گھونٹ دیا۔

کنوئیں کے اندر یلغار کرنے والا یہ دھواں کیا تم
لوگوں کی ناک میں نہیں گھس رہا ہے؟ کیا تم دھوئیں
کی اس بو کو نہیں محسوس کر رہے ہو۔؟
نہیں اب تو کسی طرح کی بھی بو نہیں محسوس ہوتی
ہاں پہلے کبھی ہوا کرتی تھی۔
کیا تمہارے نتھنوں میں جلن بھی نہیں ہو رہی ہے
نہیں۔ پہلے کبھی ہوا کرتی تھی۔ اب ہمارے نتھنے
اس کے عادی ہو چکے ہیں۔
لیکن مجھے اس دھوئیں سے بڑی تکلیف ہو رہی
ہے۔
ہاں ضرور ہو رہی ہو گی۔ کیونکہ تمہارے نتھنے
اس کے عادی نہیں ہیں۔ ہماری ناک میں تو اس دھوئیں
کی موٹی موٹی پپڑیاں جم چکی ہیں۔
پپڑیاں ——— ؟
ہاں پپڑیاں۔ جن کی پرتوں میں ہزاروں سال
لمبی انسانی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ اور ان پرتوں میں
اب بھی ایسی کئی پرتیں موجود ہیں۔ جو انسانی خون سے
لت پت ہیں۔
اوہ، مگر یہ دھواں کیسا ہے۔؟
الٹے لٹکے ہوئے آدمیوں نے سرد آہیں کھینچیں۔
اور ان میں سے ایک بولا۔
اس دھوئیں کی کہانی بھی ہزاروں برس لمبی ہے
یہ کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب انسا
نوں کی دھوپیں غائب ہو چکی تھیں۔ اور اس نے
اپنی بے لباسی چھوڑ دی تھی۔
کہانی۔ کیسی کہانی؟ ——— اس نے یوں پوچھا جیسے

انی سننا چاہتا ہو۔
سنو گے ___ ؟
ہاں ضرور سنوں گا۔ کیونکہ اب میں بہت تھک
ا ہوں۔ شاید میرا دل تمہاری کہانی سے بہل جائے ۔
دل اب صرف کہانیوں سے ہی بہلنے کا عادی ہو چکا ہے
اس کی بات سن کر چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا
ں۔ الٹے لٹکے ہوئے دونوں آدمی کسی سوچ میں ڈوب
ئے۔ جیسے کہانی کا پہلا سرا پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں
وڑی دیر بعد ان میں سے ایک بولا۔
کیا تم نے ہاروت اور ماروت کا نام سنا ہے ؟
ہاں شاید بچپن میں کبھی سنا تھا۔ کہ اس نام کے دو
رشتے ہیں۔
ان سے متعلق اور بھی کچھ سنا تھا ؟
ہاں سنا تو ضرور تھا۔ مگر اب کچھ یاد نہیں رہا کہ
ساری یادیں اب دھواں بن کر اب اڑ چکی ہیں۔ صرف
تنا معلوم ہے کہ میں بھٹک رہا ہوں۔ اور میرے اندر اور
میرے باہر کھنڈروں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا
ہے۔
ہم تمہاری بات نہیں سمجھ سکے۔ دونوں لٹکے ہوئے
آدمی ایک ساتھ بول اٹھے۔
تم سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ہاں تم مجھے اپنی کہانی سناؤ۔
ہماری کہانی، اچھا ہماری کہانی سننے سے پہلے
تم یہ جان لو کہ میں ہاروت ہوں۔ اور یہ ماروت ہے
ان میں سے ایک بولا۔
ہاروت اور ماروت وہی دونوں فرشتے۔
ہاں وہی فرشتے۔ ان دونوں کے چہرے افسردہ
ہو گئے۔ اور آنکھیں کہیں کھو سی گئیں۔ وہ یوں ڈوب
گئے۔ جیسے بے پناہ بکھری ہوئی یادوں کو ایک لڑی میں
پرونے کی کوشش کر رہے ہوں۔
کیا مجھے کہانی سننے کے لئے دیر تک انتظار کرنا
ہوگا۔ وہ پوچھ بیٹھا۔
کیوں اب تمہارے پاس کیا وقت کی بھی کمی
ہو گئی ہے۔ ؟
ہاں اب انسانوں کے پاس وقت کی بے حد کمی ہے
انہیں یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ان کے بغل میں کون رہتا ہے
وہ کب ہنستا ہے۔ اور کب روتا ہے۔ اور پھر اب اس
کی ضرورت بھی کیا رہ گئی ہے۔
ہاروت اور ماروت سمندر کے غوطے کھانے لگے
وہ پھر بولا ___
میں تمہاری کہانی سننے کو بیتاب ہوں۔
کہانی کے نام پر دونوں نے ایک جھرجھری سی لی۔
اور ہاروت کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
بڑی عجیب سی کہانی ہے ہم دونوں کی۔ میں وہ
شام کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب ہم دونوں تمہاری ذہنی
بلندیوں سے بہت اوپر عرش پر بیٹھے ہوئے تمہاری باتیں
کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ باتوں کے بیچ ہاروت نے
کہا تھا کہ یہ انسان کتنا بے وقوف ہے نیکی اور بدی کے
بارے میں جاننے کے باوجود نیکی سے دور اور بدی
سے قریب ہے۔ اس کے جواب میں میں نے کہا تھا کہ
یقیناً ابن آدم عقل سے خالی ہے۔ اور اگر میں اس کی
جگہ ہوتا تو ہمیشہ نیکی سے قریب اور بدی سے دور
ہوتا۔ پھر ہماری یہ بات اس حد تک پہونچ گئی۔ جو
سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو سب سے عظیم ہے۔ جو
اس کائنات پر حکومت کرتا ہے۔ اور قادر مطلق ہے

اور پھر..........

ہاروت کچھ کہتے کہتے اچانک نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گیا۔ اور ماروت اس کی بات کو آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ قادرِ مطلق ہمارا امتحان لینے کے لئے صرف ایک رات کے واسطے ہمیں زمین پہ بھیج رہا ہے۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے عرش پہ واپس آنا تھا۔ جب ہم زمین پہ پہونچے تو ہماری شکلیں انسانوں جیسی تھیں

وہ رات روشنی اور تاریکی کا ایک طویل سلسلہ تھی۔ ہم تاریکی سے بچ بچ کر روشنی میں چل رہے تھے۔ کہ ایک جگہ تاریکی میں پھنس ہی گئے۔ وہ تاریکی ایک خوبصورت عورت کی کوکھ سے چھوٹ رہی تھی۔ اس عورت کا ریشہ ریشہ تھرک رہا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت رقص کر رہی تھی۔ ہم اس کے جسم کے نشیب و فراز میں میں کچھ ایسے ڈوبے، کہ ہمیں پتہ بھی نہ چلا کر سورج کب نکلا۔ اب ہم سزا کے مستحق ہو گئے تھے۔ ہمیں سزا ملی۔ ہم اس نافرمانی کے عوض میں کہ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے عرش پہ پہونچنا تھا۔ اس کنویں میں الٹے لٹکا دیئے گئے۔ اور سارے جہان کا دھواں ہمارے حلق میں یلغار کرنے لگا۔ بس یہی ہماری کہانی ہے۔ اتنا کہہ کر ماروت چپ ہو گیا۔

ہاروت اور ماروت کی کہانی سن کر اس نے ایک طویل سرد آہ کھینچی۔

اس کو آہ بھرتے دیکھ کر ہاروت نے پوچھا۔ بھئی ہماری کہانی سن کر تم یہ سرد آہیں کیوں بھر رہے ہو۔؟

وہ تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہوا بولا۔ میں اور میرے پیچھے آنے والا ہجوم بھی دھوئیں کے ایک سمندر میں قید ہیں۔ یہ دھواں ہمارے جسموں کو چھلنی کرتا ہوا اونچیا ونچی چمنیوں کے سہارے فضا میں پھیلتا رہتا ہے۔ اور گھٹی اور گھٹی سانسیں ہمارے بے جان جسموں کا مقدر بن جاتی ہیں۔

ہم نہیں سمجھ سکے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ ا... کی بات سن کر ہاروت بولا۔

تم سمجھ بھی نہیں سکتے کہ ہمیں قید ہوئے ہزاروں سال بیت چکے ہیں اور دنیا پھر وہیں جا رہی تھی جہاں سے چلی تھی۔

مگر تمہارا قصور کیا ہے اس بار ماروت نے پوچھا

ہمارا قصور ہمارے یہ پھٹے ہوئے کپڑے ہیں۔ پیٹھ سے چپکتا ہوا یہ پیٹ ہے۔ اور پیروں سے رستا ہوا یہ خون ہے۔ بس اور کچھ بھی نہیں۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنی نگاہیں کنویں کے اندر سے ہٹا لیں۔ اور ریتیلے میدانوں کے اس لامتناہی سلسلہ میں بھٹکنے کے لئے کھڑا ہو گیا ●

ذاکر عزیزی
بنگلہ دیش

سہاگ رات

آج اس کی سہاگ رات تھی
اور اس وقت رات کے تقریباً ۱۲ بج رہے تھے
بدرالدین ہوٹل امان میں اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ دوست احباب جہاں سے شادی کی مبارک باد دے رہے تھے۔ وہاں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ میاں بدرالدین اب کافی رات ہو چکی ہے۔ گھر جاؤ بے چاری دلہن اکڑو بیٹھی سہاگن بنی بڑی بے چینی سے تمہاری راہ تک رہی ہو گی۔

تب بدرالدین اپنے دوستوں کی دلجوئی کی خاطر ہوٹل امان سے نکل پڑا اور اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ وہ ہوٹل میں کچھ دیر اور بیٹھنا چاہتا تھا تاکہ اس وقت گھر میں اس کی بھابی اور بھیا گہری نیند سو جائیں کیونکہ اسے اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھیا اور بھابی اب تک جاگ رہے ہوں اور جب وہ گھر پہنچے تو سارا مزا کرکرا ہو کر رہ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی دوستوں کے درمیان بیٹھا وقت کاٹ رہا تھا۔ ورنہ اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وقت اتنی تیز رفتاری سے گزر جائے کہ وہ پلک جھپکتے ہی اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس پہونچ جائے، جو نہ جانے کتنی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اپنی تجسس بھری نگاہوں کو فرش راہ کئے ہو گی۔ اس کا ایک ایک پل پہاڑ جیسا بھاری ہو گا اور ایک ایک سانس میں گھٹن کی سی پرورش پا رہی ہو گی۔

ان خیالات کے آتے ہی اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے اتنے تیز کہ جیسے وہ پیدل نہیں چل رہا ہو۔ بلکہ خلاؤں میں اڑ رہا ہو۔ شاہین کی طرح۔

مگر اسی لمحہ اسے گھر کی خستہ حالی اور بے پردگی کا خیال آیا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی ہو۔ اور اس زنجیر کے بوجھ سے اس کے پاؤں شل ہو گئے ہوں۔ بدرالدین جہاں رہتا تھا وہ گھر کا ہے کو تھا ایک گودام تھا۔ کبھی اس گودام میں جوٹ کے بنڈل رکھے جاتے تھے۔ اب اسے کیمپ کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اور اسے بلوچ آئے ہوئے خانماں برباد وں کے نام پر الاٹمنٹ کر دیا گیا تھا! اس کے بھیا اور بھابی بھی جب شتاب گنج سے تباہ و برباد ہو کر یہاں آئے تھے تو انہیں بھی اس گودام میں ایک گوشہ الاٹ کر دیا گیا تھا۔ اور دیگر لوگوں کی طرح انہوں نے بھی گودام کی دیوار کے سامنے دو جانب سے بانس کے ٹیرے سے گھیر

ایک کمرہ بنا لیا تھا۔ اور سامنے دروازے پر بوریہ کا پردہ
ڈال دیا تھا۔ اس کمرے کے درمیان بھی بوریہ کا ایک
طویل پردہ ڈال کر اسے دو کمرے کی شکل دے دی گئی تھی
پردے کی ایک جانب جس طرف دیوار تھی۔ اس کے بھیا
اور بھابی سوتے تھے۔ اور دروازے کی جانب بدرالدین
تنہا سوتا تھا۔

ان دنوں بدرالدین کی عمر ہی کیا تھی۔ بس یہی
دس گیارہ سال کے پیٹے میں تھا۔ لیکن ناپختہ شعور کے
باوجود جب کبھی گہری رات میں اس کی آنکھ کھل جاتی اور
پردے کے اندر سے کوئی متحرک آواز اس کے کانوں
میں آتی، تو اس کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی
کانوں کی لویں گرم ہو جاتیں۔ اور جسم کے مختلف حصوں
میں ایک لطیف سا تناؤ پیدا ہو جاتا۔ ایسے موقع پر
اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر
باہر نکل جائے۔ اور کسی سمت سے سرپٹ دوڑتا ہوا دور
تک بھاگتا چلا جائے۔ وہ ایسا کیوں سوچتا تھا اس کا سبب
سمجھنے سے قاصر تھا۔

دراصل وہ ذہنی طور پر بڑا ہی حساس واقع ہوا
تھا۔ وہ معمولی معمولی باتوں کا بھی اثر یوں لیتا تھا۔ جیسے اس
کے ذہن پر کوئی ہتھوڑا برس رہا ہو۔ دس سال پہلے کی بات
ہے وہ جب شتاب گنج میں تھا۔ اور جناح پرائمری اسکول
میں پڑھ رہا تھا تو ایک روز ایک ماسٹر صاحب نے تمام
لڑکوں کو ہوم ٹاسک دیا کہ کل "گائے" پر ایک مختصر
مضمون لکھ کر لاؤ گے۔ عجیب اتفاق کہ بدرالدین اس
روز وہ کاپی گھر پر بے خیالی میں چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ تمام
لڑکوں نے اپنی اپنی کاپیاں بنچ پر جمع کر دیں۔ مگر وہ بڑا
پریشان ہوا کہ اب کیا ہوگا۔ ماسٹر صاحب کے استفسار
پر اس نے بتایا کہ

"سر! میں نے گائے پر مضمون تو لکھ لیا ہے مگر کاپی
گھر پر بھول آیا ہوں۔ کل دکھلا دوں گا۔"

"وہ سب میں کچھ نہیں جانتا چلو باہر نکلو، اور مرغا
بنو!"

اور ماسٹر صاحب نے اسے اس وقت تک مرغا
بنائے رکھا تھا۔ جب تک کہ دوسری گھنٹی نہیں بج
گئی تھی۔ ہم جماعت لڑکوں نے جو مذاق اڑایا وہ الگ
دوسرا یہ احساس کہ ماسٹر صاحب نے اس کی باتوں کا
یقین کیوں نہیں کیا۔ اس نے تو قطعی جھوٹ نہیں بولا تھا
اور تمام لڑکوں کے سامنے اسے خواہ مخواہ مرغا بنا دیا
گیا۔ اس دن کے بعد سے وہ تین روز تک شرم سے
اسکول نہیں گیا تھا۔

ایک بار ماں نے بھی اسے بری طرح پیٹا تھا سخت
وسست جملے بھی کہے تھے۔ اور گالیاں بھی دی تھیں
"سور، کمینہ، حرام خور، باز نہیں کرے گا،
راشن نہیں لائے گا، تو کھائے گا کیا، ہر وقت لٹو
نچانے اور پتنگ اڑانے سے ہی پیٹ بھر جائے گا۔
جا ابھی گھر سے نکل جا۔ منحوس، نالائق لڑکا۔"

اس رات اسے زوروں کا بخار آ گیا تھا۔ کچھ چوٹ
کے درد کی وجہ سے۔ کچھ مار کے غم سے۔

مگر اس غم میں اور اس درد میں اتنی لذت تھی۔ کہ وہ
غم وہ درد اسے آج بھی یاد تھا۔ اور اچانک جب
کبھی اسے ماں کی یاد آتی تھی۔ تو اس کا کلیجہ شق ہو جاتا
تھا۔ اور وہ دل ہی دل میں ہولے ہولے، چپکے چپکے،

سسکیاں بھرنے لگتا تھا۔

ان دنوں جب وہ شتاب گنج سے یہاں اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ آیا تھا تو بڑا اداس اداس اور بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ ایک طرف والدین اور کئی بھائی بہنوں کے شہید ہو جانے کا غم، اور اپنے شہر اور اپنے دوستوں سے بچھڑ جانے کا غم تو دوسری طرف سارا سارا دن ادھر ادھر بے کار مارے پھرنے کا غم، نہ پڑھنا نہ لکھنا، بس آوارہ گردی، اس کا شعار بن چکی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کے بھیا اور بھابی اسے لعن طعن کرتے، اور اسے کاہل اور نکما سمجھتے، اور جب گھر سے نکال دینے کی دھمکی دیتے تو وہ اپنے آپ کو خلاؤں میں ایک دم معلق جھولتا ہوا سا محسوس کرتا کہ ابھی وہ گرا اور اس کے پرخچے اڑ جائیں گے

بھیا اور بھابی کے ایسے ہی ناروا سلوک سے بدرالدین کا دل ٹوٹ جاتا اور باہر سڑک کے کنارے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر رکھ کر، پھوٹ پھوٹ کر، بلک بلک کر، پہروں روتا رہتا۔ اب وہ ماں بھی نہ تھی جو اسے اس طرح روتے ہوئے دیکھ کر تو اس کے چہرے پر سے ہاتھوں کو ہٹا کر اپنے آنچل سے اس کے آنسوؤں کو پونچھ لیتی تھی۔

اس طرح لمحہ لمحہ وقت گزرتا گیا اور بدرالدین ایک ایک جو بڑھتا گیا۔

پھر وہ ایک ہوٹل میں کام کرنے لگا۔ ہوٹل کے برتن اور پیالے مانجھنے لگا۔ مگر چند ہی روز کے بعد اس نے اس ہوٹل کی ملازمت اس لئے ترک کر دی تھی کہ اس ہوٹل کے مالک نے اسے ماں کی گالی دی تھی۔ اور بدرالدین سب کچھ برداشت کر سکتا تھا۔ مگر یہ کبھی نہیں برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی اسے ماں کی گالی دے دے۔

اس نے پھر کہیں نوکری نہیں کی۔ بلکہ اپنے بھیا سے اس نے کچھ روپیہ مستعار لے کر کیمپ کے سامنے سڑک کے کنارے ایک سگریٹ پان کی دوکان کھول لی۔ رفتہ رفتہ وہ دوکان میں سگریٹ پان کے علاوہ بسکٹ، ٹافی، کھلونے، صابن، اور اسنو پوڈر بھی رکھنے لگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ کیمپ کے خریداروں کے علاوہ راہ گیر بھی آتے جاتے اس کی دوکان سے کچھ نہ کچھ خرید لیتے تھے۔

مہرن بھی اس کی دوکان کی خریدار تھی۔ وہ بھی اسی کیمپ میں رہتی تھی۔ جس کیمپ میں بدرالدین رہتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے دیکھتے آ رہے تھے۔ مگر اب دونوں کا ایک دوسرے کے دیکھنے کا انداز بدل گیا تھا۔ پہلے بدرالدین بھی ایک معمولی سا لونڈا تھا۔ جو ادھر ادھر سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔ اور مہرن بھی ایک الہڑ سی لڑکی تھی۔ جو سر کے بال کھولے اور بغیر دوپٹے کے کیمپوں میں دوڑتی پھرتی تھی۔ اب بدرالدین بھی قرینے سے کپڑے استعمال کرنے لگا تھا اس کے چہرے پر مسیں بھیگنے لگی تھیں۔ اس کے خون کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ اور راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنے کا اس کا جی چاہنے لگا تھا۔ اور اب مہرن کی آنکھوں میں بھی حیا آ گئی تھی۔ سر کے بال قرینے سے سنوارنے لگی تھی۔ چہرے پر اسنو اور پوڈر ملتی تھی۔ اور سینے پر سے پھسلتے ہوئے دوپٹے کو بار بار درست کرنے لگی تھی۔

مہرن جب اس کی دوکان پر آتی تو بدرالدین

کی زبان گنگ ہو جاتی۔ اور جب بدرالدین سوالیہ نشان
بن کر اس کی طرف دیکھتا تو دہرن کی نگاہیں جھک جاتیں
پھر اشارے کنائے میں سوال و جواب ہوتے۔ پھر
سودا سلف کی خرید و فروخت ہوتی۔ دہرن چپکے سے
بدرالدین کو مطلوبہ رقم چکاتی اور راج ہنس کی طرح
چلتی ہوئی وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ تو
بدرالدین کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ خواب دیکھتے
دیکھتے اچانک جاگ گیا ہو۔

اور آج اس کی سہاگ رات تھی۔

اور وہی راج ہنس چلنے والی دہرن اس کی دلہن،
سہاگن بنی، سرخ کپڑوں میں ملبوس، خوشبو سے لدی پھندی
اکڑوں بیٹھی کتنی بے چینی سے اس کی راہ تک رہی ہوگی
اس خیال کے آتے ہی بدرالدین کے قدم ایک بار پھر تیز
ہو گئے۔

اس نے چلتے چلتے دل ہی دل میں سوچا کہ جب وہ
سہاگ کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوگا تو دہرن جو
پہروں سے اس کا انتظار کر رہی ہوگی، اسے دیکھتے ہی
لاجونتی کی طرح سمٹ جائے گی۔ اور جب وہ اس کے
رخ روشن سے ہولے ہولے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں
سے گھونگھٹ اٹھائے گا تو وہ ضرور احتجاج کرے گی۔ اور
جب وہ احتجاجاً منہ سے کچھ بولے گی۔ تو فوراً وہ اس کے
ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دے گا کہ آہستہ بولو کہ مبادا
بھیا اور بھابی جاگ رہے ہوں۔ اور جب وہ اترا کر منہ
پھیر لے گی تو وہ اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر لے گا
اور جو وہ مزاحمت کرے گی۔ تو وہ جنگ کرنے پر آمادہ
ہو جائے گا۔

لیکن جب وہ کیمپ کے احاطے میں پہنچا اور،
دروازے کا پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا۔ تو بھابی
نے اسے ٹوک دیا۔

"کیوں جی نواب صاحب! سات بجے کے گئے
گئے ابھی لوٹے ہو۔ جاؤ آرام کرو، دلہن پریشان ہوگی"

اور بدرالدین کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اس
کی امیدوں کا محل مسمار ہو گیا۔ اور اس کے دل کا شیشہ
چور چور ہو گیا۔ اسے کبھی بھی یہ امید نہیں تھی کہ بھابی
اب تک جاگ رہی ہوں گی۔ ورنہ خواہ مخواہ اپنے
دوستوں کے درمیان بیٹھا فضول باتوں میں اپنا
وقت ضائع کرنے کی بجائے اور بھی پہلے گھر چلا آیا
ہوتا۔

پھر وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور اپنے
سہاگ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دیکھا دیوار سے
لگی ہوئی دہرن دلہن بنی اپنے دونوں گھٹنوں پر سر ٹکائے
بیٹھی تھی۔ اور پاس ہی کراس تیل کا چراغ جل رہا تھا۔
اور دلہن کے جسم پر سلک کی ساڑی جھل مل کر رہی
تھی۔ چراغ کی ہلکی ہلکی روشنی میں بدرالدین نے دہرن
کے سراپا پر ایک نظر ڈالی۔ اور اسے یوں لگا جیسے
چاندنی رات میں کوئی تاج محل استادہ ہو۔

وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھا
اور دہرن کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ بدرالدین کی آہٹ
پا کر دہرن اپنے جسم کو سمیٹنے لگی۔ تو اس کے دل میں
ایک ہیجان سا برپا ہوا۔ اور اس کا جی چاہا کہ دہرن
کے چہرے پر سے یہ گھونگھٹ الٹ کر اسے اپنے
بازوؤں میں یوں بھینچ لے کہ اس کی چیخیں نکل جائیں
پھر اچانک اسے خیال آیا کہ نہیں۔ ابھی نہیں، ابھی تو
بھابی جاگ رہی ہوں گی۔

اور وہ بیتی ہوئی یادیں اس کے ذہن میں عود کر آئیں۔ جب وہ شروع شروع میں اس کیمپ میں اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ آیا تھا۔ بھیا اور بھابی یہاں سوتے تھے۔ اور وہ اس پردے کے اس پار سوتا تھا۔ ان دنوں اکثر ایسا واقعہ رونما ہوتا تھا کہ بھیا اور بھابی کے درمیان تکرار ہوتی۔ نوک جھونک ہوتی۔ پھر چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی کھینچا کھینچی کی آواز کانوں تک بڑی سنائی دیتی تھی۔ کہ اس کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی تھی۔ اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر باہر نکل جائے اور کسی سمت سرپٹ دوڑتا ہوا دور تک بھاگتا چلا جائے۔

وہ ذہنی طور پر بڑا ہی حساس واقع ہوا تھا وہ معمولی معمولی باتوں کا اثر بہت جلد قبول کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج سہاگ رات ہونے کے باوجود مہرن کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ بھیا اور بھابی جاگ رہے ہوں گے۔

اس خیال کے آتے ہی بدرالدین دھیرے سے دلہن کے بیچ پہ لیٹ گیا۔ اور مہرن دلہن بنی خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ دھیرے دھیرے وقت گزرتا رہا۔ مگر اس نے نہ تو مہرن سے کوئی بات ہی کی، اور نہ تو اس نے اس کی انگلیوں کے پور تک کو چھوا۔ بلکہ وہ ایک کشمکش میں مبتلا تھا اسے بار بار بھتا پر غصہ آرہا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ جہاں ذرا سے کوئی سانس بھی لے تو ایک کمرے سے ہوتی ہوئی کئی کمرے تک اس کی آواز پہونچ جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بارہا بھیا اور بھابی سے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ وہ کیمپ کی اس بے پردگی کی زندگی گزارنے کی بجائے کسی کرائے کے مکان میں اٹھ جائیں۔ مگر انہوں نے اسکی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی

اور آج بدرالدین مہرن کے ساتھ شب عروسی کی آرزو پوری کرنا چاہتا تھا۔ تو اس کے جذبات بے تھے۔ اور شرم سے اس کا سراپا کانپ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو زمین میں دھنستا محسوس کر رہا تھا آخر مہرن کیا سوچے گی۔ جو اپنے سینے میں جانے کتنے ارمان چھپائے بیٹھی ہوگی۔ مگر وہ کیا کرے۔ اسے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے بھابی اور بھیا بستر پر لیٹے اسی کی طرف کان لگائے ہوئے ہوں اور اپنی اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف گھور رہے ہوں اسی طرح صبح ہو گئی۔ مگر اس کے جذبات میں کوئی ہیجان برپا نہ ہوا۔

دوسری شب بھی اس نے مہرن سے کوئی دلچسپی نہ لی، بار بار اس کے ذہن میں بھیا اور بھابی کا خیال گھوم جاتا تھا۔ کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی تک جاگ رہے ہوں۔ بدرالدین کا خیال تھا کہ مہرن اس دوران کئی بار آپ ہی آپ کسمسائی بھی تھی۔ اور اپنی چوڑیوں کی ہلکی سی جھنکار سے اس کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر بدرالدین پر جیسے اوس پڑی ہوئی تھی۔

تیسری شب بدرالدین کو قطعی نیند نہیں آئی رات کے تیسرے پہر جب اسے یقین ہو گیا کہ اب بھیا اور بھابی کے جاگنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ جب اس نے ہر طرح اپنا اطمینان کر لیا کہ دونوں گہری نیند سو رہے ہیں۔ اور ان کے خراٹے

لینے کی آواز یں دیر تک بلند ہوتی رہیں۔ تو بدرالدین کا حوصلہ بلند ہوگیا اور دوسرے ہی لمحہ اس نے بہن کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ لیا۔

پھر صبح ہوگئی۔ اور کانوں کان سارے کیمپ میں یہ خبر دھماکے کی طرح پھیل گئی کہ بدرالدین نے بہن کو طلاق دے دی۔

اس اندوہناک واقعہ پر اس کی بھابی سخت شرمندہ تھی۔ اس نے بدرالدین سے شکایت آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"یہ تو نے کیا کیا بدرالدین ؟"

"یہ آپ نہیں سمجھیں گی بھابی، یہ آپ نہیں سمجھیں گی"

"آخر کچھ بتا بھی تو سہی کہ بات کیا ہے ؟"

"میں دھوکہ کھا گیا ہوں بھابی، دھوکہ کھا گیا ہوں۔"

"کیا مطلب ؟" بھابی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔

"تم جسے ندی سمجھ رہی ہو بھابی، وہ ندی نہیں سراب ہے۔ سراب ہے بھابی۔"

اور بھابی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔"

بقیہ ایک اہم سوال

کا اچھا سمجھ رکھتے ہیں ـــــ ادیبوں اور شاعروں کو اپنے قاری اخبار بینوں میں سے ملنے لگیں گے میں توازن اور ذمہ داری کا حامی ہوں۔

(بحث جاری ہے) ادارہ

طنز و مزاح

سرور خوشتر ایم اے

گورِ دیگراں

جب جاپان کے انجینیروں نے بھی کہہ دیا کہ قطعہ آراضی عصر حاضر کے غیر ذمہ دار نوجوانوں کی طرح کسی قسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں۔ اس پر ہم الدولہ مان گئے ہمارے مقامی انجینیروں نے جب یہی بات بتلائی تو ہنس دیئے تھے۔ ان کے نزدیک ہمارے انجینیر چار پان کے حقیقی انجینیر جاپان کے۔

کچھ مہینوں بعد اخباروں میں اعلان چھپوا دیا۔

اپنی آخری آرام گاہ کے لئے ہم سے مشورہ کیجئے۔ ورنہ آپ بھی بقول ظفر

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

گنگناتے ہوئے ملک عدم کو کوچ فرمائیں گے موجودہ قبرستان ویران سنسان شہر سے دور، درخت نہ پھول، دھول ہی دھول، ہمارے عصری قبرستان کا محل وقوع ایسا ہے کہ جہاں موت کی دیوی دن رات زندگی سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔ شمال میں سرکاری دواخانہ، جنوب میں سینما گھر، مغرب میں بس اسٹینڈ، مشرق میں ریلوے اسٹیشن، ان چاروں ٹھکانوں پر ہمارے عملہ حادثات کی رپورٹ دینے کے لئے تعینات ہیں۔ ادھر ریلوے میں کوئی کٹا، ادھر ہماری زمین حاضر۔ ادھر اسپتال میں کوئی دم توڑا۔ ادھر ہم نے مٹی کھود دی۔

اب آپ کو اپنے نازک کاندھوں پر جنازہ کو چار پانچ کلو میٹر دور لے جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف چند گز کے فاصلے پر ہمارے گورستان لے آئیں مرحوم کو اتنی جلدی سپرد خاک کر دیں گے گویا لفافہ سپرد ڈاک کیا ہو۔

مناسب معاوضہ پر کاندھا دینے کے لئے مضبوط شانہ والا عملہ ہر وقت موجود ہے۔ گویا مصروف زندگی میں آپ اس فریضہ سے بھی سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ کئی جاہ و جلال حضرات کے متوقع متعلقین دو گز زمیں پیشگی ریزرو کرا چکے ہیں۔ آپ بھی جلدی کیجئے۔ قبرستان کا افتتاح بہت جلد ہو رہا ہے۔ تیز بہ سماجی بہبود و فیملی پلاننگ عمل میں آرہا ہے۔

یہ اشتہار ہماری دم توڑتی اور آخری ہچکی لیتی ہوئی [illegible] زندگی کے لئے مژدہ جانفزا ثابت ہوا۔ عرصہ ہوا بیگم کی وہ ملکی خالہ ہمارے سر پر چھپتے ملکوں میں فوجی کی طرح مسلط ہو گئی گئیں۔ ہم نے اشارتاً ان سے کہا تھا ہمارے مکان میں تمہارا کیا کام ہے۔؟ جواب میں بڑی بیگم کے شوہر بزرگوار نے [illegible] نصیحت فرمائی۔ وہ آج بھی ذہن پر نقش ہے۔ [illegible]

چل آفتاب لے کر چل،
چل ماہتاب لے کر چل۔

تو آج اپنے اس گھر میں
وہ انقلاب لے کر چل
سر پہ نہیں کھپانے کے لئے!
جی میرے لال زمانے کے لئے
اپنے لئے جئے تو کیا جئے۔

بہرکیف ہمارے اور شہر کے احباب کے خوشگوار تعلقات کو اس آفتاب سے گہن لگ رہا تھا۔ مسلسل کھانسی کے پیش نظر ان کی آخری آرام گاہ ریزرو کرانے کی تقریب میں شرکت کی۔

رعیت شناس، میت نواز، وزیر نے ربن کاٹ کر قبرستان کا باقاعدہ افتتاح فرمایا۔ یوم الدولہ نے مالک سبحانہٗ

حضرات! جب تک آپ خاک پر رہتے ہیں۔ ابھی پرسکون جگہ بہتر ماحول اور دیگر سہولتوں کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ہم دوسرے مرحلہ یعنی خاک میں سپرد کرنے کے بعد ان ہی لوازمات کا انتظام کیا ہے۔ اس کار خیر کے لئے ہم نے اپنی اس سونے سے قیمتی زمین کو مٹی کے داموں آپ کے لئے وقف کر دی ہے۔ اس سارے قبرستان کو گلاب، چنبیلی، موگرا، اور دیگر پھولوں کے پلاٹس میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر پلاٹ کا اس کی خوشبو اور چھاؤں کے مطابق معاوضہ رکھا گیا ہے۔ ایسی پرسکون راحت بخش جگہ تو آپ کو جیتے جی نہیں مل سکتی۔ کم از کم بعد مرگ تو حاصل کیجئے۔ ہمارے یہاں آپ کو کروٹ کروٹ جنت ملے گی۔ آج غالب زندہ ہوتے تو ہمارے مثالی قبرستان کو دیکھ کر کہہ اٹھتے کہ:

یہیں جنازہ اٹھتا اور یہیں مزار ہوتا

معاشی و سماجی اعتبار سے پسماندہ افراد کے لئے برگ و بار والا پلاٹ مختص کیا گیا ہے۔ گویا گور دیگراں کے ساتھ ساتھ گور مفلساں کا بھی ہمارے یہاں گنجائش ہے۔ معاشی و سماجی مساوات ہندوستان میں آئے نہ آئے ہمارے گورستان میں ضرور آئے گا۔ غریب افراد کی میت کے ساتھ تحصیلدار کا موافقت نامہ لانے پر قبر کے لئے معمولی فیس لی جائے گی ماہانہ ہدیہ پیش کرنے والوں کے عزیزوں کی قبروں کا خاص خیال رکھا جائے گا۔

گرد جنگ (بچوں میں) فرد جنگ (عوام میں) اور سرد جنگ (ملکوں میں) کے اس جارحانہ ماحول میں ہمارا خطہ دفن ہی خطہ امن ثابت ہوگا۔ آپ چاہے زندگی بھر بیگم اور لیڈر کے بالترتیب نوٹ اور ووٹ کے لئے قطار پر سن سن کر بور ہوتے ہوں مگر جناب دوسرے قبرستانوں کی طرح چرس گانجا، شراب، اور تاش والے آکر آپ کو یہاں تنگ کریں تو مجھ پر خاک ڈالئے۔

ڈاکٹروں اور آٹو رکشہ ڈرائیوروں نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ اس قبرستان کو آباد کرنے میں پوری مدد فرمائیں گے۔ صرف ان کی پرخلوص کوششوں سے کچھ نہیں ہوتا آپ حاضرین سے یہ خاکسار درخواست کرتا ہے کہ خاکساری کا بھرپور موقعہ دیں۔ یہاں کی سہولتوں کے پیش نظر انڈر گراؤنڈ حضرات یہی گنگنائیں کہ:

ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔

امید ہے کہ اس دائمی بستی کو آباد کرنے میں آپ شانہ بشانہ حصہ لیں گے۔ جہاں چار جمع ہوں سمجھئے کہ ہمارا کام ہو گیا۔ بصورت دیگر ہمارا سارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔ مرحومین کی تقریب کی بعد ازاں وزیر محترم آپ سے مخاطب ہوں گے۔

حاضرین! شہر میں بڑھتی ہوئی آبادی اور لوگوں کے ریل پیل کے پیش نظر اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ ان کا کہیں مناسب ٹھکانہ ہو اس پرشور سے ماحول سے ہٹ کر ایسی جگہ جہاں ہر طرح کی سہولتوں کے ساتھ قیام کرنے کا موقع

لے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہاں ہر چیز ہے۔ لائٹ، باغ، فون، ایئرکنڈیشنڈ کا انتظام ہے۔ لوگ اب سردیوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ بس وہ ہر حال میں آرام چاہتے ہیں۔ انہیں یہاں صحیح معنوں میں آرام نصیب ہوگا۔ میری دعا ہے کہ یہ قیام گاہ سدا آباد رہے۔ اور.......

اسے معاف کرنا سکریٹری کی غلطی سے میں نے بجائے دائمی قیام گاہ کے عارضی قیام گاہ بھی یعنی فائیو اسٹار ہوٹل، والا ایڈریس پڑھا۔ دراصل اس کی افتتاحی تقریب بھی آج لائے میں قبرستان والا ایڈریس پڑھتا ہوں۔ چھوڑیئے اب پڑھنے میں کیا رہ گیا ہے۔ بہرکیف میں اتنا کہوں گا کہ یہ سرسبز و شاداب ہے۔ آپ آیا کریں۔ یہاں کے لالہ و گل آپ کے پھول آپ کے منتظر ہیں۔ اور ان کی خوبصورتی دیکھ کر غالب نے کہا تھا سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں۔ ابھی خاک پر کیا ہو رہی ہوں گی جو اس گورستان سے پنہاں ہو گئیں۔

آخر میں اتنا ہی کہتا ہوں کہ،
مر کر بھی چین نہ پایا تو اِدھر آئیں گے۔

علی احمد فاطمی

سوئے مشرق ہم چلے

(ایک سفر کی روداد سنہ ۱۹۷۹ء)

مغرب کی تقلید ہمارا تہذیبی و معاشی معیار سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی تہذیب و ادب پہ مغرب نے خاصا اثر ڈالا ہے۔ اور بڑی حد تک تعمیری رول ادا کیا ہے لیکن جب تقلید پرستش کی شکل اختیار کر گئی۔ تو اس میں بابنیت، خام اعتقاد اور فیشن کی بو آنے لگی۔ پرستش کی اس رفتار نے زندگی کے ہر شعبہ پر اثر ڈالا خصوصاً ادب پہ۔ اور ادب میں فکشن کے سلسلے میں دلچسپ سے دلچسپ تقلیدی اور غیر تفہیمی ڈھانچے ہمارے سامنے آئے۔ اور ہم اپنے تہذیبی سرمایہ سے یکسر بے خبر ہو کر خلا میں قلابازیں مارنے لگے۔

ذہنی اور جسمانی اعتبار سے مغرب کی پرستش کے دور میں مشرق کی بات سوچنا قابل حیرت امر ہو سکتا ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو ذہن کی رگوں کے بعض رشتے خون کی اچھال کو صحیح تقویت ہمیں مشرق ہی میں ملتی ہے۔ ہم مشرقی ہیں، مشرقی تہذیب کے پروردہ، ممکن ہے مشرق کا تصور مختلف اذہان میں مختلف انداز سے جذب ہو — ہم یوپی والے اپنے حلقے میں جب مشرق کی بات کرتے ہیں تو ہمارا ذہن بہار، بنگال کی جانب اٹھتا ہے۔

جب ہم نے بہار کا پروگرام بنایا تو ایک صاحب نے دلچسپ سوال اٹھایا کہنے لگے مغرب سے متاثر ہونے والے مشرق کی طرف بھاگ رہے ہیں آپ کو مشرق سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔؟ سوال ایسا تھا کہ تفصیلی جواب کی ضرورت تھی۔ اس لئے ٹال دیا۔ لیکن وہ سوال میرے اس سفر نامہ کی خستہ تمہید کی شکل اختیار کر گیا۔ اس وقت میں نے ان سے یہ کہا تھا۔ بھائی جس نسل کے ہم لوگ ہیں وہ تذبذب میں ہے SANDWITCH بنی ہوئی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مشرق کی بو باکیوں ہوتی ہے۔ ہم لوگ مشرق جا کے

میں۔ تو ایسا کون سا مشرق ہے جس پر بات کی جائے میں تو صرف اتنا جانتا ہوں۔ کہ میں بہار جا رہا ہوں بہار جہاں ایک شہر سہسرام ہے جس میں پیارا دوست شفق رہتا ہے ـــــ ایک شہر گیا ہے جہاں جینے بھائی عبدالصمد ہیں۔ بزرگ و مشفق کلام حیدری ہیں۔ انیس ظفر ہیں۔ شاہد احمد شعیب ہیں، اور بدنام نظر ہیں۔ جو اپنے اخلاق و محبت کے لئے سارے گیا میں بدنام ہیں۔ بہار کی راجدھانی پٹنہ جو ایک خوبصورت شہر ہے اور اس خوبصورت اور بھیڑ والے شہر میں خاموش گم سم سا شوکت حیات رہتا ہے جس کی دوستی پر مجھے فخر ہے۔ احمد یوسف صاحب ہیں جن کی شفقت پر مجھے ناز ہے۔ رضا نقوی واہی ہیں جو میرے استاد ڈاکٹر عقیل صاحب کے دوست ہیں۔ بڑے پیار سے ملتے رہیں۔ خوب ناشتہ کراتے رہیں۔ بہت اچھی چائے پلاتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی ہیں جو نوجوانوں کو نوازتے ہیں۔ طہیر صدیقی ہیں۔

بہت دنوں سے وعدے تھے، بہت سارے تقاضے تھے۔ دل میں خواہش تھی کہ بہار کے دوستوں سے ملا جائے۔ لیکن پروگرام اتنی آسانی سے نہیں بن جاتا ہے اور شاید دور دور تک اس کے امکانات پیدا نہیں ہوتے کہ عزیز دوست اسرار گاندھی کہ جن کو خدا نے صرف گھومنے پھرنے کے لئے بنایا ہے۔ ان کی چھٹی پڑ گئی اور وہ تیار ہو گئے۔ متعدد ذمہ داریاں انہوں نے اپنے سر لیں۔ اور ہم دونوں چل پڑے مشرق کی طرف ـــــ بہار کی طرف ـــــ جس کا ایک خاص تصور، خاص معنی ہیں۔ ان کو دیکھنے اور محسوس کرنے۔

سب سے پہلے ہم نے سہسرام کا پروگرام بنایا کیونکہ سہسرام یوپی، اور بہار کی سرحد پر ہے۔ اور الہ آباد سے سب سے زیادہ نزدیک۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۹ء ۱۰ بجے دن ہمارے دوستوں میں محمد اشتیاق شمیمہ حسن اور تنویر نے ہمیں

رخصت کیا۔ ڈیڑھ بجے ہم مغل سرائے پہونچے۔ چار بجے سہسرام کے لئے گاڑی ملی۔ جو شام کے ۷ بجے سہسرام پہونچی، لوہے اسٹیشن یا شاید پورے شہر میں اندھیرا [illegible] سہسرام جگ جیون رام کا شہر ہے۔ سہسرام کی تاریکی [illegible] کی علامت ہے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔

شفق نے بے پناہ خط لکھے ہیں لیکن تصویر ایک بھی نہیں بھیجی۔ اس اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو کیسے پہچانیں گے یہ سوال ہم دونوں کو پریشان کئے ہوئے [illegible] لیکن ہم سے زیادہ شفق پریشان تھے۔ ہم لوگوں کو [illegible] لینے آئے تھے۔ اور ہر مسافر کو آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھ [illegible] تھے۔ اسرار گاندھی کو انہوں نے پہچان لیا۔ طویل عرصہ پھیلی ہوئی ذہنی رفاقت جسمانی رفاقت میں تبدیل اور ہم دونوں گلے مل گئے۔ سیدھے کبیر گنج پہونچے جہاں شفق کا گھر ہے۔ بھابی ہیں۔ ماں ہیں۔ اور دو پیاری [illegible] بچیاں ہیں۔ شفق کے ساتھ نوجوان شاعر شمیم قاسمی اور آرٹسٹ احمد سلیم تھے جنھوں نے شفق کے مجموعے کے [illegible] کی ڈیزائن بنائی ہے۔ ایک دوسرے سے تعارف ہوا [illegible] ہم لوگ چائے پینے لگے۔ اور محبت بھری باتیں کرنے [illegible] نعیم اشفاق کے بھائی کا حادثہ، مہدی جعفر کی باتیں، شوکت حیات، عبدالصمد کی ملاقاتیں۔ الہ آباد بھیلد کی گفتگو سب کچھ دھندلا تھا۔ کیونکہ ہم خاصے تھک چکے تھے کھانا کھایا اور سفر کے لئے دوسری جگہ منتقل ہو [illegible]

۲۰ اکتوبر ۱۹۷۹ء

صبح اٹھتے ہی اسرار حسنہ بھابی کو خط لکھنے بیٹھ [illegible] اور میں کرشنا سوبتی کے ہندی ناول "ڈار سے بچھڑی" [illegible] کی زبان تقریباً پنجابی ہے۔ اس کے اوراق الٹنے لگا

تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ تیار ہو گئے اور شفق کے گھر کی طرف چل پڑے۔ بہت اچھا ناشتہ کیا۔ شفق کے مقامی دوست ڈاکٹر افروز آ گئے۔ اور ہم لوگ شیر شاہ سوری کا مقبرہ دیکھنے چل پڑے۔ جو سہسرام کی عظمت کا ایک اہم جزو ہے۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں کو پار کرتے ہوئے سہسرام کی تہذیب و معاشرے پر دھندلی دھندلی رائے قائم کرتے ہوئے ہم جی ٹی روڈ پر آ گئے۔ جو سہسرام کی واحد بارونق سڑک ہے۔

سہسرام جسے انگریزی میں SASARAM کہتے ہیں۔ جو ایک ضلع ہے جس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ کافی پہلے ساسارام نام کے کسی شخص نے پہاڑ کے دامن میں ایک بستی بسائی تھی کچھ ہی دنوں کے بعد شیر شاہ سوری کے والد حسن خاں سوری ادھر آ نکلے۔ اور قیام کیا۔ کچھ دنوں تک اس کا نام حسن پور پڑ گیا لیکن رفتہ رفتہ پھر سہسرام کے نام سے مشہور ہوتا گیا۔

بڑی سڑک پر سے ہو کر ہم لوگ اس سڑک پر آ گئے جو مقبرہ کو جاتی ہے۔ داہنے طرف ضلع کا اسپتال ہے جہاں بہت بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ اسپتالوں میں اس طرح کی بھیڑ اب قابل توجہ نہیں رہی ہے۔ لیکن شفق نے بتایا کہ یہاں آئے دن قتل ہوتے رہتے ہیں۔ انفرادی تک نہیں بلکہ اجتماعی قتل۔ ایک ساتھ چھ چھ سات سات لوگوں کو مار ڈالا جاتا ہے۔ جانوروں کی طرح ذبح کر دیا جاتا ہے۔ سہسرام نہایت [illegible] علاقہ ہے۔ میں نے اسرار پر نظر ڈالی۔ جن کے چہرے کی زردی ابھر کر تیز ہلدی کا رنگ اختیار کر رہی تھی۔ میں نے شفق سے پوچھا۔ یہاں پولس کا انتظام نہیں ہے؟ — رہتا ہے رات کو پہرہ زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ لیکن قتل تو دن کے ۱۲ بجے ۲۰۔ بجے یا ۳ بجے ہوتا ہے۔ پورا گھر جلا دیا جاتا ہے قتل و غارت گری نے یہاں تفریح کی شکل اختیار کر لی ہے۔ میں نے دیکھا کہ شفق کے چہرے کا رنگ سانولا ہو گیا ہے۔ جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ وہ کیوں رہتا ہے اسے یہاں نہیں رہنا چاہیے لیکن پھر کہاں جائے کیا پورے ملک میں کوئی پناہ گاہ ہے شاید نہیں۔ ہر جگہ یہی فضا ہے۔ خون ہے۔ قتل ہے شور ہے۔ دھواں ہے۔ اور پھر میں شفق کے بارے میں سوچنے لگا۔ لڑکھڑاتے ہوئے میرا ذہن اس کے افسانے کے کینوس میں جھٹکنے لگا۔ جس کی فضا میں بالکل اسی طرح دھواں اور وحشت ٹپکتی ہے۔ یہ سوچ یہ فکر مجھے شفق کے افسانوں کو سمجھنے میں مدد کرنے لگی۔

ہم لوگ مقبرہ کے قریب پہونچ گئے تھے۔ راستے میں شمیم قاسمی بھی مل گئے۔ پھاٹک کے پاس ایک ٹورسٹ بس کھڑی ہوئی تھی۔ بنگالیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی بس شاید یہ لوگ مقبرہ دیکھ کر لوٹ چکے تھے۔

شیر شاہ سوری کا یہ مقبرہ جو چاروں طرف پانی کے درمیان واقع ہے۔ اپنے آپ میں بڑی خوب صورتی رکھتا ہے۔ اس کے ارد گرد پھولوں کی کیاریاں اور سبزے اس کی دلکشی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مقبرہ کے دکن سے پتھریلا راستہ پانی سے ہو کر گیا ہے۔ جو براہ راست اس ہال تک پہونچاتا ہے، جہاں سوری کی مزار ہے۔ یہ مقبرہ ۱۵۴۵ء میں واقع ہوا۔ سوری نے اپنی زندگی میں ہی اسے بنوایا تھا تھوڑا سا نامکمل رہنے پر بعد میں اس کے لڑکے سلیم شاہ نے مکمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہمایوں کی حکومت جلد واپس آ جانے کی وجہ سے پورا نہ کروا سکا۔ بعد میں ۱۸۸۲ء میں، انگریزی حکومت کے جارج فریڈرک نے اسے REPAIR کروا دیا۔ اور اسے یہ شکل دی جو [illegible] نہ ہونے کے باوجود خوب صورتی رکھتا ہے۔ ہم لوگ مقبرہ کی

سب سے اونچی منزل پر چڑھ گئے ۔ اور ایک ٹھنڈے کونے
میں بیٹھ کر کیلے کھانے لگے ۔ اسرار ایسی جگہوں پر بے حد رومانی
ہو جاتے ہیں ۔ اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتے ہیں شاید رومان
میں ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں یہیں پر شفق نے بتایا کہ سہسرام کا محرم
بہت اچھا ہوتا ہے ۔ خاص طور پر یہاں کی لڑائی دیکھنے سے تعلق رکھتی
ہے ۔ شیعہ سنی کا کوئی فرق نہیں رہتا یہ سن کر طبیعت خوش ہوئی
سہسرام جیسے خونریز مقام پر اتنا اتحاد شاید یہاں کے بزرگوں کا
کرم ہے ۔ کاش کہ کچھ اور مہذب شہر اس غیر مہذب شہر سے سبق حاصل
کرتے ۔

واپسی پر ہم نے حسن سوری کا مقبرہ دیکھا ۔ اور باؤلی دیکھنے
گئے ۔ گھروں کے اندر ایک خاص قسم کے چوکور کنواں یا حوض تالاب
کو کہتے ہیں ۔ جو پہلے کروسا بنوایا کرتے تھے ۔ تاکہ مکانوں میں
ٹھنڈک رہے ۔ ڈاکٹر افروزاں سب کے بارے میں کافی معلومات
رکھتے ہیں ۔ بڑی دلچسپی کے ساتھ سب بتاتے رہے ۔

گھر پہنچتے پہنچتے ہم خاصے تھک چکے تھے ۔ کھانا کھایا ۔
آرام کیا ۔ دو بجے خوشبو جو پچھلا رسالہ ہے سہسرام سے ہی نکلتا
ہے ۔ اس کے ایڈیٹر معصوم صاحب جو خود بھی بچے ہیں اور معصوم
بھی ملنے آگئے ۔

پانچ بجے چائے پی کر ہم لوگ پہاڑی کی طرف نکل گئے ۔
ابتدا میں میرے ساتھ شمیم قاسمی رہے ۔ بستی سے نکل کر ہم اسی
راستے پر آگئے ۔ جو پہاڑ کے دامن میں جاکر ختم ہو جاتا ہے ۔ اب
میں اور شفق، قاسمی اور اسرار الگ الگ باتیں کرتے پہاڑ کی طرف
بڑھتے رہے ۔ قاسمی سے کی ہوئی ادھوری باتیں میں نے شفق
سے مکمل کی ۔ شفق نے بھی بہت ساری باتیں کیں ۔ وہ باتیں جو
ہم لوگ خطوں میں اشاروں میں کرتے تھے آج کھل کر کرتے رہے
سامنے پہاڑ تھا ۔ خوبصورت پہاڑ، ہم لوگ آہستہ آہستہ
اوپر چڑھنے لگے ۔ پہاڑ کافی اونچا تھا ۔ ابھی ہم آدھا ہی چڑھے
تھے کہ آدھ گھنٹہ گذر گیا اور مغرب کا وقت گذرنے لگا ۔
اندھیرا بڑھنے لگا ۔ شفق نے رائے دی کہ اب ہم لوگوں کو واپس
چلنا چاہئے ۔ زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہیں ۔ اس بلندی
سے ہم نے پورے سہسرام کا جائزہ لیا ۔ پورا سہسرام
روشنیوں میں نہایا ہوا تھا ۔ دیوالی کے دن تھے اس لئے
چاروں طرف قمقمے جگمگا رہے تھے ۔ پہاڑ پر سے یہ منظر بہت
اچھا لگا ۔ بائیں طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں اس کے نشیب
میں لمبے لمبے کھجور کے درخت نے حسن میں اور اضافہ کر رکھا
ہے ۔ پہاڑ کے دائرے ، کھجور کے درخت ، ڈوبتے ہوئے سورج
کی نارنجی کرنیں اور سرمئی ماحول یہ سب اس قدر حسین لگا ۔ کہ
اسرار ڈوبنے لگے ابھرنے لگے ۔

شفق نے یہ بتایا کہ پہاڑوں کا سلسلہ یہاں سے
لے کر مرزا پور تک پھیلا ہوا ہے ۔ ان کے کھنڈر جو یہ
ڈاکوؤں کے پناہ گاہ ہیں ۔ مرزا پور سے بھاگ کر آتے
تو پہاڑ ہی کے راستے سے ۔ ادھر بھاگ آتے ہیں اور
یہی سلسلہ اس طرف سے بھی رہتا ہے ۔ اتنی خوبصورت
جگہوں پر اتنی بدصورت لوگ یہ سوچتے ہوئے ہم نیچے
اتر آئے ——— ویران میں پھیلا ہوا اندھیرا بہت اچھا
لگ رہا تھا ۔ ہم لوگ مختلف قسم کی باتوں اور ماحول کا بے پناہ
مزہ لوٹتے ہوئے لوٹ آئے ۔ واپسی پر معصوم صاحب اپنے
گھر پر ہمارا انتظار کر رہے تھے ۔ ان کے ساتھ ان کے معاون
شاہد چاند بھی تھے ۔

۲۱ اکتوبر ۷۹ء

شمیم قاسمی ایک دوست کے ساتھ آگئے ۔ ہم لوگ

سوکر ہی اٹھے تھے چائے پی اور الفاظ کے تازہ شمارہ کا اداریہ
پر باتیں کرتے رہے۔ میں نے انداز ے کا بس نوشت سنایا
اس موضوع پر کچھ باتیں کیں۔ اور شفق کی طرف چل پڑا۔ ناشتہ
کیا اور آوارہ گردی کے لئے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اسٹیشن
کی کینٹین میں ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ شمیم قاسمی اور احمد
سلیم صاحب آگئے اور وہاں سے اٹھ کر ہم لوگ حضرت وحید
پیا کی مزار کی طرف زیارت کے لئے چل پڑے۔ سہسرام مزاروں
اور درگاہوں کا شہر ہے۔ متعدد درگاہیں ایسی ہیں جہاں
سال میں دو دو بار عرس ہوتا ہے۔ اور خوب لنگر بٹتا ہے
ہم لوگ درگاہ کے اندر داخل ہوئے۔ تو وہاں کی ویرانی
اچھی لگی۔ اور ہم لوگ ایک پیڑ کے تلے بیٹھ گئے۔ شاعرانہ
ماحول تھا۔ احمد سلیم صاحب اور قاسمی نے چند اشعار سنائے
شفق اسرار اور میں نے اپنی اپنی پسند کے ایک ایک شعر
سنائے۔

واپسی پر ہم لوگ خاصے تھک چکے تھے۔ شام کو ہم
لوگ حسن آرزو صاحب سے ہم لوگ ملنے گئے۔ اس ملاقات
میں سہسرام کے تمام نوجوان قلم کار ہمارے ساتھ تھے حسن
آرزو صاحب گفتگو بہت اچھی کرتے ہیں۔ کافی دیر تک ہم
لوگ سہسرام کی تاریخی حیثیت پر گفتگو کرتے رہے وہاں
سے اٹھے تو ایک پارک کی طرف مڑ گئے۔ جہاں بہت دیر تک
جمشید رضوی اور اسرار گاندھی میں لطیفوں کا مقابلہ
رہا۔ وہاں سے لوٹے تو فوٹو گرافر کی دوکان پہ ہم لوگوں نے
ایک گروپ کھنچوایا اور گھر کو لوٹ پڑے۔

۲۲ اکتوبر ۹۱ء

علی الصبح اٹھ گئے۔ اور مع ساز و سامان کے تیار
ہو گئے۔ آج ساڑھے آٹھ بجے کی گاڑی سے گیا کے لئے روانہ ہونا
تھا۔ دو دن سہسرام میں بہت اچھے گذرے ایک طرح سے
یادگار۔ ناشتہ کے بعد ہم شفق کی والدہ اور بھابی سے
رخصت ہو کر اسٹیشن آگئے۔ شفق ہمارے ساتھ گیا چلنے کو
تیار ہو گئے۔ اسٹیشن پر حسن آرزو صاحب مل گئے وہ بھی
گیا جا رہے تھے۔ ہمارے ہم سفر ہو گئے۔ لیکن ایک مشکل
بھی ہو گئی۔ حسن آرزو صاحب شفق کے استاد ہیں۔ خاموش شفق
استاد کے ادب سے اور بھی خاموش ہو گئے۔ حسن آرزو
صاحب سارے راستے باتیں کرتے رہے۔ لیکن اچھی باتیں
اور میں درمیان میں سماعت کی ذمہ داری اسرار پر چھوڑ کر
گذرے ہوئے دو دنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ انسان محبتیں
اور شفقتوں کا حساب لگانے لگتا جو شفق نے دی شفق
کے گھر والوں نے دی۔ کیا اس دور میں یہ سب ممکن ہے۔ یہ
سوال کوئی شفق سے پوچھے۔

سفر کے دوران حسن آرزو کی گفتگو سے پتہ چلا کہ ان دنوں
وہ اودھ کی بیگماتی زبان پر تحقیق فرما رہے ہیں۔ ساتھ ہی
شیر شاہ سوری کے دور کے سکوں کے بارے میں تحقیق کر رہے
ہیں حسن آرزو صاحب نے انداز ے کے تازہ شمارہ کی
بہت تعریف کی۔

بارہ بجے ہم لوگ گیا پہنچے۔ بودھوں کے شہر
بودھ گیا اسٹیشن پر غیر معمولی بھیڑ تھی۔ باہر نکل کر ہم لوگ
سیدھے عبدالصمد کے گھر پہنچے۔ وہ ہمارا انتظار کر رہے
تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ عبدالصمد نے بتایا کہ ہم لوگ
کو کلام حیدری صاحب کے یہاں ٹھہرنا ہے۔ وہ ہم لوگوں
کا انتظار کر رہے ہیں۔ عبدالصمد اور میں دونوں الٰہ
آباد کے سمینار میں مل چکے ہیں۔ اجنبیت کا احساس بہت
پہلے اٹھ چکا ہے۔ اور ہم دونوں کے تعلقات گہری دوستی میں
تبدیل ہو چکے ہیں۔ عبدالصمد اور شفق میں خوب نوک جھونک

چلتی خوب مذاق ہوتا ہے۔ عبدالصمد نے ایک ہوٹل میں کھانا
کھلایا۔ یہاں خالص بہاری کھانا کھانے کو ملا۔ خالص چاول اور
دال، روٹی غائب۔ شفق کے یہاں کھانے میں اس قسم کا کوئی احساس
نہیں ہوا۔ پتہ نہیں کیوں۔ شاید سہسرام لوہی سے زیادہ قریب
ہے۔ وہاں سے نکل کر ہم لوگ بدنام نظر سے ملنے گئے۔ گھر پر ملاقات
ہوگئی۔ بڑی جلدی بے تکلف ہو گئے۔ فوراً نشست کی بات
کرنے لگے۔ دوسرے دن اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی
بدنام نظر سے ملاقات کے بعد ہم لوگ م ق خاں کی طرف
مڑ گئے۔ م ق خاں کا نام افسانوں میں بالکل نیا ہے۔ کچھ دنوں
قبل آہنگ نے ان کا خصوصی مطالعہ پیش کیا تھا۔ عبدالصمد
نے تعارف لکھا تھا۔ تحریر اور افسانوں کے ذریعہ میں نے
انھیں نئی نسل کا افسانہ نگار سمجھ رکھا تھا۔ لیکن جب ان سے ملاقات
ہوئی تو ہم لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ موصوف کی عمر پچاس سے
زیادہ ہی رہی ہوگی۔ شفق نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا۔
خاموش قسم کے آدمی ہیں۔ اس قدر خاموش کہ خاموشی اخلاق
کے آڑے آتی ہے۔ جلد ہی ہم لوگ باہر نکل آئے۔ شفق نے
کہا کہ یہ عمر تو بچوں کی شادی بیاہ کی ہے افسانے لکھنے کی نہیں
ہم ڈاکٹر حسنین صاحب سے ملنے گئے۔ وہ بھی محبت سے
ملے۔ پھر آنے کا وعدہ کر کے ہم لوگ ڈاکٹر افصح ظفر صاحب
سے ملنے گئے۔ ان سے ملاقات ہوئی ان کے ساتھ شاہد احمد شعیب
صاحب بھی تھے۔ پہلی ملاقات میں الٰہ آباد سیمینار سے متعلق
شکایت کرنے لگے۔ افصح ظفر صاحب کے یہاں ہم قلم کا تازہ
شمارہ دیکھنے کو ملا جس میں شارق نے اردو کہانی مر چکی ہے
کے عنوان سے بحث چلا رکھی ہے۔ شارق میرا دوست ہے
اس کی مدد کے طور پر میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس موضوع پر
گیا کے افسانہ نگاروں کے درمیان گفتگو کی جائے۔

شام ڈھل چکی تھی کہ اب احساس ہونے لگا کہ
کلام صاحب سے اب تک ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔ وہ انتظار
کر رہے ہوں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم لوگ مع ساز و سامان
کے کلام صاحب کے یہاں تھے۔ کلام صاحب اوپر تھے۔
عبدالصمد نے پرچہ بھجوایا تو انہوں نے اوپر ہی بلوا لیا۔
دھلے دھلائے شفاف کرتے پاجامے میں ملبوس شفاف
ماحول میں بیٹھے کلام صاحب کی شخصیت بہت اچھی لگی۔
بڑی محبت سے ملے۔ بیٹھتے ہی اچھی اچھی باتیں شروع کر دیں۔
کلام صاحب کی انداز گفتگو تیکھا پن اور ان کی ادبی گفتگو
پورے ادبی حلقے میں مشہور ہے۔ ہم سب ہنستے رہے اور
ان کی شعلہ بیانی کا لطف لیتے رہے۔ کلام صاحب کا یہ ہی
تیکھا پن آہنگ کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ لیکن ان کے
افسانے اس تیکھے پن سے قدرے محروم رہتے ہیں۔ وجہ
جو بھی ہو۔ شاید افسانہ لکھتے وقت وہ غیر ضروری طور پر
محتاط ہو جاتے ہیں۔ جبکہ انہیں اس بات کا شاید احساس
ہے کہ تخلیق کی زبان مہک اور لپک چاہتی ہے۔
شفق اور عبدالصمد چلے گئے اس وعدے کے ساتھ
کہ صبح آئیں گے۔ ہم پھر کلام صاحب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تھوڑی
دیر کے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کی میز پر باتیں ہوتی رہیں
کچھ موسم کی، کچھ ادب کی، کچھ ادب نوازوں کی۔ ڈاکٹر حسنین
کی لنڈا ہوسٹنگ کی، گوپی چند نارنگ کی۔ اور ڈاکٹر عقیل
صاحب کی۔ کس کے بارے میں وہ کس قسم کے احساسات رکھتے
ہیں ان کی گفتگو سے خوب اندازہ لگ رہا تھا۔ لیکن باتیں
اچھی ہو رہی تھیں۔ مجموعی طور پر جو ایک پڑھے لکھے آدمی
کو کرنا چاہئے۔ ہمارے سر تکان سے بوجھل ہو رہے تھے۔
ہم لوگ اجازت لے کر کہانیوں کے کمرے میں آ گئے۔ پھیلے ک

پھر مشہور ہیں۔ عبدالصمد بہت ڈر گئے تھے۔ لیکن ہم جب کمرے
میں داخل ہوئے۔ تو بستروں پر عمدہ قسم کی مچھر دانی کمرے
کی نفاست میں اضافہ کر رہی تھی۔ ہم لوگ تھکے ہوئے تھے
لیٹتے ہی سو گئے۔

۲۴ اکتوبر ۷۹ء

رات خوب سوئے اور دیر میں اٹھے۔ شفق آگئے
اسرار نہانے چلے گئے۔ شفق نے موقع اچھا دیکھا۔ اور اپنے
افسانوں کی بات چھیڑ دی۔ شاید شفق کا خیال یہ ہے کہ میں
افسانے بہت پڑھتا ہوں۔ خصوصاً نئی نسل کے افسانے
ہم لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ شفق نے صاف صاف
مجھ سے پوچھا۔ ایک قاری کی حیثیت سے تمہارا میرے افسانوں
کے بارے میں کیا خیال ہے؟
مجھے تقریر کا موقع ہاتھ آگیا۔ ماحول اچھا ہو تو بات
اچھی ہو سکتی ہے۔ اور اسرار کی غیر موجودگی میں عام طور پر
ماحول اچھا ہی رہتا ہے۔ میں نے موقع اچھا دیکھ کر معذرت
کے ساتھ ساتھ صاف صاف کہنے لگا۔ شفق تمہاری شخصیت
بہت سنجیدہ ہے۔ تم سوچتے بہت ہو۔ حساس ہو۔ سہسرام
کی خون ریز فضا نے تمہارے اوپر بہت اثر ڈالا ہے۔ عدم
محفوظیت، قتل، خوف کی باتیں۔ براہ راست تمہارے
افسانوں میں آگئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تم نے اسے
بہت خوب صورت ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ اس سے
پتہ چلتا ہے کہ تمہارے اندر کہانی کا آرٹ پورے طور پر جلوہ
گر ہے۔ لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں تمہارے افسانوں
پر اس قدر حاوی ہو گئی ہیں جو ہر افسانے میں شدت کے ساتھ
منڈلاتی رہتی ہیں۔ جس سے تمہارے تمام افسانے تقریباً
ایک سی فضا کے حامل ہو جاتے ہیں۔ ہر چند کہ بعض کہانیاں الگ
ہیں۔ اکھڑا ہوا درخت، یا اسی قسم کی دوسری کہانیاں۔
لیکن اس کہانی میں بھی تم نے اسی طرح کا ماحول بنایا ہے
زندہ اور اچھی کہانی کے لئے سنجیدہ موضوع کے علاوہ
آرٹ کی شگفتگی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہاری
کہانیوں میں زندگی تو ہے لیکن شگفتگی کی کمی ہے۔ موضوع
کے علاوہ آرٹ کی شگفتگی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔
تمہارے دل و جگر میں بس ان مجروحوں اور وحشت پسند
لہروں کو عام قاری کب تک پسند کرے گا۔ اور کیوں برداشت
کرے گا۔ ذرا اور کھلنے کی ضرورت ہے۔ دن رات کڑھتے
رہنا کہانی کے لئے چلتے رہنا کبھی نقصان دہ بھی ہوتا ہے
اسرار کو دیکھو ——— اور اسرار غسل خانے سے نکل
آئے ——— اسرار میں بہت ساری خوبیاں ہیں۔ تو
کچھ خرابیاں بھی ہیں۔ گفتگو کے ماحول کا اندازہ کئے بغیر
درمیان میں بول پڑنے اور پھر اپنی بات ختم کر کے دوسرے
کی جانب سے بے نیاز ہو جانے کی ادا خوب ہے۔ کبھی کبھی
تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔

ابھی ناشتہ میں دیر تھی۔ اس لئے ہم لوگ تازہ
دم ہو کر باہر نکل آئے۔ باہر بڑی اچھی فضا تھی۔ سامنے
پہاڑ گولائی کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ نیچے سبز وادیاں ہرے
رنگ کی بوچھار کر رہی تھیں۔ صاف ستھری سڑک پر ہم
چل پڑے۔ ایسی خوب صورت فضا صرف مجھ پر ہی نہیں
شفق پر بھی کام کر گئی۔ اور خاموش گم صم شفق نے لطیفے
شروع کر دیئے۔ ہم لوگ ہنستے رہے چلتے رہے۔ اور چلتے
چلتے نہ جانے کتنی دور نکل گئے۔ پھر لوٹ پڑے۔ واپسی پہ
تو کلام صاحب ناشتہ کی میز پر ہم لوگوں کا انتظار کر رہے
تھے۔ ہم لوگ اوپر پہونچے، سلام عرض کیا۔ اور ناشتہ کے
میز پر رکھی ہوئی گرم گرم پھولی ہوئی پوریوں کی اشتہا

خوشبوئیں ہمیں بے قابو کر دیا۔ اور ہم فوراً ناشتہ کرنے لگے۔
ناشتہ کے فوراً بعد عبدالصمد آ گئے۔ شاہد احمد شعیب صاحب
تشریف لے آئے۔ میں نے موقع اچھا دیکھا اور افسانے
پر گفتگو کی بات [illegible] کرنے لگا۔ عبدالصمد سے مشورہ کیا
سب سے درخواست کی۔ سب تیار ہو گئے۔ ہم لوگ نیچے
قالین پر بیٹھ گئے۔ گفتگو کی ابتدا کلام صاحب کے ذریعہ
ہوئی۔ اور ختم ہوئی اسرار گاندھی پر (گفتگو الگ
سے ترتیب دی گئی ہے) درمیان میں شعیب صاحب
کافی بول گئے۔ شعیب صاحب خاص ترقی پسند ہیں۔ کیونکہ
انہوں نے ترقی پسندی سے متعلق کافی وقت لے لیا حالانکہ
ہم بالکل ایک نئے موضوع پر بات کرنے بیٹھے تھے۔
دراصل اب ہمیں ترقی پسندی کے تناظر میں کچھ نئے
موضوعات کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ نئے مسائل
نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ یہ مسائل سماجی و معاشی
بھی ہیں اور ادبی بھی۔ درمیان میں ڈاکٹر حسنین صاحب
کا فون آ گیا۔ انہوں نے شام کی چائے پر بلایا تھا۔ سب
میرا منھ تکنے لگے۔ حسنین صاحب کی چائے کی دعوت ہماری
خوش نصیبی کی مستحکم دلیل تھی۔

ہم لوگ تیار ہو کر باہر نکل آئے۔ یہیں پر شفق ہم
سے الگ ہو گئے۔ شفق پچھلے تین چار دنوں سے ہمارے ساتھ
اور ہماری محبت اور ہماری خاطر میں اپنا سب کچھ برباد
کئے ہوئے تھے۔ ایک دوست نے ایک دوست کا دل جیت
لیا تھا۔ کچھ یادیں، محبت کے گہرے نقوش، ایسے رچ بس
گئے تھے۔ کہ نکالنا مشکل، بھولنا مشکل۔

بقیہ تبصرہ

ہیں۔ اس ناول میں ہمیں دو انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے
اور دونوں اپنی جگہ پر مکمل انسان ہیں۔ اچھائیوں اور
کمزوریوں کے مجموعے۔

ناول میں جو تین تصویریں دی گئی ہیں۔ وہ
ہاتھ سے بنائی ہوئی ہیں۔ اور ناول کی خصوصیات میں
کوئی اضافہ کا سبب نہیں بنتیں۔ مصنف نے پہلی
بات کے عنوان سے جو بات کہی ہیں وہ قابل قدر
ہونے کے ساتھ ساتھ قابل غور ہیں۔

۱۱۲ صفحات کے اس ناول کو کتاب دان لکھنؤ
نے شائع کیا ہے۔ چھپائی، کتابت، جلد بندی اور کاغذ
نفیس ہیں۔ قیمت ۳۰/ روپے۔

بقیہ سواد و صوت

دور تک جا پہنچے گی۔ میں اس بحث سے پرہیز کرتے ہوئے
صرف میں دو مضمون کا ذکر کروں گا وہ ہے ایک اسلام عشرت
کا اور دوسرا گوپی چند نارنگ کا۔ ڈاکٹر نارنگ کا مضمون تو
حسین الحق نے اچھا جواب دیا ہے۔ لیکن انہوں نے مضمون
کو غور سے نہیں پڑھا جس کے وجہ سے چند غلط باتیں لکھ گئے
ہیں اسلام عشرت نے اپنے مضمون پر محنت نہیں کیا ہے صرف
سرسری طور سے لکھ گئے ہیں۔ ہند و پاک کے افسانہ نگاروں
کا بھرپور جائزہ لینا چاہئے تھا۔

تین بنگلہ نظمیں

اسد چودھری

مختصر تعارف

اسد چودھری بنگلہ دیش
کے مقبول و ممتاز شاعر ہیں۔ ان
کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت
یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے چھوٹے
چھوٹے واقعات و حادثات کو
موضوعِ سخن بنایا ہے اور بنگالی
شاعری میں دوسرے ممتاز شاعروں
سے الگ اپنا ایک منفرد اسلوب
بیان رکھتے ہیں۔

اسد چودھری کی اب تک تین
شعری مجموعے، "دھن بھی نہیں،
دولت بھی نہیں"، "طبق دیا ہوا پان
اور سوال نہیں، جواب پہاڑ" منظر
عام پر آ چکے ہیں۔

ان دنوں وہ بنگلا اکاڈمی
ڈھاکہ سے وابستہ ہیں اور بنگلہ دیش
ٹیلیویژن ڈھاکہ میں ادبی پروگراموں
کے منتظم ہیں۔

بنگالی :- اسد چودھری

اردو :- احمد سعدی

جان پہچان

میں اسے پہچانتا ہوں
جانتا ہوں
اس کا قد کہ اس کی قامت، اس کی ذات،
منکشف ہر زاویئے سے، میری نظروں میں عیاں
ہر شکایت نافہم، گرچہ فہم سے بالاتر
پھر بھی اس کو سب سے زیادہ
جانتا ہوں

میں اسے پہچانتا ہوں
اس کی نیکی اور بدی
برہمی کہ عاجزی، اس کا غرور
جسم کا ہر زاویہ، ہر دائرہ
اس کی ہر اچھی بُری عادت سے واقف
ہر ادا سے آشنا
اس کے گھر کی ہر خبر سے باخبر ——
آگاہ ہر چھوٹی بڑی باتوں سے بھی ہوتے ہوئے۔
ایسا لگتا ہے مجھے
جیسے وہ ناآشنا اب تک رہا میرے لئے

(جانا بھائی)

بنگالی :- اسد چودھری

اب کے بہار کا موسم

اردو :- احمد سعدی

مجھے اک ہاف پینٹ اور ایک جوڑا سینڈل بھی مول لینا ہے
بڑی تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے کھیرا کا چارا
مچان اس کے لئے تیار کرنا ہے
کہ سیتبن دلو کی تتلی کو ــــــ
اپنے زرد پاؤں اس کے پھولوں پہ ہی رکھنا ہے ۔
کئی قطرے پسینے کے اگر کچھ کام نہ آئے ،
تو پھر حاصل کیا ہے موسم گل کا ؟

نہیں بازار میں اب سبزیوں کا نرخ بھی ارزاں
مٹر کی چھیمیاں بھی اور اس کے سبز دانے بھی ،
نظر سے ہو گئے اوجھل
ٹماٹر اونگھتا ہے ہات رکھے اپنے گالوں پہ
بڑی روشن، بڑی ہی خوب صورت چاندنی پھیلی ہے آنگن میں
میرے بچے کی کھانسی بڑھ گئی ہے اور اس کے کھانسنے کا شور سن کر ــــــ
نیند بھی مجھکو نہیں آتی ۔
میرا بچہ مسلسل چیختا ہے، کھانستا ہے ، اور روتا ہے
کبھی تو کھانستے ہی کھانستے قے کرنے لگتا ہے

(اے بوشونتو)

بھول جانے کی میری عادت ہے

بنگالی :- اسد چودھری

اردو :- احمد سعدی

حافظہ میرا بہت کمزور ہے
یاد کچھ رہتا نہیں
عہدِ طفلی میں اسی باعث مجھے تعویذ پہنایا گیا
پھر بھی ایک دن ڈاکٹر انعام الحق نے
اشتیاق آمیز لہجہ میں زبانی امتحان لیتے ہوئے
جب کیا مجھ سے سوال
مجھکو یاد آئی نہ کوئی نظم بھی ٹیگور کی
اپنی ہی تاریخ پیدائش نہیں اب مجھکو یاد
محو ہو جاتا ہے میرے ذہن سے
والد موصوف کا یوم وفات
دوستوں کی شادیوں کی کون سی تاریخ تھی
یاد کچھ آتا نہیں۔
شرح ادویات کہ بازار کے سودے کی فرد
یاد رہتا ہی نہیں لکھنا مجھے خط کا جواب
شعر ہو کوئی، کسی گانے کا بول
نام ہو فن کار کا
یا رسالہ کے ایڈیٹر کا پتہ
بھول جاتا ہوں جمع کرنا میں انکم ٹیکس کا ریٹرن بھی
حافظے کی اس خرابی کے سبب
کوئی معمولی سا بھی ریسیپٹ بجلی کا مجھے ملتا نہیں
تلخ افسردہ، ملول و سوگوار
چند تاریخیں فقط ایسی ہیں۔
جن کو آج تک بھولا نہیں۔
فرض کیجئے، جیسے میری زندگی کا یادگار
چشم گریہ، درد کی تصویر اک یوم بہار

(بھولے جائی)

وحید اختر

○

یا تو سمٹ کے آئے دہر میرے حصارِ ذات میں
یا تو برسنے دو مجھے عرصۂ شش جہات میں

کون ہے جو نہیں اسیر اپنے توہمات میں
علم گماں میں قید ہے، دین تعصبات میں

پردہ نشیں ہے حسن اگر اپنے تصورات میں
عشق بھی گوشہ گیر ہے دامِ تخیلات میں

کس کو خبر ہے کون کیا پردہ بہ پردہ ذات میں
عکس بدلتے رہتے ہیں آئینۂ صفات میں

کعبۂ دل کا اک خدا، وہ بھی نظر سے ماورا
لاکھوں بتانِ دل ربا آنکھوں کے سومنات میں

آتشِ شوق، چشمِ تر، سر میں ہوائے جستجو!
اور ہے جو بھی وہم ہے، خاک ہے کائنات میں

معنی کی چھوٹ اگر پڑے لفظ بھی آنکھ کھول دے
پہلو ہیں رنگ رنگ کے سادہ سی ایک بات میں

دن بھی نہ جائے رائیگاں سننے میں شب کی داستاں
خوابوں کا بھی ہو کچھ بیاں، گزری سو گزری رات میں

پاس جو تھے وہ دور ہیں ساتھ جو تھے وہ چھٹ گئے
بچھڑے سب اپنے آپ سے کشمکشِ حیات میں

آج بھی دشتِ کربلا ابر رواں ہے فیض کا! (ق)
اب بھی رواں ہے تشنگی پیچ و خمِ فرات میں

ہو گیا راکھ کب کا ظلم، جل کے خود اپنی آگ میں
جلتی ہے اب بھی شمعِ غم، ایک جلی قنات میں

لاکھ یزید ہوں تو ہوں ایک حسینؑ ہی کا دل!
اب بھی دھڑکتا ہے وحید سینۂ کائنات میں

شاہد کلیم

اندھیرے گھر میں کہیں آفتاب رکھ آئے
ہم اپنے سر سے اٹھا کر عذاب رکھ آئے

نہ کوئی رنگ ہے باقی نہ کوئی خوشبو ہے
بدن کا اپنے کہاں تم گلاب رکھ آئے

سلگتی شام سے منسوب تھے سوال بہت
نگارِ صبح کے لب پر جواب رکھ آئے

ہر ایک رات ہماری طرح ڈرو گے تم!
تمہاری آنکھوں میں ہم اپنے خواب رکھ آئے

ورق ورق ہمیں جب کوئی شخص پڑھ نہ سکا
اندھیرے طاق پہ اپنی کتاب رکھ آئے

جلا بجھا کے یہی شوق ہے ترا شاہد
چراغ تیرے لئے بے حساب رکھ آئے۔

○

منکشف ہوا مجھ پہ کچھ نہ تھا حجابوں میں
سارے شبد روشن تھے رات کی کتابوں میں

چاروں اور کمرے میں مچھلیوں کی بدبو ہے
ڈھونڈتے ہیں خوشبو ہم کاغذی گلابوں میں

چاندنی کا پیکر بھی بے سبب ہوا تقسیم
ان گنت سوالوں میں انگنت جوابوں میں

میں ہوا کا جھونکا تھا دشت میں پلٹ آیا
زور تھا بہت اس کے جسم کی طنابوں میں

تہہ میں آبشاروں کی پتھروں کے ریزے تھے
منہمک ہوائیں بھی زخم کے حسابوں میں

میں بھی چونک اٹھا تھا تو بھی کانپ اٹھا تھا
کوئی آ گیا تھا پھر تیرے میرے خوابوں میں

روشن پٹیالوی

○

ہو گیا اب چارہ ساز غم دماغ،
پا لیا ہم نے مسرت کا سراغ،
پا کے صہبائے مسرت کے ایاغ،
دامن دل سے اڑے حسرت کے داغ
دل میرا رشک گلستاں ہو گیا
مسکرائے جب تمناؤں کے داغ
جب ہماری آرزو بر آ گئی
عرش پر اڑنے لگا اپنا دماغ
حسن کی رنگینیوں میں کھو کے ہم
ہم نے پایا اپنی ہستی کا سراغ
اک غم عشق آپ نے بخشا ہمیں
سب غموں سے ہو گیا حاصل فراغ
آفتوں سے ہو گریزاں جسکا دل
زندگی کا پائے گا وہ کیا سراغ
جبت انکا نہ کا پھیلا ہے نور
مٹ گئے اوہام کے تاریک داغ
طے ہوئیں جب راہ کی دشواریاں
بن گیا گہوارہ عشرت دماغ
پائیں گے منزل نہ فرزانے کبھی
اس کا پا سکتے ہیں دیوانے سراغ
پھول الفت کے کھلے ہیں ہر طرف
دیکھ کر ان کو ہوا دل باغ باغ
مٹ گئیں نفرت کی سب تاریکیاں
جب ہوا روشن محبت کا چراغ

پرتپال سنگھ بیتاب

○

ٹیڑھی میڑھی سی رہگذر تنہا
اور جنگل میں اک کھنڈر تنہا
اب تو کرنا ہے سب سفر تنہا
جھیلنا ہیں یہ بحر و بر تنہا
رات جب شہر سے گذرتی ہے
کھلا ہوتا ہے ایک در تنہا
صرف دیکھو تو اک گھنا جنگل
اور سوچو تو ہر شجر تنہا
مجھ سے ملنے کوئی جب آتا ہے
مجھکو لگتا ہے اپنا گھر تنہا
کوئی سیلاب تھا قیامت کا
لب دریا تھا ایک گھر تنہا
پیڑ کو دیکھ کر جو آتا تھا
رہ گیا وہ پیامبر تنہا
چار سو رہگذار پھیلا ہے
بیچ بیتاب اک شجر تنہا

رئیس الدین رئیس

○

صحنِ تیرہ میں اجالوں کا خنجر تو ہوتا
منظر وہم سہی وقف نظر تو ہوتا

راہبر تجھکو میں تسلیم بھی کرتا لیکن
میری راہوں میں کوئی عکس سفر تو ہوتا

تم بھی سکتے ہے گناہوں کے کھنکتے گھنگرو
شب کے آنگن میں کبھی سحر تو ہوتا

طنز و تشنیع رقیباں سے نہ ڈرتا لیکن
اپنے احساس کے شعلوں سے مفر تو ہوتا

ہم تصور ہی کی شمعوں سے منور کرتے
لیکن اس وادی افلاس میں گھر تو ہوتا

اے رئیس اسکو دکھاتا دل ریزہ ریزہ
گنبد لفظ ملاقات میں در تو ہوتا

غلام حسین ساجد

○

تمام رات جاگنے کے بعد چاند سو گئے!
ستارہ ہائے وصل بھی کہیں غروب ہو گئے

میں اپنے گھر کے کھوج میں چراغ بیچتا رہا
مگر وہ تیرے شہر کی کسی گلی میں کھو گئے

تیرے دکھوں کے ابر بھی تیرے کرم کی مثل تھے
کسی گلاب پر جھکے نہ کوئی بات دھو گئے

طلوع مہر بھی نہ تھا کہ زرد اوس کھل اٹھی
کسی کی یاد بھی نہ تھی کہ ہم اداس ہو گئے

یہ مانتا ہوں میں نے پیار میں شکست کھائی ہے
مگر وہ رزم عشق سے کسی کے ساتھ تو گئے

خبر نہیں وہ آئیں بھی تو کب پلٹ کے آسکیں
ابھی جو ابر شہر کی گلی گلی میں رو گئے

یقیں نہیں میں کھینچ لوں گا کیف خواب سے انہیں
اگر وہ میری گفتگو کے درمیاں سو گئے

اکرام الحق اورنگ
(بنگلہ دیش)

○

خود اپنے ذات کی جن کو انا پسند نہیں
مجھے وہ اہل خلوص و وفا پسند نہیں

میں آسمان کے حسن کرم کی بات کروں
سلوک اہل زمیں کا بھی ناپسند نہیں

برا لگے ہے شب ماہتاب میں بادل
کڑی ہو دھوپ تو کس کو گھٹا پسند نہیں

کریں گے پھر یہ شگوفے برابری گل کی
مجھے چمن میں خرام صبا پسند نہیں

نہ جانے سلسلہ محدود ہے یہ ہو کس کا،
جفا سے کم تو وفا انتہا پسند نہیں

اس احتساب میں ہم کوئی عزم کر نہ سکے
انہیں پسند ہے کیا اور کیا پسند نہیں

تیرے سلوک سے صحرا میں جا بسے ہم بھی
نہیں تو شہر کی کس کو ہوا پسند نہیں

یہ ایک تضاد ہوں اورنگ خاکساری میں
مرے نیاز کو جھکنا ذرا پسند نہیں

شہپر رسول

○

منافقت کے گھروں میں آئے ہوائے تازہ
روایتی محوروں میں آئے ہوائے تازہ

محبت اخلاص کی سپاہوں سے جنگ جیتے
نفاق کے لشکروں میں آئے ہوائے تازہ

میں اپنی پرواز بھول بیٹھوں اگر اسی سے
غنیم کے شہپروں میں آئے ہوائے تازہ

کھنڈر میں مدت سے رہنے والے بھی منتظر ہیں
کبھی تو ان بے گھروں میں آئے ہوائے تازہ

انہیں حصار انا سے اب تو رہائی دیدے
خدا میرے خود سروں میں آئے ہوائے تازہ

شگفتہ ہو جائے گرد آلود دیل پھر سے
کبھی تو اس کے دروں میں آئے ہوائے تازہ

مرے عزیزوں کے شعر بھی ہوں عظیم شہپر
خیال کے منظروں میں آئے ہوائے تازہ

تبصرہ

ناول — ملار
مصنف — حیات اللہ انصاری
ناشر — کتاب دان ۔۔۔ ۳/۴ بی ریور بینک کالونی لکھنؤ
قیمت — ۲۰ روپے
صفحات — ۱۱۲
مبصر — عبدالصمد

حیات اللہ انصاری اردو کے کہنہ مشق افسانہ نگاروں میں ہیں۔ انہوں نے "لہو کے پھول" جیسا تاریخ ساز ناول لکھ کر اردو ناول کی دنیا میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے۔ انصاری صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کا قلم کبھی نہیں تھکتا آج بھی ان کے وہ افسانے منظر عام پر آتے رہتے ہیں جن میں عصر جدید کی روح دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے انہیں کل کا افسانہ نگار کہہ کر پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ ابھی ان کا تازہ ناول "ملار" آیا تو ایک حیرت انگیز خوشی سی ہوئی۔ اور ناول پڑھ کر تو جو کیفیت ہوئی اسے لفظوں میں بیان کرنا آسان نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے اس ناول کے لئے انصاری صاحب نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ ایک ایسا اچھوتا موضوع ہے جس پر عام نگاہیں پڑنا آسان نہیں تھا۔ اردو تحریک کے سلسلے میں انصاری صاحب کا جو رول رہا ہے اس کے پیش نظر یہ کہنے سے گریز نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے ناول کے لئے اس موضوع کا انتخاب کرنا حیات اللہ انصاری ہی کا حق تھا۔

ناول بہت ہی سادہ اور سیدھی سادی زبان میں لکھا گیا ہے جو انصاری صاحب کے فن کا خاصہ ہے سلیس اور ایسی زبان جسے آسانی سے ہندی میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور جو صحیح معنوں میں ہندوستانی کہے جانے کی مستحق ہے
ہندوستانی فوج کا ایک آفیسر بہت سی مشکلات کو پار کرتا ہوا ایک ضروری کام سے تبت پہونچتا ہے تو ایک مشتری کے ذریعہ وہ ایک ایسی لڑکی سے متعارف ہوتا ہے جو اس کے لئے مترجم کا کام کرتی ہے۔ تبت سے سینکڑوں میل دور ایک پہاڑی گاؤں کی رہنے والی یہ لڑکی بچپن میں ڈاکوؤں کے ذریعہ اغوا ہو کر یہاں آتی ہے۔ اور ہر طرح کے ذہنی، جسمانی، اور روحانی استحصال میں اپنا بچپن اور جوانی گزار کر راضی بہ رضا ہو جاتی ہے۔ اور تاریک مستقبل کی طرف بڑھتے ہوئے زندگی کے بقیہ دن گزار رہی ہے۔ لیکن ہندوستانی آفیسر سے مل کر اس کا جذبہ وطنیت عود کر آتا ہے۔ اور وہ آفیسر کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ واپس لے چلے، اور اسے ایک بار اپنا وطن دکھا دے۔ اس کے بدلے میں وہ زندگی بھر اس کے ساتھ اس کی داشتہ کے طور پر رہنے کو تیار ہے۔ آفیسر کمینہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اس کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ اسے کچھ دنوں تک تو وہ داشتہ کے طور پر رکھے گا۔ لیکن پھر

حالات کے درست ہو جانے پر باقاعدہ بیوی بنائے گا۔ مگر وہ یہ بات لڑکی پر ظاہر نہیں کرتا۔
ان کی واپسی کا سفر خاصا دلچسپ ہے۔ انہیں بہت سے نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لڑکی آفیسر کے ساتھ حالات کا دلیری سے مقابلہ کرتی ہے۔ یہ حالات دونوں کو مزید قریب کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں جسمانی طور پر ایک ہو جاتے ہیں۔
لڑکی جیسے جیسے اپنے وطن سے قریب ہوتی جاتی ہے اس کا بچپنا لوٹ کر آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ پھولوں کو، چڑیوں کو، اور پہاڑوں کو دیکھ کر ایک عجیب کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بچپن میں سُنے ہوئے اس کے وہ گیت جو اس کی زبان میں ہوتے ہیں اسے یاد آتے جاتے ہیں، اپنے گاؤں کی رسمیں، رہن سہن، اور وہاں کے صبح و شام اسے یاد آتے جاتے ہیں۔ وہ آفیسر سے جب اپنے استحصال کی کہانی بیان کرتی ہے۔ تو اس وقت اسے وہ زبان یاد نہیں آتی جس زبان میں وہ آفیسر سے ہمکلام ہوتی ہے۔ بلکہ اس وقت اس کی زبان سے ایسے الفاظ نکلتے ہیں جو آفیسر کی سمجھ میں نہیں آتے دراصل یہ اس کی مادری زبان ہے۔
گاؤں کے قریب پڑاؤ ڈال کر وہ آفیسر سے ایک دن کی رخصت لے کر نیچے اپنے گاؤں جاتی ہے۔ تو پھر اپنے وعدے کے مطابق لوٹ کر نہیں آتی۔ آفیسر اس کی یاد میں تڑپتا ہے۔ بے چین ہوتا ہے اور مجبور ہو کر وہ خود گاؤں میں جاتا ہے تو وہ لڑکی کو اپنے تہذیبی لباس میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے ساتھ دیکھتا ہے۔ لڑکی اس سے بے رُخی برتتی ہے۔ لیکن پھر ملنے کا وعدہ کرتی ہے۔
وعدہ کے مطابق لڑکی اس سے ملنے آتی ہے تو بتاتی ہے کہ کس طرح وہ اپنے گھر گئی اور وہاں اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں پاکر کتنی مایوس ہوئی۔ اس کی ملاقات اسی گھر میں اس ادھیڑ عمر شخص سے ہوئی جو اس کی زبان سمجھتا اور بولتا ہے۔ لڑکی اس سے اپنی بپتا بیان کرتی ہے۔ تو وہ اسے اس کی زبان میں دلاسہ دیتا ہے۔ ———— یہ کام آفیسر نہیں کر سکا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی زبان سے ناواقف تھا۔ لڑکی دوراہے پر کھڑی ہے۔ اسے دو چاہنے والے ہیں۔ ایک کے پاس جوانی اور دولت ہے۔ مگر زبان نہیں۔ دوسرے کے پاس زبان ہے مگر جوانی اور دولت نہیں کش مکش کے ایک جہنم سے گزر کر لڑکی کا فیصلہ زبان کے حق میں ہوتا ہے اور وہ آفیسر کو چھوڑ کر ادھیڑ عمر کے ساتھ چلی جاتی ہے۔
حیات اللہ انصاری نے اپنے اس ناول میں ایک ایسی کہانی بیان کی ہے جو بہت ہی فطری انداز میں آگے بڑھتی ہے اور بہت ہی فنکارانہ انداز میں ختم ہوتی ہے۔ کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مصنف کہانی پر سوار ہو کر اسے اپنی مرضی کے مطابق جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ انصاری صاحب کے اس ناول میں ایک بے پناہ بہاؤ ہے۔ جو کہانی کو تو اپنے ساتھ بہا کر لے ہی جاتا ہے۔ قاری کو بھی نہیں چھوڑتا۔ مادری زبان کو موضوع بنا کر انصاری صاحب نے ہندستان پر ایک احسان کیا ہے۔
کہانی میں بنیادی طور پر دو ہی کردار ہیں۔ اور دونوں کردار اپنی جگہ پر بہت ہی مضبوط ہیں۔ ان کی تصویر کشی میں مصنف نے کہیں بھی بے ایمانی سے کام نہیں لیا ہے۔ ایک انسان میں جہاں اچھائیاں ہوتی ہیں وہیں کچھ کمزوریاں بھی ہوتی

بقیہ برصفحہ

قارئین

سواد وصوت

فرحت نواز ـــــــ مہاراشٹر

برادر محترم ! السلام علیکم

آہنگ آپ اپنی مہربانی سے بشیر نواز کے پاس بھجواتے ہیں ۔ پڑھتا رہتا ہوں ۔ دسمبر کے شمارے میں طارق سعید کا مضمون چونکانے والا ہے ۔ مضمون پڑھکر احساس ہوا کہ اردو میں بھی محنت اور خلوص سے فکشن پہ لکھنے والے موجود ہیں ۔ ان سے اور بھی مضامین لکھوا لیجئے ۔ ان کا یہ مضمون پڑھکر جو خوشی ہوئی اس کا بیان ممکن نہیں اس بار افسانے سبھی اچھے ہیں ۔ لیکن مجھے سید محمد اشرف کا افسانہ بہت پسند آیا ۔

شہپر رسول ـــــــ علی گڑھ

محترمی کلام حیدری صاحب ! آداب خلوص

نیا سال مبارک ہو ۔

آہنگ ملا ، غزل کی اشاعت کے لئے شکریہ ! ۔

آہنگ کی اس قدیمی رنگ و آہنگ میں واپسی مبارک ہو ادارت کی تعلق سے رفقا کی تلاش بھی خوب ہے زیر نظر شمارہ بھی اپنی دیرینہ روایت کا پاس رکھتے ہوئے ترتیب و تہذیب میں توازن اور ایک منفرد مزاج و معیار رکھتا ہے ۔

اداریہ پڑھا ۔ آپ نے WSI TRIS NEW YERS DAY خوب منایا ہے ۔ قطعی جدید طور پہ اس ایجاد کے لئے بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔

حمید الماس ـــــــ بنگلور

گرامی قدر برادر مکرم ! تسلیمات

آہنگ کا تازہ شمارہ ملا ۔ حسب عادت رسالہ کھولتے ہی میں نے آپ کی تحریر پڑھی ۔ میں سب سے پہلے آپ کو اس لئے پڑھتا ہوں کہ آپ کا ہر جملہ حسن و فکر کے تابع ہوتا ہے ۔ اور قاری کو بھی غور و فکر پر اکساتا ہے اور آپ دوسروں کی طرح قاری کو پابند نہیں کرتے آپ نے دیت ریت لفظ پر یہ جملہ لکھ کر تبصرہ ختم کر دیا کہ حمید سہروردی کے افسانے کو اشتیاق کے علاوہ احتیاط سے پڑھنا چاہئے ۔ مگر احتیاط کے لفظ قاری کو چپ نہ رہنے دیں گے ۔

تابش اکرم ـــــــ کراچی

محترمی ! تسلیم

آہنگ کا فکشن نمبر دستیاب ہوا ۔ شکریہ !

پاکستان سے کئی رسالوں نے افسانہ نمبر نکالا ہے لیکن جو خصوصیت آہنگ کے فکشن نمبر میں ہے وہ کسی میں نہیں ہے ۔ افسانے سبھی اچھے اور معیاری ہیں ۔ کئی مضمون بحث طلب ہیں ۔ اگر کسی مضمون پر بحث چھڑ جائے تو بہت

بقیہ بر صفحہ

R. N. Regd. 4253/64
P. T. Regd. No. Gy. 7
Phone — 432

THE Aahang URDU MONTHLY
BAIRAGI, GAYA

Price : Rs. 2/-

March, 1982

دائیں سے بائیں
مہمان خصوصی
مولانا آزاد کالج رانچی
تقریبات مولانا آزاد

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴۵ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

ایک سال کیلئے ، ——— چوبیس روپئے
فی کاپی ——— دو روپئے

فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹر

نوشابہ حق

رفقائے ایڈیٹرز

شفق ، عبد الصمد

محتویات

کشکول

نیا شمارہ قارئین کی نذر ہے

خدا کا شکر ہے کہ ہم نمبر کے چکر سے نکل آئے ہیں اور آہنگ پوری پابندی کے ساتھ ہر ماہ شائع کر رہے ہیں یہ بھی رب العزت کا کرم ہے کہ ہم صوری اعتبار سے بھی اسے بہتر بنا سکے ہیں "**دی کلچرل اکیڈمی**" مورچہ اور آہنگ سے براہ راست منسلک افراد کی خوش نیتی اور محنت کا ثمر ہے کہ یہ ادارہ اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ ادب و زبان کے لئے کام کر رہا ہے۔ مخصوص رفتار سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم نے ہر قدم سوچ کر اٹھایا اور مستحکم طور پر اٹھایا۔ اگر آہنگ کی برسہا برس کی تاریخ پیش نظر ہو تو یہ جاننا آسان ہو گا کہ "آہنگ" نے بہت سے طوفان سہے ہیں۔ مثلاً کہا گیا:

آہنگ کا کوئی مزاج (ابتدائی شماروں کے بعد) نہیں بن سکا ہے۔

آہنگ جدیدیت کا مخالف ہے

آہنگ ترقی پسند مصنفین کا مخالف ہے

اور یہ باتیں ذاتی خطوط میں زیادہ کہی گئیں۔ کہیں کہیں تبصروں میں بھی کہی گئیں۔ کہنے والوں کے تبصرہ کرنے یہاں تک کہ ریمارک کرنے کو بھی ہم نے ان کا حق تسلیم کیا۔ اور ہم آہنگ کا مزاج بنانے کی بجائے ادب میں گھس بیٹھوں کی "مزاج پرسی" بھی کرتے رہے۔ اور اپنے قارئین

کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اپنے مزاج کے مطابق چلتے بھی رہے۔

یہ مستقبل کا محقق اور ناقد اور ادب کی تاریخ لکھنے والا بتائے گا کہ "آہنگ" گیا سے نکل کر کہاں کہاں پہونچا، اور کہاں کہاں مقبول و معروف و مفید ہوا۔

حسد کرنے والے ہر زمانے میں ہوتے ہیں ہم انہیں معاف کرتے ہیں۔

رشک کرنے والوں کو ہم دوست سمجھتے ہیں

دوستوں کو ہم رگِ جاں مانتے ہیں

اور خدا کو عزت و ناموس عطا کرنے والا۔

اسی لئے بے خطر چلتے ہیں۔ مگر تمیز اور وضع داری کے ساتھ چلتے ہیں۔ ہمیں سفر مکمل کرنا ہے۔ راستے میں اچھل کود کر بھیڑ جمع کر کے "مشہور" نہیں ہونا ہے۔ نہ تو اپنے آپ کو دہرانا ہے۔ اور ایک جگہ پر رک کر قطب صاحب کی لاٹ بننا ہے۔

ہم تو آبِ رواں ہیں!

۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک کے ہندوستانی اور پاکستانی افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب **ارتقاء** کے نام سے تیار ہے —— اور جس طرح بعض لوگوں کو نام پر جان دینے کی خواہش ستاتی ہے۔ اسی طرح بعض کو یہ نام جو ہم نے آج سے پندرہ سال پہلے اپنے ماہنامے کا تجویز کیا تھا۔ اور جیسے سبھی جانتے ہیں بڑا اچھا لگا اور لغت میں کوئی دوسرا نام نہیں مل سکا۔ تو انہوں نے بھی یہی نام اختیار کر لیا —— یہ ہے ارتقاء کی پہلی کامیابی اور مقبولیت اور پسندیدگی کا ثبوت!

آخر میں ہمیں قارئین سے عرض کرنا ہے کہ ہر شہر میں آہنگ کی ایجنسی کے لئے کوشاں ہوں تاکہ ان کو وہاں سے پرچہ آسانی کے ساتھ بغیر یک مشت زیادہ روپیہ خرچ کئے مل جایا کرے۔

ایک اہم سوال

سوال : کیا اُردو زبان و ادب کو شاعروں، افسانہ نگاروں سے زیادہ اخبار بینوں اور اخبار نویسوں کی ضرورت ہے ------؟

• عبدالقوی دسنوی
• (ڈاکٹر) محمد محسن

برادرِ عزیز، سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کے دل میں یا آپ کے ادارے کے متعلقین کے ذہن میں یہ سوال کیوں پیدا ہوا کہ زبان و ادب کو شاعروں اور افسانہ نگاروں سے زیادہ اخبار بینوں اور اخبار نویسوں کی ضرورت ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے تو کچھ اس طرح محسوس ہوا جیسے کوئی پوچھے کہ انسان کو کیا پیر سے زیادہ ہاتھ کی ضرورت ہے؟ یا کیا دنیا کو رات سے زیادہ دن کی ضرورت ہے؟ کسی خاص وقت میں ممکن ہے کہ پاؤں کی زیادہ اہمیت ہو یا رات کے بجائے کسی خاص کام کے لیے دن کا انتظار کرنا پڑے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان کو کسی پر فوقیت ہے۔ اسی طرح زبان و ادب کو شاعر اور افسانہ نگار کے مقابلہ میں اخبار نویسوں اور اخبار بینوں کی کیوں زیادہ ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخبار نویسی یعنی صحافت کی آج اس لیے ضرورت ہے کہ عوام کو اس سے آج کی سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی اور مذہبی زندگی گزارنے میں رہنمائی ملتی ہے۔ اخبار نویس اگر معتبر ہو تو اس کی ساری تگ و دو ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے مخصوص رہتی ہے۔ وہ صحیح حالات سے آگاہ کرتا ہے، خطروں سے باخبر کرتا ہے، نقصانات کی تلافی کرانے کی کوشش کرتا ہے، کمزوروں کا ساتھ دیتا ہے۔ مظلوم کی آواز ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اتنے ذمّہ دار اور بے باک صحافی کتنے ہیں جو سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر ہمیشہ ملک و قوم کے وفادار رہیں، اور ہر حال میں انسانیت کی خدمت اپنا نصب العین سمجھتے رہیں اور حق و انصاف کو دنیا کی بہترین نعمت تصور کریں، جس طرح آئے دن زندگی میں افراد حقائق سے گریز کرکے مصلحتوں کو اپناتے ہیں اور اپنا کام چلاتے ہیں، تاکہ سود و زیاں کی کشمکش میں نفع کو نقصان نہ پہنچے۔ اسی طرح عام حالات میں ہمارے اخبار نویس مصلحتوں اور حالات کے کسی نہ کسی طرح شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ورنہ ایک ہی بات کو اخبار نویسوں کی ایک جماعت اچھی اور مفید بتاتی ہے اور دوسری جماعت ضرر رساں ثابت کرتی ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ حصولِ مقاصد کا فرق ہے، نظریۂ فکر کا تضاد ہے، وابستگی کے نتائج ہیں ------

ابھی چند روز ہوئے حسن کمال (اُردو بلٹز) شعبۂ اُردو کی دعوت پر سیفیہ کالج تشریف لائے تھے۔ جہاں

ن کمال کے ساتھ "ایک صبح" کی تقریب میں انھوں نے
لیا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ بعض اوقات اخبار
، حالات سے اس قدر مجبور ہو جاتے ہیں کہ سچائی اور حق کا
دینے سے گریز کرتے ہیں، اس کا اظہار انھوں نے نہایت
ں کے ساتھ کیا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ بعض اخبارات چاہے
نہ ہوں یا ہفتہ وار کو اگر حسن کمال کے خیالات کی روشنی
دیکھیے گا تو ان کی بات سچ نظر آئے گی، اکثر بڑا اخبارات
نہ کسی مجبوری کے تحت وہ نہیں کہتے جو انھیں کہنا چاہیے، جب
نویسوں کا یہ حال ہے تو پھر "اخبار بینی" ممکن ہے اخبار
وں کے لیے مفید ہو، لیکن اخبار بینوں کو زیادہ فائدہ پہنچتا نظر
ں آتا اگر وہ اخبار نویس کے ہم عقیدہ اور ہم خیال نہیں ہیں۔
س لیے مجموعی طور سے ہم اتفاق کریں گے کہ ان حالات میں
ری صحافت ہمارے لیے اس قدر مفید نہیں رہی ہے جتنی کہ
ے ہونا چاہیے تھی۔

جہاں تک شاعری اور افسانوں کا تعلق ہے یہ بھی زندگی
تعمیر میں اہم فرائض انجام دیتے ہیں اگر ان کے خالق صالح احساسا
ت جذبات اور بامقصد حیات کے علمبردار ہوں۔ یہ اصناف
ب کے حدود میں رہ کر زندگی کی حقیقتوں اور تقاضوں سے
گاہ کرتے ہیں اور ایک خوب صورت، بامقصد اور بہتر
ندگی گزارنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ اور اس کے حصول کے لیے
استے ہموار کرتے ہیں۔ میں محض ادب برائے ادب کا قائل
ہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب برائے ادب بے معنی بات ہے
ادب ہر حال میں حیات و کائنات، انسانی فکر و رجحان، اس
ں پسند ناپسند کا ترجمان ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ممکن ہے کہ
س میں سے ایک گروہ اختلاف کرے اور دوسرا اسے پسند کی نگاہ
سے دیکھے ایک کو اس سے فائدہ پہنچے اور دوسرا فیض نہ اٹھا سکے۔

اس لیے میری رائے میں اخبار بینوں اور اخبار نویسوں
کو شاعروں اور افسانہ نگاروں کے مقابلہ میں کوئی خاص
اہمیت حاصل نہیں ہے۔ نہ ہی شاعروں اور افسانہ نگاروں کو
دوسرے پر ضرورت کے لحاظ سے فضیلت ہے۔

اگر آپ کا سوال یہ ہے کہ آج اردو زبان و ادب
کی ترقی میں اخبار بینی اور اخبار نویسی کی اہمیت زیادہ ہے،
اس لیے اس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ لوگ اردو پڑھتے ہیں
ان میں اردو پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا ہوتا ہے، صلاحیت
پیدا ہوتی ہے انھیں اردو کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ
ہوتا ہے، اس کے مسائل سے آگاہی ہوتی ہے، اس کے ساتھ
غیر منصفانہ سلوک کا علم ہوتا ہے۔ انھیں اردو کے خلاف
سازشوں سے آگاہی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ وہ اس سے
بھی باخبر ہوتے ہیں کہ اردو والے اس زبان کے لیے کیا کچھ کر رہے
ہیں اور اپنی کوشش میں کتنی کامیابی حاصل کر چکے ہیں اور
ابھی کیا کیا کرنا باقی ہے، جس سے اس زبان کا مستقبل روشن
سے روشن تر بن سکے۔ اس کے ذریعہ اردو کو اجتماعی قوت ملنے
میں آسانی ہوئی ہے اس کے ذریعہ اردو طاقتور آواز بن کر
سامنے آئی ہے اور اپنے حقوق منوانے کے راستے پر چل نکلی
ہے۔ تو بھی میں کہوں گا کہ اس کے باوجود اردو شاعری اور
افسانہ کو اردو کی ترقی اور فروغ میں بڑی اہمیت حاصل ہے
شاعری اور افسانے تو ادب کے چہرے پر چشم و بینی کی حیثیت
رکھتے ہیں، جو ادب کے چہرے کو خوب صورت بھی بناتے ہیں،
اور ان کی مدد سے زندگی کی حقیقتوں کو پیش کرنے میں کامیابی
بھی حاصل کرتے ہیں اور بہتر زندگی کے لیے رہنمائی بھی کرتے ہیں۔

آپ کے سوال کو میں جس حد تک سمجھ سکا ہوں اس کا
جواب میرے خیال کے مطابق اسی قدر دیا جا سکتا ہے۔ کچھ اور
چاہتے ہیں تو از راہ کرم وضاحت فرمائیے تاکہ نئے سرے سے غور
کروں۔

عبدالقوی دسنوی

جواب: آپ کا یہ سوال نہایت برمحل ہے۔ آج ہندوستان میں نئی نئی اردو اکیڈمیاں کھولی جا رہی ہیں۔ لیکن ان اکیڈمیوں نے علاوہ شاعروں اور دوسرے ادیبوں کو انعام و اکرام سے نوازنے اور علمی مجلسیں اور سمینار منعقد کرنے کے، شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت، یا ان کی اشاعت میں معاونت کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے اور جو تخلیقات اس طرح شائع ہو رہی ہیں ان میں اکثریت افسانوں اور شعری مجموعوں کی ہے۔ اردو کو عوام کے قریب لانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ آج اردو انھیں لوگوں کی دلچسپی کا سامان رہ گئی ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے لیے اردو محض فرصت کے اوقات گزارنے کا وسیلہ ہے۔ اردو کتابیں ان کی ذہنی تربیت یا وسعت علم کا ذریعہ نہیں ہیں۔ اس لیے کہ موجودہ تعلیم سے آراستہ ہونے کی وجہ سے انھیں اس کی حاجت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں علمی کتابیں سوائے تنقید اور تحقیق کی کتابوں کے جن کو یونیورسٹی کے طلبا کو ولے بر ندش خریدار بننا پڑتا ہے، اپنی قدر و قیمت عام اردو داں طبقے کی نگاہ میں کھوتی جا رہی ہیں۔ اور آج اردو کا نیا سرمایہ محض افسانوں اور شعری مجموعوں تک محدود ہے۔ اردو کو عوام کے قریب لانے، انسان کی ذہنی ترقی و تربیت، معلومات میں اضافہ، ماحول سے باخبری اور ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں اپنی ثقافتی اور اقتصادی پسپتی کا احساس، ان ساری باتوں کے لیے اخبار نویسوں کی ضرورت ہے،

ایسے اخبار نویس جنھیں صرف اپنے حلوے مانڈے کی فکر نہ ہو، جن کے اندر عام اردو داں طبقے سے ہمدردی کا جذبہ کروٹیں لیتا رہتا ہو، جنھیں ان کی بہبود کی فکر دامن گیر ہو۔ مختصراً جن کی اخبار نویسی ایک اعلیٰ مقصد کی پابند ہو۔ لیکن اخبار نویسوں کے ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل جب ہی ہو سکتی ہے، جب اردو اخبار بینوں کی روز افزوں گھٹتی ہوئی تعداد میں صرف روک لگانے کا سامان نہ کر لیا جائے بلکہ ان کی تعداد بڑھانے کا وسیلہ بھی مہیا کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ طبقہ جس کی بول چال کی زبان اردو ہوتے ہوئے بھی اردو پڑھنے لکھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی اردو کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے۔ ہماری اردو اکیڈمیاں اور اردو کے نام سے وابستہ دوسرے ادارے اپنے اس فرض سے غافل ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں آپ کے سوال کا جواب اثبات میں ہونا چاہیے۔ یعنی اردو زبان و ادب کے لیے شاعروں اور افسانہ نگاروں سے زیادہ اخبار نویسوں اور اخبار بینوں کی ضرورت ہے۔ آپ شاید کہیں گے کہ اردو زبان کے معاملے میں میرا یہ جواب قابلِ قبول ہو بھی سکتا ہو لیکن اردو ادب کی ترقی اخباروں کے ذریعے تو نہیں ہو سکتی۔ اخبار کی زبان ادبی نہیں ہوتی۔ اور نہ اخبار میں عام طور پر ادبی مضامین کو شامل کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن جب لوگ اردو زبان سے ناآشنا ہو کر غیر اردو زبانوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں گے تو پھر اردو میں ادبی اور علمی کتابوں اور مضامین کے قاری ہمیں کہاں سے میسر ہوں گے؟ تب تو ہر نئی ادبی تخلیق زیورِ اشاعت نہ ہو کر محض قلمی مسودوں کی صورت میں فن کار کی موت کے بعد پنساری کی دکان کی زینت بن کر رہ جائے گی، اور اس کے منتشر اوراق پرزوں کی شکل میں قاری کی نگاہوں کو اشکبار کریں گے۔ اس وقت اردو اس عہد پارینہ میں پہنچ جائے گی جب چھاپہ خانوں کا

...ودنہیں ہوا تھا۔ اخبار جن اگر باقی رہیں گے تو انھیں میں جن
...ردو کا چسکا لگ جائے گا اور جن کی فطری صلاحیتیں اس
...ہم ترکتاب ہوں گی وہ ادبی تخلیقات کی طرف بھی رجوع
...ں گے اور ان کی بدولت ادبی تخلیقات کی مانگ میں
...اضافہ ہوتا رہے گا۔
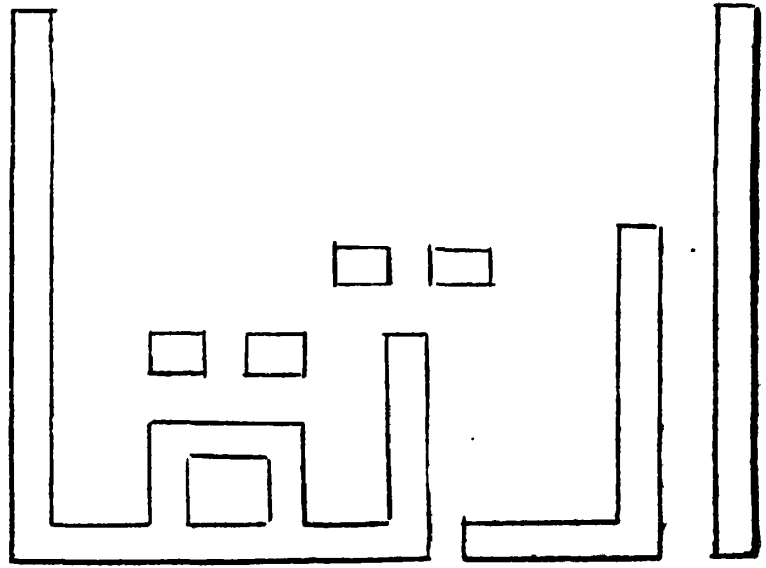
جواب کچھ زیادہ طویل ہوگیا۔ بہرحال چونکہ آپ نے ایک ایسا سوال اُٹھایا ہے جس پر پوری توجہ دینے کی ضرورت تھی اس لیے میں اختصار سے کام نہ لے سکا۔

مخلص

(ڈاکٹر) محمد محسن

ڈاکٹر سید حامد حسین

نثری پیرایہ اور اظہار کے عصری امکانات

آج ہم ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہیں جس میں ایک غیر آراستہ، بے حجاب، راست اور آزاد پیرایۂ اظہار ہماری ذہنی اور فکری ضرورت ہے اور اس کے نتیجے میں ہمیں یہ مان لینے میں دشواری نہیں ہونی چاہیئے کہ ہمارا عہد، نثر کا عہد ہے۔ ہمارا عہد صحافت اور ڈاکومینٹیشن (DOCUMENTATION) کا، مسودۂ قوانین (BILLS) اور چارٹرس کا، علمی معروضیت اور اظہاری جامعیت کا عہد ہے۔ مقناطیسی ٹیپ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی پرنٹر اور کمپیوٹر کے اس عہد میں اظہار کے ایسے سانچے وضع ہوئے ہیں جو حقیقتِ حال کی راست اور جامع ترسیل میں معاون ہوں اور جن کی ہمارے ذہن پر فوری اور کاری گرفت ہو۔ اس عہد کے فکری اور ثقافتی مقتضیات کو سمجھ کر اپنے پیرایۂ اظہار کو زیادہ کارگر انداز سے استعمال کرنا ہمارے لیے مفید بھی ہوگا اور ہم کو غلط بحث سے پیدا ہونے والے غیر ضروری کنفیوژن سے نجات حاصل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

فنِ تحریر، کاغذ اور پریس کی ایجاد سے قبل نظم (VERSE) کے پیرایے کو اس وجہ سے فوقیت حاصل تھی کہ وہ تجربہ و احساس کی ترسیل معاون ثابت ہوتا تھا — منظوم پیرایہ اپنے آہنگ و لَے، صوتی فضا اور تکرار و تواتر کے تاثر کی مدد سے حافظے کو سہولت بہم پہونچاتا تھا اور خیال و خبر کی زبانی ترسیل کی راہ میں حائل ہونے والی زمانی اور مکانی رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے ایک اہم وسیلہ مہیا کرتا تھا۔ منظوم بیانات کے لیے لوگوں کی یادداشت میں محفوظ رہ کر ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچنے کے امکانات تھے۔ پریس کی آمد تک تاریخی صورتِ حال ایسی تھی کہ منظوم پیرایے کو بالادستی حاصل رہی اور شعر کی شکل میں انسان کے تخلیقی اظہار کو محفوظ رہنے کا موقع حاصل ہوا۔

یہاں نظم (VERSE) اور شعر (POETRY) کا فرق سمجھ لینا ضروری ہے۔ نظم ایک قسم کا صوتی و صوری نظام ہے جسے بنیادی طور پر ادائیگی کی سہولت اور یادداشت کو مدد پہونچانے کی غرض سے وضع کیا گیا۔ شعر سے ہم نظم کا ایک ایسا مخصوص انداز مراد لے سکتے ہیں جس میں ایک خاص داخلی معنویت رکھنے والا مواد پیش کیا گیا ہو۔ شعر محض متوازن اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں تاثرات و کیفیات کی مؤثر پیش کش، تخیل کی دلفریب کارفرمائی اور فکر و جذبے کو گرفت میں لینے کی اہلیت بھی ہوتی ہے۔ شعر کی شناخت اس معنوی اور تاثراتی ارتکاز سے مرتب ہوتی ہے جو فکر و احساس کے جزوی تاثرات کو اپنی بلیغ ایمائیت کے ذریعے ایک معنوی افق تیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ شعر نے اس طرح نظم کے پیرایے میں اپنی اظہاری سطحوں اور سمتوں کے مطابق مناسب ترتیب اور گوشے پیدا کیے ہیں اور اس کے نتیجے میں نظم کے پیرایے کو ایک

یت ثقافتی اعتبار حاصل ہوا کہ اظہاری تاریخ میں کافی
رصے تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نظم کی بلا شرکتِ غیرے مکمل
کمرانی ہے۔

لیکن یہ تاریخی صورتِ حال اب بدل چکی ہے اور
س کی ضرورت ہے کہ عصری پس منظر میں نثری اور شعری
ثالیات کو طے کرنے کی کوشش کی جائے۔ حقیقتِ حال
ہے کہ جب نظم کے پیرایے کو اعتبار حاصل تھا اس
قت اظہار کو منظوم پیرایے کے تلازمات سے آزاد
یکھنا مشکل ہو گیا تھا اور منظوم جغرافیہ اور منظوم قواعد
ردو جیسی نثری نوعیت کی کاوشیں نظم کی روایت سے
قعت حاصل کرتی تھیں اور موجودہ دور میں نثر نے عقلی
ور فکری رجحان سے جو تائید حاصل کی ہے اس کے نتیجے
یں شعری اصناف کے نثر میں ضم ہو جانے کا اندیشہ پیدا
و گیا ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ شعر کو بحر،
زن، قافیے، آہنگ، صوتی اور صوری التزامات،
خیلی رنگ، لفظی صنائع سے رفتہ رفتہ آزاد کرنے کا
جحان، نثری اسلوب کی بڑھتی ہوئی وقعت کے
اتھ پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہم ایک ایسی
ورتِ حال سے مقابلہ کر رہے ہیں جہاں بعض اوقات
حسوس ہوتا ہے کہ شعری اور نثری اظہار میں محض
صطلاحاتی فرق رہ گیا ہے۔ تقریباً ایک صدی قبل
ارسی انشا پردازی کے زیر اثر ہم نے مقفیٰ او مسجع
ثر کی روایت ورثے میں پائی تھی اور نثری اسلوب
کے معیار، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شعری اظہار سے
ستعار لیے گئے تھے۔ جب تخیلی رنگ میں ڈوبا ہوا
ثری اسلوب اختیار کیا گیا تو اسے بعض اوقات
شعر منثور" کا نام دیا گیا یعنی شعریت اس کی اصل
عنویت تسلیم کی گئی۔ لیکن آج ہم سفر کرتے کرتے

تقریباً دوسری انتہا پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہم "نثری نظم" کی
بات کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس وقت ہمارے
ذہن میں نظم کا ایک ایسا تصور ہے جس کی بنیادی
خصوصیت اس کا نثری اظہار ہے۔

"نثری نظم" کی اس اصطلاح میں یہ رمز نظر
آتا ہے کہ آج ہم نے نثر کو ایک ایسے طاقتور اور محیطِ کلی
پیرایے کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے کہ شعری اظہار بھی
اس کی ایک ذیلی شکل معلوم ہوتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ
شعری تخلیق و تشکیل کے بارے میں ہمارے تصورات
رفتہ رفتہ بدلتے جا رہے ہیں۔ مغرب کی وساطت سے
ہم تک شعری اظہار کے جو معیار ہم تک پہنچ رہے ہیں
ان کے زیر اثر شعر اب اظہاری عجوبے، معنوی حبس دم
اور لفظی ٹریپیز (TRAPEZE) پر مشاقانہ کمالات
کا نمونہ بنتا جا رہا ہے۔ مغرب اس وقت عقلی اور
تکنیکی فتوحات کی آماجگاہ ہے چنانچہ مغربی فکر و احساس
میں بھی اس عصر کی مخصوص قطعیت اور میکانکیت
سرایت کر چکی ہے اور مغرب کے تخلیقی اظہار میں بھی یہی
کیفیات نمایاں ہیں۔ ان کیفیات کے نثر زیادہ فطری
اور کارگر پیرایہ ہے۔ لیکن جس وقت شعری اظہار کے لیے
بھی ان کیفیات پر مبنی معیار وضع کیے جاتے ہیں تو ان
معیاروں میں بھی نثری خصوصیات کا بالواسطہ طور پر
اثر دکھائی دیتا ہے۔ صرف فارم کی تلاش، فوکس کے
ساتھ تجربات، اظہار کے ساتھ کھلواڑ اسی طرح قابلِ
قدر شعری بیان کی ضمانت نہیں ہو سکتے جس طرح منطقی
طور پر مفروضہ ردِ عملوں، عقلی ادراک سے حاصل ہونے
والی صورتِ حال اور تعلیمات (GENERALISAT
IONS) پر مبنی تصورات کو حسی تجربوں کا بدل سمجھ کر
انھیں شعری مواد کی بنیادی خصوصیت قرار دینا مشکل ہے۔

دراصل یا تو ہم اس قسم کے تجربات کے اصل سرچشموں کو سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں یا ہم میں یہ تسلیم کرنے کی جرأت کی کمی ہے کہ اس وقت ہماری شعری خلاقی کی صلاحیتوں پر نثری اظہار کی قوتیں تغلیبہ حاصل کر چکی ہیں، مواد، ہیئت اور اسلوب کے لیے ہم جس طرح نظریات کو اپنا راہبر بنا رہے ہیں وہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ آج ادب کی تشکیل و تخلیق میں عقلی ترجیحات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔ اس کا ایک واضح ثبوت ان تجربات کی شکل میں نظر آتا ہے جو بسا اوقات جدید تخلیقات کے ساتھ چسپاں نظر آتے ہیں اور ان تحریرات کی نکتہ بہ نکتہ عقلی توجیہ و تشریح کا کام کرتے ہیں ۔ شعر، جسے بلا ماہرانہ کاوش کے شعور و احساس میں جذب ہو جانا چاہیے اگر اس کو لخت لخت کر کے منطقی مالش کے ذریعے ذہن میں اتارا جائے تو یہ نتیجہ نکالنے میں دیر نہیں لگنا چاہیے کہ یہ مواد بنیادی طور پر شعور و احساس میں جذب ہونے کے لیے نہیں بلکہ ذہن میں اتارے جانے کے لیے ہے ۔ بالفاظ دیگر وہ شعری مواد نہیں بلکہ وہ نثری نوعیت کا مواد ہے ۔

ہمارے عہد کو تاریخی اعتبار سے سراسیمگی، ذہنی انتشار، اور جذباتی قحط سالی کا عہد کہہ دینے سے نہ تو شعری مواد میں خلاقانہ عنصر کی کمی کا کوئی ازالہ ہوتا ہے اور نہ نثری نوعیت کے اظہار و خیال کی بوالعجبیوں کو شعر کا نام دینے سے کوئی کارگر مدد حاصل ہوتی ہے ۔ ان میں اکثر بوالعجبیاں ذہن کو جکڑا دینے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں اور بعض ادبی نظریہ ساز والوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ شعر کی بنیادی خصوصیت یہی جکڑا دینے والی صفت (CAPACITY TO PUZZLE) ہے ۔ حالاں کہ اچھا شعر جس قسم کا استعجاب پیدا کرتا ہے وہ قاری کے ذہن میں عجز کی کیفیت پیدا نہیں کرتا بلکہ قاری کے حاشیے کے کسی گوشے میں جگہ بنا کر اس کی ذہنی گرفت کے دائرے میں توسیع کرتا ہے اور اس طرح جمالیاتی حظ فراہم کرنے کا سبب بنتا ہے ۔ وہ قاری کو ذہنی بیچارگی کے احساس میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ شاعر کی خلاقی میں شرکت کا ارتقاعی احساس پیدا کر کے قاری کی اپنی خوابیدہ فنکارانہ انا میں بالیدگی کے امکانات پیدا کرتا ہے ۔

ذہن کو تنگ کرنے کا کام دراصل نثری حربہ ہے اور اس کے لیے نثر کو بہت پہلے سے استعمال کیا جا رہا ہے ۔ زمانۂ قدیم سے تقریباً ہر زبان میں پہیلیوں اور معموں کی بڑی تعداد موجود رہی ہے ۔ پہیلی چاہے نظم کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو، ہمارے شعور کی صرف بالائی سطح کو کریدنے میں کامیاب ہوتی ہے اور اپنے مواد کی نثریت کو نمایاں کرتی ہے ۔ محض اس وجہ سے کہ نظم میں الفاظ سے کھیلنے اور قاری کے فہم و شعور سے کھلواڑ کرنے کی مثالیں پہلے سے موجود ہیں، ان کوششوں کو شعری اسلوب کا جزو سمجھنا نامناسب ہوگا ۔ فہم و فراست کے لیے رکاوٹیں پھلانگنے (OBSTACLE RACE) کا ماحول بنانا، بنیادی طور پر شعری نہیں بلکہ نثری رویہ ہے اور جدید شاعری میں قاری کی سمجھ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ (MENTAL TEASING) دراصل شعری جوہر کا مظاہرہ نہیں بلکہ اس نثری اسلوب کے غلبے کو ظاہر کرتا ہے جو اس عہد کے خصوصی رجحان کی نمائندگی کرتا ہے ۔

جدید ٹیکنالوجی اور جدید نظریات کے زیر اثر جس قسم کی پروگرام بند تحریر (PROGRAMMED WRITING) کی جانب ہم جس طرح راغب ہو رہے ہیں اس کے بنیادی عناصر ایسے ہیں جنھیں شعریت کا حامل سمجھنے کا کوئی جواز نہیں ۔ کسی پروگرام کے تحت، ایک خاص معنوی یا موضوعاتی چوکھٹے میں رہ کر یا بعض خاص

کات کو معنوی مدار تصور کرتے ہوئے کسی بیان کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں پیرایہ نثر کا ہے ۔ کیونکہ نثر متعینہ حدود، جہات، سطح اور معیار کی بڑی وفاداری کے ساتھ پابندی کر سکتی ہے اور اظہار کو صحیح نشانے پر قائم رکھنے کا کام کرتی ہے ۔ لہٰذا کسی قسم کی پروگرام بند تحریر کے ساتھ صرف شعری اصطلاح چسپاں کر دینے سے وہ تحریر شعریت کی حامل نہیں بن جاتی ۔ جدید دور میں "کمپیوٹر پوئٹری" "کانکریٹ پوئٹری"، "ایبسٹریکٹ پوئٹری" وغیرہ کئی قسم کے تجربات کیے گئے ہیں ۔ لیکن ان میں شعری اظہار کی کیفیت کو پیش کرنے سے زیادہ محض لفظی اظہار کی بعض اشکال کے سلسلے میں کاوشیں کی گئی ہیں ۔ ان میں جو تلازمات مدنظر رہے ہیں وہ منطقی اور میکانکی زیادہ اور محسوساتی اور تخلیقی کم ہیں ۔ مثلاً اگر کمپیوٹر کے ذریعہ بعض سطریں حاصل کی جاتی ہیں تو اس ترتیب کو دراصل کمپیوٹر کے لیے تیار کیے گئے پروگرام کا ثمرہ کہا جائے گا ۔ اس قسم کے نتائج صرف کمپیوٹر جیسے میکانکی آلات و وسائل کے لیے ضروری پروگرام بندی سے ہی پیدا نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات یہ نظریاتی پروگرام بندی سے بھی مرتب ہو سکتے ہیں ۔ گزشتہ ایک صدی کے دوران انسانی نفسیات اور سماجیات کے مختلف پہلوؤں پر معنی خیز تحقیق عمل میں آئی ہے اور ان انکشافات کی مدد سے انسانی عمل و تجربے کی ذہنی تشکیل نو (MENTAL RECONSTRUCTION) کے امکانات پیدا ہوئے ہیں اور قیاسی افعال اور تجربوں کو حاصل کرنے کے لیے نظریاتی پروگرام بندی کی کوششیں کی گئی ہیں ۔
چنانچہ مختلف سلسلہ ہائے فکر کے تحت انسانی فکر و عمل کو ایک خاص روشنی میں پیش کرنے کی کاوشیں کی جا رہی ہیں ۔ مثلاً مارکسی مفکرین نے انسانی تجربے کی ایک طرح اور وجودی مفکرین نے دوسری طرح تعبیر کی ہے ۔ نثر نے ان نظریہ بند تحریکات کے لیے موزوں پیرایۂ اظہار مہیا کیا ہے لیکن نظریات کو بعض اوقات دوسرے پیرایہ ہائے اظہار کے لیے بنیاد بنایا گیا ہے اور اس نظریاتی اور منطقی پروگرام بندی کے نتیجے میں یہ پیرایہ ہائے اظہار بھی عقلی اپیل کا ہی سبب بنے ہیں ۔ مثلاً 'کانکریٹ پوئٹری' اور 'ایبسٹریکٹ پوئٹری' اپنا جواز عقلی دلائل سے حاصل کرتی ہیں جو اس قسم کی شاعری کے تصور کے پس پشت کام کرتے ہیں ۔ یہ پوئٹری اس وجہ سے اعتبار حاصل نہیں کرتی کہ وہ شاعری ہے بلکہ اس وجہ سے کہ نظریاتی طور پر شاعری کو ایسا ہونا چاہیے ۔ بالفاظِ دیگر نثری استدلال اس قسم کی تحریر کو اعتبار بخشتا ہے ۔ آج کے ادب کے بارے میں یہ تبصرہ کہ اس کا روئے سخن عام قاری کی جانب نہیں بلکہ ناقد کی جانب ہے، محض کورا بہتان نہیں ہے "ناقد" اس نظریاتی رائے کی نمائندگی کرتا ہے جو فکر و عمل کے منطقی تجزیے اور ایک قسم کی اصولی تشکیل سے پیدا ہوتی ہے ناقد کی تائید، ایک خاص نظریے کے تحت فن پارے کی قبولیت کو ظاہر کرتی ہے اور موجودہ دور میں ناقد کی یہ سربلندی نظریے اور نثری استدلال کی سربلندی کا اظہار ہے ۔

اس وقت ہماری تخلیقی کاوشیں جس ہیئتی بحران سے دوچار ہیں اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک شعوری طور پر یہ قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے ہیں کہ ہم تاریخی اعتبار سے نثر کے دورِ عروج سے متعلق ہیں اور نثر ہماری ذہنی اور فکری ضرورتوں کے فطری اظہار کے لیے اس وقت زیادہ موزوں اور کارآمد وسیلہ ہے اسی روشنی میں ہمیں منظوم اظہار اور شعری مواد کی واضح شناخت کرنا ضروری ہے تاکہ شعر و نثر کو اپنی اپنی صنفی خصوصیات کے ساتھ زیادہ پر اعتماد انداز میں پورے تخلیقی خلوص کے ساتھ استعمال کیا جا سکے اور دونوں اصناف میں در آنے والا کنفیوژن دور ہو سکے ۔ یہ کنفیوژن ہمارے ترقی یافتہ تخلیقی شعور کے لیے نہایت مضر ہے کیوں کہ کنفیوژن اور ادھورے پن کے ساتھ اعلیٰ ادب نہیں پیدا ہوتا ——●

شہاب الدین ثاقب

جدید اردو شاعری اور انسانی رشتوں کی شکست و ریخت

ہر ادب کچھ اقدار و روایات کا حامل ہوتا ہے اور ہر عہد دوسرے عہد سے مختلف ہوتا ہے اس لئے ادبی اقدار و روایات کی تبدیلی اور اختلاف ناگزیر ہے عظیم فن پارہ وہ ہوتا ہے جو ہمیشہ زندہ اور قابل احترام رہ سکے۔ اور اس کے آئینہ میں اس مخصوص عہد کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بقول پروفیسر احتشام حسین :

> "اگر ادبیات کا مطالعہ تاریخ کی روشنی میں کیا جائے۔ تو یہ بات سورج کی طرح روشن نظر آتی ہے کہ ہر دور کے ادبی کارناموں میں اس دور کی وہ خصوصیات ہوتی ہیں۔ جن کو اس دور کی روح رواں کہنا چاہیئے۔ مہابھارت، شاہنامہ، رامائن، الیڈ، الف لیلہ، ڈوائن کامیڈی، یہ سب ایک خاص دور تمدن، اور ایک خاص نظام معاشرت کی پیداوار ہیں جنکو کوئی دوسرا تمدن یا کوئی دوسرا نظام پیدا نہیں کر سکتا"

اردو غزل کی تاریخ میں میر کی معشوق پرستی اور سپردگی اپنی مثال آپ ہے جسے بہت سراہا بھی گیا ہے۔ اور محبوب کے ساتھ جاں سپاری، بے لوثی اور حب صادق کا جذبہ رکھنے والے عاشق شاعر کے مزاج اور لب ولہجہ کو غزلیہ شاعری کے عین موافق قرار دیا گیا ہے۔ لیکن میر جیسی سپردگی اور معشوق سے بے طلبی کے جذبے کا اظہار آج کی اردو غزل سے مفقود ہے۔ میر نے تو یہ کہہ دیا کہ :

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

اور :

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

لیکن غالب اور مومن کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ غالب عاشق تو ہیں مگر معشوق فریبی کا کام بھی کرتے ہیں۔ اور ان کا نظریۂ عشق یہ ہے کہ شہد کی مکھی نہ ہو، مصری کی مکھی ہو، اس قسم کی دیگر کئی مثالیں غالب کے خطوط اور ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ اسی طرح وہ کوہکن کو "گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب" تک کہہ دیتے ہیں۔ اور اس بات کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں :

ہ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

مومن بھی کچھ یوں فرماتے ہیں :

ہ معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا !

اور اگر وفا کرتے بھی ہیں تو ـــــ وفا کر کے خوش نہیں رہتے۔
اور آج کا شاعر تو صاف صاف یہ کہنے لگتا ہے :

ہ تو کون ہے تیرا نام کیا ہے؟
کیا سچ ہے کہ تیرے ہو گئے ہم (ناصر کاظمی)

اور :

ہ سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ تجھکو شریک خواب بنا (حسن نعیم)

یا پھر :

ہ ناصر یہ وفا نہیں جنوں ہے
اپنا بھی نہ خیر خواہ رہنا

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو (ناصر کاظمی)

قیامت خیز حالات زندگی کے سارے نظام کو درہم برہم اور مستحسن تہذیبی روایات و اقدار کو پامال کر دیتے ہیں قیامت کبریٰ سے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ میدان حشر میں کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہو گا۔ اور ہمدردیاں ختم ہو جائیں گی اور جب دنیا میں چہار طرف قیامت صغریٰ برپا ہو رہی ہو تو پھر یہاں انسانی رشتے کیونکر لٹتے ہوئے دکھائی نہ دیں اور ادب میں وہ ظاہر ہونے سے بھی کیسے رہ جائیں۔ اسی لئے ادب کی ایک نہیں۔ ایک سے زائد زندہ اصناف میں انسانی رشتوں کی شکست وریخت کا اظہار ملتا ہے اور یہ اظہار تخلیق کے فنی تقاضوں کے پیش نظر کہیں مدھم لے میں کہیں تیز لے میں کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ ملتا ہے۔ حیات اللہ انصاری کے افسانہ "آخری کوشش" میں انسانی رشتوں کی شکست وریخت کا شدید احساس ملے گا۔ جس کا سبب حد سے بڑھی ہوئی غربت اور افلاس ہے۔ اس میں صرف یہی

نہیں کہ گھسیٹے اور نفیرا دونوں بھائیوں میں (جو اس افسانہ کے کردار ہیں) اخوت و ہمدردی کا فقدان اور ضعیف و ناتواں ماں کے ساتھ بے اعتنائی کا برتاؤ ظاہر ہوا ہے بلکہ اس سرمایہ پرست ذہنیت کی بھی عکاسی کی گئی ہے جس نے ہوس زر کے سبب انسانیت کو حیوانیت میں تبدیل کر دیا ہے۔ گھسیٹے روزی کی تلاش میں کلکتہ جا پہونچتا ہے لیکن وہاں بھی مزدوروں کی کثرت کے سبب اسے جب محنت و مزدوری کا کام نہیں ملتا ہے تو وہ ناچار رکشہ چلانے پر کمربستہ ہوتا ہے اس موقع پر اس کا حال اس کی زبانی پیش کرنا زیادہ بہتر ہے:

> "سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو ضمانتی لاؤ۔ میں کیسے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے، گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ ضمانتی لے آتے تھے۔ لچھمن بولا، دو آنے روز پر تو کلوٹا مہاجن ضمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے روز اسے دیئے پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ دور ہٹ جاتے۔ جب سیٹھ سے خوشامد کرو کہ ایک اچھی گاڑی دے دو۔ تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کہ کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا......"

ایسی ہی مثال پریم چند کا افسانہ "کفن" سے لی جا سکتی ہے۔ اس میں بھی ایک خاص حد تک رشتوں کی شکست و ریخت کا احساس گھیسو اور مادھو کے کردار سے ہوتا ہے۔ (البتہ مادھو کی بیوی بدھیا کا کردار اس سے مستثنیٰ ہے) یہاں بھی سرمایہ دارانہ نظام کی لعنت اپنا کام کرتا ہے۔ اور نتیجے میں گھیسو اور مادھو دونوں دونوں غربت و افلاس کی خلیج کو محنت و مشقت کے ذریعہ نہ پار کر سکنے کے سبب حوصلہ کھو بیٹھے ہیں۔ اور بالکل بے حس ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بدھیا کے کفن کا روپیہ بھی ہوٹل اور شراب خانے میں اڑا دیتے ہیں۔

اردو نظم میں بھی ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی جس میں انسانی رشتوں کی شکست و ریخت، خلوص و محبت، اخوت و ہمدردی، نیکی و شرافت کے فقدان کے احساس کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں خورشید الاسلام کی نظم "پیاس" ایک عمدہ مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ جس میں خلوص و محبت، ہمدردی و ایثار اور جذبۂ خیر کے فقدان کا احساس بڑے موثر اور بہترین فنی پیرائے میں ظاہر ہوا ہے اور خلوص و محبت کے فقدان کا ہی احساس ہے جو خورشید الاسلام کو اس قسم کی شعری نظم لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ:

اگر دریا نے میری طرف
محبت سے دیکھا
تو میں اس میں تنکے کی طرح
بہہ جاؤں گا

اسی طرح ان کی ایک نظم "تجربہ" ہے جس کا ایک شعر یہ ہے

غیروں میں یہاں غیر کوئی ہم نے نہ دیکھا
یاروں میں یہاں یار کوئی ہم نے نہ پایا

انسانی رشتوں سے متعلق شاعر کا پوری زندگی کا تجربہ اس ایک شعر میں سمٹ آیا ہے۔

اردو نظم سے ہی اگر اور بھی مثالیں لینا چاہیں تو خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظم "بن باس" اور "پانچواں کتبہ" (جس میں طنزیہ پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے) اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ "پانچواں کتبہ" درج ذیل ہے :-

یہ کتبہ فلاں سن کا ہے / یہ سن اس لئے اس پہ کندہ ہے / کہ سب وارثوں پہ
یہ واضح رہے / کہ اس روز برسی ہے مرحوم کی / عزیز و اقارب یتامیٰ، مساکین
کو / ضیافت سے اپنی نوازیں، سبھی کو بلائیں / کہ سب مل کے مرحوم کے حق میں /
دست دعا کو اٹھائیں / زباں سے کہیں اپنی / مرحوم کی مغفرت ہو / بزرگ مقدس
کے نام مقدس پہ بھیجیں / درود و سلام / سبھی خاص و عام

(کتبہ یہاں پر ختم ہو جاتا ہے، پھر ایک شخص آتا ہے اور اس کتبے کو دیکھ کر پنسل سے اضافہ کر دیتا ہے)

مگر یہ بھی ملحوظ خاطر رہے / عزیز و اقارب کا شرب و طعام / اور اس کا نظام / الگ ہو
وہاں سے / جہاں ہو یتامیٰ، مساکین، اندھے، بھکاری / پھٹے اور میلے لباسوں
میں سب عورتیں / اور بچے / کئی لولے، لنگڑے، مریض اور گندے ۔ / وہی جن کو
کہتے ہیں ہم سب عوام / وہاں ہوگا ایک شور و غل / یہ کر دیں گے ہم سب شریفوں
کا کھانا حرام،

غزل جو کہ ایک مخصوص موضوع کی پیش کش کے لئے عربی قصیدے (کی تشبیب ہے) سے الگ کی گئی تھی۔ اور فارسی ادب میں مکمل ارتقا پذیر ہونے کے بعد اسی راستے سے جب یہ اردو میں داخل ہوئی تو اس نے یہاں بھی ایک زندہ و پائندہ صنف سخن کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی۔ اور اس کی قوس و قزح نے دوسری تمام اصناف سخن کے رنگوں کی دلکشی چھین لی۔ اردو کی بیشتر اصناف سخن (قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ) اپنے مخصوص دور کے تقاضوں کے تحت وجود میں آئیں اور جب یہ تقاضے ختم ہوئے تو ان کی وہ اہمیت بھی نہ رہی۔ جو ان ادوار سے مختص تھی۔ لیکن غزل اپنے موضوع اور وسعت کے سبب ہر دور کے مزاج اور بدلتے ہوئے رجحانات سے پوری طرح ہم آہنگ رہی۔ اس لئے اس کی بقا و تحفظ کی ضمانت بھی ہر نئے زمانہ نے خود اپنے ہاتھوں لے لی۔ اردو غزل کی تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر دور میں اس نے ضرورت کے مطابق اپنے دائرہ کو وسیع کیا ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کی تیامت خیزی انسانی زندگی کی مستحسن داخلی اقدار کو پامال کر رہی ہے۔ تو اردو غزل اس کے اظہار میں بھی عہد جدید کے شانہ بشانہ چل رہی ہے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر خورشید الاسلام کی ایک مکمل

غزل پیش کی جاتی ہے تاکہ پوری فضا کا اندازہ ہو سکے۔ غزل یہ ہے:

کس شورِ جہنم میں فضا ڈوب چلی ہے — دل دھڑکے ہے سینے میں لو اڑوب چلی ہے
وہ خون کی موجیں ہیں ہر اک سو کہ کمر تک — فرخندہ جمالوں کی قبا ڈوب چلی ہے
وہ حبس کا عالم ہے کہ ہر سانس ہے گھائل — کیا ذکر ہوا نبض ہوا ڈوب چلی ہے
کیا جانیے کس گوشے سے امڈی ہے سیاہی — کیا کہیے کہ کرنوں کی ردا ڈوب چلی ہے
اس شور میں کیا کوئی سنے گا مری آواز — جس شور میں ماتم کی صدا ڈوب چلی ہے

یہ غزل کیا ہے گویا زندگی کی اعلیٰ قدروں کی پامالی کا ایک مرثیہ ہے۔ تنہائی، کس مپرسی، حزن و ملال، تشکیک، بے دلی یہی کچھ آج کے انسان کا مقدر بن گیا ہے۔ اب مختلف شعرا کی غزلوں سے بھی چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جو زندگی کے نئے کرب کی غمازی کر رہے ہیں۔

کوئی ہے جو مجھے دو چار پل کو اپنا لے — زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے

(شہریار)

میرے لہو کی چیخ کو کب کوئی آسرا ملا — دشت بھی بے زبان تھا شہر بھی بے صدا ملا

(شہریار)

وحشت سرائے جسم میں تنہا ہوں کس قدر — تکتا ہوں چار سو کسی نادار کی طرح

(حرمت الاکرام)

یوں تو سب چہرے ہیں پہچانے ہوئے اپنے ہی چہرے ہیں مگر — مجھ سا تنہا کون اس شہر کے لوگوں میں تھا

(علیم صبا نویدی)

رفاقت کیا، کہاں کے مشترک خواب — کہ سارا سلسلہ شبہات کا تھا

(باقی)

روتے ہوئے بچھڑنے کی رسمیں چلی گئیں — شہروں سے اب خلوص کی رسمیں چلی گئیں

(منور رانا)

کوئی منظر ہے نہ عکس اب کوئی خاکہ ہے نہ خواب — سامنا آج یہ کس لمحۂ خالی کا ہے

(باقی)

بقول شاعر جنگل میں لطف و محبت کا سماں تو مل جائے گا:

پیڑ سے پیڑ لگا رہتا ہے — پیار ہوتا ہے گھنے جنگل میں

لیکن انسانوں کے اس گھنے جنگل کا سماں کچھ دوسرا ہی ہے یہاں انسان آدمیوں کے میلے میں بھی کس مپرسی اور تنہائی کے

شدید عذاب میں اس طرح مبتلا ہے کہ نہ تو اس کا استعجاب ختم ہوتا ہے۔ اور نہ حیرانی ہی جاتی ہے۔

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو! تاحد نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

(شہریار)

ایسی گھٹن کے ماحول میں انسان کا زندہ رہنا بھی ایک مجاہدہ ہے۔ جہاں چاروں طرف نیکی، ہمدردی، اخوت، خلوص و محبت شرافت، وفا، ایثار ان سب کا خون ہو رہا ہے۔

ملیں تو کس سے ملیں جائیں تو کہاں جائیں گلی گلی میں کسی خوب رو کا ماتم ہے

(خورشید الاسلام)

اردو غزل میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ انسان نے بدلتے ہوئے حالات سے اپنے مزاج، طریق زندگی اور انداز فکر کو کس حد تک ہم آہنگ کر لیا ہے اور سکون پانے کے لئے اپنے دل کو کس طرح پتھر بنا لیا ہے۔ جیسے:

زندگی جن کی رفاقت پہ بہت نازاں تھی ان سے بچھڑے تو کوئی آنکھ میں آنسو بھی نہیں

(زبیر رضوی)

اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا

(محمد علوی)

اب اسی سے ہے بچھڑنے کی تمنا جس سے ایک لمحے کی جدائی تھی مہ و سال مجھے

(لطف الرحمن)

کیا نہ ترک مراسم پہ احتجاج اس نے کہ جیسے گزرے کسی لمحۂ نجات سے وہ

(مصور سبزواری)

خود کو پتھر بنا لیا ہم نے اب تو شاید ہی آستیں نم ہو

(بشر نواز)

کندھوں پہ خود کو لاد کے بھٹکا ہوں شہر شہر اب خود ہی اپنے واسطے شہر پناہ ہوں

ان تمام مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دیگر اصناف ادب سے کہیں زیادہ اردو غزل نے انسانی رشتوں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کی شکست و ریخت کے مسئلے کو مختلف زاویوں سے اور بڑی شدت کے ساتھ اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

اکبر

انور قمر

کمرہ نیم تاریک تھا۔ اس میں رکھی ہر چیز میلی نظر آ رہی تھی۔
وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔
اور ہم دونوں کے درمیان میں ہمارے گلاس رکھے ہوئے تھے۔
تپائی کے بازو میں شراب کی بوتل۔ اور اس مسہری کے
قریب جس سے اس نے اپنی پیٹھ ٹکا رکھی تھی، پانی کی پتیلی رکھی
ہوئی تھی ۔ اس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس
خالی کر دیا۔ پھر ہتھیلی کی پشت سے اپنے لبوں کی نمی پونچھ
کر اس نے سگریٹ سلگایا اور بولا ــــــــ
"انور بھائی! آپ دیکھ رہے ہیں، اس کمرہ کی ہر چیز گندی
ہے۔ یہ بستر، اس نے مسہری پر ہاتھ مار کر کہا ــ یہ
چادر، یہ تولیہ، یہ چٹائی کہ جس پر آپ بیٹھے ہیں۔" وہ
خاموش ہو گیا۔
کمرہ واقعی گندہ تھا۔ لیکن یہ کمرہ تو برسوں سے ایسا ہی
رہا تھا۔ آج اسے کمرہ کی گندگی کا خیال کیوں آیا۔ اور
آج یہ اتنا افسردہ کیوں ہے۔ اس کے دل میں کون سا
غم ہے کہ جو عنقریب ظاہر ہونے والا ہے۔
سالا یہ کمرہ ہی گندہ ہے ــ اور یہ چالی ۔۔۔۔۔۔
اس نے گالی دی ۔۔۔ ایک موری ہے ۔ ایک
سنڈاس ہے۔ اور یہ محلہ ۔۔۔ ایک فاحشہ کی
شرم گاہ ۔۔۔۔۔۔۔۔
وہ پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر
اس رکھا سگر . بنا یا اور سگریٹ کا کش لے کر سوچنے لگا کہ

پچھلے تیس برسوں سے وہ یہیں، اسی کمرے میں رہ
رہا ہے۔ اس زمانے سے کہ جب وہ نیکر پہنا کرتا تھا
آنکھوں میں سرمہ لگاتا تھا اور بستہ پیٹھ سے
مدرسے جانے کے لیے چلتی ٹرام پر سوار ہو جایا کر
تو اس وقت اسے اس محلے کی فحاشی کا احساس
ہوا تھا۔ ان دنوں تو جب وہ کوئی سودا خرید
کرانے کی دوکان پر پہنچتا یا اپنے ابا کی سگریٹ
وہ بیڑی والے کی دکان پر جاتا تو راہ میں پڑنے وا
ہر کٹہرے سے اسے کوئی نہ کوئی سیٹی، کوئی نہ کوئی
کوئی نہ کوئی اشارہ یا کوئی نہ کوئی بلاوا ایسا نہ
جو اس کے رگ و پے میں ہلچل نہ مچا دیا کرتا تھا۔
کے پیر وزنی ہو جاتے اور آنکھوں میں عتاب آ
بیٹھ جاتا۔
پھر یہ سودا لے کر چالی کی بے شمار سیڑھیاں چیتے کی
پھرتی سے طے کر ڈالتا۔
اسے محلے میں رہنے والوں کی بد قماشی کا احسا
اس وقت بھی نہ ہوا تھا کہ جب سولہ برس کی
ایک نیپالی لڑکی کے ساتھ ساڑھے تین روپے
معاوضے پر اس نے پھل توڑا تھا۔
اور آخری لمحوں میں کہ جب جسم کی لذت رو
محسوس کرنے لگتی ہے اور اپنی سیرابی کے اع
میں اپنے پوشیدہ مخزن سے جسم کو جو ہری توا

بخشتی ہے، اسے اپنے [illegible] کی غلاظت کا احساس نہیں
ہوا تھا۔ اور جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا
بیاہ ہو گیا۔ پھر اس کے یہاں اولاد ہوئی اور وہ اپنے
کام کاج میں زیادہ منہمک ہو گیا، تب بھی اسے محلے کی
گندگی کا کوئی احساس نہ ہوا ۔
" آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آج میں کیا کیا بک رہا ہوں"
" نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ۔ دراصل میں یہ سوچ
رہا ہوں کہ آج آپ بہت ڈسٹربڈ ہیں ۔ اور اس کی
کیا وجہ ہو سکتی ہے ۔ "
ہائے ـ ـ ـ ـ ہائے ـ ـ ـ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس
چھوڑی اور کہنے لگا۔ " آپ اکبر کو نہیں جانتے ۔ "
پھر بھی آپ نے کسی گورے چٹے، غمگیں آنکھوں، منتشر
بالوں والے ایک انتہائی کمزور لڑکے کو اس چالی میں دیکھا
ہوگا ـــــــ
چوں کہ میں اس کی کھولی پر برسوں سے آتا جاتا رہا تھا۔
لیکن کبھی میں نے چالی میں بیٹھی ہوئی عورتوں، لڑکیوں
بچوں اور مردوں پر غور سے نظر نہیں ڈالی تھی ۔ اور
ممکن ہے کہ چالی والے بھی شاید اس لیے ہمارے پینے پلانے
پر معترض نہیں ہوئے تھے ۔ لیکن جس لڑکے کا حلیہ
اس نے بتایا تھا میں نے اسے بارہا دیکھا تھا۔ وجہ اس
کی یہ تھی کہ وہ لڑکا سیڑھی کے بالکل سامنے بڑی دھیمی
آواز میں قرآن پڑھا کرتا تھا۔
اس کی آواز میں اس قدر درد تھا کہ لمحہ بھر کے لیے میرے
ہاتھوں میں دبی شراب کی بوتل لرز جاتی اور دو ایک
مرتبہ شراب نوشی کے درمیان میں جب پیشاب کرنے
کو مجھے اس کے سامنے سے گذرنا پڑتا، چوں کہ پاخانے
چالی کے پچھلی سمت میں تھے، میں اسی کی پرسوز تلاوت
کے زیر اثر اپنی ڈگمگاتی چال پر قابو نہ رکھ سکا تھا اور

گر پڑا تھا ۔
میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ قرآن کی تلاوت سن کر میرے
ہاتھوں میں سے بوتل کیوں پھسلنے لگتی تھی یا میری چال
پر مجھے اختیار کیوں نہیں رہتا تھا اور میں اس کے سامنے
دو ایک مرتبہ کیوں گر پڑتا تھا ۔ میں نے بارہا اس بات
پر غور کیا تھا۔ اور آخر آخر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ
یہ اس کی پرسوز اور پر درد آواز کا اثر تھا جو میرے شعور
پر اثر انداز ہوتی تھی اور اس حد تک ہوتی تھی کہ ذہن اپنے
اعصاب پر قابو نہیں رکھ پاتا تھا ۔
یا بنیادی طور پر مسلمان ہونے کے نتیجے میں شراب نوشی
اپنے تمام لطف و انبساط کے ایک گناہ کبیرہ سی لگتی
اور میں اپنے ضمیر سے نبرد آزمائی کر کے اسے زیر کر لیا کرتا
تھا۔ لیکن جوں ہی میں اس کی دردمند آواز میں قرآن
سنتا تو میرے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے اور گناہ کا شدید
احساس مجھے زندہ درگور کر دیا کرتا تھا ۔
" دیکھا تھا ـــــ " میں نے بے دلی سے جواب دیا کیوں کہ
میں نہیں چاہتا تھا کہ اس لڑکے کا ذکر جاری رہے اور
میرا نشہ بگڑے ۔
" آج وہ مر گیا ۔ چالی میں جس جگہ بیٹھا وہ قرآن
پڑھا کرتا تھا وہیں اس کی لاش میں نے دیکھی ـــ
اس کے اطراف خون بکھرا ہوا تھا۔ اس کا گریبان بھی
خون آلود تھا ۔ "
یہ کہتے کہتے اس نیم [illegible] تاریک کمرے میں مجھے نظر نہ آنے
والے آنسو اس نے اپنی ہتھیلی کی پشت سے پونچھے اور
پھر کھڑکی سے نظر آنے تاریک آسمان کو دیکھنے لگا۔
شہر میں رہتے رہتے میں بے حس ہو چکا ہوں ۔ اس
شہر کی سنگینی نے میرے دل پر گھٹن کی چادر منڈھ دی ہے
اور اس کی [illegible] (Pollution) تمام غبار، دھند

اور دھوئیں سمیت میرے دماغ میں اتر آتی ہے۔

اس لیے لوگوں کے مرنے مارنے، لٹنے لٹانے کی خبریں مجھے مضطرب نہیں کرتیں لیکن پھر بھی میں رات کی تنہائیوں میں اندھیرے سے ڈر ڈر کر مرنے والوں پر آنسو بہایا کرتا ہوں اور جبر و استبداد سے پناہ مانگا کرتا ہوں۔

اس خبر نے پہلے تو مجھ پر مکمل بے حسی طاری کر دی — پل بھر کے لیے میرے سینے سے دل کی دھڑکن بیسیے پر ٹھونکی ہوئی ہتھوڑی کی آواز سے مشابہ لگتی۔ پھر اسی معذ لی خول میں کسی چیز کے پگھلنے کا احساس ہوا۔ میرے جسم کا درجہ حرارت اچانک گرنے لگا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ میری پیٹھ اور پیشانی کے مسامات سے تیزی سے بہہ نکلا۔

میں نے اپنا پیگ تازہ کیا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ جب میں رومال سے ماتھا پونچھ کر، ٹھنڈی سانس لے کر، دیوار سے پیٹھ لگائے پھر بیٹھ گیا تو وہ گویا ہوا:

"رات میں اسے خون کی قے ہوئی، وہ تڑپا اور مر گیا۔ پچھلے دنوں سے اس کے سینے میں شدید اینٹھن ہو رہی تھی لیکن یہ بات اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ آج انیس میاں کا چھوٹا لڑکا اپنی ماں کو بتا رہا تھا کہ اکبر کی کیفیت کیا تھی۔ ویسے اُس نے اس لڑکے سے بھی وعدہ لے رکھا تھا کہ وہ اس کے متعلق کسی سے کچھ نہ کہے گا۔"

میں سوچنے لگا:

آخر کیا بات تھی کہ یہ درد سہے جا رہا تھا۔ اطراف میں رشتہ دار نہ سہی۔ لیکن ہمدرد ایک نہیں بیسیوں تھے اور وہ برسرِ روزگار ہونے کے باوجود اپنے علاج معالجے سے آخر کیوں کترا رہا تھا۔

"چالی کے سبھی لوگوں کو معلوم تھا کہ اسے ٹی۔ بی ہے۔ لیکن کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کس اسٹیج کی ہے۔"

میں نے سوچا اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنے کے بعد کا یہ بہانہ ہے۔ لیکن وہ بولا

"بھائی، آپ کو نہیں معلوم کہ جب میں اپنی اُس کھولی پر بالکل تنہا ہوا کرتا اور شغل مے نوشی میں کوئی لطف نہ آتا تو میں اسے بلا لیا کرتا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ جاتا۔ میں شغل کیا کرتا اور وہ بیٹھا میرا منھ تکا کرتا۔ شروع شروع میں تو میں اس کی موجودگی ہی سے لطف لیا کرتا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جس شخص کے بال بچے وطن میں ہوں، اور اس شخص کو اپنے گھر پر دم دے کر چائے پلانے والا کوئی بھی نہ ہو، چالی میں بچوں کے دوڑنے، بھاگنے، ہنسنے اور قہقہے مارنے کی آوازیں سنائی دیں، اور کوئی اس کے گھر میں آمد کے بعد پیروں پر لپٹنے یا کندھے پر چڑھ کر کھیلنے والا نہ ہو، یا رات کی تاریکی میں دن بھر کے غیر یقینی اور ناساعد حالات سن کر تسلی دینے والا نہ ہو، تو وہ شخص کسی خاموش پسند لڑکے کو اپنے سامنے بیٹھ کر اپنے آپ کو تسلی نہ دے یا اس کی صحبت پر شکر نہ کرے تو پھر کیا کرے؟ آخر اندھیرے میں بیٹھ کر روئے بھی تو کب تک؟

اس نے مجھے کوئی ایسی بات نہیں بتائی کہ جس سے میں پہلے سے واقف نہ تھا۔ میں نے بارہا اسے اپنی بیوی بچوں کو وطن سے یہاں بلوا لینے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن وہ اپنی ضعیف ماں کے احترام میں اپنے وطن کی غیر صنعتی، غیر شہری فضا، اس کا فطری حسن، اس کے سادہ لوح رشتے دار، عزیز و اقارب، اور پھر ایک دن اپنے وطن مراجعت کر جانے کی امید میں اس نے تیس برسوں کا بن باس اس شہر میں کاٹ دیا تھا۔

"ایک دن میں نے اکبر سے پوچھا" اس نے سگریٹ جلا کر جلتی تیلی کو اپنے چہرے کے قریب لا کر دیکھا اور بولا "میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں تم اکیلے ہی رہتے ہو؟

تمھاری ماں کہاں ہے، تمھارے باپ کہاں ہیں ؟
انور بھائی میرا سوال سن کر وہ سمٹ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میرے سوال سے وہ خائف ہوگیا ہے تو موضوع بدلنے کی خاطر میں نے اس سے پوچھا "تمھارے دوست کتنے ہیں، اور وہ کیا کرتے ہیں ؟"
آپ جانتے ہیں ان سوالوں کا جواب مجھے کب ملا —
اب سوچتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے تقریباً تین برس کے عرصے پر اس کے جوابات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے ۔
آپ مسیح علیہ السلام کو جانتے ہیں ۔ آپ نے دیکھا ہے کہ مصلوب کر دیے جانے سے پہلے کئی من وزنی صلیب ان کے شانوں پر لاد دی گئی تھی اور وہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے بیت المقدس کے اندھیرے راستوں اور تاریک گلیوں میں اسے اٹھائے اٹھائے پھرتے رہے ۔
اکبر کے شانوں پر نہیں ، بلکہ اس کے پورے وجود پر اپنے باپ کے گناہ کی صلیب پڑی رہی جس کا بوجھ اس کی ہر سانس سے اس نے محسوس کیا ۔ اس نے اندھیرے میں ڈراؤنے خواب دیکھے اور دھاڑیں مارتا ہوا اٹھا، لیکن اس کے قریب کوئی نہ تھا کہ جو اس کی ڈھارس بندھاتا ۔ اور اسے دو گھونٹ پانی پلاتا ۔
انور بھائی، اس نے مجھ سے بارہا کہا کہ میں جانتا ہوں مرنے کے بعد مجھے تمام دکھوں سے نجات مل جائے گی ۔
میں اسے ڈپٹ دیتا ۔ کیسی قنوطی باتیں کرتے ہو، یہ تمھارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں ، تمھیں تو ابھی دنیا دیکھنی ہے ۔ ایسی افسردہ باتیں ہرگز نہ کرنا —
وہ میری ڈانٹ سن کر خاموش ہو جاتا اور خلا میں گھورنے لگتا گویا وہاں کسی سے ہم کلام ہو اور دونوں ایک دوسرے کو اتنہاک سے سن رہے ہوں ۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا ۔
میں سوچنے لگا کہ آخر اس لڑکے کے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آیا ہوگا کہ جس نے اسے اس قدر نڈھال کر رکھ دیا ہے ۔
بچے اپنے والدین کی جدائی یوں بھی برداشت نہیں کرتے اور اگر کر بھی لیں تو ان کی شخصیت پر مایوسی کا پردہ پڑا رہتا ہے ۔
وہ بولا "مرنے سے ابھی ہفتہ بھر پہلے اس نے مجھے بتایا کہ آپ پوچھتے رہے اور میں ٹالتا رہا ۔ یا یہ کہ ڈرتا رہا کہ اگر آپ نے بھی حقیقت سے واقفیت حاصل کر لی تو مجھے اپنے پاس پھٹکنے بھی نہ دیں گے ۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب میں چند روز کا مہمان ہوں ۔ شاید ہفتہ دس روز میں یہاں سے منتقل ہو جاؤں گا ۔ آج کل وضو کر کے سوتا ہوں، کپڑے بالکل پاک صاف رکھتا ہوں، کسی کا قرض مجھ پر نہیں ہے ویسے اپنی پیٹی میں کچھ رقم محفوظ کر لی ہے وہ میرے کفن دفن کے کام آئے گی ۔"
میرا جی چاہا کہ جھک کر الٹے ہاتھ کا ایسا تھپڑ رسید کروں کہ وہ لڑھک کر اُدھر جا پڑے ۔
شاید وہ میرے چہرے کے تاثرات کو سمجھ چکا تھا ۔
تو انور بھائی جانتے ہیں اس نے کیا کہا ؟
وہ بولا کہ آپ میرے بزرگ ہیں، میں آپ کا احترام کرتا ہوں لیکن اگر آج آپ نے مجھے کہنے سے روک دیا تو آپ کبھی میری حقیقت نہیں جان پائیں گے ۔ اس لیے میں نے اپنے چہرے کے تاثرات بدل دیے اور اس کی باتیں سننے کو طوعاً و کرہاً اپنے آپ کو راضی کر لیا ۔
یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا ۔
میں سمجھ گیا کہ آخری پیگ کے انتظار میں اس نے بات روکی ہے ۔ میں نے پیگ بنانے والی بوتل مسہری کے نیچے لڑھکا دی پھر سگریٹ سلگائے کش پہ کش لگائے اور وہ

(بقیہ ۳۹ پر)

تاریکیاں چُرانے والے

شمس ندیم

رات ۔ کاجل سے زیادہ سیاہ تھی، شاید وہ اماوس کی رات ہو۔

"کون ـــــ؟"

"کون ـــــ؟ کھڑا ہے ۔؟؟"

"کون ـــــ؟ کھڑا ہے اندھیرے میں ۔؟؟؟"

وہ اندھیرے میں کھڑے مقابلتاً زیادہ سیاہ انسانی سائے کو دیکھ کر حیرت، خوف اور تجسس کے ملے جلے جذبات کے زیر اثر بے اختیار پکار اٹھا، لیکن جواب میں اسے خود اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دی، جیسے وہ سیاہ انسانی سایہ کوئی ٹھوس سی شے ہو جس سے ٹکرا کر اس کی آواز فضا میں بکھر کر رہ گئی ـــــ اس کے بعد وہی سناٹا ـــــ وہی تاریکی جیسے کائنات کی تخلیق سے پہلے ہوگی ۔

وہ تاریک سائے کے قریب آیا ۔

اس نے دیکھا وہ سایہ قد و قامت میں بہت اونچا تھا اور بہت ہی ـــــ اندھیرے کے باوجود اس کی بڑی بڑی بے ہنگم سی آنکھوں کی سفیدی پتھر کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔ مزید اس کے چہرے کا کوئی بھی نقش نمایاں نہیں تھا ۔

"کون ہو تم ۔؟ اس اندھیرے میں کھڑے کیا کر رہے ہو ـــــ؟؟" اس نے جرأت کرکے بڑے اعتماد سے سائے سے پوچھا ـــــ

"میں ـــــ؟ اندھیرے کا راجا ہوں ـــــ تاریکی کا شہنشاہ ـــــ تیرگی کا حاکم ـــــ!!!"

"تم ـــــ؟ ـــــ راجا ۔؟ ـــــ شہنشاہ ۔؟ ـــــ حاکم ۔؟؟؟؟"

"ہاں! ہاں! بالکل ۔!" اس بار سائے نے زور کا قہقہہ لگایا ۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے لوہے کی بہت سی چادریں آپس میں ٹکرا رہی ہوں ۔

"لیکن یہاں اکیلے کھڑے کیا کر رہے ہو ۔" کہہ کر وہ گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا ۔ پاس ہی بڑے بڑے صندوق پڑے تھے ۔

"اکیلے کھڑا میں تاریکی کی حفاظت کر رہا ہوں ۔"

"حفاظت کر رہے ہو ۔؟ تو پھر یہ بڑے بڑے صندوق کس لیے ہیں ـــــ؟"

"میں ان صندوقوں میں تاریکیاں بھر بھر کر ایسی جگہ منتقل کر دیتا ہوں جہاں ان کی ضرورت ہے، جہاں لوگ مٹھی بھر تاریکی کے لیے ترستے ہیں ۔"

"تو تم تاریکیوں کے محافظ نہیں، تاریکیوں کے بیوپاری ہو ـــــ! تاریکیوں کے چور ہو ۔!!"

"تم جو بھی کہہ لو ۔! میں بہرحال یہی کرتا ہوں ۔"

"میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا ۔ یہ تاریکیاں ہی سہی لیکن ہماری ملکیت ہیں ۔"

میرے آدمی آگئے ہوں گے ۔ وہ تاریکیوں سے

بھرے صندوق اٹھالے جائیں گے ۔ تم روک سکو تو روک لو!"
"ہاں میں ضرور روکوں گا ۔ میں ابھی ٹارچ روشن
کرتا ہوں ۔ تم تاریکی کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکو گے ۔۔۔!"
"کوشش کرکے دیکھو ۔! اور سنو ۔۔ اندھیرے کے
تیر کا نام سنا ہے ۔۔ ؟"

اس نے جیب سے ٹارچ نکالا اور اس کا رُخ سائے
کے منھ کی طرف کرکے بٹن دبا دیا ـــــــ مگر ۔ مگر ٹارچ
روشن نہیں ہوا ۔ اس نے بار بار بٹن دبایا مگر ٹارچ کے
منھ سے روشنی نہیں نکلی ۔ وہ گھبراہٹ میں پسینے پسینے ہوگیا
اور اس کے منھ سے بے اختیار نکلا ۔ "اوہ' معلوم ہوتا ہے
بیٹری ختم ہوگئی ۔"

"ہاں! تمھاری بیٹری کب کی ختم ہو چکی ہے دوست!
پتہ نہیں تمھیں احساس کیوں نہیں ہے ۔ میرے قوتِ عمل کے
دائرے میں آنے کے بعد روشنی کے تمام ذرائع ختم ہو جاتے
ہیں ۔ سمجھے ۔۔! مومی شمعیں، تیل کے چراغ، بیٹری،
الیکٹرک، سب کچھ ۔۔ سب کچھ ۔ ایک یہ کمینہ سورج
رہ گیا ہے جس پر میں اب تک قابو نہیں پا سکا ۔۔ خیر
کب تک ـــ کب تک ۔ ؟!

اپنی کم مائیگی اور تنہائی کے زیر احساس وہ
بُت بنا کھڑا تھا ۔ اسے خود وہاں اپنی موجودگی پر شبہہ
ہونے لگا ۔۔ پھر تاریکیوں کے بہت سے سائے پس منظر میں
ابھر آئے جو صندوقوں کی طرف بڑھنے لگے ۔

"جلدی کرو! حرامزادو! سورج نکل آیا تو کیا
لے کر جاؤ گے ۔ ؟ کمینے سورج کے قدموں کی آہٹ نہیں سن
رہے ہو ۔ ؟"

تھوڑی دیر کے بعد ہی ـــ تمام سائے تاریکی سے
بھرے صندوق سروں پر اٹھائے جلدی جلدی قدم اٹھائے
مغرب کی سمت بھاگ رہے تھے اور وہ بجھی بجھی آنکھوں سے
دیکھتا رہا ۔

ہاتھ میں مُردہ بیٹری والا ٹارچ لیے اپنی بیچارگی،
تنہائی اور مایوسی کے احساس کے بوجھ تلے یوں دبا جا
رہا تھا جیسے اس کے پاؤں زمین میں دھنستے جا رہے
ہوں ۔ اس کے اندر ہی اندر چیخیں ابھر رہی تھیں ـــ
"یہ ستارے جو خاموشی سے صرف آنسو بہا رہے ہیں نیچے
اتر کر تاریکیوں کو اپنی پناہ میں کیوں نہیں لے لیتے،
ورنہ اس طرح تو یہ لوگ ہماری تمام راتیں چرا کر لے
جائیں گے ـــ پھر ـــ پھر ۔ ؟؟

پھر تو ستاروں نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔

نِروان

ایوب جوہر
بنگلہ دیش

■ آپ کو یقین نہیں آئے گا اور خود اسے بھی یقین نہیں آرہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ ٹریفک کے بیچ میں پھنس چکا تھا۔۔۔

اس نے اپنی انگلیوں سے اپنی کھوپڑی پر دو چار ٹھوکے لگائے۔ شاید لمحہ دو لمحے پہلے۔ شاید گھنٹہ دو گھنٹے یا شاید کئی دن، کئی مہینے، کئی سال یا کئی صدیاں پہلے وہ راستہ کراس کر رہا تھا کہ عین راستے کے بیچ میں ٹریفک کے درمیان پھنس گیا۔ جب سے اب تک وہ زور زور سے چیخ رہا ہے۔

"کم بختو مجھے نکالو۔ میں بیچ راستے میں پھنس گیا ہوں۔۔۔"

"اے ٹرک ڈرائیور!"

"اے بھیا رکشہ والے!"

"او' کار والا صاحب!"

"او' بس والے بھائی! ۔"

لیکن کسی بھی بھائی یا صاحب کے کان پر جوئیں نہیں رینگ رہی ہیں، شاید اس لیے کہ جوئیں رینگنے کا محاورہ فرسودہ ہو چکا ہے، اتنا ہی فرسودہ جتنا کہ خود وہ ۔

اس نے ایک بار پھر اپنے ذہن کی انگلیوں پر جوڑنے کی کوشش کی، لیکن بے سود، اسے حساب نہ مل سکا کہ کب سے وہ ٹریفک کے درمیان پھنسا ہوا راستے کے بیچ میں کھڑا ہے اور اپنے وجود کا چیخ چیخ کر اشتہار پڑھ رہا ہے ۔۔۔ اشتہار جو زمین کے لیے ضروری ہے، اشتہار جو آسمان کے لیے ضروری ہے۔ لیکن زمین اور آسمان میں کتنا فرق ہے؟ اس نے سوچا۔ ہاں، اتنا ہی فرق جتنا کہ مجھ سے سامنے کا فٹ پاتھ۔ وہ فٹ پاتھ جس سے پرے تھوڑی دور آگے جا کر میرا گھر ہے۔ گھر جسے مقبرہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن نہیں وہ گھر ہی ہے، میرا گھر، جہاں میرا منّا بھوک سے بلک بلک کر بلکہ چیخ چیخ کر رو رہا ہوگا اور دودھ کا ڈبّہ میرے ہاتھ میں ہے' اسے خیال آیا۔ وہ تو دودھ کا ڈبّہ لینے کے لیے ہی اپنے گھر سے نکلا تھا کہ بیچ راستے میں پھنس گیا۔ منّا یقیناً رو رہا ہوگا' یقیناً چیخ رہا ہوگا۔۔۔

"اَبے سالو۔۔۔"

"او تورمائری۔۔۔"

"او مانگیر لو آما کے راستہ دے"

"مجھے راستہ دے، میرا منّا رو رہا ہے ۔"

اس کی گردن پر اچانک چڑچڑے پن کا احساس سوار ہوگیا۔ تب ہی اس نے محسوس کیا وہ آدمی نہیں ہے' کتّا ہے' کتّا جو بھونکتا ہے۔ لیکن کون نہیں بھونکتا ۔۔۔؟ ہاں کچھ لوگ واقعی کتے کی طرح ہی بھونکتے ہیں اور کچھ لوگ کسی مہذب کی طرح ۔ تو حاصل جمع یوں ہوا کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں، کچھ بھی ہو اسے فی الحال اس ٹریفک کے ہجوم سے نکلنا ہے۔ ٹریفک جو اس کے آگے بھی ہے پیچھے بھی، دائیں بائیں اور شاید اوپر نیچے بھی۔۔۔۔

اور اسی اوپر نیچے، دائیں بائیں اور آگے پیچھے اس کا

ایک گھر بھی ہے جہاں اس کا کُنبا دودھ کی خاطر بلک بلک کر بلکہ
چیخ چیخ کر رو رہا ہوگا ۔ اور اس کی بیوی ؟ بیوی کا خیال
آتے ہی جیسے اس کے منھ میں کڑواہٹ کا زہر بھر گیا ۔
وہ ——— وہ حرامی ہے بلکہ حراما ۔ لیکن نہیں ، ذرا اس سے
پیچھے جاؤ ——— اور ذرا پیچھے ——— اور ذرا ۔
ناریل کے پیڑ ہوا کے دوش پر جھول رہے ہیں اور ان کے
نیچے دھان کی کھیتیاں کوئی مدھر گیت الاپ رہی ہیں ، اور
ان گیتوں کی لے پر پٹ سن کے چھریرے جسم لہک لہک کر
ڈول رہے ہیں اور ان سے پرے دور بہت دور ناریل کے
پیڑوں سے بھی آگے سورج کا سُرخ گلاب کھل رہا ہے جس کی
گلابی کرنیں ناریل کے پتوں سے چھن چھن کر پھوس کی جھونپڑی
پر اور پھر جھونپڑی کے چھوٹے سے جالنا (کھڑکی) سے گذر
کر اس گلابی چہرے پر اتر رہی ہیں جو کرشنا چوڑا کے پھول
سے بھی زیادہ سندر ہے ۔ اور جس چہرے میں شاپلا اور پدّو
جیسی جہاں تازگی ہے وہیں مہکتی ہوئی راتوں کا لوک گیت
بھی شامل ہے ۔ وہ لوک گیت جس کے ایک ایک بول پر
پوتھو جاری (راہگیر) کے قدم رک جائیں ، نوکا کے پال اتر
جائیں ، مانجھی کے حقے کی گڑگڑاہٹ تھم جائے اور کوئی
بانسری اپنی آواز کھو دے ——— اور وہ بھی اس وقت
اپنی آواز کھو چکا تھا اور لوک گیت کا محض ایک بول ہو کر
رہ گیا تھا ۔ 'لوک گیت' ——— اسے یاد آیا ———
جب پہلی بار وہ اس چہرے کے قریب آیا تھا تو اس کے
ہونٹ کانپ گئے تھے ۔ تمی ——— تمی جیسے اتنو
سندر ، تمارے آمی کی نام دی : (تم ——— تم جو اتنی
حسین ہو تمہیں میں کیا نام دوں !) بات کچھ ایسی ہی
تھی ، پھول کا کوئی الگ نام نہیں ہوتا ، خوشبو کسی اور
نام سے نہیں جانی جاتی اور روشنی کو کوئی دوسرا عنوان
نہیں دیا جا سکتا ۔ وہ ! وہ تھی ، وہ جس میں وہ گم
ہو گیا تھا ———

یہ پیار کا پہلا جھونکا تھا ، یہ محبت کی پہلی خوشبو
تھی ۔ پھر اسے یاد نہیں رہا کہ وہ عشق کی عرفانیت کی
راہ پر کب چل نکلا تھا ۔ اسے صرف اتنا یاد تھا ———
وہ چہرہ جب اس کے باڑی کے آنگن میں اترا تو اسے
یوں محسوس ہوا جیسے اس کے باڑی کی ایک ایک اینٹ
لوک گیت میں منتقل ہو گئی ۔ بجھا بجھا سا گھر چاند نگر بن
گیا ۔ شاپلا اور پدّو میں رات کی رانی مہکنے لگی ۔ اور
کرشنا چوڑا کی ڈالیاں پھولوں سے لد گئیں ——— پھر
کئی موسم نکل گئے ——— وہ چہرہ ٹھیک اس کے گاؤں
کی طرح پھیلتا اور بڑھتا گیا ۔ اور پھر ایسا ہوا کہ گاؤں
پر شہر قابض ہو گیا ۔ اور وہ چہرہ ——— وہ چہرہ
ٹریفک کے درمیان کہیں گم ہو گیا ۔ اچانک اسے خیال
آیا کہ وہ خواہ مخواہ گذری ہوئی بہاروں سے الجھ رہا
ہے ۔ وہ تو ٹریفک کی چنگھاڑتی ہوئی خزاں کی زد پر ہے ۔
ٹریفک جو اس کے آگے ہے ، پیچھے ہے ، دائیں بائیں اور اوپر نیچے
ہے ۔ اور جس کی زد میں وہ کئی لمحوں ، کئی گھنٹوں ، کئی
دنوں ، کئی مہینوں ، کئی سالوں اور کئی صدیوں ———
اچانک اس نے اپنے حلق کے اندر پورا ہاتھ ڈال دیا ۔

"او بھائی رکشہ چالوک !"

"اوئے تور مائری ——— "

لیکن بے فائدہ ۔ اس کے پیار یا اس کی گالیوں کی
زبان سمجھنے کے لیے وہاں فرصت کسے تھی ؟ البتہ اس کی
بے تحاشہ چیخ پر کچھ چہروں کے گڑھوں سے آنکھیں نکل کر
ایک لمحہ کے لیے اس کا استقبال ضرور کرتیں لیکن دوسرے
لمحے غڑاپ سے گڑھوں کے اندر چلی جاتیں اور اپنے پیچھے
محظوظیت کی ایک جلی کٹی مسکراہٹ چھوڑ جاتیں جسے
دیکھ کر تلملاہٹ اور غصے کی لہر اس کی رگ رگ میں

اتر جاتی اور تب ہی اس کی ہذیانی کیفیت اندر سے ابال کھاتی ہوئی ہونٹوں تک آتی اور گالیوں کی قے میں منتقل ہو جاتی ——

"تورمائری —"

"اوماگیر پو۔۔۔"

ایسے ہی ایک لمحہ، ایک دن، ایک ۔۔۔۔۔۔ ہذیانی کیفیت اس کے جسم سے سڑی ہوئی مچھلی کی گندی بساندھ کی طرح ابھر رہی تھی کہ اس کے کانوں میں ایک مانوس آواز اتری ۔

ایکٹی لوگ ۔۔۔۔ ایک شخص عمر پینتالیس سال گذشتہ چند لمحے، چند گھنٹے، چند مہینے ۔۔۔۔ سے گھر سے غائب ہے اگر کسی صاحب کو ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ یہ آواز ۔۔۔ یہ آواز ۔۔۔۔۔ یہ آواز تو اس کے بڑے بیٹے خضر کی ہے ۔ یقیناً وہ مجھے ہی ڈھونڈ رہا ہے ۔ میں جو کہ ٹریفک کے درمیان پھنسا ہوا ہوں اور میں جو کہ ۔۔۔۔ اس کے چہرے پر یکبارگی جیسے قوس قزح جیسے رنگ اتر گئے ۔ اس نے بڑی حقارت سے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے ٹریفک کی جانب دیکھا اور پھر زور زور سے چلانے لگا ——

"بیٹے، میں یہاں ہوں، بیٹے میں یہاں ہوں ۔"

مائک کی آواز اس کے قریب تر ہوتی جا رہی تھی، یہ خضر کی آواز تھی، اس کے چودہ سالہ بیٹے خضر کی ۔ خضر جس نے ہمیشہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ دکھائی ہے اور آج ایک خضر اپنے کھوئے ہوئے باپ کو راہ دکھانے نکلا ہے ۔ وہ باپ جو بیچ راستے میں ٹریفک کے درمیان گھرا ہوا ہے اور بیٹا اس کے ارد گرد مائک سے چیخ رہا ہے ۔

ایکٹی لوگ ۔۔۔۔ ایک شخص عمر پینتالیس سال ۔۔۔۔ اب وہ آواز اس کے کانوں سے لگ گئی تھی اور بیٹا اس کی آنکھوں سے ۔ رکشہ میں دو شخص بیٹھے ہوئے ہیں ۔ ایک اس کا لڑکا جس کے ہاتھ میں مائکروفون ہے اور دوسرا مائک والا جو بیٹری سیٹ اٹھائے ہوئے ہے ۔ اپنے بیٹے کو اتنا قریب پا کر خوشی سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے ۔ اس نے چاہا کہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے بیٹے کو سینے سے بھینچ لے لیکن ہاتھ میں پڑے ہوئے دودھ کے ڈبے کے احساس نے اس کی یہ آرزو پوری ہونے نہیں دی ۔ البتہ ایک بار پھر وہ زور سے چیخا ہے ۔

"بیٹا میں یہاں ہوں ۔ خضر بیٹے ۔۔۔!"

بیٹے نے پلٹ کر ایک بار اس کی جانب دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر ایک چھچھلی مسکراہٹ سمیٹے مائکروفون کو اپنے منھ سے لگایا اور لہک لہک کر ایک فلمی گانا گانے لگا ۔

"میرے انگنے میں تمھارا کیا کام ہے ۔۔۔ جو ہے ۔۔۔"

بیٹے کے اس رویے پر وہ غصے کی چھڑی کی طرح تن اٹھا ۔ لیکن اچانک اسے خیال آیا —— بیٹا شاید ابھی میرے انگنے میں نہیں ہے، وہ اپنے انگنے میں ہے پھر کیوں نہ اس کے انگنے کی آواز بن کر اسے پکارا جائے ۔ اور اس خیال کے آتے ہی وہ اپنے بیٹے کا لہجہ بن گیا ——

"تیرے انگنے میں ہمارا ہی تو کام ہے ۔ جو ہے رستے میں"

لیکن رکشہ تو کب کا ٹریفک کے ریلے میں آگے بڑھ گیا تھا ۔ اور وہ جہاں تھا وہیں اب بھی موجود ہے، اور قوس قزح کے سارے رنگ اس کے چہرے پر کولتار ہو گئے ہیں ۔ اس کا سر جھک گیا —— خیالات کے جونک اس کے ذہن سے چمٹ گئے، —— شاید یہ لوگ پہچانا نہیں سمجھ رہے ہیں، شاید میں بے زبان اور بے وجود ہو گیا ہوں ۔ یا شاید لوگوں کی آنکھیں ہی پتھرا گئی ہیں یا شاید تمام لوگ بے زبان اور بے وجود ہو گئے ہیں ۔ کیا شاید، شاید ہی ہے ۔ پھر حقیقت کی سیڑھی کہاں ہے !

اُس نے پھر اپنے آپ کو اُچکا کر اپنے آگے پیچھے دیکھا،
دائیں بائیں، اوپر اور نیچے دیکھا، لیکن وہ سیڑھی اُسے
کہیں نظر نہیں آئی جو سچائی کی دہلیز تک اسے چھوڑ آتی ۔
اس کے اردگرد صرف ٹریفک ہی ٹریفک تھے ۔ جن پر بے
شمار چہرے پتھر کی مورتی کی طرح لدے لدائے نہ جانے کہاں
جا رہے تھے لیکن کہیں نہ کہیں وہ جا ضرور رہے تھے ۔
شاید اپنے گھر ہی ـــــ گھر! ـــــ میری بیوی وہ
حرامی سہی بلکہ حراما پھر بھی میری بیوی ہے، عشق کی عرفانیت
کی ابتدا اور انتہا ـــــ گو وہ گھر کے چولھے پر چڑھی ہوئی
ہانڈی میں ڈوب چکی ہے لیکن وہ میری زندگی اور کل کائنات
ہے ۔ وہ اگر نہ ہوتی تو میرے سینے کتنے ویران سے ہوتے ۔
میرے چہرے پر پسینہ آیا اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔
کی ہولو آپنار ؟ (کیا ہوا ہے آپ کو؟) اور پھر وہ میری
پیشانی چھو کر کہتی ہے ـــ اُف یہ تو گرم توے کی طرح جل
رہی ہے ۔ آپ کو تو بخار ہے، آپ دوا کیوں نہیں ۔ ۔ ۔
لیکن دوا سے کیا ہوگا ۔ یہ بخار تو مجھے وہ خود دیتی رہتی
ہے ۔ کبھی باڑی والا کا چہرہ میرے سامنے رکھ دیتی ہے،
کبھی دھوبی کا، کبھی بچوں کے اسکول کا تو کبھی دودھ کا خالی
ڈبہ ـــ ہاں، دودھ ـــ منا ـــ منا دودھ کی خاطر
چیخیں مار مار کر رو رہا ہوگا ـــ رویا کرے، جہنم میں جائے
منا ونا ۔ آخر ایک منا تو تھوڑی دیر پہلے بھی آیا تھا ۔ وہی،
خضر کا بچہ، جو مائک سے چیختا پھر رہا ہے کہ اس کا باپ گم ہو
چکا ہے لیکن باپ کو دیکھ کر پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے
اور مائک پر فلمی گانا ـــــ نہیں میں کسی کے لیے
نہیں ہوں، میں صرف اپنے لیے ہوں ـــ لیکن فی الحال اپنے
لیے بھی کہاں ؟ ـــ وہ تو ٹریفک کی گتھم گتھی کے لیے
ہے ۔ ٹریفک، جو اُس کے سامنے ہے، جو پیچھے ہے، دائیں،
بائیں اور اوپر نیچے ہے ۔ اور ۔ ۔ ۔ اور پھر وہ فیصلہ
نہیں کر سکا کہ وہ کس کے لیے ہے ۔
لیکن اسے فیصلے کے کسی نہ کسی موڑ پر پہنچنا ہے ۔
وہ اگر اپنے لیے ہے تو کیوں ہے اور اگر دوسروں کے لیے ہے
تو کیوں ہے ؟ لیکن ابھی اس کا موقع نہیں ہے ۔ وہ اپنے
گھر میں چیئر پر کوئی دماغ سوزی کا کام نہیں کر رہا ہے ۔
وہ تو ٹریفک کے درمیان پھنسا ہوا ہے جس سے آزاد ہو کر
اسے سامنے والے فٹ پاتھ پر پہنچنا ہے ۔ جس فٹ پاتھ سے
ذرا آگے اس کا گھر ہے ۔ گھر، جو جنت بھی ہے اور مقبرہ بھی ۔
گھر، جہاں اس کی بیوی بھی ہے اور حراما بھی ۔ گھر، جہاں
منا بھی ہے اور خضر بھی ـــ لیکن منا ـــــ ہاں منا دودھ
کی خاطر تڑپ رہا ہوگا، روتے روتے اس کی گھگھی بند
ہو گئی ہوگی ۔ اور دودھ کا ڈبہ میرے ہاتھ میں ہے ۔ نہیں میں
ایک جگہ ایسا ہو کر رہ گیا ہوں ۔ نہیں مجھے یہاں سے نکلنا
ہے ۔ لیکن کیسے ؟ ـــ میں راستے کے بیچ بیچ چلتے ہوئے
ٹریفک پولس تک پہنچ سکتا ہوں جو مجھ سے چند قدم کے
فاصلے پر ہی اپنی گومٹی میں کھڑا ہوا اپنے دونوں ہاتھ لہرا
رہا ہے وہ یقیناً مجھے راستہ پار کرا دے گا ۔ اس خیال کے
آتے ہی جیسے اس کی آنکھوں میں سگنل کا گرین بلب
روشن ہو گیا ۔ اور پھر وہ راستہ کے بیچ بیچ ٹریفک
پولس کی جانب کھسکنے لگا ۔ اس کھسکنے کے عمل میں اسے
زیادہ دیر نہیں لگی ۔ وہ جلد ہی پولس کی گومٹی کے قریب
پہنچ گیا اور نہایت عاجزی سے ٹریفک پولس سے درخواست
کرنے لگا ۔ سارجنٹ سر، آمی ـــ میں اسی فٹ
پاتھ پر جاؤں گا خدا کے لیے مجھے جلد پار کرا دیجیے ـــ
(ایک کانسٹبل کو وہ سارجنٹ کہہ رہا تھا، بیوقوف
نہیں تھا) سارجنٹ سر کے الفاظ نے کانسٹبل کو ایک
لمحے کے لیے اس کی جانب متوجہ کیا ۔ لیکن دوسرے لمحے سارجنٹ
محض ایک کانسٹبل بن گیا جس کے چہرے پر "چیک" کا ایک

تمسخر تھا اور اس کے چہرے پر کولتار کا ایک لیپ اور ——
—— وہ سوچنے لگا ۔ پولس کانسٹیبل کو اس کی ذمہ داریوں
کا احساس دلائے ۔ ممکن ہے یہ عمل پتھر میں جونک لگانے کا
باعث ہو ۔ یہ سوچ کر وہ چیخ چیخ کر تقریر کرنے لگا ۔ اور
پھر کئی لمحے، کئی گھنٹے، کئی دن، کئی مہینے، کئی سال اور
کئی صدیاں گذر گئیں —— اس نے آنکھ اٹھا کر کانسٹبل کی
جانب دیکھا ۔ لیکن کانسٹبل کے چہرے پر جونک نہیں تھا "
البتہ اس کے ہونٹوں سے ایک "چک" چمٹی ہوئی تھی ——
اور تب ہی ایک بار پھر اس کی گردن پر چڑچڑے پن کا
احساس سوار ہو گیا ۔ اور تب ہی اس نے محسوس کیا کہ
وہ آدمی نہیں ہے کتا ہے ۔ کتا جو بھونکتا ہے ۔ لیکن اب
بھونکنے کی صلاحیت بھی اس میں نہیں رہی ۔ جسم ٹوٹ
کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے ۔ اور ذہن ؟ —— اچانک
اسے احساس ہوا کہ ذہن کے خالی پن نے اسے پورا کا پورا
خالی کر دیا ہے ۔ اور اس کا وہ ہاتھ بھی خالی ہے جس
میں دودھ کا ڈبہ دھرا ہوا تھا ۔ اس نئے انکشاف نے
اسے اور بوکھلا دیا ۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں زور زور سے جھاڑنے
لگا ۔ لیکن دودھ کے ڈبہ کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ پھر اس نے اپنے
ذہن کے اندھیرے میں اپنے ہاتھ ڈال دیے لیکن وہاں بھی
دودھ کا ڈبہ نہ تھا ۔

سپنا؟ خواب ؟ —— لیکن نہیں، یہ سپنا نہیں یہ
حقیقت ہے، وہی حقیقت جو اس کے سامنے ہے ۔ جو اس کے
پیچھے، دائیں، بائیں اور اوپر نیچے ہے اور اس سچائی کے نگر کا وہ
تنہا باسی نہیں، وہ سب ہیں جو میرے آگے ہیں، پیچھے ہیں،
میرے دائیں بائیں اور جو میرے اوپر ہیں اور نیچے ہیں ۔

اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی جگہ دھب سے بیٹھ گیا ۔
اور تب لوگوں نے دیکھا کہ زمین کی کوکھ سے آناً فاناً ایک برگد کا
درخت ابھرا، پھیلا اور نروان کی چھتری بن کر اس پر تن گیا

رحمٰن حمیدی

دودمانِ عسل

زنبورانِ عسل کی مہارانی کے باریک پنکھ دُودھ کی طرح صاف و شفاف اور ابرق کی مانند چمکدار تھے۔ مہارانی کا نرم و ملائم جسم بیش قیمت جواہرات کی طرح درخشاں تھا۔ مہارانی کی ننھی ننھی یاقوتی آنکھوں میں بے پناہ حسن و جمال پنہاں تھا۔ مہارانی کا عودی عودی رنگ انتہائی دلکش اور جاذب نظر تھا۔ وہ تنہا پھول کی ہری ڈالی پر بیٹھی، تازہ ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے رنگ برنگ کے پھولوں، پودوں اور مکھیوں پر اس نے تاسف آمیز نگاہ ڈالی۔ زنبورانِ عسل اوراق گل اور چھوٹے چھوٹے پودوں کی ہری ہری پتیوں پر زردانہ ملا رہی تھیں۔ مرغزار کی مکھیاں شہد کے چھتے تک پہنچ کر عرقِ گل کی تھوڑی سی مقدار خانہ گرد مکھیوں کے کشادہ دہن میں ڈال رہی تھیں۔ زنبوران عسل کا کارخانہ حرکت آلود تھا۔ شہد کی ایک ایک مکھی اس مقولے کی آئینہ دار تھی کہ 'حرکت میں برکت ہے'۔ زنبوران عسل کے پردۂ ذہن پر منقش تھا کہ عروجِ حیات کا سربستہ راز جد و جہد میں مضمر ہے۔ چہرے کی برنائی اور پنکھوں کی رعنائی اسی سے قائم و دائم ہے۔ شہد کی ہر مکھی جد و جہد، ثابت قدمی، دلیری، مستقل مزاجی، وفاداری اور باہمت زندگی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ ایک ایک مکھی کا نظم و ضبط اس "وقت پیما" کی طرح تھا جو کبھی ایک لمحہ کا ہزارواں حصہ بھی ضائع نہیں کرتا۔ شہد کے چھتے پر زنبوران عسل اس طرح مصروف عمل اور سرگرم نظر آتیں جیسے کسی شہنشاہ کا محل زیر تعمیر ہے اور ان گنت مزدور اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔

ہر مکھی علی الصباح خواب سے بیدار ہوتے ہی فیکٹری ورکرس کی طرح عرق گل کی کشید اور عسل سازی کی پیچیدہ کاریگری میں لگ جاتی۔ محنت و مشقت ان کی سرشت تھی اور تخلیقِ عسل ان کا مقصد حیات تھا۔ ان کی بے مثال سعی و کاوش کے باعث عسل کی فراوانی تھی، خوشحالی تھی۔ صنوبر کی شاخیں شہد کے چھتوں سے اس طرح بھری رہتیں جیسے حلوائی کی دوکان پر مٹھائی لگی رہتی ہے۔ قدیم، پراسرار، غیر مخلوط، بے آمیزش اور شیریں غذا —— شہد!! لیکن وہ وقت کچھ اور تھا۔ پیمانۂ گل رس سے بھرا رہتا تھا۔ گلوں میں عرق کی فراوانی تھی —— شہد کی مکھیاں وسعتِ عرق سے سرشار رہا کرتیں۔ ہر مکھی مہارانی کی وفادار تھی۔ مکھیوں کا لائحہ عمل اشرف المخلوقات کے لیے باعثِ تقلید تھا۔ بات بات پہ ہماری کیمیا سازی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ ہماری حیثیت دنیا کی سرخ اور باعزت قوم سے کہیں زیادہ تھی لیکن اب وہ پھول کہاں؟ اب وہ نسل اور وہ دل و دماغ کہاں؟ اب تو صرف عہد کہنہ اور شوکتِ دیرینہ کی میٹھی اور شیریں یادیں ہیں۔

حالاں کہ پھول اور مکھی علیٰ حالہ ہیں۔ مٹی میں کیسی ملاوٹ آگئی کہ پھولوں کا باطنی روح مجروح ہو گیا جس کی وجہ سے کیمیائے عسل و موم انحطاط پذیر ہے۔ تیار شدہ شہد کی مقدار مکھی چوس یا بخیل کی خیرات کی طرح ہے دیگر مکھیوں کا سوال تو درکنار رہا خود زنبوران عسل کی نوعمر مکھیوں کے لیے ناکافی ہے۔ نئی نسل کی حیات و ممات کا پیچیدہ مسئلہ مہارانی کے سامنے تھا۔

مہارانی جہاندیدہ اور تجربہ کار تھی۔ جہانبانی اور حکمرانی اس کی میراث تھی۔ سیاسی اور انقلابی بصیرت و فراست سے سرشار تھی۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز کی چشم دید ہستی تھی۔ اس کا عینی مشاہدہ تھا کہ کوئی بھی قوم آبائی مٹی اور فطری محور سے ہٹ کر زندہ جاوید نہیں ہو سکتی۔ پر فریب انقلاب اور مفلوج تحریک پوری قوم کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اس کی رگوں کا زندہ خون مردہ اقوام کی طرح خشک ہو جاتا ہے۔ اس کی سرشت کی جملہ خوبیاں خوش فہمی کی گود میں گہری نیند سو جاتی ہیں۔ تعمیراتی جذبات اور صحت مند نظریات فنا ہو جاتے ہیں۔ فہم و ادراک کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ حقیقت و اصلیت کی ماہیت سے چشم پوشی اس قوم کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ لایعنی چیخ و پکار، سنہری آوازیں، مفلوج صدائیں اور مکروہ آہیں اسے محبوس کر لیتی ہیں اور وہ ہر چمکنے والی چیز کو سونا تصور کرنے لگتی ہے ——— !

مہارانی شہد کی مکھیوں کو آتے دیکھ کر محل کے اندر چلی گئی۔

شہد کی مکھیوں میں برساتی مینڈک کی طرح رہنما پیدا ہو چکے تھے۔ انھیں شہد کی مکھیوں کے مابین برتری اور بالادستی کی شدید آرزو تھی۔ عام مکھیاں انھیں دانائے راز اور بینائے حکمت تصور کرتی تھیں۔ ان مکھیوں کی شاہی محل میں آمد و رفت تھی اور ایوان کے بالادست حکام سے گہرے رابطے تھے۔ ہر لیڈر کا اپنا اپنا گروہ تھا۔ ہر گروہ میں مکھیوں کی ہزاروں اور لاکھوں تعداد تھی۔ گروہ میں شامل ہونے والی شہد کی مکھیاں اپنی جماعت کے آئین مقاصد سے بے بہرہ تھیں۔ انھیں اپنے رہنما کے مطمح نظر کی بھی واقفیت نہ تھی۔ خود ان کے خود ساختہ رہنما کے سامنے کوئی واضح فلسفۂ حیات یا بلند نظریۂ حیات نہ تھا۔ گروہ، فرقہ بندی، اور شاہی محل کے گھیراؤ نے انھیں ایسے دروازے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں سے المناکی و کربناکی لمحہ بہ لمحہ، قطرہ بہ قطرہ ان کے وجود میں سرایت کر رہی تھیں۔ ان کے سامنے صرف سنہرے نعرے، بلند بانگ دعوے، عارضی تسلی اور خوش فہمی کی باتیں تھیں۔ ہر شہد کی مکھی اپنے رہنما کی تائید میں بھنبھناتی رہتی ———

عام طور پر سہ پہر کے وقت سرخ سورج کا سرنگوں ہو جانا، درخت کی نچلی شاخوں سے سورج کی کرنیں دم توڑنے لگتیں باد نسیم کے جھونکے چلنے لگتے۔ دھیرے دھیرے مکھیوں کی آمد شروع ہو جاتی۔ گھنٹے دو گھنٹے میں مکھیوں کی تعداد اتنی کثیر ہو جاتی کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ مکھیوں کا بے پناہ سمندر حد نگاہ تک ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ لیڈر نما مکھیوں کی بے ربط اور بے معنی بھنبھناہٹ پھیلنے لگتی۔

پہلا لیڈر ——— موسم بہار کا اختتام اور موسم گرما کا آغاز ہماری حرکت و عمل کا پر بہار موسم ہے۔ ان ایام میں پھولوں سے بڑی مقدار میں رس خارج ہوتا ہے۔ اس وقت ہماری برادری حرکت میں آتی ہے اور تن من، دھن کی بازی لگا دیتی ہے لیکن اس جان سوز اور جسم شکن محنت کا ثمرہ ہمیں کیا ملتا ہے ———؟

دوسرا لیڈر ——— ہمیں کاتب تقدیر سے بھی شکایت ہے۔ ہم عرق گل کی کشید میں لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ دو سے چھ ہفتے کی سخت مشقت کے بعد ہم تھک کر زمین پر گر جاتے ہیں

اور تڑپ تڑپ کر بے بسی سے دم توڑ دیتے ہیں اور فوراً ہی
ہماری معصوم و ناتواں اولاد کے نرم و نازک شانے پر عسل
سازی کی ذمہ داری آجاتی ہے ۔ نئی نسل کو عرقِ گل کی کشید
پر مجبور کیا جاتا ہے ۔ آخر یہ کون سا صنعتی قانون ہے؟
تیسرا لیڈر ـــــ ہم عاشقانِ گل کی آزمائش میں
صرف ہماری ذات کھری ثابت ہوئی ہے ۔ ہم گلوں کی
چاہت میں دار و رسن سے کھیلتے ہیں ۔ ہم بھونروں،
رنگ برنگی تتلیوں، اور گنگنانے والے چھوٹے چھوٹے کیڑوں
کی طرح ایک کلی سے دوسری کلی اور ایک پھول سے دوسرے
پھول پر نہیں جاتے اور ہر قسم کا زر دانہ نہیں ملاتے رہتے ۔
ہم ایک ہی پھول سے نباہ کرتے ہیں ۔ ہماری والہانہ پن
دنیا تسلیم کر چکی ہے ۔ ملکہ عالیہ کو ہمارے مسائل پر غور و
فکر کرنا ہوگا ـــــ !

چوتھا لیڈر ـــــ سیرت کی استواری اور حیات کی
تعمیر بڑی اونچی صفت ہے ۔ ہمیں اس کی نشو و نما کے لیے ہر ممکن
سعی کرنی ہے ۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم اپنی قسمت
کی لکیر خود کھینچتے ہیں ۔ اس کے باوجود آمریت نے ہمیں محصور
کر رکھا ہے ۔ ہم اس سے نبرد آزما ہیں ۔ ہماری زندگی پر
آمریت کی غاصبانہ اجارہ داری اور سفاک سیاست کی
شطرنجی چالیں اس طرح مسلط ہیں کہ کاتبِ تقدیر پر مکمل
اعتماد و یقین ہونے لگا ہے ۔ ہم ان عظیم عناصر کی پھیلی
ہوئی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ، ہم سیاسی بازیگروں
کے سامنے بے بس اور مجبور ہیں ـــــ !

پانچواں لیڈر ـــــ ایک مکھی کیا نہیں کر سکتی ۔ ہم نے
قدرت کی قوتوں پر قابو پا لیا ہے ، بحر و بر ہماری زد میں ہیں،
چاند اور ستارے ہمارے زیرِ نگیں ہیں ، ارض و فلک پر ہمارا
قائد بڑھتا ہی جا رہا ہے ۔ ہمیں قنوطیت سے منحرف ہو کر
رجائیت کی جانب قدم اٹھانا ہے ۔ ہم نے ابھی صرف چاند کی
مسافت طے کی ہے ۔ ہماری منزل ابھی بہت دور ہے نیلگوں
افلاک کے آگے ـــــ !!

چھٹا لیڈر ـــــ میں پیش رو لیڈر کے خیالات سے
متفق نہیں ۔ ہماری کاوشوں کے نتائج صرف اس حد تک
ظہور پذیر ہیں کہ ہمیں قدرت کی وسعت کا اندازہ ہوا
ہے ۔ ہم نے گلوں کی خوشبو سونگھی ہے ، پھولوں کا عرق
نچوڑا ہے ، رنگ برنگ کے پھولوں کا ذائقہ چکھا ہے ، ہم
حیات و ممات کے دوراہے پر ایستادہ ہیں ، ہم خیالات و
تصورات کے شیش محل میں بیٹھ کر چاند ستاروں کی موہوم
باتوں میں الجھے ہوئے ہیں ۔ ہمیں خود اپنے وجود کی بے ثباتی
کی خبر نہیں ۔ ہماری کیمیا گری گلوں کی فیاضی پر قایم ہے ۔
اگر آج اوراقِ گل عرق کی تخلیق مسدود کر دیں تو کل ہماری
نسل مفلوج ہو جائے گی ۔ ہماری صنعت و حرفت دھری کی
دھری رہ جائے گی ، یہ کامرانی بھی کوئی کامرانی ہے ۔ آسمان
پر کمندیں ڈالنے والا کسی اور کا دستِ نگر ہے ، افسوس ، صد
افسوس ـــ !! ناپائدار حیات کا بوجھ اٹھانے والی ذی روح
کی زبان پر مہرِ تاباں کی باتیں ـــــ !!

ساتواں لیڈر ـــــ محنت ہماری تقدیر ہے اور عمل
ہماری حیات ہے ، ہمیں مدتِ حیات کو بھی ملحوظ رکھنا
ہے ۔ دورانِ حیات محنت کا ثمرہ ہمیں کیا ملتا ہے؟ ہم بھوکے
پیاسے فنا کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں ۔ ہماری لحد بھی ہماری
حیات کی طرح بے نام و نشان ہے ۔ ہمیں اربابِ اقتدار سے
اپنا حق تسلیم کرانا ہے ورنہ ہماری مساعیِ جمیلہ بے سود
اور لاحاصل ہے ـــــ !

آٹھواں لیڈر ـــــ حقوق کی دستیابی امرِ محال ہے
حقوق کی بازیابی کے لیے بغاوت کی آگ جلانی پڑتی ہے ۔
انفرادی مفاد سے ہٹ کر اجتماعیت کے پرچم تلے اکٹھا
ہونا ہوگا ۔ ہمیں ہر لحاظ پر اتحاد کی ضرورت ہے ورنہ ہم

ملکہ عالیہ سے کچھ بھی نہیں لے سکتے ــــــ!

شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ فضا میں گونجنے لگی

ہم ایک ہیں ــــ!

ہم ایک ہیں ــــ!

ہم ایک ہیں ــــ!

زنبوران عسل کی بھنبھناہٹ سے زبردست شور و غوغا کی کیفیت چھا جاتی اور پھر ایسا شور بلند ہوتا کہ زیر درخت جانوروں کے کان کھڑے ہو جاتے، شاخوں سے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ جاتے، گھاس میں چھپے خرگوش، بچھو، سانپ، جھینگر، گرگٹ اور زہریلے کیڑے مکوڑے خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگتے۔ جس کو جدھر راہ ملتی بے تحاشہ بھاگ کھڑا ہوتا۔ دھیرے دھیرے سورج مغرب کی درختوں کے پیچھے جا چھپتا۔ بھنبھناتی مکھیوں کی چیخ و پکار ان کے حلق کے لحد میں ہو جاتی۔ مکھیوں کی انگنت تعداد شور و غوغا کے درمیان فنا ہو جاتی۔ لیڈروں کی بھنبھناہٹ سننے اور سمجھنے کی سعی میں بے شمار مکھیاں جاں بحق ہو جاتیں آہستہ آہستہ پورے جنگل پر ہیبت ناک سکوت طاری ہو جاتا۔ نہ کسی مکھی کی آواز آتی نہ کسی کیڑے مکوڑے کی آواز سنائی دیتی۔ صرف رہ رہ کر گرگٹ کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کرتی۔ رات سیاہ اور تاریک ہو جاتی۔ جگنو ننھے ننھے چراغ لیے چاروں طرف گشت کرنے لگتے۔ عارضی اور غیر اطمینان بخش سکوت ــــ!!

دوسرے دن پھر مکھیاں شاخوں پر جمع ہو جاتیں اور بھنبھنانے لگتیں۔ یہ ان کے آئے دن کا معمول تھا۔ ان کا مطمع نظر اور شیوۂ حیات تغیر پذیر تھا۔ عسل سازی کے فن پر ان کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی۔ ان کے پنکھ جھڑ رہے تھے۔ ان کے جسم و جاں میں ناتوانی سرایت کر رہی [illegible]

نشستند، گفتند و برخواستند کے وہ عادی ہو بیٹھے تھے۔ مہاراتی اور بالادست مکھیوں کی تضحیک سے انہیں بڑی مسرت ہوتی۔ زنبوران عسل کے قائدین ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے۔ عام مکھیوں کے اندر بھی یہ افواہ پھیل رہی تھی کہ ان کے رہنما کردار کے بجائے صرف گفتار کے غازی ہیں۔ رہنماؤں میں مصلحت اندیشی، مفاد پرستی، خوشامد پسندی اور چاپلوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ قائدین کو گروہ کے نمائندے کی حیثیت سے ایوان کے اندر کرسی مل چکی تھی۔ وہ مکھیوں کے مفادات کو بالائے طاق رکھ کر مزید اونچی کرسی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ عام مکھیوں کے اجتماع میں ایک رہنما دوسرے رہنما پر غداری کا الزام عائد کرتے، عدم موجودگی میں ایک دوسرے کی ہجو گوئی کرتے، غیبت اور بدگوئی ہر لیڈر کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا، چغلی اور غیبت بیان کرنے کے بعد ہر لیڈر خود کو مکھیوں کا واحد مفاد پرست لیڈر ثابت کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا۔ زنبوران عسل کی انقلابی مہم کو نافہم آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ مڈے اور برنیاں دور تماشائی کی طرح انقلابی کھیل سمجھنے کے لئے کوشاں تھیں۔ کیڑے مکوڑے سر اٹھا اٹھا کر دیکھتے اور سہم کر گھاس پھوس میں چھپ جاتے ــــ

ایک دن ــــ!!

زنبوران عسل کے رہنما شاہی محل کا محاصرہ کیے ہوئے سیدھے نعرے لگا رہے تھے۔ اچانک ایوان کے اندر جنبش ہوئی۔ پہلے تو شہد سے ملحق موم پر ہلکی سی حرکت ہوئی، اور پھر دیکھتے دیکھتے ایک سبز مکھی نمودار ہوئی۔ اس کے پنکھ ہیرے جواہرات کی طرح دمک رہے تھے۔ یہ ایک عمر دراز اور تجربہ کار مکھی تھی۔ یہ ملکہ عالیہ کی ہم نشین اور ہم نوالہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ قوت [illegible]

غمگسار و غمخوار سمجھی جاتی تھی اور کرسم نما محل کی بلندی پر ایستادہ تھی۔ اسے دیکھ کر مکھیوں کی بھنبھناہٹ بند ہوگئی۔ ساری مکھیاں اپنی اپنی باریک اور نحیف ٹانگوں پر اچک اچک کر سبز مکھی کی جانب دیکھنے لگیں۔ آخر کار سبھی مکھیوں نے اسے دیکھ لیا۔ سبھی مکھیاں اس کا بے حد احترام کرتی تھیں کیوں کہ وہ ملکۂ عالیہ کی ہم جلیس تھی۔ لیڈر نما مکھیاں اس سے خوفزدہ تھیں، کیوں کہ وہ ان کے اور مہارانی کے درپردہ تعلقات سے اچھی طرح واقف تھی۔ بعض مکھیاں اس لیے ہراساں تھیں کہ اسی مکھی کے بیان پر شاہی عتاب نازل ہوا تھا۔ شاہی خاندان موم و عسل کا خاندانی وارث تھا۔ اس کی حکمرانی صدیوں سے قائم ہے اور اس خاندان سے ٹکر لینا لوہے کے چنے چبانے کی مصداق ہے۔ بے شمار مکھیوں کے دردناک انجام سے واقف تھے ——

مکھیوں نے اپنے اپنے پنکھ ہلا ہلا کر سبز مکھی کا استقبال کیا۔ سبز مکھی نے خوبصورت چہرے کی جنبش سے خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے جم غفیر کا جائزہ لیا۔ بے ضمیر مکھیوں کی مخلوط بھنبھناہٹ انہماک سے سنی۔ پرچم انقلاب کے زیر سایہ نعرہ لگانے والی مکھیوں کی صدائیں سنی۔ مکھیوں کا ہجوم بیکراں سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ سبز مکھی زنبوران عسل کی اتحاد باہمی سے متاثر ہوئی۔ ساری مکھیاں دم بخود ساکت تھیں سبز مکھی نے اپنی بھنبھناتی آواز سے حاضرین کو خطاب کیا۔

مجاہدین موم و عسل ! میں آپ کی بے آواز اور بے نام اتحاد کا دل سے احترام کرتی ہوں۔ میں نے آپ کے جملہ مسائل پر ملکۂ عالیہ سے گفت و شنید کی ہے۔ مہارانی ہر قسم کی مراعات کے لیے تیار ہیں۔ اب موم و عسل کی صنعت آپ کی ملکیت ہے، شہد کے چھتے پر آپ کا پیدائشی حق تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن مجھے اپنے طور پر کچھ کہنا ہے۔ آپ نے حیات و کائنات صرف پیٹ کی آگ کی روشنی میں دیکھی ہے اسی لیے آپ کی حیات کا محور صرف شکم پروری ہے حالاں کہ شکم سیری حیات کی ثانوی شے ہے۔ عظیم جاندار اور قوی تر حس رکھنے والوں کی نگاہیں وسیع و بلند ہوتی ہیں۔ اور ان کا نظریۂ حیات بلند و بالا ہوتا ہے۔ مابعد دیگر جاندار ان کے پیش رو نشانات کی روشنی میں حیات کی منزلیں طے کرتے ہیں - - - -

دوران تقریر ایک مکھی سامنے آئی اور چند انگشت کی بلندی سے بھنبھناتے ہوئے جواباً عرض کیا

"ہم ایسی غذا کو لات مارتے ہیں جو ہمارے ضمیر کو مردہ اور ہماری آواز کو بے آواز کر دے، ہمارے پنکھوں کی پرواز چھین لے۔ ہماری مانگ باوقار زندگی اور سدا بہار عزت کی مانگ ہے۔ ایسی زندگی جو سرمستی و بلندی سے بھرپور اور عز و جاہ سے ہم آہنگ ہو ——!!"

وہ مکھی دوسری مکھی کے جسمانی وجود پر آکر بیٹھ گئی —

سبز مکھی نے فوراً کہا —— "میں بھی باوقار زندگی کی خواہشمند ہوں۔ میں جانتی ہوں آپ کا عزم مستقل ہے اور آپ کی قوت ارادی کی فرمانروائی مسلم الثبوت ہے، آپ کی ہستی لایعنی اور فضول بھنبھناہٹ کرنے والی مکھیوں سے بلند و ارفع ہے ——

میں عظیم فلاسفر یا عظیم رہنما ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی تاہم مجھے جو تھوڑی بہت فہم و فراست اور قابلیت و استعداد حاصل ہے، اس کی روشنی میں میں آپ کی قیادت کا بار گراں اٹھاؤں گی، میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ملکۂ عالیہ کے شاہی دسترخوان سے باہر نہ آتا۔ لیکن میں صرف آپ کی قیادت کا بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھانے کے لیے شاہی محل سے باہر آگئی ہوں اور خدا نے چاہا تو کیمیائے عسل و موم میں ترقی ہوگی، عزم استوار رہنا چاہیے راستے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اختتام گفتگو پر میں آپ کو ایک خوشخبری

دے رہی ہوں کہ ملکۂ عالیہ سے آپ کے جملہ مطالبات تسلیم کرا چکی ہوں، اب عسل و موم پر آپ کا بنیادی حق ہے اور ہم موسم گرما کے آغاز پر عسل سازی کے مجمع عام سے خطاب کریں گے !"

زنبوران عسل نے بھنبھناتی آواز سے "سبز مکھی زندہ باد" کا نعرہ بلند کیا اور سارا مجمع منتشر ہو گیا — ساری مکھیوں نے چھوٹے چھوٹے رہنماؤں کو چھوڑ دیا اور سبز مکھی کے پرچم تلے اکٹھا ہو گئیں۔ چھوٹے چھوٹے رہنما آپ اپنی موت کا شکار ہو گئے — سبز مکھی نے زنبوران عسل کی قیادت سنبھال لی۔

اگست کا مہینہ تھا، گرمی بہت زیادہ تھی، ہوا نہ صرف صنوبر کے جنگل کی گرم اور دل آزار بو سے بسی ہوئی تھی بلکہ اس میں اور بھی قسم قسم کی خوشبوئیں شامل تھیں۔ چیونٹیوں اور بھونروں کی مشکی بو تھی۔ شہد اور موم کی بو تھی۔ گرم فضا میں طرح طرح کے حشرات الارض رقص کر رہے تھے۔ رنگ برنگ کی تتلیاں تھیں، چمکتی ہوئی مکھیاں تھیں، کالے گبریلے کیڑے تھے جنھیں "سینٹ انتھونی کے گائے کہتے ہیں" باریک اور ریشم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی طرح یک روزہ حیات والی مکھیاں تھیں۔ سرخ بیر بہوٹیاں تھیں اور مچھر تھے۔ زنبوران عسل کی ان گنت تعداد چھوٹے چھوٹے پودوں پر تھی۔ قریب ہی ایک منقش پتھر پڑا ہوا تھا۔ سورج الوداعی سلام کے لیے بے چینی سے پر تول رہا تھا۔ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ زوروں پر تھی۔ ہر مکھی کی بھنبھناہٹ میں ایک ہی سوال پنہاں تھا 'ملکۂ عالیہ کی تقریر کا موضوع کیا ہو گا؟' طویل انتظار کے بعد ملکۂ عالیہ کا حفاظتی دستہ نمودار ہوا۔ حفاظتی دستے کے نقیب نے بہ آواز بلند زنبوران عسل کو آگاہ کیا —

ہوشیار، خبردار، عقل و خرد پیش ملکۂ عالیہ، مخلوق آسمانی، پاسبان کیمیائے عسل و موم ملکۂ معظمہ تشریف لا رہی ہیں —— !!

مکھیاں ادب سے صف آرا ہو گئیں۔ اپنے اپنے پروں کو پھیلا کر سرنگوں کر لیا۔ دودھ کی طرح صاف و شفاف پتھر پر شاہانہ وقار و جلال سے ملکۂ عالیہ جلوہ فگن ہوئیں — مکھیوں نے جھک جھک کر سلام کیا اور "ملکۂ عالیہ زندہ باد" کا نعرہ بلند کیا۔ ملکۂ عالیہ نے برق تبسم بکھیر کر مکھیوں کا سلام قبول کیا اور اپنی تقریر کا آغاز کیا ——

دودمان عسل کے جانباز مجاہدو! ہم پاسبان عسل و موم ہیں، یہی ہماری میراث ہے۔ ہماری فن کیمیا پر زمانے کی حریصانہ نگاہیں ہر وقت لگی رہتی ہیں۔ ہم دنیا کی اعلیٰ صفت ذی روح ہیں۔ ہماری عظمت کا اعتراف ہر ادوار میں ہوا ہے۔ محل کے قریب افتادہ اس پتھر کی شبیہہ کو غور سے دیکھو، یہ پتھر کے دور کے ایک مصور کی یادگار ہے۔ اس نے غار نما جائے رہائش کی دیوار پر یہ نقش ابھارا تھا۔ اس تصویر میں فنکار نے اپنے ہمسایہ کو شہد کے سنہرے خزانے چوری کرتے ہوئے دکھلایا ہے۔ دنیا اب تک شہد جیسی مرغوب غذا کا بدل نہ تلاش کر سکی۔ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ یہ سنہرا خزانہ روز بروز کم کیوں ہو رہا ہے۔ دراصل ہم سنہرے نعرے کی گونج میں اپنی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ ہمیں از سر نو اپنے لائحہ عمل پر غور کرنا ہے، ہمیں بنی نوع انسان سے بھی ہوشیار رہنا ہے۔ انسان ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں، جان سے مار ڈالتے ہیں، گرم گرم دھوئیں سے بدحواس کر دیتے ہیں تاہم ہم اپنی سرشت نہیں بدلیں گے اور انسانوں کو اپنی ظالمانہ روش پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ مجبور کرتے رہیں گے۔ آئیے ہم سب مل کر عہد کریں کہ اب سال کا آغاز نئے عزم اور نئی لگن سے کریں گے —— !!"

زنبوران عسل نے ملکۂ عالیہ زندہ باد کا نعرہ بلند کیا اور موسم بہار کا اجلاس ختم ہوا۔ مکھیوں میں عارضی سکون کی لہر دوڑ گئی۔

کہانی کہتی ہے

احمد رشید

اس نے سمندر میں جھانکا۔ وہ کنارے پر مجسمہ بن گئی۔ سوچتی ہے سمندر کے شفاف، نیلے اور گہرے پانی میں سورج طلوع سے غروب ہونے تک ڈوبا رہتا ہے۔ اس نے دیکھا اور اپنا وجود دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئی کہ میں بے کردار ہوگئی ہوں، بے حادثہ ہوگئی ہوں۔ لیکن یہ کیسا عجیب حادثہ ہے کہ میری پہچان منفی ہونے کے باوجود، میں سمندر میں ڈوب گئی ہوں؟ میری گناہ پورے منظر پر ہے۔ کیا یہ منظر کا بوجھ ہے؟ پھر وہ کہاں گیا جو مجھ سے کٹ گیا ہے؟ — اس نے نگاہ اٹھائی، سمندر آنکھوں میں ڈوب گیا — "چاندی کے دائرے پھیلتے سمٹتے کناروں کو چھونے کی کوشش میں اپنی انتہا کو چھو کر غائب ہونے یا غائب نہ ہونے کا، یہ سفر دائرے کی طرح کیوں تخلیق ہوتا ہے؟ وہ اپنے آپ سے کہتی ہے — اور کہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دنیا کے وجود سے پہلے میرا پہلا لفظ اس شکتی نے لکھا جب کہ کائنات عدم تھی، بہرحال وہ بھی ایک کائنات تھی جب کہ اس نے عدم سے وجود کی طرف قدم بڑھایا۔ اس کائنات پر ایک دائرہ تخلیق ہوا اس کے درمیان محیط ایک نقطہ۔۔۔۔ نقطہ اور دائرہ ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم — دائرہ نقطہ کے بغیر صرف "نہیں" یعنی "کچھ نہیں" اور دائرہ خود نقطہ کا مرہون منت — دائرہ محافظ تھا نقطہ کا۔۔۔۔ اس لیے اپنی گپھا سے نکل کر دشت کی طرف پھیل گیا۔ اس نے پتھر کے نکیلے ہتھیاروں سے نہ صرف حفاظت کی بلکہ ایندھن اکٹھا کیا اپنے چولہے کے لیے، اپنے پیٹ کے لیے، جبکہ اس نے اپنا نکیلا ہتھیار پھینکا۔ یہ دنیا کا سب سے پہلا تجربہ تھا، دائرے نے حرکات و سکنات کو نطق دینا چاہا۔۔۔۔

اور مجھے اپنی ناک، بھنویں اور انگلی کے اشارے سے یوں سُنایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"ایک اتنا لمبا۔۔۔ با" (دونوں ہاتھوں کو پھیلایا) "اتنا بڑا موں۔۔۔ ہہ۔۔۔۔ موںہہ" (اپنے ہاتھوں کو سکوڑا) "وہ منہہ کھو۔۔۔۔ کھولے تھا" (اس نے اپنا منہ کھول دیا) "اتنے۔۔ بڑے۔ بڑے دانت" (اس نے اپنے دانت کھول دیے) "وہ میری طرف آیا" (اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا) — پھر وہ آگے آیا اور نکیلا ہتھیار دکھاتے ہوئے بولا — "دیکھو۔۔۔ یہ لال لال خون میں نے اس کی گردن میں گھونس دیا" (اس نے اپنی گردن پر ہتھیار پھیرا) ۔۔۔ "اور وہ گر گیا"۔۔۔۔ سامنے شکار مرا ہوا پڑا تھا۔ اس نے اشارہ کیا

نقطہ نے کھلکھلاتے ہوئے اس کی شجاعت کی داد دی —

دائرہ فخر سے اور پھیل گیا

اور ایک رات مجھے سنایا جانے کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ میں

میں خود بخود ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
شب تار کا نصف سے زائد حصہ گذر چکا تھا ۔ دائرہ
پتھر سے پتھر چھیل کر ہتھیار بنا رہا تھا کہ اچانک وہ چونک
گیا جب کہ گپھا میں روشنی ہو گئی ۔ دائرہ اور نقطہ نے
ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں برہنہ تھے ۔ دونوں ایک
دوسرے کو چھپانے کے لیے ایک دوسرے سے چمٹ گئے ۔۔
۔۔۔ دونوں کو احساس ہوا، سردی کا ۔ کیلے کے پتے
اور درختوں کی چھالوں سے سطر پر لنگوٹ کس کر جنگل
میں کود پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ اور زمین کھود کر زر نکالا
۔ ۔ ۔ ۔ گنجِ زر کو اور سر چھپانے کو کچے مکان تعمیر
کیے ۔۔۔۔ تن ڈھانکنے کے لیے پتے سے لے تک کا سفر
کیا، یوں برہنگی اور غیر برہنگی کے درمیان، پردہ
آ گیا ۔۔۔ جب کہ دائرہ اور نقطہ کی تخلیق کا سفر
برہنگی سے شروع ہو کر برہنگی پر ہی ختم ہوتا ہے ۔۔۔
یہ جسمانی سفر ۔۔۔ یہ انسانی سفر ۔۔۔ یہ تہذیبی سفر
۔۔۔ یہ نسلی سفر کے دائرے ۔۔۔ کہاں سے شروع
۔۔۔ ؟ اور کہاں ختم ہوتے ہیں ؟ "ازل" اور
"انتہا" ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں کہ تلاش
کرنے پر صرف باقی ایک سفر ہے، ایک مسلسل سفر ہے
۔۔۔ میری تخلیق اسی سفر میں پوشیدہ ہے ۔
اور جب کہ دائرہ بہت مختصر تھا اپنی کم عمری کی وجہ سے،
تو مجھے سوچا گیا اور بولا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
"اگر یہ کچا مکان کسی قدر اونچا اٹھایا ہوتا تو ہم نے
نیلے سائبان پر لٹکا ہوا روشنی کا گولا پکڑ لیا ہوتا
۔۔۔۔ پھر کبھی رات نہ ہوتی" نقطہ نے کچھ سوچتے
ہوئے کہا
"ہاں" دائرے نے مایوسی کا اظہار کیا
"اچھا ایک بات بتاؤ ۔۔۔ یہ کہاں چلا جاتا ہے ؟
جب کہ رات ہو جاتی ہے" نقطہ نے سوال کیا
"و ۔۔۔ ہ ۔۔۔ وہ ہمارے کھیت سے جو پہاڑی نظر
آتی ہے، اس کی پشت میں جا کر غائب ہو جاتا ہے"
دائرے نے اپنی عقلمندی کا اظہار کیا ۔
"تمہیں کیسے معلوم ہوا" ؟
"میں جب اندھیرے میں کھیت میں ہل لگانے جاتا ہوں،
روز دیکھتا ہوں کہ وہ وہیں سے نمودار ہوتا ہے"
دائرے نے تصدیق کی
"ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ ۔۔۔ ہمیشہ روز روشن
کیوں نہیں رہتا"
"تم پاگل ہو، اگر روز تاریکی میں نہ ڈوبے ۔۔۔
تو ہم دونوں برہنہ کیسے ہوں گے ؟"
"برہنہ تو ہم اس سمے بھی نہیں ہوتے ۔ ۔ چونکہ
رات ہمارا لباس ہوتی ہے" نقطہ نے کہا
"رات لباس نہیں، پردہ ہوتی ہے تیسری آنکھ
کے لیے"
یہ تیسری آنکھ کی اصطلاح ہمیں کہاں سے ملی،
جو ہماری آزادی میں مخل ہے، جب کہ ہماری پیدائش
کے ساتھ آزادی کا جنم ہوا تھا لیکن یہ تیسری آنکھ بڑی
پراسرار ہے اور ہمارا تعاقب کرتی ہے"
"یہ تیسری آنکھ وہ انسانی صحیفہ ہے جو آسمانی صحیفہ
بنا کر ہماری زندگی میں اور ہماری آزادی میں داخل
کر دیا گیا" دائرے نے کہا
اور تب مجھے رات کے پہلے حصہ میں، پہلے ہونٹوں سے لوری
کی طرح یوں سنایا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
"ایک کشتی میں ایک کارواں سفر کر رہا تھا، سمندر میں
طوفان آنے کے سبب تمام کارواں ڈوب گیا ۔
جہاز ٹوٹ گیا ۔ ایک تختہ پر صرف ایک جوڑا بچا

بچہ کو ... بیدار ہی تھی ... سورج آسمان پر تھا اس عورت کو ... تھا۔ عزرائیل علیہ السلام آئے اور انھوں نے عورت کی روح قبض کر لی ... بچہ بلکتا رہا ... روتا رہا ... ہاتھ پاؤں اس تختہ پر پٹختا رہا ... سورج اس حیران کن واقعہ کی تاب نہ لا کر تاریکی میں ڈوب گیا
کہا جاتا ہے اس بچہ کی پرورش اسی تختہ پر ہوئی غیب سے اس کو کھانا دانا مہیا ہوتا رہا ... آخر کار وہ بڑا ہوا ... پانی کے بہاؤ کو کاٹتا ہوا ... کنارے سے لگا ... پہلی مرتبہ اس نے پانی کے بعد درختوں اور انسانوں کی زیارت کی ... پھر بہت جلد ہی خدائے رب ذوالجلال نے ذلالت سے نکال کر جلالت کی مسند پر بٹھایا ... پھر وہ بھول گیا کہ وہ کبھی مظلوم اور مسکین بھی تھا۔ بس اسے اتنا یاد رہ گیا تھا کہ ہوائیں میرے حکم سے چلتی ہیں، سورج، چاند ستاروں کی روشنی میرا ہی جلوہ ہے سمندر کی لہریں میری اجازت سے بہتی ہیں ... پھر اس نے "آسمانی بہشت" ہوتے ہوئے ایک "خاکی بہشت" بھی تعمیر کی ... خدا کو "خدا ثانی" برداشت نہ ہوا ... پھر ... پھر خدا نے اس کو سزائے موت کا حکم سنایا ......
"بچو! اچھے بنو، ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرو، کیوں کہ اس نے زندگی دی، یہ بھی اس کا انعام ہے"
"تو کیا ثانی موت بھی خدا کا انعام ہے؟"
"ہاں ... بچو"
"لیکن ثانی موت سے سب کیوں ڈرتے ہیں؟"
"اچھا خاموش ہو جاؤ ایسے سوالات مت کیا کرو"
بچے ڈانٹ کھا کر لحافوں میں دبک گئے

اور بہت عرصہ کے بعد اور کچھ عرصہ پہلے مجھے یوں پڑھا گیا ...

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

"ایک دائرہ تھا اور درمیان میں ایک نقطہ ...... دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے ... مگر چوں کہ دونوں کے ندی کے دو کناروں کی طرح فاصلہ تھا اور درمیان میں پانی بہتا تھا ... کبھی تیز رفتاری کے ساتھ اور کبھی آہستہ روی کے ساتھ ... دونوں ایک دوسرے کو پانے کے لیے بے قرار رہتے تھے، بیقراری کے اس منظر نامہ میں ایک تجسس قائم رہتا تھا ... اور پڑھنے والے مجھے بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے ... درمیان میں کچھ پراسرار ہیولے نقطہ اور دائرے کے بیچ فاصلہ پیدا کرتے اور وہی ہیولے رحم کھا کر دائرہ اور نقطہ کے اتصال میں مدد کرتے تھے ...... سب خوش ہو جاتے
لیکن ہوا یوں بھی - - - - - - - - - - - -
جب کہ مجھے ندی کے کناروں کی نرم اور ملائم ریت سے نکال کر سنگ و خشت پر گھسیٹا گیا تب مجھے محسوس ہوا کہ دائرہ اور نقطہ کے بیچ ایک ریشمیں رشتہ کے علاوہ ایک رشتہ اور بھی ہے جو بال سے شروع ہو کر ناف پر ختم ہوتا ہے چوں کہ "لو موکشت کین کرتی پاپ" ... تب ہی دائرہ نقطہ کی موت پر ماتم کرنے کے بجائے، پیٹ بھر پوری کھاتا ہے پھر پیٹ بھرنے پر ناچتا ہے، گاتا ہے ... یوں وہ ہزاروں سال لمبی رات سی طوالت کو زرجری کی طرح سکیڑ لیتا ہے ...
... مگر پھر بھی سیاہ رات یوں ہی برقرار رہتی ہے، طوالت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ... حالاں کہ سورج زمین کے قریب آنے کے باوجود ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، جب کہ ہاتھ میں ہاتھ ہوتا ہے ...

شانہ کو شانہ نظر نہیں آتا جب کہ شانہ سے شانہ چھلا
ہوتا ہے ---- سر سے سر ٹکراتا ... دائرے جوق در
جوق بھاگ رہے ہیں تانبے کی سڑک پر سر دھواں
لادے، شاید انھوں نے نئے عہد نامہ کی سوغات صور،
کو پڑھ لیا ہے، دائرے نے یہ بھی سیکھ لیا ہے ...
.. کہ ناف سے پیر کے ناخن تک، ایک پناہ گاہ
ہے کہ جب بھی خوفناک صور کو کانوں سے سنو تو
خواب آور گولیاں کھا کر ناف میں داخل ہو جاؤ۔
... کیوں کہ اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے ؟
طوفان تو ہمیشہ سر کے اوپر سے نازل ہوتا ہے اور
سر سے ہی گذر جاتا ہے، بس ریت میں سر گڑانے کی
تکنیک آنی چاہیے
ایک بات مجھے اور کہنی ہے ----------
کہ یہ طوفان ہر نقطہ، ہر دائرہ اپنے اندر رکھتا ہے،
اس لیے وہ پکی اور سوندھی مٹی سے کٹ گیا ہے ..
... پانی کے بہاؤ سے کٹ گیا ہے ---- نیلا سر کی
بے پایاں وسعت میں ڈوبنے کے باوجود اپنے وجود
کے عدم کی تلاش میں بالکل تنہا رہ گیا ہے سیکڑوں
نقطوں اور دائروں کے درمیان میں ——
اور چوں کہ میرا وجود دائرے اور نقطہ کی وجہ سے برقرار
ہے ... اور دائرے اور نقطہ اپنے وجود کی تلاش میں
سرگرداں ہیں ... اور یہ تلاش ایک سفر ہے ....
ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ارتقا پذیر ہے دائرے
کی طرح ------

اچانک اس نے سمندر کو دیکھا ... ستاروں
کے سمندر میں ڈوب چکا تھا .... اور اس کو اس سناٹے
کا انتظار تھا جو نئی صبح کا پیغام بر ہے .....

بقیہ: اکبر

یوں اپنے اندر کی بھٹی کی تپش بڑھاتا رہا ۔
" اس کی ماں کا ——— انور بھائی یہ کمرہ گندہ ہے
اتنا گندہ کہ یہ کھنڈر بن گیا ہے ۔
اور یہ چالی سالی ۔ بھرا ہوا، ابلتا ہوا سنڈاس ہے ۔
اور یہ محلہ، یہ روڈ، یہ رنڈی بازار ——— کسی
فاحشہ کی شرم گاہ .....
آپ جانتے ہیں یہاں کتنے پاپ پلتے ہیں اور کتنے گناہ کا
بوجھ لیے یہاں مسیح پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں ۔
نہیں آپ اندازہ نہیں کر سکتے
اکبر ایک بھڑوے کا بیٹا تھا ۔
اور
اس کی ماں ایک رنڈی تھی ۔"
پھر اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے جھٹکے سے اٹھایا اور چالی
کی بالکونی میں آکر اس نے سامنے کے ایک نیم تاریک کٹہرے
کی طرف انگلی اٹھا کر مجھ سے کہا
" دیکھیے ..... دیکھیے .... اس رنڈی خانے
میں اکبر کا جنم ہوا تھا ۔ اور سن شعور ...... یہ
کہتے کہتے اس نے بڑی سی قے کر دی ۔
میں نے اس کٹہرے کو غور سے دیکھا
کٹہرے کی سلاخوں سے لگے اب بھی چند سائے کھڑے تھے
... اور .... کسی کے منتظر تھے ۔

جاڑے کی دوپہر : ۱۲ نظمیں

اختر یوسف

(۱)

جاڑے کی دوپہر
دھوپ
تمہارے ساتھ آئی ہے
مرے سامنے
تمہاری گود میں بیٹھی ہے
مری طرف ہمکتی ہے
تم، لال گلابی ہوتی جاتی ہو
لگتا ہے
سیب کے باغوں سے ہو کر آئی ہو
کتنی میٹھی خوشبو
دھوپ میں شامل ہوتی جاتی ہے ●

(۲)

جاڑے کی دوپہر
بڑا سا لان
لان پہ کرسی
کرسی پہ میں
گملے میں تنہا سبز گلاب
دُور دُور تک
سرد سرد سا سنّاٹا ●

(۳)

جاڑے کی دوپہر
کرسی پہ بیٹھی عورت
مونگ پھلی کھاتی ہے
سوندھی سوندھی مونگ پھلی اور
سوندھی سوندھی عورت
دھوپ بھی
اب کتنی سوندھی ہو گئی ہے ●

(۴)

جاڑے کی دوپہر
کھڑکی سے
دھوپ کی اِک تتلی آتی ہے
تمہاری تصویر پہ بیٹھ جاتی ہے
کانچ کے اندر
برسوں سے اُداس تم
مُسکرا اُٹھتی ہو
یہ سوچے بغیر
کھڑکی سے پتھر بھی آتا ہے ●

(۵)

جاڑے کی دوپہر
بادامی سوئٹر میں تم
ابھی ابھی
مرے سامنے سے گزری ہو
اب دھوپ بھی
بادامی ہو گئی ہے
تھوڑی راحت ہوتی ہے
بادامی نشہ ... مرے اندر
اُترا جاتا ہے ۔ ●

(۶)

جاڑے کی دوپہر
دھوپ میں بیٹھا
گنّا پیتا ہوں
تم نے مسکرا کر دیکھا ہے
گنّا اور میٹھا ہو گیا ہے ●

(۷)

جاڑے کی دوپہر
لان میں مرے بچّے
دوڑ رہے ہیں
دھوپ
کتنی پیاری لگتی ہے ●

(۸)

تم گئی تو اپنے ساتھ
دھوپ بھی لے گئی
جاڑے کی دوپہر
کتنی ٹھنڈی ہے
تم، بہت یاد آتی ہو ●

(۹)

جاڑے کی دوپہر
بند کرکے کھڑکی کی پھاٹک سے
ابھی ابھی ڈاکیہ
تمہارا ایک خط دے گیا ہے
تاریک کمرے میں چاروں طرف
دھوپ
پیاری پیاری دھوپ
پھیلی ہے ●

(۱۰)

جاڑے کی دوپہر
کوّا منڈیر پر مسلسل
ڈاکتا ہے
ڈاکیہ کب کا جا چکا ہے
کہیں سے کچھ بھی نہیں آیا
کہیں سے کوئی نہیں آیا
سالا، اب یہ بھی
جھوٹ بولتا ہے ●

(۱۱)

جاڑے کی دوپہر
ٹرین ایک
چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکتی ہے
چائے والوں کے چولھے
مُردہ مچھلی کی طرح ٹھنڈے ہیں
جاڑے کی دوپہر
ٹھنڈی چائے کی طرح
اندر اندر تک اُترتی ہے ●

(۱۲)

جاڑے کی دوپہر
دھوپ میں بیٹھی ہوئی
تم
بڑی سانولی سی لگتی ہو
دیکھو تو ذرا
دھوپ کتنی نمکین ہو گئی ہے ●

مری آنکھ ...

فصیح الزماں

مری آنکھ
بہت دور تک دیکھتی ہے
اندھیروں کے پیچھے، اُجالوں سے آگے
کلیسا، حرم اور شوالوں سے آگے
ہوس کے بریدہ خیالوں سے آگے
خلا تا خلا، فلک تا فلک
زمان و مکاں کی حدیں توڑ کر
عرش سے بھی پرے
اور
زیرِ زمیں
کوہِ آتش فشاں ہو کر رود جیسی
وہ اک روشنی
جو صداقت، شجاعت
کرم اور سخاوت
کی تجدید ہوتی
پاکیزگی اور طہارت کی تنویر ہوتی
ہماری تمہاری بھی تقدیر ہوتی
اگر روشنی
کسی رنگ میں بھی، یہاں یا وہاں، جس جگہ اور جہاں بھی
دکھائی مجھے دے گئی تو
یہ وعدہ ہے تم سے
یہ دل بھی جھکے گا، یہ سر بھی جھکے گا
میں [illegible] کروں گا
خلوص اور عقیدت کے سجدے

توازن کی حد تک
شرافت کے تہذیب کے دائرے میں
مگر سوچ لو تم
مری آنکھ سے بچ نہ پاؤ گی تم بھی
کہ حق بیں نگاہیں
پہچانتی ہیں
صدق و صفا کو، جھوٹ اور ریا کو
محبت کی نفرت کی ایک اک ادا کو
صبح و شام کی دوپہر کی ہوا کو
خوش آہنگ لہروں کو، موجِ بلا کو
جذبات کی اور اصولوں کی جنگ کو
گلابوں کی خوشبو، بولوں کے رنگ کو
بہت دور تک دیکھتی ہے
مری آنکھ ...

●●

احمد سعدی
مکند دیش

میرا سایہ

مرے وجود سے لپٹا ہوا مرا سایہ
رفیقِ جادۂ منزل
شریک بزمِ طرب
جہاں جہاں بھی گیا میں وہ میرے ساتھ ہی تھا
مری نگاہ نے جب بھی اُسے ڈھونڈا،
وہ میرے پاس ہی تھا
رفیقِ خلوت و جلوت
شریک عیش و نشاط
نہ جانے کب سے، مرے ساتھ وہ آوارہ و سرگرداں رہا
کبھی جو اس کو جُدا کرنا بھی چاہا تو جدا کر نہ سکا
مرا وہ مونس و ہمدم، مرا رفیقِ سفر
مرے وجود سے وابستہ وہ مرا سایہ
سکوتِ تیرگیٔ شب میں
میرے پاس نہیں

●●

صفدر

جھگڑا

سُنو!
اے بن بیاہی لڑکیو
اک زندگی
تمہاری آنکھوں کے حلقوں سے ہر دم جھانکتی ہے
تمہارے سُرخ رخساروں پہ پھیلی ہے
تمہارے ان چھوٹے ہونٹوں سے ہنستی ہے
ہمکتی ہے تمہارے آنچلوں میں
تمہارے پیرہن میں سرسراتی ہے
اُسی کے واسطے جھگڑا ہے میرا اور زمانے کا
زمانہ مسئلہ سمجھا ہے اس کو آب و دانے کا

●●

معبود

ہماری آوازیں جیسے تو نے
خلا میں نابود کر دیا ہے
ہمارے دفتر سے روزِ محشر
ہمارے عصیاں نکال دینا

لپیٹ کر آفتاب تو نے
ستارے روشن کئے ہمارے
بھی نیکیاں یوں اُجال دینا

●●

وحید اختر

○

دشتِ خاموش بھی ہے دشتِ نوا سے آگے — بے ندا کوہ بھی ہیں کوہِ ندا سے آگے

کربلا پر ہی نہیں ختم شہادت کا سفر — کوفہ و شام بھی ہیں گنجِ شہدا سے آگے

کھینچئے لفظوں سے دامن کو بچا فکرِ سخن! — باغِ معنی ہے بیابانِ صدا سے آگے

کئی برسوں سے نہ دل مہکا نہ غنچے ہی کھلے — پہنچی ہر بارِ خزاں بادِ صبا سے آگے

دل کی آبادی کا عنوان ہے کونین میں کیا — اک خلا اور ہے ہر ایک خلا سے آگے

قسمتِ عشق سدا بادیہ پیمائی ہے — ہجر کا دشت بھی ہے دشتِ وفا سے آگے

یہیں بیٹھے رہیں، مل جائے گی خود ہی منزل — راہ گم ہے ترے نقشِ کفِ پا سے آگے

جستجو ختم نہ ہو کون و مکاں کی حد تک — ہو گی آزاد فضا، بند فضا سے آگے

نونہالانِ نوا سے نہ ہو مایوس وحید
جائے گی ان کی نوا تیری نوا سے آگے

سلطان اختر

○

چہرہ چہرہ گرد جمی ہے اے مولیٰ تو پانی دے — ہر شئے میلی میلی سی ہے اے مولیٰ تو پانی دے

قہر کی چادر سر پہ تنی ہے اے مولیٰ تو پانی دے — ہر سو ہاہاکار مچی ہے اے مولیٰ تو پانی دے

اپنا سایہ روشن کر دے ہونٹوں کی دیواروں پر — محفل محفل تشنہ لبی ہے اے مولیٰ تو پانی دے

گھبرا کر صحرا و بیاباں شہروں میں گھس آئے ہیں — دریا دریا آگ لگی ہے اے مولیٰ تو پانی دے

کوکھ جلے کھیتوں میں ہر سُو تیرے نام کی جوت جلے — پیاسی دھرتی چیخ رہی ہے اے مولیٰ تو پانی دے

گرم ہواؤں کے شعلوں سے ننگے پیڑ جھلستے ہیں — جنگل جنگل دھوپ کڑی ہے اے مولیٰ تو پانی دے

ہم سے خشک نصیبوں پر پھر اپنی رحمت نازل کر — تُو ہی تو سیخیوں کا سخی ہے اے مولیٰ تو پانی دے

جنم جنم سے جلتی راتیں صدیوں سے یہ تپتے دن
قہر کی رُت کتنی لمبی ہے اے مولیٰ تو پانی دے

عزیز قیسی

○

دُعا کیا چیز ہے باب اثر کیا
قفس میں رہ کے ذکرِ بال و پر کیا
سمجھتے یہ ازل کے بے خبر کیا
کہ بزمِ خیر کیا ہے رزمِ شر کیا
زمیں کیا آسماں کیا بحر و بر کیا
بلند و پست جُز وہمِ نظر کیا
وہی ویرانیاں دل کا مقدّر
کسی کی انجمن کیا اپنا گھر کیا
حق و باطل فسانہ ہی فسانہ!
یہاں نامعتبر کیا معتبر کیا
نہ جانے کب سے ہے سورج گہن میں
سحر کیا شام کیا اور دوپہر کیا
قیامت تک یونہی مرتے رہیں ہم؟
شبِ غم مر گئی، تیری سحر کیا
تمھاری جیب خالی ہے تو قیسی
ادب کیا شعر کیا فن کیا ہُنر کیا

○

زخم ہے سینہ ابھی، تلوار ہے احساس ابھی
کچھ نہ کچھ جینے کا سرمایہ ہے میرے پاس ابھی

سانس روکے سُن رہا ہے وقت ان کا فیصلہ
اُٹھتی جھکتی وہ نگاہیں آس ابھی ہیں یاس ابھی

حد سے بڑھ جائے تو پھر دریا کی کچھ ہستی نہیں
ساحلِ ممنوع پر دم توڑتی ہے پیاس ابھی

برف کی سِل ہے یہ دل، یا ہے کسی شعلے کی لَو
اس بیاباں کو کوئی موسم نہ آیا راس ابھی

شہرِ جاں تیری طرف ابھی کھنچا جاتا ہے دل
تیری گلیوں میں ہے اگلے دور کی بُو باس ابھی

گونجتی ہے دل میں اب بھی کوئی گم گشتہ صدا
ہم کو قیسی ہے شکستِ آرزو کا پاس ابھی

اطہر عزیز

○

دل تو برساتا ہے ہر روز ہی غم کے ساون
پھر بھی بجھتے نہیں یادوں کے سُلگتے ایندھن

زندگی خوابوں کی چلمن میں یوں اٹھلاتی ہے
جیسے سکھیوں میں گھری ہو کوئی شرمیلی دُلہن

اب تو ہر روز ہی اک آنچ نئی اُٹھتی ہے
یہ مرا جسم نہ بن جائے دہکتا مدفن

اس سے پہلے کہ صبا آنکھ مچولی کھیلے
بند کر دو درِ اُمید کا ہر ہر روزن

شب کے آئینے میں تصویرِ تمنّا دیکھو
عکس دکھلائے گا کیا تم کو سحر کا درپن

اس قدر بھی تو ستاؤ نہ بہکتے خوابو!
دلِ تعبیر کی رک جائے لرزتی دھڑکن

مدّتیں ہو گئیں شعلے ہی برستے ہیں سدا
کاش پھولوں سے بھی بھرتا کبھی دل کا دامن

ہے وہ وحشت کہ ہوا بھی نہیں چلتی اطہر
بن گیا کتنا بھیانک یہ وفا کا آنگن

○

اپنی پرچھائیں سے خود آپ اُلجھ جاؤ گے
شیش محلوں میں اگر سایوں سے کتراؤ گے

یوں کریدا نہ کرو راہ میں چلتے چلتے
راکھ کا ڈھیر ہوں کیا مجھ میں بھلا پاؤ گے

غیر ممکن نہیں کل وقت ہی ٹھکرائے تمہیں
تم اگر وقت کی آواز کو ٹھکراؤ گے

کھردرے چہرے پہ اب چاہے شرارے مل لو
پھر بھی تم ٹھٹھری ہوئی لاش ہی کہلاؤ گے

اب تو بس ہاتھ میں نوکیلا سا پتھر لے لو
کب تلک سر درِ آلام سے ٹکراؤ گے

میں ہوں سہمے ہوئے موسم کا سمٹتا بادل
تم مرے ساتھ چلو گے تو بھٹک جاؤ گے

غم کے آنچل میں تبسّم کے ستارے چن کر
روٹھے خوابوں کو کہاں تک یونہی بہلاؤ گے

دل کی ہر بات کو چہرے پہ ہی لکھ لو اطہر
اجنبی شہر ہے کس کو یہاں سمجھاؤ گے

○

غم کے کھیتوں سے ملیں کیوں نہ مسرت کے اناج
ساتھ موسم کے بدلتا ہے ہواؤں کا مزاج

ہے جو ہمّت تو اُٹھاؤ کوئی تیشہ تیکھا
صرف سوچوں سے بدلتے ہیں کہیں کہنہ رواج

آپ کے ساتھ جو برسایا کرے انگارے
ایسے بادل کا بھلا اشکوں سے کیا ہوگا علاج

پہلے تھی شب پہ ستاروں کی حکومت قائم
اب ستاروں پہ مسلّط ہے شبِ یاس کا راج

پوچھتے ہیں مجھے آلام بنا کر اوتار
رکھ کے سر پر مرے انگاروں کا تپتا ہوا تاج

دو قدم ساتھ ہمارے جو چلے آتے تم
ہم بناتے بھلا کیوں ایک الگ اپنا سماج

صحنِ افکار میں رقصاں ہیں یوں آہیں اطہر
جیسے امید کے ساگر میں دکھوں کی امواج

شاہد نعیم
(جدہ)

ہمت بھی ہے دلوں میں نیا حوصلہ بھی ہے
اپنی تباہیوں کا یہی سلسلہ بھی ہے

ان کے طریقِ کار سے کیوں متفق نہیں
ہم بات مان لیں تو ہمیں فائدہ بھی ہے

سورج سے ہو گیا ہے بدن دھوپ کا جدا
یہ آسمانِ فکر کا اک جائزہ بھی ہے

کیا جانے چل رہے ہیں کہاں کیا مقام ہے
بچھڑا ہوا مسافروں سے راستہ بھی ہے

پھیلا ہوا خیال سمٹ کر دماغ میں!
حکمِ سفر کا ذہن میں اک آبلہ بھی ہے

واپس نہ لائے کوئی زمانے کی سختیاں
اک خوفِ مستقل کا یہاں سلسلہ بھی ہے

شاہد میں چاہتا ہوں شکایت نہ ہو کبھی
ان سے براہِ راست کوئی واسطہ بھی ہے

حامدی کاشمیری

مہ و ستارہ و گل کا کوئی نشاں تو رہے
سیاہ کھنڈروں میں اک چراغِ جاں تو رہے

زمیں پاؤں سے نکلے گی، سنتے آئے تھے
دھواں دھواں ہی سہی سر پہ آسماں تو رہے

کہاں رکے گی تو اے انجماد کوشش ہوا
یہ سنگ بستہ فلک ہی شررفشاں تو رہے

سکوت برف میں ڈوبیں صدائیں بستی کی
درونِ حرف یہ ہنگامۂ فغاں تو رہے

فصیلیں پھاند کے دریا کے نور ہو جائیں
ہمارے نام سے منسوب آستاں تو رہے

جزیرہ باسیو! کیوں روکتے ہو راہ ہوا
نواحِ بحر کا کوئی خبر رساں تو رہے

نشان بھارتی

○

اُمڈ رہا ہے وہ سیلِ عذاب چار طرف
بکھر گئے ہیں سُلگتے سے خواب چار طرف

ابھی تو ذہن میں بنیاد سائباں کی تھی
کہ شعلہ بار ملا آفتاب چار طرف

سُنا ہے سعی و عمل کی جزا ملے گی ضرور
مگر ہے محوِ تعاقب سراب چار طرف

اسی جہان میں سب کچھ ہے آنکھ کھولو تو
ہے ایک عالمِ روزِ حساب چار طرف

غم اپنا کس کو سُنائیں کہ شان دنیا میں
بہت سے لوگ ہیں خانہ خراب چار طرف

پرنپال سنگھ بیتاب

○

پانیوں کا بھی سلسلہ رکھیے
ساحلوں سے بھی رابطہ رکھیے

بھول جائے نہ اپنی شکل کہیں
روبرو کوئی آئینہ رکھیے

کیا خبر لوٹنا پڑے اک دن
یاد جنگل میں راستہ رکھیے

قرب کا بھی تو ایک فوکس ہے
درمیاں کچھ تو فاصلہ رکھیے

کوہساروں کا یہ سفر ہے کٹھن
آبشاروں سے رابطہ رکھیے

فر ہر لمحہ کھو دئیے بے شک !
زندگی کا بھی سلسلہ رکھیے

سرد بے شک ہو جنگ باہر سے
گرم اندر کا رزمیہ رکھیے

بھیڑ میں کھو نہ جائیے بیتاب
کچھ نکلنے کا راستہ رکھیے

حصتیر نوری

برہنہ جسم نہیں ہوں کہ آزماؤ گے
یہ سوچو کس طرح تم دوستی نبھاؤ گے

غم حیات کا حاصل کبھی نہ پاؤ گے
تم اس کی تہہ میں نہ جاؤ کہ ڈوب جاؤ گے

تم اپنے آپ کو اک بار سے دیکھو
نگاہ خود پہ پڑے گی تو مسکراؤ گے

میں مانتا ہوں رستہ ہے خار دار بہت
کبھی تو اپنا قدم اس طرف بڑھاؤ گے

تجھے پسند نہیں ہے مگر یقین کر د
بلندیوں سے مری سمت تم بھی آؤ گے

ذرا سی بات پہ برہم ہوئے تم مجھ سے
گلی گلی میں فسانے مرے اڑاؤ گے

ہزار غیر سہی، مجھ سے واسطہ ہی نہیں
میں جانتا ہوں کہ تم ہی مجھے ستاؤ گے

ہر ایک سمت رواں دھوپ کا سمندر ہے
تم اس کی زد سے بچو گے تو ڈوب جاؤ گے

ایک اینٹ بھی تو اٹھا کر کبھی نہ لائے حقیر
کسی کی راہ میں دیوار کیا اٹھاؤ گے

اسعد بدایونی

سخن وجہ زیاں کیوں ہو گئے ہیں
ہم اتنے بدزباں کیوں ہو گئے ہیں

کسی منزل پہ کچھ پایا نہیں ہے!
سفر سب رائیگاں کیوں ہو گئے ہیں

جلاتے تھے جو مشعل اپنے خوں سے
چراغوں کا دھواں کیوں ہو گئے ہیں

جہاں جاں کا خطرہ حد سے سوا ہے
اسی جانب رواں کیوں ہو گئے ہیں

کئی دریا ہیں اسی باعث پریشاں
سمندر بیکراں کیوں ہو گئے ہیں!

یہ موجیں اس قدر کیوں پھیلتی ہیں!
یہ ساحل ناتواں کیوں ہو گئے ہیں

تبصرہ

نام کتاب :- اقبال ایک مطالعہ
مصنف :- کلیم الدین احمد
قیمت :- چالیس روپئے
ناشر :- کرسینٹ کوآپریٹو پبلشنگ سوسائٹی لمیٹڈ، گیا
مبصر :- کلام حیدری

اقبال نے اپنی ایک کتاب کا نام "ضرب کلیم" رکھا تھا۔ کلیم الدین احمد نے لکھا ہے :

اقبال پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور لکھی جائیں گی لیکن زیادہ کتابوں میں اقبال کی شاعری موضوع بحث نہیں ہوتی .... اقبال کا فلسفہ، اقبال کا پیام، اقبال اور تصوف، اقبال اور رومی، حافظ اور اقبال، دانتے اور اقبال، اقبال اور گوئٹے، اقبال اور مارکسزم، اقبال اور وجودیت وغیرہ وغیرہ، یہ موضوع بحث ہوتے ہیں

(صفحہ ۳ پیش لفظ، اقبال ایک مطالعہ)

کلیم صاحب کا مفہوم یہ ہے کہ اقبال کو مولویوں اور مولوی صفت فلسفہ پسندوں نے اقبال کو شاعر مانا ہی نہیں۔ وہ انہیں فلسفہ اور اسلامیات کے مفسر کی حیثیت سے جاننے اور ماننے پر اصرار کرتے رہے۔ اقبال کی بدنصیبی یا مولویوں کی زیادتی کا یہ عالم کلیم الدین احمد نے بتایا ہے۔ مجھ جیسے حقیر نے بارہا اس بات پر افسوس اور صدمے کا ذکر کیا ہے کہ اقبال کا مولویوں اور فلسفہ پسندوں نے اغوا کر کے ادب پسند اور شاعری پسند لوگوں نے چھین لینے کی بہت طویل مہم چلائی۔ نتیجے میں "اقبالیات" کے تحت لکھی جانے والی کتابوں میں شاعر اقبال بڑا مضطرب دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کی اذیت کی جانب دھیان دینے کی بجائے جگن ناتھ آزاد جیسے "ماہر اقبالیات"، نے تو ایسے ایسے موضوعات سے اقبال کو متعلق ثابت کرنے کی کوشش کیں کہ مجھ جیسے لوگ حیرت میں ہیں۔

شاید اقبال کے ظاہر پیغمبرانہ انداز نے انہیں مستقبل میں اپنی شاعری پر "ضرب کلیم" پڑنے کا اندازہ لگالیا ہوگا۔ اس لئے کلیم الدین احمد نے " اقبال۔ ایک مطالعہ " نام کی کتاب لکھی جو ضرب کلیم ہے۔! پتہ چلا ہے کہ انگریزی کے انڈر گریجویٹ طلبا کو پڑھانے والے ایک لکچرر نے کلیم الدین احمد کی اس کتاب پر چار سو صفحات کی پوری کتاب لکھ ڈالی ہے۔ اور وہ عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اس کے ایک آدھ حصے میری نظر سے گزرے ہیں۔ جس میں یہ بھی تحریر ہے کہ کلیم الدین احمد نے ماڈرن انگلش لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں معاملے میں OUT OF DATE ہیں۔ اس زیر اشاعت یا زیر تصنیف کے ٹکڑے کا پاکستان اور ہندوستان میں اسلامی ادب کے شائقین بڑے کر و فر کے ساتھ ذکر کر رہے ہیں۔

در جماعت اسلامی نے تو اپنے اس مفکر اعظم اور عالم بے پناہ کے لکھے کو اپنی "پارٹی لائن" کی بہترین تصنیف سمجھ لیا ہے۔ اور
پنے ترجمان رسائل کے ذریعہ ان کو کلیم الدین احمد سے اونچا، زیادہ پڑھا لکھا، زیادہ زیرک اور مستند نقاد کے علاوہ
انگریزی ادب پر بے مثال عبور رکھنے والا ثابت کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کو ادب سے اتنا
ہی تعلق ہے جتنا ان لکچرر صاحب کو ہے۔ جن کی آمدگاہ مدرسہ شمس الہدیٰ ہیں OUT OF DATE منطق اور فلسفہ بذریعہ
اردو پڑھایا گیا ہے۔ ظاہر ہے اہل زبان سے انگریزی پڑھنے والے کلیم الدین احمد اور ساری عمر پوسٹ گریجویٹ طلبا کو پڑھانے
والے انگریزی کے تحقیقی مقالات کی جانچ کرنے والے کو جماعت اسلامی کے اس بے مثال اسکالر کی ہمسری بہتر کیسے ہو سکتی۔
کلیم الدین انگریزی ان سے کم جانتے ہوں گے وہ ریٹائر ہونے کے بعد انگریزی پڑھنے سے تائب ہو گئے ہوں گے۔ مگر وہ غلط
سلط انگریزی میں اپنے سیاسی خطوط انڈین نیشن پٹنہ اور ریڈینس میں نہیں چھپواتے ہیں۔ اور نہ مودودی صاحب پر ایڈیٹری کا
زور زیادہ اور چوٹی کا زور کم لگا کر مضامین نہیں لکھا کرتے ہیں۔ اس لئے کلیم الدین احمد کے انگریزی کے مطالعے کو ناقص اور فرسودہ
کہنے کا اس کو شاید حق بھی پہونچ سکتا ہے۔ ان صاحب کی کتاب سامنے آجائے تو کلیم الدین کے انگریزی کے مطالعے کی فرسودگی
اور محدودیت کا پتہ بھی چل جائے گا۔ اور مجھ جیسے طالب علم کے ساتوں طبق روشن بھی ہو جائیں گے جو کلیم الدین احمد کی انگریزی
دانی اور ادب شناسی پر عرصے سے ایمان لائے ہوئے ہیں۔ چاہے ان کی تنقید کے بعض پہلوؤں سے اختلاف ہی کیوں نہ
رکھتے ہوں۔

"مطالعہ اقبال" پیش لفظ کے علاوہ سات ابواب پر مشتمل ہے،

۱۔ دانتے اور اقبال، صفحہ ۹ تا ۱۴۸
۲۔ اقبال کی پانچ نظمیں صفحہ ۱۴۹ تا ۲۱۸
۳۔ اقبال کی فارسی نظمیں صفحہ ۲۱۹ تا ۲۶۴
۴۔ اقبال کی اردو اور فارسی غزلیں، صفحہ ۲۶۵ تا ۳۰۱
۵۔ اقبال کی آٹھ مختصر نظمیں صفحہ ۳۰۲ تا ۳۴۰
۶۔ شاہین اور THE WIND HOVER صفحہ ۳۴۱ تا ۳۶۸
۷۔ اقبال اور ملٹن صفحہ ۳۶۹ تا ۴۱۶

ان سات ابواب پر مشتمل کتاب میں اقبال کے افکار اور فلسفے پر بحث اس لئے نہیں کی گئی ہے کہ اقبال
شاعر کی حیثیت سے ہمارے مطالعے میں آئے ہیں۔ ورنہ زیادہ تر کیا اقبال پر تفصیلی طور پر اردو میں سبھی لکھنے والوں
نے اقبال کو اسلام کا مفکر اعظم اور ہندوستانی مسلمانوں کا مذہبی نجات دہندہ کی حیثیت سے ہی پیش کیا ہے۔ اردو
تنقید کا عالم ہی عجیب رہا ہے۔ ادب، ادبی مقام اور رتبہ ــــ ان باتوں کی توضیح کو بے کار سمجھا گیا اور شاعری کو
شاعری کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کم ہوئی ہے۔

اس کتاب کا پہلا باب دانتے اور اقبال ہے۔ کلیم الدین احمد نے پہلے دانتے کی "تعمیری صلاحیت" تخیل
اور زندہ تصویر کشی کی بے مثالیت پر بحث کی ہے۔ اور اقبال سے ان کا موازنہ کیا ہے۔ ظاہر ہے دانتے سے اقبال کا

موازنہ ایک بے مزہ اور بے ضرورت کام ہے۔ مگر کلیم صاحب کو یہ کام طبیعت پر جبر کر کے اس لئے کرنا پڑا ہے کہ اردو کا نقاد پہلے تو دانتے کی حیثیت اور بزرگی سے ہی واقف نہیں ہے۔ اور پھر اقبال اور دانتے کے یہاں "دوزخ اور جنت" پا کر فوراً ہی یہ سمجھ لگتا ہے کہ اس نے اس بے معنی مماثلت کا سراغ لگا کر بڑا کام کر لیا۔ چنانچہ وہ فوراً DIVINE COMEDY اور جاوید نامہ کو پورا کا پورا ہی مماثل سمجھ بیٹھتا ہے۔ اور "مواد" کے سامنے دانتے کی شاعرانہ حیثیت سے اقبال کا موازنہ کر دیتا ہے۔ مجھے مختصر سے تبصرے میں مختصر سا حوالہ یا اقتباس دیتے ہوئے بھی تکلف ہوتا ہے۔ مگر میں چند اقتباسات یہاں پر مزورتاً جبراً اور قہراً دے رہا ہوں۔ دانتے کی شاعرانہ حیثیت :

NO WORDS CAN DESCRIBE THE GREATNESS
OF THIS (THE DIVIUE COMEDY) WORK. AS
A ROET DANTE TAKES HIS PLACE IN THE
RANKS OF THE FOREMOST ARTISTS THE
WORLD HAS EVER KNOWN ....
ONLY A MASTER COULD FIND THE LOFTIN-
ESS OF TONE AND THE SRLENDOR AND
VARIETY OF IMAGES AND SCENES WHICH
ARE RRESENTED IN THE DIVIUE COMEDY.
(MASTER PLOTES VOL (IV)

اس باب میں کلیم الدین احمد نے دانتے کو یہی ثابت کیا ہے۔ دانتے کی اس نظم کے آگے جاوید نامہ تک بندی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اقبال دانتے کے سامنے بونے ــــ لگتے ہیں۔ اپنی زبان سے محبت ایک بات ہے اور ادب شناسی ایک دوسری بات ـــــ اور اونچی بات ہے۔ نقاد کو اپنی زبان کا وکیل نہیں ہونا چاہئے۔ اسے ادب کا جج ہونا چاہئے۔ کلیم الدین احمد نے اقبال کی بعض خوبیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اور اسے مناسب مرتبہ اور مقام بھی دیا ہے۔ مگر دانتے؟ دانتے شاعری کی دنیا میں اقبال جیسے شاعروں کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا۔

کلیم صاحب نے یہ باب اپنی ہر تنقیدی سطر کی طرح ذمہ داری اور احتیاط کے ساتھ بے خطر لکھا ہے۔ کلیم صاحب سے اس معاملہ پر بحث کرنے کی بجائے ان کے اس باب کو اردو قارئین اور نقاد پڑھیں تاکہ ان کو دانتے کی شاعرانہ عظمت اور بزرگی کا احساس ہو سکے۔

ٹی ایس ایلیٹ کو QUOTE کرتے ہوئے یہ باب ختم کر دیا گیا ہے۔

DANTE AND SHAKESPEAR DIVIDE THE MOD-
ERN WORLD BETWEEN THEM

مگر جناب عبدالمغنی تو یہ بھی فرمانے نہیں جھجکے کہ آغا حشر شیکسپیر سے کم تر نہیں بہتر ہے! اس کے آگے مجھ جیسا خاکپائے اہل ادب کیا

کیا عرض کر سکتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد اپنی تنقیدی بصیرت کو عقیدت کے پیش نظر بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اور جہاں دانتے کے بارے میں یہ کہتے ہیں

ڈیوائن کامیڈی ایک بیانیہ نظم ہے لیکن اس میں شاعر کا کمال فن تنہا قصہ در قصہ کے حسن بیان میں نہیں ہے۔ جتنا بیان کو انتہائی نزاکت کے تمثیلی لباس پہنانے میں ہے۔ اس نظم میں دانتے کے فن کا ہم صرف مطالعہ ہی نہیں کرتے بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ اس میں بصارت، آواز سماعت، خوشبو اور لمس کا جادو، قدم قدم پر خوف اور رحم کے جذبات، غم و غصہ اور مسرت و شادمانی، کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ کہ قاری اکثر اوقات اپنے آپ کو محض قاری ہی نہیں۔ بلکہ اس تمثیلی شاہکار کا جزو سمجھنے لگتا ہے۔ (اقبال اور مغربی مفکرین صفحہ ۱۲۶)

اب عقیدت ملاحظہ فرمائیے۔

"جاوید نامہ" بھی اول تا آخر انہی خوبیوں سے مملو ہے۔" (اقبال اور مغربی مفکرین صفحہ ۱۲۶)

"جاوید نامہ میں ان تمام خوبیوں کے ہونے کا ذکر عقیدت مندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تبصرہ مقالہ نہیں بنایا جاسکتا۔ میرے لئے ان صفحات پر انحصار کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ مطالعہ اقبال کا یہ باب کلیم الدین احمد کی عالمانہ، حکیمانہ، حیثیت کو مستحکم بناتا ہے۔ اور ان کی تنقیدی پختگی کا قائل بنا کر اقبال کے سلسلے میں اس کتاب کو اقبالیات میں منفرد و ممتاز و مستند حیثیت دیتا ہے۔

دوسرا باب اقبال کی پانچ نظموں پر مشتمل ہے۔

(۱) خضر راہ، (۲) طلوع اسلام، (۳) ذوق و شوق، (۴) مسجد قرطبہ، (۵) ساقی نامہ

خضر راہ کے چار حصے بنائے گئے ہیں ان میں بے ربطگی کو نظم کے تقاضے کے خلاف بتایا گیا ہے۔ مگر کلیم الدین احمد نے ایماندار اور دانشور نقاد کی طرح ان حصوں کی شعریت کی داد بھی دی ہے۔

"یہ ایک حسین شاعرانہ تصویر ہے"........ان شعروں میں اقبال ایک حسین معصوم، سکوت افزا فضا کی تخلیق کرتے ہیں۔ جو شعریت سے لبریز ہے۔ (مطالعہ اقبال صفحہ ۱۵)

جیسے اقبال کے تمہیدی اشعار میں شعریت ہے اسی طرح جواب خضر کے کچھ ابتدائی اشعار شعریت سے لبریز ہیں۔ وہ بھی ایک مرئی اور حسین تصویر کھینچتے ہیں۔ (صفحہ ۱۵۰)

جہاں جہاں کلام اقبال میں شعریت کی خوبیاں ہیں۔ کلیم الدین احمد نے پوری فراخدلی کے ساتھ تعریف کی ہے۔ اسلئے اس کتاب کو رد اقبال کہنے اور سمجھنے والے کلیم الدین احمد کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ ان کی تنقیدی صلاحیتوں کے معترف ہونے کی بجائے وہ ان کو ایک متعصب نقاد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کے باقی ابواب بھی اس طرح پوری احتیاط، بھرپور تنقیدی بصیرت اور دانشوری کے ثبوت ہیں۔ مطالعہ اقبال اقبال کی شاعری کی پہلی تنقید ہے۔ اس سے انکار کرنے کی گنجائش مجھے نظر نہیں آئی اس کتاب نے اقبال بحیثیت شاعر کی تنقید کے دروازے کھولے ہیں۔ اولیت کا یہ شرف کلیم الدین احمد کے لئے وقف تھا۔ اس حیثیت سے اقبال کا مطالعہ آئندہ اور بھی بہتر ڈھنگ سے ہو سکتا ہے مگر یہ کتاب اساسی حیثیت رکھے گی۔

سواد و صوت ـــــــــــ قارئین

عبد النقوی دسنوی ـــــــــ بھوپال

آہنگ کا فکشن نمبر مل گیا تھا، مجھے یاد نہیں رسید بھیج سکا تھا یا نہیں۔ اس وقت کسی ضرورت سے کتابیں اُلٹ پلٹ کر رہا تھا کہ اس نمبر پر نظر پڑی، اس نمبر کے لیے دلی مبارکباد قبول کیجئے، بہت اچھا نمبر ہے۔ اچھے افسانے بھی جمع ہو گئے ہیں اور ان پر تبصرے بھی۔ یہ طریقہ زیادہ مفید اور بامعنی ہے آپ خاموشی کے ساتھ اچھے کام کیے جا رہے ہیں، کرتے جائیں۔ اس کے نتائج بھی مفید نکلیں گے۔ انشاء اللہ

شہپر رسول ـــــــــ علی گڑھ

مارچ کا آہنگ ملا، پسند آیا۔ "کشکول" بطور خاص پسند آیا۔ اداریہ کیا ہے طنز اور سچائی کے زہر میں بجھا ہوا تیر ہے اور اداریہ کا آخری حصہ جس پر ایک (ـــــــ) خط امتیاز بھی کھینچا گیا ہے۔ زہر میں بجھے ہوئے اس تیر کی دھار دار نوک ہے۔

ابو ظہبی، دوبئی، ریاض، نامعلوم قسم کے بزنس، دہلی کے فائیو اسٹار ہوٹل میں جشن شراب و شباب، پیشہ ور اہل قلم، ناقابل یقین دولت، چشم زدن میں کافکا اور کامو کو پیچھے چھوڑنا اور افبال اور میراجی کا گرد ہو جانا، غرور و جہالت دوسری زبانوں کے الفاظ کا غلط استعمال اور اس پر اُردو نظم کا دعویٰ ـــــ یہ تمام ایک ہی دستار کے طرے ہیں۔ آندھی آتی ہے اور گذر جاتی ہے، غبار چھاتا ہے اور چھٹ جاتا ہے

اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غبار کئی کئی دن تک چھایا رہتا ہے۔ فضا مکدر رہتی ہے۔ لیکن زیادہ وقت تک نہیں۔

آپ کی بات اپنی جگہ پر نہایت راسخ اور صائب ہے۔ "اقلیم ادب کے قوانین بڑے سخت ہوتے ہیں۔ وہی رہ جائے گا جو کھرا ہوگا اور کاغذ کا گلیز کسی کام نہیں آئے گا۔"

وحید اختر، رئیس الدین رئیس، اور غلام حسین ساجد کی غزلیں اور اسرچودھری کی نظمیں پسند آئیں۔ مضامین اچھے ہیں اور "ایک اہم سوال" بھی قابل غور ہے۔

احمد عثمانی ـــــــــ مالیگاؤں

کشکول کا دوسرا حصہ بہت خوب ہے۔ صلاح الدین پرویز کے دلال رات دن ایک کر کے انھیں آسمانِ ادب کا "آریہ بھٹ" کہلوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک علی گڑھی پرچے نے گوشۂ صلاح الدین پرویز شائع کیا ہے۔ جس کی کتابت اعلیٰ کاتب نے کی ہے اور اس کا کاغذ بھی اعلیٰ ہے کتابت اور کاغذ اعلیٰ ہونے سے شاعری اچھی ہوتی ہے تو یہ شاعری ہے۔ اُدھر پاکستان میں سیپ نے بھی ان کی نظمیں شائع کی ہیں۔ وہ بھی تک بندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مجھے حیرت صلاح الدین پرویز پر نہیں ہے کہ ہر شخص شہرت کا بھوکا ہوتا ہے لیکن ایڈیٹرز کی نامعقولیت پر حیرت ضرور ہے۔

ایوب جوہر ———— ڈھاکا

آہنگ کا فکشن نمبر موصول ہوا، نیز آہنگ کا تازہ شمارہ بھی۔ میں ان عنایات کے لیے آپ کا اور جناب کلام حیدری صاحب کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آہنگ کا فکشن نمبر دیکھ کر نہ صرف یہ کہ مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی بلکہ آنکھ کی تکلیف کے باوجود اس کے تقریباً نصف مطالعے سے بھی گزر چکا ہوں، اور یہ آہنگ کے فکشن نمبر کا ہی کرشمہ ہے کہ ڈاکٹر کی ہدایت کے خلاف آہنگ کے فکشن نمبر سے متعلق اپنی ناقص رائے قلم بند کرنے کی تحریک سے گزر رہا ہوں۔ آہنگ کا فکشن نمبر مجھے ہر لحاظ سے پسند آیا ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ گیا جیسی چھوٹی جگہ سے اس کی باوقار اشاعت کیوں کر ممکن ہوئی بلکہ اس لیے کہ فکشن کے موجودہ دَور کے مطابق آہنگ نے جو نمبر ترتیب دیا ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل اور باوقار ہے اور اس کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں بلاشبہ ادارہ کلچرل اکیڈمی نیز نثار احمد صدیقی، جناب کلام حیدری، محترمہ نوشابہ حق اور دیگر رفقاء کار قابل مبارک باد ہیں، اب رہی بات مندرجات سے متعلق تو میں کیا اور میری رائے کیا، پھر بھی اتنا کہوں گا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کا مضمون میرے خیال میں عنوان سے ہی اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ یعنی نارنگ صاحب کے مضمون کا عنوان ہے "نیا افسانہ۔ روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحۂ فکریہ۔" میں نہیں سمجھ پایا کہ نارنگ صاحب اس عنوان سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ نارنگ صاحب کے ذہن میں نئے افسانے کا تصور کچھ اور ہی ہے۔ یعنی وہ نیا افسانہ گویا تو افسانہ نہیں سمجھتے یا پھر افسانے جیسی کوئی اور صنف ادب سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ روایت سے انحراف سے مراد شاید ان کی یہی ہے کہ ان دنوں افسانے نہیں لکھے جا رہے ہیں بلکہ افسانوں کے نام پر کچھ اور لکھا جا رہا ہے۔ (جسے وہ انشا پردازی کا نام بھی دیتے ہیں) یعنی نئے افسانے میں موصوف کو کوئی کہانی نظر نہیں آتی اور پرانے افسانوں کی طرح افسانے کے اختتام پر ڈرامائی انداز میں چونکا دینے والے جملے (جسے وحدت تاثر کا نام دیا گیا ہے) انھیں نیا افسانہ میں کہیں نہیں ملتے اور اس لحاظ سے موصوف کی نظر میں نیا افسانہ باغی افسانہ قرار پاتا ہے۔ لیکن میں بحیثیت ادب کا ایک ادنیٰ قاری یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ نیا افسانہ کلّی طور پر روایت سے انحراف نہیں کرتا اور نہ ہی اس میں کہانی پن یا وحدت تاثر سرے سے غائب رہتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نیا افسانہ دادی اماں کی وہ کہانی نہیں ہے جس میں ایک دیو نمودار ہوتا ہے اور اپنی بیٹی سے کہتا ہے "مانوس گندو، مانوس گندو" اور اس کی بیٹی شہزادہ گل باز کو ایک مکھی بنا کر اپنے جوڑے کے اندر چھپا لیتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمیں دادی اماں والی کہانی لکھنی چاہیے یا پھر انتظار حسین اور قرۃ العین کا نیا افسانہ؟ تو موصوف نے اس سوال کا خود ہی جواب دے دیا ہے۔ کہ ان لوگوں کو تو نیا افسانہ ضرور لکھنا چاہیے جن کے نام سے ہی افسانے کی بسم اللہ ہوتی ہے لیکن ان لوگوں کو ہرگز نہیں لکھنا چاہیے جن کا نام نہ لینے سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا ———

بہر حال موصوف کا مضمون دل چسپ ہے اور خصوصی طور پر مجھے پسند آیا۔ دوسرے حضرات کے مضامین بھی پسند آئے اور ان تمام مضامین سے اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ اب، اس سے پہلے اور آئندہ اردو ادب، خصوصی طور پر اردو فکشن صرف ہندوستان اور پاکستان تک ہی محدود ہے، تھا اور رہے گا۔ بنگلہ دیش' ہندوستان (متحدہ) کے نقشے پر سرے سے کبھی موجود ہی نہیں تھا، لہٰذا اب کیوں؟ اور پھر یہاں پر صرف بنگلہ زبان بولی جاتی ہے، لکھی جاتی ہے اور پڑھی جاتی ہے پھر اُردو کا تصور ایک دیوانے کا خواب ہی ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں اس نئے انکشاف کے لیے تمام ناقدوں اور خصوصی طور پر جناب کلام حیدری کا شکر گزار ہوں

کہ ان حضرات کی وجہ سے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ اور ہاں ایک بات یاد آ گئی، وہ یہ کہ ایک مثل اکثر دہرائی جاتی ہے "چوپڑی چوپڑی کا شوربہ"۔ پھر کلام حیدری صاحب کا اس میں کیا دوش، وہ پاکستانی افسانہ نگاروں کو ہی کسی کھاتے میں نہیں لاتے تو بنگلہ دیشی افسانہ نگار چہ معنی؟

اب آئیے فکشن نمبر کی کہانیوں اور ان کہانیوں کے تجزیاتی مطالعے کی جانب۔ کلام حیدری صاحب نے جن اہل قلم حضرات کو افسانوں کے تجزیاتی مطالعے کے لیے تخلیق کاروں کے نام کے بغیر ان کی کہانیاں بھیجی تھیں، میرے خیال میں نام کو مخفی رکھ کر نہ صرف اچھا کیا گیا بلکہ صحیح اور غیر جانبدارانہ تجزیاتی مطالعے کے یہ ضروری بھی تھا۔ لیکن ان میں سے بعض اہل قلم حضرات کو یہ شکایت پیدا ہوگئی کہ نام کو مخفی رکھ کر اچھا نہیں کیا گیا اور جواز میں یہ کہا گیا کہ:

> "تخلیق کار کا نام ظاہر کر دینے میں ہی
> فائدہ ہے کیوں کہ اس طرح اس کی دیگر تخلیقات
> بھی زیر تجزیہ تخلیق کو سمجھنے اور سمجھانے میں
> معاون ہوتی ہیں۔"

یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی افسانے کو سمجھنے یا اس کے تجزیاتی مطالعے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی "معمے" کو سمجھنے کے لیے جس طرح کچھ اشارتی کتابچے یا پمفلٹ سامنے رکھے جاتے ہیں، افسانے کو سمجھنے کے لیے بھی اسی قاعدے اور کلیے کا ہونا ضروری ہے وغیرہم، —— بہرحال تجزیاتی مطالعے بھی دل چسپ ہیں اور ان مطالعوں سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ کوئی صاحب تو اتنے سہمے ہیں کہ ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہے ہیں اور کوئی صاحب اتنے برہم کہ خاطر تعلقات کا پاس نہ ہوتا تو افسانے کلام حیدری صاحب کو واپس کرتے ہوئے یہ کہا جاتا۔ "برادرم، یہ کام تو آپ خود ہی بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں مجھ کمترین کو لہولہان کرنے سے آپ کو کیا حاصل ہوگا؟ بہرحال تجزیاتی مطالعے دل چسپ ہیں اور تجزیاتی مطالعوں کی شمولیت سے آہنگ کا فکشن نمبر نہ صرف باوقار ہوگیا ہے بلکہ اس کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ رہی بات کہانیوں کی تو میں اب تک چند کہانیاں ہی پڑھ سکا ہوں اور ان کہانیوں سے اندازہ ہوا کہ ادارے نے تخلیقات کا انتخاب بہت چھان پھٹک کر کیا ہے اور تقریباً معیاری کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ادارہ بلاشبہ لائق تحسین و آفرین ہے۔

ظفر ہاشمی ———— جمشید پور

ہر بار کی طرح مارچ ۱۹۸۲ء کا آہنگ بھی زیر مطالعہ آیا تو جی خوش ہوگیا۔

آپ کا "ایک اہم سوال" جتنا خوب صورت ہے، ویسا اس کا جواب نہیں۔ رفعت نواز کا "نیا گھر" ایک سیدھا سادہ اور عام گھر ہے لیکن اپنے معنوی لحاظ سے بے کراں۔ اساطیری بنیاد پر اسرار گاندھی کی پیش کش "ہاروت ماروت" بھی دل کو چھو لیتی ہے۔ ذاکر عزیزی کی "سہاگ رات" دل چسپ بھی ہے اور اپنے آخری جملوں میں چونکاتی بھی ہے۔ یہ آج کے خالی پن کی بہترین مثال ہے۔ علی احمد فاطمی صاحب کی روداد بھی بڑی کامیاب اور دل چسپ ہے۔ انھوں نے اس کو ایک تخلیق کا درجہ دے دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادھر جتنی بھی رودادیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں یہ سب سے منفرد اور اچھوتی ہے۔

غزلیں سبھی اچھی ہیں لیکن وحید اختر کے بعض اشعار اور شاہد کلیم و رئیس الدین رئیس کی غزلیں خاص طور سے بے حد پسند آئیں۔۔

دی کلچرل اکیڈمی ریتنہ ہاؤس جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ گیا

شرح خریداری

ایک سال کے لئے ـــــ چوبیس روپے
فی کاپی ـــــ دو روپے

فون نمبر 432

محتویات

کشکول

آہنگ کا نیا شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

نثری اور شعری حصوں میں توازن برقرار رکھنا ماہنامے کے لئے محال ہے کیوں کہ یہ تو لکھنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ کس صنف کی جانب زیادہ متوجہ ہیں اور بہتر نمونے تخلیقات کے پیش کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ماہنامے کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ "بہترین" ادب پیش کرے ہمارے خیال میں (کوئی ضروری نہیں کہ ہمارا خیال درست ہی ہو) ماہنامے کو نئے TALENTS کا تعارف بھی کرانا چاہئے تاکہ تخلیقات کے معیار اُن کی نوعیت جامد نہ ہو جائے۔ آج جس کا تعارف کیا جاتا ہے کل وہ کیسا ثابت ہوگا، کون کہہ سکتا ہے ؟

ہمیں اعتراف ہے کہ جن کو آج ہم ایک ہونہار لکھنے والا سمجھ کر تعارف کر رہے ہیں کل وہ بالکل بے کار ثابت ہو سکتے ہیں مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے اور ہوا ہے کہ اگر ہم نے سال میں پانچ TALENTS پیش کئے تو ان میں کئی بہت جلد نمایاں اور منفرد ہو گئے۔

خود آہنگ نے خصوصی مطالعے پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ محض نام کے پیچھے بھاگنا ایڈیٹر کا کام نہیں ہونا چاہئے، اُسے ڈاک میں آنے والی تخلیقات کو پڑھنا چاہئے۔

—— مانا یہ صبر آزما کام ہے !

اور تب اُن میں سے چند "ہونہاروں" کی کچھ کچی چیزوں کو بھی شائع کرنا چاہئے تاکہ آگے وہ چھپی چیزوں پر تبصرے اور تنقید کی روشنی میں اپنے فن پر زیادہ

محنت کریں اور اُن کے اندر جو صلاحیت اپنی طفلی کے دن گزار رہی ہے، وہ بلوغ کو پہنچ جائے۔

بتصرہ کے لئے کتابیں ہمارے پاس آتی ہیں اور بہت آتی ہیں، ہم اُن مصنفین کے شکر گزار ہیں کہ وہ ہمیں اپنی کتابیں بھیجتے ہیں اور یوں ہمیں مطالعے کا موقع بھی ملتا ہے اور ہم اپنے ادب کی رفتار کا اندازہ بھی کرتے ہیں اور قارئین تخلیقی ادب کے رُخ کو پہچانتے بھی ہیں۔

آہنگ کو تنگیٔ داماں کا احساس ہے، قارئین سے ہم اس کے لئے شرمندہ بھی رہتے ہیں مگر کسی طرح کی سرکاری مدد کے بغیر ——— (جب کہ سرکار اُردو کی ایسی انجمنوں کو مالا مال کر رہی ہے جن کا کارنامہ صفر کے قریب ہے) محض قارئین کے سہارے اور دوست ادبا و شعرا کی معاونت کے طفیل، آہنگ ہر ماہ پابندی کے ساتھ آپ تک پہنچ رہا ہے۔ یہ خدا کا کرم ہے!

عبدالصمد

روشنی اے روشنی!

رات نے سورج کو ڈس لیا۔ زہر سورج کے جسم میں بتدریج پھیلتا گیا۔ اور زردی مائل ہوتا ہوا سورج ڈوبتا گیا .... ڈوبتا گیا .... یہاں تک کہ فنا ہو گیا اور زہر کی تاریکی نے چاروں طرف اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔

تب وہ عجب مخلوق کہ جس کو انسان کہہ بھی سکتے ہیں۔ اور نہیں بھی کہہ سکتے۔ کہ جس کو حیوان کہہ بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی کہہ سکتے۔ اپنے وجود پر فضاؤں کا بھبھوت مل کر نکلی اور دبے پاؤں انسانوں کی بستی میں گھس گئی۔

ایسا وہ کئی بار کر چکی تھی۔ لیکن ہر بار اس کا بدن نظروں کے تیر سے زخمی ہو جاتا تھا۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو پاتی تھی۔ کیونکہ اسے بوچھار سے گھبرا کر بھاگ جانا پڑتا تھا۔ لیکن اس دفعہ اس نے سب انتظام پہلے کر رکھا تھا۔ گو کہ اسے اس کے لئے کافی انتظار کرنا پڑا تھا۔ لیکن کسی بات کے ہونے کے لئے برسوں کی تسبیحات گلے میں ڈالنی ہی پڑتی ہیں۔

شہر میں ایک کہرام مچا تھا۔

لوگ باگ اپنے گھر اپنے رنگ اور اپنے نام تک بھول چکے تھے۔

گھر بھولنے کی وجہ سے کسی کا گھر سلامت نہیں رہا تھا۔

رنگ بھولنے نے رشتوں کے تمام بندھن توڑ کر فضاؤں میں بکھیر دیئے تھے۔

نام بھولنے سے سر اور دھڑ آپس میں بدلے جا رہے تھے جن کے پاس رنگ تھے ان کے رنگ تبدیل ہو گئے۔ جن کے پاس رنگ نہیں تھے ان کے رنگ ل گئے۔

کچھ چیزیں ایسی بھی تھیں جن کے رنگ سرے سے غائب ہو گئے پانی کا رنگ جو ابھی تک [illegible] نہیں ہو سکا تھا سرخ ہو گیا اور گلے میں چھید کرنے لگا۔ ہواؤں کو بھی ایک رنگ ملا ——— سیاہ! اور سانسوں میں سیاہی گھلنے لگی آسمان کا الٹا پیالہ سیدھا ہو گیا

زمین مسطح نہیں رہی۔ اور سکڑ کر تازہ نچوڑے ہوئے کپڑے کی طرح سمٹ گئی۔ درختوں کے جڑ فضاؤں میں لہرانے لگے۔ اور ان کی بلند و بالا شاخیں زیر زمین ہو گئیں۔ سمندر صحرا بن گیا۔ اور صحرا میں سمندر موجیں مارنے لگا۔

پہاڑوں کے انہیں کے نیچے پھٹ گئے اور وہ حرکت میں آ گئے۔ انسان اپنی بولی تک بھول گیا اور تمام جانور کیا چرند، کیا پرند، انسانوں کی بولیاں بولنے لگے۔ ایسی چیخ و پکار مچی کہ بس!

اور ان سب کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ انسان وہ پورا واقعہ تک بھول چکا تھا جب ایک عجب مخلوق ایک پہلے سے تیار کردہ ماحول میں اتر آئی تھی۔ اور اس نے تاریکی کا سہارا لے کر انسانیت کے جد میراث سے وہ روشنی ہی اٹھا لی تھی جس سے انسان رشتوں کی تاریک راہوں کو روشن کرتا تھا۔ اور جس سے میانہ کی [illegible] جھپٹی تھیں۔ اور انسان اس وقت کچھ نہ کر سکا تھا کیونکہ اس عجب مخلوق نے اپنے وجود پر فضاؤں کا بھبھوت مل لیا تھا۔ اور زہر کی تاریکی کے جھنڈے چاروں طرف لہرا رہے تھے۔

وہ عجیب مخلوق بہت خوش تھی کہ اس نے انسان کی سب سے قیمتی دولت چھین لی تھی ——— وہ بہت خوش تھی کہ اس چھینی ہوئی روشنی کی مدد سے وہ قیامت [illegible] برپا کر سکے گی۔

قیامت جو جہنم ہے جہنم، جو روشنی [illegible]

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

نہرو نامہ ـــــ ایک مطالعہ

نہرو نامہ ساغر نظامی کا ایک ایسا منفرد شعری شاہکار ہے جس میں جواہر لال نہرو جیسے مرد مجاہد و معمار قوم وطن کی حیات و مرگ کو ہندوستانی فکر و ثقافت کے تناظر میں بھرپور شعری زبان و بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ پنڈت نہرو نے آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا اور کامیاب محاذ آرائی کا ثبوت فراہم کیا۔ اور ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنے وطن کو جدیدیت سے روشناس کرانے کے لئے وہ سب کچھ کیا۔ جس نے اس کا وقار اتنا بلند کیا کہ آج ہندوستان کا شمار بڑے ملک میں ہوتا ہے۔ نہرو سے ساغر کے بہت قریبی مراسم رہے نیز ہندوستان سے محبت اور یہاں کی ثقافت سے گہرا لگاؤ ان دونوں کے مابین منجملہ دیگر اقدار مشترک تھے۔ وطنیت ساغر کی شاعری میں جلوہ جلوہ نظر آتی ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعہ **بادۂ مشرق** کے بارے میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو نے فرمایا تھا کہ:-

> ساغر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کے لئے ہندوستانی تجربات اور ہندوستانی جذبات کے عام عنوانات کو منتخب کرتا ہے۔ اور ان کی ادائیگی کے لئے ایسے سلیس اور دلکش الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جو عوام الناس کی بول چال سے مشابہت رکھتے ہیں۔

ان کی حالیہ تصنیف **مشعل آزادی** (حصہ اول) جس کو پبلیکیشن ڈویژن بھارت سرکار نے شائع کیا ہے۔ میرا تنقیدی مضمون "مشعل آزادی"...... وطنی شاعری کا گل سرسبد" آج کل اردو شمارہ مئی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے جو بلاشک وشبہ ایک عظیم شاہکار ہے۔ مگر نہرو نامہ بھی کچھ کم اہمیت و وقعت کا حامل نہیں ہے

ساغر کے کلام میں خصوصی عمق ہے ان کے یہاں جوش ملیح آبادی جیسی لفاظیت اور گھن گرج نہیں ہے۔ کیونکہ ساغر نے اپنے وطن سے اور یہاں کے گنگا جمنی تہذیب و ثقافت سے فی الواقع محبت کی ہے ؎

میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

۱۹۶۴ء میں نہرو کا انتقال ساغر کو ذاتی سانحہ بھی تھا۔ اور ایک دل شکن ملی و قومی المیہ بھی۔ معمولی دل و دماغ کا آدمی تو ذہنیت کر رہ جاتا ہے۔ مگر ساغر جیسے بڑے شاعر کا غم وہم سے ماورا ہو کر ماضی، حال اور مستقبل پر محیط تخیلات و جذبات سے معمور ہونا ناگزیر تھا۔ بھرتری ہری نے اپنے ایک شلوک (نیتی شتکم) میں بڑی معقولیت سے بھرپور بات کہی ہے۔ کہ شمشان میں کسی لاش کو سپرد آتش کئے جانے کا مشاہدہ کرنے پر ارتکاب گناہ کے بعد پیدا ہونے والے خیالات

دجذبات جو بالعموم عارضی ہوتے ہیں۔ اگر دیرپا ہو جاتے ہیں تو زندگانی کے دھارے کو بدل دیتے ہیں۔ شانتی بن میں چتا سے اٹھتے ہوئے شعلے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کا تناظر پیش کرتے چلے گئے ؎

شانتی بن کی خاک سے ہمدم   اب بھی اٹھتی ہے ہوک سی اکثر
ماتم اے ارتقائے انسانی

مشرق کی حکمتوں پہ کیا بیتی   غرب کے فلسفوں پہ کیا گزری
کیا نظام مسیح پہ بیتی   اسوۂ مصطفےٰ پہ کیا گزری
آتما کیا ہوئی پرانوں کی   روح ویدوں کی کیا ہوئی لوگو
درس گوتم کا کیا مآل ہوا   کیا کوئی حرف بھی نہیں باقی
حکمت لازوال گیتا کا

گیتا کے لازوال فلسفے کو شاعر نے مثالیں دیتے ہوئے ان اشعار میں سمویا ہے ؎

کوئی اکبر ہو اور کوئی اشوک   کوئی ٹیگور اور کوئی دارا
کوئی چشتی ہو اور کوئی نانک   کوئی گوتم ہو اور کوئی گاندھی
کوئی حافظ ہو یا کوئی فیضی،   کوئی ہومر ہو، کوئی فردوسی
کوئی سقراط، کوئی افلاطون   کوئی لینن ہو یا کوئی لنکن
اور بہ فیضان ارتقائے حیات
وہ بھی لیکن شخص ان میں پنہاں ہو!
نئے طوفان سے پنجہ کش ہو کر   اپنی کشتی کا ناخدا ہوگا،

بالفاظ گیتا یہ رجائی آہنگ درج ذیل شلوکوں سے ابھرتا ہے ؎

यदा यदा हि
यदा यदा हि धर्मस्य ग्लानि भवति भारत !
अभ्युत्थानम धर्मस्य तदाऽऽत्मानं सृजाम्यहम !

جب کبھی تعلیم صداقت شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتی ہے۔ تو اقدار اعلیٰ کو استحکام دینے کے لئے میں آتا ہوں "میں آتا ہوں" یعنی مصلحین پیدا ہو جاتے ہیں۔

परित्राणाय साधूनां विनाशाय च दुष्कृताम !
धर्म संस्थापनार्थाय सम्भवामि युगे युगे !!

اچھے باسیرت و کردار افراد کو ابھارنے کے لئے بے راہ روی کی بیخ کنی کے لئے زمان زماں امکانات کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

اشوک، اکبر، ٹیگور، جواہر لال نہرو وغیرہ ہندوستان کی سرزمین نے پیدا کئے۔ قدرت ہمیشہ اس ملک کو سرفرازی سے نوازتی رہی ہے۔ اور نوازتی رہے گی۔ جواہر لال نہرو ایک معنی میں گیتا کی اعلیٰ حکمت لازوال کی تجسیم تھے۔ نہرو کو آدمیت سے محبت بھی۔ اور یہی وہ خوبی ہے، جو ساغر کو پسند رہی ہے ؎

ہاں یقین ہے مجھے، یقین ہے مجھے — کہ نہیں امن عالمی ممکن !!
آدمیت کے فیض سے جب تک — آدمی، آدمی نہیں بنتا !!
جب تک اک انضباط انس و وفا — مذہب آدمی نہیں بنتا !!

ہندو اساطیری وقوف و آگہی کلام ساغر میں بڑی کہکشانی ظاہر درخشاں ہو اٹھتی ہے۔ لکشمی دولت و ثروت کی دیوی اور سرسوتی علم و عرفان کی دیوی کو اسی معنی میں کہ وہ ایک ہی شخص پر مہربان نہیں ہوتیں، سوت کہا جاتا ہے۔ مگر جواہر لال نہرو پر دونوں یکساں مہربان تھیں کیونکہ وہ ایک دولت مند و معروف وکیل موتی لال نہرو کے واحد چشم و چراغ تھے۔ نیز جواہر لال نہرو نے بہترین تعلیمی استعداد اور علمی صلاحیت حاصل کیں۔ ایک ہی شعر میں اس پس منظر کو یوں پیش کیا گیا ہے ؎

گود میں لکشمی کے کھولی آنکھ — سائے میں سرسوتی کے پلا،
عیش و عشرت میں جوان ہوا

اس کے بعد شاعر نے باتمام ایجاز و ارتکاز جواہر لال نہرو کی آزادی کے لئے جدوجہد اور ان کے تخیلات و جذبات کو یوں نظم کیا ہے ؎

اور جواں ہو کر جب نظر ڈالی — اپنے ماحول کی کثافت پر
اس کے احساس میں بھڑک اٹھا — ایک شعلہ نئی بغاوت کا!
کاٹ کر ہفت خوان مصائب کے — کیا اس نے جہان نو پیدا
اور غلامی کی کاٹ دی زنجیر — ایشیا کی بدل گئی تقدیر
حکمت مرگ و زیست کیا کہئے
موت اسرار، زندگی اسرار!

"حسن" کے تحت نہرو کے کردار کو پیش کیا گیا ہے جو بہت خوب ہے ؎

متلاشئ خیر تھا نہرو — شمع انصاف و حق کا بیگانہ
حسن کی جستجو میں دیوانہ

نامکمل سماج میں پیہم — حسن کامل کا مستقل جویا
زندگی جس کی زندگی کی قسم — زندگی کو نکھارتے گزری
وہ اسی آرزو میں خاک ہوا — کہ فقط اک کرن ہی مل جائے
اس کی ہستی تھی سر بسر تنویر — موت انوار، زندگی انوار
حکمت مرگ و زیست کیا کہئے — موت اسرار، زندگی اسرار

ملحوظ رہے، لفظ متلاشی کو غلط بتایا جاتا ہے۔ اور اسی مفہوم میں تلاشی کو صحیح بتایا جاتا ہے۔ مگر اردو روزمرہ میں متلاشی کو دوامی زندگی مل گئی ہے۔ لہٰذا اثر لکھنوی نے اپنی معروف تالیف و تخلیق فرہنگ اثر میں یہ سب کچھ لکھتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اردو میں متلاشی کو درست سمجھنا چاہئے۔ تلاشی اردو مفہوم میں پولیس لیتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ساغر کے یہاں زبان و بیان معیاری بھی ہیں۔ اور مرورِ ایام کے ساتھ ارتسامات و مصطلحات کے لئے اثر پذیری کے لئے تیار و مستعد بھی۔ ساتھ ہی وہ ہندی لغات کو صحیح تلفظ میں نظم کرتے ہیں۔

"خمیر" کے تحت تخیلات وجذبات سے بھرپور تناظر کی صوتی تصویر پیش کرنے والے اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

خیرہ خیر جس کا غازۂ رُخ روئے تخلیق کا جمال بنا
لمحۂ خیر جس کا پر تو نور! رُخ تہذیب کا جلال بنا
رُوحِ فن کار میں ستارۂ فن! دستِ محنت کشاں میں مشعل نور
ذہنِ دانش وراں میں مشعلِ فکر دلِ پیغمبراں میں شمعِ نجات
خمیر کے جذبۂ تمنا نے! روحِ معمار کو عطا کردی
ایک نئی صبح و شام کی دنیا در و دیوار و بام کی دنیا

اور پھر یہ چار مصرعے تو بہت ہی پُرزور ہیں۔ اور ساتھ ساتھ حسین بھی ؎

"خمیر" نے بت گری کے پردے میں جب ترا شے خدا ترا شے ہیں،
زندگی بھر تلاش منزل میں سنگ میں رہنما ترا شے ہیں

اب رہنماؤں اور پیغمبروں وغیرہ کا ذکر یوں کیا گیا ہے ؎

ایک سورج ہزار ہا کرنیں ایک جلوہ ہزار ہا پیکر!
جامِ سقراط سے کبھی چھلکا!! کبھی اوجِ صلیب سے ٹپکا!
اور کبھی ذہن میں فلاطون کی شعلۂ فکر انقلاب بنا
کرشن کی بانسری میں لہرایا نغمۂ زندگی کی لے بن کر!
کبھی گوتم کے جام سے چھلکا بادۂ امن و آشتی بن کر
اور کبھی ارضِ کربلا پہ بہا! آلِ احمد کا یہ لہو بن کر!
کبھی لینن کی آنکھ سے ٹپکا نوعِ انساں کا آسرا بن کر
کبھی باپو کے نطق میں ابھرا امنِ عالم کا مدعا بن کر!

اور نہرو کو خطاب کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے ؎

تھی اسی خمیر کی تلاش تجھے تھی اسی خمیر کی لگن تجھ کو
زندگی تیری جستجوئے تمام موت بھی ہے تیری تلاشِ مدام

"جستجوئے تمام" و "تلاش مدام" سے AN ANTOBIOGRAPHY / DISCOVERY OF INDIA

جواہر لال نہرو کی معروف تصنیفات ہیں۔ کی یاد بالخصوص تازہ ہو جاتی ہے۔ واقعی ساغر کا فرمانا درست ہے۔ نہرو نے اپنی عمر تصنیف میں اپنی صلاحیت واستعداد کو کسی نہ کسی تلاش و جستجو پر مرکز کیا ہے۔ شاعر کی آہ سرد میں کتنا سوز و گداز ہے۔ اور ملاقات ہی سمجھ والوں کے لئے چیلنج، آہ سرد یہ ہے جو ہزار ہا معنوں پر مشتمل "آہ" ہے۔

حکمت مرگ و زیست کیا کہئے　　موت اسرار، زندگی اسرار

اس کے بعد شاعر نہرو کی حق پرستی کی یاد کرتا ہے۔ ؎

حق ہے انسان کا پُرانا خواب　　ایک خواب اور ہزار ہا تعبیر!
لیکن اس قتل گاہ انسان میں　　حسن اور خیر و حق کے دیوانے!

ہر تعدی پہ مسکراتے رہے

تھا اسی حق کا تو بھی دیوانہ　　تو بھی اس شمع کا تھا پروانہ
اے پرستار حق سلام تجھے　　اے نگہ دار حق سلام تجھے
امن کا ایک حسین و شوخ کنول　　فکر تازہ کا عطر بیز گلاب
سوز باپو سے جو ملا تھا چراغ　　اسے خورشید کر دیا اس نے

بھارت ورشی وہ جنم بھوم ہے۔ جس میں زماں زماں کیف و وجدان سے بھرپور رہنماؤں کو پیدا کیا ہے۔ مجاہدین کی پرورش و پرداخت کی ہے۔ اور بین الاقوامی پیغام دینے والے بھی یہاں ہوئے ہیں۔ کرشن کی بانسری کی مدھر تانیں اور گیتا میں محفوظ اس کا متحرک فلسفہ، رام لکشمن کے کردار، بھرت کا تیاگ کالیداس کی فنکارانہ مہارت تو رکیلاش، مدوح اکبر، قلب دارا یہیں کے ارض پاک نے دیئے اور ؎

اسی تہذیب نے جواہر کو　　علم و ادراک زندگی بخشا
اس کی تعلیم آدمیت نے　　سب کو انسانیت کا درس دیا
تھی یہی وحدت تضاد صفت　　جس نے نہرو کے فکر کو بخشا

سیکولرازم کا حسین خواب

ہمارا وطن ؎

یہ چمن ہے طلسم نیرنگی　　نہیں یک رنگی پہ دوام بہار
جتنا اس نقش کو مٹاؤ گے　　اور ابھریں گے اس کے نقش و نگار

"نقش مٹ کر بھی موجب نقش و نگار ہو سکتا ہے"۔ کے پس منظر میں بار بار آنے والا یہ شعر مزید معنویت کے ساتھ ابھرتا معلوم ہوتا ہے ؎

حکمت مرگ و زیست کیا کہئے　　موت اسرار، زندگی اسرار

نہرو بیک وقت مورخ، ادیب، دانشور، ذہن و فکر کا معمار، جانباز مرد مجاہد وغیرہ سب کچھ تھے۔ ان سب خصوصیات دل و دماغ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد ساغر نے کہا ہے ؎

اور یہ انسان ہر ایک کا محبوب　　ساری دنیا کی آنکھ کا تارا

اس حسین و عجیب انسان کی — قوم کے ذہن پر حکومت تھی
قوم کی فکر پر سیادت بھی — اک علامت شعور تازہ کی
زندگی کے نئے تصور کی! — آدمی کے نئے تصور کی!
اپنے خوابوں کا اک جہان وسیع — آرزوؤں کا بے کنار دیار
زندگی صفت میں لا محدود — موت کے روپ میں ابد بکنار

موت سے دوچار ہوتے ہوئے نہرو کو تخیل میں لاتے ہوئے شاعر کہتا ہے ؎

جب وہ اپنے جلال خاص کے ساتھ — دو بدو موت کے تصور سے
آخری لفظ کہہ رہا ہوگا۔

قافلے عمر بھر کی یادوں کے — اس کے چاروں طرف کھڑے ہونگے
اپنی فردوس کے حسین نقشے — عطر تخیل میں بسے خاکے
اس کے گھلتے ہوئے تصوریں! — نبض کی طرح ڈوبتے ہونگے

لیکن نہرو کا کردار ابد بکنار اہمیت کا حامل تھا ؎

تیاگ کو جذبۂ عمل بخشا — موت کو دے دیا حیات کا نام
حرّیت کو دیا نیا مفہوم! — حرّیت کو دیئے نئے معنیٰ
حرّیت کو دیا نیا مقصد۔

وہ مرد مجاور نہیں تھا ماضی کا — اسے امروز سے محبت تھی!
مقبروں کا نہیں تھا سودائی — زندگی سے اسے محبت تھی!
وحشت و جہل کے تلاطم میں — شمع عرفاں تھا یہ کیا کم تھا!
عہد حاضر کا دیوتا ہو کر! — صرف انسان تھا یہ کیا کم تھا

ایک حصے کو بے کم و کاست مثال کے طور پر دینا نادرست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ قرن با قرن پر محیط ہندوستانی تاریخ پر بڑے جاذب و دلکش انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے ؎

جائزہ جب لیا ہے ماضی کا — سر گردسفر یہ کھل کے دی ہے صدا
کہ نہیں حق کی کھوج نے مارا! — اتنی کی جستجو کہ کھوئے گئے!
"ماورا" کے جنون بے حد نے — زندگی جیسی شئے کو بھول گئے
عام انسان تھے کہ تھے تیاگی — وہ رشی تھے، کہ منی، کہ ویراگی
سب تھے ہندوستان سے بیگانے — سب تھے اپنے جہاں سے بیگانے
زیست رومان، موت بھی رومان — روح و دل میں رچے تھے افسانے
راج محلوں سے راہ جو نکلی، — کوہ و صحرا میں جاکے ڈوب گئی
کوہ و صحرا سے جو ڈگر پھوٹی — راج محلوں میں آکے ختم ہوئی

سب کے سب فلسفوں میں ڈوبے تھے — فلسفے زندگی کو کیا جانیں،!
جو ہوں محدود اپنے باطن تک — وہ خدا آدمی کو کیا جانیں!
دیکھ کر گمرہی "خداؤں" کی — ایک بندے نے رہنمائی کی!
رشتہ جو ماورائے ذہن کا تھا — اپنی ضربِ صدا سے توڑ دیا!
بےخودوں کو خودی کی مے دیکر — ہندیوں کو ہزاروں سال کے بعد!
ہند سے اس نے روشناس کیا۔

ہندوستان کے باشندے کردار و عمل سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ نہرو نے ہمیں زندہ رہنا سکھایا۔ مرگ نہرو بڑا سانحہ تھا۔ مگر دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے ؎

عہدِ حاضر کا دیوتا ہو کر! — صرف انسان تھا یہ کیا کم تھا!
دین نہرو کا آدمیت تھا! — نوعِ انساں سے خلوص تمام!
جب بھی اس دین میں پڑے رخنے — جب بھی گمراہیوں نے بھٹکایا!
نہرو ابھرے گا اوجِ منزل پر — ایک مینارۂ ضیا ہو کر!

الغرض نہرو نامہ جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا نہرو کے عظیم کردار کی طرح ایک عظیم فنی شاہکار ہے۔ اتنی بڑی مسلسل نظم اور ایک ہی بحر میں بغیر خلوص و صدقِ دل نہیں کہی جا سکتی۔ فاعلاتن، مفاعلن، فعلن پر وضع کی گئی یہ رواں دواں نظم جو فضائے قوم و وطن کے تناظر پر محیط ہے اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے کہ شاعر پر "نہرو موڈ" خاصے طویل عرصے تک جاری و ساری رہا ہوگا۔ وطنیت پر ایک کے بعد ایک گلِ سرسبد پیش کرنا آسان کام نہیں کہا جا سکتا۔ ساغر کی وطنیت بذاتِ خود اعتنا بھی ہے اور قابلِ تعریف بھی۔

آغا سہیل (لاہور)

خوشیوں کا باغ ــــــ ایک مطالعہ

انور سجاد غالباً اردو کا واحد افسانہ نگار ہے جو بیک وقت مصور بھی ہے ڈراما نگار بھی۔ اور اسٹیج کا اداکار بھی۔ اس کی شخصیت کی تفہیم کے لئے اس کے ذہنی افق تک رسائی ناگزیر ہے۔ اور اس کے ذہنی افق کو اگر اردو کے نام نہاد نقادوں کی وساطت سے سمجھنے کی سعی کی گئی تو غالباً انور کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی۔ اور اس کے فن کے ساتھ بھی۔ بحمداللہ کہ مجھے نہ تو نقاد ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور نہ میں نے انور کو سمجھنے کے لئے اردو نقاد کے معروف گراف کو استعمال کیا ہے۔ میں اسے بحیثیت دوست کے کم و بیش بیس سال سے جانتا ہوں۔ اتنے ہی عرصے سے اس کی مصوری کا بھی گواہ ہوں۔ اور اداکاری کا بھی۔ بس میری کوشش یہی ہوگی کہ میں اس کے فن کے باب میں چند کلمات معروضی طور پر پیش کر سکوں۔ اس سے زیادہ کی توقع آپ مجھ سے ہرگز نہ قائم کریں ورنہ مایوسی ہوگی۔

یہ طے کرنا مشکل ہے کہ مصور انور پہلے معرض وجود میں آیا کہ اداکار۔ یا افسانہ نگار۔ لیکن یہ طے ہے کہ انور کی شخصیت کے یہ تمام رُخ اس کے احساس جمال کی تفسیر بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس ناول میں بھی ہمیں اس کی شخصیت کی تینوں جہتیں نظر آجاتی ہیں۔ کہ وہ بوش سے تحریک پا کر جو مختصر سا ناول لکھتا ہے وہ لفظوں سے کم اور لفظوں کے بین السطور مختلف النوع رنگوں کے شیڈز SHADES سے جو ایک وسیع پس منظر قائم کرتا ہے۔ اس کا افق یوں تو سارا زمان و مکان (TIME & SPACE) ہے مگر بطور خاص تیسری دنیا ہے۔ تیسری دنیا جہاں تنازع البقا کا عمل جاری ہے۔ جہاں صرف ایک بیرونی ملک کی فرم کے اکاؤنٹنٹ، اس کی بیوی، دو بچیوں اور اس کے ماں باپ کی اجتماعی زندگی کے چند معمولات کو عمرانی عوامل اور معاشرتی حرکات کے سیاق و سباق میں دیکھا گیا ہے۔ ان محرکات اور عوامل کی ڈور کا سرا کس کے ہاتھ میں ہے؟ مجھے پتہ نہیں۔ شاید مصنف کو بھی پتہ نہیں۔ مگر آپ کو تو پتہ ہے۔ آپ تو بقائمی ہوش و حواس سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اور بس دیکھ رہے ہیں۔

انور نے ڈرامے کو یونانی اور ہندوستانی دونوں حوالوں سے سمجھا ہے لیکن ڈرامے کو کبھی ملو ڈراما نہیں

1- GARDEN OF DELIGHTS : HIERONYMUS BOSCH 3rd PANEL - MUSICAL HELL (C. 1450-1516) PRADO : MADRID

ہونے دیا۔ بلاشبہ وہ قصے، کردار، الفاظ، خیال، آرائش، اور موسیقی سے ڈرامے کو ترکیب دیتا ہے۔ ہندوستانی ڈرامے کے "رس" (آٹھواں رس[1]) اس کی نگاہ سر میں، کلاسیکس میں شیکسپیر سے برناڈ شا تک کے جلوے اس کی نظر میں ہیں۔ لیکن وہ کسی کا حلقہ بگوش نہیں۔ لبقدر ضرورت اس نے قدیم اور جدید سبھوں کو دیکھا بھالا اور سمجھا بوجھا۔ مگر اپنا راستہ آپ بنایا۔ ڈراما اس کے ابلاغ کے گراف پر صرف ایک خط ہے۔ اداکاری، اظہار، مافی الضمیر کا ایک دوسرا خط ہے۔ اور افسانہ ترسیل خیال کا تیسرا خط ہے۔ اور ان تینوں خطوط کی حدود زیر نظر ناول میں صرف ان کو نظر آئے گی جو اسے کسی قدر قریب سے جانتے ہیں۔

میں نے پہلی ہی کہہ دیا ہے کہ ناول کا پلاٹ مختصر ہے۔ لیکن اس مختصر پلاٹ کا سیاق و سباق پڑھے لکھے قاری کے لئے نہایت وسیع و عمیق ہے۔ اس پس منظر کا پیش منظر پاکستان ہے۔ (ظاہر ہے کہ پس منظر تیسری دنیا ہے) اور اس لبناٹ پہ جو مہرے بچھے ہوئے ہیں۔ اور سجے ہوئے ہیں۔ انہیں چلانے والے نہ ہاتھ نظر آتے ہیں نہ جسم، مگر ان کی چالیں ضرور نظر آتی ہیں۔ ان ہاتھوں نے جو دستانے پہن رکھے ہیں۔ انہوں نے انہیں غائب یعنی INVISIBLE بنا دیا ہے۔ تیسری دنیا پہ جو یہ INVISIBILE استعماریت کا عفریت قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ اس کی جہاں کہیں نشان دہی کی جاتی ہے۔ اس سرزمین پر سیاسی زلزلوں کا نزول ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سو فیصدی اقتصادی مسئلہ ہے۔ کہ ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور پس ماندہ ملکوں کے مابین PER CAPITA INCOME کا فرق، زمین و آسمان کا سا فرق بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور ہم کے نتیجے میں ——— خیر چھوڑیئے آیئے اپنی بات کریں کہ سب ورنہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں۔ سنتے ہیں۔ سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہم کسی جبر میں مبتلا ہیں۔ ہمیں اس قہاری اور جباری جبر کے حصار سے کون نکالے گا ——— کیا ہم خود نکل سکتے ہیں۔ کیا ہم نکلنے کی سعی کر سکتے ہیں۔ کیا ہمیں ہنسنے کی اجازت ہے۔ تیسری دنیا کے ملکوں کی تاریخ سامنے رکھیئے اور سوچیئے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کے اس کارگہہ شیشہ گری کا!

---

(1) ACCORDING TO SANSKRIT DRAMA, THERE ARE EIGHT PRINCIPLES: RASAS OR IMPRESSIONS WHICH MIGHT BE AROUSED BY A DRAMETIC POEM — SRIGARA WICH WE MIGHT CALL THE EMOTION OF LOVE, VAR - THE EMOTION OF HEROLSM KARUNA - THE EMOTION OF PATHOS OR TENDER GRIEF, RANDRA - THE EMOTION OF ANGER, HASVA - THE EMOTION LAUGHTER, BHAVANKARA - THE EMOTION OF FEAR OR TERROR, BIBHATSA - THE EMOTION OF DISGUST AND ABHUTA - THE EMOTION OF INONDER OR ADMIRATION.

انور نے اس کارگہہ شیشہ گری میں ایک گرم سانس لی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شیشے کی بہت سی کرچیاں اس کے باطن میں اتر گئی ہیں۔ اس نے اپنے انہیں زخموں کو دکھایا ہے۔ یہ زخم ہمارے آپ کے سبھوں کے زخم ہیں۔ یہ تیسری دنیا کے زخم ہیں۔ یہ ایک کربناک عذاب ہے۔ جس میں ہم مبتلا ہیں۔ ایک جہنم ہے جس میں ہم سلگ رہے ہیں۔ اس کی مصوری کس قدر مشکل تھی۔ انور تم نے جوش کے حوالے سے جو مصوری کی ہے وہ سوچ کی مصوری ہے ہماری اجتماعی سوچ کی۔ وہ سوچ جس میں ہماری راتوں کا گداز اور ہمارے دلوں کا عذاب سب کچھ موجود ہے۔ اور انور تم برش کے رنگوں ہی کے ماہر نہیں۔ لفظوں SHADEO بھی پہچانتے ہو۔ جو تم نے استعمال کئے۔ اور لفظوں کے وہ شیڈ بھی جو تم نے استعمال کئے غیر قاری کے ذہن میں اتار دیئے۔ تم بین السطور کلام کرتے ہو تصویریں بناتے ہو۔ کبھی کبھی تم تھیٹر کے پردے کے پیچھے چپ چاپ کھڑے رہتے ہو۔ اور ہمیں ایک ایسا منظر دکھاتے ہو۔ جسے ہم جانتے پہچانتے ہیں۔ مگر اسے دیکھنا نہیں چاہتے۔ اسے دیکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

یہ خوشیوں کا باغ ہے۔ کہ جہنم کا عذاب ہے۔ کیونکہ خوشی کے نشاط و انبساط کے پیچھے جو درد کارفرما ہے۔ اسے انور نے گرفت میں لے لیا ہے۔ یہ ایک فرد، یا چند افراد یا ایک ملک کی مخصوص سوسائٹی کا ناول نہیں۔ تاریخ کے عمرانی عوامل اور محرکات، انسانوں کے ابنوہ در ابنوہ مدرکات ان کی نفسیات کی کتھا ہے۔ ممکن ہے میری ہی طرح آپ میں سے بعض قارئین نے اسے پڑھا ہو۔ لیکن جنہوں نے اسے اب تک نہیں پڑھا میں ان سے اتنا ضرور ــــــــــــــ کہوں گا کہ آپ اسے پڑھ ڈالیں اور پڑھنے کے بعد آنکھیں بند کر کے آرام کرسی پر بیٹھ جائیں۔ اور اب سوچیں کہ آپ کس مقام پر موجود ہیں؟

ریشماں سمبل

احسان دانش کی شاعری کا ایک تجزیہ

ہندوستانی سماج کے پسماندہ طبقے کی الم انگیز زندگی کی مصوری کرنے میں احسان دانش کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ احسان ایک انتہائی درد مند اور حساس طبع انسان واقع ہوئے تھے۔ ان کی طبعیت کی یہ دردمندی مصنوعی نہیں تھی۔ بلکہ حقیقی اور فطری تھی۔ جو زندگی کے تلخ تجربات کی آنچ میں تپ کر کچھ اور نکھر گئی۔ جذبات میں سب سے قوی جذبہ غم کا جذبہ ہوتا ہے۔ جو احساسات پر جلد اثرانداز ہو کر شدت اختیار کر لیتا ہے۔ احسان محض ایک آزاد اور روشن خیال ہی نہیں ایک ایسے شاعر بھی ہیں۔ جو جذبات و تاثرات اور احساسات کو پراثر انداز میں پیش کرنا جانتے ہیں۔ وہ مناظر فطرت کی تصویرکشی، جذبات، درد و غم کی عکاسی اور جزئیات نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

ان کی شاعری۔ مزدوروں، کسانوں۔ اور مفلسوں کی ترجمانی کے ساتھ انسانیت، محبت اور مساوات کا ایک پرکشش انقلابی پیغام دیتی ہے۔ ان کے کلام میں حریت و آزادی، اخوت و محبت، خلوص و صداقت، جلال و جمال، حزن و یاس اور درد و الم کا ایک متوازن امتزاج پایا جاتا ہے۔ احسان کی شاعری کا مقصد تفنن طبع یا دلچسپی کا سامان بہم پہونچانا ہی نہیں بلکہ وہ ہندوستانی مزدوروں، کسانوں اور ستم رسیدہ لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کر کے انقلاب کے لئے دعوت دیتے ہیں۔

احسان الحق کا آبائی وطن باغپت۔ ضلع میرٹھ ہے۔ والد کا نام قاضی دانش علی تھا۔ جنھوں نے ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسی مقام پر ۱۹۱۴ء میں احسان کی پیدائش ہوئی [۱] احسان نے تقسیم ملک سے قبل ہی لاہور میں رہنا شروع کر دیا تھا زمانہ طفولیت افلاس و تنگدستی کا پرشور بس گزرا اور اسی کے زیر سایہ منزل شباب میں قدم رکھا۔ احسان کی ابتدائی زندگی جس ماحول میں بسر ہوئی وہ انتہا درجہ المناک تھا۔ غربت اور افلاس کے باعث ان کی باقاعدہ تعلیم نہیں ہو سکی۔ محنت و مشقت سے وقت بچا کر صرف چوتھی جماعت تک ہی تعلیم حاصل کر سکے۔ جسے احسان صاحب اب مزاحاً "فورتھ ایر" کہا کرتے تھے۔ لاہور میں احسان نے اپنی کفالت کے لئے خشت برداری بھی کی۔ اور معماری بھی۔ پہرہ داری بھی کی۔ اور چپراسی گری بھی۔ کچھ عرصے تک مالی کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔ ان سخت مصائب کے باوجود ان کے شعری ذوق و شوق میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ جب دوپہر کو تمام مزدور تھک کر آرام کیا کرتے تھے اس وقت احسان اس دنیا سے الگ اخبار اور رسائل کی ورق گردانی میں غرق رہتے تھے۔ شب

---

[۱] مختصر تاریخ ادب اردو، اعجاز حسین۔

کا زیادہ تر وقت بھی ان کے علمی ذوق کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ وہ ایک مختصر سی تاریک کوٹھری میں ٹاٹ کے بستر پر مٹی کے تیل کی ڈبیا لکڑی کے صندوق پر روشن کئے مطالعہ میں منہمک پائے جاتے تھے۔ اور بڑی مردانہ واری سے مسکراہٹوں کے درمیان لوگوں کا خیر مقدم کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات کہا کرتے کہ یاد رکھو میری بوریئے پر آنکھیں کھلی ہیں۔ اور قالین پہ دم نکلے گا۔ حزن و یاس اور قنوطیت دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔ وہ انتہائی خوددار باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کی تلخیوں کو کبھی منظر عام پر لانا پسند نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ کہیں اس کی اشاعت رحم کی بھیک نہ سمجھی جائے۔ احسان کو کتب بینی کا انتہائی شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بالآخر کتابوں کی اشاعت اور خرید و فروخت ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔ اور ایک تجارتی ادارہ قائم کیا۔ جو مکتبۂ دانش کے نام سے مشہور رہے۔

افسوس کہ زندگی کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی۔ وہ ۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء کو اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔ ادھر ایک سال سے وہ فالج کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ لیکن پڑھنے لکھنے کا کام بدستور جاری تھا۔ اور دو کتابیں اس زمانے میں بھی زیر تسوید تھیں۔ اپنی زندگی کے آخری رات کو بھی وہ دیر تک دوستوں سے باتیں کرتے رہے۔ اور اپنے اشعار سناتے رہے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا سہ

مجھے عادت ہے اپنے گھر نماز شام پڑھنے کی
میری میت کو دفنا دو غروب شام سے پہلے

ان کی وصیت کے مطابق انہیں قبل غروب آفتاب قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اور ہم ایک باعظمت اور خوددار شاعر سے محروم ہو گئے۔ جس نے زندگی بھر بڑی دردمندی کے ساتھ سماج کے پس ماندہ طبقوں کی حمایت میں انقلاب کی گیت گائے تھے

احسان نے جو کچھ اپنی زندگی کے تلخ تجربات سے حاصل کیا اور محسوس کیا اسی کو اپنی شاعری میں ڈھال دیا۔ جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں :-

> میری بے کس اور مزدور زندگی جن کٹھن منزلوں سے گزری۔ اور اپنے ہم قسمت رفیقانِ سفر پر گردش لیل و نہار کے جو ہمت پاش مظالم دیکھے۔ ان غم ناک مناظر کے تاثرات میرے حدود ضبط سے باہر تھے۔ اور اپنی خواہش کے خلاف ان کے بیان کرنے پر میں نے اپنے آپ کو مجبور پایا ...... یہ منظوم آہیں حسن اتفاق سے اصطلاحی اوزان پہ پوری اترتی ہیں۔ اب انہیں شاعری سمجھ لیجئے یا ہذیان نامرادی۔
>
> (لوائے کارگر صفحہ ۱۵-۱۴)

اس اقتباس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ قال نہیں ہے بلکہ حال ہے۔ جذبہ و احساس کی یہی صداقت شاعر کے لہجے میں دردمندی، بیان میں خلوص اور پیغام میں تاثیر کی موجب ہوتی ہے۔

ان کے دل و دماغ کی کاوشوں کا بہترین نتیجہ نچلے طبقے کی ترجمانی اور مناظر قدرت کی عکاسی ہے۔ ہر دور میں کامیاب شاعر اسی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو وقت کے مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اور سیاسی و سماجی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ احسان نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں۔ وہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان

کے لئے بہت ہی نازک زمانہ تھا۔ سرمایہ دار مزدوروں کا استحصال کر رہے تھے۔ اور غریب مزدور کو تڑپنے فریاد کرنے اور اپنے حق محنت مانگنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ایسے دور میں احسان کی شاعری نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔ احسان نے سرمایہ دارانہ ذہنیت اور سفاکانہ شیطانی روش کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا۔ کیونکہ وہ مزدور طبقہ کی بےکسی، بےبسی محرمان نصیبی، و فاقہ کشی ، اور اس کی نفسیات سے بخیر و خوبی واقف تھے۔ ذاتی تجربہ کی بنا پر احسان مزدوروں اور مفلسوں کے جذبات کی ترجمانی ایسے مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔ کہ سخت سے سخت اور پتھر سے پتھر دل بھی پگھل کر اشکوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ خصوصاً غم و الم کی مصوری میں ان کو ملکہ حاصل ہے۔

احسان انقلاب کے خواہش مند ضرور تھے۔ لیکن یہ تصور زیادہ تر جذباتی اور کبھی کبھی رومانی ہوتا ہے۔ ان کو باغی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کافی حد تک اقبال اور جوش سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں یہ اثرات نمایاں طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ۔ اس میں گھن گرج اور تلاطم کی کیفیت نہیں جو جوش سے مخصوص ہے

واقعات اور مناظر فطرت کی ہو بہو تصویر پیش کرنے میں احسان کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ تصویر کے خد و خال اور واقعات کے جزئیات کو کسی قدر نمایاں کرنے کے لئے بہت دلکش پس منظر پیش کرتے ہیں۔ اور یہ پس منظر کبھی مفلسی کی دل ہلا دینے والی تصویر ہوتا ہے۔ تو کبھی فطرت کے رنگین مناظر میں ایک ایسے مجبور و بیکس انسان کی تصویر جو سماج کے استحصال کا شکار ہے۔

احسان نے دلسوز نظموں کے ساتھ ساتھ رومانی نظمیں بھی کہی ہیں اور حسن و عشق کے موضوعات بھی قلمبند کئے ہیں۔ احسان میں کیف و سرور کی شاداب فضا پائی جاتی ہے۔ احسان نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن وہ فطرتاً ایک نظم گو شاعر ہیں۔ غزلوں میں سوز و ساز اور حسن و یاس کے علاوہ جستہ جستہ تصوف فلسفہ اور مسائل وحیات و کائنات کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ لیکن یہ غزلیں روایتی غزل سے مختلف ہیں۔ اور ان میں جذبات و تاثرات کی جو وحدت ملتی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے ان غزلوں کو غزل مسلسل یا بے عنوان نظم کہا جا سکتا ہے۔ اشعار میں روانی اور صوتی آہنگ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہر شعر شاعرانہ موسیقی کے وصف سے مالا مال ہے۔ جدید تشبیہات اور شاعرانہ اصطلاحات کافی ملتی ہیں۔ زبان نہایت صاف اور شستہ ہے۔

احسان نے اپنی مشکلات سے بھرپور زندگی اور کسی قدر پریشان کن مصروفیات کے باوجود ۹ نثری اور ۲۰ بیس شعری مجموعے مرتب کئے ہیں۔ جو احسان زندگی کے تلخ تجربات کے شاہد ہیں۔

لوائے کارگر: یہ احسان کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کی دردانگیز نظمیں ہر دل پر اثر انداز ہوتی ہیں معاشرت نسواں کے کمزور پہلوؤں پر جو نظمیں کہی گئی ہیں۔ وہ حقیقی اور نفسیاتی ہیں فردوس بیوہ، قرآن اور مزدور، ڈل پر مزدور، عورت کا ایثار، مزدور کا مہمان، ایک ٹھیکیدار سے وغیرہ اس مجموعے کی بہترین نظموں کے نمونے ہیں۔

آتش خاموش: اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں۔ اور غزلیں بھی۔ احسان نے اس میں مزدور اور سرمایہ داری کے مظالم کی دل برداشتہ کرنے والی تصویریں اور فاقہ کشی کے الم انگیز مناظر بیان کئے ہیں۔

چراغاں : نظموں کا مجموعہ ہے۔

جادۂ نو : یہ شعری مجموعہ احسان کے قطعات پر مشتمل ہے۔ جس میں مختلف تشبیہات اور تمثیلات کے ذریعہ معاشرے کے کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نغیرِ فطرت : اس مجموعے میں ان کی تازہ نظموں اور غزلوں کے علاوہ درد، زندگی، اور حدیثِ ادب کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔

حصرِ عروض : علمِ عروض کے نکات و مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ جو شعرا حضرت کے لئے کافی کارآمد ہے۔

مومن حیات اور شاعری : یہ کتاب مومن کی سوانح اور ان کی شاعری کی خصوصیات پر مبنی ہے۔

دستورِ اردو، زخم و مرہم، شیرازہ، اور گورستان کے علاوہ، ریاضی، فرہنگ، محاورات، اور علمِ معانی اور بیان کی چھ کتابیں ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ جو بہت جلد منظرِ عام پر آنے والی ہیں۔ بہارِ دانش کی دوسری جلد "جہانِ دگر" اور "اسلامی علوم کا نشو و نما" ابھی احسان کے زیرِ قلم ہی تھیں۔

گورستان ایک طویل نظم ہے۔ جو احسان نے اپنی والدہ کے انتقالِ پُر ملال سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ انہوں نے اس نظم میں فلسفۂ موت کے بیان کے ساتھ ساتھ اربابِ تکبر اور اہلِ ہوس کو ایک درس بھی دیا ہے۔ موت ہی انسان کا ایک ازلی دشمن ہے۔ جس پر آج تک کوئی فتح یاب نہیں ہو سکا۔ دنیا کی ہر شئے بے ثبات اور فانی ہے۔ اور ہر چیز کو آخر کار زوال ہے۔ اپنے اصل کی جانب واپس جانا ہے۔ خواہ امیر ہو یا فقیر، ہر شخص خاک میں ملنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ یہ دنیا مثلِ حباب فانی ہے اور آگے طویل زندگانی ہے۔ جس میں ہر شخص اپنے کئے کا پھل ضرور پائے گا۔ احسان کے یہاں قنوطیت نہیں بلکہ رجائیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ تکلیفِ مرگ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ موت کے تخیل سے ہی انسان کانپ اٹھتا ہے۔ لیکن احسان اس امر کو ماننے کو تیار نہیں۔ ان کے یہاں موت محض تبدیلیِ ہیئت کا نام ہے۔ موت کے بعد انسان کو تمام آسودگیاں بہم پہنچتی ہیں ؎

موت ہے شانہ ادائی زلفِ پرخم کے لئے
موت ہے فردوس بن جانا جہنم کے لئے

احسان کی نظم "صبحِ مسرت" مصورانہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ وہ فطرت کے رنگین مناظر کی مرقع کشی میں بھی مزدور اور دہقان کا ذکر ضروری خیال کرتے ہیں۔

آثار سحر کے پیدا ہیں اب رات کا جادو ٹوٹ چکا
ظلمت کے دشتِ وحشت سے تنویر کا دامن چھوٹ چکا
کہرے کے دھندلے پردوں سے خورشید نکلتا آتا ہے!
ظلمت میں اجالے کا دریا پہلو سے بدلتا آتا ہے!
چرواہوں کے پیچھے بستی سے گاتے ہوئے گلہ بان چلے
محتاجِ مرمت گھروں سے ہل بیل لئے دہقان چلے،

"نکاحِ ثانی" میں احسان نے ایک بیوہ کے جذبات و احساسات کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اس پر درد و غم کے برجستہ الفاظ سونے پر سہاگے کا کام دیتے ہیں۔

"نوعروس بیوہ" اعلیٰ درجہ کی منظرکشی کی بہترین مثال ہے جس کو پڑھنے سے ایک نوعروس کی تصویر ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

احسان کی زندگی کے تلخ تجربات انہیں کبھی کبھی نہایت خوفناک اور ہیبت ناک مناظر کی مصوری کے لئے اکساتے ہیں "سادھو کی چتا" اسی قسم کی ایک مثال ہے۔

کھولتا سینہ، سلگتی کھوپڑی، پکتا بدن — بڑبڑاتی آگ، جھلاتی لپٹ، جلتا کفن

ٹوٹتی نبضیں، چٹختی ہڈیاں، اڑتے شرار — لوتھڑوں کی سنسناہٹ سرخ شعلوں کی ڈکار

ہونکتے جھونکوں کے آگے چونکتی چنگاریاں — لوٹتے شعلوں کی لہراتی ہوئی نیلی زباں

ہر طرف لہرا رہا تھا بے ثباتی کا علم — موت کی دیوی کی خونیں قہقہوں کا زیر و بم

اس پوری نظم میں ایک پُرہیبت فضا طاری نظر آتی ہے۔

"قرآن اور مزدور" احسان صاحب کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے ایک ناتوان مزدور مذہب کی قیود میں رہ کر اسی یاس و امید پر اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ کہ آنے والی صبح اس کے لئے خوشحالی کا پیام لے کر آئے گی لیکن خدا اسے اپنی رحمتوں اور نوازشوں سے کسی قدر دور ہی رکھتا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے۔

پرستش کا دلدادہ منعم گزیدہ! — گریباں میں پیوند دامن دریدہ

نگاہیں الم ناک میں التجائیں! — جھپکنے میں پلکوں کے سو سو دعائیں

ہزاروں امیدوں کا مدفن ہے سینہ! — ہے فاقوں کے دریا میں دل کا سفینہ

جو لب تک نقاہت سے رک رک کے آئیں — وہ کیا جائیں باب اثر تک دعائیں

ہر ایک سانس افلاس کی داستاں ہے — غم دو جہاں اور تن ناتواں ہے

تمیں اس کی راحت کا زیر و زبر ہے

کدھر ہے تو اے رحمت حق کدھر ہے؟

احسان نے اپنی زندگی میں تمام نشیب و فراز دیکھے۔ لیکن ان کے مزاج میں صبر و تحمل کی جو صفت تھی۔ اس نے ان کو بڑی سے بڑی صعوبتوں اور مصیبتوں کو مسکرا کر برداشت کرنے کا اہل بنا دیا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے گھر سے خط آیا کہ مکان انتہائی بوسیدہ ہو چکا ہے اور ہو سکتا ہے اگلی بارش کی تاب نہ لا سکے۔ لیکن کچھ مجبوریوں کی بنا پر احسان وقت پہ گھر نہ پہونچ سکے۔ اور وہ مختصر سا شکستہ مکان منہدم ہو گیا۔ یہاں تک کہ احسان کو کاندھلے پہونچنے پر اپنے ایک دوست کے گھر قیام کرنا پڑا۔ اس واقعہ کو انہوں نے ایک نظم میں "میرا گھر" کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔ جو منظرکشی کی اچھی مثال کہی جا سکتی ہے ؎

میرا ٹوٹا ہوا جھونپڑا ہے اور غلاف شام ہے — سامنے ایک شاہکار گردش ایام ہے

آہ یہ برسات کے مارے ہوئے دیوار و در — جن سے اب تک بے نصیبوں کی بلندی جلوہ گر
ہائے دیواروں کے یہ مٹتے ہوئے نقش و نگار — کر رہے ہیں اور بھی غم گیں فضا کو سوگوار!
دل بھر آتا ہے رو کوں کس طرح انسان ہوں — آہ میں اپنے وطن میں ہوں مگر مہمان ہوں!

غرض احسان دانش نے اپنی نظم گوئی سے جس میں تجربے خلوص شامل ہے اور سماجی آگہی اور طبقاتی شعور کے کے واضح نشانات ملتے ہیں۔ اقبال کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کے یہاں کے مابعد الطبعیاتی تصورات کا کوئی دخل نہیں بالکل سامنے کے حقائق ہیں۔ اور ان تجربوں کا بیان ہے۔ جن سے سماج کا پس ماندہ طبقہ روز دوچار رہتا ہے ان کی شاعری ان ترقی پسندوں کی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ جو ایر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر اور قیمتی شرابوں کے جام ہاتھ میں لے کر مزدور کے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے ہیں۔

گفتگو:- ممتاز احمد خاں

(برائے بحث)

احمد یوسف پاکستان میں

سوال:- احمد یوسف صاحب! آپ ہندوستان کے کس شہر میں مقیم ہیں۔ اور کس پیشے سے وابستہ ہیں؟

جواب:- میں صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ میں رہتا ہوں اور تجارت کے پیشے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے۔ جس میں پلاسٹک کی مصنوعات تیار کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں ہارڈویر میں بھی ڈیل کرتا ہوں۔

سوال:- آپ نے افسانہ نگاری کی ابتدا کب سے کی؟ کچھ اپنے ابتدائی دور کے بارے میں بتائیں؟

جواب:- میں نے ۱۹۵۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ درمیان میں کچھ عرصے کے لئے لکھنے لکھانے کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ لیکن ۱۹۶۲ء سے پھر لکھنا شروع کیا۔ اور اب تک باقاعدگی سے لکھ رہا ہوں۔ میں نے جب لکھنا شروع کیا تو اس وقت ترقی پسند تحریک کا زور تھا۔ مگر ساٹھویں دہائی میں میرے ساتھ بہت سے دوسرے لکھنے والوں نے بھی محسوس کیا کہ ادب پر کسی خاص موضوع، نظریے یا ازم کا تسلط ہو جائے تو تخلیق تخلیق نہیں رہتی نعرہ اور پروپگنڈہ بن جاتی ہے۔ یہ احساس ادب میں ایک تبدیلی کا موجب بن گیا۔ میرے دو افسانوی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "روشنائی کی کشتیاں" تھا جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "آگ کے ہمسائے" ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آیا۔

ایک نظر میں

نام	احمد یوسف
تاریخ پیدائش	جون ۱۹۳۱ء
مقام پیدائش	پٹنہ، (عظیم آباد)
تعلیم	بی۔ ایس۔ سی (علی گڑھ)
افسانہ نگاری کی ابتدا	۱۹۴۹ء
پہلا مطبوعہ افسانہ	وہ بیس کا نہ تھی
مطبوعہ افسانوی مجموعے	(۱) روشنائی کی کشتیاں ۱۹۷۵ء
" "	(۲) آگ کے ہمسائے ۱۹۸۰ء
پیشہ	تجارت
سفر پاکستان پہلی بار	۱۹۷۸ء
" دوسری بار	۱۹۸۲ء

اصناف جن میں طبع آزمائی کی: افسانہ، ناولٹ، خاکہ، خاکہ، تنقید۔ البتہ غزل بھی کہتے ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے

سوال:۔ آپ نے ترقی پسند تحریک کا تذکرہ کیا ہے اس سلسلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کسی اور تحریک سے متاثر ہوئے؟

جواب:۔ بھئی ہمارے ہاں تحریکیں کہاں چلیں؟ ہمارے ہاں تو رجحانات آئے۔ مثلاً ساٹھویں دہائی کے آغاز میں جدیدیت کا رجحان آیا۔ اور علامتی و استعاراتی انداز یا اسلوب کو فروغ ہوا۔

سوال:۔ کیا آپ یہ بتائیں گے کہ آپ نے اب تک کتنے افسانے لکھے ہیں۔ اور افسانوں کے علاوہ اور کیا کچھ لکھا ہے۔؟

جواب میرے دونوں مجموعوں میں بیس بیس کہانیاں شامل ہیں۔ تیسرا مجموعہ "۲۳ گھنٹے کا شہر" زیر ترتیب ہے اس میں بھی تقریباً ۲۰ کہانیاں ہوں گی۔ اس سے آپ میرے افسانوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بالکل صحیح تعداد میں نہیں بتا سکتا۔ افسانوں کے علاوہ میں نے دو ناولٹ بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے ایک "سیپ" کے ناولٹ نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ ان دنوں میں ایک ناول پر کام کر رہا ہوں۔ افسانے اور ناولٹ لکھنے کے علاوہ میں نے کچھ مضامین بھی لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر میں نے غلام عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، شکیلہ اختر، اور پریم چند وغیرہ کے ایک ایک افسانے کے تجزیے کئے ہیں۔ اردو ناولوں کے اہم کرداروں کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ جو بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہو جائے گا۔

سوال:۔ جب انسان لکھنا شروع کرتا ہے۔ تو لازماً کسی نہ کسی سے متاثر ہوتا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کن لوگوں سے متاثر تھے۔؟

جواب:۔ میں بیدی، کرشن، منٹو، غلام عباس اور عصمت وغیرہ کو پڑھتا رہا تھا۔ اور ان سے متاثر بھی تھا۔ مجھے احمد ندیم قاسمی کے ان افسانوں نے بھی جو دیہات سے متعلق تھے، متاثر کیا تھا۔

سوال:۔ یہ غالباً اس وقت کی بات ہے جب آپ کی حیثیت افسانہ نگار سے زیادہ ایک قاری کی تھی۔ لیکن اب جبکہ آپ خود افسانہ نگاری میں ایک مقام حاصل

> غیاث بہت اچھے افسانہ نگار ہیں اور انہوں نے کئی بڑی کہانیاں اردو ادب کو دی ہیں، مثلاً پرندہ پکڑنے والی گاڑی، خانے تہہ خانے، پیچ در پیچ وغیرہ۔

کر چکے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ بیدی صاحب میرے لئے ہر دور میں پسندیدہ رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کے افسانے قلب و جگر کو چھوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر، غلام عباس، ممتاز مفتی اور انتظار حسین بھی مجھے پسند ہیں۔ اور میں ان کی قدر کرتا ہوں۔

سوال:۔ اپنے ہم عصروں میں آپ کن لوگوں کو اہم سمجھتے اور پسند کرتے ہیں۔؟

جواب:۔ میرے ہم عصروں میں بھی بہت سے اچھے لکھنے والے ہیں۔ میں سب سے پہلے غیاث احمد گدی کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ غیاث بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔ اور انہوں نے کئی بڑی کہانیاں اردو ادب

کو دی ہیں۔ مثلاً پرندہ پکڑنے والی گاڑی، خانے
تہہ خانے، پیچ در پیچ وغیرہ لیکن غیاث کی
ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ اسپیلائزیشن میں یقین
رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس کلام حیدری کے یہاں
بہت زیادہ تنوع ہے۔ وہ کسی ایک ماحول یا
طبقے تک محدود نہیں ہیں۔ جوگندر پال ہمارے
ہمعصروں میں شاید سب سے زیادہ لکھتے ہیں۔
ان کا ایک مخصوص انداز ہے۔ رتن سنگھ اپنی اختصار
پسندی اور چابک دستی کے لئے مشہور ہیں۔
دوسرے اچھے لکھنے والوں میں انور عظیم، اقبال
متین، الیاس احمد گدی، جیلانی بانو وغیرہ ہیں۔

سوال: آپ نے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے
افسانے پڑھے ہیں۔ کیا آپ کو ان کے درمیان

کلام حیدری کے یہاں بہت زیادہ
تنوع ہے وہ کسی ایک ماحول یا
طبقے تک محدود نہیں ہیں

کوئی واضح فرق نظر آتا ہے؟

جواب: پاکستان کے افسانے پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ
یہاں زندگی سے ہم رشتگی کو بڑی اہمیت دی
جاتی ہے۔ پھر یہاں ایسی علامتیں استعمال ہوتی
ہیں جنہیں سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ یہاں
کے افسانہ نگاروں کی اکثریت ابلاغ کا احساس
رکھتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اچھے لوگ بھی
ہیں جو بالکل HOAX ہیں۔ کچھ لوگ جغرافیائی
اور سائنسی میڈیم افسانے میں لکھ رہے ہیں۔
جو بیکار سی بات ہے مگر ہمارے یہاں اچھے لکھنے
والے بھی ہیں اور در اصل یہی لوگ ہندوستانی
افسانے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

سوال: آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ ہندوستان اور پاکستان
میں جدید افسانے کا مستقبل کن ناموں سے وابستہ
ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب میں شہروں اور علاقوں کے
حوالے سے گفتگو کروں گا۔ تاکہ آسانی رہے۔ ہمارے
ہاں بمبئی میں سلام بن رزاق اور انور خان وغیرہ
اچھے افسانے لکھ رہے ہیں۔ سلام بن رزاق کے
ہاں صنعتی عہد کا کرب ملتا ہے۔ علی گڑھ میں سید
محمد اشرف، طارق چھتاری اور دو ایک اور لوگ
اچھا لکھ رہے ہیں۔ بہار میں شوکت حیات،
حسین الحق، عبدالصمد، عبید قمر، م ق خان وغیرہ
بہت اہم نام ہیں۔ یہاں کراچی میں افسر آذر، علی
حیدر ملک، مشرف احمد، اے خیام، اور رحمان شریف
وغیرہ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ اسد محمد خاں،
زاہدہ حنا، اور نقی حسین جعفری نے بھی کئی عمدہ کہانیاں
دی ہیں۔ ادھر راولپنڈی میں رشید امجد، مرزا
حامد بیگ، اعجاز راہی، محمد منشا یاد، احمد داؤد
وغیرہ افسانے میں نئی جہتوں کا اضافہ کر رہے ہیں
ایک صاحب یونس جاوید بھی بہت اچھا لکھ رہے
ہیں۔ مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔

سوال: احمد یوسف صاحب! افسانے کے بارے میں کافی گفتگو
ہو چکی ہے۔ اب کچھ ناول کے بارے میں بات
کی جائے۔ ہندوستان اور پاکستان کی ناول
نگاری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ممتاز صاحب! سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں

اچھے ناول بہت ہی کم لکھے گئے ہیں۔ قرۃ العین
حیدر پاکستان میں تھیں تو انہوں نے "آگ کا دریا"
جیسا عظیم الشان ناول لکھا۔ اس کے بعد ہندوستان
جا کر انہوں نے کچھ اچھے ناول لکھے۔ کرشن چندر
نے جو ناول لکھے وہ کچھ یوں سے ہیں۔ البتہ بیدی
صاحب کا ناولٹ قدر اول کی چیز ہے۔ حیات اللہ
انصاری کے ناول "لہو کے پھول" میں زبردستی کی
تفصیلات، سیاسی لیڈروں کی تقریریں، اور
بیانات اس ناول کو خواہ مخواہ بوجھل اور ضخیم
بنا دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اسے سختی سے
اڈیٹ کیا جائے تو یہ ایک اچھا ناول بن سکتا
ہے اسکے علاوہ عصمت چغتائی اور جیلانی بانو نے
بھی اچھی کوششیں کی ہیں۔ پاکستان نے نسبتاً
زیادہ اچھے ناول نگار پیدا کئے ہیں۔ جن میں فضل
احمد کریم فضلی، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، خدیجہ
مستور، ممتاز مفتی، نثار عزیز بٹ، رضیہ فصیح احمد،
بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، انیس ناگی وغیرہ شامل ہیں
مگر ہندوستان اور پاکستان کے تمام ناول نگاروں
کو مجموعی لحاظ سے نظر میں رکھا جائے تو یہ کہنا پڑیگا
کہ قرۃ العین حیدر سب سے بڑی ناول نگار ہیں

سوال:۔ یہ تاثر عام ہے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں
جگہ فکشن پر تنقید بہت کم لکھی گئی ہے۔ صرف شاعری
پر ایک ہی جیسے مضامین ......

جواب:۔ کچھ دنوں پہلے تک یہ تاثر صحیح تھا۔ لیکن اب یہ
دیکھنے میں آرہا ہے۔ کہ دونوں ملکوں میں ایسے
لوگ ابھر رہے ہیں۔ جنہوں نے فکشن ہی کو اپنا
خاص موضوع بنایا ہے۔ ادبی پرچے میرے اس
خیال کی تصدیق کریں گے۔ ہندوستان میں مہدی
جعفر، عابد سہیل اور وہاب اشرفی وغیرہ فکشن پر لکھ
رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پریم چند کے صد سالہ جشن
کے سلسلے میں ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا جس میں عمدہ
مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان مقالات
کو کتابی صورت میں شائع کر چکے ہیں جس سے فکشن
کا ذکر کافی تقویت ملی ہے۔ اسی طرح پاکستان میں
بھی کئی لوگ اس میدان میں آئے ہیں۔ یہاں محمد حسن
عسکری مرحوم، اور ممتاز شیریں مرحومہ نے بھی بہت
اچھے مضامین تحریر کئے تھے۔ پھر محمد احسن فاروقی نے
کچھ کام کیا ہے۔ مظفر علی سید فکشن پر مفید اور معیاری
کام کر رہے ہیں۔ شہزاد منظر گذشتہ بارہ تیرہ سال
سے صرف افسانے اور ناول کے بارے ہی میں لکھ
رہے ہیں۔ اب ان کی کتاب "جدیدیت اور افسانہ"
بھی آگئی ہے آپ کے یہاں مرزا حامد بیگ نے بھی
افسانے پر کئی معیاری مضامین لکھے ہیں۔ افسانے
پر شاید ان کی کتاب بھی جلد ہی آنے والی ہے۔ اسی
طرح علی حیدر ملک نے بھی جو بنیادی طور پر افسانہ نگار
ہیں۔ جدیدیت اور علامتی افسانے سے متعلق مضامین
کی ایک سیریز لکھی ہے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اس کی
طرف توجہ کی ہے۔ جس سے یہ امید بندھی ہے کہ
آئندہ چند سالوں میں فکشن کی تنقید کے سلسلے میں
بڑا کام ہو جائے گا۔

سوال:۔ شاعری سے بھی آپ کو کچھ دلچسپی ہے؟

جواب:۔ جی ہاں میں شاعری بہت شوق سے پڑھتا ہوں
کراچی میں قیام کے دوران مجھے جن لوگوں کا کلام
پڑھنے یا سننے کا موقع ملا ان میں سے کچھ نے مجھے
خاصا متاثر کیا۔

سوال:۔ کیا آپ ان کے نام بتانا پسند کریں گے؟

(طنز و مزاح)

فاروق نشتر

پرسہ پرستار کا ——— !

ذہن اور دل کے تالوں کو کھول کر انسان اگر ملاقات کا شرف بخشے تو سمجھ جائیے ——— انسانوں کی تقدیر کھل گئی
اخلاق سدھر گئے۔ اور ملاقاتی بیمار رہے۔ کیونکہ ذہن اور دل کے تالوں کو بیماری کی کنجی نے کھولا ہے۔ اس مشینی دور میں اگر
میٹھی باتیں سننے اور کہنے کا موقع ملتا ہے تو ——— بیمار کی قربت میں ——— بیمار جانتا ہے ——— معاملہ چل چلاؤ پر ہے ———
لہذا ———

ع۔ تعلق کچھ ہو بہر ملاقات چاہئے۔

اور تیماردار سمجھتا ہے دو روپئے کی موسمیوں میں اگر پانچ روپئے کے لوازمات ملیں تو دلاسہ دینے میں حرج ہی کیا ہے۔
محلے میں حضرت تیماردار بیمار کی تیمارداری کی وجہ سے نیک نامی کی حد تک مشہور ہیں۔ (بدنامی کی حدوں کو سماج نے ختم کر دیا ہے) یہ ہمیں ہر روز میونسپل اسپتال کے چکر میں چکراتے نظر آئے تو ہم نے وجہ دریافت کی، کہنے لگے ——— بھیا! سنا ہے شہر کے رئیس اعظم مولانا اعظم خان کی ہستی فلم مغل اعظم کی طرح یادگار ہونے کے چکر میں اس دار فانی میں اپنا کیا کرایا غریب بندوں اور رئیس بیٹوں کو دے دلا کر اسی بستی کے کسی اسپتال میں حلق گور ہیں۔" ہم نے کہا" سنا ہے وہ ڈاکٹر دھن رام کے ہاں ہر لمحہ لب گور اپنے صندور تن کو توانا بنانے کے لئے دھن اور من سے کوشاں ہیں۔ مگر آپ کو رئیس اعظم کی کیوں پڑی۔ جبکہ ہم آپ کی پڑوسی بھی ہیں۔ اور بیمار بھی رہتے ہیں۔ مگر آپ نے .... حضرت تیماردار ہماری بات کاٹ کر ہمیں خونخوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ چیخ کر چلے گئے جیسے لاحول کہتے ہیں۔ اور دوسرے دن ہم نے دیکھا وہ ڈاکٹر رام دھن کے اسپتال سے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اپنی پیٹھ بھی خود اپنی ہاتھ تھپک رہے تھے۔

آپ نے غور کیا! حضرت تیماردار نے ہم لاچار ادیب کو لائق مرہم سمجھا، اور نہ لائق رحم، بلکہ ہماری بات کے ساتھ ہمارا راستہ اور پتہ دونوں کاٹ کر چل دیئے۔

لیکن ہم حضرت تیماردار کو مورد الزام نہیں ٹھہراتے کیونکہ ادیب کی تقدیر میں جب کھانا ہی مشکل سے لکھا گیا تو بیماری کے لئے وٹامن کہاں لکھے جاتے۔ اور ادیب کی قسمت تخلیقی اناج (جو قارئین کے لئے ہوتا ہے) لکھنے کے بعد پیٹ کے لئے اناج اور وٹامن کے لکھنے کو جگہ کہاں ہوگی۔

لیکن کبھی کبھی انسان کو وسیع النظری اور وسیع القلبی کا ثبوت بھی دینا چاہئے۔ لہذا! ادیب وٹامن، اے،

ں اور ڈی کے لائق نہیں ـــــــ وہ انگریزی وٹامن کے مستحق نہ سہی۔ مگر اردو وٹامن "ح" یا "ہ" کے قائل
ں۔ یعنی وٹامن "حوصلہ" اور وٹامن "ہمت" جو پرستاران ادب افزائی کی سرینج سے انجکٹ کرکے ادیب کے
شربت روح افزا اور اس کے قلم کے لئے روشنائی لوح افزا فراہم کرسکتے ہیں۔ شاید حضرت مومن بھی وٹامن ہمت
نہ پاکر لکھتے ہیں۔

ع دن رات فکر جو رہیں یوں رنج اٹھانا کب تلک

ردو دنیا میں اچھے سخنور ہونے کے ہم نے بھی جیب سخن کی بذلہ سنجی پر اسے اپنا ـــــــ مگر واہ رے عوام کا اجتماعی عوامیانہ
، نہ کسی نے آہ کی، نہ اُف، ادھر ہمارا یہ حال اور ادھر مرزا شمشیر کو دیکھئے، جو افسانہ نگار ہونے کے باوجود شاعر کی
ہر کو ادبی دم چھلّہ بنا کر اپنے نام کے گلے میں لٹکائے جب ہمارے سامنے اپنے پرستار کا نامۂ پرستاری لا رکھتے ہیں۔ تو
دم، دم بخود اور دُم خود بخود دب جاتی ہے۔ اور ہم ان دونوں کو داب کر ہاتھ میں مرزا شمشیر کی ضیافت کی جائے کے
، کو دبائے اپنی نظریں بھی اس پرستار کے خط پر جمائے رکھتے ہیں۔ ایک خط میں پرستار نے لکھا تھا ـــــــ :

جناب مرزا شمشیر! تسلیمات

ابھی ابھی پوسٹ مین نے تین ماہ قبل کا رسالہ "نوہین ادب" اپنے دست مبارک
سے ہمیں عطا کیا۔ اور ہم نے اسے اپنی موروثی عادت کے مطابق الٹے ہی کھولا۔
جہاں آپ کا افسانہ بعنوان ـــــــ ہے کلی کلی کے لب پر، دیکھنے کو ملا۔ بے اختیار
زبان سے واہ نکل گئی۔ جو راست والد محترم کے کانوں میں پڑی، انہوں نے بھی افسا
کی تعریف ایسے کی جیسے مشاعرے میں کہنہ مشق شعراء نئے شاعر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں
مگر آپ ہمت نہ ہارئیے، افسانے لکھتے رہئے۔ ہم نے آپ کے کئی افسانوں کو
حقیقت کا رنگ دے دیا ہے۔ واقعی آپ ملک کے واحد افسانہ نگار ہیں جو حقیقت
کو اپنی نہیں بلکہ قلم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جو اس زمانہ میں کمال بے مثال ہے۔ میں
نے اس نئے افسانے سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ کل ہی کالج میں بات اڑی کہ دو نو
خیز کلیوں نے مجھ بھونرے کی تعریف کی۔ اب میں آپ کے افسانوی خیال پر چلتے چلتے
ان کلیوں کی لب سے کہلوا ہی لوں گا کہ :

ع لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

اور میں جواباً آپ کا نام لیتے ہوئے گردن اکڑا کر کہوں گا

ع روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

آپ کے نقش پا کا محقق
پاک داماں مجنوںؔ!

اب ذرا حضرت بے داغؔ کی سن لیجئے۔ موصوف افسانہ نگار تھے۔ ایک رات ہمارے گھر آئے۔ معلوم ہوتا تھا

جیسے تحقیقات کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے ہم تک پہونچے ہیں۔ (جبکہ ہماری حفاظت کے خود ہم ذمہ دار نہیں) ہانپتے ہوئے کہنے لگے اکثر
جا اپنا بستر اب اس سرائے ادب سے گول کرلو۔ ہم نے تعجب سے وجہ پوچھی کہنے لگے۔ میاں اس بے داغ نے زندگی بھر دنیا کو اس
کے داغوں سے آگاہ کیا۔ اور آج خود داغدار ہوگیا۔ دنیائے ادب کے ٹھیکیدار فائیو اسٹار ہوٹلوں میں مقیم ہوکر ادب کی خالی بوتلیں
اور خالی ڈبے بیچتے ہیں۔ اور اگر ہم بھرتی بیماری اور بھرتی پیسے بھی مفت دیں۔ تو داغدار ہوجاتے ہیں۔

صاحبو! حضرت بے داغ وہ افسانہ نگار تھے۔ جو سماج کو کھری کھری سناتے تھے۔ انہوں نے سماجی اجارہ داروں
کی منت سماجت نہ کی۔ اور غنڈوں کے ہاتھوں پٹ کر اپنا بوریا بستر گول کرگئے۔ ایک دن خبر ملی وہ انتقال فرماگئے۔ پھر
کیا تھا۔ اخبارات نے منہ کھولے، پرستاروں نے قلم کھولے، اور بے داغ صاحب کے قصیدے لکھ لکھ کر مردہ پرستی کا
ثبوت دینے لگے۔

کیا کیا جائے۔ نعرہ "غریبی ہٹاؤ" کے خلاف ہونے کے لئے اب ملک اور عوام کو چاہئے کہ شعراء و ادبا کی کثرت پیداوار
دیکھ کر نعرہ "شاعر ہٹاؤ" اور "ادیب ہٹاؤ" رکھنا چاہئے۔ تاکہ کامیابی اس شکل میں ہی مل جائے۔

حال ہی میں سکندر مفلس کچھ اس طرح ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا جارہے تھے کہ ہم نے سوچا کہیں ان کے ہاتھ
کسی مرحوم ادیب کی غیر مطبوعہ تخلیقات تو نہیں لگ گئیں مگر نہیں! سکندر مفلس نے بی۔ اے کیا۔ مگر گرانی اور اہل خاندان کا
عتاب ان کے سر پر ٹوٹا تو بیروزگار، اے کئے بغیر نوکری ڈھونڈنے لگے۔ اور ظاہر ہے جب ملک میں نوکری کی ٹوکریاں محلے میں
کچرے سے بھرے ڈربوں کی طرح ملیں تو یہ ادب کے وسیع گٹر میں اپنے خیالات کا کچرا ڈالنے لگے۔ کیونکہ ادب ہی ایک ایسی صنف
افلاس اور صنف اخلاص ہے جو ہر کٹے ہوئے پیٹ کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔

ایک دن سکندر مفلس سے ہم نے ان کی ادبی کامیابی کا راز پوچھا۔ کہنے لگے یہ پرستاروں کی دین ہے۔ جو حوصلے
کی وشامن ہمارے حلق کے اندر اور ہم جوش کو قلم کے اندر اتار کر لکھ جاتے ہیں۔

ہمیں یہ نہیں کہنا کہ ادیب یا شاعر کی ہمت افزائی ہی قارئین کو تاہ بین یا کوتاہ قلب ہوتے ہیں۔ آپ اس خط سے اندازہ
کیجئے کہ حوصلہ افزائی بھی کبھی کبھی روڑہ بن جاتی ہے۔ ادیب شاعر اور پرستار کے درمیان۔

خدمت شاعر معتبر جناب ضیائے قلم صاحب قبلہ! سلام مسنون

واللہ میں آپ کی شاعری کا واحد پرستار نہیں۔ بلکہ میرا حلقۂ احباب بھی آپ کی پرستاری
کا دم بھر بھر کر آپ کے مخالفین کو ختم کردیتا ہے۔ مگر برا ہو گھریلو مصروفیات کا ـــــ
چاہتا تھا کہ بیوی کے آفس سے ہٹتے ہی سونے سے پہلے خط لکھ دیا کروں۔ مگر میرا ہاتھ
قلم سے مَس ہوتے ہی منا نیند سے جاگ اٹھتا تھا۔ جیسے میں نے قلم کو نہیں منا کو چھیڑا ہے
مگر خدا اور تینے دونوں کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ منا اب بڑا ہوگیا ہے۔ اس لئے آپ
کو خط لکھنے کے لئے مجھے چار برس انتظار کرنا پڑا۔

قبلہ ہم تو آپ کے غلام ہوگئے جب یہ شعر آپ نے لکھا تھا کہ ؎

شاعری کی روح پاک کو تخم غم سے شاد کر۔ ۔۔ اپنی جفا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر۔

مگر مولانا! میری مجبوریوں کے پیش نظر میرا یہ نامۂ ہمت افزاء (جو خصوصاً آپ کے
لئے ہے) قبول فرمائیے۔ دو چار سال آگے یا پیچھے ہی سہی، مگر جواب سے نوازیئے ڈاک
ٹکٹ رکھ رہا ہوں۔ اگر جواب دینے تک ڈاک کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا تو اسی ٹکٹ
پر جواب دیجئے۔ میں جرمانہ ادا کر لوں گا۔ کیونکہ شادی کے فوراً البعد سے جرمانے ادا کرنے
کا عادی سا ہو گیا ہوں۔ فقط آپ کا

حقیر فقیر بے دست و پا دلگیر خاں

مندرجہ بالا خط جناب ضیائے قلم کے گھر اس وقت پہونچا جب مولانا ضیائے قلم نفس بنفیس ملک عدم کو پارسل ہو چکے تھے
لہٰذا ـــــ یہ خط آج بھی بیگم ضیائے قلم کے سوگوار کمرہ میں مع فریم کے نمائشی طور پر لٹکا ہوا مولانا کی کاوشوں کا ثبوت دے رہا ہے
حضرات! ہر احسان کا ایک بدلہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر شاید ادبا و شعرا بے وقوف ہوتے ہیں۔ جو صراط المغضوم عوام کو
صراط المستقیم پر گامزن کرنے کی فکر میں عوام کو اپنا احسان مند بنانے پر تلے رہتے ہیں۔
ابھی دیکھئے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر جب وٹامن "ج" یا وٹامن "د" سے محروم ہوئے تو قارئین سے
کہہ اٹھے، ؎

بڑے بڑوں کو چڑھانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو تب ہے کہ چھوٹوں کو تھام لے قاری

بگولا

قیوم راہی (پاکستان)

بائیں پاؤں کو فٹ پاتھ پر جمائے منظور سائیکل پر بیٹھا سبز بتی کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کے سامنے کاروں، اسکوٹروں اور رکشاؤں کا ایک ریلا تھا جو تیزی سے امڈا چلا آرہا تھا۔

اس شام دفتر سے واپسی پر اس نے انارکلی کا سارا راستہ پیدل طے کیا تھا کیونکہ وہاں گہما گہمی بہت تھی۔ دوسرے اس کو بیوی کی جرسی کے لئے اون بھی دیکھنی تھی ــــــ آتی جاتی حسین و دل نواز عورتیں اور لڑکیاں بھی حسب معمول اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔

وہ اپنے خیالوں کے حصار میں گھرا ہوا منتظر میں سرخ بتی پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔ کہ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ آپ۔ سمن آباد جانا ہے۔؟

اس نے دیکھا۔ قریب ہی ایک نوجوان کھڑا اس کو آس بھری نگاہوں سے تک رہا تھا۔ کوئی جواب دینے کے بجائے نوجوان کا سر سے پاؤں تک جائزہ لینے لگا ــــــ بڑے بڑے بال، نیچی قلمیں چیک کوٹ۔ بیل باٹم پتلون، براؤن شوز جن پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی ــــــ

کیا آپ کو سمن آباد کی طرف جانا ہے؟ نوجوان نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ سمجھا منظور نے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ لیکن منظور تو اسی کے خیال میں غرق تھا۔

منظور نے انکار میں سر ہلایا۔ تو نوجوان خراماں خراماں زیبرا کراسنگ کی طرف چلا گیا۔

کتنی دھیمی اور کمزور تھی اس کی آواز ــــــ منظور نے سوچا ــــــ جیسے وہ بھوکا ہو۔ اور آنکھیں ــــــ کتنی بے رونقی تھی ان میں، سائے سے ڈول رہے تھے۔ وہ یوں کھڑا تھا جیسے بری طرح تھکا ہوا ہو ــــــ جوتے کس قدر گرد آلود تھے ــــــ غالباً وہ دن بھر سڑکوں کی خاک چھانتا پھرا تھا۔

منظور نے دیکھا نوجوان فٹ پاتھ پر کھڑا اس طرف کے ٹریفک بند ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی لمحے منظور نے اپنے بارے میں ایک نئے زاویئے سے سوچا ــــــ وہ تو بہت سوں سے اچھا ہے۔ برسر روزگار ــــــ ایک سائیکل کا مالک ــــــ

سبز بتی نمودار ہوئی تو منظور نے تیزی سے سڑک پار کی۔ اور اس کی سائیکل گھر کے راستے کی جانب دوڑنے لگی۔

نوجوان کا ماند ماند چہرہ ایک بار پھر منظور کی نگاہوں کے سامنے ابھر آیا ــــــ کتنی مایوسی اور افسردگی سی تھی اس چہرے پر ــــــ خاصی دیر وہ نوجوان کے بارے میں ہی سوچتا رہا سوچتا رہا، اور اس کے دل میں ہلکا ہلکا غبار سا اٹھتا رہا۔

سوچتے سوچتے منظور اداس سا ہو گیا تھا۔ اس کی سائیکل حسب معمول دھیمی رفتار سے منزل مقصود کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اور سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور شام گہری ہو گئی تھی۔

اچانک منظور نے دیکھا۔ نوجوان نقاہت سے نڈھال سر جھکائے چھوٹے چھوٹے قدموں سے ایک ویران راستے پر چل رہا تھا ــــــ چلتے چلتے وہ لڑکھڑا کر نیچے گر جاتا ہے۔ اور پھر ــــــ پاتال میں دھنسنے لگتا ہے۔

اسی وقت ہوا سے باتیں کرتی ہوئی ایک کار دھول اڑاتی ہوئی منظور کے اتنے قریب سے گزری کہ وہ بری طرح لرز کر رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے دھول کے ایک بگولے نے اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور تب وہ سائیکل پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اور دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ ●●

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

چنگاری

چاروں طرف اونچے اونچے مکانوں، پتلی پتلی گلیوں
اور ہنگامہ خیز بازاروں کے درمیان گھرے ہوئے شہر کے
اس علاقہ میں بڑی گنجان آبادی تھی۔ ہر وقت لوگوں کا تانتا
بندھا رہتا۔ خرید و فروخت کا بازار گرم رہتا۔ اور لوگ ایک
دوسرے کے جسم سے ٹکراتے، دھکے کھاتے ادھر سے ادھر بھاگتے
دوڑتے رہتے۔ اس لئے صبح سے لے کر رات گئے تک ایک
ہنگامہ برپا رہتا اور جب آدھی رات ڈھل جاتی، بازار بند
ہو جاتے۔ سڑکیں سنسان ہو جاتیں تو بتدریج یہ ہنگامے سرد
پڑ جاتے۔ لیکن صبح سے پہلے پہلے تک رات پلک جھپکائے بغیر
جاگتی رہتی۔ اس علاقہ میں نیند کا گزر ہی نہیں تھا۔

عام طور پر یہ ہنگامہ اس وقت شدت اختیار کر لیتا
جب شام کا سرمئی آنچل اس علاقہ کو اپنے سایہ میں لے لیتا۔
اور نیم تاریک گلیوں سے گزر کر ہوا کے سرد جھونکے وسطی حصہ
میں پہونچ کر تنور کے گرد چکر لگانے لگتے۔ اور راکھ کی تہوں میں
چھپی ہوئی چنگاریوں کو کرید کر اپنے جسموں کو حرارت بخشتے ہوئے
شور مچاتے۔ اور شور مچا کر جیسے سارا علاقہ کو اپنے سروں
پر اٹھا لیتے۔

شام کی سیاہی پھیلتے ہی اس علاقہ کے وسطی حصہ میں
بے مقصد قہقہوں کی آوازیں گونجتیں۔ بے سرے اور سماعت
پر بار گزرنے والے نغمے لہلہاتے۔ طبلے ٹھنکتے۔ گھنگھرو چھنکتے،
اور آوازوں کا شور بلند ہوتا۔ کبھی کبھی جب ہوا کے سرد جھونکے
آپس میں ٹکرا جاتے تو دھڑام دھڑام کی آوازوں کے ساتھ
دروازوں کے پٹ بند ہو جاتے۔ اور گلیوں میں بھگدڑ مچ جاتی
دیر تک عجیب و غریب قسم کی بھیانک چیخیں سنائی دیتیں۔ اور
فضا میں ناقابل برداشت تعفن کے ساتھ خون کی بو پھیل جاتی

آدھی رات تک ہر روز یہی کچھ ہوتا لیکن دن کو قدرے
سکون رہتا۔ یوں تو سرد ہوا کے جھونکے دن کو بھی شور مچاتے
مگر اس میں رات جیسی شدت نہ ہوتی۔ دن کو ہوا کے سرد
جھونکے گلیوں سے گزر کر جب وسطی حصہ میں پہونچتے تو زیادہ تر
تنور کے گرد گھیرا ڈالے رہتے۔ اور تنور کے اندر دبی ہوئی چنگار
کو کرید کرید کر خاموشی سے اپنے ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو
گرمی پہونچاتے۔ البتہ کچھ آوارہ جھونکے بلاوجہ شور مچاتے اور
ہنگامہ کھڑا کرنے سے باز نہ رہتے۔ تنور کی چنگاریاں ہوا
کے جھونکوں کے لمس سے راکھ کا لبادہ اتار کر ان کے ٹھٹھرے ہوئے
جسموں کو اپنی تپش سے حرارت پہونچاتیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ
چنگاریاں بھی چیخ پڑتیں۔ اور ان کے چیخنے کی صدا شور میں
تبدیل ہو جاتی۔

یہ سلسلہ اسی طرح چل رہا تھا کہ ایک ٹھٹھری ہوئی دو
پہر کو ہوا کا سرد جھونکا گلیوں سے گزر کر وسطی حصہ میں پہونچا
اور تنور کو کریدنے لگا۔ اس جستجو میں اسے راکھ کے نیچے دبی
ہوئی ایک ایسی چنگاری نظر آئی۔ جو دوسری چنگاریوں
سے بالکل مختلف تھی۔ ہوا کے سرد جھونکے نے جب اسے راکھ

کی تہہ سے باہر نکالا۔ تو وہ اپنی تمازت کی رعنائی لئے ہوئے تنور میں بجھی ہوئی راکھ کی بالائی سطح پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہوا کے سرد جھونکے نے اس کی چمک دمک دیکھی تو اسے یہ سمجھنے میں قطعی دشواری نہ ہوئی کہ وہ چنگاری اب تک ناقابل یقین حد تک روشن تھی۔ اور دوسری چنگاریوں کی طرح اس کی تمازت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

سرد ہوا کا جھونکا دیر تک اس چنگاری کے قریب بیٹھا رہا۔ اور چنگاری اس کے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو حرارت بخشتی رہی اور جب ہوا کا جھونکا اپنے جسم کو حرارت پہونچا کر جانے لگا تو چنگاری نے اس کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پھر کب آؤ گے؟

ہوا کے جھونکے کے لئے یہ سوال نیا بھی تھا اور بے معنی بھی۔ کیونکہ ہوا کے جھونکے واپس نہیں آتے۔ ان کی کوئی ایک منزل نہیں ہوتی۔ آج یہاں تو کل وہاں، جس طرف دل چاہا نکل گئے۔ دل چاہا تو کہیں پر گھڑی دو گھڑی کے لئے رک گئے پھر چل پڑے۔ ہوا کے جھونکے نے حیرت سے چنگاری کی طرف دیکھا۔ اور اس کی معصومیت پر مسکرا دیا۔

مجھے معلوم نہیں۔ ہوا کے جھونکے نے جاتے جاتے مختصر سا جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر چنگاری کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ اور اس کی دمک ماند پڑ گئی۔

دوسرے دن جب فضا برف کی سل کی طرح یخ ہو گئی تو خلاف توقع ہوا کا جھونکا پھر وسطی حصہ میں پہونچ کر تنور کی آگ کو کریدنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسے وہ چنگاری مل گئی۔ ہوا کے جھونکے نے جب اسے بجھی ہوئی راکھ کی بالائی سطح پر لا یا تو وہ اسے دیکھ کر بڑی اپنائیت سے مسکرائی مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔

ہوا کے جھونکے نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر یہ بات سچ تھی کیونکہ ہوا کے جھونکے کو کہیں بھی چین نہیں مل رہا تھا پارکوں میں، بازاروں میں، کرشن چوڑا کے سائے میں۔ اور انسانوں کے اژدہام میں، سڑکوں پر، شاہراہوں پر، وہ جہاں جہاں بھی گیا اور دنوں کی طرح پر سکون نہیں تھا۔ وہ جگہ جگہ مضطرب سا رہا۔ بیقرار سا پھرتا رہا۔ جیسے اس کی کوئی شئے گم ہو گئی ہو۔ اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ سرد ہوا کے جھونکے کی زندگی میں یہ پہلا تجربہ تھا۔ اور اب جبکہ اس کے جسم کو چنگاری کی حرارت مل رہی تھی۔ اسے بڑا سکون مل رہا تھا۔ بڑی طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔

اس دن کے بعد سے اس کا یہ معمول ہو گیا۔ کہ وہ ہر لحظہ سردی سے سکڑی ہوئی فضا میں تنور کے گرد ایک چکر ضرور لگاتا اور چنگاری ہوا کے جھونکے کے ہر لمس پر اور بھی زیادہ شدت سے دمکنے لگتی۔ اس کی تمازت بڑھ جاتی۔ اگر کبھی ہوا کا جھونکا دور دراز کے سفر پر چلا جاتا اور اس کی واپسی میں دیر ہو جاتی تو چنگاری بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہتی۔ اس کی آنکھوں میں کتنے ہی رنگ بکھرتے اور سمٹتے رہتے۔ خوابوں کے گلزار سجتے رہتے، یادوں کی بارات جگمگاتی رہتی۔

ایک دن چنگاری نے ہوا کے جھونکے سے کہا ——

مجھے یہ راکھ کے ڈھیر اچھے نہیں لگتے میں تمہارے لمس سے ہر وقت دمکتی رہنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے کہیں لے چلو!

یہ ناممکن ہے" ہوا کے جھونکے نے کہا —— میں تمہیں کہیں نہیں لے جا سکتا!

کیوں؟ چنگاری نے بڑی افسردگی سے پوچھا۔

میں ہوا کا جھونکا ہوں۔ جس کا کام اڑتے رہنا ہے صبح کہیں تو شام کہیں۔ ہوا کے جھونکے نے جواب دیا۔ کھیتوں کھلیانوں، بستیوں، ویرانوں، شہروں، بازاروں، میدانوں اور جنگلوں میں پھرتا رہتا ہوں۔ میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔

سرد ہوا کا جھونکا نیم تاریک گلیوں سے گزرتا ہوا

ملی فضا میں چلا گیا۔ اور چنگاری دیر تک افسردہ و ملول خاموش بیٹھی رہی۔ راکھ کی تہہ میں منہ چھپا کر روتی رہی۔ ہوا کے جھونکے آتے اور جاتے رہے۔ تنور کو کریدتے رہے۔ لیکن وہ اسی طرح راکھ کی ڈھیر میں سمٹی ہوئی بیٹھی رہی۔

تنور میں جمی ہوئی راکھ کی بالائی سطح پر بیٹھی ہوئی چنگاریوں نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں ـــــ پگلی کہیں کی۔ ہوا کے جھونکے تو یوں ہی آتے اور جاتے رہیں گے ان کا کیا بھروسہ! ہوا کے جھونکے چہروں کو چوم سکتے ہیں زلفوں سے کھیل سکتے ہیں۔ پیرہن سے الجھ سکتے ہیں۔ لیکن کسی آنچل کے سائے میں عمر تمام نہیں رہ سکتے۔ انہیں دامن سے باندھ کر رکھنا ممکن نہیں۔

سرخ رو چنگاری نے نمناک نگاہوں سے ان زرد رو چنگاریوں کی طرف دیکھا ـــــ لیکن مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں مختلف ہاتھوں کے لمس سے اکتا گئی ہوں۔

زرد رو چنگاریاں پھر کھلکھلا کر ہنس پڑیں ـــــ ان تنور میں جلتی ہوئی چنگاریوں کی یہی قسمت ہے۔ جب تک تمہارے جسم میں تمازت ہے جلتی رہو اور ایک دن راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاؤ۔

سرخ رو چنگاری نے افسردہ لہجے میں کہا ـــــ مجھے اس انجام سے ڈر لگتا ہے میں راکھ کی ڈھیر بن کر اس تنور میں رہنا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ ہوا کے لمس سے جلتی رہوں۔ وہ مجھے اپنے لمس سے زندگی دیتا رہے۔ میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے گھیرے میں لئے بیٹھا رہے۔ میری حرارت سے اپنے جسم کو گرمی پہونچاتا رہے۔ اور میں آہستہ آہستہ راکھ بن کر فضا میں اڑتی رہوں۔ اڑتی رہوں۔ یہاں تک کہ میرا وجود فنا ہو جائے۔ اور میری راکھ فضاؤں میں پھیل کر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پرواز کرتی رہے۔

اس کی باتیں سن کر زرد رو چنگاریاں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ ہوا کے کئی تیز تیز جھونکے آئے اور انہوں نے تنور کی راکھ کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ فضا میں شور بلند ہونے لگا۔ چاروں طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وسطی حصے پر ویرانی مسلط ہو گئی۔

اس کے بعد ہوا کا سرد جھونکا کئی دنوں تک نہیں آیا لیکن سرخ رو چنگاری اس کا انتظار کرتی رہی۔ دن بھر وہ گلیوں سے گزرنے والے راستوں پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہتی۔ اور وسطی حصے پر شام کی سیاہی سایہ ڈال دیتی۔ اور دور کھڑے لائٹ پوسٹ کی مٹ میلی روشنی پھیل جاتی۔ تو وہ مایوس ہو کر رونے لگتی۔

آخر تم کب تک اس کا انتظار کرو گی؟ ایک زرد چنگاری نے اس سے پوچھا! اب وہ نہیں آئے گا۔

میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ چنگاری نے جواب دیا۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کون جانے شاید وہ آ جائے! میں ہاتھوں کے لمس کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔

کیسا لمس؟

پیار کا لمس۔ چنگاری نے ماضی کے جھروکے میں جھانکتے ہوئے جواب دیا ـــــ ایک وہ ہاتھ تھا جس کے لمس سے میں نے زندگی پائی۔ آنکھیں کھول کر اس دنیا کو دیکھا جس نے میرے آنسو پونچھے۔ مجھے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہا۔ اور میرے سر پر سایہ بن کر مجھے دھوپ کی تمازت سے بچاتا رہا۔ ایک وہ ہاتھ تھا جس نے مجھے ہرے بھرے پیڑ کی شاخ سے جدا کی۔ جس کے لمس نے مجھے ایک نئی زندگی بخشی۔ جس کے لمس سے میں اپنے آپے میں نہ رہی۔ دیوانی ہو گئی اور اپنی آنکھوں میں سہانے خواب سجائے نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھری۔ اور جو مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس جہنم کی آگ میں مجھے دھکیل گیا۔ اور پھر ہر روز کتنے ہی انجانے ہاتھوں کا لمس

جو سانپ کی طرح مجھے ڈس رہا ہے اور پھر اس کے ہاتھ کا لمس جو سب
سے مختلف ہے جس کے لمس میں دھیمی دھیمی آگ پوشیدہ ہے۔
چاند کی خوشبو ہے۔ جینے کی آرزو ہے۔ اور بھی بہت کچھ ہے۔
اس کی باتیں سن کر زرد زرد چنگاری زور سے ہنس پڑی —
دیوانی کہیں کی۔

پھر ایک دن جب سرخ رو چنگاری راکھ کی بالائی سطح پر
بیٹھی سرد ہوا کے جھونکے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بڑی سست روی
سے تنور کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

چنگاری اسے دیکھتے ہی دمک اٹھی ——— اتنے
دنوں تک کہاں رہے تم؟ میں ہر روز تمہاری راہ دیکھتی رہی ہوں

اس شہر میں نہیں تھا۔ ہوا کے جھونکے نے تھکے ہوئے
لہجے میں جواب دیا۔

دونوں نے دیر تک پھر کوئی بات نہیں کی صرف خاموش
نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

اتنے میں اس علاقہ کے وسطی حصہ میں بڑے زور کی آندھی
آئی آندھی کے قدموں کی چاپ سنتے ہی تمام چنگاریاں راکھ کی
تہہ میں چھپ گئیں۔ اور ہوا کے جھونکے جاگ کھڑے ہوئے۔
چنگاری نے یکایک گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور ہوا کے جھونکے
سے کہا ——— تم جلدی سے ان گلیوں سے گزر کر کھلی فضا میں چلے
جاؤ۔

ہوا کے جھونکے کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا ——— کیوں؟
ہوا کے جھونکوں کو قید کرنے والے آئے ہیں۔ چنگاری
نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ قید
کر لئے جاؤ گے۔

ہوا کے جھونکے نے ایک جست بھری اور گلیوں سے گزر
کر کھلی فضا میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ آندھی کے
نرغے میں آئے ہوئے ہوا کے جھونکے قید کر لئے گئے تھے۔
اس دن کے بعد اس کے دل میں ہوا کو قید کرنے والوں
کا ایسا خوف سما گیا کہ اس نے پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔

وہ بہت دنوں تک کھلی فضا میں آوارہ پھرتا رہا۔ پھول
کھلے، پھلواری جلتی رہی۔ مینہ برسا۔ برسات جلتی رہی۔ اور وہ
تنہائی کی آگ میں جلتا رہا۔ اور بے مقصد ادھر ادھر چکر لگاتا رہا
کتنے ہی دن شام سے گلے ملتے رہے۔ کتنی ہی راتیں آئیں
اور گزر گئیں۔ کئی موسم آئے اور گئے۔ پھر ایک دن بھٹکتا ہوا وہ
اس شہر میں واپس آ گیا۔ اس شہر میں آتے ہی اسے چنگاری کی
یاد آئی۔ مسلسل سفر کرتے کرتے وہ تھک گیا تھا۔ اور تھوڑی دیر
ستانے کے لئے اسے کسی پر سکون گوشہ کی تلاش تھی۔

وہ کشاں کشاں وسطی حصے میں چلا آیا اس نے تنور کے
قریب پہنچ کر راکھ کے ڈھیر کو کرید کر دیکھا۔ لیکن اسے وہ چنگاری
کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ دیر تک بے چینی سے تنور میں جمی ہوئی راکھ کو
کریدتا رہا۔ پھر اچانک اسے وہ چنگاری نظر آ گئی۔ اس نے دھڑکتے
ہوئے دل کے ساتھ اسے راکھ کی بالائی سطح پر کھینچ لیا۔ سرخ پیرہن
چنگاری اسے دیکھ کر مسکرائی مگر وہ تو کوئی اور ہی چنگاری تھی۔

شاید تمہیں تلاش ہے کسی کی؟ چنگاری نے پوچھا۔
ہاں! ہوا کے جھونکے نے سرد مہری سے جواب دیا۔
کس کی؟
ایک چنگاری کی

یہاں تو چنگاریوں سے تنور بھرا پڑا ہے۔ تم کس چنگاری
کی بات کر رہے ہو۔؟

ہوا کے جھونکے نے دور خلا میں دیکھتے ہوئے جواب
دیا ——— جس کا چہرہ گلابی ہے۔ جو باتیں کرتے وقت بار بار
پلکیں جھپکاتی ہے۔ جو ذرا ذرا سی بات پر ہنستی اور روتی ہے
اور جس کا پیرہن سرخ رنگ کا ہے۔ کہ اسے سرخ رنگ بے حد
پسند ہے۔

اچھا! اچھا! سمجھ گئی۔ چنگاری نے کچھ یاد کرتے ہوئے
کہا ——— تو اس کی تلاش ہے تمہیں۔؟

بقیہ صفحہ ۴۳ پر

م ناگ

ریگرموڑٹس

اس کا باپ اسے ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا اس نے اسکول میں سبجیکٹ بھر لیا تھا بائیلاجی سائنس۔ اور وہ خود ٹیچر بننا چاہتا تھا۔ مگر دونوں باتیں نہ ہو سکیں وہ بن گیا ۱۴۰ گریڈ والا بابو۔۔

تب وہ پہلی دفعہ مرا۔

اپنے ٹیبل پر آکر اس نے زوردار آواز میں چپراسی کو پکارا ـــــ رامو

رامو جھومتا سا آیا ـــــ بولیئے۔

پنکھا فل اسپیڈ۔ اور پانی

رامو نے پنکھا فل اسپیڈ کیا ـــــ پانی پلایا ـــــ دروازے کی طرف نکلا اور باہر کی فضا کا ڈالہ بن گیا۔

ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ۔ سامنے مس پریرا ٹائپ کر رہی تھی۔ ٹائپ مشین کے پیچھے گلے میں جھولتا نکلس۔ شک ویل دبلور لپوز کے علاوہ کیپ ان ڈارک! ہیڈ کول پلیس کی تختیاں اس کی آنکھوں میں گھوم گئیں۔ اس نے سگریٹ جلائی۔ پھر پوکسٹش یا بہت دیر تک ٹیبل کا پیپر ویٹ اٹھا کر داہنے ہاتھ میں دباتا رہا۔ پھر بائیں میں لے کر جھنجھوڑنے لگا۔ اسے مس پریرا کی چھاتیاں بڑی اگر شک لگتی ہیں اسے

اسے لگتا ہے جیسے پریرا کا دل جگر اور پھیپھڑے اس کی چھاتیوں کے پیپر ویٹ تلے دبے ہوں۔ اور شاید اسی ل[illegible] وہ کسی زیادہ گھلتی، ملتی نہیں۔

نیا نیا بالو گائے لوتندے دروازے سے اندر دا[illegible] ہوا۔ اور فائل پر جھک گیا۔ ابے سالے گائے لوتندے سا[illegible] مرنا ہے کیا جلدی۔ آتے برابر فائل پر گھور رہا ہے۔ ابے تم اتنا کام کرنے پر کیا ملائی ملے گی تجھے پرموشن کی ماں کی۔ سالا ہر سال انکریمنٹ دس لوتہنگائی بچاس۔ اب کرو اڈجسٹ۔ من سمجھاون کو کہتے ہیں اڈجسٹمنٹ ود[illegible] لائف ـــــ سالا بارہ سال سے ہم ایک ہی سیٹ سڑ رہے ہیں۔ اوکے اڈجسٹمنٹ۔

گائے لوتندے جس کا منہ گائے کی طرح تھا۔ جھ[illegible] گیا۔ کام کرو نا ساگر بھائی۔

ابے آج تیرے صاف کو ایسی ایسی گالیاں سنا[illegible] آیا ہوں کہ یاد کرتا ہوگا سالا کہ کون ملا تھا۔ ہمیشہ سے [illegible] آتا ہے ہو نہہ۔ بیٹا اگر ہم ہماری طرح بس پہ آتا تو [illegible] دونوں میں گالوں کی چکنائی جھڑ جائے۔ سالے خود [illegible] ہیں اور رعب کا نٹتے ہیں ہم پہ۔ ابے سالے گائے [illegible]

؎ ریگر موڑٹس۔ ایک میڈیکل ٹرم جس میں لاش سرد ہو کر کچھ دیر کیلئے گرم ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ سرد پڑ جاتی ہے۔

MORTIS = AFTER DEATH RIGER = RISE IN TEMPRETURE

سے بات کر رہا ہوں۔ اب کون سی افسری ملنے والی ہے۔

یار ساگر پلیز!

چپراسی ٹھا گھاس! اسے رحم آیا۔ اس نے دراز سے فلم فیئر نکالی۔ اور اس کی تصویر الٹا پلٹا کر چاروں دشاؤں سے دیکھنے لگا۔ پھر ماچس نکالی۔ ایک تیلی کھینچی پھینک دی۔ دوسری سے کان کریدے۔ کھائے لونڈے سے بولا۔

چل بلا ایک سگریٹ۔

یار نہیں ہے۔

وصت بیڑی کی۔

رامو اور رامو۔ چپراسی جھوٹا سا آیا پنکھا تو فل اسپیڈ میں ہے۔

اسے رہنے دے۔ لا بیڑی پلا۔

رامو صاحب کی کیبن میں کافی لے جا رہا تھا۔ اسے یاد آیا چائے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ سیدھے باہر نکل گیا باہر آکر سوچنے لگا کون سا مرغا پھانسنا چاہئے۔ دور سے اس نے گپتا کو آتا ہوا دیکھا۔ سالا اسٹیشنری میں بے خوب ہاتھ مارتا ہے۔ چلو اسے ہی کاٹیں آج۔ قریب جا کر گپتا سے ہاتھ ملایا۔ کہو یار، کیسا چل رہا ہے۔ سنا ہے خوب سمیٹ رہے ہو۔ چلو چائے تو پلاؤ۔

——— چائے کے ساتھ اس نے سموسے بھی کھائے گپتا کا سسرال مالدار ہے۔ سالے کے پاس گاڑی ہے۔ اپن کو ایسی سسرال نہیں ملی۔ بس سسر نے ایک عدد چڑچڑی بیوی پلے باندھ دی۔ لے بیٹا! جنازہ۔ بیوی ہمیشہ بیمار رہتی ہے جس کی دوائی لے جانا وہ ہمیشہ بھول جاتا ہے۔ خوب ودھاتا کی نیتی ہے۔ کبھی کبھو دیتا ہے تو ایک دم چھپر پھاڑ کر اور کسی کو ایسے سل دیتا ہے کہ بس تنگ ہوئے جاؤ۔ گھر پر بیوی کی بیماری۔ بچوں کے تقاضے۔ دودھ اور راشن کے وہی حساب کتاب۔ رات میں بیوی کو مشینی انداز میں جھنجھوڑنا۔ جیسے کتا ہڈی کو چھوڑے

کوئی رس نہ رہا۔ اس لئے لیٹ ہوا۔

کیونکہ والے مر گیا تھا۔

کیونکہ مرگھٹے کو مرگی آئی

گاڑی لیٹ تھی۔

بس نہیں ملی

آفس میں پارٹی تھی۔

ادھر آفس میں لیٹ۔ ادھر گھر میں لیٹ۔ اُدھر بھی جوتے ملیں۔ ادھر بھی۔ آخر کب تک والے مرے گا۔ اور مرگھٹے کو مرگی آئے گی۔

گپتا کے سینٹ کی کریز دیکھو۔ ہیٹ تازہ۔ ٹائی کی ناٹ کسی ہوئی۔ چست درست۔ کیسا بنا ٹھنا بھلا کون سالا نانک بچتا ہوگا۔ گپتا کو وہ جب بھی پھانستا ہے اسے بڑا مزہ آتا ہے۔ ایسا مزہ جو بدلے کے بعد ملتا ہے۔ کینٹین کا بل دینے کے لئے گپتا نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑی بے مروتی سے مڑے تڑے دس پانچ دو ایک کے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ سالا کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ چاہے پہلی تاریخ ہو یا انتیس ۲۹ تاریخ۔ ساگر کو ایکدم خیال آیا جب وہ گھر سے چلا تھا۔ بیوی نے کہا تھا کہ آج کہیں پندرہ روپے اُدھار لائے۔ اس نے سر ہلایا تھا۔ اچھا ہوا جو اب خیال آیا۔ مگر ادھار کس سے لے۔ کیا گپتا ٹھیک رہے گا۔ یار گپتا پندرہ روپئے دے پہلی کو لے لینا۔ مجھے یاد ہے تو نے پچھلے دنوں دس روپئے دیئے تھے۔ اب کے پچیس لے لینا۔ وہ بولتا گیا۔

روپئے لے کر آیا۔ چپراسی کھڑا تھا۔ لبے بڑے بابو کی ایسی تیسی۔ چاچا کے بول ڈھونڈ کر دیتا ہوں۔

فائل نہیں۔ پچیس ——— ہونہہ۔ ان کا کیں داماد ہوں جو جلد میں نکال کر دے دوں گا۔

گائے کو نڈے سر گھسائے کام کر رہا تھا۔ ساگر بڑبڑایا مر جائے گا سالا یہ یوں ہی۔

ارے مرنا ہی ہے تو کچھ کر کے مر ـــــ یہ بڑا کوا ہاتھ لے
ٹیبل پر ایک خط پڑا تھا" ساگر شرما ایم اے ۔
ان لوگوں کو ابھی تک یاد ہے ہنسنے لگا ۔
کیوں ہنس رہے ہو یار ۔ گائے کوندے نے پوچھا
خط پر لکھا ہے ساگر شرما ایم اے ۔
تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ۔ آپ ہیں ہی ایم اے
بلکہ ڈبل ایم اے ہیں آپ تو ۔
میں تو کب کا بھول گیا ـــــ نہ میں ایم اے ہوں
اور نہ ڈبل ایم اے ۔ میں تو صرف ایک بابو ہوں ۔ ۱۳۰ گریڈ
والا ـــــ کیا سمجھے ۔ یہ خط میرا نہیں ۔
دو بج چکے تھے ۔ لنچ ٹائم تھا ۔ وہ کلب چلا گیا ۔ اور
تاش کا کھیل کھیلتا رہا ۔ تاش میں جیت کے بھی ہارا اور ہار کر
بھی جیتتا رہا ۔ اٹھتے ہوئے اس نے کہا ۔ میں نے سب پتے
شو کر دیئے ہیں ۔

.... سریلے خون سے بجلی دوڑتی ہے جب
یاد آتا ہے کہ بچوں کو فارم دلانا ہے ، جب یاد آتا ہے کہ بیوی
کے لئے دوائیاں لانی ہیں ، جب یاد آتا ہے کہ بھائی کو منی آڈر
بھیجنا ہے ۔ جب یاد آتا ہے کہ ماں کے لئے شال خریدنی ہے
جب یاد آتا ہے کہ دودھ والے کا بل دینا ہے ۔ خون میں گرمی
سی پیدا ہوتی ہے ۔ اسٹرگل جاگتا ہے ۔ برق سی لہراتی ہے
اور بدن گرمانے لگتا ہے ۔ اور ساگر بجٹ بناتا ہے .....
فائل ڈھونڈتے ہوئے دو چار فائلیں باہر کھینچی
دھول کا غبار اڑا ۔ دو چھینکے دوڑے ۔ دھول منھ اور ناک
میں بھر گئی ۔ گائے توندے کھانسنے لگا ۔ یہ بڑا انگریزی میں
چھینکی ۔ اوہ ساگر وات نان سنس ،
آخر شو فائل مل ہی گئی ۔ وہ اور کہیں نہیں سامنے
ہی پڑی تھی ـــــ وہ بیٹھ کر پسینہ پوچھنے لگا ۔ چار بج رہے
تھے ۔ اس نے سوچا اب کچھ کام کرنا چاہئے ۔ سامنے کی فائل
کا ربن کھولا ۔ اور بیٹھ گیا ۔ ارے کون ڈبل ایم اے ہے یار
اب تو میں ایک لاش ہوں ۔ ریگر مورٹس کے پہلے اور ریگر
مورٹس کے بعد بھی لاش ۱۳۰ گریڈ والی ۔

آج پتہ نہیں اچانک وہ بیٹھے بیٹھے کیسے ۔ شاید دل
کے رُک جانے سے مر گیا تھا ۔ سب نے مل کر مرحوم ساگر کے
لئے ایک پرپوزل بڑے صاحب کی ٹیبل پر بھیجا ، کہ ایک خصوصی
فنڈ سے مرحوم کی مدد کی جائے ۔ بڑے صاحب نے اپنی
عادت کے مطابق انگریزی میں یہ ریمارک لکھا ۔ اس قسم
جیسی ایک آدھ مثال ماضی میں ہو چکی ہے کیا ؟ ـــــ
تو ہیڈ کلرک نے جواب میں یہ نوٹ لکھا ۔ نہیں پہلی دفعہ
وہ مرا ۔ اس وقت اس کی جان نہیں نکلی تھی ۔ پر اب وہ
سچ مچ مر گیا ہے ۔ اور جان بھی نکل چکی ہے ۔ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ
ساتھ میں نتھی کر رہا ہوں ۔ ●●

بقیہ چنگاری

ہاں ہاں ! کہاں ہے وہ ۔ ؟ ہوا کے جھونکے نے
پراشتیاق لہجے میں پوچھا !
وہ زور سے ہنس پڑی ۔ اور اس کی ہنسی کی آواز ایک
جھناکے کے ساتھ شیشے کے ریزوں کی طرح چاروں طرف
بکھر گئی ۔
وہ بجلی تو کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے تو جل بجھی ۔ ●●

قلم کار حضرات تخلیقات
صاف اور خوش خط لکھیں ۔

ڈاکٹر عزیزی (بنگلہ دیش)

لاوارث لاش

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اور امام الدین کی لاش حاجی احسان الہٰی کیمپ کے دروازے کے سامنے سڑک کے کنارے ایک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ لاش کے سرہانے ایک چھوٹی سی بچی جس کی عمر تقریباً چھ سات سال کی ہوگی اداس اور مضمحل بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں وہ بار بار ایک ہی صدا لگا رہی تھی۔ اللہ کے نام پر لاوارث لاش کے لئے کچھ دے جائیں۔

امام الدین کون تھا، کیا تھا، اور کہاں سے یہاں آیا تھا یہ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن میں اس کے بارے میں جانتا تھا۔ کہ وہ کون تھا، کیا تھا، اور کہاں سے یہاں آیا تھا کیونکہ انہیں دنوں میں اس کیمپ کا ریلیف انچارج تھا۔ اور اکثر اس کے ساتھ بیٹھ کر ادھر ادھر کی گفتگو کرنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ اور امام الدین اپنے گزرے ہوئے ایام کو ایسے پرلطف انداز میں بیان کرتا تھا۔ کہ کبھی کبھی کسی داستان گو کی خودساختہ داستان کا گمان ہوتا تھا۔ مگر ایسی بات نہیں تھی، وہ داستان اس کی اپنی داستان تھی۔ وہ واقعات اس کے اپنے واقعات تھے وہ احساسات اس کے اپنے احساسات تھے، اور وہ کرب اس کا اپنا کرب تھا۔

امام الدین بہار شریف کے گرد و نواح میں واقع ایک گاؤں جہان آباد کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ امام الدین کے والد جمال الدین کے گھر یکے بعد دیگرے جب تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ تو وہ بہت بد دل ہوگئے کہ اگر اسی طرح لڑکیاں پیدا ہوتی رہیں۔ تو پھر اتنی بڑی زمینداری کا وارث کون ہوگا۔ پھر وہ امام الدین کی ماں کو اپنے ہمراہ لے کر بہار شریف کے مخدوم الملک بہاریؒ کے مزار پر گئے دہلی نظام الدین اولیاؒ کے مزار کی زیارت کی۔ خواجہ غریب نوازؒ کے روضہ پر اجمیر شریف گئے۔ اور ان کے روضہ پر عقیدت کے پھول نچھاور کئے۔ چادریں چڑھائیں، منتیں مانگیں۔ تو ان کے گھر امام الدین چاند بن کر نمودار ہوا تھا اور سارا گھر جیسے روشن ہوگیا تھا۔ شہنائیاں بجنے لگی تھیں سارا گاؤں جمال الدین کو مبارک باد دینے کے لئے امڈ پڑا تھا!

اور جب امام الدین پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ اور اس کے پاؤں میں دوڑنے کی طاقت آگئی تھی۔ تو جمال الدین نے اس کے لئے پٹنہ سے تین چکے والی سائیکل خرید کر لادی تھی۔ جسے امام الدین اپنے کشادہ آنگن میں چلاتے چلاتے جب کبھی باہر گلی میں چلا آتا تو گاؤں کے بچے اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اسے حیرت سے دیکھنے لگتے تھے۔

جب وہ سات آٹھ سال کی عمر کا ہوا تو جمال الدین ایک روز اسے انگلی سے پکڑ کر مولوی بشارت حسین کے مدرسے میں لے گئے تھے۔ مولوی صاحب نے جو زمین دار صاحب کو دیکھا

تو ادب سے کھڑے ہو گئے۔ آگے بڑھے اور جمال الدین سے مصافحہ کیا۔ ان کی خیریت دریافت کی امام الدین کے لئے عمر درازی کے لئے دعا کی۔ اور اس کا اپنے مدرسے میں داخلہ لے لیا۔ بسم اللہ خوانی ہوئی۔ اور تمام طلبا میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔

مگر امام الدین بڑا ہی نٹ کھٹ ثابت ہوا تھا پڑھائی لکھائی کی طرف قطعی اس کی طبیعت مائل نہیں تھی۔ اپنی شرارتوں کے سبب مدرسے کے دیگر طالب علموں کے لئے مصیبت بن گیا تھا کسی بات پر اگر کسی لڑکے کی کتاب چھین لیتا تو واپس نہیں دیتا تھا۔ اگر کسی سے تو تو میں میں ہو گئی تو بلا جھجک مارنے کے لئے پل پڑتا۔ وہ کسی کی قمیض تار تار کر دیتا۔ تو کسی کی کتاب پھاڑ دیتا۔ کسی کو گھونسہ رسید کر دیتا۔ تو کسی کی ناک توڑ دیتا۔ اور اگر کبھی مقابل کے لڑکے جوابی کارروائی پر اتر آتے۔ تو امام الدین چیختا چلاتا ہوا اپنے گھر چلا جاتا۔ اور جمال الدین سے ان بچوں کا نام بتاتا۔ کہ ان لوگوں نے مل کر مجھے مارا ہے۔ اور گالیاں بھی دی ہیں۔ تو زمین دار جمال الدین ایک دم چراغ پا ہو جاتے۔ اور ان بچوں کو گاؤں سے نکال دینے کی دھمکی دیتے۔

اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر ایک روز مولوی السادت حسین زمین دار صاحب کے گھر گئے۔ اور ان سے دست بستہ عرض کی۔

گستاخی معاف ہو سرکار۔ ! تو عرض کروں کہ بابو امام الدین اگر گھر ہی پر تعلیم حاصل کریں۔ تو زیادہ بہتر ہو گا۔ میں خود ہی یہاں آ کر انہیں درس دے دیا کروں گا "

" مگر کیوں مولوی صاحب ؟ ایسا کیوں ! ؟

وہ اس لئے کہ مدرسے کے بچے بڑے شریر ہیں سرکار، ان کی ان لوگوں سے پٹری نہیں کھاتی ہے۔ اور اکثر یہ لوگ ایک دوسرے سے الجھتے رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ بابو امام الدین کو کبھی کسی قسم کا ضرب آ جائے۔ پھر میں آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا

سرکار !

اور جمال الدین ایک دم مطمئن ہو گئے تھے۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں مولوی صاحب !

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اور گاؤں کی گلیوں میں اچھلتے کودتے امام الدین ایک دم کڑیل جوان ہو گیا تھا۔ رگوں میں دوڑنے والا خون کبھی کبھی اس کے وجیہہ چہرے سے چھلکنے لگتا۔ تو کبھی کبھی اس کا سراپا خلاؤں میں اڑتا ہوا سا محسوس ہونے لگتا۔ وہ ننگی گھوڑی پر بیٹھ کر سرپٹ سڑک پر دوڑتا ہوا دور دور تک نکل جاتا۔ اور اس طرح گھوڑی کو دوڑاتا ہوا جب واپس آ کر گھوڑی کی پیٹھ پر سے نیچے اترتا تو وہ گھوڑی سے زیادہ خود ہانپ رہا ہوتا۔

ایک بار اسی گھوڑ دوڑ میں اس کی نظر چمپا پر پڑ گئی تھی اور اس کی شریانوں کا خون گرم ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے گھوڑی سے نیچے اترا تھا۔ اور دوسرے ہی لمحہ اسے اپنے بازو میں اٹھایا تھا۔ پھر وہ اسے گھوڑی پر بٹھا کر گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا پہاڑی کے دامن میں غائب ہو گیا تھا۔ اور عالم میں چمپا کو پھر اسی جگہ پر چھوڑ دیا تھا۔ چمپا نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ بلکہ اپنے کپڑے درست کر کے یوں آگے بڑھ گئی تھی۔ جیسے راستہ میں چلتے ہوئے وہ ٹھوکر کھا کر گر گئی ہو اس واقعہ کی کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ اور امام الدین کا حوصلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ اس طرح کے اور بھی کئی شب خون وہ مار چکا تھا۔ مگر زمین دار جمال الدین کے صاحبزادے کے خلاف کون زبان کھول سکتا تھا۔ گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کاناپھوسی کر کے مہر بہ لب رہ جاتے تھے

مگر زمین دار جمال الدین نے بھی دنیا دیکھی تھی امام الدین کے حرکات و سکنات سے انہیں بھی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اب یہ کھونٹے میں رسی سے بندھا رہنے کے لائق نہیں رہا۔ کسی وقت بھی رسی تڑا کر بھاگ سکتا تھا۔ کیونکہ

کہ گلے میں ایک ایسی گھنٹی باندھ دی جائے کہ اس کی ٹن ٹن
کی آواز سے وہ ساری عمر محفوظ ہوتا رہے گا
چنانچہ بہار شریف کے ایک امیر گھرانے میں بڑی
دھوم دھام سے شادی کر دی گئی۔

شادی کے ہفتہ عشرہ بعد امام الدین دلہن کو اپنے
ہمراہ لے کر سیر و تفریح کیلئے کلکتہ چلا گیا۔ وہاں وہ لوگ ایک
عالیشان ہوٹل میں ٹھہرے۔ سارا سارا دن وہ اپنی دلہن کو کلکتہ
کی گلیوں اور شاہراہوں کی سیر کراتا۔ نئی نئی خوشنما عمارتوں
کے بارے میں اسے بتاتا اور سہ پہر کو کبھی کبھی وہ لوگ وکٹوریہ
میموریل کی طرف نکل جاتے۔ کبھی عجائب خانہ میں داخل ہو جاتے
اور ایک سے ایک نادر عجائب کو دیکھنے کے بعد دونوں کے
منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جاتے تھے۔ چڑیا خانہ میں شیر
کی دھاڑ سن کر اس کی دلہن ایسی سہم گئی تھی۔ کہ اچانک وہ
امام الدین سے چمٹ گئی تھی۔ تب اسے امام الدین نے
بتایا تھا کہ اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ وہ شیر
تو پنجرے میں بند ہے۔

جب وہ کلکتے سے سیر و تفریح کے بعد اپنا گاؤں
جہان آباد واپس آیا تھا تو بڑا ہی ہشاش بشاش تھا۔
وہ گاؤں کی گلیوں میں لمبے سینہ تان کر چلتا تھا۔ جیسے وہ ساری
دنیا کی سیر کر کے آ گیا ہو۔ بھلا زمیندار جمال الدین کے
صاحبزادے کا مقابلہ کر بھی کون سکتا تھا۔

ابھی امام الدین زمینداری کی کھلی فضا اور جوانی کے
پُر بہار ماحول میں پورے طور پر سانس بھی نہیں لے پایا تھا
کہ زمینداری چھن گئی۔ برطانوی سرکار نے جمال الدین کی
چھوٹی موٹی سلطنت کو ضبط کر لیا۔ جمال الدین اس غم کی
تاب نہ لا سکے۔ اور چند ہی ماہ بعد جاں بحق ہو گئے۔ ان کے
خاندان کا شیرازہ ایک دم بکھر گیا۔ امام الدین کے سینے کا
تمغہ باقی نہ رہا۔ اور پُر غرور سر خم ہو گیا۔ اور اس کے لہلہاتے
ہوئے باغ پر بجلی گر پڑی۔ اور اس کا سب کچھ جل کر خاک
ہو گیا۔

ان دنوں امام الدین ایک دم نڈھال ہو گیا تھا۔ وہ
رعب وہ دبدبہ، وہ عزت وہ احترام، وہ شان و شوکت
اور وہ جاہ و جلال کہاں، اب تو راہ چلتے کبھی کبھی وہ یوں
سہم جاتا تھا۔ جیسے آس پاس کے لوگ اسے دیکھ کر قہقہہ
لگا رہے ہوں۔ جب وہ پلٹ کر ادھر ادھر دیکھتا، اور
کسی پر نظر پڑ جاتی۔ تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ بیچ
راستے میں ننگا کھڑا ہو۔ اور جب کوئی یہ کہتا کہیے زمیندار
صاحب! سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟ تو اسے ایسا لگتا
جیسے اس شخص نے امام الدین کے دل کو مٹھی میں لے کر مسل
دیا ہو۔

اس کے چند ہی برسوں بعد سارے ملک میں ہندو
مسلم فساد نے اس قدر زور پکڑا کہ اس کا گاؤں جہان
آباد بھی اس فساد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ جو کل تک
امام الدین سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتے تھے۔ آج اس
کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ اور گاؤں میں قتل و غارت
گری کے دو چار واقعات کے بعد امام الدین کے قدم
جہان آباد کی سرزمین سے ایک دم اکھڑ گئے۔ اور وہ اپنی
بیوی کلثوم کا ہاتھ پکڑ کر چپ چاپ ظلمت کی تاریکی میں
گاؤں سے نکل کر ترک وطن کرنے والے قافلے میں شریک
ہو گیا تھا۔ اسے گاؤں چھوڑنے کا اس قدر قلق ہوا تھا
کہ وہ کلثوم کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر اس بچے کی طرح
رونے لگا تھا۔ جس کا گھروندہ کسی شریر بچے نے مسمار
کر دیا ہو۔

پھر وہ کافی دنوں تک کلکتے میں رہا۔ کہ انہیں دنوں
اس نے سنا کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اور
مسلمان بڑی تیزی سے پاکستان جا رہے ہیں۔ تو وہ

بھی کلثوم کے ساتھ پاکستان کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ اور
ایسٹرڈی میں ایک چائے کی دوکان کھول کر بیٹھ گیا تھا۔
ایسٹرڈی میں اس نے اپنا ایک ماحول بنا لیا تھا
اور وہ احباب جو بہار شریف اور کلکتہ سے اس کے
ساتھ آئے تھے۔ ہر روز شام کو اس کی دوکان پر آکر بیٹھتے
تھے۔ چائے کی چسکیاں لیتے تھے۔ اور دل چسپ باتوں
اور ہنسی مذاق کے دوران جب کبھی جہان آباد کے بیتے
دنوں کا ذکر چھڑ جاتا۔ تو امام الدین کا دل ٹوٹتا پھوٹتا
ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔ اور بڑے کرب کے ساتھ نورالدین
سے کہتا تھا کہ نورو بھائی! خدا کے لئے ان بیتے دنوں
کا ذکر نہ چھیڑو، میرا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ اور جی چاہتا
ہے کہ میرے جسم میں پر لگ جائیں۔ اور میں اڑتا ہوا جہان
آباد پہونچ جاؤں۔ جس سے میرے بیتوں کی یادیں وابستہ
ہیں۔ جس سے میرا اٹوٹ رشتہ ہے۔ ان باتوں کو مت
چھیڑو نورو بھائی! ان باتوں کو مت چھیڑو۔ اور نورالدین
ایک دم جھینپ جاتا۔ جیسے واقعی اس نے امام الدین کی
شہ رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔

جب امام الدین کی چائے کی دوکان کے آس
پاس چائے کی کئی بڑی دوکانیں کھل گئیں۔ تو امام الدین
کی دوکانداری ماند پڑ گئی۔ جو احباب اس کی دوکان پر
بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لیتے تھے۔ اور خوش گپیوں میں
اپنا وقت گزارتے تھے۔ اب چپکے سے آس پاس کی
دوکانوں میں چائے پینے لگے تھے۔ اور امام الدین سے
آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے۔ ایسی صورت میں امام الدین
خسارے میں یہ ہوٹل کب تک چلا سکتا تھا۔ ایک روز
اس نے دوکان بند کر دی۔ اور سامنے والے قمرالدین
کے ہوٹل میں ملازم ہو گیا وہ برسوں وہاں چائے کی پیالیاں
اور کھانے کے برتن دھونے پر مامور رہا۔

پھر ایک روز وہ کام کی زیادتی سے غش کھا کر گر گیا اور
اسے روزانہ اس بات کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ کہ اب
وہ بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے بازوؤں میں اب اتنی طاقت
نہیں رہی کہ ان پیالیوں اور کھانے کے برتنوں کا بوجھ اٹھا سکے
اس کی داڑھی اور اس کے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔
کام کرتے ہوئے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوتا تھا۔ اور پاؤں میں
لغزش پیدا ہونے لگتی تھی۔

اس روز وہ کلثوم کے سامنے جاکر اپنی بد قسمتی پر
بہت رویا تھا۔ اس نے سوچا اگر اس کے چاروں بچے یکے
بعد دیگرے نہ مر گئے ہوتے، تو اس کے بازو اتنے کمزور
ہر گز نہ ہوتے۔ وہ ان کے بازوؤں کا سہارا ہوتے۔ اور ان
پر حکمرانی کرکے وہ دونوں چین کی زندگی گزارتے۔ اس طرح
دوسروں کے جوٹھے برتن دھونے پر مجبور نہ ہوتے۔

اس روز کلثوم نے بھی امام الدین کو دلاسہ دیا تھا۔
ہمت اور حوصلہ سے کام لینے کی تلقین کی تھی۔ اور بڑے کرب
کے ساتھ یہ بھی مشورہ دیا تھا کیوں نہ ہم لوگ جہان آباد واپس
چلے جائیں اپنے آباواجداد کی سرزمین ہے۔ کہیں نہ کہیں سر چھپانے
کو جگہ اور دو ایک ٹکڑے روٹی کا سہارا تو مل ہی جائے گا۔

تو امام الدین نے تیور بدل کر کلثوم سے کہا تھا۔

تم بھی کیا باتیں بنا رہی ہو کلثوم! بہار شریف میں ہمارے
بھائی بھتیجے اچھے کاروباری اور خوشحال ہیں۔ کبھی تو یہ توفیق
نہ ہوئی کہ ذرا دیکھ آئیں۔ میرے بہن اور بہنوئی کس حال میں
ہیں۔ زندہ بھی ہیں کہ مر گئے۔

اس روز امام الدین کے ساتھ ساتھ کلثوم بھی اپنی
بد قسمتی پہ بہت روئی تھی۔ جیسے اتھاہ سمندر میں ہاتھ پاؤں
مارتے مارتے تھک گئے ہوں۔ اور اب سمندر کی گہرائی میں
دھیرے دھیرے غرق ہوتے جا رہے ہوں۔

امام الدین کی طرح اب کلثوم بھی لاغر اور کمزور ہو گئی تھی

پھر بعد نئی بیماریوں کا حملہ ہونے لگا تھا۔ اور ایک روز ایسا بھی آیا کہ کلثوم امام الدین کا ساتھ چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسی اس دن امام الدین ایسے رو رہا تھا جیسے روتے روتے اب اس کی آنکھیں بہہ جائیں گی۔

پھر وہ دن بھی آیا کہ اس کے جہان آباد کی طرح ایشرڈی میں بھی ایک ہولناک انقلاب آیا۔ قتل و غارت گری کا بازار یہاں بھی گرم ہوا۔ سارے ملک میں خون کے چھینٹے اٹھنے لگے۔ جس کا حد مرسنگ سمایا نکل گیا۔ اس نفسا نفسی اور اس افراتفری کے عالم میں امام الدین ایسا بدحواس ہوا کہ اسے چاروں اور اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ پھر وہ چلتے، چلاتے گرتے پڑتے اپنی جان بچا کر یہاں آ گیا تھا۔

یہ جگہ ایک انجان جگہ تھی۔ یہاں کے لوگ اس کے لئے ناآشنا تھے۔ یہ شہر ایک روشن شہر تھا۔ مگر اس کی آنکھوں کی بینائی دھندلی ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی لاٹھی کمزور ہو چکی تھی۔ اور اس کمزور لاٹھی کے سہارے وہ سارے شہر کا چکر کاٹتا۔ اور ایک ایک شخص کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا کر اللہ کے نام پر بھیک مانگتا اور روکھی سوکھی جو بھی مل جاتا کھا کر حاجی احسان الٰہی کیمپ کے ایک کونے میں جا کر سو جاتا۔

کبھی کبھی وہ نیند میں یوں بڑبڑاتا جیسے وہ کسی کو ڈانٹ رہا ہو۔ یا کسی پر اپنی زمین داری کا رعب جما رہا ہو۔ کبھی کبھی دھیرے دھیرے اور کبھی کبھی زور زور سے۔ کمینے! حرام زادے۔ تم لوگوں نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے؟ میں کوئی بھکاری نہیں ہوں۔ میں تو ایک زمین دار ہوں۔ حرام زادے میں زمین دار ہوں۔ بھکاری نہیں۔

دوسری صبح کو جب کیمپ کی عورتیں پوچھتیں،
امام الدین چاچا! یہ خواب میں آپ کس زمین دار کی باتیں کر رہے تھے۔؟

تو وہ بڑے پیار بھرے انداز میں جواب دیتا۔

نہیں ماں جی! میں کس زمین دار کی بات کروں گا۔ خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ پھر خواب تو اندھے اور گونگے بھی دیکھتے ہیں۔ ماں جی! مگر اس کا اظہار تو وہ نہیں کر پاتے ہیں۔ اگر میں نے خواب دیکھا تو کیا ہوا۔

اس روز وہ بہت اداس تھا۔ صبح سے سرد ہواؤں کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ اس کا جسم سردی کی وجہ سے کانپ رہا تھا جسم کے جوڑ جوڑ میں درد محسوس کر رہا تھا۔ اور اس روز وہ بازار سے جلد ہی کیمپ کی طرف لوٹ آیا تھا۔ اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا تھا۔

اس روز کے بعد وہ روزانہ شام کے پانچ بجے کیمپ لوٹ آتا تھا۔ کیونکہ امام الدین کے جسم میں اب وہ طاقت و توانائی بھی نہ رہی کہ پہلے کی طرح سارا سارا دن شہر کی سڑکوں پر لاٹھی ٹیکتا ہوا گھوم پھر کر بھیک مانگ لیتا تھا۔ اب تو یہ عالم تھا کہ دو چار قدم چلنے کے بعد وہ یوں ہانپنے لگتا جیسے وہ میلوں کی مسافت طے کر کے گھر لوٹ رہا ہو۔

پھر مہنگائی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور بھیک دینے والے اپنا ہاتھ بھی کھینچتے جا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امام الدین سر شام گھر لوٹ آتا۔ اور کبھی کبھی بھوکا پیاسا اپنے بیتے دنوں کی خلش اپنے دل میں لئے ہوئے سو جاتا۔ بھوک کی شدت کو برداشت کرنا سب کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو بھوک کی شدت اس قدر جان لیوا ثابت ہوتی کہ امام الدین کا ایمان ڈانواڈول ہو جاتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ پہلوان ہوٹل کی سینی میں سجی سجائی ہوئی مٹھائی کو چپکے سے لے کر بھاگ جائے۔ مگر اس میں خدشہ تھا کہ اگر وہ پکڑ لیا گیا تو پھر اس بڑھاپے میں اس کی کیا لاج رہے گی۔ پھر اس نے سوچا! نہیں! وہ بھوکا مر جائے گا۔ مگر چوری کر کے اپنا پیٹ ہرگز نہیں بھرے گا۔

اور اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے اور

امام الدین کی لاش حاجی احسان الٰہی کیمپ کے دروازے کے سامنے سڑک کے کنارے ایک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ لاش کے سرہانے ایک چھوٹی سی بچی جس کی عمر تقریباً چھ سات سال کی ہوگی اداس اور مضمحل بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں وہ بار بار ایک ہی صدا لگا رہی تھی۔

اللہ کے نام پر لاوارث لاش کے لئے کچھ دیتے جائیں!

لاش کافی دیر سے پڑی ہوئی تھی۔ اور اس راستے سے گزرنے والے راہ گیر اس لاوارث لاش کی امداد کے لئے لڑکی کے سامنے بچھے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے پر روپیہ دو روپیہ پچیس پیسہ اور پچاس پیسہ اچھالتے ہوئے گزرتے رہے۔

پھر جب راہ گیر کی آمد و رفت کم ہوگئی اور ہر طرف رات کا سناٹا چھا گیا تو اچانک امام الدین کی لاش میں حرکت پیدا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے امام الدین اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اس نے تمام روپے پیسے سمیٹ کر لڑکی کا ہاتھ تھاما اور کیمپ کی طرف چل پڑا۔

●●

رُباعیاں

تجلی

(بدنام نظر کے لئے)

شب گردو "تہی دست" ہے بدنام نظر
جس حال میں ہے مست ہے بدنام نظر
دنیائے معانی کی بلندی کی طرف
الفاظ کی اک جست ہے بدنام نظر!

اک دیپ سرِ راہ جلایا اس نے
بے نام سا احساس جگایا اس نے
مانا کہ "تہی دست" ہے بدنام نظر
شعروں کو گہر تاب بنایا اس نے

(سلطان اختر کے لئے)

امکانِ غزل ہے کہ ہے سلطان اختر
عرفانِ غزل ہے کہ ہے سلطان اختر
تہذیبِ غزل کا وہ نمائندہ ہے
سلطانِ غزل ہے کہ ہے سلطان اختر

کیوں خونِ جگر پیتے ہو سلطان اختر
بے خوف و خطر پیتے ہو سلطان اختر
جیسے کہ غمِ جاں کا مداوا ہو یہی
یوں شام و سحر پیتے ہو سلطان اختر

نظم (۱)

خلیل تنویر

دستکیں تو ـــــــ
بند ہی دروازوں پر ہوتی ہیں۔
جو بند پڑے ہوں
تم نے تو اپنے تمام
دروازے کھول دیئے ہیں
اب کیا دستک ہو گی

نظم (۲)

تبدیلیاں تو آتی ہیں مگر
جس تیز رفتاری سے
تم بدلے ہو۔
حیرانی ہے ـــ!
کیا پیراہن بدل دینے سے
دھیان کے راستے بھی بدل جاتے ہیں۔
ایک ہی انداز سے سوچتے ہوئے
یہ سوچنا کہ
سب کچھ جان لیا ہے
شاید تمہاری پیاس کا سفر
بہت مختصر تھا۔

حمید الماس

خوشبو تبسم کی

شہر کے فکر دفن کے اندر
ہیں کرشمے بے شمار
تشنہ لب پھرتی ہیں
کتنی غیر مرئی صورتیں
سلسلہ در سلسلہ
دیوار کے اندر ہیں دیواریں کئی
بھاگتی ہے جن سے بچ کر تیرگی
وہ شارع آتش خاموش بھی تو ہے یہاں
جو مجھے اندر ہی اندر سے جلاکر
راکھ میں تبدیل کرتی ہے مسلسل
اس لئے شاید
میرے منہ سے نکلنے والے لفظوں میں ہے
خوشبو تبسم کی !

ڈاکٹر نریش

خلا اور میں

یہ ایک ایسا خلا ہے
جو میری نس نس میں سما گیا ہے
مجھے لو نیچ کر کھاتا ہے
یہ ایک ایسا خلا ہے
جو بن کے بیرا لہو
میری رگوں میں بڑا تیز تیز بہتا ہے
یہ ایک ایسا خلا ہے
جو بھر سکا نہ بھرے گا کبھی کسی صورت
یہی خلا ہے جو اک دن مجھے نگل لے گا.
یہی خلا ہے جو مجھکو تباہ کر دے گا.
میرا وجود خلا کا مجسمہ ہو گا
کبھی جو ذہن الجھتا ہے ان خیالوں سے
تو سوچتا ہوں
خلاؤں میں گم نہ ہو جاؤں
تو سوچتا ہوں
خلا کی طرح نہ مٹ جاؤں

چندر بھان خیالؔ

داغِ فراق

انجمن احساس کی خاموش بزمِ دل پریشاں
دے گیا ہے ایک لمحۂ مستقل داغِ فراق
سر جھکائے سوگ میں، بے حال سے اردو زباں
پھر عمارت شاعری کی ہائے خالی ہو گئی

خون کے آنسو فضا علم و ادب کی رو گئی
جس کے ہاتھوں سے متاعِ فکر و ہستی کھو گئی
کس قدر فنکار ہوتا ہے ندائے شعر و فن
سرخ رو لفظوں میں لکھی جائے گی داستاں

مصلحت سے دور دل آویز نغموں کی اذاں
حسن کا منہ زور دریا، جیسے قرآن سے اذاں
وہ سخن اندر سخن، شانِ تفکر خیمہ زن
جیسے لب پر سرسوتی بیٹھی ہوئی پر باوقار

جلوہ جلوہ حشر ساماں، لمحہ لمحہ بے قرار
زندگی بھر زندگی سے جنگ پیہم بھی کے وار
سینکڑوں صدیاں مسلسل جاگتی ہیں دم بدم
تب کہیں تحریر کر پاتا ہے انساں اپنا خواب

اس قدر بے خواب لفظوں کا مکمل انتخاب!
شب برہنہ ہو کے ناچے اور صبحیں بے حجاب
تجربہ در تجربہ عرفان کا اک سلسلہ
لمحہ لمحہ اک ستارہ زندگی کی راہ میں

میر کا غم، غالبِ خستہ کی خلوت گاہ میں
وسعتِ افلاک بھر فکر کی ہر تھاہ میں
انفرادی ذہن کی باقاعدہ بے باکیاں!
بات جو ہونٹوں پہ آئی بول دی منہ کھول کر

وہ دلبستانِ ہنر، وہ درس آموزِ نظر!
محفلِ شعر و سخن کی شان واحد شعر گر!
جوش کے ہمعصر پہ لوں تو بلائیں بھی تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور تھی وہ بھی ہوئی

غزل

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

دست حنا میں رنگ نہ پھولوں میں باس ہے
ہر نقش دلفریب و فا ناشناس ہے

چہرے تمام غم کے اندھیرے میں کھو گئے
محفل میں اک چراغ ہے وہ بھی اداس ہے

صحن چمن میں بکھرا پڑا ہے در قفس
کچھ بال و پر بھی تیلیوں کے آس پاس ہے

کس کا گلہ کریں کوئی نا آشنا نہیں!
جو آشنا نہیں وہ سراپا سپاس ہے

خنجر بکف جو شہر میں تھا سب سے پیش پیش
کیا بات ہے کہ آج وہی بدحواس ہے

آؤ نا مل کے بانٹ لیں غمہائے کائنات
اک دل تمہارے پاس ہے اک میرے پاس ہے

راحت کی آرزو مجھے سعدی ہو کس لئے،
جب ہر غم حیات مرے دل کو راس ہے

غزل

بعد مدت کے وہ پھر آج ادھر سے گزرے
برق سی دل پہ گری جب وہ نظر سے گزرے

حوصلہ ان کے خیالوں نے بڑھایا، ورنہ
کتنے طوفان بلا راہ میں سر سے گزرے

دل کو بھاتی ہی نہیں کوئی بھی تصویر جمال
بارہا انجمن شمس و قمر سے گزرے

ان کے ہاتھوں کی حنا ایسی دل آویز ہوئی
عمر بھر شوق کی راہوں میں سفر سے گزرے

میری آمد پہ انھوں نے جو پلٹ کر دیکھا
ان کی زلفوں کے سیہ ناگ کمر سے گزرے

نقش پا پہلے کبھی پھول کی مانند نہ تھے،
قافلے یوں تو بہت [illegible] گزر سے گزرے

موسم گل کا وہ منظر بھی عجب تھا سعدی
پھول کی چاہ میں جب لوگ شرر سے گزرے

کرشن موہن

غزل

ناامیدی ہوں سراپا اب تو
چھا گیا مجھ پر بڑھاپا اب تو

اب نہیں کوئی گلہ یاروں سے
اجنبی ہو گیا آپا اب تو!

اور کچھ اس کے سوا پاس نہیں
درد سے عمر کو ناپا اب تو

اک شکایت کی حکایت نکلا
دل نے جو راگ الاپا اب تو

کچھ نہ کر سکنے کا پچھتاوا ہے
بس اسی آگ کو تاپا اب تو

قطعہ

ماہناموں کے مدیروں کو ہوا
تیری شہرت سے جلاپا اب تو

کرشن موہن ترا نام نامی!
سرِ فہرست نہ چھاپا اب تو

حسن اکبر کمال (پاکستان)

غزل

طلسماتی کوئی منظر نہ دیکھا
کہ ہم نے پھر وہ گل پیکر نہ دیکھا

ہوئے برباد ہم تیری ہی خاطر
یہ عالم تو نے ہی کم کر نہ دیکھا

نہ اتری چاندنی پھر آنگنوں میں
کہ روشن پھر کسی کا گھر نہ دیکھا

بچھڑ کر یوں بنا پتھر، کہ ہم نے
کوئی دکھ اس کے چہرے پہ نہ دیکھا

تمہیں احساس غم کیا ہو کہ تم نے
کبھی اس آگ میں جل کر نہ دیکھا

اڑانوں سے ہوا کچھ پیار ایسا،
پرندوں نے پلٹ کر گھر نہ دیکھا

رفیعہ شبنم عابدی

غزل

فرازِ دار پہ احسان کر گئے ہیں لوگ
لہو کی شمع جلا کر گزر گئے ہیں لوگ

ہمارے عہد کے چہرے ہیں ایسے خوفزدہ
کہ جیسے تیرہ خرابوں میں ڈر گئے ہیں لوگ

نہ قاتلوں کی ضرورت نہ مقتلوں کی کمی
حدیں خلوص کی یوں پار کر گئے ہیں لوگ

کنوئیں جو کھیتوں کو سیراب کرنے والے تھے
انہیں لہو بھری لاشوں سے بھر گئے ہیں لوگ

نہ خونِ دل، نہ شرابِ نظر، نہ رنگِ حنا
وہ رنگ اور ہیں جن سے نکھر گئے ہیں لوگ

اب اس کے بعد کہے کیا زبانِ خنجر بھی
لہو بدست ہیں پھر بھی مکر گئے ہیں لوگ

کہاں سے ڈھونڈھ کے لاؤں میں زندگی شبنم
حیات ہوتے ہوئے بھی تو مر گئے ہیں لوگ

ظہیر غازیپوری

غزل

ذہن تا ذہن کتابوں کا سفر جاری ہے
فکر کے تازہ گلابوں کا سفر جاری ہے
کوئی برگد کے گھنے سائے میں کیا سوچے گا
دھوپ میں کتنے عذابوں کا سفر جاری ہے
کوئی دستک، کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں
جانے کس راہ میں خوابوں کا سفر جاری ہے
بند رکھو ابھی احساس کے سارے روزن
ابھی دزدیدہ عتابوں کا سفر جاری ہے
حرف تا حرف دمکتا ہے سراپا تیرا
نقطہ در نقطہ حجابوں کا سفر جاری ہے
جذبے نادیدہ ہیں، الفاظ ہیں مبہم پھر بھی
اب تک ان خانہ خرابوں کا سفر جاری ہے
لوٹتے رہنا بظاہر ہے مقدر لیکن
موج در موج حبابوں کا سفر جاری ہے
لو یہ لو سبز مراعات ہیں بے سود ظہیر
جب میرے ساتھ سرابوں کا سفر جاری ہے

یوسف جمال

غزل

سبز پتوں میں رنگیلی آگ تھی
جا بجا رقصاں سنہری آگ تھی

دھوپ کی حدت کا پس منظر تھا یہ
پیش منظر میں جھلستی آگ تھی!

ایک گھر سے کیا دھواں اٹھا کہ آج
سارے اخباروں کی سرخی آگ تھی

جل اٹھے پورے محلے کے مکاں!
ایک چنگاری میں کتنی آگ تھی

جل رہا تھا گھر، وہ اندر گھر کے تھا
گرد اس کے رقص کرتی آگ تھی

دب گئی چیخ اس کی اٹھتے شور میں
جان لینے والی ایسی آگ تھی!

جب ہوا سے تھی نہ کوئی ساز باز!
شہر میں ہر سمت کیسی آگ تھی

کہنے سننے کے لئے تھی دیدہ ور!
پھر بھی اندھی، گونگی، بہری آگ تھی

بوکھلاہٹ چند خود سوزی سے کیوں
جب تری قسمت میں لکھی آگ تھی

آگ کے کس روپ کا ہو تذکرہ!
اس کی تو بے چہرگی ہی آگ تھی

آنکھ کی قندیل گل ہو کس لئے.
آنسوؤں سے جلنے والی آگ تھی

بھسم کر دے گی مجھے اک دن جمال
کیا کہوں ہر سانس بھری آگ تھی.

شاہد میر

غزل

خاموش بام و در بھی ہر ایک منظر بے صدا
پہچان اب مشکل نہیں ایسے میں بڑھ کر دیکھ صدا

ہر گام گونگی بستیاں ہر موڑ بہرے شہر ہیں
کس بن میں آوارہ پھرے کس دشت میں پھیلے صدا.

اس پار نیرا گاؤں اور بستی ہے حائل بیچ میں
مجبور تیرے بے بال و پر کس طور اب پہنچے صدا

ترویج فن مشکل یہاں ہر سمت بس چپ کا دھواں
کچھ لوگ تھے حرف آشنا دہ بھی نہیں سمجھے صدا

اس شاہراہ عام پر، آزادیوں کے نام پر
پہلے گنوائی تھی زباں، رخصت ہوئی اب کے صدا

یہ چپ تو کچا بند ہے اک آن میں ڈھ جائے گا.
دریا پہ پابندی نہیں کب تک کوئی روکے صدا.

شاہد اسے احساس کی مضراب دے کر چھوڑ دے
خاموشیوں کی دشت ڈھونڈے گی خود رستے صدا

خالد قمر

غزل

میری نشانیاں دے
وہ پھول پتیاں دے
لے چوڑیوں کا تحفہ
نازک کلائیاں دے
اے کاش! کوئی لمحہ،
تجھ تک رسائیاں دے
نیلام ہو رہا ہوں
تو بھی تو بولیاں دے
یہ پیار ہے فضول اب
چولہے میں لکڑیاں دے
خاموشیوں کو میری
جادو بیانیاں دے

مس محمودہ نغمی

غزل

چھپا کے میرے گناہوں کو تو نقاب میں رکھ
لطیف جذبوں کو تو پردۂ شباب میں رکھ

بچا کے رکھ غم ہستی میں بھی جگر کا لہو
چھپا کے عشق کا دریا اسی حباب میں رکھ

میں نقش نقش ابھرنے لگی ہوں پر معنی
بنا کے لفظ مجھے تو کسی کتاب میں رکھ

بکھر گئی ہے فضاؤں میں لمس کی خوشبو
کہا تھا کس نے کہ انگلی کسی گلاب میں رکھ

خورشید طلب

غزل

وقت کی دھوپ میں اک سایۂ جاں شامل ہے
یعنی کچھ سلسلۂ نام و نشاں شامل ہے

ہو کے لفظوں سے الگ غور سے سوچو مجھ کو!
میری خاموشی میں اک تلخ بیاں شامل ہے

مسکراتے ہوئے لمحوں کو غنیمت جانو.....
اس میں زیست کا سب سود و زیاں شامل ہے

زردیاں بکھری ہیں چہروں پہ صعوبت بن کر،
اب ہر اک شخص کی سانسوں میں خزاں شامل ہے

اپنا سرمایہ وہیں رکھ کے چلا تھا گھر سے
اس سفر میں بھی مگر بارِ گراں شامل ہے

ڈھونڈ لیجئے گا اگر ہو گی ضرورت مجھ سے
آپ کے شہر میں میرا بھی مکاں شامل ہے.

راز جلتے ہوئے پیڑوں کا نہاں ہے اس میں
اب کے برفیلی ہوا میں جو دھواں شامل ہے

حرف سب مٹ گئے انگشت شناسائی سے
اب میرا نام کتابوں میں کہاں شامل ہے

خواب جیسے ہیں حقیقت کے در و بام طلب
آج تو شہرِ یقیں میں بھی گماں شامل ہے

ایم آر قاسمی

غزل

اے خدائے لہم و رفتار! یہ آسانی دے
مجھکو اس شہر میں رہنے کی گراں جانی دے

وہ جو دیتا ہے سمندر کو سکوں میں اس سے
چاہتا ہوں مرے دریاؤں کو طغیانی دے

مری آنکھوں میں سجا رنگ برنگے منظر،
نرم جذبوں کی مرے دل کو فراوانی دے

یہ جھلستی ہوئی وادی، یہ سسکتے ہوئے لوگ
چند ہی دن کو ہوائیں انھیں برفانی دے

تبصرہ

نام کتاب :- منزل تک (ناول)
مصنف :- ظفر ہاشمی
صفحات :- ۱۶۶
قیمت :- لوز روپے ۹/=
ناشر :- گجرات اردو لٹریری اینڈ کلچرل اکیڈیمی، احمد آباد گجرات۔
مبصر :- عبدالصمد

اردو میں اچھے ناولوں کی اس قدر کمی ہے کہ جب بھی کوئی ناول منظر عام پر آتا ہے۔ تو ایک خوشی سی ہوتی ہے۔ اور یہ امید بندھ جاتی ہے کہ شاید اردو ناول کا سر بلند ہو جائے، لیکن جب ناول نظر اور ذہن کی تمام منزلوں سے گزر جاتا ہے۔ تو ایک ایسی مایوسی ہاتھ آتی ہے۔ جو ساتھ ساتھ جھنجھلاہٹ بھی لاتی ہے۔ کچھ یہی ناول "منزل تک" کا ہے۔ اس کے مصنف ظفر ہاشمی ہیں۔ جو کتاب میں چھپے تعارف کے مطابق ایم کام ہیں۔ ایسے پڑھے لکھے آدمی کو اپنے علم اور ذہانت کو بروئے کار لانا چاہئے تھا۔ ان میں صلاحیت موجود ہے کہاں کا تانا بانا وہ بن سکتے ہیں۔ اور آج کی COMPLEX SOCIETY میں موضوعات کی کمی ہے۔

ناول پڑھئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ جیمنی کی بنائی ہوئی ایک خالص گھریلو رومانی پکچر دیکھ رہے ہیں ایک ہیرو اور ایک ہیروئن ہے۔ ہیروئن کا بھائی ہیرو کا دوست ہے۔ ہیرو ہیروئن کے گھر اپنے دوست سے ملنے آتا ہے۔ تو پہلی ہی نظر میں کیوپڈ کا تیر اپنا کام کر جاتا ہے۔ درمیان میں عین موقع پر پر ولن کود جاتا ہے۔ جو ہیروئن سے بچپن سے منسوب ہے۔ ظاہر ہے کہ ولن کا کام ہیرو، ہیروئن کے درمیان خلیج پیدا کرنا ہے۔ سو اس نے یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ ایک اتفاقیہ ڈرامے نے ہیرو ہیروئن کو بمبئی میں ملا دیا۔ اور جب گلے سے مل گئے، سارا گلہ جاتا رہا۔ نتیجہ کیا نکلا ——— بدی پر نیکی کی فتح ——— میں نہیں جانتا کہ مصنف پر اس موضوع پر کتنے ناول پڑھے ہیں۔ لیکن مجھ جیسے بے علم آدمی کے علم میں بھی درجنوں نہیں۔ سینکڑوں ناول موجود ہیں۔ جن میں کسی نہ کسی طرح اس موضوع پر حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ اگر مصنف نے اس موضوع کا انتخاب کر ہی لیا تھا تو اسے کم از کم اور بہتر طور پر پیش کر سکتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ پیش کش کا انداز اس قدر بھونڈا ہے۔ کہ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ ہیرو ہیروئن اور دوسرے کردار سے اس قدر سطحی اشعار کہلوائے گئے ہیں۔ کہ مصنف نے اپنے طور پر تانا بانا بننے کی جو بھی کوشش کی ہے وہ بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔

کتاب چھوٹے سائز پر اچھی چھپی ہے۔ کتابت کی غلطیاں نہیں ہونے کی حد تک ہیں۔

نام کتاب :- کانچ کا درخت (افسانوی مجموعہ)
مصنف :- ابواللیث جاوید
صفحات :- ۱۱۲
قیمت :- بیس روپے ۲۰/-
مبصر :- عبدالصمد
ناشر :- اردو رائٹرز گلڈ، الٰہ آباد ۳

افسانوں کی دنیا میں ابواللیث جاوید کا نام محتاج تعارف نہیں۔ آپ ایک عرصہ سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اور چونکہ انہوں نے زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہو کر اس فن پر محنت کی ہے۔ اس لئے انہیں ادوار میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ ابواللیث جاوید ایک عرصہ تک پلاٹ اور کہانی پر مشتمل افسانے لکھتے ہیں اور اس کے بعد وہ وہ علامتی روش کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس لئے ان کو بڑا فائدہ یہ پہونچا کہ افسانے پر ان کی گرفت مضبوط رہی۔ اور ان پر کوئی ایسا کمزور لمحہ نہیں گزرا جب افسانہ ان پر سوار ہو گیا ہو۔ اور وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگے ہوں۔ علامت نگاری کو فیشن کے طور پر اختیار کرنا کتنا مہلک ثابت ہوا ہے۔ یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ یہ بات کتنی عجیب لگتی ہے کہ پلاٹ کی تعمیر جن لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ لوگ جدید علامتی افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہوئے۔ آج ۲۰؍ بیس سالوں کے بعد جب ہم پر محاسبہ کی گھڑی آتی ہے تو یا تو ہم بے حد کند ذہن ہیں کہ ہمیں کسی کا نام یاد نہیں رہتا یا پھر جاہل ہیں کہ ہم نے ان لوگوں کو نہیں پڑھا۔ ابواللیث جاوید بہرحال ان لوگوں میں ہیں۔ جن کے نام ذہن کے گوشوں میں محفوظ رہتے ہیں۔ ذہنوں میں اپنے نام کو بٹھانے کے لئے ابواللیث جاوید نے کس طرح اپنے آپ کو بھلا کر فن کی بھٹی سے نکالا ہوگا۔ یہ بات غالباً بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس مجموعے میں کل چودہ افسانے شامل ہیں۔ ان میں گیارہ افسانے ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی تفصیل کتاب میں آخر میں دی گئی ہے۔ بقیہ افسانے اس پہلے کہیں شائع نہیں ہوئے۔ ابواللیث جاوید کی پیش کش کا یہ طریقہ بھی پسند آیا کہ "کانچ کا درخت" اردو افسانے کے لئے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔

بہرحال! جس قاری نے کتاب خریدنے میں اتنے پیسے خرچ کئے ہیں اسے کچھ تو ایسا ملنا ہی چاہئے جو اس سے پہلے ان کو نہیں ملا۔ ابواللیث جاوید نے علامت کو اس وقت اختیار کیا ہے جب اس کی ضرورت پڑی ہے۔ بلاوجہ انہوں نے علامتوں کو چھوا بھی نہیں اسی لئے ان کے فن میں چابک دستی ہے۔ اور بھونڈا پن نظر نہیں آتا۔ موضوع سے انصاف برتنا بجائے خود ایک فنکاری ہے۔ اور ابواللیث جاوید نے بلاشبہ اپنے فنکار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

کتاب خوب صورت چھپی ہے۔ ٹائیٹل تو بہت ہی خوب صورت اور دلفریب ہے جسے قیصر سرمست نے بنایا ہے۔ قیمت البتہ کچھ زیادہ ہے۔

نام کتاب :- آخری کش ۔ (افسانوی مجموعہ)
مصنف :- عبید قمر
صفحات :- ۸۲ ،
قیمت :- بارہ روپے ۱۲/۰
مبصر :- عبدالصمد
ناشر :- نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، (یو پی)

نشتۂ کے بعد ابھر کر سامنے آنے والوں میں عبید قمر ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ بہت سے دوسرے فنکاروں کی طرح عبید قمر نے بھی نشتۂ کے بہت قبل لکھنا شروع کیا۔ لیکن اپنے بہت سے ہمعصروں کی طرح اپنی اہمیت نشتۂ کے بعد ہی منوائی۔ دراصل نشتۂ اردو افسانے کا ایک اہم LAND LLAIK ہے کہ اس نے اپنے پیش روؤں کی طرح نہ تو TOTAL RCJECTIAN کا رویہ اختیار کیا۔ اور نہ بلند بانگ دعوے کئے۔ اپنے پیش روؤں کی اچھی چیزوں کو اپنانے میں اس نے کبھی شرم محسوس نہیں کیا۔ اور خراب چیزوں کو مسترد کرنے میں اسے کوئی ڈر نہیں لگا۔

ادبی سیاست کے دور میں عبید قمر ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کئے بغیر بس لکھتے رہے یہی وجہ ہے کہ ان کا نام اپنے ہم عصروں میں معروف نہیں رہا لیکن ان کے افسانوں کی اس اکھٹی پیش کش نے یہ ثابت کر دیا کہ عبید قمر اپنے بہت سے ہم عصروں سے زیادہ باصلاحیت ہیں۔ وہ افسانہ لکھنا جانتے ہیں۔ انہیں کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔ انہوں نے اپنے فن کے ساتھ ایمانداری برتی ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے زبردستی اپنے آپ پر افسانہ نگار کو طاری کر کے اپنے قلم کو گھسیٹا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کی بہت لمبی فہرست نہیں بنائی ہے۔ اس مجموعے میں بھی ان کے صرف دس افسانے شامل ہیں۔ لیکن انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے بہت سوچ سمجھ کر اور ذمہ داری کے ساتھ لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف کرنے میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو سکے ہیں۔

مجھے اس کی خبر نہیں کہ عبید قمر نے اب تک کتنے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن اس مجموعے میں شامل دسوں افسانے پڑھ کر مجھے بہت ہی طمانیت کا احساس ہوا۔ نشتۂ کے بعد کے افسانہ نگاروں کے کارناموں میں یہ مجموعہ فخر کے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔ خاص طور پر، مجرم، چمگادڑ، آخری کش، قتل اور مرغا کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ کہ یہ افسانے اپنی جگہ پر مکمل فنی نمونے ہیں۔ ان میں کہیں بھی جھول نہیں۔ عبید قمر نے علامتوں کے ساتھ مذاق کرنے کی کوشش نہیں کی ہے ان کی علامتوں میں زندگی کے OELEVENCE موجود ہیں۔

بعض افسانوں میں کہیں کہیں پر انگریزی جملوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن جملوں کی ترکیب غلط ہے۔ جیسے "فیتھ می سر" عبید قمر کو ان جگہوں پر محتاط رہنا چاہئے۔ ان کی زبان خوب صورت ہے۔ اور ان کی زبان میں ایک کشش ہے۔

مجموعے کا انتساب انہوں نے ایک ریاستی وزیر کے نام کیا ہے۔ یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اور میں اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ عبدالمغنی نے "پہلا کش" کے عنوان سے عبید قمر کے مجموعے پر اظہار خیال کیا ہے لیکن اس میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ "آخری کش" کے تعلق سے پہلا کش میں ان سے بہت کچھ توقعات وابستہ تھیں۔ جو پوری نہیں ہوئیں۔ اور ایک ممتاز ناقد کے ہاتھوں ایک سنہرا موقع ضائع ہو گیا۔

کتاب بہت اچھی نہیں چھپی ہے لیکن غنیمت ہے۔ ٹائٹل جاذب نظر ہے۔ قیمت کچھ زیادہ ہے لیکن آج کی مہنگائی کے ہنگامے میں اس موضوع پر کہنا کچھ لاحاصل ہے۔

●●

محتویات

مضمون:

افسانے:

نظمیں:

غزلیں:

نذیر تبسم (پاکستان)

سرفراز شاہد۔ ایک مطالعہ

طنز و مزاح کے عناصر دراصل فرد اور معاشرے [illegible] کی [illegible] درجہ رکھتے ہیں۔ اور انہی کا سہارا لے کر ادیب، شاعر اور فنکار ماحول کی بے اعتدالیوں اور فرد کی ناہمواریوں پر [illegible] کرتا ہے۔ طنز و مزاح نہ کسی زبان کی نشوونما کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اہلِ زبان [illegible] ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔

دراصل انسان کائنات کا سب سے بڑا خواب پرست [illegible] اور اکثر و بیشتر اپنی امنگوں اور آرزوؤں کے تانے بانے سے ایک ایسا رنگ محل تعمیر کرتا ہے جس کی [illegible] پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس زندگی خواب ہو یا نہ ہو ایک بے رنگ ٹھوس اور تلخ حقیقت ضرور [illegible] جب انسانی امنگوں کے تاج محل زود یا بدیر اس تلخ حقیقت سے ٹکراتے ہیں تو انسان کائنات کی سب [illegible] بے بس، غمزدہ اور مظلوم ہستی بن جاتا ہے۔ احساسِ مزاح کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کی بے [illegible] آرزوؤں [illegible] رنگوں اور پراسرار خوابوں پر متبسم انداز سے تنقید کرے۔

"بلا تکلف" میں سرفراز شاہد بھی خوبصورت [illegible] ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں دراصل سرفراز شاہد کی ذاتی زندگی کے حوالے سے کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن ان کی شاعری [illegible] ان کی شخصیت ایک کھلی کتاب بنا کر رکھ دی ہے۔ تاہم ان کی مشہور و معروف نظم "[illegible]" [illegible] صحافت سے ان کا غائبانہ تعارف ہم سے اس زمانے سے ہی ہو چکا تھا، جب میں پشاور یونیورسٹی میں [illegible] تھا۔ اور ہم کچھ دوست اس نظم کی معنوی صداقتوں سے اپنی کلاس فیلوز کو چڑانے کے لئے لہک لہک کر گایا کرتے تھے

وہ اس کالج کی شہزادی تھی اور شاہانہ پڑھتی تھی — [illegible] کالج آتی تھی وہ بیباکانہ پڑھتی تھی
بڑے مشکل سبق تھے جن کو وہ روزانہ پڑھتی تھی — وہ [illegible] مضمون سب مردانہ پڑھتی تھی
یہی کالج ہے وہ [illegible] پڑھتی تھی

جماعت میں ہمیشہ دیر سے وہ آیا کرتی تھی — [illegible] کے تلے فلمی رسالے لایا کرتی تھی
وہ جب دوران لیکچر بور سی ہو جایا کرتی تھی — [illegible] افسانہ پڑھتی تھی
[illegible] کالج ہے [illegible]

وہ ناسمجھ تھا کہ جو دو دھ لیا گیں شاہد ‏— وہ مرے شہر میں رشوت تمام لیتے ہیں
حسیناؤں کی بیل باٹم کی موٹر کار کی باتیں ‏— میں حیران ہو رہا ہوں اس کے برخوردار کی باتیں

اسی طرح ان کی بعض نظمیں بھی اپنے دامن میں مزاح کے تمام عناصر سمیٹے ہوئے ہیں۔ انداز ملاحظہ ہو۔ ایک بیوٹی پارلر کی کتنی خوبصورت عکاسی کی ہے۔

لب و رخسار و گیسو کا یہ رنگیں کارخانہ ہے ‏— حسیناؤں کا اکثر اس دکاں پر آنا جانا ہے
کوئی اس فکر میں غلطاں کہ رنگت اسکی کالی ہے ‏— مگر اگلے مہینے اس کی شادی ہونے والی ہے
وہ ایک پھیلی ہوئی بیگم کا اتنا سا فسانہ ہے ‏— کہ دکھنے میں ایک جمبو جیٹ جیسے وہ کر بنا تا ہے

ایک اور نظم " رکشے میں " میں انداز کا تیکھا پن ملاحظہ ہو۔

غیر رکشے میں، یار رکشے میں ‏— مشکلیں ہیں ہزار رکشے میں
لطف مزدا کیجئے ساتھ رقیب ‏— اور تیرا خاکسار رکشے میں

فی زمانہ گھر کی تعمیر۔ مسائل کا کیسا پشتارہ ہے۔ اس کی ہلکی سی جھلک سرفراز صاحب کی " کار آشیاں بندی " میں دیکھئے۔

کہاں سے ہم چلے تھے اور کدھر کو جا رہے ہیں ہم ‏— نہ جانے کن سزاؤں کی سزا کیں پا رہے ہیں ہم
بڑی مشکل سے سیمنٹ اینٹ بجری لا رہے ہیں ہم ‏— یقیناً قصۂ فرہاد کو دہرا رہے ہیں ہم
مبارک ہو کہ اب اپنا مکاں بنوا رہے ہیں ہم

سرفراز شاہد کی مزاح نگاری میں موازنہ، مبالغہ، کردار، واقعہ، اسٹائل اور ان کے مخصوص زاویۂ نظر نے مل جل کر ایک نگارخانہ تعمیر کیا ہے۔ لیکن اس نگارخانے کی آرائش و زیبائش میں انہیں عملی مذاق کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور عملی مذاق سے فائدہ نہ اٹھانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کا ذوق مزاح نہایت شستہ اور بلند ہے وہ مزاح کے اس رنگ کے گرویدہ ہیں جو تخریب، عملی مذاق یا لفظی بازی گری کا سہارا نہیں لیتا، بلکہ اپنی وسیع القلبی اور ذہنی کشادگی سے تحریک پاتا ہے۔

ظار حسین (پاکستان)

[illegible]

واپسی

"سو ہے سنگھیو! تب بدھ دیو جی نے آنکھیں کھول کر کہا" ہے بھکشوؤ! یہ پہلی بار نہیں ہے ... آگے بھی ہو چکا ہے ..." بھکشو یہ سن کے ... پوچھنے ... "تتھاگت ایسا پہلے کب ہوا تھا؟"

تب بدھ دیو جی نے ایک جاتک سنایا ... ار ہے کہ بنارس کے سندر نگر کے باہر ایک مرگھٹ تھی جہاں بہت سے کتے رہتے تھے۔ ان میں ایک کتا ان سب ... تھا۔ سب کتے اس کا بہت آدر کرتے تھے۔

ایک دن کی بات ہے کہ بنارس کا راجہ اپنے رتھ میں بیٹھ کے سیر کو نکلا۔ دن بھر سیر کرنے کے بعد شام کو لوٹا۔ چاکروں نے رتھ کا سامان باہر پڑا چھوڑ دیا۔ رات کے ... ہوئی تو ... رات بھیگ گیا۔ اس سامان میں رتھ کے گدے ... جن پہ چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ یہ چمڑا بھیگ ... راج محل کے کتوں نے چمڑے کو گیلا پا کر ... اور کھا گئے۔

دوسرے دن راجہ تک بات پہنچی کہ کتے رتھ کا چمڑا کھا گئے۔ راجہ نے تاؤ کھایا اور منادی کر دی کہ کتے جہاں دکھائی دیں انہیں مار ڈالو۔ بس پھر کیا تھا، بنارس نگری کے کتے مارے جانے لگے۔ یہ سب وہی کتے تھے جو شمشان گھاٹ ... ٹھکانا کرتے تھے۔ جب مرنے کٹنے لگے تو اپنے گرو ... کے

کے اپنی بپتا سنائی اور دہائی دی کہ ہے گرو کیسا انیائے ہے کہ راج محل کے پاپی کتے نگر میں دندناتے پھرتے ہیں اور ہم شمشان ... کے باسی بنا کارن مارے جاتے ہیں۔

گرو نے یہ بات سن راج محل کی راہ لی۔ راجہ کے چاکروں نے اسے بہت دھتکارا۔ مگر اس نے ایک نہ سنی اور سیدھا راجہ کے پاس پہنچا اور کہا "ہے منش جاتی کے راجہ! کتوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے کہ تو ان کی جانوں کا بیری ہو گیا ہے۔"

"انہوں نے میرے رتھ کے گدے کاٹ ڈالے اور اس کا سارا چمڑا چبا گئے۔ سو میں نے ڈونڈی پٹوا دی کہ نگر میں جو کتا دکھائی دے اسے مار ڈالو۔"

"ہے راجہ! کیا یہ حکم راج محل کے کتوں پر بھی لاگو ہوتا ہے؟"

"نہیں، وہ میرے شرن میں ہیں۔"

"کیسا انیائے ہے کہ اپرادھی راجہ کے شرن میں ہے ... دوشی مارے جاتے ہیں۔"

"اے کتے! تو نے یہ کیسے جانا کہ یہ راج محل کے کتوں کا کیا دھرا ہے۔"

"مہاراج! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، اپنے کتوں کو دودھ میں گھی اور گھاس ملا کر پلا دو۔"

راجہ نے ترت دودھ ...

اپنے کرتوں کو پل یا۔ جو کتا وہ دودھ پیتا، پانی لیتا اور چھڑے کے ٹکڑے اگلتا۔ تب راجہ نے شمشان گھاٹ کے کتوں کو معافی دی۔ کتوں کے گرد کوا چھا موقع ہاتھ آیا۔ اس نے راجہ کو بھلائی کی شکشا دی۔ راجہ نے کتے کی سکشا کو گرہ میں باندھا اور اسے اپنی راج نیتی بنایا۔ اور ہے بھکشو! اس سکشا کا اثر ایک لاکھ برس تک رہا۔ لاکھ برس بعد راجاؤں کے لچھن پھر ویسے ہی ہو گئے۔ جیسے پہلے تھے۔

بدھ دیو جی جاتک سن کے چپ ہوئے۔ پھر بولے کہ "سے بھکشوؤ! وہ کتا میں تھا۔"

"تم؟" سب بھکشوؤں نے گھبرا کے پوچھا۔

"ہاں میں، وہ راجہ آنند تھا۔ کتوں کے گروہ میں تھا۔ شمشان گھاٹ کے دوسرے کتے تم تھے۔"

"ہم؟"

"ہاں تم۔ تم نے اپنے کرموں کے کارن آگے چل کے آدمی کا جنم لیا اور — پھر تم میرے سنگھی بنے۔"

"اور راج محل کے کتے؟"

"وہ ... وہ ابھی تک کتے ہیں۔"

اگرسین سے یہ جاتک سن کے سب بھکشو سوچ میں پڑ گئے اور وچار کرنے لگے۔ دیر بعد گوبند نے لمبا ٹھنڈا سانس لیا اور کہا کہ "وہ کیا منگل سمے تھا کہ ہم شمشان گھاٹ کے کتے تھے۔ اور تتھاگت ہمارے سنگ تھے۔ ہمارے ہی کارن تو انہوں نے یہ جنم لیا تھا۔ انہوں نے کیسی جوگی جگائی کہ کتے بھی آدمی بن گئے تھے اور اب ہم آدمی کے جنم میں ہیں۔ آدمی آدمی نہیں رہے۔ باہر آدمی دکھائی پڑتے ہیں، پر اندر سے ......"

"اگرسین! تو نے کیسے جانا کہ آگے بھی ایسا ہو رہا ہے؟"

"مترو! میں نے تتھاگت سے ایسا ہی سنا ہے۔"

اور اگرسین نے ایک جاتک سنائی کہ اس طرح ہے کہ پراس بیتے سمے کی بات ہے۔ جب متھلا پیسن کے راج سنگھاسن پر راجہ جنندا پراجمان تھا اور راج محل میں ہمارے یہ دیو جی کرانگی بدہستو تھے۔ راج کمار کہ روپ براجتے تھے۔ روپ انوپ صورت چندرما ایسی۔ اس کارن انہیں سب محل کے اندر باہر ادیس مکھ کہتے تھے۔ پتا نے انہیں تینوں وید میں یاد کرائیں اور ساری ودیا پڑھا ڈالی۔ پھر ابھی ساتواں برس لگا تھا کہ جنندا نے پران چھوڑے اور بیکنٹھ کو سدھارا۔ راج سنگھاسن پر اب ادیس مکھ کو بیٹھنا تھا پر بہت سے درباریوں کی نیت میں کھوٹ آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ راج کمار ابھی بالی عمر کے ہیں۔ راج کے کام کیسے کریں گے۔

درباریوں میں بھلے لوگ بھی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ راج کمار نے ساتوں ودیائیں پڑھی ہیں۔ پرجا کے چہیتے ہیں۔ راج کرنے کے لیے اور کیا چاہئے۔

کھوٹی نیت والوں نے کہا کہ اچھا یہ بات ہے تو ہم پرکھ کیے لیتے ہیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا ہے۔ وہ ایک بندر کو شالا دوشالے اوڑھا کر اور دو ٹانگوں پر چلا کر ادیس مکھ کے سامنے لائے اور کہا کہ ہے راج کمار! یہ بہت ودوان آدمی ہیں۔ راج کمار وہ یہ راج کاریں بہت سہایتا کریں گے۔ تم انہیں اپنے منتری منڈل میں لے لو۔

بدھستو جی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور کہا کہ مترو! یہ مانس نہیں منو ہے۔ مجھے آدمیوں کی سہایتا چاہئے۔ جہاں بندر منتری بن جائیں وہاں [illegible] کیا ہوگا کہ پرجا دکھی ہوگی، راج چوپٹ ہو جائے گا [illegible]

جمیلہ اختر

آکٹوپس

"مجھے آپ سے محبت ہے۔"

رضوانہ یہ جملہ اگر نعیم کی بجائے کسی اور کے منہ سے سنتی تو دل میں یقیناً خوش ہوتی۔ چاہے بظاہر کتنی ہی خفگی اور ناراضگی کا اظہار کرنا پڑتا مگر نعیم اس کا شاگرد، ساتویں کلاس کا طالب علم عمر بمشکل بارہ تیرہ برس، جس کے چہرے پر داڑھی مونچھ تو در کنار ابھی تک سنہری روئیں بھی نہیں آئے، وہ اس سے محبت کرنے چلا ہے۔ رضوانہ کو اپنے آپ سے شدید ہمدردی اور شرمندگی محسوس ہوئی۔ دیر تک اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

پرنسپل سے شکایت ....

اسی لمحہ رضوانہ کو چند مہینے پہلے کا وہ دن یاد آیا جب وہ پرنسپل کے دفتر میں بڑے ادب و احترام سے بیٹھی تھی۔ اور وہ میز پر جھکے اس کی اسناد کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے یہاں تک کہ ان کی عینک پھسل کر ناک کی نوک پر آ گئی۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا اور تنقید کی نظروں سے رضوانہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"بی بی آپ کی کوالیفکیشن تو ٹھیک ہے لیکن ہم صرف تجربہ کار اسٹاف رکھتے ہیں۔"

"سر آپ مجھے ایک موقع دیں۔ میں تجربہ کار سے بہتر پرفارمنس دوں گی"

پرنسپل صاحب چند لمحے سر کھجاتے رہے۔

"مس رضوانہ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمارا زیادہ تر اسٹاف MALE ہے۔ AND YOU ARE SO YOUNG"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

نادیدہ خدشوں کا یہ سگنل رضوانہ کو ہر وقت محتاط رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود نعیم ....

اس نے پرنسپل کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کیا میں مس فریدہ سے بات کروں۔ مس فریدہ FMALE اسٹاف کی انچارج تھیں۔ ان کا سر چاندی ہو چکا تھا۔

شفقت اور مروت انہیں چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ اسٹاف روم میں بیٹھ کر [illegible] بناتے ہوئے اقوال زریں بولتی رہتی تھیں۔ ان کا پہلا سنہری قول یہ تھا۔

"مرد سانپ سے زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ جب سانپ کے ڈسنے کا انتظار کئے بغیر اسے کچل دیا جاتا ہے تو مرد کے ساتھ رعایت کیوں۔"

بدقسمتی سے مس فریدہ ایک برس کی [illegible]

مرد ہی تصور کرتی تھیں۔"

انہوں نے تیسری کلاس کے ایک بچے کو اس لئے دھکے دے کر اسکول سے نکال دیا تھا کیونکہ اس نے ایک لڑکی کو سزا سے بچانے کے لئے اپنی انگریزی کی کتاب اس کے بستے میں رکھ دی تھی۔

"اور اب نعیم ...." رضوانہ کو خوف سے جھرجھری آگئی۔

مس فریدہ کے علاوہ FEMALE اسٹاف میں چار ٹیچرز اور بھی تھیں۔ چاروں ادھیڑ عمر وہ جب بھی مل بیٹھتیں تو اسکینڈلز پر گفتگو کرتیں یا غیبتیں کر کے دل کی بھڑاس نکالتیں۔ رضوانہ کے ساتھ ان کا رویہ غیر شائستہ تھا۔ اور وہ اپنی کولیگز کے تلخ جملوں کو ان کا کمپلکس سمجھ کر نظرانداز کر دیتی تھی۔ نعیم کے مسئلے پر گفتگو کرنا بدنامی کو دعوت دینا تھا۔

رضوانہ کو نعیم کے والد کا خیال آیا مگر اسی لمحے اسے صنوبر کا قصہ بھی یاد آیا۔ صنوبر ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔ ایک بچی کے پروگریس رپورٹ کے سلسلے میں [illegible]۔ بچی کے والد نے خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اسے محبت نامہ لکھ مارا۔ اور جب مثبت جواب نہ ملا تو اپنی بچی کو اس کے اسکول سے اٹھا لیا۔ اور جگہ جگہ یہ کہنا شروع کر دیا۔

"صنوبر کہتی تھی مجھ سے شادی کر لو اور اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔"

رضوانہ نے یہ خیال بھی ذہن سے جھٹک دیا۔

وہ اپنے گھر میں اس واقعے کا ذکر نہیں کر سکتی تھی، ماں ہر وقت کی بیمار انہیں پہلے کیا کم پریشانیاں ہیں کہ اور پریشان کیا جائے۔

رضوانہ کو محسوس ہوا کہ اسے اس مسئلے پر تنہا ہی نمٹنا ہے۔ اور کسی سے مشورہ کرنا ایسے ہی ہے، جیسے کسی تالاب میں کنکر اچھال دیا جائے۔ پھر دائرہ در دائرہ اٹھنے والی لہروں کو کوئی نہیں روک سکے گا۔

"بیٹے ......" ان چند لمحوں میں سوچ کر خود کو سنبھال چکی تھی۔

"مجھے بیٹا نہ کہیں" نعیم نے احتجاج کیا۔

"میں بیٹا ہی کہوں گی" رضوانہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے نرمی سے سمجھانے لگی تم زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ برس کے ہو گے۔ جبکہ میں اس وقت اٹھائیس برس کی ہوں۔ تم ابھی ساتویں کے طالب علم ہو۔۔ مجھے ایم اے کئے تین سال ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تم میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ بیٹے۔ اچھے بچے اس طرح کی باتیں نہیں کرتے۔ شاباش اب جاؤ۔

"پلیز میرا دل نہ توڑیں نہیں تو میں ......"

اسی لمحے برآمدے کے ایک کونے پر مس فریدہ کا چہرہ دکھائی دیا اور نعیم جملہ ادھورا چھوڑ کر کھسک گیا۔

رضوانہ رات بھر سو نہ سکی۔ وہ نعیم کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس میں یہ بات کہنے کے لئے اتنا ہمت کہاں سے آگیا۔ وہ ایک نارمل طالب علم ہے۔ ہوم ورک باقاعدگی سے کرتا ہے، کلاس ٹیسٹ میں اچھے نمبر لیتا ہے۔ کھیلوں اور تقریبات میں بھی آگے آگے ہوتا ہے۔ ہاں البتہ ہم جولیوں میں بیٹھ کر فلموں اور ٹیلی ویژن کے ڈراموں کا تذکرہ آنکھیں پھیلا کر اور منہ کے زاویے بدل بدل کر کرتا ہے۔ اگر یہ فلموں اور ٹیلی ویژن ڈراموں کا ردعمل ہے۔ تو ساتویں کلاس میں چھ طالبات بھی ہیں۔ پیاری پیاری سی۔ ان کے سوا بھی لڑکیوں کی

کمی نہیں۔ مگر نعیم نے اس کا انتخاب کیوں کیا۔ اس
سوال کا رضوانہ کے ذہن میں کوئی جواب نہیں تھا مگر
دل کے کسی گوشے میں مسرت کا ہلکا سا احساس ضرور
تھا۔ اس رات رضوانہ نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے سے کہیں
زیادہ محتاط طرزِ عمل اختیار کرے گی۔

آنے والے دن اپنے اندر کئی تبدیلیاں لیے
آئے۔ رضوانہ پہلے کلاس میں بچوں کی ننھی منی
شرارتوں کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ مگر اب بری طرح
الجھنے لگتی۔ اب وہ زیادہ تر اپنی نظریں کتاب اور
بلیک بورڈ پر مرکوز رکھتی تھی۔ کیونکہ جب بھی اس کی
نگاہ بچوں پر پڑتی تو نعیم بڑی محویت سے اسے تک رہا ہوتا
تھا۔ نعیم کا یہ انداز اسے کنفیوز کر دیتا۔ اور اس کے لئے
پڑھانا مشکل ہو جاتا۔ پہلے کلاس کے بعد رضوانہ کا وقت
اکثر لان میں گذرتا تھا۔ کبھی وہ ایک پھول کے پاس
جاتی۔ کبھی دوسرے کو چھوتی۔ کبھی خشک پتیوں کو الگ
کرتی۔ اور کبھی ان پر لگی مٹی کو بڑی احتیاط سے جھاڑتی
تھی۔ ایک دن اسی لان میں نعیم نے اس کے پاس آ کر
بڑی جرأت سے کہا تھا۔

"مجھے آپ سے محبت ہے"

اب وہ لان میں جانے کی بجائے دفتر میں مس
زیدہ جیسی بور خاتون کے پاس بیٹھ رہتی۔ اور اس
کے اقوال زریں سنتی یا کوئی کتاب اٹھا کر اسٹاف
روم کے کونے کی نشست سنبھال لیتی۔ اور اپنی کو لیگز
کی باتوں سے کان لپیٹ کر ورق گردانی کرتی۔ اس
دوران میں نعیم بہانے بہانے سے کمرے کے پاس سے
گزرتا اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔

ایک دن رضوانہ نے کمال کا ٹیسٹ لیا۔ جب
اس نے ... تو وہ سن ہو کر رہ گئی۔ اس

نے اپنا پرچہ حل کرنے کے بجائے ہر سطر پر لکھا تھا
"I LOVE YOU"

رضوانہ نے اسے ایک لفظ بھی نہ کہا اور گھر آ کر پیپر
کو آگ دکھا دی۔ چند روز بعد ایک اور واقعہ ظہور میں
آیا۔ کلاس پڑھانے کے بعد وہ اسٹاف روم میں چلی
گئی اپنا رجسٹر اور پرس میز پر رکھا۔ اور منہ دھونے
باتھ روم میں چلی گئی۔ ابھی تک ٹیچرز پڑھا کر نہیں آئی تھیں۔
وہ باتھ سے باہر آئی تو پرس کے ساتھ گلاب کے کئی پھول
رکھے تھے۔ اور دروازے میں نعیم کھڑا مسکرا رہا تھا۔
رضوانہ نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ کھسک گیا تھا۔ رضوانہ
نے غصے میں سارے پھول فرش پر پھینک کر جوتے
سے مسل ڈالے۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد رضوانہ باتھ سے منہ
دھو کر باہر آئی تو نعیم اس کے پرس پر جھکا ہوا تھا۔ آہٹ
پر وہ چونکا اور اسے دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ادھ کھلا
پرس میں سے ایک رقعہ جھانک رہا تھا۔ رضوانہ
نے کپکپاتے ہاتھوں سے اسے کھولا۔ ابھی تک اسٹاف
روم میں کوئی نہیں آیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس
کے باوجود اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اور
رقعہ ہاتھ میں کپکپا رہا تھا۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں
سے اردگرد دیکھتے پڑھنا شروع کیا۔

جانِ من! اگر آپ نے یہی رویہ
یہی رکھا تو میں پاگل ہو جاؤں گا اور
گلیوں میں آپ کا نام پکارنا شروع
کر دوں گا۔ پھر آپ کیا کریں گی۔ پلیز
میری محبت کا جواب محبت سے
دیں۔

نعیم

اسی لمحہ دروازے کے رستے آوازیں اندر آنے لگیں۔ پریڈ ختم ہو گیا تھا اور اس کی کولیگز آ رہی تھی۔ رضوانہ نے جلدی سے خط پرس میں بند کر لیا۔ اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ اس نے بقیہ وقت کی چھٹی لی اور گھر آ کر بستر میں گھس گئی۔

نعیم کی جرأت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی اس کا نتیجہ......... انجانے خدشوں کے ان گنت ریلے اس کے ذہن میں سے ہو کر گذر گئے۔ حتیٰ کہ وہ تھک کر سو گئی۔

ہفتہ بھر کوئی نیا واقعہ نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ نعیم کی نگاہیں ہر جگہ اس کا تعاقب کرتیں۔ اس تعاقب سے اس نے سمجھوتہ کر لیا۔ اور کچھ مطمئن سی ہو گئی۔ کہ رفتہ رفتہ نعیم کے سر سے عشق کا بھوت اتر رہا ہے۔

ہفتے کے اختتام پر پرنسپل نے اپنے بیٹے کی سالگرہ کی مٹھائی اور سارے اسٹاف کو دعوت دی۔ ابھی کیک کاٹا نہیں گیا تھا۔ اور سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ کونے میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ پرنسپل نے فون اسٹینڈ کیا۔ اور رضوانہ کو آواز دی۔

"ہیلو" دوسری جانب سے نعیم بول رہا تھا۔

رضوانہ ایک دم زرد ہو گئی۔ اس نے جلدی سے دیوار کا سہارا لیا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"ہیلو ہیلو" دوسری جانب سے آواز آئی "آپ بولتی کیوں نہیں۔ میں نعیم بول رہا ہوں"

"ہیلو" وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ نے میرے خط کا ابھی تک جواب نہیں دیا۔"

رضوانہ نے رحم طلب نگاہوں سے ارد گرد دیکھا سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور پرنسپل صاحب اس کے قریب کھڑے تھے۔

"میں کل جواب دے دوں گی" رضوانہ نے جلدی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

اگلے روز اسکول جانے کے بجائے اس نے چھٹی کی درخواست بھیج دی۔ سہ پہر کو نعیم اور رشا اس کا حال پوچھنے اس کے گھر آئے۔

"آج میں سارا دن بڑی پریشان رہا" نعیم اسے بتانے لگا۔

"ہوں"

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے"

"بہت خراب۔ بہت ہی خراب، بمشکل بیٹھی ہوں۔" وہ پیچھا چھڑانے کی کوشش میں تھی۔

"آپ آرام کیجئے۔ ہم چلتے ہیں"

"بڑی مہربانی" رضوانہ نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا کہ کہیں وہ دوبارہ نہ بیٹھ جائیں۔

رات کے کھانے پر رضوانہ کے والد نعیم اور رشا کی تعریفیں کرنے لگے

"بہت اچھے بچے ہیں۔ تم ذرا بیمار ہوئیں تو حال پوچھنے آ گئے۔ ورنہ آج کل کے بچے توبہ توبہ"

رضوانہ چپ رہی۔

"یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔ تمہیں اس اسکول میں جگہ مل گئی ہے۔ جہاں اتنا اچھا ماحول ہے۔ اتنے مہذب بچے ہیں........."

"ابو" رضوانہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "میں یہ سروس چھوڑنا چاہتی ہوں"

"اچھا بیٹا، جیسے تمہاری مرضی" ان کا اندازہ اتنا شکستہ تھا کہ رضوانہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی۔

اس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ وہ اپنی چار بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ دو سال پہلے والد پنشن پر گھر آ گئے تھے۔ انہیں جو گریجویٹی ملی، وہ انہوں نے کاروبار کے لئے ایک دوست کے سپرد کر دی۔ جو اسے لے کر رفوچکر ہو گیا۔ وہ دن بڑی تنگ دستی اور عسرت کے تھے۔ جو انہوں نے قلیل پنشن پر گذارے۔ جب رضوانہ کو سروس ملی تو گھر کے حالات میں خوشگوار تبدیلیاں آ گئیں۔ اسی لئے اس کے والد آرام کہتے رہتے تھے۔

رضوانہ نے اگلے ہی لمحہ اپنا فیصلہ بدل لیا میں سروس نہیں چھوڑوں گی۔ اور کوئی ڈھونڈ رہی تھی۔

پھر حل بھی اس کے ذہن میں آ گیا۔ اور شاہد اس اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکنے لگا۔

اگلے روز رضوانہ نے شاہد کو بلایا۔

"دیکھو تم نعیم کے دوست ہو کلاس فیلو ہو۔ اکثر اکٹھے رہتے ہو۔ جو حرکت وہ کر رہا ہے۔ تم اس سے بھی باخبر ہو گے۔ کس قدر بری حرکت ہے یہ تم اسے سمجھاؤ......."

وہ بہت دیر تک اسے سمجھاتی رہی۔

"مس آپ فکر نہ کریں۔ یا تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یا مجھ سے ہڈی پسلی تڑوا لے گا" شاہد نے جوش سے کہا اور رخصت ہو گیا۔ اور رضوانہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

اگلے روز نعیم اسکول نہیں آیا۔ رضوانہ دن بھر بے چینی میں مبتلا رہی۔ نعیم اس کے تصور سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اس نے ضبط کی بہت کوشش کی مگر شاہد سے پوچھنا ہی پڑا۔

"میں نے اس کا دماغ درست کر دیا ہے۔" وہ غصے میں تھا۔

تیسرے دن نعیم اسکول آیا تو رضوانہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا نعیم خیریت تو ہے۔" اس کے لہجے میں بے پناہ پیار سمٹ آیا تھا۔

"کچھ نہیں" وہ لاپرواہی سے بولا۔ "ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔"

"مجھ سے چھپاتے ہو۔" رضوانہ نے پیار سے ڈانٹا۔

"میں آپ سے نہیں بولتا آپ بڑی ظالم ہیں۔" اس نے منہ پھلا لیا

"بیٹے میری بات سنو۔" رضوانہ اسے سمجھانا چاہتی تھی لیکن وہ رکا نہیں چلا گیا۔

اسی روز سہ پہر کو چھٹی ہونے پر رضوانہ گھر جانے کے لئے باہر نکلی تو الیمنٹری باڑ کی دوسری جانب سے آنے والی آوازوں سے اس کے قدم رک گئے۔ شاہد نعیم سے کہہ رہا تھا۔

"اگر تم نے مس رضوانہ سے ملنے کی کوشش کی تو میں تمہاری ٹانگ توڑ دوں گا۔ وہ تم سے نفرت کرتی ہیں لیکن مجھ سے محبت۔ اب مجھے بھی ان سے محبت ہو گئی ہے۔ اس لئے میرے رستے کی دیوار مت بنو۔"

تحریر: آغا سلیم

ترجمہ: کرن سنگھ

آہنگ لگیا

قہقہہ

کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے اور اس کا نام کیا ہے، سب اس کو کالی کے نام سے پکارتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کالی بھی حد سے زیادہ جیسے توے کی پیٹھ پھر ناک نقشہ بھی اچھا نہ تھا۔ موٹے اور رکھلے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پھولے ہوئے نتھنے پیشانی پر [illegible] ہونے کی وجہ سے پیشانی بھی چھوٹی ہوگئی تھی، اس کو گھر میں ہر کوئی دھتکارتا [illegible] اٹھتے بیٹھتے لعن طعن ہوتی لیکن وہ [illegible] خاموش [illegible] رہتی۔ جیسے اس نے بولنا سیکھا ہی نہ ہو۔ جیسے اس میں احساسات ہی نہ ہوں۔ جیسے ریل کا وہ کالا انجن تھی جو زندگی کی پٹریوں پر چل رہی تھی۔ وہ ہمیشہ گہرے رنگ کے کپڑے پہنتی تھی، قمیص میں اس کا کالا رنگ چمکتا نظر آتا تھا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتی۔ تب بھی اس کے ہونٹوں کی کالاہٹ نظر آتی تھی، پتہ نہیں کیوں اس کو تیز خوشبو بہت پسند تھی اور میٹھا سر بھی بہت تیز اچھی لگتی تھی۔ اس کو اپنی خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے اور اس کے ماں باپ کون ہیں۔ ہاں صرف اتنا پتہ تھا کہ میرا نام کالی ہے۔

اس کو وحید کی ماں نے بتایا تھا کہ وہ جب چھوٹی سی تھی تب ایک دن روتی روتی اس کے گھر چلی آئی تھی۔ اور وحید کی ماں کو اس کی روتی ہوئی صورت پر رحم آگیا اور اس نے کالی کو پیار کر کے اس سے اس کے ماں باپ کا پتہ پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا صرف آنسو بہاتی رہی اور وحید کی ماں کو دیکھتی رہی۔

وحید کی ماں نے کالی کے ماں باپ اور عزیز و اقارب کی بہت تلاش کی مگر جب کوئی وارث نہ ملا اس نے اپنے ہی گھر میں اسے رکھ لیا۔ بچپن سے لے کر وحید اور وحید کی ماں کے علاوہ گھر کے تمام افراد اس کو دھتکارتے تھے۔ وحید کی چھوٹی بہن تو اس کو اٹھتے بیٹھتے چونٹیاں بھرتی، اس کے بال نوچتی تھی اور پھر جب اس کی شادی ہوئی تب جا کر کہیں کالی کی جان چھوٹی لیکن اب بھی وہ اپنے میکے آتی تو کسی نہ کسی بہانے کالی کو ایسا مارتی کہ اس کا انگ انگ درد کرنے لگتا تھا۔

وحید اور کالی تقریباً دونوں ہی ہم عمر تھے۔ بلکہ وحید ایک دو سال بڑا ہی ہوگا۔ بچپن میں وحید کو کالی سے بہت پیار تھا۔ سارا دن کالی کے ساتھ کھیلتا تھا۔

لیکن پھر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا وہ کالی سے باتیں کم کرتا گیا۔ اور کالی بھی خاموشی سے اپنا وقت گذارتی رہی وہ دن بھر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی

اور اکثر رات گئے تک اسے کام کرنا پڑتا اور رات کو جب وہ اکثر تھک ہار کر اپنے کمرے میں بستر پر آ کر لیٹتی تو اس کو اس کا سارا جسم کانپتا ہوا محسوس ہوتا تھا جو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا اور وہ سوچتی تھی کہ کاش ایک مرتبہ وحید اس کے سینے میں پڑے ہوئے بارود کو سرخی لگائے اور وہ بارود پھٹ جائے اور اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

ایک دن کالی نے سنا کہ وحید پڑھنے کے لئے کالج جا رہا ہے۔ اس دن کالی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ چارپائی پر الٹی پڑی روتی رہی۔ اس کو خبر نہ تھی کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے کیونکہ وہ پڑھی لکھی نہ تھی۔ جو افسانوں اور ناولوں سے محبت کی معلومات حاصل کر سکتی اور نہ ہی اس نے کوئی فلم دیکھی تھی۔ اس کو صرف اتنی خبر تھی کہ اس کے دل میں ایک عجیب کشمکش ہو رہی ہے کوئی اس کے دل کو چھری سے چاک کر رہا ہو۔ جس طرح وہ مچھلی اور پلے کو چاک کیا کرتی تھی۔

ایک سال بعد جب وحید چھٹیاں گزارنے گھر آیا تو کالی کے انگ انگ سے خوشیوں کے الاپ نکلنے لگے۔ اس کے جسم کا انگ انگ ہوا میں اڑنے لگا اور اس کے دل میں عجیب و غریب جذبات مچلنے لگے۔ وہ دن بھر اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں کوئی اس کے اندر میں مچلنے والے جذبوں کے رد عمل کو اس کے چہرے سے سمجھ نہ لے۔ وہ پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے سرہانے کو چھاتی سے لگا کر چارپائی پر کروٹیں بدلتی رہی۔ ساری رات وہ عجیب ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔ کبھی وہ دیکھتی تھی کہ وہ کسی لمبے بانس کی چوٹی پر بیٹھی اوپر ہوا میں جھول رہی ہے اور زمین پر گر کر کوئی زور سے چلا رہی ہے اور کبھی وہ دیکھتی تھی کہ اس کے ارد گرد کالے سانپ پھن نکالے ہوئے اس کے جسم پر گھوم رہے ہیں۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا پورا جسم درد کر رہا تھا۔ وہ صبح سویرے نہائی اور لال جوڑا پہنا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک اور پورے جسم پر تیز مہکتی ہوئی خوشبو لگائی۔ اس کے بعد اس نے چائے تیار کی۔ گھر کے تمام افراد کو چائے پلانے کے بعد اس نے بڑے اہتمام سے وحید کے لئے چائے بنائی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وحید چائے میں شکر کم پیتا ہے اس نے وحید کی چائے میں شکر زیادہ ڈالی۔ اور چائے کا کپ لے کر وحید کے کمرے میں گئی اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جب وہ وحید کے پلنگ کے قریب کھڑی ہوئی تو چپ چاپ وحید کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں وحید کتنا خوب صورت اور کڑیل جوان ہو گیا تھا۔ اس نے دل تھام کر وحید سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی کالی کالی بدصورت انگلیوں سے وحید کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ وحید نے آنکھیں اٹھا کر کالی کی طرف دیکھا۔ اور پھر ایک دم آنکھیں بند کر لیں۔ "تجھے کس نے کہا تھا کہ صبح صبح آ کر اپنی منحوس شکل دکھا۔ صبح ہی صبح تیری شکل دیکھی ہے۔ پتہ نہیں آج روٹی بھی نصیب ہو گی کہ نہیں۔"

کالی کو جیسے کسی نے ساتویں آسمان سے دھکا دے کر نیچے زمین پر پھینک دیا ہو۔ اس کے اندر مچلتا ہوا بگولہ ایک دم ختم ہو گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن کسی کارخانے کی مشین کی طرح تیز تر چلنے لگی۔ اس کے دل میں محبت کی جلتی ہوئی بھٹی پر پانی کے مٹکے ڈال دیے ہوں۔ وہ چپ کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور

آئینے میں اپنے کالے کالے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پھیلے ہوئے ناک اور اپنی کالی رنگت کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کالی نہ ہوتی تو اس کا نقشہ اتنا خراب نہ لگتا۔ اس کے دل میں آیا کہ باورچی خانہ میں پڑے ہوئے بغیر نوک کے چاقو جس سے وہ گوشت سبزی وغیرہ کاٹتی تھی۔ اس سے اپنے چہرے سے ساری کالاہٹ کو چھیل کر پھینک دے تاکہ اندر سے زندہ خون کی طرح لال لال رنگ نکل آئے۔ اس دن کے بعد کالی نے لال کپڑے پہننا، لپ اسٹک اور خوشبو لگانا بالکل چھوڑ دیا۔ لیکن پھر جب وحید کی شادی ہوئی تو اس نے اسی دن اپنا لال جوڑا پہنا، لپ اسٹک اور خوشبو لگا کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے لگی۔ کئی دن سے اس نے بالوں میں کنگھی نہ کی تھی۔ لپ اسٹک نہیں لگائی تھی۔ لال جوڑا نہیں پہنا تھا۔ اور اب اپنی سنگھار کی ہوئی صورت اور لال جوڑے کو دیکھ کر وہ اپنے آپ کو دلہن تصور کرنے لگی۔ اس کے کانوں میں شہنائی کی آواز گونجنے لگی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آنسو بہہ کر کالے کالے گالوں پر پھیلنے لگے۔

وحید کی دلہن عائشہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ جیسے کوہ قاف کی پری۔ اس کا رنگ دودھ کی طرح صاف تھا۔ جیسے اس کی رگوں میں لال خون کی بجائے سفید دودھ گردش کر رہا ہو۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی نیک اور سلجھی ہوئی بھی تھی۔ عائشہ کو دیکھ کر کالی کو اپنا رنگ اور کالا لگتا تھا۔ عائشہ کالی کو بہت چاہتی تھی۔ اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔ اور بڑے پیار سے پیش آتی تھی۔ گھر کا کوئی فرد کالی پر ناراض ہوتا تو وہ اس کی طرفداری کرتا۔ کالی کو سزا ملتی

زندگی بھی ملتی رہی تھی۔ اب پیار کے دو میٹھے بولوں نے کالی کی زندگی کو بدل دیا۔ اس کا دل کھل گیا۔ جیسے کسی اجل سے پیاسے کو ایک دم امرت مل جائے۔ جب وحید گھر پر نہیں ہوتا تو عائشہ رات کو دیر تک کالی سے وحید کی باتیں بتاتی۔ زور دیتے دیتے جب کالی کے کالے اور بدصورت ہاتھ عائشہ کے نرم اور ملائم رانوں پر پہنچتے تو کالی کو ایسا محسوس ہوتا جیسے کالی وہ نہیں ہے بلکہ اور کوئی کالی ہے اور اس کے جذبات کے دھارے الٹے بہنا شروع ہوتے تھے۔ ڈھلوان سے اونچائی کی طرف، سمندر سے پہاڑوں کی طرف۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ عائشہ کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے پکڑ کر نچوڑے جیسے وہ شکنجے میں نیبو کو نچوڑتی ہے، لیکن پھر وہی کالی ہو جاتی۔ جس کے اندر جوانی کی ادھوری امنگیں نیم بسمل کئے ہوئے پرندے کی طرح تڑپتی اور پھڑپھڑاتی تھیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کے بدن کو اپنے سخت مضبوط ہاتھوں سے گوندھے۔ جس طرح وہ آٹا گوندھتی ہے۔ اس کی تھکن ایک مرتبہ عروج پر پہنچ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ ایک مرتبہ صرف اس کے سینے میں پڑے ہوئے بارود کو آگ لگ جائے۔ اور اس کا سارا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

ایک رات کالی عائشہ کو دبا رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی۔ سردیوں کی رات تھی۔ سردیوں کی رات باہر بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ کالی نے کمرے کو گرم کرنے کے لئے سگھڑی جلا کر عائشہ کے قریب رکھی۔ باتیں کرتے کرتے عائشہ کو نیند آ گئی۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے اور ایسے ہی سو گئی۔ کالی بھی آہستہ سے اٹھ کر عائشہ کو اچھی طرح رضائی اوڑھا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

رات کو پتہ نہیں کس وقت عائشہ نے کروٹ

لی اور اس کے گلے میں پڑا ہوا نائیلون کا دوپٹہ کا ایک سرا سگڑی میں گر گیا۔ آگ نے ایک دم عائشہ کو گھیر لیا۔ وہ ایک دم چونک اٹھی اور جلتے ہوئے کپڑے سمیت چلاتی ہوئی باہر بھاگی۔ جب تک گھر کے افراد پہنچے تب تک اس کا نازک اور حسین بدن آگ سے جھلس گیا اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔ گھر کے تمام افراد نے مل کر آگ بجھائی اور ایک دم ہسپتال پہنچایا گیا۔

اس واقعے کا اثر یوں تو سارے گھر پر پڑا لیکن کالی تو بالکل پاگل ہو گئی۔ بے وقوفوں کی طرح ہر ایک کو گھور گھور کر دیکھتی اور ہر ایک سے عائشہ کا پوچھتی۔ بیٹھے بیٹھے چلانے لگتی۔ پھر اس نے وحید کی ماں سے منت کی کہ ایک دفعہ عائشہ سے ملایا جائے۔ ایک دن وحید کی ماں اس کو ہسپتال لے گئی۔ عائشہ کا سارا جسم سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف منہ اور ناک کے نتھنے کھلے ہوئے تھے۔ عائشہ کو دیکھ کر کالی کو کفن لپٹا ہوا مردہ یاد آ گیا جس کو قبر میں اتارنے کے لئے آدمی کھڑے ہوں۔ کالی چیخ کر عائشہ کی طرف بھاگی مگر وحید کی ماں نے اس کو پکڑ لیا۔ عائشہ نے کالی کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ عائشہ نے اس کو دلاسہ دیا کہ صرف جسم پر دو تین زخم آ گئے ہیں جو بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور پھر وہ گھر آ جائے گی۔ ہوا بھی ایسا ہی کچھ دنوں کے بعد اس نے سنا کہ عائشہ ٹھیک ہو گئی ہے اور اب وہ گھر آ رہی ہے اس دن کالی خوشی سے سما نہیں رہی تھی۔ اس نے سارے گھر کو صاف کیا اور اچھی طرح سجایا وہ بہت خوش تھی اس نے دیکھا کہ اس کے علاوہ گھر کا کوئی فرد خوش نہیں ہے۔ ہر ایک کے چہرے پر ایک... پر اسرار خاموشی چھائی ہوئی ہے۔

گھر کا سارا کام کاج کر کے وہ عائشہ کے کمرے میں آکر بیٹھ گئی اور عائشہ کا انتظار کرنے لگی [illegible] کو گھر کے دوسرے افراد عائشہ کو لے کر آ گئے [illegible] کو اس طرف سے وحید کی ماں نے پکڑے [illegible] اور دوسری طرف سے وحید نے۔ عائشہ کو دیکھ کر کالی ایک دم کود کر عائشہ کی طرف بڑھی۔ لیکن پھر ایک دم رک گئی اور ٹک ٹکی لگا کر عائشہ کو دیکھنے لگی۔ عائشہ کی سا[ری] خوب صورتی جل گئی تھی۔ اس کے سر کے بال اور پلکیں بھی جل گئیں تھیں۔ اس کے چہرے پر کالے اور سفید داغ عجیب ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ ایسے جیسے مسان سے کوئی مردہ جلتی ہوئی چتا سے اٹھ کر آیا ہو۔ کا[لی] ایک ٹک ہو کر عائشہ کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ پاگلوں کی [طرح] کونے میں پڑی ہوئی ڈرائینگ روم کے آئینے میں [کھڑی] ہوئی اپنے موٹے موٹے کالے ہونٹوں، چپٹی [ناک] پھیلے ہوئے نتھنے اور توے کی پیٹھ جیسے کالے رنگ کو [دیکھنے] لگی۔ اس نے پھر عائشہ کے ڈراؤنے چہرے کی طرف [دیکھا] اور پھر وحید کی طرف دیکھا۔ اور پھر قہقہہ لگایا۔ زوردار قہقہہ۔ جیسے اس نے اپنے جسم کی پوری طاقت سے قہقہہ لگایا ہو۔ جیسے اس کے سینے میں پڑے ہوئے بارود کو کسی نے آگ لگا دی ہو اور اس کا سارا وجود کانپ گیا ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح قہقہہ لگاتے ہوئے باہر نکل گئی۔ عائشہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ وحید نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے عائشہ کو آرام سے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا "شاید عائشہ کے غم میں بے چاری پاگل ہو گئی ہے۔"

اسلم ملک

درندہ

رات کا ہولناک منظر!

سارے شہر پر موت کا سناٹا طاری تھا۔ ہر طرف قتل و غارت گری کے بعد اب کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ شہر کی ہر گلی کوچوں میں ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ جگہ جگہ انسانوں کی بستیاں اب راکھ کا ڈھیر ہو چکی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے دکانوں سے اب بھی شعلے اور دھوئیں بلند ہو رہے تھے۔

شہر کے دو بڑے فرقوں کے درمیان فساد ہو گیا تھا۔ کوئی بھی فرد فساد کا سبب نہیں جاننا چاہتا تھا۔ اور جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ دلوں میں جب نفرت پیدا ہو جاتی ہے تو لڑائی جھگڑے، قتل و خون کے لئے وجہ کی ضرورت نہیں۔ بلا وجہ بھی قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا جا سکتا ہے۔

موسم کی طرح اب قتل و غارت گری کا موسم بھی ہر سال آتا ہے۔ اور بہت سے انسان نما درندے ایسے موسم کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

ایسے ہی درندوں میں وہ ایک بڑا درندہ تھا۔ اس نے بھی قتل و غارت گری کے موسم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوٹ کا مال کافی مقدار میں اپنے گھر میں اکٹھا کر لیا تھا اور اب اسے مزید مال کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ

اب کسی خوب صورت کلی کی تلاش میں بھٹک رہا
نے سن رکھا تھا کہ دوسرے فرقے کی لڑکیاں بہت
اور شرم و حیا کی پیکر ہوا کرتی ہیں۔ ایسے بھی ہر آ
کے جسم کا جو حصہ کپڑے وغیرہ سے ہمیشہ ڈھکا رہتا ہے
دوسرے حصے سے زیادہ صاف اور چکنا ہوتا
اجڑی ہوئی اس بستی میں لاشوں کے
گزرتا ہوا یہ درندہ گھروں کی تلاشی لے رہا تھا

اسے ایک گھر سے کھٹ ...... کھٹ ......
سنائی دی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ آ
والے گھر سے آ رہی تھی۔ وہ اس گھر میں داخل
حویلی نما پرانے طرز کا مکان تھا۔ بیچ میں آنگن
طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ آنگن سے
ایک کمرے میں گھستا اور جائزہ لیتا۔ جگہ جگہ
جلی ہوئی تھیں۔ پلاسٹر اکھڑ چکے تھے۔ پلنگ
راکھ ہو چکی تھیں۔

ایک کمرے میں گھستے ہی اسے بالکل
گھڑے کے پاس ایک معصوم سی لڑکی نظر آئی
چودہ پندرہ برس کی ہو گی۔ بال بکھرے ہوئے
کرب و الم جھلک رہا تھا۔ شاید وہ پیاس
ہو کر پانی کی تلاش میں گھر کے اندر بھٹک ر

بقیہ ص ۲۲

لیکن میں نے ان کو کبھی کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ اور پھر ——!

اس بوڑھے سنیاسی کی جگہ بھی تو نہیں بدلی تھی۔ وہ برسوں سے اسی طرح کی پرانی سی چوکھٹ پر اسی طرح بیٹھا نظر آرہا تھا۔ یہ بھی کسی کو نہیں معلوم —— کہ وہ کیا کھاتا ہے۔

اس کا آگے پیچھے کوئی پرسانِ حال تھا کہ نہیں —— کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ شخص دنیا میں کب آیا اور کیوں سنیاسی بن بیٹھا۔؟

گاؤں کا ہر شخص یہی جانتا تھا کہ یہ بوڑھا سنیاسی ہے اور اس کی جبیں کی ہر تیوری میں ایک ایک صدی کی اجڑتی جوانی کی داستان مخفی ہے۔ اس کے ماتھے پر کتنی تیوریاں تھیں۔ کوئی یہ گننے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کی خواب ناک آنکھوں میں ایسی چمک تھی جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن یہ ضرور ہی کہا جا سکتا ہے کہ بہرحال وہ پراسرار آنکھیں دراصل اس کی زندگی کی علامت تھیں —!

ہاں تو میں بات کرتے کرتے سنیاسی بابا کے گرد لپٹے ہوئے ورق کھولنے بیٹھ گئی۔

وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ شاید موسموں کی بدلتی تیوریوں کا ذکر تھا، یا شاید بارش کا بھی —! اور پھر بانجھ دھرتی کے المیے پر وہ بلبلا اٹھا تھا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ آنکھوں میں چھپا کر بیٹھ گیا۔ میرا تجسس کچھ اور بڑھنے لگا تھا۔ میں نے دانتوں میں انگلی دبا کر کچھ دیر غیر ارادی طور پر بوڑھے سنیاسی کو غور سے دیکھا۔ اور پھر جانے کیوں بے اختیار ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے دروازے کے سامنے راستہ چلنے والوں کے قدموں کی چاپ [illegible] تھی۔ میں نے پل بھر کو سوچا کاش یہ چاپ بلند ہو جائے۔ تاکہ اس بدبودار تنگ اور تاریک کوٹھری میں موت کا سناٹا شکست کھا جائے یا تاریکی ایک بار پھر سانس لینے لگے۔ لیکن انسان کی خواہش کے سامنے کبھی کائنات نے اپنے اصول توڑے ہیں —؟

پھر یہ خواہش تھی بھی تو احمقانہ —!

اب میرا دل گھبرانے لگا —— سنیاسی بابا کو اس حالت میں بیٹھے کئی گھنٹے گزر گئے۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں خود سنیاسی تو نہ تھی لیکن کئی برسوں سے اس بوڑھے سنیاسی کے سامنے بیٹھ کر خاصی سنیاسی ہو گئی تھی۔

میں تاریک اور بدبودار سرائے میں تو نہیں رہتی تھی لیکن شہر کو جانے والی گاؤں کے مغربی حصے کو کاٹتے ہوئے اور شمالی مشرقی حصے کی طرف خم لیتی ہوئی سڑک کے بالکل بائیں جانب قبرستان سے ملحقہ زمین کے بے آب و گیاہ چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک کچی کوٹھری میں رہتی تھی۔ میرے آس پاس بھی کوئی نہیں رہتا تھا۔ خاموش فضا میں چیختی چلاتی اور کبھی گنگناتی ہوا میری تنہائیوں کے ساتھ تھی۔ میں کچھ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے بوڑھے سنیاسی کی باتیں بھی سن لی تھیں۔

میرا دل لرزنے لگا۔

اُف خدایا — تو کیا ایسا ہونے والا ہے —؟

یہ خیال آتے ہی مجھے اپنے چاروں طرف قہقہوں کی گونج سنائی دی۔ جیسے وہ میرا تمسخر اڑا رہے ہوں۔ کسی کی آواز تھی —— تو تم واقعی اس دنیا میں رہتے ہو —؟"

"کیا اس خطے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔؟"

اگر ہے تو تمہیں یہ معلوم نہیں کہ بوڑھے سنیاسی کی ایک ایک بات تمہیں آئینہ دکھا رہی ہے —؟

میں نے گھبرا کر اپنے بائیں طرف دیکھا۔ پھر [illegible] دائیں

طرف ابلنے لگا ــــ !

کئی ایک مشترکہ آوازوں نے مجھ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ تم نے اپنے شمالی سرحدوں کی طرف نظر دوڑائی ہے۔ وہاں تمہیں سیاہ بادلوں کے منہ پھاڑے سرخ جبڑے نظر نہیں آئے۔ جن کے کونوں سے لہو ٹپک رہا ہے۔

میں نے خوف سے جھرجھری لی۔

اس کیفیت پر ایک قہقہہ اور بلند ہوا۔ "ابھی کیا ہے۔ ابھی سنو! ہمت اور صبر سے سنو ــ !"

تمہیں بھوک سے بلبلاتے بچوں کی چیخیں سنائی نہیں دیتیں۔ ان شیر خوار بچوں کے پھڑ پھڑاتے ہونٹوں کی لرزش تمہیں نظر نہیں آتی۔ جو اپنی ماؤں کے خالی سینے کو ٹٹولتے ہیں۔ مگر ان معصوم بچوں کو یہ کون بتائے کہ ان کی ماؤں کی چھاتیاں تو ظالموں نے کاٹ کر دو پھینک دی ہیں۔ تاکہ شیر خوار بچوں کے منہ میں دودھ کی ایک بوند بھی نہ جا سکے۔

میں آوازوں کے تعاقب میں بے خود ہو کر چلتی گئی۔ اور پھر وہیں پہنچ گئی۔ جہاں لاکھوں انسان کھلے آسمان کے نیچے اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر تھے۔ ان میں معصوم بچوں کی گولہ بارود میں ڈوبتی کلکاریاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے پل بھر کو احساس ہوا کہ انسان بہت وحشی ہے۔ مگر قدرت بھی اپنی جگہ اٹل ہے۔

[illegible] کی جھلسا دینے والی لو ہو یا گولیوں کی چلچلاہٹ [illegible] بچے کی معصومیت اپنی جگہ اٹل ــ اور قدرت کی [illegible] انسان کے وحشی پن کو بچے کی معصوم کلکاریوں [illegible] سے دوچار کرتی ہے لیکن انسان اتنا [illegible] ہے کہ وہ اپنی [illegible] کو اپنی [illegible]

میں نے نوجوان کنواریوں کی کوکھ سے [illegible] بھی دیکھا۔ جسے ظالموں نے اپنے [illegible] ہونے کی علامت کے طور پر سمجھایا۔ [illegible] اور چیخوں نے ان کے ذہنوں اور [illegible] نہیں کیا۔

میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ لاکھوں لوگوں کے پیٹ بھوک سے سوکھ کر ہڈیوں کے ساتھ چپک گئے تھے۔ ان کے منہ میں مکئی اور گندم کے دانوں کی جگہ پستولوں اور بندوقوں کی گولیاں جاتی تھیں۔ پانی کی جگہ ان کی آنکھوں سے ابلتا لہو ان کے گلے تر کرتا تھا۔ اور نتھنوں میں تازہ ہوا کے بجائے گولے بارود اور انسانی جانوں کی بلکتی چیخوں سے [illegible] ان کے پھیپھڑوں میں اتری جا رہی تھی۔ مگر ان کی آنکھیں ــ !

جانے کیوں ــ ! مجھے ان کی آنکھیں دیکھ کر سنیاسی بابا کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ جو ان کی ہڈیوں کے ڈھانچے پر لٹکی مرجھائی ہوئی کھال پر زندگی کی [illegible] کے طور پر نمایاں تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے [illegible] اپنے مذہب اور عقیدے کے اعتبار سے [illegible] ہیں۔ اور ان کے چہرے پر عکس ہے [illegible] ہلکی سی رمق لئے یہ آنکھیں شاید دور کہیں گرد و غبار اور گولے بارود کے بادلوں کے اس پار یہ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کہ آزادی کی پو پھٹے گی ــ !

کھلے آسمان کے نیچے کا اس [illegible] کب ابھرے گی۔ جسے وہ [illegible] گے۔ اور ان کے اپنے مردوں کی جہاد پکار [illegible] سے [illegible] کی [illegible] ایک دھرتی کے سینے پر [illegible] گیا۔

ان ملک (پاکستان)

پالن ہار

اب وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کے تمام دانت جھڑ چکے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا اور کمر دوہری ہو چلی تھی۔ اس کی پونجی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ اور رات [illegible] فکرمند رہنے لگا تھا۔ اسے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جیل جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ لیکن [illegible] وہ اپنی گھر والی کا خیال کرتا تو اسے یہ راستہ بھی مسدود [illegible] نظر لگتا۔

ایک روز وہ اپنے بڑھاپے کی ادھ کچی نیند [illegible] سویا ہوا تھا کہ اس کے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے اس کے گھر کی دیوار میں نقب لگائی جا رہی ہے۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور بے آواز قدموں سے اس طرف بڑھا جہاں سے وہ آواز آ رہی تھی۔

وہ خاموشی سے ایک طرف ہٹ گیا، تھوڑی دیر بعد دیوار کی ایک اینٹ گری، پھر دوسری، اور تھوڑی ہی دیر میں ایک بڑے سوراخ سے ایک چور اندر آ گیا اور اس بوڑھے کو سامنے پا کر بری طرح ٹھٹک گیا۔

بوڑھے نے بڑی شفقت سے اس نوجوان کا کندھا پر ہاتھ رکھا اور بولا "تم بہت ہی ناتجربہ کار معلوم ہوتے ہو۔"

اس نحیف و نزار بوڑھے کے نہایت [illegible] انداز سے حیران، وہ نوجوان سر نہوڑائے وہیں کھڑا رہا۔

بوڑھے نے پوچھا، "تمہارے ماں باپ ہیں؟"

وہ نوجوان خاموش رہا اور نہایت نادم ہو کے بجھی آواز میں بولا "ماں باپ ہوتے تو یہ کام کاہے کو کرتا؟"

"پیٹ بڑی مجبوری ہوتی ہے بیٹے" بوڑھے نے کچے صحن کی مٹی گیلی کر کے اس سوراخ میں اینٹیں جوڑتے ہوئے کہا "اور بھوک بڑی نامراد چیز ہے"

تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی، اور پھر وہ نوجوان اس کے ساتھ اینٹیں جوڑنے میں لگ گیا۔

سوراخ بند ہو چکا تو بوڑھے نے [illegible] آ جاؤ، تم سے ایک بات کرنی ہے۔" یہ کہہ کر بوڑھا اپنی کھاٹ پر آ لیٹا اور کہنے لگا۔ "بیٹے تمام عمر چوری کرتا رہا ہوں، اور ایک بار بھی جیل نہیں گیا، اب [illegible] تیشہ بھی اٹھایا نہیں جاتا" اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی داستانِ حیات شروع کر دی۔ اور [illegible] کمالات اور سنسنی خیز واقعات سنا کے [illegible] سنانے میں آ گیا۔

احسان دانش

اشاعتوں سے احسانِ خوش بیاں کہیے
وہ جس کو شاہدِ معنیٰ کا رازداں کہیے

سجی تھی لفظ و معانی کی کہکشاں جس پر
زمینِ شعر پہ اِک ایسا آسماں کہیے

خیال و فکر و نظر کی لطافتوں کا امیں
قلم کی عِفّت و عظمت کا پاسباں کہیے

ورق ورق تھا بعنوانِ زندگی جس کا
کتابِ عزم و عمل کی وہ داستاں کہیے

تھا وہ غیرت و قناعت کا ایک پیکر تھا
خلوص و مہر و مروّت کا اِک جہاں کہیے

ادب کے منبر و محراب کا جلال و جمال
منارِ علم سے اِک گونجتی اذاں کہیے

[illegible] نغز و دل کش نقیبِ فطرت کا
حضورِ سرورِ عالم کا مدح خواں کہیے

وہ نظم و نثر میں یکساں کمال رکھتا تھا
ادیب و شاعر و نقّاد نکتہ داں کہیے

تھا رہروانِ ادب کے لئے گھنا برگد
تو کیوں نہ رازؔ اسے فن کا سائباں کہیے

طلعت زاہدی

جینا کب تک

ڈال ڈال لہرانا
رنگ برنگے پھولوں کے جھرمٹ سے
اُڑ کر آسمان کی نیلاہٹ کو پانا
لوٹ کے ہریالی تک آنا
مست بہار کے نغمے گانا
مدھر امنگ کے جھرنوں میں
برسات کا جشن منانا
جس کے بس سے باہر
جس چڑیا کے پنکھ کٹے ہوں
موسم کا ہر جادو جس کے
لمس کو ترسے
ایک ہی اس کی آس
کہ، آنکھیں بند کرے وہ
اور دھرتی کے رنگوں میں رنگ جانے کا
یہ سپنا تو نے ......
بے لذت، بے راحت جینا آخر کب تک!

حسین بانو

آہنگ لیا ۳

تین نظمیں

کانٹے

تم بن میرے من میں کانٹے یوں چبھتے ہیں
جیسے میری ہرنی جیسی ان آنکھوں میں
تم سے پیارا سوہنا ساتھی
چپکے چپکے آن بسا ہو !

دھنک

دھنک کے ساتوں رنگ
میری محبتوں کے سنگ
جسموں کی پاتال میں اتریں
بھیگ بھیگ جائیں !

لذّت

میرے من کے اندر
تیری چاہت اتنی گہری
تیرے بارے جب بھی سوچوں !
سب سے جھوٹ میں بولوں !

سلیم احمد

غزل

وہ ہاتھ ہاتھ میں آیا ہے آدھی رات کے بعد
دیا دیئے سے جلایا ہے آدھی رات کے بعد

میں جاگ اُٹھا ہوں یکایک کسی کی دستک سے
یہ کون ہے کہ جو آیا ہے آدھی رات کے بعد

میں آدھی رات تو تیرہ شبی میں کاٹ چکا
چراغ کس نے جلایا ہے آدھی رات کے بعد

مجھے خبر ہے کہ سب سو گئے ہیں محفل میں
فسانہ میں نے سنایا ہے آدھی رات کے بعد

ہوا تھا شام خیال وصال سے آغاز
وہی دیا وہی سایا ہے آدھی رات کے بعد

مجھے خبر بھی نہیں ہے کہ شب نوردوں نے
مجھے کہاں سے اٹھایا ہے آدھی رات کے بعد

یہاں تو کوئی کہیں نہیں ہے ہوا نہ دھواں نہ چراغ
یہ مجھ کو کس نے جگایا ہے آدھی رات کے بعد

ریاض خوارزمی

غزل

کدھر جائیں گے اُٹھ کر سنگِ در سے
جدھر اُٹھ کر گئے پتھر ہی برسے

گھٹائیں برسیں جل تھل ہو گئے دشت
صدف ساں ہم تو ساری عمر ترسے

اشاروں کو کنایوں کو جو سمجھے
نظر آتے ہیں کتنے بے خبر سے

کہاں تک شوق دیوانہ بنا دے
نہیں کھلتا خبر سے یا نظر سے

یہی ہجراں و ہجرت کی ہے تفسیر
نکلنا پڑتا ہے ہر مستقر سے

یہ شاید آپ سے کچھ کہہ رہا ہے
ذرا پوچھیں تو میری چشمِ تر سے

پھر آثارِ دیارِ یار دیکھیں
ریاض آئیں صدائیں بامِ دور سے

عبدالعزیز خا

غزل

لکھنے والے نے عمر بھر کے لئے
میری قسمت میں رت

رہی سعیِ وصال نا مشکور
نہ مٹے فاصلے جدا

کر سکے قید کون خوشبو کو؟
کوک کوئل کی کون

ہر درخت اُگ سکے نہ گملے میں
ہر پرندہ قفس میں

فکر دمن خواستگارِ آزادی
آگہی ہے تعصبی

لادوا ہو چکا مرض اب تو
چہرہ داروں سے کون

کون سچ بات کا کرے اقرار؟
کون اپنے دیں کو تر

لوگ آتش برگ کی مانند
چھپے رہتے ہیں اکثر آ

ہیں کہاں وہ کشیدہ قد جن کے
منتظر ہیں کیسے ہوش

یہ پری رو بھی کیا ہوئے پیدا
مٹی کی مٹی کے سو کھے

یوں تصور میں ابھرے نقش اسکا
یوں وہ بزمِ خیال

جس طرح سانس آئے سینے میں
نیند آنکھوں میں جس

جنہیں عارف تلاش کرتے ہیں
ہیں وہ معنی بیان میں

میں کہ جبر و جمود کا دشمن
حرفِ تازہ ہے تحفہ میرے لئے

شاہد حسن مراد آبادی

غزل

ہم کھڑے ہیں باادب یوں دل بروں کے درمیاں
جس طرح ماتحت کوئی افسروں کے درمیاں

ہم ترستے ہیں ہوا کو، روشنی کو، دھوپ کو
کس قدر آرام ہے اونچے گھروں کے درمیاں

حوصلہ بخشا مری خود اعتمادی نے مجھے
ورنہ کیا میں بولتا دانشوروں کے درمیاں

میری پروازِ تخیل آسماں در آسماں
وسعتیں محصور ہیں میرے پروں کے درمیاں

اس لئے ان کی نظر میں قتل کے موجب تھے ہم
ہم نے لب کھولے تھے احسن خنجروں کے درمیاں

نظام ہاتف

غزل

اصل تو نادیدہ، لیکن دیدنی ہے عکس عکس
موسمِ ہر جسم و جاں فصلِ رنگ و بو ہے عکس عکس

وہ پسِ افسونِ شب گمشتگیٔ آفتاب
اُف وہ تاریکی کہ ہر کھوئی ہوئی شے عکس عکس

بازگشتوں میں تصادم در تصادم یعنی میں
جیسے ایک مسحور کن آواز کی لے عکس عکس

ہے عجب پس منظری لاہوت میں مبہوت تم
واہمہ یکتوں کا جاں لینے کو در پے عکس عکس

سب کی سب سیال بھیڑ میں پی گئی منظر کی آنکھ
جستجو میں جسم کی ہوتا رہا طے عکس عکس

غزلیں

[illegible]ے شہر میں پتھر کی جو بارش ہو گی
[illegible] دل کے اجڑنے کی ہی سازش ہو گی

شہر کا شہر اندھیرے میں ہے کب سے ڈوبا
ایک دیا کوئی جلائے تو نوازش ہو گی

سادگی دیکھو بناتے ہیں جو شیشے کا مکاں
بچ سکے گا کہیں پتھر کی جو بارش ہو گی

یہ صلہ مجھ کو ملا آج وفا کا میری
میری بربادیٔ قسمت کی نمائش ہو گی

[illegible] کے آنے کی تمنا نہ کرو تم شبیر
[illegible] ہو گی

خزاں کے دور میں لطفِ بہار لیتا [illegible]
شبِ فراق میں اس کو پکار لیتا [illegible]

کہیں جو کوئی کڑی دھوپ میں ملا
اسی کی چھاؤں میں لمحے گزار لیتا [illegible]

تمہاری طرح نظر آتے ہیں جو چہرے
سمجھ لو تم کو ہی اکثر پکار لیتا ہوں

کسی کی سانس کی خوشبو ہوا جو لاتی
مزہ وصال کا لیل و نہار لیتا ہوں

کہاں کہاں نہ تمہاری تلاش میں بھٹکے
گلی گلی کا [illegible]

دی کلچرل اکیڈمی ریبنہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ ـــ ۱۹۶۴ء

شرح خریداری

بارہ شمارہ ـــــ چوبیس روپے

ایک شمارہ ـــــ دو روپے

فون نمبر ـ 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹر
نوشابہ حق

رفقاء ایڈیٹرز

شفق ، عبدالصمد

دی کلچرل اکیڈمی گیا کی تمام مطبوعات (کتابیں، رسائل، پمفلٹ) میں شائع ہونے والی ادبی و نیم ادبی، نام، مقام واقعات ادارے اور کردار ساری چیزیں سو فیصدی فرضی ہوتی ہیں حقیقی افراد مقامات، واقعات اداروں اور کردار سے ان کی مماثلت یا مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے کلچرل اکیڈمی گیا کے کسی فرد، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا مالکین، معاون کارکن یا مصنف پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری قطعاً عائد نہیں ہوتی۔ ادارہ

کتابت :۔ ایم کلیم ڈنگروی ـــــــ طباعت ، ہندلیتھو پریس گیا

محتویات

کشکول

آسکر وائلڈ نے کہا ہے :

"THE RICH KNOW THE PRICE OF EVERYTHING . AND THE VALUE OF NOTHING"

اگر کوئی بنیادی طور پر تخلیق کار نہ ہو۔ اور گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا ہوا اچانک کروڑ پتی ہو جائے تو وہ ادب کی قیمت سے بھی دوسری چیزوں کی طرح واقف ہو جاتا ہے مگر وہ ادب و شاعری کے حقیقی قدر سے ناواقف محض ہی رہتا ہے۔ کہیں اگر اسے یہ سوجھ گئی کہ وہ ادب اور آرٹ کی دنیا میں بھی اچانک سارتر، شکسپیر، کالی داس، غالب، اور کرشن چندر یا قرۃ العین حیدر اور بیدی ہو جائے، تو وہ اسکو بھی سون اسٹار ہوٹل کی لکثری اور بینک بیلنس کا کریڈٹ کے تعلق سے ہی سے دیکھنے لگتا ہے وہ جانتا ہے علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ یونیورسیٹیوں کے وائس چانسلر وں کی کیا قیمت ہے۔ مگر بد قسمتی سے وہ یہ نہیں پاتا کہ ان کا VALUE کیا ہے۔ وہ پڑھے لکھے دبیز لوگوں کی قیمت بھی جانتا ہے۔ اور خریدنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اور الفاظ تک کی قیمت لگاتا ہے، دوستوں کی قیمت بھی لگاتا ہے۔ اور اپنے شیفر یا پارکر یا ماؤنٹ بیلینک قلم کو کالی داس کا قلم سمجھ بیٹھتا ہے۔ اور شکنتلا کو مکمل کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ خریدے ہوئے دبیز نقادا سے سمجھاتے ہیں کہ شکنتلا نامکمل ہے۔ اور کالی داس کا قلم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ اور صدیوں اس لئے گرا رہا کہ وہ اسے اٹھا لے اور شکنتلا کو مکمل کرلے : امداد باہمی " بزنس کا ایک طریقہ کار ہے ادب تخلیق کرنے کا بھی یہ طریقہ ہو سکتا ہے اس کا تجربہ کرنے لگتا ہے۔ کمپیوٹر اگر ناول لکھنے لگے اور شاعری کرنے لگے۔ تو یہ کمپیوٹر کی بے بسی ہے۔ اور ناول اور شاعری کی بدنصیبی ——— خوش نصیبی ان کی ہے جو شہر یار کہلاتے ہیں۔ اور دوستی میں دوست کے قارونی خزانے سے انکساری میں کبھی کبھی مستفید ہونے کا اقرار کرتے ہیں،

جواظہر کہلا کر خود کو بھی اور حسین وجمیل الفاظ کو بھی غلاظت میں ڈال دیتے ہیں۔ آلِ احمد ہونے کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی بجائے میراثی بن کر غیر ادب کو عظیم ادب ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگ جاتے ہیں۔ ــــــــــ کیوں سبھوں کو قیمت منظور ہوتی ہے؟ اپنی وقعت نہیں معلوم ہوتی۔

قارون کو شاعر یا ڈرامہ نگار بننے کی نہیں سوجھی۔ ورنہ ہومر کا قلم بھی گر جاتا۔ اور اس قلم کے کارناموں کو اسے ہی مکمل کرنا پڑتا۔

ایسے میں ہمیں وارث علوی یاد آتے ہیں کہ قلم کی طراری اور ذہن کی تیزی کی اس وقت بڑی ضرورت ہے۔ جب قارون نے ہومر بننے کی ٹھانی ہے۔

"آہنگ" ادیب کی عزت، اس کے احترام اور اس کے تخلیقی تقدس کی سوگند کھا کر ادب کے نامور انمول اور کج کلاہوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ قارون کو قارون کے خانے ہی میں رکھنے کے سلسلے میں ہماری مدد کریں کیونکہ جب یونیورسیٹیاں، سیمینار، ادیب نقاد خریدے جارہے ہوں تو اس "بازار" کی حقیقت انہیں ہی کو بتانی پڑے گی۔

کالی داس کے اس قلم کی سوگند جو کبھی نہیں گرا، اور جس کی شکنتلا مکمل ہے، آہنگ اس کے تقدس کی حفاظت اور عبادت کرتا رہے گا۔

قارئین

سواد وصوت

برادر خوش گہر ! سلام و محبت

آہنگ کا تازہ شمارہ باصرہ افروز ہوا۔ شکریہ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ محدود صفحات کے باوصف اردو کے قارئین کو جتنا متنوع اور مفید مواد فراہم کرتے ہیں۔ وہ کیفیت کے لحاظ سے اہم اور وقیع ہوتا ہے۔ کم و بیش ہر شمارہ میں ارباب نظر کی ضیافت کے لئے آپ کوئی نہ کوئی نیا گوشہ ڈھونڈ ہی نکالتے ہیں۔ اب اسی زیر نظر شمارہ کو لے لیجئے۔ مضامین نظم و نثر کے علاوہ آپ نے ایک ہم عصر نوجوان شاعر کی بے تحاشا پذیرائی و قدر افزائی کے تعلق سے جو دلچسپ معلومات شائع فرمائی ہیں۔ انہیں پڑھکر عبرت ہوئی اس پس منظر میں ہم اپنے "معصوم" نقادوں اور دانشوروں کے ادبی و ذہنی رویوں کی بوالعجبی کا بخوبی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ پچھلی فروری میں دہلی میں دوران قیام میں نے اس سلسلے میں یاران خجستہ گام کے سابقانہ جذبوں کی گونج سنی تھی لیکن یہ گونج اتنی واضح اور شفاف نہیں تھی۔ اب "آہنگ" میں تفصیلات دیکھیں۔ تو آنکھیں کھل گئیں۔ آپ نے جس صفائی و بینائی سے ہم مصلحت زادوں اور ابن الوقتوں کے چہروں سے نقاب ہٹائی ہے وہ آپ کی ادبی جسارت اور صحافتی دیانت داری کی دلیل ہے اتنی بات ضرور ہے کہ لگ بھگ ادبی سرمایہ کاری کی یہ مرقع لعنت اور ذاتی مفاد پر مبنی شخصیت پرستی کی یہ مصنفانہ طرز و روش، ماضی میں بھی تھی۔ گو اس کی شکل ذرا بدلی ہوئی تھی۔

مختصر یہ کہ بادل ناخواستہ سہی، ہمیں اسے تسلیم کرنا ہے کہ ادب اور صحافت کی اپنی ایک الگ سیاست ہوتی ہے جس پر ہم بڑی سنجیدگی، سلیقہ مندی، ہوشیاری اور خوش دلی کے ساتھ کل بھی قائم تھے اور آج بھی قائم ہیں۔

فضا ابن فیضی ——— مئو ناتھ بھنجن (یوپی)

محبی ! تسلیم

عید کارڈ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ آپ کو بھی یہ تقریب سعید مبارک ہو۔

ابھی ابھی آہنگ ملا۔ آپ کو کس طرح مبارکباد دوں۔ اسے پڑھکر سر افتخار سے بلند ہو گیا۔ کہ میری ! ہاں میں ابھی باضمیر رسالے اور باضمیر مدیر زندہ ہیں۔ جو روپے اور مصلحتوں سے خریدے نہیں جا سکتے۔ آپ نے بڑی محنت اور جرأت سے پرچہ مرتب کیا ہے۔ اور ادب اور ادیب کی قدر و قیمت کو اس کی تخلیقات کے آئینے میں دیانتدارانہ طور پر پرکھنے اور بے کم و کاست اس پہلائے و بیے اور حقائق کو بے نقاب کرنے کی جسارت کی ہے۔ اور ادیب کو سماجی پوزیشن یا اس کی دولت اور تکرم بازی سے بے نیاز رہے ہیں۔ یہ ادب اور صحافت دونوں کی بڑی خدمت ہے۔ اور ادب آج جس قسم کی تجارت کا شکار ہے اس کے

یہ پہلا جرات مندانہ وار ہے۔ مبارک باد،

آپ کے لئے جلد کوئی مضمون بھیجوں گا۔ بلکہ نذرانۂ عقیدت۔ کلیم الدین احمد صاحب کے بعد بہار نے آہنگ کا یہ شمارہ سب سے بڑا ادبی واقعہ ہے۔ آج سے آپ کا نام کلام نہیں (مضرب) کلیم حیدری ہونا چاہئے۔ آپ نے پوٹرشن ہیبن کو (نامرد) کہہ کر پورے اردو ادب کو پوٹرشن ہیبن ہونے سے بچالیا ہے۔

محمد حسن ——— دہلی

محترم ! تسلیم

آپ کا خط ملا، خوشی ہوئی۔

"آہنگ" اور "مورچہ" مسلسل مل رہا ہے شکر گزار ہوں۔ یہ دونوں پرچے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔ گزشتہ ماہ سے آہنگ اور مورچہ میں آپ نے بڑی دلچسپ اور ہمارے جیسے گوشہ نشینوں کے لئے عبرت ناک چیزیں چھاپی ہیں۔ بہت مزہ آیا۔ آپ نے جو نشتر کا تیس لکھی ہیں وہ بجا ہیں۔

جیلانی بانو ——— حیدرآباد

برادر بزرگ ! آداب

آہنگ کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔

ایک طرف جہاں پٹرو ڈالر کی دھن پر صلاح الدین پرویز کا بے ہنگم راگ اور ہمارے ادیبوں کا رقص جاری ہے بڑے بڑے مشاعرے، سیمینار، اور سمپوزیم منعقد کئے جا رہے ہیں، کمزور بنیاد پر عالی شان محل تیار کرنے کی کوشش بھی جاری ہے۔ وہیں دوسری طرف راتوں رات بن جانے والے خوب صورت مگر کھوکھلے بُت کی جس طرح آپ نے نقاب کشائی کی ہے اور حق و صداقت کا نعرہ بلند کیا ہے

——— آپ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

احمد ہمیش کا خط پڑھ کر اچانک میر کا یہ شعر مجھے یاد آگیا ؎

کرتا کسو کے آگے کیا دست طمع دراز
یہ ہاتھ سو گئے ہیں سرہانے دھرے دھرے

احمد ہمیش نے ایک ہزار روپے کے نذرانہ کو ٹھکرا کر واقعی ایک سچے اور ایماندار فن کار ہونے کی مثال پیش کی ہے۔

شاہد کلیم ——— آرہ

محترم کلام حیدری صاحب ! آداب و نیاز

تازہ شمارہ دیکھا، مزہ آگیا۔ بھائی آپ نے اپنے نام کے دوسرے ٹکڑے کی لاج رکھ لی ہے۔ منیر صلاح الدین پر گوشہ بڑی جرات اور بے باکی سے نکالا ہے۔ مبارکباد قبول کریں۔

مذکورہ شمارے میں پرویز کا خط اور احمد ہمیش کا جواب خاصے کی چیز ہے۔ لیکن کاش کوئی فرد احمد ہمیش کو یہ نکتہ سمجھا دیتا "بھتیجے"! یہ اونچے بول بچن، انہیں زیب دیتے ہیں جو زہر انہیں کھاتے۔ تمہارا منہ تو باقاعدگی سے بھرا جاتا رہا ہے۔ آج مخالفت اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ غیرت بیدار ہو رہی ہے بلکہ اس لئے کہ آٹھویں دہائی کے فہم سے محروم حاتم نے کاسہ میں حسب منشا سکے نہیں ڈالے۔

مزہ آجائے اگر آپ اس سلسلے میں مزید انکشافات کریں۔

سنا ہے پچھلے دنوں صلاح الدین پرویز بمبئی آئے تھے آپ نے "کشکول" میں پوچھا ہے۔

"بتا اے نرتا تو کون سا مارگ اپنائے گی"؟

تو جواب حاضر ہے!

سلولائیڈ — ! جی ہاں نرتا پر فلم بن رہا ہے۔ اپنی بمبئی میں بھی کچھ ضرورت مند ادیب بستے ہیں۔ بے چارے ادب سے فلم کی طرف گئے یا تو جا رہے ہیں۔ اب

صلاح الدین پرویز کی سخاوت علی گڑھ اور کراچی تک محدود کیوں ہو
"آہنگ" میں آپ اپنے مخصوص انداز میں "سزتا" سارے
دن کا تھکا ہوا پرش" "لوپوئیز" اور دھوپ سمندر سایہ پر
تفصیلی تبصرہ کب شائع کریں گے۔

سلیم احمد، احمد ہمیش، گوپی چند نارنگ، محمود ہاشمی
اور علی گڑھ گروپ پرویز کو دولہا بنا چکے۔ "سہرا بزرعائی" کی
رسم آپ ادا کریں تو مزہ آجائے۔

مسجود عالم ——— بمبئی

محترم کلام حیدری صاحب! تسلیمات

دو دن قبل ماہنامہ "آہنگ" ملا۔ اسے میری کم علمی کہئے
یا نارسائی کہ میں اب تک اس پرچے سے ناواقف تھا۔ کچھ تو اس لئے
بھی کہ پاکستان میں ہندوستانی ادبی جرائد تقریباً تھے۔ اور
یہاں آنے کے بعد تو فاصلوں کا جواز بہرحال موجود ہے جولائی کا
شمارہ ہرچند کہ بہت مختصر ہے لیکن اس میں بہت کچھ ہے۔

کشکول کا آخری پیراگراف ہی اس کی جان ہے۔ اور
بعد کے مضامین نے تو اس پر مہر ثبت کر دی ہے۔ پاکستان کے
مختلف اخباروں کے ادبی تراشوں کو یکجا کر کے آپ نے واقعی بڑی
خدمت کی ہے۔ خصوصاً صلاح الدین پرویز کے حوالے سے۔
ہم جیسے لوگ جو اتنی دور بیٹھے ہوئے ہیں اس پس منظر سے واقف
ہی نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ادبی کالم نگاری میں حالات اور
واقعات پر بے لاگ تبصرہ نہ کیا جائے۔ اور آپ نے جن کالموں
کا انتخاب کیا ہے وہ واقعی اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔

احمد ہمیش نے صلاح الدین پرویز کے نام جو خط لکھا
ہے وہ اپنی جگہ پر۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ہمیش کی ایک نظم یاد
آگئی۔ جو انہوں نے بھٹو کابینہ کے ایک وزیر مولانا کوثر نیازی
کی شان میں کہی تھی۔ واضح رہے کہ یہ نظم اس وقت کہی گئی تھی
جبکہ ریڈیو پاکستان کراچی سے ہندی سروس میں پروگرام ہمیش

کیا کرتے تھے۔ اور وزیر موصوف اطلاعات و نشریات کے
نگراں تھے۔ اس وقت ان کی شان میں کچھ لکھنا اور پھر پاکستان
کے اخبار "جہاں" میں اس کا چھپوانا ——— اگر سرکار سے کسی
وظیفہ کی امید میں نہیں تھی تو اس کا مقصد اور کیا تھا ——— ؟
میرے نزدیک کسی ایک فرد سے مالی منفعت حاصل کرنا پھر بھی
بہتر ہے۔ نہ کہ دربار سرکار کی مدح خوانی کر کے قلم کی حرمت کو
ذلیل کیا جائے۔

اشفاق حسین ——— اردو انٹرنیشنل میگزین کینیڈا

برادرم نثار احمد صدیقی صاحب! سلام و خلوص

ادھر آہنگ کے شماروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ آہنگ نے نہ صرف ترقی کی ہے بلکہ کسی بھی بڑے ادبی پرچے
کے مقابل آچکا ہے۔ جولائی ۸۲ء کا آہنگ دیکھ کر مزید
خوشی ہوئی کہ آپ حضرات نہ صرف ادبی ذمہ داریوں کو نباہنے
کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں بلکہ نقلی چہروں کی نقاب کشائی
کر کے ادب کے جسم سے لپٹی ہوئی غلاظت کو بھی دور کر رہے
ہیں۔ اور یہ بہت ہی جرأت مندانہ اقدام ہے اور یہ اقدام وہی
لوگ کر سکتے ہیں جن کا اندر باہر سب کا سب اُجلا، کھرا اور
سچا ہو۔ میری جانب سے اس قابل تحسین و آفرین اقدام پر
دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

ایوب جوہر ——— بنگلہ دیش

برادر مکرم کلام حیدری صاحب! سلام و خلوص

تازہ آہنگ ملا۔ صلاح الدین پرویز کے بارے میں پہلے
سے اتنا ضرور جانتا تھا۔ کہ وہ کروڑ پتی ہیں۔ بلکہ اب پتہ چلا ہے
اور رسائل و کتب کی خریداری پر ہزاروں روپے ماہانہ خرچ کیا
کرتے ہیں۔ لیکن یہ علم نہیں تھا کہ ملک کے نامور اور قابل ذکر
ناقدین اور اہل قلم حضرات زرخرید غلاموں کی طرح ان کی

بقیہ [illegible]

رُوئے سخن کسی کی طرف ....

زرزرا خامہ می کشد

آل احمد سرور

صلاح الدین پرویز اپنی تجرباتی شاعری کی معنویت کی وجہ سے ادبی حلقوں میں ایک امتیازی جگہ پیدا کر چکے ہیں۔ اب ان کا ایک اور کارنامہ سامنے آیا ہے۔ یہ "نمرتا" ہے۔ صلاح الدین پرویز نے نمرتا سے نمرتا کی طرف "تلاش کے اس نئے سفر کو ایک "نیا عہد نامہ کہا ہے" جو نئی دیومالائی کی تخلیق کا سبب بنا" میرے نزدیک یہ انسان کے باطن کا سفرنامہ ہے۔ جس میں شاعری کتھا، ناول، سب مل جل کر ایک اہم تخلیقی کارنامے کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔

ہندوستانی دیومالا، ہندی الفاظ، اسالیب یہ علائم تپ ہیں یہ تخلیق۔ بڑی جاندار اور تہدار زبان میں لکھی گئی ہے۔ یہ تہذیبوں کے آغاز اور عروج کی کہانی ہے۔ اور انسان کی ازلی جستجو، ازلی اضطراب، ازلی محبت، اور ازلی مسنت کا رزمیہ ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں نمرتا کی کتھا ہے دوسرے میں اس کی تعبیر، دوسرے حصے کی وضاحتوں، اور تشریحوں سے پہلے حصے کے تار و پود پر روشنی پڑتی ہے۔ اور اس سے صلاح الدین کے شغف اور مطالعے دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کا اسلوب اس کی اہمیت اور معنویت کا ضامن ہے۔ پرویز لفظ کے لامتناہی امکانات کو برتنا جانتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہماری زبان کے لوچ اور رس میں اضافہ ہوا ہے۔ اس تخلیق پر میں مبارک دیتا ہوں۔ کتاب بڑی خوب صورت چھپی ہے عروس جمیل و لباس حریر کے مصداق۔

آل احمد سرور ، ۲۶ فروری ۸۶ء

داشرے

سلیم احمد

آپ نے دیکھا ——— انھوں (صلاح الدین پرویز) نے آپ کو نعت سنائی، رسول کریمؐ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہاں کی نظم آپ نے سنی اور یہ ذکر سنا کہ نظام الدین اولیا اور امیر خسرو سے ان کا رابطہ ہے ..... اور میری ایک مختصر سی ملاقات

میں انہوں نے کہا کہ میری زندگی کا MISSION امن و
مساوات ہے۔ اور میں وہ آدمی ہوں کہ جو ہندوستان کی اس
حالت میں کہ جب مذہب کا نام لینا OUT OF
FASHION ہو گیا تھا .... اس وقت میں نے
مذہب کو ادب میں ایک تخلیقی تجربے کے طور پر داخل کرنا
چاہا ...... یہ سب باتیں اور یہ بات کہ وہ عرب کی سرزمین
مقدس پہ قائم ہیں ایک طرف ———— اور یہ "نمرتا"
کی حقیقت دوسری طرف ہے کہ اس میں ہندو اساطیر اور
ہندو دیو مالا کے ذریعہ ایک تخلیقی تجربے کو تشکیل دینے کی
کوشش کی گئی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اور سطحی ذہنوں
کو یہ تضاد معلوم ہو کیونکہ اس بات کو لوگ بھول کر کہ ہمارے
صوفیانہ تجربے میں، مذہبی تجربے میں، شعری تجربے میں کس
طرح کفر و ایمان کی حدود سے بلند ہوتے ہوئے اور اس
سے ماوراء جاتے ہوئے ایک بلند تر حقیقت کا اثبات کیا
ہے۔ لوگوں نے اس کو مخصوص حد بندی کا ذریعہ بنایا ہے
...... میں تو اس بات کو صلاح الدین پرویز کی علمیت اور
ان کی وسیع النظری سے تعبیر کرتا ہوں ———— اور جو
لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ
مذاہب FORM کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی
حیثیت ایک ظاہری شکل کی ہے۔ اور ان کے پیچھے ایک
ماورائی وحدت موجود ہے جو اپنا اظہار اور اپنے حقائق
کا اظہار مختلف FORM میں اور مختلف LANG-
UAGES میں کرتے ہیں۔ اسی وحدت کو پانے کی
کوشش صلاح الدین پرویز کے یہاں ملتی ہے ....

———— دائرے

دیویندر اِسر ●

میں محمود ہاشمی کے اس قول کی مکمل تصدیق نہیں
کر سکتا۔ کہ نمرتا میں نو رسوں کی نمو ہوئی ہے۔ کسی ایک تخلیق
میں سب رسوں کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ اور نہ یہی
اس تخلیق کے اعلیٰ ہونے کی شرط ہے۔ نمرتا میں جن رسوں کی
جھلک ملتی ہے۔ وہ ہیں۔ بھگتی، شرنگار، شانت، اور بھبت
اور کرونا۔ لیکن اس میں بلاشبہ ویرودھی بھتس اور نرودر کا
نہیں۔ ان میں سے نمرتا میں دو رسوں کی شمولیت ضروری ہے
ویر رس جو شرنگار اور بھگتی کے تصادم سے ابھر کر سامنے
آتا جب نیل کنٹھ سمراٹ کا روپ دھارن کرتا ہے۔ آخری
ادھیائے میں ودی بھتس رس کی آتِ پتی ناگزیر تھی۔ جب
ہم موجودہ عہد میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ عہد جس اظہاریت
پرستی کا حامل ہے وہ کلٹ آف اگلی نیس کے ذریعہ ہی
مستند طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اس عہد سے نبرد آزما ہونے
کے لئے نرودرس لازمی ہے۔ نہ کہ شانت، شرنگار رس پھر
بھی اس میں شسید، سیمبرش، رس، روپ اور گندھ کا ایک
ایسا گھلن ہے جو اسے محض تاریخ اور فلسفے واقعات اور
تجزیئے سے بلند کر کے ایک تجربہ بنا دیتا ہے۔

اس عہد کا سنکٹ آتمن کی پراپتی یا تکمیل ذات
نہیں۔ موکش، نروان یا کسی ایک ذات یا فرد واحد کی نجات
ہے۔ پرشن پوری نوع انسانی کی نجات کا ہے۔ سوال یہ
ہے کہ ہمارا مارگ کون سا ہے۔ ہینیان کا، یا مہایان کا
لوگ کا۔ یا بھوگ کا۔ موکش یا مہا پری نروان کا۔ ولیہ
کا دودھو کا۔ (بغاوت) کا ...... ہمارا نمرتا لو کون
سا مارگ اپنائے گی؟

تیرا نیل کنٹھ تو اب بوڑھا اور پورش ہین (نامرد)
ہو چکا ہے۔ ———— دائرے

آشفتہ چنگیزی ●

آج میں ایک ایسے ہی شاعر اور اس کی شاعری سے

بحث کروں گا۔ جس کو پیڑ اور صحت دونوں کو واضح شکل میں دیکھنے پر قدرت ہے اور جو بیک وقت کئی سطحوں پر جی سکنے کی جرات رندانہ رکھتا ہے۔ وہ صلاح الدین پرویز بھی ہے اور صلاح الدین قریشی بھی۔ وہ نہ قریشی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ اور نہ پرویز ہی اس سے ناخوش ہے۔

پرویز کی شاعری بلبل کی چہکار نہیں ہے۔ جس سے رنڈی کے کوٹھوں پر حظ اٹھایا جا سکے۔ اس کی شاعری اپنے اندر ایک ایسا جہان معنی رکھتی ہے۔ جو قاری سے سنجیدہ مطالعہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب پرویز نے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا اس وقت مسائل پیچیدہ اور گنجلک ہو چکے تھے حقیقتیں بکھر چکی تھیں۔ مارکس، فرائڈ، کامیو، غالب اور کافکا پیدا ہو چکے تھے۔ شاید اسی وجہ سے اس کی شاعری پہلے مطالعہ میں قاری کو الجھا دیتی ہے۔ یوں بھی اردو شاعری کے قاری کو جس شاعری کی چاٹ پڑ چکی ہے۔ وہ مصالحہ پرویز کی شاعری فراہم نہیں کرتی ہے۔ اس کی شاعری سے محظوظ ہونے کے لئے نہ صرف ذہن رسا بلکہ دیوار کے آر پار دیکھنے والی نگاہ بھی درکار ہے ——— دائرے

اسی سب کے باوجود صلاح الدین نے اپنی اعلیٰ نسبی اور اپنے علمی شجرے کا پاس رکھا۔ روحانی پیشواؤں اور اولیا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے سب کو معاف کر دیا... صرف معاف ہی نہیں کیا بلکہ اپنی دریا دلی کا ثبوت بھی فراہم کرتا رہا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ شاید اسے پچھلا کچھ یاد نہیں۔ ادبیت کی تحقیر کے جو مناظر میں نے صلاح الدین کے ساتھ روا رکھے دیکھے ہیں۔ اس سے ایسا لگتا ہے کہ شاید قرون وسطیٰ کے کسی چشتی صوفی کی روح اس میں حلول کر گئی ہے

——— الفاظ شمارہ ۱ ۱۹۸۲ء

غیاث الرحمن ●

برگد کی گھنی چھاؤں میں بیٹھا شکنتلا کا خالق شکنتلا... کے سمپورن روپ کو نکھار رہا تھا۔ کہ اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ قلم اٹھانے کے لئے نیچے جھکا تو برگد کی جڑوں سے آواز آئی۔ کالیداس! تمہاری شکنتلا ادھوری ہے کالی داس نے پوچھا یہ پوری کب ہو گی۔؟ آواز آئی، صدیوں بعد جب ایک نیا انکور میری بوڑھی جڑوں کو چیرتا ہوا سر ابھارے گا۔ کالیداس نے کہا اے فضاؤ! تم گواہ رہنا کہ میں نے اپنا قلم اس صدیوں بعد آنے والی شخصیت کیلئے محفوظ کر دیا۔

نثر میں شاعری کی لطافت و شیرینی بھی ہے۔ اور نثر کا شکوہ و وقار بھی۔ اس میں پہاڑی ندی کی روانی و چنچل پن بھی ہے اور نرم رو دریائی متانت و سنجیدگی بھی صلاح الدین پرویز ایک تخلیق کار کا نام نہیں۔ ایک اسلوب کا نام ہے ایک انداز بیان کا نام ہے۔ ایک طرز فکر کا نام ہے۔ ایک عہد اور ایک دور کا نام ہے۔ نثر اپنے اسلوب اور انداز بیان کی واحد تخلیق ہے۔ جس کا خمیر ہندوستانی دیو مالا سے اٹھایا گیا ہے اور ارتقائے تہذیب و تمدن کے اس بحر بیکراں کو ایک کوزے میں سمو دیا گیا ہے۔

نثر میں شاعری کی لطافت و شیرینی بھی ہے۔ اور نثر کا شکوہ و وقار بھی۔ اس میں پہاڑی ندی کی روانی ہے۔ اور چنچل پن بھی ہے۔ اور نرم رو دریائی متانت و سنجیدگی بھی

دائرے

منظور ہاشمی ●

صلاح الدین پرویز کے انداز تحریر کی ایک خاص خوبی استعاروں کی تجسیم اور تشبیہات کی ندرت ہے مرئی اور غیر مرئی اشیا کی پیکر تراشی ان کی عبارت کو تصویر خانہ بنا دیتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ الفاظ کے رنگوں سے جذبہ و فکر کی پینٹنگ بنائی گئی ہے اور ساری تحریر

۔ آرٹ گیلری بن گئی ہے، ان تمام خوبیوں کے باوجود
یہ کہنا درست ہے کہ نمرتا بے مثال ہے نمرتا سدا
رہے۔ اور ہمیشہ ہر موسم میں نئے نئے پھول کھلاتی رہیگی

دائرے

پرویز چونکہ اسلوب کے نہیں بلکہ اسالیب کے شاعر
۔ اس لئے ان کی شاعری کی تفہیم نسبتاً دشوار ہے۔ لیکن
یز کے بارے میں لکھتے ہوئے اور پڑھتے ہوئے دو باتیں
ر پیش نظر رہنی چاہئے۔ ایک تو یہ کہ پرویز کی تخلیقی
ادیت کیا ہے۔؟ اور دوسرے وہ اپنے معاصرین سے
حد تک مختلف ہیں۔

دھوپ، سمندر، سایہ، پرویز کا تازہ مجموعہ
کے دیباچہ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بڑے
کی بات کہی ہے۔ پرویز کے تخلیقی عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے
ں نے لکھا ہے:

> پرویز کی شاعری ہیڈگر کے وجودی تصور
> کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہے۔ پرویز
> کی نظموں میں وژن کی وہ منزل موجود ہے
> جہاں شاعر اشیا اور کائنات کی ماہیت
> کو خود بیان نہیں کرتا۔ بلکہ اشیا اور کائنات
> خود پرویز کے تخلیقی ذہن پر اپنے منفرد
> مفہوم کو آشکار کرتی ہے۔

پروفیسر نارنگ نے پرویز کے تخلیقی VISION
ارتقائی منزل کو بنیاد تصور کیا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جو
ید اور قدیم کے درمیان حد فاصل قائم کرتی ہے۔ جدید
ن دراصل ان واسطوں کے بعد ہی اپنا اظہار کرتا ہے
فاظ اور افکار کو مقررہ مفاہیم کا پابند بناتے ہیں جدید
ید فنکار کے نزدیک اپنا ذہن ہی وہ فعال قوت ہے۔ جو
ہی اپنی تخلیق کا بنیادی اصول ہے۔ اور خود ہی اپنا
خالق ہے۔ چونکہ ذہن کی ماہیت اور اس کا وجود خود تخلیق
ہے۔ اس لئے ذہن اسی چیز کو تخلیق کرتا ہے۔ جس کی وہ تفسیر
کرتا ہے۔ اور صرف اسی چیز کی تفسیر کرتا ہے جس کا وہ خالق
ہے۔ جدید ذہن اپنے وجدان کے ذریعہ اپنا اظہار کرتا ہے۔
اور وجدانی فکر ان علامتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ جو فنکار کی
روح کا اظہار ہوتی ہیں۔ یعنی جدید شعری تخلیق غیر منفرد تصورات
کا التباس نہیں۔ بلکہ وژنری (VISIONARY)
ارتسامات پر مشتمل ہوتی ہے۔

اپنے عہد کی کیفیات کا احساس کرتے ہوئے امریکی
شاعر ہیری کراسی نے ایلیٹ کو خط لکھا تھا۔ اور اس سے
سوال کیا تھا۔ کہ وہ شاعر جس کا اس کے عہد کا انتظار ہے
ٹی ایس ایلیٹ ہے۔؟

اردو کے معاشرے میں یہ سوال کس سے پوچھا جا
سکتا ہے۔؟ شمس الرحمٰن فاروقی تو میر غالب، یا اقبال
اقبال کا پتہ بتا دیں گے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ذہن
میں کئی نام آ سکتے ہیں۔ لیکن ان ناموں میں صلاح الدین پرویز
کا نام ضرور شامل ہوگا۔ اور اسی نام پر اصرار ہوگا کہ یہی وہ
فن کار ہے جو اپنی تخلیق کے تحرک سے اس عہد کی بے حسی
اور بے بسی سے ماورا اس وجود کی داستان سنا سکتا
ہے جو خداؤں کا مقرب ہو اور زمین پر ایک مکمل آدمی کی
طرح سانس لیتا ہو۔

الفاظ، شمارہ ۱۹۸۳ء

احمد ہمیش ●

نمرتا کی اشاعت سے پہلے مسودہ سن کر ہی ۱۹۸۷ء
میں مجھے توقع ہوئی تھی بلکہ عصر حاضر کی بہترین کہانیوں کے
پیش لفظ میں میں نے تحریر بھی کیا کہ ممکن ہے نمرتا کی اشاعت
۱۹۸۰ میں ہو۔ اور اردو زبان ان بین الاقوامی زبان کی

صف میں شامل ہو جائے، جن میں بڑے ناول لکھے گئے، اس ضمن میں میں نے بڑے ناول کی تصنیف سے متعلق ژال پال ساخت (سارتر) کی پیش بینی کا [illegible] بھی دیا کہ آئندہ لکھا جانے والا بڑا ناول ہوگا جس میں تھیم مشرق کا ہوگا اور تکنیک مغرب کی۔ اس اعتبار سے اگر گزشتہ برسوں کے عرصہ میں بغور جائزہ لیا جائے، تو بیشتر زبانوں میں لکھے گئے ناول ساخت (سارتر) کی پیش بینی پر پورے نہیں اترتے۔ مگر صرف ایک نمرتا کو جو ناول کی مروجہ فارم سے بھی ماورا ہے دانش حاضر پیشوا کی پیش بینی سے مطابقت حاصل ہوئی ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے۔ مگر ہے ضرور۔ ہاں بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے خطے میں لوگ ادبیات سے متعلق معکوس دانشوری کے سناب رویوں سے اتنے مرعوب ہیں کہ وہ یہ آسانی سے مان نہیں سکتے۔ کہ اردو اور ہندی میں بہ یک وقت ایک بڑا ناول لکھا گیا ہے۔ سو یہ کام بہت مشکل ہے کہ پہلے لوگوں کی تنگ نظری حسد اور احساس کمتری سے اٹے ہوئے آلودہ مطلع کو صاف کیا جائے، پھر ان سے کہا جائے کہ وہ نمرتا کا مطالعہ کریں۔

بہر حال ایک بات تو اپنی جگہ طے ہے کہ نمرتا کے مطالعہ سے قلب و ذہن کی یکسوئی اور وسیع النظری مشروط ہے۔ اور اگر یہ لوگوں کے لئے ممکن ہو تو وہ پہلے تیس سال کے عرصہ میں بین الاقوامی زبانوں میں لکھے گئے ناولوں کی تخلیقی قدر و قیمت کا بغور جائزہ لیں۔ پھر نمرتا کا مطالعہ کریں۔ کیونکہ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں کہا جا رہا ہے کہ جو اعزاز ٹیگور کو اپنے وقت میں ملا۔ وہ صلاح الدین پرویز کو اپنے وقت میں مل رہا ہے ــــــــ الفاظ شمارہ ۲، ۸۲ء

سید امین اشرف ●

سارے دن کا تھکا ہوا اپریش کا ذکر کرتے ہوئے اطہر پرویز نے کہا کہ صلاح الدین پرویز نے اردو شعر و فکشن کو ایک نئی آواز سے روشناس کرایا ہے ان کی زبان، ان کا لب و لہجہ، روایتی زبان اور اسلوب سے مختلف ہے۔ اور پڑھنے والے کو چونکاتا اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ گویا جلسہ کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ حاضرین چونکے۔ اور اس وقت اطہر پرویز نے آشفتہ چنگیزی کو دعوت دی۔ کہ وہ صلاح الدین پرویز کے رفیق ہیں۔ اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالیں گے۔ ــــــــ الفاظ شمارہ ۲، ۸۲ء

آشفتہ چنگیزی ●

علی گڑھ کے نیند محل سے بہادر شاہ ظفر کی معزول گاہ تک ہمارا راج کمار ہر گھاٹ پر گایا۔ سنا اور پڑھا جاتا ہے۔ لکھنو ہو کہ علی گڑھ، حیدرآباد ہو کہ دلی، لاہور ہو کہ کراچی، ریاض ہو کہ واشنگٹن، لندن ہو کہ جینوا، یا پیرس وہ جہاں بھی جاتا ہے جمود کو توڑتا ہے۔ ذہنوں کی برف پگھلاتا۔ قلوب کو گرماتا اور فضاؤں کو متحرک کرتا ہوا نکلا چلا جاتا ہے۔

لیکن ۱۹ اکتوبر ۸۱ء کی شام اس کے اپنے شکار کی شام تھی۔ محمود ہاشمی، یوگندر بالی، بہیب سنگھ، پروفیسر نارنگ شمس الرحمن فاروقی، بلراج مینرا، کمار پاشی، فرحت احساس شمس الحق عثمانی، عبید صدیقی، خلیق انجم، مخمور سعیدی، قمر احسن اور عنوان چشتی جیسے قدر شناسوں نے اسے آسانی سے گذرنے نہیں دیا۔ بلکہ اپنی دوستی اور خلوص کی جال میں گرفتار کر لیا۔ اور خوب ستایا۔ کسی نے رسالت مآب کا واسطہ دیا۔ اور لعنتوں کا دریا بہنے لگا۔ کسی نے کلکاریوں کا ٹیپ آن کر دیا اور "اردو گھر" کے در و دیوار گنگنانے لگے۔ کسی نے معاشی بحران سیاسی استحصال، اور ارباب حل و عقد کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور نثری نظموں کی بلند خوانی کے جوہر بکھرنے لگے۔ کسی نے فراق و وصال نیز ہجرتوں کے الاؤ روشن کر دیئے اور نیل کنٹھ

نرتا کا پاٹھ کرنے لگا ۔۔۔۔۔ اس مجمع میں اہل علم کی کثرت، اہل دل کا فقدان، اور اہل ذوق کا بحران تھا۔ دو چار کے استثنا کے ساتھ زیادہ تعداد کافی دار عینکوں، سگریٹوں جھومتی ہوئی مائیوں، اور پائیوں کی تھی۔

پہلا دور وہسکی سے شروع ہوا ۔۔۔۔ اب میری باری تھی کیونکہ صلاح الدین پرویز اس میدان کے آدمی نہیں ہیں۔ اور محمود ہاشمی عرصہ ہوا تائب ہو چکے ہیں۔ بیگم صلاح الدین کی وجہ سے میں بھی بے جھجک سنجیدگی کی وجہ سے ترستا رہا۔ مگر فرحت احساس کی آمد نے مشکل کو آسان کر دی ۔۔۔۔۔ پھر شعر و شاعری کا آغاز ہوا۔
اس نشست کا انجام میں میرے ذہن میں پہلے ہی سوچا سمجھا تھا اس محفل میں پروفیسر شکیل، شیل احمد شیخ اور پروفیسر نارنگ کے صاحبزادے ترن [illegible] کے علاوہ باقی سب کی سنجیدگی پر مجھے شک ہے محفل تو بہت رات تک چلی ہوگی۔ مگر مجھے واپس ہوٹل پہونچنے کی بہت جلدی تھی۔ کیونکہ وہاں TIMES OF INDIA کے نمائندے جناب لوگندر بالی اور شمع کے مدیر یونس دہلوی صاحب سے وعدہ تھا کہ میں آج کوئی نہ کوئی صورت ایسی ضرور نکالوں گا کہ یہ دونوں حضرات صلاح الدین پرویز سے کچھ وقت چھین سکیں ۔۔۔۔ چھیننا میں نے اس لئے استعمال کیا ہے صلاح الدین کی بے نیازی نے اس سے پہلے مجھے کئی بار شرمندہ کروایا ہے۔ دلی T.V اور آکاشوانی کے لوگ تقریباً چھ گھنٹے آشوکا ہوٹل کے چکر لگا کر جا چکے تھے مگر صلاح الدین کو خیال خاطر احباب اور نظام الدین اولیا کی درگاہ سے فرصت ہی نہ مل سکی تھی۔

مدیر شمع جناب یونس دہلوی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ یونس صاحب کا شمار دلی کے معتبر اور اہل ثروت حضرات میں ہوتا ہے آخر شب ۲ اکتوبر کی قیامت خیز صبح آ پہونچی آج ہمیں دلی کو الوداع کہنا تھا۔ صلاح الدین کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے حضرت نظام الدین اولیا سے اجازت لینے ضرور جاتے ہیں۔ وقت بہت کم تھا، یونس صاحب آخری ملاقات کی غرض سے حسب وعدہ ۷ بجے آشوکا ہوٹل پہونچ چکے تھے اور لابی میں بیٹھے ہمارے منتظر تھے، جہاز کی روانگی میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ آشوکا ہوٹل سے بستی نظام الدین۔ اور پھر واپس ایرپورٹ ۔۔۔۔ مشورہ کیا گیا۔ میری اور محمود بھائی کی رائے تھی کہ کمولانہ درگاہ کی طرف رُخ کر لیا جائے۔ اور یہیں سے بابا کو سلام کر لیا جائے۔ لہٰذا پرویز بالکونی میں چلے گئے۔ اور رازونیاز میں مشغول ہو گئے۔ ادھر میں اشارہ پورٹرس کو بلا لیا گیا۔ اور تین مسافروں آشفتہ پرویز اور بیگم پرویز اور الوداع کہنے والوں محمود ہاشمی، ثریا سعید، فرحت احساس، یونس دہلوی اور اعجاز بھائی کا یہ قافلہ ہوٹل کے ضابطوں سے نمٹتا ہوا ایرپورٹ کے لئے روانہ ہو گیا۔

میں فرحت احساس اور اعجاز بھائی الگ گاڑی میں تھے، اور باقی حضرات یونس دہلوی کی گاڑی میں ہوٹل سے چلے تھے۔ ہم تین لوگوں نے ایرپورٹ پہونچ کر باقی حضرات کی تلاش شروع کی ۔۔۔ ایک گھنٹہ بیت گیا۔ مگر یہ لوگ ندارد۔ میں نے بورڈنگ پاس حاصل کر لئے روانگی کی آخری کال بھی ہو گئی۔ کہ یکایک پرویز اپنی دیرینہ شان بے نیازی کے ساتھ دکھائی پڑے، تاخیر کی وجہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بالکونی والے رازونیاز سے تشفی نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ نفس نفیس حاضری کی غرض سے درگاہ چلے گئے تھے، معانقوں کی رسم ادا کی گئی۔ الوداعی ہاتھ ہلنے لگے۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔

بھیگی آنکھیں چھوڑ رہیں ۔ دیکھیے منظر ساتھ نہ لے،
محمد علوی کے تنبیہ کے باوجود ہم یہ سارے مناظر سمیٹ کر دیار میں پہونچ گئے لمحے روشنی کی رفتار سے ماضی بن رہے ہیں۔ تھکن قبول نہ کرنے کی کوشش میں شین بنتے قدم نہ جانے کون سی منازل طے کرنے کی دھن میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کو بے چین ہیں ۔۔۔ شاید انہیں احساس ہو گیا ہے کہ اگر گونگی پہیلیوں کو زبان مل گئی۔ تو وہ خسارے میں رہیں گے ـــــ پیغامات نشر ہو رہے ہیں۔
"مڑ کے دیکھنے والے پتھر ہو جاتے ہیں" ـــــ دائرے

ایک نظم

اے جمند آرا کیلئے

صباح الدین پرویز

کس نے برباد کیا خشت جہانوں میں مکاں
کس نے برباد کیا شعلۂ جاں عشق نما
یاد آنے کی تو فریاد نہیں سچ بھی بھلا،
کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
شمع گر تو ہے تجھے کیا سمجھاؤں!
چاہتا تو ہوں مگر خود کو بجھاؤں کیسے
ساز میں بند وحی ہیں ہمیں سن لے اک دن
ورنہ کانوں میں تیرے! ....
آگے کچھ کہنے کا یارا بھی نہیں!
لب پاسی پہ صلا میرے بعد!

ایک نظم ـــ "ضاد" کیلئے

صباح الدین پرویز

کہ کبھی نہ سونے دیتا
مجھے یوں جگائے رکھتا
کوئی آکے یہ بتاتا
سرِ شام ہوتے ہوتے
مری نیند کے چمن میں
کیا خزاں برس پڑی ہو
کسی جاگتے بدن میں
مری رات کھو گئی ہے

کہاں جائے گی دوانی
کہاں جائے گی دوانی

کہ ہزار راستے ہیں!
جو کھل اٹھیں گے ہنستے
کئی بار ہجر تیں ہیں
سندباد کے سفر میں
کہ وہ گذر نہ جائے
کہ اندھیرا، اندھیرا کھیو
کہ وہ بکھر نہ جائے
ہوائیں تیز تر ہیں

وہ حسب نسب پیاری
مری رات، رات عالی
وہ ریشم زلفوں والی
وہ گلاب چہرے والی
وہ اداس گل کیاری
وہ بُرے دنوں کی ساتھی
کہاں جائے گی دوانی
مرے ساتھ رہنے والی
کہ نہ گھر ہے مرا کوئی،
کہ نہ گھر ہے اس کا کوئی

ہوائیں ہو گئیں دوانی
ہوائیں ہو گئیں دوانی

عتیق احمد (پاکستان)

نیا افسانہ — پرانا جال

ہے۔ نئے افسانے کی حد بندی اور پہچان کا واحد استارہ
نئے لکھنے والوں کے ناموں سے اس حد تک منسلک ہو کر رہ گیا
ہے کہ جب بھی کسی نئے افسانہ نگار کا نام سامنے آتا ہے تو ذہن میں
اس کے افسانے کا جو PATTERN ابھرتا ہے وہی کچھ پڑھنے
کے بعد ثابت بھی ہوتا ہے۔ جس کی توقع قاری کے ذہن میں
پہلے ہی سے ہوتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ خوش آئند ہے کہ اس
طرح سے نئے افسانہ نگاروں نے اپنی ایک علاحدہ پہچان قائم
کر لی ہے لیکن موضوعات کی یکسانیت اور اس کے فنی برتاؤ
کے طریقوں نے اس دور کی افسانہ کو اتنی بڑی حد تک یکساں
بنا دیا ہے۔ کہ کسی کا نام بدل کر کسی بھی لکھنے والے کے ہی کھاتے
میں ڈالا جا سکتا ہے۔

یہ نیا پیٹرن کچھ تو تجریدیت اور کچھ علامت نگاری کے
امتزاج سے تراشا گیا ہے۔ آج کل اس ہی نوعیت کے افسانے
بالعموم اور بڑی کثیر تعداد میں بالکل اسی طرح سے لکھے جا رہے
ہیں۔ جیسا کہ اب سے تیس چالیس برس پہلے سجاد حیدر یلدرم
کے اسکول آف تھاٹ کے پیروکاروں میں کسی کا نام بغیر اس
تلازمے کے تصور ہی میں نہیں آتا۔ اس اعتبار سے نئے علامتی
تجریدی اور ایبسٹریکٹ (ABSTRACT) افسانہ
کی ایک تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے دور کا ______
FASHION OF THE DAY بھی ہے۔ اور

تو ہم آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کے فیشنوں کے پس پشت
کوئی عقلی اور وجوہاتی تا دلیل تو ہوتی نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ
لیجئے کہ جانتے ہیں اس قسم کے فیصلوں کے پس پشت
ننگو نے چھوڑنے کی یہ CRAZE آج کل دنیا بھر کی نوجوان
نسل کا ٹریڈ مارک بن گئی ہے۔

علامتی، تجریدی، اور ایبسٹرکٹ افسانہ نگاروں نے
اپنے موقف کی وضاحت بلا واسطہ اور بالواسطہ بارہا کی ہے
اور کچھ اس طرح سے کی ہے کہ ان سے پہلے لکھنے والوں نے جو
ہیئت افسانہ نگاری میں بڑی پابندی سے برتی ہے وہ اب
اتنی گھس اور پٹ گئی ہے۔ کہ اب اس میں اظہار مدعا کے لئے
کسی اجتہاد کی گنجائش نہیں رہی۔ دوسری بات جسے وہ بہت
دیکھ کہتے ہیں۔ وہ یہ کہ چونکہ ہر نیا عہد معیار اور اظہار کے نئے
نئے پیمانے اور نئی راہیں لے کر آتا ہے۔ لہٰذا نئے دور کے فنکاروں
سے پرانی لکیریں پیٹتے رہنے کی توقع کرنا یا انہیں اس کی تلقین کرنا
نہ صرف یہ کہ قدامت پسندی کے پابند بنائے رکھنے کے مترادف
ہیں۔ بلکہ ادبی بد دیانتی بھی ہے۔

یہ باتیں تو ہوئیں افسانے کی ہیئت اور انداز بیان
میں تبدیلی کے سلسلے میں۔ اور یہ اس لئے بھی قابل توجہ ہیں۔
کہ افسانے ہو یا ناول یا شاعری کی کوئی صنف، انداز بیان
اور ہیئت کو ہر دور میں بڑا بنیادی دخل رہا ہے۔ چنانچہ

اصولی طور پر نئے افسانہ نگاروں کے اس دعویٰ سے نہ صرف یہ کہ کوئی اختلاف کرنا (اور وہ بھی محض برائے اختلاف) کوئی صحت مند بات نہیں ہوگی۔ لیکن یہ بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے کہ ہئیت اور طرز بیان کا ایک ناگزیر تعلق اس مواد سے ہوتا ہے جسے برت کر لکھنے والا کچھ تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ مرثیہ کا مواد ہی مرثیہ کی ہئیت میں کھپ سکتا ہے۔ مزاحیہ نظم کی فورم ایسے مواد اور واقعات کے سلسلے میں ذہن میں بھی نہیں آسکتی۔

نیا افسانہ نگاروں کی طرف رجوع کیجئے تو وہ بھی مواد کی اہمیت سے منکر نہیں ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ مواد کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے گرد و پیش کے مادی ماحول ہی سے واقعات اور کرداروں کو منتخب کرنے کے مدعی ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے فنکارانہ رویہ کو حقیقت پسندانہ بھی کہتے ہیں۔ یہ تمام عناصر وہی ہیں جن کو ترقی پسند ماضی کے ادب کے مقابلے میں اپنا سب سے بڑا اجتہاد کہتے رہے ہیں۔ اور ادب کا زندگی سے رشتہ استوار کرنے کے مدعی بھی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ آج کا نیا فنکار اگر ایک طرف ترقی پسندانہ معیار و اقدار فن کو ماننے کا مدعی ہے۔ تو وہ اس ہی سانس میں اپنے آپ کو ترقی پسند اور ادب کا باغی بھی کہتا ہے۔ (اور شاید اصل ترقی پسند اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہے)

بغاوت کا یہ مفہوم کہ اس کے پس پشت تعمیر کا خلوص منقلب کرنے کی آرزو اور عمل موجود ہوں یہ بڑی خوش آئند بات ہوتی ہے لیکن اگر صورت حالات ان دونوں عناصر سے خالی اور برعکس تو اس بغاوت کا مفہوم نیت اور عملی اقدامات کے بارے میں شکوک اور شبہات کا سر اٹھانا عین ممکن ہوسکتا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ نئے افسانے کا تجریدی اور علامتی فن کے بارے میں نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ کچھ باتیں سوچ لی جائیں۔

علامت نگاری کے متعلق پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ اس کو برتنے پر فخر و افتخار سے بغلیں بجائی جائیں۔ ہمارے یہاں غزل کی شاعری میں تشبیہات استعاروں، اور رموز و کنایات کی شکل میں ڈیڑھ دو سو برسوں سے برتا جارہا ہے۔ اردو نثر کی بات کیجئے تب بھی معراج العاشقین اور سب رس سے لے کر تمام پرانی داستانوں میں اس کا استعمال عام ملتا ہے۔ اگر یورپی ادب کی بات کی جائے تب بھی جون بنیئن (JOHN BUNYAN) کی پلگرمز پروگریس اور گلیورز ٹریولز سے لے کر مابعد الطبعیاتی شعر کے مدرسۂ فکر تک ایک مربوط سلسلہ پارینہ ملتا جارہا ہے۔ اور پہلی جنگ عظیم کے دوران جو تجربہ ایک ادبی دھماکہ کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ اب اس کی صدائے بازگشت بھی دھندلی پڑ چکی ہے۔ یہی کچھ تجریدیت کے ساتھ بھی گزری ہے۔ کہ پیرس جو اس حربہ کا سب سے بڑا اکھاڑہ تھا اب وہ بھی اس فن کے پہلوانوں کے بغیر سونا سونا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود ہمارا نیا افسانہ نگار ان بھولی بسری تیکنیکوں پر سے اپنی دستار افتخار میں سجاتا پھر رہا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کسی تکنک یا کسی فن کی قدامت اس کی DISQUALIFICATION نہیں ہوتی۔ اور نہ لازمی طور پر ہوسکتی ہے۔ اوپر جو سوال اٹھایا گیا ہے اس کی نوعیت بھی یہ نہیں ہے کہ علامت نگاری یا تجریدیت کی مذمت کی جائے۔ یا ان کو سرحد پار ڈھکیل ڈالنے کی کوئی تحریک چلائی جائے۔ ترقی پسند نقطۂ نظر سے ہی سوچا جائے تو بھی ان دونوں رجحانات کا ابتدائے بیسویں صدی میں رواج پانا در رومانوی تحریک کے خلاف اس بغاوت کی علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو اخیر اخیر میں وکٹورئین مورلٹی کے بھاری پتھر کے تلے دب دبا کر نمائشی اخلاق کا ہمیشہ ڈھول بن گئی تھی اب سے ساٹھ ستر برس پہلے کی اس دنیا میں یہ تحریکیں اور امکانات کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ تم بیسویں صدی کی دوسری ...

میں پیرس کلچرل کانفرنس کے بعد ترقی پسند عالمی تحریک کے عالمی احیا کو ممکن بنا رہے تھے، مطلب یہ نہیں ہے کہ علامتی اور تجریدی تحریکیں ترقی پسند تحریک ہی کی کوئی شکل نہیں تھی۔ بلکہ اشارہ یہ کرنا مقصود ہے کہ ان دونوں تحریکوں نے یکے بعد دیگرے قدیم ادبی طرزوں کے خلاف یک لخت اتنا شدید طوفان برپا کر دیا تھا کہ عہد دکٹوریا، ڈی ایس ہیتھو آرنلڈ وغیرہ جیسے جدید ترین (اپنے دور کی نسبت سے) ستون ڈھے گئے اور ادب میں انقلاب پسندی کی واضح راہ پڑنے لگی۔ لیکن پھر وہی یورپی فضا تھی۔ جن میں ان دونوں تحریکوں کے خلاف پوری ادبی فضا صف آرا ہو گئی۔ اس لئے کہ یہ دونوں ہی تحریکیں مبالغہ آرائی کی رو میں بہتی ہوئی اپنے ابتدائی کردار کو چھوڑ کر اتنے ان دیکھے راستوں پر پڑ گئیں کہ پورا مادی ماحول اور اس کی تمام جاندار اشیا اپنی اصل کی پرچھائیاں بن کر رہ گئیں۔ اور جیتا جاگتا آدمی اور اس کا ماحول لایعنی، علامتوں اور چند آڑی ترچھی لکیروں کا بے معنی ضمیمہ بن کر رہ گیا۔ عالمی ترقی پسند تحریک ماضی بعید ہی میں نہیں بلکہ ان علامتی تجریدی تحریکوں کے خلاف بھی سب سے زیادہ اور شدید ردعمل تھا۔

ترقی پسند تحریک جن دنوں عالم شباب میں تھی۔ تو بڑے بڑے ادبی پارسا بھی اپنے آپ کو ترقی پسند کہلوانے کی فکر میں حاشیہ نشینی کو اپنی معراج سمجھتے تھے، یہ کوئی ایبسٹرکٹ بیان نہیں ہے۔ بلکہ ابھی تک اس صورت حال کی زندہ مثالیں ہمارے آپ کے درمیان جی جاگ رہے ہیں پھر جب وطن عزیز میں اس تحریک پر تعزیری آرے چلے تو ان پارساؤں کو ہم سب نے اپنی اپنی گردن بچانے کی فکر میں مذہب اور تقدس کے مفلر لپیٹے بھی دیکھا۔ پھر بات اور آگے بڑھی تو ترقی پسندوں کو دشنام اور طعنوں سے نوازتے بھی دیکھا گیا۔ یہ گروہ بھی اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک کا باغی گروپ ہی کہتا تھا۔

جس نے بعد حب الوطنی کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو روپوش کر لیا۔ ہماری موجودہ نئی نسل بھی اس ہی باغی گروپ کی EXTENSION ہے۔ یہ بھی اپنے آپ کو ترقی پسند روایات فکر و فن کا باغی کہتی ہے۔

اس نسل کے متقدمین کے لئے حب الوطنی، مذہب اور تقدس کی آڑ، سہارے کے لئے مضبوط دیواروں کی طرح میسر ہو گئی تھیں۔ لیکن نوخیز لوگ وقت تک پہنچتے یہ سب کچھ یا اتنا بڑا ACCEPTED FACT بن گئیں، جس کا اعادہ قطعاً غیر ضروری تکرار بن گیا۔ یا پھر اقتصادی یا معاشی بدحالی نے ان سہاروں کو نئی نسل کو ثانوی حیثیت دے دی۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک غیر ضروری اور دھندلے وژن (VISION) کی صورت میں نکلا۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تو مادی حالات سے آگہی اور تاریخی شعور کی رو ترقی پسندی کی مخالفت کے ریلے میں بہہ گئے، اور دوسری طرف اقتصادی اور معاشی بحرانوں نے وطن مذہب اور تقدس کو بے سہارا دیوار بنا دیا، اس صورت حال کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ اب سامنے ہے۔

یعنی یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ آجکل کے افسانوں میں وطن اس کے باشندے ان کے مادی ماحول کے احوال و کوائف ان کے اسباب و علل اس کے نتائج وطن دوستی کے نعرے غرض سبھی کچھ لاشعور کے اندھیرے غاروں میں پڑ کر طاق نسیاں بن چکے ہیں۔ اور ان اندھیر غاروں سے ہمارا نوجوان افسانہ نگار چند ایسے خطرناک اور عجیب الخلقت ہیولے برآمد کر رہا ہے جس سے خود بھی گھگھیائے ہوئے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان افسانوں کی فضا عجیب سی دم گھونٹنے والی فضا ہے۔ اس کے ماحول طلسماتی اور اس کے کردار انسانوں کے سایہ ہیں ان کی حرکات اور سکنات باتیں کرنے اور سوچنے کے طریقے بائل

HYPNOTIZED ہیں۔ جیسے غیر مرئی قوتوں اور بھوت پریتوں نے ان کے دل و دماغ اور حلقوم کو جکڑ رکھا ہے۔ آسیب زدہ بستیاں جن میں ویرانی اور نحوست کا راج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ موجودہ صنعتی معاشروں اور عالمی فضا پر ٹیکنولوجی کے تحت تباہ کن اثرات کے منڈلاتے ہوئے سایوں کی فضا اور اس کے اندر خوف سے دبے ہوئے انسانوں کی کہانیاں ہیں۔

اگر واقعی ایسا ہی ہے (؟) تو انسان اور اس کے ماحول کی یہ تجرید کو علامتی شکلوں سے کیا مقصد حاصل ہو رہا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ سب کچھ ترقی پسند انکار رد نظریات اور فن کی ضد میں بغاوت کی جا رہی ہے۔ تو اولاً یہ کہ اس سارے عمل میں ترقی پسند نظریات کی کہانیاں نفی ہوتی ہے۔؟ اور دوئم یہ کہ اگر ایسا سب کچھ ترقی پسندی (یا جدید ترقی پسندی) ہی ہے تو اس ساری تحریک کا مثبت نقطۂ نظر کیا بن رہا ہے۔؟

نیا افسانہ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔
صنعتی معاشروں کی نفی اور اس کے خلاف تحریک تو خود ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اور اس مقصد کا سب سے واضح پہلو یہ تھا کہ سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے ان مہروں کی نشاندہی کی جائے جو یہ زہر پھیلا رہے تھے نئے افسانہ نگار نے جو روش اختیار کی ہے وہ یہ کہ اس زہر فشانی کے ذمہ دار اصل مرکزوں کو دیدہ و دانستہ، پس پشت ڈال کر اپنے ہی لوگوں کو مطعون کرنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ غریب لوگ اس صورت حال کے قطعاً ذمہ دار نہیں ہیں۔ بلکہ سرمایہ داروں کے جال میں اسیر گماشتوں اور ٹیکنوکریٹس کی لوٹ کھسوٹ طبع کی بلاؤں کے ستائے ہوتے ہیں۔ اگر اپنے ہی گرد و پیش کے مظلوم کرداروں ہی کو نشانہ طعن و تعریض بنانا ہمارے نوجوان افسانہ نگار کے فن کے مقصد ہے۔ پھر سرمایہ داروں ان کے گماشتوں اور سرمایہ داری کے جال میں اسیر ٹیکنوکریٹس کے کردار اور اس نوجوان نسل کے کردار میں کہاں خطِ فاصل کھینچی جائے، جو آج اپنی دنیا کا نمائندہ ہے کہ اس میں موجود ظلم و جبر کے خلاف علم بلند کرنے کا دعوے بھی ہے اور خود ہی ان مظلوموں کے ذبیحہ کا ثواب بھی کما رہا ہے۔

بالعموم دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارا نوجوان افسانہ نگار صنعتی شہروں کی اس نسل کے خلاف مصروف جہاد ہے جو نئی سائنس، ٹیکنولوجی اور سرمایہ دارانہ ماحول میں ایسی ہم رنگ ہو گئی ہے کہ انسان کی انفرادیت ہی گم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ نئے افسانہ نگار کا دوسرا اہم نظریہ اور نکتۂ جہاد ہے۔ اگر اس مفروضے کو بھی صحیح مان لیا جائے تب بھی یہ پوچھنا پڑتا ہے کہ اس کی ذمہ داری نیا افسانہ نگار کس کے سر تھوپ رہا ہے۔؟ اور اصل ٹارگٹ (TARGET) اس کی نظروں سے کیوں اوجھل ہے۔؟ گویا دونوں صورتوں میں بات ایک ہی نوعیت کی ہے۔

اگر یہی کچھ ترقی پسندی کی مخالفت ہے (جو کہ وہ بیان کی گئی ہے) تو اس کا بالکل سیدھا سادا اور منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نئے افسانے کا فن اس کی علامت نگاری اور تجریدی فن کاری کا تمام حسن (؟) اور اس کی افادیت(؟)، مظلوموں کی نہیں بلکہ ظالموں کی طرف داری ہے۔ جس کی پردہ پوشی وہ بڑے فن کارانہ انداز میں کر رہا ہے۔ اور اس دعویٰ کے ساتھ کر رہا ہے کہ وہ گویا اپنے عہد کے خلاف کوئی بہت بڑی جنگ کر رہا ہے۔

میری ذاتی رائے ہے کہ ہمارا نوجوان افسانہ نگار واقعی اپنے خلاف ایک بہت بڑی جنگ کر رہا ہے یہ عہد جو انسانی تاریخ میں عوامی قوتوں کی اور عوام کی عملی جنگ کا عہد ہے۔ سرمایہ داری اور اس کی ہلاکت خیزیوں کے خلاف جنگ کا عہد۔ اس ہلاکت خیزی کے خلاف جنگ کا عہد جس کا تعلق سیاسی اور معاشی میدانوں سے لے کر علم و ہنر، شعر و شاعری

اور تہذیب وثقافت کے میدانوں تک۔ میں غریب عوام کا اور محنت
کشوں کا خون پی جانے کے درپے ہے۔ اور ہمارا نوجوان اپنے اس
عہد ساز انسان کے خلاف نبرد آزما ہے واقعی فکری اعتبار سے اردو
کا پاکستانی جدید افسانہ اپنے عہد کی ان مثبت قوتوں کے خلاف ایک
بہت بڑی جنگ لڑ رہا ہے۔ جن کے خلاف پہلے ہی سرمایہ داروں
کی تمام قوتیں کئی صدیوں سے مورچے بنائے ہوئے ہیں۔

فکری میدان نوجوان افسانہ نگاری کے اس احوال کے
بعد اس کی علامتی، تجریدی، تکنیک اور اپروچ کے بارے میں کہنے
کو کیا باقی رہ جاتا ہے۔ یورپ کے صنعتی ماحول کے خلاف تو جنگ
میتھو آرنلڈ اور کارلائل نے بھی لڑی تھی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی
اشتراکی نہیں تھا۔ (بلکہ میتھو آرنلڈ سخت مذہبی اور کارلائل ایک
"نیٹی قومیت" یعنی PHILLISTINSE کا نمائندہ تھا)
لیکن اپنی اپنی کلاسوں کا نہایت بلند آہنگ نمائندہ ہونے کے
باوجود صنعتی سرمایہ داری کے خلاف انہوں نے بھی کبھی علامتی انداز
بیان اختیار نہیں کیا۔ یہ ہماری نئی نسل جو اپنے آپ کو بے حد
بے باک نڈر بلکہ منہ پھٹ فن کار کہلوانا پسند کرتی ہے۔ اب سے
سو، سوا سو برس پہلے کے ادیبوں جتنی بھی جرأت گفتار کا مالک
نہیں پاتی تو ادب کے مقابلے میں کلاسیکی موسیقی کیوں اختیار
نہیں کرتی۔ جس کی ساری جرأت اظہار ایک سچا سُر نکالنے میں
مرتکز ہے۔ اور جس کا سننے والا اسے سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو شرما
شرمی تان کے ساتھ ساتھ خود بھی بل کھاتا ہے یہ موسیقی ہمارے
فنون لطیفہ میں آج سب سے بڑی علامتی فن بن کر رہ گئی ہے
کلاسیکی موسیقی کے متعلق اس صورت حال کی طرف اشارہ سے
مطلب اس فن کی تضحیک مقصود نہیں ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ جب
کسی فنکار کا فن اس کے اپنے ہی لوگوں کے درپے آزاد ہونے
کی راستہ کاٹ جائے اور بہرحال فنکارانہ اپج کی ترقی مقصود
ہی ہو تو کم از کم ایسے فن کی طرف رجوع کرنا اپنے اپنائے دہر یہ
کرم گستری ہوتی ہے۔ جس سے ان کا اگرچہ بھلا نہ ہو تو کچھ بگڑے بھی نہیں

بات دراصل یہ ہے کہ بالعموم علامت نگاری یا تجریدی
فن اپنی بنیاد میں عجز و اظہار کے کڑے لمحات میں بڑا سہارا ہوتا ہے
کم از کم جدید دور کی تمام ہی قسم کی علامتی اور تجریدی تحریکات نے
اب تک یہی ثابت کیا ہے کہ اس سے کہیں زیادہ جاندار حربہ تو کسی
حد سمبالزم (رمز و کنایہ) ہی رہا۔ جس نے اپنے یہاں بھی غزل کے
ایسے فن شریف اور "متین" کو مشکل اور کڑے وقتوں میں دودھاری
تلوار بنانے میں معاونت کی۔ علامتی نگاری اور تجریدیت سے اگر
یہی کام ہمارا نوجوان افسانہ نگار نکالنا چاہتا ہے تو اول تو یہ اپروچ
ہی غلط ہے کہ علامتوں اور تجریدی اشکال کی اپنی متعینہ قدریں نہیں
ہیں۔ کم از کم یورپی ادب میں تو ایسا نہیں ہے۔ ہاں قدیم اساطیر
کی بات الگ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کے اظہار کی زیادہ سے
زیادہ ضرورت اس وقت ہی پڑتی (یا پڑ سکتی) ہے۔ کہ جب
فنکار کسی مسئلہ کے کھلے اظہار سے "فساد خلق" کے خوف کا خوف
یا اندیشہ رکھتا ہو۔ ان معنی میں کہ نیا افسانہ نگار سرمایہ دارانہ
چالوں اور ان کے جالوں کے پھیلاؤ میں ان کی معاونت کرنا چاہتا
ہے۔ تو اس کی یہ علامت نگاری، تجریدیت اور ABS-
-TRACTISM واقعی مبنی بر حق ہے۔ کہ ایسی باتوں
کو کھل کر بیان کرنا خوف فساد خلق کا سبب بن سکتا ہے اس
کے علاوہ افسانے کے جدید فن میں (بلکہ نقطہ نظر میں بھی) ان
سارے لوازمات کی اور کوئی دوسری تاویل نہیں ملتی۔ جس
کا امتیاز یہ اپنے لئے طُرّۂ فخر و امتیاز سمجھے ہوئے ہیں۔

علی احمد فاطمی

ماضیٔ قریب کی ادبی تاریخیت اور نئی نسل

نیرنگیٔ وقت اور تبدیلیٔ صورت کا کون قائل نہیں۔ بڑے بڑوں نے اس کے آگے گھٹنے ٹیکے ہیں۔ اور سر جھکایا ہے اگر فطرت اپنے آپ میں یہ خصوصیات نہیں رکھتی تو بازار حیات کا سارا کاروبار منجمد ہو کر رہ جاتا، اور دنیا ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر سمٹ جاتی، ارتقا کی ساری کوششیں غضب ہو جاتیں پھر ہم وہ ہم نہ ہوتے جو آج ہم ہیں بجائے اس کے کہ کہیں کسی جنگل میں اپنی ناموس کو کسی بڑے پتے یا موٹی چھال میں چھپائے بے مقصد ادھر ادھر آوارہ گردی میں مصروف رہتے یا کشت و خون کی ہولیاں کھیلتے رہتے، ——— لیکن قدرت نے ازل سے ابد تک کی تعمیر و تشکیل کی کڑیاں کچھ اس انداز سے پروئی ہیں کہ ہم اشرف المخلوقات کی شکل اختیار کر کے کچھ سے کچھ ہو گئے اور ہوتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ زندگی کا ارتقائی سلسلہ عجیب و غریب دلچسپیوں و نیرنگیوں کا حامل ہے۔ جس کی تفصیل فی الوقت نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مناسب،

قدرت کی متعدد ایجادات و اختراعات سے جہاں ہمیں اختلاف و انحراف ہوتا ہے، وہیں پر بعض باتیں خود بخود توصیف و تحسین آمیز انداز میں ہمارے دل میں بیٹھتی چلی جاتی ہیں۔ ان تمام باتوں کا ضرور نسلم تمام خصوصیات کا وہ ارتقائی عمل ہے جو اپنے آپ فعالیت اور تکمیل کی حدوں کو چھونے کے لئے مضطرب و مجتہد رہتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس اضطراب میں دانستہ یا شعوری طور پر ہمارا بہت زیادہ رول نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے پس پردہ دل و دماغ کی متبدل اور خود غرض خواہش کا لاشعوری عمل سرگرداں رہتا ہے۔ اور یہی عمل وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ کبھی متحرک اور کبھی متشدد بھی بنا رہتا ہے۔ جس طرح سے وقت کا گزرنا فطری ہے ایک نسل کے بعد دوسری نسل کی آمد بھی فطری ہے۔ ہزار ہا برس سے یہ سلسلہ رواں دواں ہے۔ لیکن کسی نے اس سلسلے کی تاریخ مرتب نہ کی، ہاں اگر تاریخ مرتب ہوئی ہے تو اس سلسلے کے ان اہم منفرد اور روشن واقعات، حادثات، اور رجحانات کی جو ان سلسلوں کے ذریعہ انسان اذہان اور ادوار کی نہ صرف تاریخ مرتب کر جاتے ہیں۔ بلکہ روشنیاں اور حوصلے بھی عطا کر جاتے ہیں۔ جس کی روشنی میں ہم ان تاریکیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ازل سے ہمارے وجود سے مٹی رہتی ہیں۔ اس کے بعد کی روشنی سے بعد کی نسل اپنا قافلہ تیار کرتی ہے۔ اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، اور چلتا رہے گا۔ نقوش اسی کے سبب ابھرتے رہیں۔ جن کی شکل منفرد اور غیر معمولی طور پر تعمیری اور انتشاری بھی ہوتی ہے۔

تقریباً اس بے ربط سی تمہید کے ذریعہ گفتگو کا ایک سرا بہرحال گرفت میں آ جاتا ہے کہ زندگی اپنے کشکول میں بہا ہزاروں واقعات چھپائے رکھتی ہے۔ کچھ ہمیشہ ہمیش

کے لئے ایسے دب چکے ہوتے ہیں جن کو کریدنا غلط اور بے سود ہوتا ہے اور کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو ختم ہو کر بھی اپنی ایک شناخت چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک ایسی شناخت جو اپنے آپ میں دائمیت کی خصوصیات رکھتے ہیں جن سے نہ صرف ان کو کبھی موت آتی بلکہ وہ دوسروں کو بھی زندگی عطا کر جاتے ہیں۔ یہ بات صرف زندگی کے بارے میں ہی بلکہ اس کے تمام شعبوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جن میں زندگی براہ راست منعکس ہوتی ہے۔

ادب جو زندگی کی تعبیر و تفسیر ہے ——— ادب جو زندگی کی تنقید اور تحقیق ہے ——— ادب جو زندگی کی تفصیل اور تخفیف ہے ——— ادب جو زندگی کی تصویر اور جس میں اس زندگی کا تجزیہ اور آپ جیتے ہیں جاندار اور سچا عکس ہمہ وقت رقص کرتا رہتا ہے۔ لہذا ایسے آئینہ زندگی میں زندگی کی تمام کروٹوں کا جھلک آنا ہر چند کہ اپنے آپ میں استعجاب کا حامل نہیں لیکن خود بخود عمل کا ایک ایسا سانچہ ہے جس کی جاذبیت بہرحال کسی نہ کسی مقام پر کبھی متاثر اور کبھی حیران کر جاتی ہے۔ لہذا ایسی صورت میں تمام نیرنگئ صورت اور تبدیلئ وقت کا شکار جتنا زندگی ہوتی ہے۔ کم و بیش اتنا ہی ادب بھی ہوتا ہے خواہ اس کی عمر ڈھائی ہزار برس کی ہو یا ڈھائی سو برس کی۔

اہل علم واقف ہیں کہ اردو کے صالح اور سیدھا ادب کی عمر گذشتہ تقریباً ڈیڑھ دو سو برس کے درمیان شروع بھی ہے اور نہ اس وقت ختم بھی۔ ——— ۱۸۵۷ء کا حادثہ ہو یا کوئی بھی بڑا حادثہ زندگی پر اگر جارحانہ طور پر اثر انداز ہے تو یقینی طور پر ادب پر بھی اثر انداز ہے۔ [illegible] پہلو یہ ہے کہ وہ حادثہ جو زندگی اور سماج کو منتشر کر جاتا ہے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی تعمیر کا نقطہ آغاز بن جاتا ہے۔ ادب کے سلسلے میں [illegible] طور پر کہی جا سکتی ہے۔ تبھی تو حالی نے میکالے [illegible] والی بات کہی تھی کہ

"رات جتنی تاریک ہوگی لالٹین کی روشنی
کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اسی وقت
ہو سکے گا"

جو لوگ اس سے اختلاف کریں گے ان کے پاس سرسید، حالی، شبلی، آزاد، اور پھر ان کے ساتھ ساتھ نذیر احمد، سرشار، شرر کی فنکاریت کا کیا جواز ہوگا۔ ان کے لٹریچر کی جامعیت، واقعیت، زندگی سے وابستگی، اور علم و فن میں ڈوبے ہوئے ذہن اور قلم کو وہ کس خانے میں رکھیں گے، ؟ سرسید کی تحریر و تحریک، حالی کی شاعری کی تقدیس و تقدیم، شبلی کی تاریخی مراجعت، آزاد کے تمثیلی مناظر، نذیر احمد کے اصلاحی مقالے، سرشار کی تہذیبی تقلیب، اور شرر کی تاریخی تمثیل ——— سب کے سب بظاہر انفرادی شکل لے کر آگے بڑھے، لیکن ان سب کی اندرونی ترتیب، باطنی لہر کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو ان سب کے دل کی لگن، قلم کی جھجھک میں ایک سا درد، ایک سا سوز محسوس ہوگا، ان سب قلم کاروں نے اپنی ایک علاحدہ تاریخ مرتب کی، اپنے آپ کو ادبی تاریخ کا ایک ایسا جزو لازم بنا دیا کہ ہم ان ناموں کی تسبیح پڑھے بغیر ادب کا کوئی سپارہ نہ پڑھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ سارا ادب بکھر کر رہ جائے گا۔

جب ان قلم کاروں نے صرف چالیس پچاس برس کی طوالت میں ہی اپنے غیر معمولی کارناموں کے ذریعہ ادب کا ایک جامع تصور اور زندگی کا ایک خوبصورت سلیقہ دیا، تو ہمیں وہ زندگی ملی، وہ حوصلہ ملا جو ارتقائی سفر کو نہ صرف آگے بڑھاتا ہے بلکہ دعوت تحریک بھی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدا ہوتے ہی ہمارے اندر ایک خاص قسم کا شعور اور بیداری کروٹیں لینے لگیں۔ زندگی اور ادب کے رشتے اور اس کے امتزاج کی واضح شکلیں سامنے آنے لگیں، اس پر جب پریم چند نے ادب اور زندگی دونوں کو میدان کی کھلی اور چمکتی ہوئی دھوپ میں، کھیت اور کھلیان میں لا کر کھڑا کیا، تو ایک لمحہ کے لئے رومان میں ڈوبے ہوئے ہمارے ذہن میں ارتعاش پیدا ہوا۔ لیکن زندگی کی زندہ اور بے رحم حقیقتیں ایسے تمام ارتعاش کو منجمد

آگے بڑھ جاتی ہیں۔

پریم چند کے قلم نے کچھ اور کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن ادب کی سُرمئی فضا میں زندگی کی بھربھری مٹی کو قوس قزح کی طرح رنگین کر کے پیش کر دیا۔ اور اس طرح پریم چند کے ذریعہ زندگی کا جب ایک اور باب کھلا اور اس نے بڑے سلیقے سے اپنے عہد کی تمام انفرادیات کو تاریخ کے اوراق میں سمیٹ لیا۔ ——— ان تاریخی اعمال کے ذریعہ ایک ایسی منظم شکل سامنے آئی، جس کے لئے ہم عرصہ دراز سے آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے، یعنی ان تمام بکھری ہوئی ارتقائی صورتوں نے ایک تحریک اور تنظیم کی ہیئت اختیار کر لی۔ اور اسی طرح سے ادب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ایک اور نئی تاریخ ترتیب پانے کے لئے مچلنے لگی، اس کے بعد کی بیس پچیس سال کی کہانی ہمارے سامنے ہے۔ اس درمیان زندگی کئی حادثات سے الجھی، ٹکرائی اور پھر شکستہ ہو کر بکھر گئی۔ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ جب زندگی کے ٹکراؤ اور چور چور ہونے کے دن آتے ہیں۔ تو سمجھو کہ ادب کے جڑنے اور بننے کے دن آ گئے۔ کم و بیش کچھ ایسا ہی ان حادثات کے ساتھ بھی ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی ایک نیک مبارک فال پھر ہند کی تقسیم اور فسادات کا سلسلہ ایک واصیات عمل، دونوں کے پیچھے ظلم و ستم، کشت و خون، نفرت وحد کی دلدوز کہانی پوشیدہ ہے۔ اور اس کہانی کی کوکھ سے گزشتہ ادب نے جنم لیا لیکن اس بار شاعری کے مقابلے میں فکشن کی باری تھی۔ جو لوگ اس سے بھی اختلاف کریں گے، ان کے پاس کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت، قاسمی کی افسانوی ہنرمندی اور فنکارانہ چابکدستی کا کیا جواز ہوگا؟ شاعری بھی ہوگی، فیض مخدوم، سردار وغیرہ اور بھی کئی لوگ جنھوں نے اس میں اضافے کئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بار فکشن آگے تھا۔ جو نذیر احمد سے شروع ہو کر راشد الخیری اور پریم چند کے ذریعہ اس گروپ تک پہونچا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ سارا جوش مقصد سب کچھ وہی۔ لیکن حادثات کے مزاج نے انوع فنکاریت ذرا بدل دیا تھا۔

کرشن چندر کے رومان سے جھانکتی ہوئی زندگی کی بے رحمی، منٹو کی جنسی حقیقتوں کے درمیان جھولتی ہوئی انسانی زندگی، بیدی، عصمت کے یہاں عورت کی بے بسی، قاسمی کے یہاں دیہات کی معصومیت اور بے ہنگم پن ——— سب کچھ ایک نئے ادا دلکش اور فنکاریت سے پُر ہو کر ادب سے ایسا مجسّم کہ زندگی تڑپ کر رہ گئی، لیکن ادب صحت مند ہو گیا کہ جس کی صحت کو کچھ لوگوں نے بدنیتی سے دیکھنا شروع کیا۔ بہانہ یہی کہ ادب کہیں کہیں زندگی سے اس انداز سے چمٹا کہ زندگی ہی زندگی نظر آئی ادب اوجھل ہو گیا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر دور میں ایسا ہوا ہے لیکن تخلیقیت کے اعلیٰ جوہروں سے محروم اور ستائے ہوئے معترضین ایسے لمحات کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اور اس طرح انگشت نمائی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ہر دور میں ایسا ہوتا آیا ہے اس دور میں بھی ایسا ہی ہوا۔

۴۷ء، ۴۸ء فوری طور پر اپنی آگ بجھا گیا۔ اور زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آنے لگی۔ تو ادیب کو بھی معمول پر آنا چاہئے لیکن ہوا اس کے برعکس، ——— زندگی میں گرمی میں غائب ہوئی تو ادب میں پھیکا پن بیٹھ گیا۔ گزشتہ موسم کی تیزی کب تک ساتھ دیتی، لہٰذا ایک اوب سی پیدا ہوئی، اور اسی مقام پہ تبدیلی صورت نے انگڑائی لی، اور بہانہ بنا فن اور ادب کا ترسیل اور تفہیم کا ——— بات تقریباً بہرحال ملاقات کی تھی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے بات بننے کے لئے بہرحال کچھ نہ کچھ بہانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ لوگ پرانی صورتوں کو نئی صورت دینے کے لئے ان بہانوں کی طرف لپکے، اور ان میں گرمی پیدا کرنے کے لئے کچھ ان صورتوں میں شکست و ریخت شروع کر دی، چونکہ ذہین لوگوں کا عقیدہ ہے کہ تخریب سے ہی تعمیر کے سوتے پھوٹتے ہیں، اس لئے ابتدا میں معقول اذہان نے ان کا استقبال کیا۔ لیکن جلد ہی یہ احساس ہونے لگا کہ اس تخریب میں باغیانہ اور دھماکہ خیز عناصر کی شدید کمی ہے۔ تخریب زیادہ ہے۔

تعمیر کم! اس شکست و ریخت کی کہانی زیادہ پرانی نہیں ہے اس لئے آنے والی تاریخ ہی اس کا فیصلہ کرے گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔ فیصلہ کن اعلان تو وقت خود کرے گا۔ کیونکہ اس کے انصاف و اعلان سے ہی تاریخ ترتیب پاتی ہے۔

ادب میں صرف احساس کی عمر دس بیس برس سے کم نہیں ہوتی۔ گزشتہ پندرہ بیس برس کی ادبی شکست و ریخت میں مقصدیت اور افادیت کا فقدان کا احساس رفتہ رفتہ جب ہو چلا کہ جھنجھلاہٹ لازمی تھی۔ اور اس بیچ زندگی بھی جھنجھلاہٹ والی الجھنوں کے بھنور میں پھنس گئی۔ انسانی ذہن اپنی تمام آسودگیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ناآسودگیوں میں بدلتا دیکھ کر تڑپ گیا لیکن اس بار اس کی تڑپ اور جھنجھلاہٹ ماضی سے یکسر مختلف تھی۔ اس میں گرمی اور استقلال، خوشی اور استدلال، کی شدید کمی تھی۔ زندگی اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہو گئی کہ ہر شخص کنفیوز اور الجھ گیا۔ اور ایسا لگ رہا تھا کہ جملہ حفاظتی اقدامات کے باوجود چشم زدن میں سب کچھ تاراج ہو جائے گا۔ خوب صورت زندگی کا سارا سرمایہ چوراہے پر ذرہ ذرہ ہو کر بکھر جائے گا ——— جدید زندگی کی یہ عظیم الجھن ادب کی اس الجھن سے جا ٹکرائی جو اس کا پیش خیمہ ہی ہوئی تھی۔ نتیجتاً لمحہ بھر کے لئے فضا میں دھند ہی دھند چھا گئی۔ اور اس سے بھی زیادہ صفحۂ قرطاس پر جا بکھری جس نے ادب میں کچھ ایسے سیاہ بادل تیرا دیئے کہ تخلیق کار سے لے کر قاری سب اس دھند میں گم ہو گئے۔ اور ایک عجیب سے تاریکی بے راہ روی، بے ترتیبی ترتیب پانے لگی۔

تخلیق نے جتنے ہنگامے اس دور میں کئے شاید کسی دور میں نہ کئے ہوں گے۔ ایسا لگا کہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء دو کو نے مل کر کوئی بڑی ہنگامی صورت اختیار کر لی ہو۔ یا کم لکھنے والی پیڑھی لیکن کیا یہ حقیقت ہے یہ سچ ہے کہ زندگی انتشار اور انحطاط کا شکار ہو گئی۔ جتنا البتہ ماضی کے مشکل اور پیچیدہ ہو گیا۔ لیکن جتنا ہوا اس سے زیادہ ظاہر کیا گیا۔ سارا کے سارا ادب اس مصنوعی اظہاریے کے تلے دب کر اپنی حقیقی شناخت کھو بیٹھا۔ اور ایک مخصوص قسم کی بے کیفی اور بدمزگی فضا میں تیرگی۔ شعر و ادب میں گھٹن کا احساس بے چینی پھیلنے لگی۔ قدرت ہچکیاں لینے لگی۔ یہ سب کچھ برداشت تھا کون اعتراض کرتا۔ لیکن وہ لوگ جو ادب کی افادیت اور مقصدیت کے قائل نہیں تھے اور انفرادی آزادی اور بے راہ روی پر یقین رکھتے تھے۔ اپنے آبا و اجداد کے تمام سرمایہ سے یکسر منحرف اور مختلف ہو کر اپنی ناجائز اور غیر ادبی کوششوں میں ادب کی ان بنیادی قدروں کو کھنگال گئے اور صدہا برس کی پیوست روایت کو جڑوں سے ہلا دینے کی کوشش کرنے لگے۔ ——— ادب، فن تبلیغ، ترسیل کی ایسی دھینگا مشتی ہوئی کہ خدا کی پناہ، ادب ادب نہیں، مجذوب کی بڑ خلاقی فلسفہ کی نام نہاد نقالت کی ملی جلی ایک ایسی بھدی شکل اختیار کر گیا کہ قارئین کو اپنے غموں سے کم اس کے اظہار پر زیادہ کوفت ہونے لگی۔ وہ بلکنے لگے، بھڑکنے لگے، اور پھر تیزی سے ان کی تعداد سمٹنے لگی جہاں انہوں نے دھواں، سمندر، چیخ، خون وغیرہ دیکھا تیزی سے آگے بڑھ گئے، کیونکہ آگے بہر حال ان کے لئے تفریح طبع کے کچھ سامان تھے، غرض کہ ایک بے ربط بے ہنگم، اور لڑکھڑاتا ہوا سا قافلہ چل پڑا ——— لیکن بے ربطی اور بے راہ روی کی زیادہ عمر نہیں ہوتی۔ تیزی سے کمزوریوں نے گھیرا ڈال دیا۔ اور دھیرے دھیرے پرتیں اترنے لگیں۔ مطلع صاف ہونے لگا۔ ادب کا وہ تھوڑا سا حصہ جس نے قدرے ایمانداری اور فن کاری کے ساتھ تبدیل ہوتی ہوئی ہنگامیت کو سلیقے سے گلے لگایا تھا۔ اور حقیقتاً اپنے عہد کی ترجمانی کی کوشش کی تھی۔ اس تیری نئے پن نے اپنی اس قدیم روایت سے رشتہ جوڑا جس نے ہر ہر کے ارد گرد اپنے آپ کو روک لیا تھا۔

اس جوڑ توڑ میں دس سال گزر گئے۔ اس دس سال میں جو تعمیری اور تاریخی کام ہوئے اس کی حیثیت سے ہم جتنا چاہیں انکار یا اقرار کریں، آنے والی تاریخ اس کا فیصلہ کچھ تو کر رہی ہے، کچھ اور کرے گی۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ پچھلے زیادہ ہوئے، ادب، ادیب، ناقد، تخلیق کار ان سب کے درمیان ایک عجیب سا مصالحانہ و تاجرانہ رشتے قائم ہونے شروع ہوئے، ہر تخلیق کار اپنا ناقد خود تلاش کر بیٹھا، ناقد تقسیم ہوئے تخلیق کاروں کے اعتبار سے، درمیان میں شہرت دولت عظمت یا پروفیسر شپ لکچرر شپ وغیرہ بھی آ گئی تمام طرح کی مصلحتیں، خود غرضیاں، دور اندیشیاں عود کر آئیں، جو بظاہر گلے ملنے لگیں۔ لیکن بباطن ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے لگیں۔ ایک عجیب افراتفری کا ماحول ہو گیا۔ جیسے ابتدا میں تو یہ سمجھا جاتا رہا کہ یہ ساری لڑائیاں نقطۂ نظر کی ہیں۔ اور ادب میں نقطۂ نظر کی لڑائیاں تعمیری ہوا کرتی ہیں۔ لیکن یہ سب دل بہلاوے کی بات تھی۔ کیونکہ حقیقت تو کچھ اور تھی جب رفتہ رفتہ ان کے درمیان سے ادب ہی اٹھتا رہا تو نقطۂ نظر کی بات ہی کیا۔ لہٰذا نظریاتی پورے خلوص اور جذبے کے ساتھ ذاتی لڑائی کی شکل اختیار کر گئی اور پھر کل ہند سطح پر بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور بڑے بڑے پروفیسروں، اور ناقدوں، تخلیق کاروں یہاں تک کہ قارئین کی ایک دنیا بظاہر دو گروپ حقیقتاً متعدد گروپ میں تقسیم ہو گئی، ایک طرف اردو ادب اپنی ارتقا کی نام نہاد خوشی کا اعلان کرتا رہا۔ دوسری طرف مظلوم، معصوم زبان اپنی بدنصیبی و شرمانے نصیبی کا رونا روتی رہی۔

ایسے ہی ماحول کی کوکھ سے نئی نسل نے جنم لیا ——

وہ نئی نسل جس کی پیدائش ۵۰ء کے ارد گرد ہوئی، اور جس نے ہوش و حواس کی آنکھیں ۶۵ء، ۷۰ء کے ارد گرد کھولیں اردو زبان و ادب کی خوبصورتی اور اپنے فطری جذبے سے مجبور ہو کر اس میدان حشر کی طرف بڑھ گئے جہاں پہلے ہی کھینچا تانی اور اودھم چوکڑی مچی ہوئی تھی، معصوم، نرم اور جوشیلا ذہن ابتدا میں تعلیم و تحریک کی طرف مصروف رہا اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مطالعہ و مشاہدہ کی ایک خاص منزل پر پہونچنے کے بعد اس نے فیصلہ لیا کہ ہم اپنی ایک الگ دنیا بنائیں، تمام فضولیات سے اپنے آپ کو الگ کر کے ایک علاحدہ راہ اختیار کریں گے، اس کی یہ سوچ غلط بھی نہ تھی اس کے سامنے غلط و صحیح تجربے تھے، یہ محض ان کی ہوش مندی تھی کہ انہوں نے علیحدگی اور انفرادیت کے بارے میں سوچا —— سب کچھ ہوتا اور رہ چلا تھا۔ نئی نسل کی تیسری آواز پھوٹ چلی تھی۔ کہ زندگی کی بعض بے رحم ضرورتوں ماحول کے بعض ظالمانہ تقاضوں نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ ایک دم جوش اور جلد بازی سے کام نہ لیں۔ بلکہ سنجیدگی سے زندگی اور اس کے طویل سفر کے بارے میں سوچیں، اور یہیں پر ہم سب کا امتحان تھا —— بس اسی سوچ میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی، ایک طرف استحکام اور اعتبار کی کمزوری، دوسری طرف تخلیق کاروں ناقدوں اور پروفیسروں کی گھورتی ہوئی آنکھوں نے موقع اچھا دیکھا —— اپنے ہاتھ اپنا گروپ مضبوط کرنے کا اس سے اچھا موقع کب ملتا۔ بس پھر کیا تھا مصلحت پسندی اور خود غرضی کی دوڑ دھوپ ایک بار پھر شروع ہوئی، سیاست کے بازار میں ایک بار پھر ابال پیدا ہوا۔ اور ہماری صلاحیتیں اور ہمارا ذہن ہمارا اپنا نہ رہ کر غیر کا ہو گیا۔ اور ہم بہت آسانی سے انجماد کی طرف بڑھنے لگے۔ اور اسی دریا میں غوطے کھانے لگے جس میں ہماری اپنی کمزوریاں بھی ڈوبنے لگیں۔

موجودہ ایام حقیقتاً اسی انجماد کے ایام ہیں۔ جہاں ایک بار پھر ہم اپنے تمام سماجی و تہذیبی فرائض کو بھول کر نہ جانے کس خواب کی دنیا میں پہونچ گئے ہیں۔ ہمیں اپنی ایمانداری اور دیانت داری سے احتساب کرنا ہے۔ ورنہ

غور کرنا ہے کہ انیسویں صدی کے قلم کاروں نے ہمیں جو دیا ہے مورخ اسے رقم کر چکا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا ہمیں کیا دے چکی ہے۔ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک ترقی پسند ادب نے جس سرمایہ سے مالا مال کیا اور کس طرح نعرہ بازی خلا میں تیر گئی اس پر بھی ہماری نظر ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک جدید ادب نے جو نیرنگیاں دکھائیں، اور اس میں کتنا حصہ تاریخی صورت اختیار کرے گا، اس کا بھی اندازہ ہو چلا ہے۔ لیکن ہمیں اس کا اندازہ ہرگز نہیں ہے کہ آنے والا مورخ ۱۹۷۰ء سے شروع کرکے ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء یا اس کے آگے پیچھے کی تاریخ مرتب کرے گا تو کیا لکھے گا؟ کن اہم خصوصیات و رجحانات کا ذکر کرے گا؟ کن افسانہ نگاروں اور شاعروں کے نام رقم کرے گا ۔؟ کچھ مثبت پہلوؤں کی طرف اشارے کرے گا یا نہیں۔ لہٰذا بات غور کرنے کی یہ ہے کہ کیا ہم نے واقعی ادب کے صالح سرمایہ میں اضافہ کیا؟ کیا ہمارے پاس اپنا کوئی انفرادی سرمایہ ہے؟ کیا ہماری کوئی تنظیم ہے؟ کیا ہمارا کوئی نقطۂ نظر و ژن یا سوچ کا سانچہ ہے؟ کیا ہم حقیقی معنوں میں اپنی نسل کا حق ادا کر سکے؟ تیسری آواز بن سکے؟ ——— کہنے کو تو ایک بھیڑ ہے۔ ایک افسانہ نگار کا نام لیجئے تو دس بیس نام لینے پڑینگے (اگر نہیں لیتے تو آپ بودم ہیں پڑھنا لکھنا اور سمجھنا بوجھنا نہیں آتا)، ایک شاعر کا نام لیجئے تو سینکڑوں نام کلبلانے لگیں گے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے پاس منتخب افسانہ نگار اور شاعر نہیں۔ بلکہ منتخب افسانے اور اشعار ہیں۔ جو شاید کسی جھلملاتے ستاروں کی طرح کچھ دیر تو چمکیں گے۔ پھر وقت کی رفتار کی دھند میں ختم ہو جائیں گے۔ اور ہم اپنی یاد، شناخت سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔ کوئی ہمیں یاد نہ کر سکے گا۔ کیونکہ وقت بہت بڑا نقاد ہے۔ ظالم بھی اور منصف بھی۔

یہ ساری باتیں نئی نہیں ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر ان صورتوں سے واقف ہیں۔ اس کے باوجود ہم میں سے اب بھی نہ جانے کتنی مصلحتوں اور دور اندیشیوں کے شکار ہیں۔ کوئی کسی نقاد یا پروفیسر سے چپٹا ہوا ہے۔ کسی کو یہ شکایت ہے کہ اس نے اب تک تین افسانے لکھ لئے ہیں جن میں دو کو شرف اشاعت بھی حاصل ہو چکا ہے۔ پھر بھی انہیں صف اول کا افسانہ نگار نہیں مانتا۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ میں ایسا گنجلک لکھوں کہ اس کے ذریعہ ہی میرا نام چلے کوئی پڑھے لکھے بزرگوں کو جاہل اور بے وقوف کہہ کر اپنے آپ کو پہچنوانا چاہتا ہے۔ کوئی بہت قیمتی مجموعہ چھاپ کر لوگوں میں مفت تقسیم کرکے اپنی تخلیقیت کا سکہ جمانا چاہتا ہے۔ کسی نے تو سکوں کی کھنک میں ادب اور ادیب کا ایمان خرید رکھا ہے۔ کوئی یہ بھی چاہتا ہے کہ میں ترقی پسند رہوں نہ جدید پسند، اس کے باوجود میرا ذکر ہر جگہ ہر مضمون، اور ہر انتخاب میں رہے۔

غرض کہ ایک طوفان بے تمیزی ہے جس کی وجہ سے ادب میں ایک پھسپھسا پن، ہلکا پن اور بیگانگی ——— ہماری ریاضت کمزور ——— ہماری عبادت ضعیف اور ہماری نیت میں فتور! ہم بڑی مشکل سے ایک افسانہ لکھتے ہیں۔ تو دو تین جگہ چھپوانے کے بعد بھوکی نظروں سے اپنی شہرت دیکھنے کے لئے بے تاب رہتے ہیں۔ اور اگر وقتی طور پر کسی نے ذکر کر دیا تو بڑے اور اعلیٰ فن کار ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں کرتے۔ غرض کہ ایسی باتوں کا طویل سلسلہ ہے اور وقت ہے کہ گزرتا ہی چلا جا رہا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ فیصلے بھی کرنے لگے گا۔ پتہ چلے گا کہ ۷۰ء کے بعد جو نسل آئی تھی وہ ذرا جذباتی اور جلد باز تھی۔ مطالعہ و مشاہدہ کی ڈور کمزور تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے افسانے لکھے شاعری کی۔ ——— بس دو ایک شعر، کسی ایک افسانے کا ذکر ملے گا۔ کہیں وہ بھی نہیں بات آگے بڑھ جائے گی

—— بس دو ایک شعر یا کسی ایک افسانے کا
ذکر ملے گا۔ ہمیں بیدار ہونا ہوگا۔ سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا
کہ ہم نے گزشتہ دس برس میں کیا دیا۔ اور کیا رہ گیا؟ کتنا چیخے
کتنا شور مچایا۔ کتنا دب گیا۔ کتنا زندہ رہا۔؟ یہ اس لئے بھی ضروری
ہے کہ تاکہ ہم اس نتیجے پر پہونچیں، کہ گزشتہ دس برس میں جو ہم
نہیں کر سکے، آئندہ برسوں میں کر ڈالیں۔ جذبے اور خلوص نیت
سے کام لیں۔ اپنا اپنا تجزیہ کریں، وقتی شہرت اور دولت
سے بے نیاز ہوکر، ایک ہوکر، ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر، سوچ
و فکر کے تعمیری سانچے میں ڈھل کر ایک اسپرٹ کے ساتھ کام کریں
—— بس نجات کا یہی ایک راستہ ہے ورنہ
زندگی کا سیلاب تنکے کی طرح بہا لے جائے گا۔ اور ہمارے عہد
کے نہ جانے کتنے خسرو اور پرویز دیکھتے دیکھتے ایک آن میں
پسپا ہو جائیں گے،

اس لئے ضروری ہے کہ کم از کم ہماری ایک فکری تنظیم
ہو۔ اپنے عہد اور اپنی نسل کا ایک اپروچ اور نقطۂ نظر ہو۔
فکر ہو۔ جذبۂ خدمت ہو۔ اور ہو سکے تو اپنا ایک رسالہ اور ایک
پلیٹ فارم ہو۔ تب تو ہم اپنی زندگی اور زندہ دلی کا ثبوت دے
سکیں گے۔ ورنہ سمجھئے کہ ہمارے ختم ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔
اگر ہم میں ایک ہی اسپرٹ یکجٹ ہوکر کام کرنے کی طاقت
ختم ہو گئی۔ اگر ہم اپنی ذات سے نکل کر اجتماعی طور پر دیکھنے کی
صلاحیت ختم کر چکے ہیں۔ تو پھر ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہم بھی
ختم ہو چکے ہیں —— اگر ایسا نہیں ہے تو آئیے
سوچ و عمل میں ایک نیا ولولہ و جوش بھر دیں۔ ایک نئی
تازگی سے دوچار ہوں۔ کیونکہ دس سال گزر چکے ہیں۔ ۹۰
قریب ہے۔ بقیہ آٹھ دس برس میں اپنا کام کر جائیں ——
—— ادب کا تاریخی تسلسل ایسی ہی کاوشوں سے
قائم رہتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو ارتقا کی ساری کڑیاں بکھر کر
رہ جائیں۔ اس ارتقائی عمل میں ہم نے کتنا تاریخی رول ادا
کیا؟ نئی نسل کے سنجیدہ، حساس اور معقول فنکاروں کو اس
امر پر سوچنا ہے کیونکہ بغیر سوچ اور عمل کئے ہم فرار نہیں حاصل
کر سکتے۔

بقیہ سواد و صوت

ان کی جوتیاں چاٹتے ہیں۔ یہ بات تصور میں بھی نہیں تھی کہ ایسی قد
آور شخصیتیں ان "کالے دھندے" میں ملوث ہوں گی۔
برادرم احمد ہمیش قابل صد آفریں ہیں کہ انہوں نے اپنا تحریر
کردہ خط پریس کے حوالے کر دیا۔ ورنہ ان "کالے دھندے" میں شریک
ناقدین و معاصرین تو اس ہل گو شاعر کو خدا بنا کر ہی دم لیتے۔
آپ نے تمام خطوط اور رپورٹیں آہنگ میں یکجا کر کے
ادب نوازوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ کم از کم اب ان "چہروں" کو
پہچاننے میں غلطی نہ ہوگی۔ اور اب تینوں کے "کھیل" بن کر ادب
تخلیق کر کے ڈھنڈورا پیٹتے رہے ہیں۔
مجھے یقین ہے کہ اب بھی بہت سے چہروں پر نقابیں
موجود ہوں گی۔ اور مستقبل قریب ہی کچھ اور حیرت انگیز انکشافات
ہوں گے۔ —— ظہیر غازیپوری

محترم! آداب
آہنگ کا تازہ شمارہ کسی وجہ سے مجھے نہیں مل
سکا۔ الہ آباد میں عقیل صاحب کے پاس، پھر علی گڈھ میں
گھر گھر اسے دیکھتا رہا۔ پہلی بار ایک نام نہاد شور و غل کے
خلاف آپ نے جس طرح طوفان برپا کیا ہے۔ اس سے کم از کم
علی گڈھ میں پرویز کا جنازہ اٹھ گیا۔ پرویز تو نادان ہیں جو
دوسرے بھیڑیوں کے ذریعہ بے وقوف بن رہے ہیں۔ یہیں
ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نقادوں اور ادیبوں کی نقاب
کشائی کی جائے جنہوں نے اپنے ایمان اور قلم کو بیچ دیا ہے
لیے جرات مندانہ اقدام آپ ہی اٹھا سکتے ہیں۔
علی احمد فاطمی۔ علی گڈھ

ایک اہم سوال

کیا اردو زبان و ادب کو شاعروں افسانہ نگاروں سے
زیادہ اخبار بینوں اخبار نویسوں کی ضرورت ہے ؟

احمد رشید (علیگ)

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے علٰحدہ بھی ہیں۔ اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی بھی۔ اس سوال کے پس پشت دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ اخبار بینی شاعری اور افسانہ نگاری کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کا ثبوت اخبار کے قارئین کی زیادہ تعداد ہے۔ دوسری بات یہ، کیا اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے شاعروں اور افسانہ نگاروں کی ضرورت ہے۔ یا اخبار بینوں اور اخبار نویسوں کی، لیکن ان دونوں باتوں کے پیچھے چھپا ہوا کرب بھی ہے کہ صحت مند ادب کی کتابیں اور رسائل کیوں نہیں چلتے؟

اب میں بات یہاں سے شروع کرتا ہوں، اخبار بینی یقیناً ادب سے مختلف شئی ہے۔ اخبار زبان کی خدمت کر سکتا ہے لیکن شاعری اور افسانہ نگاری ادب کے زمرہ میں آتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اخبار نویسی کوئی غیر اہم پیشہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اخبار نویسی کتنی اور کس قدر صحت مند ہے۔؟ اس لئے ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اردو صحافت کو بھی فروغ دیا جائے۔ کیونکہ چھپا ہوا اخبار واقعات اور خبروں کا ایک مجموعہ ہے۔ ساتھ ہی مدیر کا صفحہ، معلومات کے مضامین بھی شامل ہوتے ہیں۔ جو نہ صرف اخبار بینوں کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اردو صحافت کی نشو و نما کا سبب ہو سکتے ہیں اگر اردو صحافت نگاری کا معیار بلند کریں۔ (انگریزی اور ہندی کے مقابلے میں کمتر ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں یہ الگ بحث کا موضوع ہے) اس طرح زبان اور ادب دونوں ہی کا مقام بلند ہوگا۔ صحت مند صحافت نگاری ادب کی ایک صنف ہے اور کسی بھی صنف کی ترقی کا مطلب زبان و ادب کی ترقی ہے۔

اس طرح اخبار بینوں کے بھی دو حصے ہو جاتے ہیں۔ عام قارئین جو خبروں کو پڑھتے ہیں۔ خاص قارئین جو خبروں کے ساتھ ساتھ مدیر کا صفحہ اور معلومات افزا مضامین کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔

ایک دوسرے سے جڑے اس لئے ہیں کہ اخبار ہمیں نہ صرف عصری آگہی کا ایک احساس دیتا ہے بلکہ ادب کو نئے نئے موضوعات بھی عطا کرتا ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اخبار بینی اور اخبار نویسی ایک دلچسپ موضوع ہے۔ مختلف دلچسپیاں والے حضرات کو مطالعہ مل جاتا ہے۔ اور یہی مضامین اگر کسی ادبی رسالہ میں ڈال دیا جائے

تو اس کے غیر معیاری ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اخبارات کے قارئین کی تعداد زیادہ ہے۔ اور یہ المیہ صرف اردو کا ہی نہیں۔ بلکہ ہر زبان میں اخبارات پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ رہی ہے جہاں اس کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ ان میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ادب کو پسندیدگی سے پڑھنے والا ہمیشہ انٹلکچول قاری رہا ہے جو تعداد میں قلیل رہا ہے۔ اس لئے ادب کو پڑھنے والے ہر دور میں تعداد میں کم رہے۔ لیکن ان دونوں قارئین کا بحران شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کے علاوہ سائنس کی نئی نئی ایجادات (ٹیلی ویژن، ریڈیو، فلم جن میں فن کاری کے کمالات دکھائے جاتے ہیں) نے ذہین قارئین چھین لئے ہیں۔ یہ بات مغرب میں بھی محسوس کی جا رہی ہے۔

ایک اہم راز کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ زبان و ادب کو سرکاری معاونت حاصل نہیں ہوتی۔ اس وقت تک زبان و ادب تیزی سے ترقی نہیں کر پاتا۔ بے شک اردو نے غیر سرکاری معاونت کے ترقی کی ہے لیکن ایک بات ماننی پڑے گی جو اردو داں بزرگ جو اردو کا دم بھرتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو گھر ہی اردو سے تھوڑی سی آشنائی ضرور کراتے ہیں۔ لیکن اسکول میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے بھی نہیں پڑھاتے۔ اس کی بنیادی وجہ، روزگار ہے۔

آج جبکہ اردو کو سرکاری مقام تھوڑا یا بہت حاصل ہو گیا ہے۔ تو اردو میں ایم۔ اے کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ چونکہ پیٹ بھرنے کی راہیں ہموار ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ ممکن ہے آئندہ قارئین کا اضافہ اس بحران کو ختم کر دے۔

آخر میں پھر یہ کہوں گا، اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے ـــــ دونوں کی ضرورت ہے۔

مشرف عالم ذوقی

کلام بھائی!

ایک اہم سوال کے تحت آپ نے ایک خوب صورت بحث کی بنیاد ڈالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج ہر ادیب کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ افسانے اور شاعری کے ساتھ ساتھ اس بحث میں بھی حصہ لے۔ مگر محض حصہ لے بلکہ شعوری طور پر اس بحث سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے اسکو عملی جامہ بھی پہنائے ـــــ جبکہ تازہ شمارے میں میں نے دیکھا کہ زیادہ تر حضرات محض فلسفے اور باتوں میں الجھ کر عام کو یکسر غائب کر گئے ہیں۔ پروفیسر وحید اختر کا جواب بھی واحد لگا۔ جو اپنی جگہ چیت اور حقیقت سے قریب لگا ـــــ

مگر ایک سوال جو بہر صورت اپنی جگہ پر قائم ہے اور وہ ہے کہ اردو ادب میں SUNDAY, PROBE جیسے پرچوں کے لئے قاری آئیں گے کہاں سے۔ اور جو لوگ ایسے انگلش جرائد کے پابند قاری نظر آتے ہیں۔ انہیں یہ یقین کیسے دلایا جا سکتا ہے کہ اردو ادب بھی صحافت کے میدان میں ایسی ہی بے باکی اور جرأت سے کام لے کر اپنا ایک خاص معیار رکھے گا۔ میں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ تقریباً ہر دور میں اردو ادب کے ایسے پرچوں کی کمی نہیں رہی۔ "واقعات" اور "تازہ" یک شنبہ اس کی واحد مثالیں ہیں ـــــ مگر کیا ایسے پرچوں کے قاری ملے؟ واقعات نے ایک زمانے میں صحت مند ادب بھی پیش کیا تھا۔ مگر وہ بند کیوں ہوا ـــــ؟ اور شاید یک شنبہ بھی بند ہو گیا ـــــ یا پھر کسی طرح ایڑیاں رگڑ کر چلنے کی کوشش کر رہا ہے ـــــ یہاں بڑی بڑی باتوں سے قطع نظر ہم صرف یہ دیکھیں کہ ہم میں کتنے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے SUNDAY TODAY اور PROBC کی جگہ ان پرچوں کو فوقیت بخشی ہے۔ اور خرید کر اس کے مطالعے کی اہمیت دی ہو۔ صحت مند کی صحافت اس وقت اچھی اور بھلی معلوم

ہوتی ہے جب اردو قاری کے سامنے اس طرح کے پرچوں کی
کئی مثال سامنے ہو۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے پرچے نکالنے
کی جرات کی جائے۔ ایک جرات فاروق ارگلی نے تیز گام نکال
کر کی۔ مگر اسے ہم ایک خوب صورت اسلامی جریدہ بھی سمجھیں
گے۔ اور دوسرا ان پرچوں کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے۔
کہ عام قاری انہیں خرید نہیں سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ
اردو والے اتنے غریب نہیں کہ جو کسی فنڈ یا سینما یا دوسرے
پروگراموں کے تحت سو دو سو تو خرچ کر سکتے ہیں مگر ایک
اس طرح کا ادبی اور معیاری پرچہ خرید نہ سکیں۔ اس سلسلے میں
میں نے اپنے دوستوں سے باتیں بھی کی۔ جو کتاب خرید کر
پڑھنے کے حد درجہ شوقین تھے۔ ان کا خیال ہے دو روپے پچاس
پیسے میں SUNDAY جو بات پیدا کرتا ہے۔ اور پڑھ
کر جو تقویت ملتی ہے۔ وہ اردو والوں کے بس کی بات نہیں۔ یہ
اردو والوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔ کہ خود اردو کا قاری انہیں
ایسا چیلنج کر رہا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ جو عام قاری اس طرح کے رسائل پسند
کرتا ہے اور پڑھتا ہے وہ ہر طرح کے کالم کی چاشنی میں بھی ڈوبنا
چاہتا ہے۔ جیسے ایک کالم فلم کا ہو، ایک کالم ستاروں سے متعلق
ہو۔ ایک کالم انٹرویو کا ہو۔ ایک خوب صورت اور صحت مند
افسانہ ہو۔ نئی تحریکوں اور NEW PROBLEMS پر
تبصرے ہوں۔ مگر یہ سب صحت مند طریقے سے ایک پرچے میں
ہونا ناممکن سا لگتا ہے۔ اگر ناممکن نہیں تو آج ہر شہر سے
سینکڑوں ہزاروں پرچے نکالنے والے مدیر حضرات اس طرح کا
جرات مندانہ قدم کیوں نہیں اٹھاتے۔؟ جس کی آج ضرورت
ہے تاکہ آج ہم دیگر زبان والوں سے چیخ چیخ کر کہہ دیں کہ
دیکھو ہماری زبان صرف افسانے اور شاعری ہی کی محتاج
نہیں۔ ہماری زبان میں اتنا کچھ ہے کہ صرف اپنی زبان کے رسائل
پڑھ کر بھی ہم خاطر خواہ فیض اٹھا سکتے ہیں۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گا کلام بھائی کہ آپ نے جو
یہ اہم سوال اٹھایا ہے ——— اسے میں ایک تحریک کہوں گا
آپ اس تحریک کو جاری رکھیں ——— سوئے لوگوں کو جگائیں
شاید کسی کے اندر وہ سویا ہوا بیج مل جائے، جو پھر سے
صحافت میں ایک درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہو۔
اور اردو کی بے دریغ خدمت کرے، آمین۔

طاہر نقوی (پاکستان)

زیست کی دہلیز پر انسانیت کی پھڑپھڑاہٹ

ان دونوں نے بھاگتے بھاگتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور ان کے گھر سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے اور سامنے بہت سے لوگ کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ سامان کی لوٹ مار میں وہ لوگ ایسے مصروف ہوئے، کہ انہیں دونوں کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ملی۔ اور یہ دونوں موقع غنیمت جان کر چھپتے چھپاتے ان کی نظروں سے بچ کر تیزی سے بھاگ کھڑے ہوئے،

انہوں نے رفتار دھیمی کر دی کیونکہ ان کا سانس پھول گیا تھا۔ لڑکی نے اس انداز سے لڑکے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اب بھاگا نہیں جا رہا۔ مگر خوف کی وجہ سے وہ ٹھہرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لڑکے نے اس کی ہمت بندھائی، اور پیچھے بھاگتے ہوئے خوف کا احساس دلایا۔ لڑکے کے چہرے پر بھی تھکن اور خوف کے ملے جلے اثرات موجود تھے۔ لڑکی کی رفتار دھیمی ہوتے ہوتے لڑکھڑاہٹ پر آ گئی، تو وہ ایک دم وہیں بیٹھ گئی۔ لڑکے نے ادھر ادھر خوفزدہ نظریں دوڑائیں۔

دکھ انسانیت کے راستوں کے کنارے دبکے علاقائی تعصب کی نفرت کو پاس سے گزرتے دیکھ رہے تھے آس پاس کا خوف مساموں کے راستے اس کے جسم میں گھسنے لگا۔ پھر اس نے لڑکی کے بازوؤں کو پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دونوں پھر چلنے لگے۔ جگہ جگہ انسانی لاشیں پڑی تھیں۔ انسان چراغوں کی طرح بجھتے چلے جا رہے تھے اور بعض واقعات و احساسات کا تسلسل قائم ہوتا چلا جا رہا تھا

جگہ جگہ مکانات جلے ہوئے تھے، زمین پر گولہ باری کی وجہ سے بڑے بڑے گڑھے ابھر آئے تھے۔ درخت کھڑے تھے مگر ان کی شاخوں اور تنوں پر گرد و غبار کی دبیز تہیں جم چکی تھیں فضا بارود اور خون کی ایک ناگوار سی بو رچی ہوئی تھی۔ چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔ جس نے انسانیت کے ضمیر کو تعصب کے گدھوں کے سامنے ڈال دیا تھا۔ یہ گدھ انسانوں کے گوشت نوچتے نوچتے انسان کی روح کو اذیت اور کرب میں مبتلا کئے ہوئے تھے،

لڑکی نے چلنے سے انکار کر دیا۔ لڑکا اسے سہارا دے کر پاس ہی ایک ادھ جلے مکان میں لے گیا۔ تاکہ وہاں سب کی نظروں سے بچ کر کچھ دیر آرام کر سکیں۔ مکان کا آدھے سے زیادہ حصہ جل چکا تھا۔ جلنے کی بو ابھی تک آ رہی تھی۔ شاید اسے جلے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ لڑکے نے پورے گھر میں نظریں دوڑائیں خالی صندوق بکھرے پڑے تھے۔ اور پے در پے دھماکوں سے کمروں اور روشن دانوں کے شیشوں کی کرچیاں زمین پر بکھری پڑی تھیں۔ یہ کرچیاں اب دراصل انسانوں کی روح پر گر رہی تھیں جگہ جگہ خون کی بوندیں اسے نظر آئیں اور پھر ایک لمحے کے لئے اس کی روح پر جیسے کوئی بھاری پتھر آ پڑا۔ اس کا رواں رواں کانپنے لگا اس نے دوسرے کمرے کی چہار دیواری میں ایک ننھا سا بازو کٹا پڑا دیکھا۔ جس میں سے خون ابھی تک رس رہا تھا اس کا وہ احساس بھی مر چکا تھا جس کے ذریعہ غم ابھرتا ہے

اور آنکھوں میں آنسو نکل آتے ہیں۔ اس نے اپنے اعصاب کو
سنبھالنے کی کوشش کی۔ تاکہ اس کی لڑکی اس کی ذہنی اور
اندرونی کیفیت کا اندازہ نہ لگا پائے۔ لڑکی نے وہاں فرش
پر بیٹھتے ہی کہا۔

اچھا ہوا کہ تم آ گئے تھے، ورنہ میں تو تنہا وہاں سے
نہ بھاگ پاتی۔ اور پھر پتہ نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔ یہ کہہ کر لڑکی
نے جھرجھری سی لی۔

لڑکے نے جواب دیا۔ انہوں نے میرے سامنے میری
ماں پر چاقوؤں سے حملے کئے، اور میں اپنی ماں کو نہ بچا پایا۔
اس نے میرے سامنے دم توڑ دیا۔ میرے باپ کو پہلے ہی ختم کر
دیا گیا تھا۔ چھوٹا بھائی کئی دن سے غائب تھا۔ میں وہاں سے
تمہاری طرف بھاگا تم کونے میں کھڑی خوف سے کانپ رہی
تھیں۔ مجھے دیکھ کر بھی تمہارے خوف میں کمی نہیں ہوئی، شاید
اب کسی کے سہارے کی ڈھارس بیکار ہی لگ رہی تھی۔

لڑکی کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے
آنسو جیسے خشک ہو چکے تھے، اس نے کہا۔ میں نے اپنی بہن
کے ساتھ ان کا وحشیانہ سلوک اپنے سامنے دیکھا۔ تم مجھے
گھسیٹتے ہوئے نہ لاتے، تو وہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے

اچانک اس وقت ایک شور سا اٹھا۔ اور لڑکی نے
خوف زدہ ہو کر اپنا چہرہ لڑکے کے سینے میں چھپا دیا۔ پھر خوف
کے باوجود فوراً ہی علاحدہ بھی ہو گئی۔ وہ زندگی میں پہلی بار
اس وقت کسی مرد کے اتنے قریب تھی اس کے خاندان میں
لڑکیاں کھلے آسمان کو اپنے صحن ہی سے دیکھ سکتی تھیں۔ اور اب
تو سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔ نہ وہ مکان تھے نہ وہ لوگ۔ اس
کے دل میں اس خیال سے کچھ آسودگی کا احساس ہوا۔ کہ کوئی
دوسرا مرد ہوتا تو وہ مرنا بہتر سمجھتی۔ اس وقت وہ اپنے منگیتر
کے ساتھ ہی تھی۔ جس سے کم از کم اس سے ذہنی قربت تو تھی۔
وہ ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ انہوں
نے ایک دوسرے کو اپنے خیالوں میں سجایا تھا۔ ایسے ہی
مسرور لمحے جو مسکراہٹوں میں بسر ہوئے تھے، زندگی کی ویرانیوں
میں ہمیشہ رفیق بنتے ہیں۔ سب کچھ اجڑ جانے پر بھی زندگی کی
تاریکیاں ان ہی کرنوں سے جگمگا اٹھتی ہیں۔ یہی زندگی میں
روح کی سی پاکیزگی برقرار رکھتی ہیں۔ لڑکے نے ادھر ادھر
نظر دوڑا کر ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

یہ ادھ جلا مکان محفوظ جگہ ہے۔ اب اسے دوبارہ
جلانے وہ کاہے کو آئیں گے۔ شاید رات یہیں بسر کرنی پڑے

لڑکی کچھ نہیں بولی۔ اس کے کان ہر ہلکی سی آواز پر بھی
کھڑے ہو جاتے، اور وہ چونکتی ہو کر گھبرائے ہوئے انداز سے
ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔

تم نے پتہ نہیں کب سے کچھ پیا نہ ہوگا۔ اندھیرا ہو جائے
تو کچھ انتظام کرنے کی کوشش کروں۔

نہیں نہیں لڑکی کی آواز کسی گہرے کھڈ سے آ رہی تھی
اب تو وہ اپنی آبرو اور جان بچانے کے علاوہ کسی اور طرف
دھیان جاتا ہی نہیں۔

لڑکے نے کھڑے ہو کر آس پاس کے علاقے کی طرف
نگاہ دوڑانے کی کوشش کی۔ مگر لڑکی نے زبردستی اسے بٹھا
لیا۔ اس پورے علاقے میں وہ کھیل کود کر جوان ہوا تھا۔ لیکن
اب ہر گلی، ہر سڑک، ہر مکان، یہ سارا علاقہ ہی اسے اجنبی
لگ رہا تھا جیسے وہ پہلی بار اس طرف راستہ بھول کر نکل آیا ہو
ہمدردی اور اخلاق ایسے جذبے انسانیت کے ذہن سے
چھین کر دور سڑکوں پر پھینک دیئے گئے تھے۔ بغیر اہم شئے کی
طرف ان کا ڈھیر اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ محبتوں کے اس ڈھیر
پر نفرت کھڑی قہقہے لگا رہی تھی۔ اور درندگی بھاڑ جیسا منہ
کھولے انسانوں کی جانیں اور عصمتیں نگلنے کے لئے منتظر کھڑی
تھی۔ وقت اور حالات کے ساتھ احساسات بھی بدل جاتے
ہیں۔ ماضی اور اس کے کردار ان کی آنکھوں کے سامنے

ردش کرنے لگے۔ ایک آن میں سب کے سب ماضی کے ایسے دھندلے
روایوں کی حیثیت اختیار کرلی تھی جن کی وقت کی بہتے ہوئے سمندر
میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

دفعتاً ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ اور مکان ہل کر رہ گیا
ساتھ ہی اتنا غبار پھیل گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے ارد گرد کی تمام چیزیں
س میں چھپ گئیں۔ وہ چند لمحے سانس روکے زمین پر پڑے رہے
ن کے کپڑوں، بالوں، اور چہروں پر گرد کی گہری تہہ جم چکی تھی۔ دونوں
نے اپنے اوپر سے گرد جھاڑی۔

اب شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور لڑکی وہاں سے کہیں
ور جانے کو تیار نہ تھی۔ لڑکا بھی اس بات سے خوفزدہ تھا۔ کہ وہاں
ے نکلے تو اسے دیکھ لیں گے۔ اس خیال سے ہی اس کے جسم میں کپکپی
ی طاری ہوگئی۔ وہ وہاں سے نکلتے بھی تو کہاں جاتے، ہر آنکھ
ن کی تاک میں تھی۔ ہر چہرہ دشمن۔ اچانک ایک بار پھر دور سے
شور اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں نے ایک دوسرے
خوف زدہ ہو کر دیکھا۔ لیکن لڑکے نے لڑکی کو نگاہوں نگاہوں میں
ہمت نہ ہارنے کا مشورہ دیا۔ یہ سوچ کر ہی کہ اگر ان لوگوں نے انہیں
یہاں چھپے ہوئے دیکھ لیا وہ دونوں اور سمٹ کر کونے میں دبک
گئے۔ جب شور بالکل قریب آگیا تو لڑکے نے جلے ہوئے مکان کے
ایک سوراخ سے باہر دیکھا۔ چند ننگی عورتوں کو گھیرے میں لئے دس
دس لوگ قہقہے لگاتے جا رہے تھے۔ کوئی ان عورتوں کے ننگے جسم کو
چھلہ کوئی بڑھ کر کسی عورت کی چھاتیوں کو مسلتا۔ اور قہقہہ لگاتا
کوئی کسی عورت کے بال گھسیٹتا۔ اور وہ گرتے گرتے بچتی۔ کوئی لپک
کر کسی عورت کے جسم پر چھڑی کی نوک چبھوتا۔ لڑکے سے زیادہ دیر
سب دیکھا نہ گیا۔ اس کے نحیف جسم میں جھرجھری کی ایک لہر دوڑی
چاہتا تھا کہ دوڑ کر جائے اور ان درندوں کو ایک ہی وار میں
دے اور ان عورتوں کو لباس دے۔ مگر دوسرے ہی لمحہ
اس کے رونگٹے رونگٹے میں خوف سرایت کر گیا۔ اس نے اپنی غیرت
حمیت بھی کچلی ہوئی محسوس کی۔ وہ اپنے آپ کو بے حس پانے
لگا۔

پھر اس نے لڑکی کے پیلے چہرے کو دیکھا۔ اور سوچا اگر اپنی
جان پر کھیل بھی جائے۔ تو پھر اس کا کیا حشر ہوگا۔ لڑکی اب کونے
میں اور سمٹ کر اشارے سے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے تو لڑکے نے
اسے اشارے سے ہی مطمئن رہنے کو کہا۔ اسی اثنا میں باہر بھگدڑ
سی مچنے لگی۔ لڑکی سرک کر لڑکے کے اور قریب ہوگئی۔ لڑکے نے سوراخ
سے جھانک کر پھر دیکھا اب سپاہی پہونچ گئے تھے۔ اور ان لوگوں
پر لاٹھیاں برسا رہے تھے وہ لوگ بھاگ نکلے۔ لڑکے کے چہرے
پر اتنی دیر کے بعد اطمینان اور خفیف سی خوشی کا تاثر دیکھ کر لڑکی
نے آہستگی سے اس کا سبب دریافت کیا۔ تو لڑکے نے جواب دیا۔

ہمارے محافظ پہنچ گئے ہیں۔ اور انہیں مار بھگائے ہیں

یہ سن کر لڑکی کے جسم کا لرزہ کچھ کم ہوا۔ لڑکے نے پھر جھانک
کر دیکھا اس وقت سپاہی ان عورتوں کو مال غنیمت سمجھ کر آپس
میں بانٹ رہے تھے۔ وہ عورتیں بھی شاید اس کے ساتھ مطمئن اس
لئے جا رہی تھیں کہ لٹی ہوئی عصمتیں مزید نہیں لوٹی جائیں گی۔ لڑکے
نے نظریں وہاں سے ہٹا لیں۔ اس نے اس وقت اپنے آپ کو
ہر جانب سے غیر محفوظ محسوس کیا۔ شور ختم ہو جانے پر لڑکی نے
بھی اطمینان کر لینے کے لئے باہر جھانکا اور آہستہ سے بولی،

باہر ایک سپاہی کھڑا ہے۔ اس سے کچھ اور مدد مانگو،

لڑکا چپ ہی رہا۔ صرف لڑکی کو غیر یقینی انداز میں دیکھا
تو وہ بے چینی سے بولی،

اس سے کچھ پانی مانگو۔ یا کہو کہ ہمیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دے،

لڑکے کا حلق بھی خشک تھا۔ وہ اٹھا اور ڈرتے ڈرتے
قدم رکھتا باہر نکلا، اسے اس وقت ان کا خوف نہیں تھا جن
کے دل چھوٹے تھے، لغزشیں ان میں سمانہ پا رہی تھیں، اور اب
ابل رہی تھیں۔ قدموں کی چاپ سن کر سپاہی اس طرف متوجہ
ہوا، اور بندوق کی نوک اس کے سینے پر رکھتے ہوئے بولا،

کیا تمہارے پاس ہے؟

میرے پاس تو... تو... کچھ بھی نہیں ہے۔ سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے لڑکے نے جواب دیا۔

سپاہی کی نظر لڑکی پر پڑی تو اس کے کھردرے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

جھوٹ بولتے ہو..... یہ ہے تو؟

اس کے پاس بھی کچھ نہیں۔

اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ سپاہی نے لڑکی کے جسم پر نظر ڈالتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا، اور لڑکے کو ڈھکیلتے ہوئے لڑکی کی جانب لپکا۔ لڑکا لمحے میں چیرہ سپاہی کو دھکے دے کر لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے اندھیرے میں بڑھ گیا۔ اندھیرا ہر خوف ہر دکھ کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔

بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ ساتھ دونوں اب پھر بھاگنے لگے۔ مکانات اور دکانوں سے اٹھتے ہوئے شعلوں سے کبھی کبھی آس پاس روشنی پھیل جاتی۔ اور وہ اس روشنی میں راستے کا تعین بھی کر لیتے، بھاگتے بھاگتے لڑکے نے کہا

یہ تو وہی بستی ہے جہاں تمہارے ابا کے دوست رہتے ہیں۔ کیا نام ہے ان کا۔ تم انہیں چاچا کہتی تھیں، ان کا مکان تو دور ہی سے نظر آجائے گا۔

پھر اس نے مکانات سے اٹھتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا،

وہ رہا۔ وہ چلتے ہیں وہ ہماری ضرور مدد کریں گے۔

وہ دونوں ہانپتے ہوئے اس بنگلے کے پاس پہونچے تو اس کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر بہت سے لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے، سب کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ اور کوئی انہیں ہدایات دے رہا تھا، لڑکے نے کچھ سمجھتے ہوئے ایک بچے کو چاچا کو بلانے کے لئے کہا، بچے نے معنی خیز انداز میں ان دونوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اور بھاگا ہوا اندر چلا گیا۔ اور اسی تیزی سے چاچا آئے اور انہیں دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے، اور عجیب انداز میں ان دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ یہ دونوں ہر ہر قدم پر خوف محسوس کر رہے تھے، مگر دل میں کچھ بھروسہ بھی تھا، چاچا انہیں کمرے میں چھوڑ کر باہر چلے گئے، لڑکے کمرے سے باہر کی سن گن لینے لگا، کمرے کے چاروں طرف زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی قہقہے بھی بلند ہوتے، یکایک وہ دونوں ٹھٹھک کر رہ گئے، چاچا برابر ہی کے کمرے میں کسی سے باتیں کر رہے تھے، ان کے لہجے میں نفرت اور حقارت کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا۔ ان کی باتیں بخوبی سنی جا سکتی تھیں۔ لڑکی خوف سے لرزنے لگی، چاچا کہہ رہے تھے،

اس نے مجھے ہر قدم پہ شکست دی تھی، اب میں سارا بدلہ اس کی بیٹی سے لونگا۔

لڑکی کے چہرے کی رنگت بدل گئی، اس کے چہرے پر غیر معمولی ردعمل دیکھ کر لڑکا اور پریشان ہو گیا۔ وقت کے بیکراں سمندر میں خوشی، خلوص، محبت، ایسے جذبے کہیں کھو گئے اور ہر جگہ سے نفرت، خطرہ، خوف، ابھرنے لگے تھے، خوف کی وجہ سے ان میں یہاں سے بھاگنے کی بھی ہمت نہیں تھی شعور مسلسل خوف سے اب بے حس ہو گیا تھا، مگر لاشعوری طور سے ان کے قدم باہر کی جانب اٹھے، ان کے پیچھے دو تین لوگ لپکے، دونوں اندھیرے میں نہ جانے کس جانب نکل گئے، یہ سوکھے پتوں کی طرح انسانیت کے کینوس پہ ادھر ادھر ڈولتے پھر رہے تھے، اور ان کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں، بھاگتے بھاگتے لڑکی لڑکھڑا کر گری، اور بولی، پانی، پانی،

لڑکے کے حلق میں بھی کانٹے سے اُگ آئے تھے۔

زبان خشک ہو کر لکڑی کا ٹکڑا بن گئی تھی، اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، شہر اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا، مگر سامنے ہی اسے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی، اس نے لڑکی کو کاندھے سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور سہارا دیتے ہوئے اس روشنی کی طرف

چل دیا۔ اس نے سوچا چاہے کچھ بھی ہو یہاں سے پانی ضرور پیئیں گے وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا کھڑکی کھلی ہوئی تھی، اور لالٹین کی روشنی میں اس نے اندر کمرے میں دیکھا اسلحے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر دروازے پر دستک دی، لڑکی بھی اب سنبھل کر کھڑی ہو گئی تھی، چند لمحے بعد دروازہ کھلا، اور باہر آنے والے آدمی نے چند لمحے انہیں دیکھا پھر آگے بڑھ کر لڑکی کے چہرے پر پھونک ماری، کچھ گرد اس کی آنکھوں میں بھی جا گھسی، پھر الفاظ چبا چبا کر حیرانی بولا،

چھوٹی بیگم صاحبہ تم.......

اور انہیں اندر آنے کی جگہ دی۔ لالٹین کی روشنی میں لڑکی نے اس آدمی کو پہچانتے ہوئے کہا،

ارے سدّو تو......

لڑکی کی آواز میں حیرت اور خوشی کا ملا جلا احساس موجود تھا، سدو لڑکی کے یہاں کا خاندانی نوکر تھا جو ان کے یہاں سے بہت پہلے ہی غائب ہو گیا تھا۔ لڑکے نے جمع شدہ اسلحے کی طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا،

پانی جلدی سے،

سدو جھٹ پانی لے آیا، اور بولا۔

بیٹھے بٹھائے تو میری تو قسمت ہی جاگ گئی،

اس کے لہجے کو ان دونوں نے نظر انداز کر دیا۔ لڑکی ایک ہی سانس میں پانی پی کر بولی،

تیرے یہاں آ کر ہم نے خود کو محفوظ محسوس کیا ہے۔

اس سرزمین پر تمہارے لئے محفوظ جگہ تو کوئی بھی نہیں

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا،

میں نے بچپن سے تمہارے ہاں کا نمک کھایا ہوں،

میں نے بچپن سے تمہارے ہاں کا نمک کھایا ہوں

صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ سرحد پار کرا دوں۔

ہاں تم یہی کر دو۔ دونوں بول اٹھے،

ایک ایک ہزار لوں گا، سدو نے دانت نکالتے ہوئے کہا

ان دونوں کے چہروں پر مایوسیوں کے سائے لہرانے لگے، اپنائیت دور کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی، اور اجنبیت انہیں اندھیرے غاروں میں دھکیل رہی تھی، جہاں مایوسیاں اور دکھ کانٹے دبن کر ان کے جسموں میں چبھ رہے تھے،

ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ سدو نے عجیب عجیب نظروں سے لڑکی کو گھورتے ہوئے،

وہ کیا؟ لڑکی نے بے قراری سے پوچھا

تم ایک رات میرے بستر پر گزارو۔ اللہ قسم! سدو نے لڑکی کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری

نہیں، نہیں، لڑکی لرز کر رہ گئی،

بکواس بند کرو، لڑکے نے چیخ کر کہنا چاہا مگر اس کا سارا جسم ہل کر رہ گیا۔ اور صرف کمزور سی آواز اس کے حلق سے نکلی، غیر معمولی ردعمل کی وجہ سے لڑکی کے چہرے کی رنگت جل گئی۔ اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی، لڑکی کے چہرے کی کیفیت ایسی تھی، جیسے کسی خونخوار بلی نے اس کے کمر پر اپنے پنجے گاڑ دیئے ہوں، اتنے میں سدو کو کسی نے پکارا، وہ ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی لڑکے نے لڑکی کو سہارا دے کر کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی، مگر دروازہ باہر سے بند تھا کھڑکی میں بھی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، وہ بے بس نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ کہ سدو کی آواز برابر کے کمرے سے آئی، آواز صاف سنائی دے رہی تھی،

ایک مال پھنس گیا ہے۔ اس نے مزے لے لے کر کہا رات کو مزہ چکھوں گا۔

وہ تین آدمی ساتھ ہی بولے،

اور ہمارا حصہ؟

سدو بولا، اس کے بعد تمہارے حوالے کر دوں گا۔

ان سب کے ملے جلے قہقہے دھوئیں کی طرح پھیل گئے

بقیہ۔ صفحہ ۴۳

قمر جہاں

صدالصحرا

آواز کے گھنے جنگل میں جب اسے اپنی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ بے حد گھبرائی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور اس کے ہاتھ میں "نیا قلم" کانپنے لگا۔ جسے وہ کل ہی مارکیٹ سے بہت قیمت دے کر خرید لائی تھی۔ اور صبح تک اس قلم کو بڑے اعتماد اور فخر کے ساتھ کاغذ پر گھستی رہی تھی لیکن اسے نہ تو اب اپنے قلم پر اعتماد رہا اور نہ اپنی آواز پر ____ مشاہدے نے اسے بتایا تھا کہ آواز کے ڈوب جانے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مردہ ہو گئی ____ اور وہ خود کو مردہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی تمنا ہر ذی روح کی بنیادی تمنا ہے۔ اس تمنا کے بیدار ہوتے ہی اس نے اپنے ارد گرد ریشم کے کیڑے کی طرح ریشمی حصار بنا لینا چاہا۔ لیکن اس کی سوچ نے اسے سمجھایا کہ اس طرح تو اور بھی محدود ہو جائے گی۔ اور اس کی آواز خول سے باہر بھی نہیں نکل سکے گی۔ لہٰذا اپنے تحفظ کے لئے اس کے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا۔ اور آن واحد میں اسے وہ عملی جامہ پہنانے کے عمل میں مصروف ہو گئی۔

اس نے کوڑے کرکٹ کی انبار سے ایک تیشہ اٹھایا تیشہ کی کند دھار کو پہلے آبدار بنایا پھر پوری تندہی کے ساتھ جنگل کو کاٹنے لگی۔ اسے اس خیال سے آسودگی مل رہی تھی کہ اس طرح وہ اس بے کراں دشت میں وہ اپنی انفرادیت کا سکہ جما سکے گی۔ اور اپنی آواز میں وقار پیدا کر لے گی ____ اس کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا تھا۔ کہ اس زمانے میں زندہ رہنے کے لئے انفرادیت کی ڈگر پر چلنا ہوگا۔

جنگل کو تراشنے کے عمل میں اس کے ہاتھ لہولہان ہو گئے، دامن تار تار ہو گئے، لیکن اسے ان باتوں کی مطلق پروا نہ تھی۔ بلکہ وہ "قلم ہوئے ہاتھ" اور "تار تار دامن" کو اپنی کامیابی سمجھتی تھی۔ اور بڑے فخر سے وہ اپنے لہولہان ہاتھوں کو فضا میں مرغولے بنا کر اچھالتی رہی۔

سخت محنت و مشقت سے اس کی خوبصورت پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آتے جنھیں وہ اپنے ریشمی آنچل سے بڑی احتیاط سے صاف کر لیتی۔ اور اپنے کام میں محو ہو جاتی۔

روز و شب کا چکر چلتا رہا لمحے روز میں اور روز مہ و سال میں بدلتے رہے ____ لوگ اس کی پاگل پن پر حیران تھے۔ لیکن وہ خود مطمئن تھی۔ اسے یقین تھا کہ ہر تخریب کے پیچھے تعمیر کی جھلک پوشیدہ ہوتی ہے ____ وہ بڑی لگن اور محنت کے ساتھ تناور درختوں، مضبوط شاخوں، اور موٹی موٹی ٹہنیوں کو توڑتی مروڑتی رہتی۔ ____ نہ جانے کتنے شجر، سایہ دار پھل دار پودے اور ہری بھری ڈالیاں اس کی وحشت کا نشانہ بنے ____

شاید اسے اس وحشیانہ عمل میں ایک نفسیاتی حظ مل رہا تھا ایک سکون اور لطف کا احساس ہو رہا تھا۔ جبھی تو تھکن کے باوجود بھی وہ مطمئن اور آسودہ نظر آتی تھی ——— اور ———!

اور ایک دن ایسا آیا کہ وہ اس جنگل میں تنہا ببول کے پیڑ کی طرح لنڈ منڈ کھڑی رہ گئی ——— یہ دن اس کے لئے بڑی مسرت کا دن تھا۔ وہ فتح کے احساس اور گرگی نشاط تصور میں سے ایسی سرشار ہوئی، کہ چند لمحے کے لئے اسے اپنی آنکھوں کی بینائی کھوئی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن جب اپنی بے انتہا مسرت کو اس نے ضبط میں لایا اور آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ تو اس نے دیکھا کہ جنگل تو واقعی اس کی محنت سے ریگستان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن وہ جہاں تھی وہ...... وہیں کھڑی ہے اور اس کی آواز صحرا میں صدا بہ صحرا بن کر بازگشت کر رہی ہے مگر آج ...... ایک عرصہ کی محنت و مشقت کے بعد اس پر یہ راز کھلا کہ اس کی یہ دوسری آواز تو پہلی آواز سے بھی زیادہ کھوکھلی اور بے جان ہے۔ ●●

بقیہ :- زیست کی دہلیز پر انسانیت ...

کے چہرے پر چڑھے ہوئے حمیت کے خول پر کالک کی ایک تہہ جمانے لگے، پھر ان سب نے مل کر بدمستی میں چیخنا شروع کر دیا۔ عورت مجلات اور اس بیٹے کی بے بسی کے لمبے ہاتھ بے حرمتی کے لئے اٹھیں، لڑکی نے آگے بڑھ کر کمزور آواز میں کہا۔

اس وقت میں اپنے آپ کو تمہارے سپرد کرتی ہوں کہ ان جنگلی کتوں کے پاس کنواری نہ پہنچوں ●●

ڈاکٹر عزیزی (بنگلہ دیش)

نیا راستہ

تم نے کبھی شراب پی ہے

نہیں!

تم نے کسی سے عشق کیا ہے

نہیں!

تم نے کبھی کسی کو کوٹھے پر جا کر مجرا سنا ہے

نہیں!

تم نے کبھی کسی عورت کے ساتھ رات گذاری ہے

نہیں یار! میں یہ سب کیوں کرنے لگا۔

روشن علی کے اتنے سارے تابڑ توڑ سوالات پر فضلو ایک دم جھلا گیا۔ یہ کیا تنگ کیے ہے۔ بھلا یہ کوئی بات ہوئی کہ اس نے اس سے اتنے غیر ضروری سوالات شروع کر دیے جبکہ وہ گاؤں کا ایک بھولا بھالا لڑکا، اور ان واہیات اور خرافات چیزوں سے قطعی ناواقف۔ وہ تو روشن علی کے متواتر اصرار پر شہر چلا آیا تھا صرف روشن علی سے ملنے کی غرض سے۔ ورنہ شہر میں اس کا کیا کام۔

جب وہ گاؤں سے چلنے لگا تھا تو ماں نے کئی باتوں کی تاکید کی تھی۔ ماں نے کہا تھا فضلو بیٹے، شہر کے لوگ اچھے نہیں ہوتے [illegible] ہوشیار رہنا، سنا ہے شہر کی سڑکیں بارونق اور پر پیچ ہوتی ہیں۔ کہیں تم ان سڑکوں پہ چلتے چلتے گم مت ہو جانا روشن علی تمہارے بچپن کا ساتھی ضرور ہے مگر اب وہ بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ وہاں زیادہ دنوں تک رہ کر اس کا احسان مت لینا۔ اور زیادہ رات تک ادھر ادھر اس کے ساتھ مارا مارا مت پھرنا۔

تم بھی کمال کرتی ہو ماں! وہ میرا بچپن کا ساتھی ہے میں روشن کو نہیں جانتا ہوں کیا۔ اس نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

پھر وہ ماں سے رخصت ہو کر پیدل چل پڑا تھا۔ اور کچھ دور جانے کے بعد سڑک پر اسے بس مل گئی تھی۔ وہ بس پر سوار ہو گیا۔ بس ڈھاکہ جا رہی تھی۔ وہ بھی ڈھاکہ جا رہا تھا اپنے بچپن کے ساتھی روشن علی سے ملنے کے لئے، جس نے متواتر کئی خطوط اس نے لکھے تھے۔ کہ فضل پیارے ایک بار شہر آ جاؤ آخر گاؤں میں پڑے پڑے کیا جھک مار رہے ہو۔ وہ بھی روشن علی سے ڈھاکہ میں ملنے کے لئے بار ہا پر تولتا رہا تھا مگر کبھی موقع ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اور آج وہ بہت خوش تھا کہ اپنے دوست روشن علی سے مل سکے گا۔ وہ روشن علی جو بچپن میں اس کے ساتھ گاؤں میں مسجد والے مدرسے میں پڑھتا تھا۔ پھر جب اس کے والد کی ملازمت ڈھاکہ میں کسی اچھے فرم میں ہو گئی۔ تو تھوڑے [illegible] ہی عرصہ کے بعد روشن علی بھی اپنے والدین کے ہمراہ ڈھاکہ چلا گیا تھا۔ ادھر کئی سال تک گاؤں میں وہ لوگ آتے جاتے رہے تھے۔ مگر ادھر تقریباً دس سال سے ان لوگوں نے یہاں آنا جانا ترک کر دیا تھا اور اب جو روشن علی سے ملے گا تو پتہ نہیں وہ اسے پہچان بھی سکے گا کہ نہیں۔ روشن علی اب وہ روشن علی نہیں تھا۔ اب تو وہ لاکھوں میں کھیلتا ہے۔

اور جب وہ گلستان کے علاقے میں بس سے نیچے اترا تو لوگوں کا ہجوم، دور دور تک پھیلی ہوئی سڑکیں۔ اونچی

اونچی عالی شان عمارتیں، اور بسوں اور کاروں کی شائیں
شائیں دوڑتے بھاگتے ہوئے دیکھ کر اس کا دل ایک انجانے
خوف سے دھڑکنے لگا پھر اس نے اپنی جیب ٹٹولی اور روشن
علی کا لکھا ہوا پتہ اپنی جیب سے نکال کر پڑھنے لگا۔

شاہنہ منزل۔ ۲۵ بابر روڈ گلشن ڈھاکہ۔

پھر وہ سامنے پان والے کی دوکان پر گیا۔ اور اس
سے دریافت کیا!

بھائی صاحب! آپ بتا سکتے ہیں کہ گلشن کس طرف
ہے۔؟

ہاں ہاں ضرور بتا سکتا ہوں۔ آپ ۲۴ نمبر بس میں
بیٹھ جائیے بس سمجھئے کہ آپ گلشن پہونچ گئے۔

پھر وہ قریب ہی بس اسٹاپ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔
بس اسٹاپ پر کافی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اور اس قسم کی بھیڑ بھاڑ
اور شور ہنگامے سے اسے سخت کوفت ہوتی تھی۔ سال دو
سال میں اکثر اس کے گاؤں میں میلہ لگتا تھا۔ اور اس میلے
میں سرکس اور جاترا کا ان کا بھی پروگرام ہوتا تھا۔ مگر اسے
ان ہنگاموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بڑا ہی خاموش
طبع اور سنجیدہ مزاج واقع ہوا۔ ایک بار ایسے ہی کسی میلے میں
کسی نوجوان لڑکی سے اچانک اس کی ٹکر ہو گئی تھی تو سر سے
پاؤں تک کانپ گیا تھا۔ جیسے بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو

تب سے وہ بھیڑ بھاڑ میں بڑا محتاط رہتا تھا۔ مگر
یہاں تو مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ چل پھر رہے تھے۔ ایک
ساتھ ساتھ بس سے اتر رہے تھے۔ اور ایک ہی ساتھ بس میں
سوار بھی ہو رہے۔ اور اسے اس ماحول میں ایک اجنبیت کا
احساس ہوا۔ مگر اسے ان لوگوں سے کیا لینا دینا تھا۔ بس آئی
اور وہ ۲۴ نمبر کی بس دیکھ کر سوار ہو گیا۔ اور گلشن ٹرمینل
پر اتر گیا۔ اور پوچھتے پاچھتے شاہنہ منزل تک وہ پہونچ گیا
یہ مکان سڑک کے کنارے واقع تھا۔ سامنے لوہے
کا گیٹ۔ گیٹ کے اندر سورج مکھی، گلاب، اور گندھا راج
سے سجایا ہوا لان، اور اس کے بعد ایک خوبصورت سی دو منزلہ
عمارت، فضلو ایک لمحہ کے لئے غیر یقینی طور پر یہ سوچنے لگا کہ کیا
یہ روشن علی کا مکان ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر
عمارت پر لکھے ہوئے شاہنہ منزل کو دیکھ کر اطمینان کر لیا
پھر وہ دروازے پر دستک دینے لگا۔

جب دروازہ کھلا تو روشن علی ایک لمحہ کے لئے فضلو
کو پہچان نہیں سکا۔ پھر وہ جب اسے پہچان گیا تب وہ اس
سے بڑے ہی گرم جوشی سے ملا۔ اور ڈرائنگ روم میں صوفہ
سیٹ پر بٹھا کر پہروں ادھر ادھر کی گفتگو کرتا۔ روشن کی
ماں سے مل کر وہ بہت خوش ہوا۔ روشن علی کی بہن کافی
بڑی اور نئی روشنی کی دلدادہ ہو گئی تھی، چہرے پر حیا اور جسم
کے نشیب و فراز میں ایک نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ آمنہ کے حسن
کو دیکھ کر فضلو کی آنکھیں جھک گئی تھیں، اور جب فضلو نے
روشن کے باپ کو تلاش کیا تو روشن کی ماں ایک دم اداس
ہو گئیں، روشن کے باپ کا انتقال ہوئے تین سال ہو چکے
تھے۔

شام کی چائے پر دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے
کے ساتھ بے تکلفانہ ماحول میں گفتگو کرتے رہے۔ دونوں
نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی روداد سنائی، روشن علی کی
زندگی میں کیسے کیسے انقلابات آئے وہ کہاں کہاں بھٹکتا
پھرا تھا اس نے کس طرح یہ عمارت حاصل کی تھی، وہ کس
طرح ایک فیکٹری کا مالک بن بیٹھا تھا، اور ایک لڑکی کے عشق
میں ناکام ہونے کے بعد وہ کس کرب کے دور سے گذرا تھا
روشن علی کی یہ ساری باتیں سننے کے بعد فضلو احساس کمتری کا
شکار ہو گیا تھا۔ کیونکہ روشن علی کے مقابلے میں وہ اپنے آپ
کو اس قدر حقیر سمجھ رہا تھا کہ جس کی قیمت دو ٹکے سے کیا
زیادہ ہو گی۔

اور اس روز روشن علی نے مسکراتے ہوئے بڑے ہی [illegible]ازدارانہ انداز میں اس سے کئی سوالات کئے تھے۔ تم نے کبھی شراب [illegible]ہے، تم نے کسی سے عشق کیا ہے، تم نے کبھی کسی کو کوٹھے پر جا کر [illegible]ناسا ہے۔ تم نے کبھی کسی عورت کے ساتھ رات گزاری ہے [illegible]ور روشن علی کے ہر سوال کا جواب فضلو نفی میں دیتا رہا تھا۔ [illegible]خری سوال پر فضلو ایک دم جھلا گیا تھا نہیں یار! میں یہ سب کیوں کرنے لگا۔ تو روشن علی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

ارے یار، تم بھی ایک دم مٹی کے مادھو ہو۔ اس بھری جوانی میں تم نے زندگی کا کوئی لطف ہی نہیں اٹھایا۔ آخر [illegible]ؤں میں رہ کر بھاڑ ہی جھونکتے رہے، دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی۔ لوگ چاند تک پہونچ گئے۔ اور تم چاند والی بڑھیا کی طرح برگد کے سائے میں بیٹھ کر چرخہ ہی کاتتے رہے۔

یہ کہتے ہوئے روشن علی نے جب ایک بار پھر قہقہہ لگایا تو فضلو اس وقت واقعی مٹی کا مادھو دکھائی دینے لگا تھا۔ اور وہ دل ہی دل میں اس قدر شرمندہ ہوا تھا کہ جیسے شراب نہ پی کر، عشق نہ کر کے، کسی کو کوٹھے پر مجرا نہ سن کر اور کسی عورت کے ساتھ رات نہ گزار کر واقعی گناہ کیا تھا ورنہ اب گاؤں گاؤں کہاں! اور گاؤں کے لڑکے اتنے بھولے بھالے کہاں! اس کے گاؤں کے بہت سارے لڑکے تو ایسے بھی، جو اکثر و بیشتر گاؤں سے شہر جاتے تھے اور فلمیں دیکھتے تھے، شراب پیتے تھے، رنگ رلیاں مناتے تھے۔ اور گاؤں کی طرف یوں لوٹ آتے تھے جیسے اپنے کھیتوں کی فصل کاٹ کر گھر لوٹ رہے ہوں۔ مگر فضلو ایسا نہیں تھا اسے اپنے کھیت کھلیان سے محبت تھی۔ اور اس گاؤں کے مٹی سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی باس سے اسے انسیت تھی ورنہ وہ ایسا بچہ بھی نہیں تھا کہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اور اتنا بیوقوف [illegible] نہیں تھا کہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا ہو کہ یہ روشن کل کیا تھا

اور آج وہ اس مقام پر کیوں کر پہونچا تھا۔ اور اس کا جی بھی چاہ رہا تھا کہ روشن علی کو کچھ تیکھا سا جواب دے کے اس کا منہ بند کر دے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ روشن علی کی باتوں کو شہد کی طرح پی گیا۔ کہ اس کا ذائقہ اسے کچھ اچھا بھی لگا تھا

پھر جب وہ روشن علی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر سڑکوں پر گذرتا تو اس کا سینہ فخر سے تن جاتا کہ روشن علی اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اور جب وہ رینا کلب میں داخل ہوتا تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تاریکیوں سے نکل کر اچانک روشنیوں کے شہر میں آ گیا ہو۔ اس کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں، ہال کے اندر میز کے ارد گرد مرد اور عورتیں زرق برق لباس میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہوتے، دھیرے دھیرے سروں میں موسیقی بج رہی ہوتی لوگ بڑے سحر انگیز انداز میں ایک دوسرے سے محو گفتگو ہوتے، تو فضلو کو ایسا لگتا جیسے وہ جاگتے میں کوئی خوب صورت سا خواب دیکھ رہا ہو۔

ہیلو روشن! ہاؤ ڈو یو ڈو

ویری نائس میریا! تم میرے فرینڈ فضل سے ملو

او ویری گڈ، یہ تمہارا فرینڈ ہے۔ یہ ہمارا ساتھ ڈانس کرے گا۔

نو نو! ہم ڈانس کرنا نہیں جانتا میڈم! ہم ڈانس ایکدم نہیں جانتا۔ فضلو لرز گیا،

اس دن فضلو اس قدر حواس باختہ ہوا کہ وہ روشن علی سے الجھ پڑا تھا،

یار! یہ کہاں لے آئے ہو تم! چلو باہر نکل چلیں،

تو روشن علی نے میریا کے جانے کے بعد فضلو کو بتایا۔ کہ یہ بہت ہی بدنصیب عورت ہے اس کلب میں بھی اس کی حیثیت اس تتلی کی سی تھی جو سارے کلب میں پھر پھر اڑتی پھرتی تھی۔ اور ہر شخص اپنے دل میں یہ خواہش رکھتا تھا

کہ وہ اس تتلی کو چٹکی سے پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر بٹھا لے، مگر کوئی بھی اسے اپنی چٹکی کی گرفت میں نہ لا سکا تھا۔ لیکن ایک روز وہ خود ہی ناگن کی طرح لہراتی بل کھاتی ہوئی آئی اور شوکت کی میز پر بیٹھ گئی۔ اور شوکت بھی ایک وجیہہ اور خوب صورت نوجوان تھا۔ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو گئے، دونوں ہر روز ایک ساتھ آتے، دونوں ہر روز ایک ساتھ ڈنر کھاتے، دونوں ہر روز ایک ساتھ بال ڈانس کرتے، مگر ایک روز ایسا ہوا کہ دونوں بال ڈانس کر رہے تھے، کہ شوکت بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اور چند لمحوں کے وقفے میں وہ چل بسا تھا۔ اور میریا ایسے چیخ کر رو دی تھی کہ جیسے کسی نے اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔

اب کلب کے لوگوں نے اسے منحوس قرار دیدیا ہے کوئی بھی میریا کے ساتھ ڈانس کرنا نہیں چاہتا ہے۔ اور وہ ہر نئے چہرے کو دیکھ کر اپنی خواہش کی اظہار کرتی ہے۔ ہیلو! میرے ساتھ ڈانس کرے گا۔

میریا کی روداد روشن علی کی زبانی سننے کے بعد فضلو کافی متاثر ہوا۔ اور میریا کا چہرہ ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس کا بھولپن، اس کی معصومیت، اس کی سادگی، اور اس کی انکساری فضلو کے دل میں کھب گئی،

اور اس نے دل میں سوچا کہ کل وہ ضرور میریا سے ملے گا۔ وہ یقیناً اسے ڈانس کرنے کی دعوت دے گی۔ اور وہ انکار کر دے گا پھر وہ مایوس ہو کر جب وہ واپس جانے لگے گی۔ تو بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لے گا۔ اور اس سے کہے گا کہ میریا واپس لوٹ چلو، میں تمہارے ساتھ ناچوں گا، میں تمہاری آواز کے ساتھ اپنی آواز ملا کر گاؤں گا تم منحوس نہیں ہو میریا، تم منحوس نہیں ہو۔

پھر اس نے سوچا کہ اسے میریا کے سلسلے میں اس قدر جذباتی نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ میریا ایک اعلیٰ سوسائٹی کی لڑکی۔ اور وہ گاؤں کا ایک معمولی چھوکرا۔ جو اچھی طرح آنکھیں ملا کر تو بات بھی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ بھلا اس کے ساتھ کیا ناچے گا۔ کیا گائے گا۔ یہ باتیں اسے بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوئیں اور وہ دل ہی دل میں مسکرا کے رہ گیا۔ جس میں تلخی بھی تھی اور مٹھاس بھی۔

وہ روزانہ روشن علی کے ہمراہ کلب جاتا روشن علی اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتا، جوا کھیلتا، اور کسی عورت کے ساتھ دھیمی دھیمی موسیقی کی دھنوں پہ ڈانس کرنے لگتا۔ تو فضلو کے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ جاتی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی میز پر رکھی ہوئی بوتل کو غٹاغٹ پی جائے۔ اور روشن علی کی محبوبہ کی کمر میں بانہیں ڈال کر ناچنا شروع کر دے۔

کبھی کبھی اچانک اس کے دل میں جب ایسے خیالات پرورش پانے لگتے۔ تو وہ آپ ہی آپ تلملا جاتا۔ اور یہ سوچنے لگتا کہ اب وہ اپنے گاؤں واپس چلا جائے گا۔ اور جب اس نے اپنے اس خیال کا اظہار روشن علی سے کیا تو وہ سخت متعجب ہوا کہنے لگا۔

ابھی ابھی تو یہاں آئے ہو۔ اور واپس جانے کی سوچنے لگے تم نے اب تک نہ شراب پی ہے۔ نہ مجرا سنا ہے پھر واپس کیسے چلے جاؤ گے۔ کل ہم لوگ مجرا سننے کے لئے نرائن گنج چلیں گے۔ وہاں ایک انوری بائی ہے۔ بڑی حسین و جمیل۔ اس کا غمزہ و عشوہ، اس کی ناز و ادا دیکھو گے تو اپنے گاؤں کا رستہ بھول جاؤ گے۔ اس کے ناچنے کی ادا، اس کے گانے کی سُر اس کی آواز کے لوچ پہ یقیناً تم لوٹ پوٹ ہو جاؤ گے۔

فضلو نے روشن کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔
اس روز وہ کافی رات تک روشن علی کی آزادانہ زندگی سے متعلق سوچتا رہا تھا۔ روشن علی شہر میں اکیلا

تمدا اسمارٹ ہوگیا تھا۔ وہ کلبوں میں یوں داخل ہوتا تھا جیسے کوئی شہزادہ اپنے محل میں داخل ہورہا ہو جہاں کی عورتیں ایک دوسرے مرد کے ساتھ بے باکانہ انداز میں سرِ محفل رقص کرتی ہیں اور ایک مرد دوسری عورت کے پیچھے یوں لپکتا ہے جیسے بچپن میں گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر جھپٹتے تھے۔

اور سوچ کے اس مقام پر فضلو کو اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا اس نے سوچا کہ واقعی وہ بہت بڑا بے وقوف ہے ورنہ اس روز میریا کے ساتھ ڈانس کرنے کی دعوت کو کبھی نہیں ٹھکراتا۔ وہ بال ڈانس کے فن سے واقف نہیں تھا۔ تو کیا ہوا کم از کم میریا کے جسم کے لمس سے تو وہ ضرور لطف اندوز ہو سکتا تھا اب تو کہیں میریا نظر بھی نہیں آتی ہے۔ سنا ہے کہ کلب سے اس کا دل ٹوٹ گیا ہے۔ اور اب وہ اپنا زیادہ تر وقت گھر ہی پر گزارتی ہے۔

دوسری شب جب وہ روشن علی کے قدم بہ قدم ملا کر افسری بائی کے کوٹھے کے زینے طے کر رہا تھا تو خود بخود اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ایک صدی سے نکل کر دوسری صدی میں داخل ہو رہا ہو۔

افسری بائی کا کمرہ کشادہ تھا۔ کمرے کی ایک طرف نشست کا خاص انتظام تھا۔ فرش پر قالین بچھی ہوئی تھی۔ اس پر چار پانچ عدد گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور وہاں دو حضرات پہلے ہی سے براجمان تھے۔ اس سجے سجائے کمرے کا ماحول بڑا ہی پر تکلف اور پر سکون تھا۔

جب روشن علی فضلو کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ تو افسری بائی بڑے ہی ناز و انداز کے ساتھ سازندوں کے درمیان سے اٹھی اور اس نے مسکراتے ہوئے روشن علی کا یوں استقبال کیا۔ کہ افسری بائی کا سارا جسم کمان کی طرح خم ہوگیا تو فضلو اس کی اس ادا پر دل ہی دل میں کسمسانے لگا۔ جس کی تاب نہ لا کر دل دھڑکنے لگا۔ اور آنکھوں کے سامنے سفید دھواں سا چھا گیا

آئیے تشریف لائیے، کافی دنوں کے بعد میری یاد آئی ہے آپ کو!

افسری بائی کچھ اتنے دھیمے لہجہ میں روشن علی سے بات کی تھی کہ کسی نے سنا اور کسی نے سنا بھی نہیں۔ اور اس کے اس اندازِ گفتگو میں ایسی شائستگی اتنی شیرینی، اتنی اپنائیت تھی کہ فضلو کا دل چاہنے لگا تھا کہ بڑھ کر وہ افسری بائی کا وہ منہ چوم لے۔

پھر افسری بائی نے طشت میں پان کی گلوریاں ان کے سامنے پیش کیں۔ گلاس میں عنابی رنگ کا شربت پیش کیا۔ اور روشن علی اور فضلو کو اس نے کٹیلی نظروں سے دیکھا اور لبوں پہ ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔

شربت حاضر ہے۔ نوش فرمائیں۔

پہلے تو فضلو جھجکا کہ پتہ نہیں کیا چیز ہے پھر اس نے روشن علی کی طرف دیکھا۔ تو روشن علی نے آنکھوں کے اشارے سے بتایا کہ پی جاؤ۔ تو فضلو نے کوکا کولا سمجھ کر ایک ہی بار میں گلاس خالی کر دیا۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ اس شربت میں کچھ تلخی تھی۔ کلب والے کوک میں ایسی تلخی تو نہ تھی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے سبھی ساز بجنے لگے اور افسری بائی چہرے پر گھونگھٹ کھینچ کر ایک پاؤں کو آگے پھیلا کر بیٹھ گئی۔ اور بڑے ہی دلربانہ لے میں گانے لگی پھر کھڑی ہو کر ناچنے لگی۔ اس کے ہاتھوں کے لہرانے کا انداز، آنکھوں کے مٹکانے کی ادا، پاؤں میں گھنگھرو کے کھنکنے کی آواز اور گانے کے ایسے مدھر بول تھے، کہ روشن علی تو روشن علی فضلو کا سر بھی سرور میں آکر جھومنے لگا۔ افسری بائی کی آواز میں بڑا ہی سوز و گداز تھا۔ گانے کا مفہوم واضح تھا۔ اور گانے کا مضمون کچھ یوں تھا

میں ابھاگن سرِ شام رات کی رانی کی طرح مہکنے لگی

لگتی ہوں۔ اور ساری رات مہکتی رہتی ہوں۔ اپنے آشناؤں
کو اپنی بھینی بھینی خوشبو سے مدہوش کرتی ہوں۔ اور صبح مری
کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جیسے ساری رات طوفان چلنے
کے بعد رات کی رانی اپنی ڈالیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین
پر بکھر گئی ہو۔

گانے کے اس بول پر فضلو بے انتہا محظوظ ہوا تھا
اور اس کا جی چاہا تھا کہ اس رات کی رانی کو اپنی گود میں اٹھا
کر اپنے گاؤں میں لے جائے۔ اور اپنے گھر کی چہار دیواری
میں اسے قید کر دے۔ اور اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی
خوشبو سے وہ ساری عمر بدمست ہوتا رہے۔

اس روز وہ ساری رات افسری بائی کی اداؤں میں
کھویا رہا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت افسری بائی نے جس
شفقت اور محبت سے دوبارہ حاضر ہونے کی دعوت دی
تھی۔ فضلو کا کلیجہ ایک دم کٹا ہوا سا محسوس ہوا تھا۔ اور اس
نے راستے میں روشن علی سے کچھ کہا تھا۔

روشن! مجھے کچھ ایسا لگتا ہے۔ جیسے افسری بائی سے
مجھے عشق ہو گیا ہے۔

اس وقت روشن علی نے بڑے زوردار کا قہقہہ لگایا تھا
فضلو! تم کیا جانو عشق کیا ہوتا ہے۔ عشق میں نے
کیا تھا کلکتے میں، سوناگاچی میں ایک بہت ہی خوبصورت
طوائف تھی۔ بیلا دیوی۔ اس کی نشیلی آنکھیں۔ گلابی رخسار،
گلاب کی پنکھڑیوں جیسی نازک ہونٹ، آواز کی سحر انگیزی،
اور کپڑے پہننے کا وہ سلیقہ کہ جی چاہتا تھا کہ وہ ساری عمر یوں
ہی بیٹھی رہے۔ اور میں اسے تکتا رہوں۔ میں نے دو تین
روز اس کے یہاں شب باشی بھی کی تھی۔ وہ میرے ساتھ
نکل بھاگنے پر آمادہ بھی ہو گئی تھی۔ مگر ایک روز میرے ہی
ایک دوست مبارک علی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اور میں دل
برداشتہ ہو کر یہاں واپس آ گیا

روشن علی کی داستان سن کے وہ بڑا افسردہ ہوا پھر
اس نے دل میں سوچا صرف بیلا دیوی ہی کیوں۔ افسری بائی
بھی تو بے وفا ہو سکتی ہے۔ پھر ان جیسی عورتوں کا کیا کہ
کب اور کس کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑ لے

اس روز رات گئے تک وہ جاگتا رہا۔ جب بار
بار افسری بائی کا تصور اس کے ذہن میں ابھرتا تو اس کا سر
پھٹنے لگتا۔ اور جب سر پھٹنے لگتا تو وہ روشن علی کی الماری
سے شراب کی بوتل نکال کر پینے لگتا۔ اور جب وہ سرور میں
آجاتا۔ تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ابھی افسری بائی کے گھر جائے،
اور اس کے ساتھ ایک رات گذار کر اپنی پیاس بجھا لے۔ کیونکہ
اس کے جذبات میں ایک ہیجان برپا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ
کو پیاسا محسوس کر رہا تھا۔ اور اسے اپنے چاروں اور صحرا ہی
صحرا دکھائی دے رہا تھا۔

پھر وہ اپنے بستر سے اٹھا۔ اس نے دیکھا ہر طرف
سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھر کے سارے لوگ گہری نیند میں سو
رہے تھے۔ آنگن میں آ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس نے
سوچا کہیں اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ مگر نہیں اسے
کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ تنہا تھا، تنہا، ایکدم تنہا۔

اس وقت وہ آنگن کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے
میں آ گیا۔ باہر ایکدم اندھیرا تھا۔ ایک ہو کا عالم تھا۔ جو سارے
ماحول پر طاری تھا۔ اور اس کا دل سینے کے اندر ہولے ہولے
دھڑک رہا تھا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ لان پار
کر کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اور غیر شعوری طور پر وہ نرائن گنج
جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ جہاں افسری بائی رہتی تھی ●●●

ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر کلام حیدری نے ہند لیتھو پریس گیا میں
چھپوا کر دفتر آہنگ بیراگی گیا سے شائع کیا۔
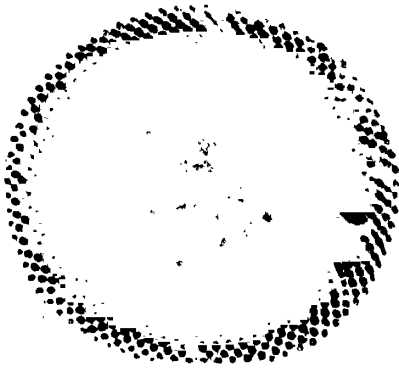
شاندار مستقبل کا ضامن ہریانہ

شریمتی اندرا گاندھی نے سماجی خوش حالی کے لئے ملک کے سامنے جو ۲۰ نکاتی پروگرام رکھا ہے ہریانہ اس پر تندہی سے عمل پیرا ہے بھگوان کرشن نے کورو کشیتر کی سرزمین پر "شری مد بھگوت گیتا" کا جو لافانی پیغام دیا تھا وہ صدیوں سے بنی نوع انسان کی رہنمائی کرتا آرہا ہے۔ آج یہ پیغام ہمیں ایک نئی سمت کی طرف گامزن ہونے کی ترغیب دے رہا ہے۔

- چھٹے پانسالہ پلان کے آخر تک تمام ذرائع کو بروئے کار لاکر آبپاشی کی موجودہ صلاحیت 19.40 لاکھ ہیکٹر کو بڑھا کر 24.00 لاکھ ہیکٹر کردیا جائے گا۔
- عالمی بینک کے تعاون سے آبی راستوں کو پکا کرنے کے بڑے پروگرام پر کام چل رہا ہے۔ جس کے پورا ہونے پر 1500 کیوسک پانی کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے گا اور اس سے 50,000 ہیکٹر مزید اراضی سیراب کیا جاسکے گا۔
- راوی، بیاس کا پورا پانی ملنے پر خوردنی اجناس کی پیداوار 100 لاکھ ٹن تک پہونچ جائے گی
- عالمی بینک کی امداد سے رضاکارانہ شجرکاری اسکیم کے تحت بہتر فضا قائم کرنے جنگلاتی دولت کو بڑھانے، اور زیادہ روزگار کے مواقع کی فراہمی کے لئے ایک سال کے اندر 12 کروڑ پودے لگائے گئے۔
- بجلی جو ہریانہ کی بڑھتی ہوئی اقتصادی آمدنی کا ذریعہ ہے کی صلاحیت کو مختلف پروجیکٹوں کی تکمیل سے 1174 میگاواٹ سے بڑھاکر 2079 میگاواٹ کیا جارہا ہے۔
- ریاست کی تمام 5634 ہریجن بستیوں میں بجلی پہونچا دی گئی ہے۔ دوسری قابل ستائش کامیابی یہ ہے کہ گلی کوچوں میں بھی بجلی کی روشنی مہیا کردی گئی ہے۔
- اس دہائی کے اختتام تک ریاست کے تمام ایسے گاؤں میں جہاں پینے کے پانی کی کمی ہے وہاں پانی فراہم کردیا جائے گا۔ اب تک 900 گاؤں میں پینے کے پانی کی سہولتات مہیا کرائی جاچکی ہیں۔
- غریب دیہاتیوں میں فالتو اراضی کی تقسیم اور رہائشی پلاٹوں کا تقسیم کا کام تقریباً مکمل ہونے والا ہے۔
- ہریجنوں اور پچھڑے طبقوں کی بہبود سے متعلق کارپوریشنوں کی بہتر کارکردگی سے ان طبقوں کو سماجی اور اقتصادی فائدے ہورہے ہیں۔

اپنے عظیم رہنما کے خوابوں کی تعبیر کے لئے ہریانہ ایک نئے عزم سے کام کررہا ہے تاکہ اس انقلابی پروگرام سے سماج کا ہر فرد مستفید ہوسکے۔

بھجن لعل
وزیر اعلیٰ، ہریانہ

جاری کردہ:- محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ 82/46

مختصر تعارف

نام	———	شاہد انور
والد کا نام	———	جناب خلیل الدین
یوم پیدائش	———	۳۰ ستمبر ۱۹۶۱ء
آبائی وطن	———	بھاگل پور
پہلا افسانہ	———	۱۹۸۰ء میں شاعر میں شائع ہوا

شاھد انور

اندھیرے، اجالے

کل رات پھر وہی ہوا جو تقریباً ایک ماہ سے ہر رات ہوتا آرہا تھا لیکن اب اس رشتہ کے بہت سے ہاتھ پاؤں نکل آئے تھے۔ اور جو آکٹوپس کی طرح مجھکو اپنے شکنجہ میں آہستہ آہستہ جکڑتا چلا جا رہا تھا۔

میں جب بھی تمہارے لئے سوچتا ہوں میرے سامنے وہ رات آکھڑی ہوجاتی ہے جب سب کچھ نیا نیا تھا۔

میں تمہارے کمرے میں بیٹھا تمہاری نوٹس دیکھ رہا تھا۔ گھر کے دوسرے لوگ منجو آنٹی کے یہاں پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ یوں ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے تھے اور بارہا بہت دیر تک تنہا بھی ساتھ رہے ہیں لیکن اس رات جیسا ہنگامہ تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے تمہاری کاپی کھولی ہی تھی کہ بجلی چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ بجلی دو گھنٹہ سے پہلے نہیں آنے والی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔

اُف! یہ کمبخت بجلی والے تو پڑھنے ہی نہیں دیتے،

تمہارے پاس اس وقت کچھ تھا بھی نہیں کہ جلاتی۔

ارشی تم چپ کیوں ہو۔؟ اندھیرا اور بھی خوفناک معلوم ہورہا ہے۔ اس اندھیرے میں میں نے تمہاری آنکھوں کے دیئے کو پہلی بار شعلے اگلتے دیکھا۔ میں اب بھی خاموش رہا۔ تم کرسی سے اٹھکر میرے سامنے کھڑی ہوگئیں۔

گیا

آؤ، بالکنی میں چلیں۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تمہارے بدن کی مہک میرے اور بھی قریب ہوگئی۔ تم راہداری میں ہی رُک گئیں۔ جہاں اندھیرا زیادہ گہرا تھا میں تم سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ تمہاری شرارت کو کچھ کچھ بھانپ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟

اچانک محسوس ہوا جیسے میں چنگاریوں کے ڈھیر میں دبا دیا گیا تم مجھ سے لپٹ پڑی تھیں تمہارے ہونٹ میرے چہرے پر دوڑنے لگے۔ تمہاری باہیں میری گردن اور اس سے نیچے رقصاں تھیں اور تمہاری سانس میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے تمہیں اور بھی قریب کھینچ لیا۔ تمہارے جسم کا ایک ایک عضو میری دست درازی کی گرفت میں تھا۔ تم مجھ سے بالکل چمٹی جا رہی تھیں، ....

اور پھر یہ رات بھی ہونے لگا۔ پڑھائی کے بہانے ہم دونوں ایک کمرہ میں رہتے، اور اب اندھیرا ہونے کا بھی انتظار نہیں رہتا۔ یہ سلسلہ نہ جانے کتنے دنوں تک جاری رہتا اگر آج اس رشتہ کو میں نے اجالوں تک کھینچ لانے کا فیصلہ نہیں کرتا۔ میں پچھلے کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ ہم آخر کب تک یہ کھیل کھیلتے رہیں گے۔ جس کا انجام تمہارے لئے خطرناک بھی ہوسکتا ہے لیکن تمہیں تو اس کی فکر ہی نہیں ہے جیسے آج میں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ تم سے جلد شادی کرلوں گا۔

تم اس وقت میرے سامنے ہو۔ تمہارے ہاتھ میرے کاندھوں پہ ٹکے ہیں۔ اور اس سے پہلے کہ وہی پرانا کھیل شروع ہو میں تم سے کہتا ہوں،

ارشی ہمیں شادی کرلینی چاہئے،

تم بھڑک اٹھی،

ارشی آخر ہمیں شادی کی ضرورت کیا ہے؟ ہم کیا اس طور پر ایک دوسرے کے قریب نہیں ہیں۔ ہماری چاہتیں کیا اس طور ادھوری ہیں۔ ہماری بھوک کیا اس طرح نہیں مٹ پاتی، ہم آخر کہاں سے نامکمل ہیں؟ — بقیہ۔ صفحہ ۵۱

حادثہ

شاہد انور

آج کی شام بہت خوش گوار تھی ۔ کچھ ہی دیر قبل بارش تھمی تھی ، اور دن بھر کی جھلسا دینے والی گرمی کا اب کہیں نام و نشان نہیں تھا ۔ بوڑھے جوان سبھی کے چہرے یک بیک تروتازہ ہو گئے ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا جسم کو ایک لطیف سی تھپکی دے رہی تھی ۔ سب کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا ، بالکل جوان ،

اور ایسی شام میں اس شہر کے رہنے والوں کو بھارت کیفے کی یاد بری طرح آتی ہے ۔ جب کسی شام اس شہر کے ہنگامے شدید ہو جاتے ہیں ۔ تو کچھ لوگ اس ہنگامے میں خود کو جلانا نہیں چاہتے بھارت کیفے کا رُخ کرتے ہیں ۔ گنگا کے ساحل سے لگی ہوئی اس کی لاونج میں سب کچھ خموش اور ساکت لگتا ہے ۔ ایسا لگتا ہی جیسے ہم اس دنیا میں بیٹھے ہیں ۔ جہاں ہر پل ایک دہکتا ہوا اجالا مکھی سے سب کچھ نیم خوابیدہ سا لگتا ہے ۔ زندہ رہتی ہے تو بس گنگا کی موجوں کی ہلکی سی اتھل پتھل ...... اور بس سب کچھ گم صم سا ، کھویا کھویا سا ۔

میں بھی ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا ، میرے آگے پیچھے چاروں طرف چہرے ہی چہرے نظر آرہے تھے ۔ خلاف معمول آج یہاں بہت سارے لوگ موجود تھے ، اور اس کی وجہ شاید مہینوں کے انتظار کے بعد آنے والی آج کی شام تھی ۔ سبھی چہرے دہک رہے تھے ، میرے بائیں ہاتھ کی سیٹ پر ادھیڑ پروفیسر نراش موجود تھے اور ان کے ساتھ تھیں انگریزی کی لکچرار مس پانڈے ، دونوں کے رومانس کا چرچا ان دنوں یونیورسٹی میں بہت زور شور سے ہو رہا تھا ۔ حالانکہ دونوں کی عمر میں اچھا خاصہ فرق ہے ۔ اپنے اپنے ڈپارٹمنٹ میں اپنی سنجیدگی کے لئے مشہور یہ دونوں ابھی بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے ، اور ایک دوسرے کی مسکراہٹوں میں بھرپور ساتھ دے رہے تھے ،

ان سے کچھ دور جو نوجوان جوڑا بیٹھا ہوا تھا ، وہ دونوں میرے فلیٹ کے سامنے والی بلڈنگ میں رہتے ہیں ۔ ایک کرایہ دار کا لڑکا تھا جو کسی مقامی یونٹ میں پڑھاتا ہے ۔ اور لڑکی مکان مالک کی بیٹی تھی جو فائن آرٹ کی اسٹوڈنٹ ہے ۔ یہ دونوں آئے دن ایک دوسرے سے جھگڑتے رہتے ہیں ۔ کبھی نیچے سے نل کھول لے جانے پر ، تو کبھی بجلی کا سوئچ آف کر دینے پر لیکن ابھی ان دونوں کے بیچ انڈر اسٹینڈنگ نظر آرہی تھی ۔ ان کے پیچھے ایک شاعر بیٹھا تھا ، جو یہاں کے ادبی حلقہ میں ایک اچھی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس وقت وہ گنگا کی لہروں میں نہ جانے کیا کیا تلاش کر رہا تھا ...... اور پھر وہاں ادھر ...... اُدھر ...... بہت سارے لوگ تھے لیکن سب اپنے آپ میں گم ۔

یک بیک میں چونک گیا ۔ کیونکہ جو عورت ابھی ابھی مجھ سے کچھ دور بیٹھی تھی ۔ اس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا سا لگا ۔ میں نے اسے قریب سے دیکھنے کی کوشش کی اور کچھ یاد کرنے لگا بہت سارے چہرے اکٹھا ہو گئے ...... ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے ...... بہت سارے لوگ آنے لگے ، اور اپنے اپنے چہروں ، سے منسلک ہو کر الگ ہو گئے ...... یہ نیرا سہائے تھی ، پرچون والے کی بیٹی اور مجھے آٹھ سال پہلے کی وہ شام یاد آگئی ۔

میں ترپاٹھی جی کے یہاں سے ٹیوشن کر کے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں یک بیک بارش نے گھیر لیا ۔ بڑی تیز بارش تھی ، میں تقریباً بھیگ چکا تھا ۔ لیکن آس پاس کوئی شیڈ نہ دیکھ کر میں

سائیکل کی رفتار تیز کردی۔

اسی روڈ میں پربھو سہائے کا بھی گھر پڑتا تھا۔ وہ اپنے کالج کے ہر دلعزیز لکچرار تھے، ان کی لڑکی نیرا سہائے بھی میرے ہی ساتھ تھی۔ اور ان کے گھر میں آنے جانے سے میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ پربھو جی کے گھر میں صرف دو ہی افراد تھے نیرا اکلوتی تھی اور اس کی ماں بہت پہلے ہی مر چکی تھیں۔ روڈ سے آتے جاتے میں پربھو سہائے کے گھر پر ایک نظر ڈال لیا کرتا تھا ہر بار مجھے نیرا ہی نظر آتی، کبھی اسٹڈی کرتے ہوئے، تو کبھی ریڈیو آن کرکے ہوئے مجھے دیکھتی تو ہاتھ ہلا دیا کرتی، اور کبھی مسکرا کر صرف رہ جاتی۔

اس شام میں جیسے ہی پربھو سہائے کے گھر کی طرف مڑا، میری نظر نیرا پر پڑی جو کھڑکی سے لگی کھڑی تھی۔ اور مجھے اندر چلے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اس وقت تک بارش اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ اور میں نے آگے بڑھنا مناسب نہیں سمجھا۔ برآمدہ میں سائیکل کھڑی کی، تب تک نیرا دروازہ کھول چکی تھی۔ اور میرا حلیہ دیکھکر ہنس رہی تھی۔ آدمی طوفان میں بھی سلیش تم پڑھنے سے باز نہیں آؤ گے، ارے بھائی تمہیں تو ٹاپ کر رہے ہو اس بار، اتنا جان کھپانے کی کیا ضرورت ہے؟

میں بالکل شرابور ہو چکا تھا۔ کپڑا بدن پر چپک جانے سے سردی بھی لگ رہی تھی۔ نیرا نے میری یہ حالت دیکھی تو کہا۔

بغل والے روم میں پاپا کے کپڑے ہیں جا کر بدل لو۔ میں تھوڑا ہچکچایا تو تحکمانہ انداز میں بولی۔ جاؤ ورنہ نمونیہ ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے

اور اس بار میں چپ چاپ دوسرے کمرے میں گھس گیا پربھو جی کے کپڑے مجھ پر فٹ نہیں ہو رہے تھے، لیکن کسی طرح ان کا پائجامہ اور بشرٹ اٹھا ہی لیا۔ نیرا نے کپڑوں کو میرے بدن پر اس طرح جو کسرت کرتے دیکھا تو ہنس پڑی۔ بالکل انکل جیسے لگ رہے ہو۔ ٹھہرو تمہارے لئے کافی لاتی ہوں۔ ایسے موسم میں بڑا مزہ آئے گا کافی پینے کا۔ وہ کچن کی طرف مڑ گئی۔

مجھے تعجب ہوا کہ کالج سے آنے کے بعد ہر وقت گھر میں رہنے والے پربھو جی ایسے موسم میں کہاں نکل پڑے، ان کی یہ عادت تو کالج میں بھی مشہور تھی۔ میرے ساتھی تو یہاں تک کہتے کہ بیٹی کی رکھوالی ہوتی ہے سارا دن۔ لیکن میں جانتا تھا کہ انہیں نیرا کی تنہائی کا پورا پورا احساس ہوتا ہے۔

نیرا کافی بنا کر لے آتی ہے۔ سر کہاں نکل پڑے ہیں اس بارش میں؟

سلوجا انکل کی چھوٹی لڑکی بیمار ہے۔ اس کو دیکھنے گئے ہیں سلوجا صاحب بھی اکنامکس ہی میں تھے، اور ان دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔

نیرا میری بغل میں آکر بیٹھ جاتی ہے۔ اور اپنی نوٹس دیکھنے لگی۔ ساری فضا سرد تھی۔ اور ایسے میں جو کبھی کاپی کا ورق لیتے ہوئے میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکراتا۔ تو لگتا میرے اندر ہی اندر کوئی چیز گرم ہو اٹھی ہو......... باہر بارش اسی رفتار سے ہو رہی تھی......... ہوا تیز اور کافی سرد...... یک بیک ایک تیز دھماکے کے ساتھ سارے گھروں کی روشنی گل ہو جاتی ہے۔

لو اب نئی مصیبت آئی۔ تیل بھی نہیں ہے کہ لیمپ جلاؤں نیرا جھنجھلاتی ہے۔ اب باہر اندر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اگر کوئی چیز روشن ہے تو میری بغل میں بیٹھی ہوئی نیرا کے جسم کی آنچ...... میرے اندر کوئی بدشکل چیز جاگ اٹھتی ہے........ مجھے لگتا ہے جیسے اس اندھیرے کمرے میں کسی سانپ کی پھنکار جیسی ڈھیر ساری تصویریں روشن ہو گئی ہوں...... ان تصویروں کا ناچ شروع ہوتا ہے...... ایک ہنگامہ...... ناچ اور بھی تیز ہوتا ہے...... اور تیز...... تیز...... اور تیز......

میری انگلیاں نیرا کے ہونٹوں کو چھو لیتی ہیں۔ میرا سارا چہرہ

جھنجھنا اٹھتا ہے۔ نیرا کا ایک زناٹے دار طمانچہ میرے گالوں پر پڑتا ہے۔ اور وہ غصہ و نفرت کا پیکر بنی میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ گیٹ آؤٹ۔ کمینے ..... ذلیل! اس سے پہلے کہ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں یہاں سے نکل جاؤ۔ اور میں اپنے اندر کے شیطان کو سینے میں دبائے اسی بارش میں باہر نکل جاتا ہوں۔

اس دن سے میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔ کتنی بار سوچا کہ نیرا سے معافی مانگ لوں۔ لیکن وہ ..... وہ تو جب بھی ملتی نفرت سے منہ سکوڑ لیتی۔ اور زمین پر تھوکتے ہوئے میرے قریب سے گزر جاتی۔ اور میں اسی طرح بوجھ سے دبا رہا۔

پھر زندگی کے کینواس پر بہت سارے لمحے آئے اور گئے۔ میں یہاں سے گریجویشن کر کے دلی چلا گیا۔ لیکن میرے اندر کے آدمی پر یہ بار زندہ رہا۔ میں آنے والے وقت کا انتظار کرتا رہا کہ یہ قرض اتار سکوں۔ دلی میں ہی اجیت کے خط سے معلوم ہوا کہ کالج کے پرنسپل شپ کے جھگڑے میں پربھو سہائے کا قتل کر دیا گیا نیرا کچھ دنوں پہلے ماسٹر ڈگری میں بری طرح فیل ہوئی، اور پھر اچانک کہیں غائب ہو گئی۔ پھر کسی کو اس کی خبر نہیں ملی ..... لیکن آج .....

آج پھر وہ میرے سامنے ہے اور مجھے لگا کہ جیسے آج وہ وقت آ ہی گیا۔ کہ برسوں سے ڈھوئے جا رہے اس بوجھ کو اتار پھینکوں۔ میں اس کے پاس جانے کے لئے اٹھا لیکن وہاں .... اب اس ٹیبل پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں جلدی سے ٹیبل صاف کرنے والے بیرے سے نیرا کے بارے میں پوچھا، وہ میم صاحب تو ابھی باہر چلی گئیں،

میں باہر کی طرف دوڑتا ہوں۔ نیرا ایک نیلی فیاٹ کو ڈرائیو کرتی ہوئی میرے قریب سے گزر جاتی ہے۔ میں نے اپنا اسکوٹر اس کے پیچھے لگا دیا۔

نیرا کے چہرے میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ وہ بہت گہرے میک اپ میں تھی۔ پھر بھی ویسے ہی شاداب نظر آ رہی تھی۔ جیسی آٹھ سال پہلے اس شام۔ میں بہت کچھ سوچنے لگتا ہوں ..... بہت کچھ .....

ہم دونوں پٹیل کالونی میں داخل ہو چکے تھے۔ اور اس کی گاڑی ایک خوب صورت بنگلے میں رک چکی تھی۔ دروازہ پر ہی مس نیرا سہائے کی پٹی لگی ہوئی تھی۔ اس کے نام کے آگے اب بھی مس، لگا دیکھ کر نہ جانے کیوں خوشی ہوئی، اندر لان میں فیاٹ کے علاوہ ایک دوسری کار بھی تھی۔ جیسے ہی میں نے کال بیل پر انگلی رکھنا چاہا۔ اندر سے کسی مردانہ قہقہہ کی آواز آتی ہے۔ میں چونک گیا کہ نیرا کے ساتھ یہ مرد کون ہے جالی کے سوراخ سے آنکھ لگا کر دیکھا اور مجھے لگا جیسے یہاں تک آنے میں بہت دیر لگا دی۔ اندر کوئی نوجوان بیٹھا ہنس رہا تھا، اور نیرا اپنے بدن سے کپڑے الگ کر رہی تھی،

میں تھکے ہوئے قدموں سے نیچے اترتا ہوں، یک بیک سامنے گلی سے دو چھوکرے نمودار ہوتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر ان میں ایک کہتا ہے، دیکھ رہے ہو یار! آج کل اس کال گرل کے مزے ہی مزے ہیں۔ ایک شفٹ میں دو دو آسامی پھانس رہی ہے۔ اور دونوں میری طرف ایک گندی سی مسکراہٹ پھینک کر غائب ہو گئے،

مجھے اس شام پر رونا آ گیا جس کے نصیب میں ایک حادثہ بھی لکھا تھا

●●

بے مزہ

شاہد انور

آخرکار اس نے اخبار اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اور اخبار والوں کو گالیاں دینے لگا کہ جنکو وہ ایماندار اور سچا آدمی سمجھتا تھا۔ وہ بھی دھوکے باز نکلے۔ آج اس کی اٹھنی برباد گئی۔ پچاس پیسوں میں وہ پانچ سگریٹیں خرید سکتا تھا۔ نرم ملائم اور سفید سگریٹ جو اس کے جسم کی تنی ہوئی رگوں کو فرحت پہونچاتی، لیکن کم بخت یہ اخبار پڑھنے کی عادت...... اس نے تو جیسے اس کا سارا سکون چھین لیا تھا۔ آٹھ آنے میں پانچ سگریٹ...... اُف

اور پھر وہ اخبار والوں کو کوسنے لگا۔ اخبار والوں کو گالیاں دیتے دیتے جب اس کا ذہن تھک گیا۔ تو اس نے ریڈیو آن کیا لیکن پھر وہی کسک، جیسے سب کچھ کھو گیا ہو، ریڈیو سے آنے والی آواز ایسی لگ رہی تھی جیسے قبرستان میں کوئی منحوس جانور چیخ رہا ہو، اور جھلا کر اس نے ریڈیو بھی بند کر دیا۔

آخر اخبار والوں کو آج ہو کیا گیا۔ پہلے تو کتنا مزیدار ہوا کرتا تھا یہ اخبار، لیکن آج......

باہر صحن میں بچے جھگڑ رہے تھے، شبنی گڈو سے لوڈو کے گوٹ چھین رہی تھی۔ اور گڈو چیخ چیخ کر اپنی ماں کو بلا رہا تھا کوئی اور دن ہوتا تو وہ بچوں کو سمجھا کر ان کے بیچ صلح کرا دیتا، اور خود بھی کھیلنے لگتا۔ لیکن آج اسے دونوں بچے زہریلے جانور معلوم ہو رہے تھے، باہر نکل کر اس نے دونوں کو زوردار چانٹا لگایا

اور پھر کمرے میں آ کر پیکیٹ سے آخری سگریٹ نکالنے لگا۔

پیکٹ کے پاس ہی اس کا پھینکا ہوا اخبار پڑا تھا۔ اور اس نے آخری بار اسے الٹ پلٹ کر کچھ کھوجنے کی کوشش کی لیکن کہیں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور غصے نے مل کر ایک عجیب سا رنگ پھیلا دیا تھا۔

وہ دن کتنا اچھا تھا جب اس نے پڑھا تھا کہ کسی گاؤں میں چھ آدمیوں نے مل کر پندرہ سال کی ایک لڑکی کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا۔ نہ جانے کتنی بار اس نے یہ خبر پڑھی تھی۔ اور سارا منظر اس کی آنکھوں میں اس طرح اتر گیا تھا جیسے وہ سب کچھ اس کے سامنے ہوا ہو۔ ایک کمسن سی لڑکی، اور چھ آدمی.... زبردستی ...... مخالفت اور پھر زبردستی ...... اُف اس کی زبان پر جیسے کچھ چپٹا سا گھل گیا تھا۔

اور اس رات جب اس کی انگلیاں اپنی بیوی کے جسم پر دوڑ رہی تھیں، اور وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کے جسم سے لگی جا رہی تھی، تو یک بیک اسے اپنی بیوی سے نفرت سی ہو گئی، اور وہ چپ چاپ منہ پھیر کر سو گیا۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی کہ نہ ہچکچاہٹ، نہ روک اور نہ مخالفت، پھر کئی دنوں تک وہ خبر ایک منظر بن کر اس کے ذہن سے چپکی رہی۔

ایک بار بس میں سفر کرتے ہوئے جب اس نے ایک آدمی کو پڑھتے سنا کہ بارات لے کر جاتا ہوا ایک ٹرک پل سے گر گیا اور سارے آدمی مارے گئے، تو اس نے کس تپاک سے اخبار اس آدمی سے چھین لیا تھا۔ اور پوری خبر ایک ہی سانس میں پڑھ گیا۔ اخبار لوٹاتے ہوئے جب اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا، تو سڑک کے کنارے کنارے کافی گہری گہری گھاٹیاں چل رہی تھیں، اور اس کے دماغ میں ایک خیال آیا کہ کاش بس کا ڈرائیور ایک پل کو آنکھیں موند لیتا۔ اور بس کسی گہری کھائی میں اتر جاتی۔ بس میں بیٹھے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سو آدمی ایک دوسرے پر گرتے ہوئے کھائیوں میں لڑھک جاتے، چیختے،

چلائے اور زخمی ہوتے ہوئے آدمی ...... کتنا لطیف ہوتا وہ منظر لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ وہ بہت مایوس ہوا اور سارا دن سوچتا رہا کہ کاش ایسا ہو جاتا......

اس نے کتنی بار دعا کی تھی کہ اس کے شہر میں بھی ہنگامہ ہوتا، ڈھیر سارے لوگ مارے جاتے، گھر جلائے جاتے، ہر جگہ کیمپ لگتے، تاکہ اگلی صبح کے اخبار میں اس کے نام سے بھی ایک فساد جوڑ دیا جاتا، اس نے اب تک صرف اخبار میں ہی پڑھا تھا، کہ ہنگامہ والی جگہوں پر کیسا ماحول رہتا ہے لوگ کیسے سہمے ہوئے پھرتے ہیں۔ اور کس طرح ایک دوسرے کو شکوک نظروں سے دیکھتے رہیں۔ کیونکہ اس کے شہر میں بھی کوئی بڑا فساد نہیں ہوا، چھوٹے چھوٹے جھگڑے ہوتے تھے لیکن پولس دبا دیتی، اسے پولس پر بڑا غصہ آتا، کہ اس کی وجہ سے اس کے شہر میں کچھ ہوا نہیں۔ اور اسے ہمیشہ دوسرے، شہروں میں ہونے والے فسادات کی خبریں پڑھتے رہنا پڑا۔ خیر، روز کہیں نہ کہیں کی ایسی خبر ضرور چھپ جاتی، لیکن آج ......

آج تو اخبار اداس تھا، اس نے پورا اخبار پڑھ ڈالا لیکن نہ تو کہیں قتل ہوا، نہ ڈکیتی، نہ تو کسی لڑکی کی آبرو ریزی ہوئی اور نہ ہی کوئی ٹرک الٹ جانے کا حادثہ، لیکن فساد ہونے کی خبر بھی نہیں تھی۔ آج اس کی اٹھنی برباد ہوئی۔ آٹھ آنے کی پانچ سگریٹیں آتیں، ...... نرم ملائم اور سفید سگریٹیں، جو اس کے جسم کی تنی ہوئی رگوں کو ٹھنڈک پہونچاتیں۔ ●●

بقیہ:- اندھیرے اجالے

تم پھر اسی طرح مجھ سے چمٹ جاتی ہو، میرے ہونٹوں کو میرے چہرے کو اور میرے جسم کے مختلف حصوں کو چھونے لگتی ہو۔ اور میں۔

——— ؟ اندھیرے نے ہی شروع کیا تھا،
پھر اجالے میں کون سی برائی ہے ؟

بہت سی باتیں اندھیرے میں اچھی لگتی ہیں۔ اور ہم جسے اجالا کہنا چاہتے ہیں۔ اس کا علم کہاں ہے۔ ؟ اور یہ کیسے ہے ؟

اور بجلی ایک بار پھر فیل ہو جاتی ہے۔ ●●

دھندلکے

شاہد انور

چہرے ...... چہرے ...... چہرے وہ کل رات ان گنت چہروں کی بھیڑ میں کھویا ہوا تھا۔ بہت ساری پرانی تصویریں جو اس کے ذہن کے تاریک گوشہ میں جا چھپی تھیں اور جن پر بہت سارے سال دھواں کی ایک موٹی سی پرت کی شکل میں جمے ہوئے تھے۔ یک بیک جھلمل ہو گئی تھیں۔ وہ سارے عکس جن کو مردہ سمجھ کر اس نے کہیں دور پھینک ڈالا تھا اچانک پھر سے روشن ہو گئے تھے۔ اور دھندلائی آنکھیں اس سے اس کے تیس چالیس سالوں کے سفر کا حساب مانگ رہی تھیں، اور سب کچھ اس کے سامنے تھا ...... اس نے کچھ بھی تو نہیں پایا اس طویل سفر کے بعد بھی۔

بارش یار ہو رہی تھی۔ اور اس کے اندر سب کچھ دھل رہا تھا۔ آئینہ کی ایک ایک لکیر اس کا چہرہ حیرت سے تک رہی تھی جیسے وہاں دو آنکھیں کچھ لکیریں ابھر آئی ہوں۔ لکیریں ہی تو تھیں جو کہیں کہیں سے مر گئیں اور جن کے کنارے اب کند ہو چکے تھے لیکن یہ لکیریں اور اس کے چہرے ...... نہیں نہیں، اس نے آئینہ اٹھا لیا۔ وہاں تو سب کچھ ویسا ہی تھا کسی رات کا سناٹا اتر آیا تھا آنکھوں میں ...... اور بس

پٹنہ کالج کے لان پر بسر ہوتی وہ جگمگاتی رات ...

وہاں بیٹھے ہوئے، احبت، اکرام، آمی، روشن وغیرہ ......

ان کے چہروں پر برستا ہوا پورے چاند کا دودھیا پن ......

اور سنجے تیواری گا رہا تھا" اس کی آنکھوں میں کوئی خواب بھی چلتا ہو گا" اور گنگا کے سینے سے ابھرتی ہوئی موسیقی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

کہاں گئے اتنے سارے لوگ، ؟ ابھی تو سب ساتھ سارے راستے تو جانے پہچانے تھے۔ پھر یہ کون سا موڑ تھا جہاں سب غائب ہو گئے باری باری۔ ریگل ریستوران تک جانے والی وہ پتلی سی سڑک تو ابھی ابھی اس کے ساتھ تھی۔ پھر اچانک کہاں کھو گئی، ڈھیر سارے راستوں کا ایک بنڈل سا تھا۔ اس کے سامنے اور اب کتنی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ سڑک پہچاننے میں جو دھیرے دھیرے اس کے ساتھ چلتے ہوئے ریگل تک چھوڑ آتی تھی۔

ریگل ...... دائیں کونہ میں بچھی ٹیبل کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے چہروں کا منظر من سنگھ جمشید پور فساد پر بحث کرتے کرتے چیخنے لگا تھا۔ ہمارے باپ دادا نہایت کمینے تھے جنہوں نے وراثت میں ہمیں صرف نفرت دیا۔ وہ لڑتے رہے اور اب ہم ایک دوسرے کا خون پی رہے ہیں۔ اور ہمارے بعد کی جنریشن ...... اُف !

وہ بولتا رہا اور آس پاس بیٹھے لوگ اس کا چہرہ حیرت سے تک رہے تھے۔ کیسا ہو رہا تھا اس وقت سماں۔

باہر موسم خوشگوار ہونے لگا تھا۔ بارش تھم چکی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ننھے ننھے پودے اپنا سر دائیں بائیں جھٹک رہے تھے۔ اندر کے سوکھے ہوئے موسم نے بھی کروٹ لی۔ اور وہ گرادس کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔ کتنے دن ہو گئے تھے اس طرح بھیگنے کا مزہ لئے، جب بھیگی بھیگی چمکیلی سڑکوں پہ چلتے ہوئے کسی کی نظریں ستارہ بن بن کر سینے میں جگمگ کرتی رہتی۔ اُف ! اب تو ایسی رُت چھائی ہے کہ سب کچھ بوجھل ہو گیا ٹھیک اس شام جیسا۔

سنجے تیواری نے اپنی آنکھوں میں یادوں کی جوت جلائے

جوت جلائے اس سے کہا تھا۔ بھائی انیلا نے اپنے لڑکے کا نام شوکت رکھا ہے۔ اور جب ہونق کی طرح اس کا چہرہ تکنے لگا تو اس کے شانہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا،

چلو بے سنگھ کی گرم گرم چائے پیتے ہیں۔ پھر وہ شام کتنی اداس ہو گئی تھی۔ وہ گنگنا نے لگا۔ بات نکلے گی تو پھر.... لیکن اس کی آواز ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہی تھی۔

نہ جانے کتنے منظر تھے جو اس کے اندر ٹیس بن بن کر ابھر رہے تھے۔ الوداع...... الوداع .... اس نے دوبارہ آئینہ دیکھا۔ اور اس بار وہ نقوش پڑھ لیا جو اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی اتنی طویل جد و جہد میں اس کے چہرے پر اتر آئے تھے۔ وہ اس صبح سے آج تک اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی کوشش میں اپنے پورے وجود کو فریز کے آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور وہ صبح پورے آئینہ پہ پھیل چکی تھی۔

اکرام کو الوداع کہنے کی وہ صبح .... چھوٹے چھوٹے قہقہے بلند ہوتے اور پھر سب کچھ خاموش ہو جاتا.... باری باری سبھوں کے گلے ملنے کا وہ منظر..... اکرام کا ڈبہ میں چڑھتے چڑھتے رُک جانا اور پلٹ کر کہنا the world too much with us

سب کچھ تو ویسا ہی تازہ تھا۔ تصویریں پرانی تھیں لیکن اب بھی چمک رہی تھیں۔

اور بکھراؤ کا منظر...... وہ تو بالکل ویسا ہی نیا تھا جیسا تیس چالیس سال پہلے سبھوں نے اپنے آپ کو آتی جاتی لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔ کبھی کبھی لہروں کے ٹکراؤ سے ہچکولے کھاتے ہوئے وہ ایک دوسرے کے قریب بھی آتے لیکن پھر اپنی اپنی سمتوں میں روانہ ہو جاتے۔ وہ بھی تو بہت دور نکل چکا تھا دوسروں سے۔

ساری تصویریں، سارے عکس، سارے منظر جو کب سے دھند میں چھپے تھے، کل رات سے پھر اس کے پاس پاس تھے، کل رات سے وہ اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ ان کو جھٹک کر پھر ان سے دور نکل جائے، پرانے چہروں کو بھلا کر نئے چہروں کے ہمراہ اپنا سفر جاری رکھے۔ لیکن سب کچھ تو اس کے قریب تھا ...... بالکل قریب اس نے بارہا چاہا کہ انہیں دھکیل کر آگے بڑھ جائے، لیکن کچھ بھی تو اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو گیا آخر کیوں ؟ ان چہروں سے لپٹا ہوا کہرہ یک بیک کیوں چھٹ گیا۔ اور سب کے سب تیز دھوپ میں کیسے نہا گئے، ؟

اور اسے اپنے آپ پر بڑی طرح جھلاہٹ ہوئی، بات تو بس اتنی سی تھی کل شام ...... شبیر شاہ لودھنہ کی سیڑھیوں پر ٹانگیں پھیلائے تنویر دھیرے دھیرے ڈوبتے ہوئے سورج کو گھور رہا تھا اور جب سورج عید کی بڑی بڑی گنبدیں سے الجھ کر غائب ہو گیا۔ تو اس نے اچانک پوچھا ــــ یار تیری اس لودھنہ روڈ والی بنگالن کا کیا ہوا ؟

گم گشتہ

شاہد انور

آج تقریباً دس بارہ سالوں کے بعد بڑے میاں اچانک روڈ پر مل گئے۔ میں انہیں اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ بڑے میاں کے چہرے پر کافی جھریاں پھیل چکی تھیں۔ آنکھوں کی چمک کسی حد تک ماند پڑ گئی تھی۔ لیکن ان کی چال میں اب بھی وہی الہڑ پن تھا۔ جس کے لیے وہ گاؤں میں کافی مشہور تھے۔

بڑے میاں ہمارے نوکر تھے۔ ابو کے شہر چلے جانے کے بعد گھر میں بازار سے چیزیں وغیرہ لانے میں کافی پریشانی ہوا کرتی تھی۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی تب دونوں کافی چھوٹے تھے۔ اس لئے ابا نے شہر سے بڑے میاں کو بھیج دیا تھا۔ بڑے میاں ان کا نام نہیں تھا۔ چونکہ جوانی میں ہی ان کے کچھ بال سفید ہو گئے تھے۔ اس لئے سبھی انہیں اس نام سے بلانے لگے۔ پہلے تو بڑے میاں بہت جھنجھلایا کرتے۔ اپنے اس بوڑھے نام پر، لیکن پھر عادت سی بن گئی۔ اسے سننے کی، اور پھر انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے اس نئے نام کو قبول کر لیا۔ اماں نے جب اس ہٹے کٹے نوجوان کو دیکھا۔ اور ان کا لقب سنا تو خوب ہنسیں،

بڑے میاں کے ملتے ہی اپنا وہ پرانا مکان مجھے یاد آ گیا۔ جس کے ایک چھوٹے سے کچے کمرے میں بڑے میاں چٹائی بچھا کر لیٹے رہتے اور دھیمے دھیمے سروں میں نہ جانے کیسے کیسے گیت گنگنایا کرتے تھے۔ مجھے گیت کے بول تو سمجھ میں نہیں آتے پھر بھی بڑے میاں کے قریب لیٹے لیٹے ان کے ہونٹے موٹے ہونٹوں کو کئی خوب صورت زاویے بناتے ہوئے غور سے دیکھتا۔ مجھے گرمی کی وہ دوپہریں یاد آ گئیں، جب اماں کو سوتا چھوڑ کر میں بڑے میاں کے کمرے میں گھس جاتا۔ اور ضد کر کے انہیں آم کے باغیچہ میں باہر لے جاتا۔ وہاں کسی گھنے پیڑ کے سائے میں ہم دونوں بیٹھ جاتے۔ بڑے میاں اونچے سروں میں لہک لہک کر گانے لگتے۔ اور ساتھ ساتھ میرے لئے اپنی چھوٹی سی چاقو سے کھٹے میٹھے آم چھیلتے۔ اور پھر یک بیک خاموش ہو جاتے، اور مجھ سے پوچھتے، منا کہانی سنئے گا۔؟

میں جانتا تھا کہ وہ ہر روز کی طرح وہی سنہرے بالوں والی شہزادی کا قصہ سنائیں گے۔ جس کو ایک لمبے چوڑے شہزادے سے دوستی ہو گئی تھی۔ میں یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہانی سننے کے موڈ میں آ جاتا۔ کیونکہ کہانی سناتے وقت ان کی آنکھوں میں نہ جانے کیسے کیسے عکس لہرانے لگتے۔ جو مجھے بڑے بھلے معلوم ہوتے۔ بڑے میاں کہانی سناتے رہتے اور میں ان کی آنکھوں میں ڈوبتی ابھرتی ست رنگی تصویریں دیکھتا رہتا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے بڑے میاں کہانی سناتے سناتے کہیں دور چلے جاتے ہوں...... شاید سنہرے بالوں والی شہزادی کی کہانی میں۔ انہیں غور سے دیکھتا رہتا۔ اور کہانی جاری رہتی۔ ...

پھر سنہرے بالوں والی شہزادی نے لمبے چوڑے شہزادے کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے بادل بکھرا دیئے۔ شہزادے کو یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بار بار بادلوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا لیکن بادل کہاں ٹھہرتے، ہار بار ہاتھ لگانے پر بھی پھسل جاتے، اور سنہرے بالوں والی شہزادی زور زور سے ہنسنے لگتی...... بڑے میاں کی کہانی روز یہاں آ کر ختم ہو جاتی۔ اور وہ یک بیک خاموش ہو کر اپنی آنکھیں موندے دیر تک لیٹے رہتے جیسے اپنی کہانی کے شہزادے اور شہزادی کو اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں بند کر لیا ہو۔

ایک دن ...... ویسے ہی دوپہر ...... چھوٹے چھوٹے آم چنتے ہوئے میں نے بڑے میاں کی طرف حیرت سے دیکھا۔ آج بڑے میاں بالکل خاموش تھے، میں نے ان سے کہا کیوں آج گیت نہیں سنائیں گے۔

نہیں منا! لگتا ہے میں سارے گیت بھول گیا ہوں

اچھا تو وہ کہانی ہی سنا دیجئے، سنہرے بالوں والی شہزادی کی،

آج رہنے دو منا، پھر کبھی، لیکن میں ضد کرنے لگا اور بڑے میاں شروع ہو گئے۔

.... اور سنہرے بالوں والی شہزادی نے لمبے چوڑے شہزادے سے دوستی کر لینے کے بعد ڈھیر سارے وعدے کئے، .... اور سنہرے بالوں والی شہزادی نے شہزادے کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے بادل پھیلا دیئے........

اور بڑے میاں کہانی ختم ہونے سے پہلے ہی چپ ہو گئے۔ آج ان کی آنکھوں سے وہ خوبصورت سی تصویریں بھی غائب تھیں

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، آؤ منا واپس چلیں۔

کچھ دنوں کے بعد بڑے میاں اپنے گھر لوٹ گئے، ان کے ابا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ اور پھر وہ وہیں رہنے لگے۔ کبھی کبھی ان کی خبر مل بھی جاتی۔ کچھ دنوں تک مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ ان کے بغیر، لیکن پھر سب کچھ ٹھیک ہوتا گیا۔

اور آج اچانک مل جانے پر بڑے میاں کے بہت سارے کھوئے ہوئے لمحے ایک ساتھ مل گئے تھے، کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ اس چھوٹے سے عرصہ میں، میں آم کے باغیچہ میں دوڑ لگانے والے بچے سے زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے والا جوان ہو گیا۔ ابو کے انتقال کے بعد شہر میں ایک نوکری کر لی، اور گاؤں کی ٹھنڈی وادی سے جیسے میرا رشتہ ہی ٹوٹ گیا۔ بڑے میاں میں بھی کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اب ان کے ہونٹوں پہ کوئی گیت نہیں تھرکتا۔ اور وہ بجھے بجھے سے رہنے لگے تھے

بہت دنوں کے بعد انہوں نے اپنے ہاتھوں کا بنایا ہوا کھانا مجھے کھلایا۔ اور رات میرے لاکھ انکار کے باوجود وہ بڑی شفقت سے میرا سر دبانے لگے۔ میں نے یوں ہی ان سے پوچھ لیا۔ بڑے میاں آپ کو یاد ہے آپ بچپن میں مجھے ایک کہانی سنایا کرتے تھے۔ سنہرے بالوں والی شہزادی کی کہانی، آج بھی وہی کہانی سنائیے نا!

مجھے ایسا لگا جیسے بڑے میاں کا ادھیڑ جسم ایک لمحہ کو کانپ سا گیا۔ لیکن پھر وہ سنبھلے اور کہانی شروع کر دی۔

بہت زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے کہ کہیں ایک سنہرے بالوں والی شہزادی تھی جسے ایک لمبے چوڑے شہزادے سے دوستی ہو گئی۔ اور بڑے میاں اچانک رک گئے،

منا تو اب بڑا ہو چکا ہے۔ یہ جان ہی گیا ہے کہ کہانیوں کی شہزادیاں ہمیشہ جھوٹی ہوتی ہیں۔ اور بڑے میاں ہلکے سے ہنس دیئے، لیکن ان کی ہنسی میں کہیں نمی سی گھلی تھی۔

آزادی نے ہمیں ترقّی کا موقع دیا

نیا 20 نکاتی
پروگرام
راہ دکھاتا اور تحریک
دیتا ہے

"قوم کے لئے یہ کارروائی نامہ
ترقی کے مجموعی منصوبے سے منسلک کیا گیا ہے یہ ان میدانوں
کی نشاندہی کرتا ہے جن میں خصوصی کام کرنے سے متعلقہ طبقوں
کے لئے فوری اور واضح نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔"

اسے کامیابی سے بروئے کار لانے کے لئے
ہر ایک شہری کے تعاون کی ضرورت ہے۔

آئیے مل جل کر ایک ٹیم کی طرح کام کریں
"یہ پروگرام آپ سب کے لئے اور اس ملک کے لئے ہے جو
ہمارا ملک ہے جس کی خدمت، نشو و نما اور تعمیر ہمیں کرنی ہے۔
اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے میں آپ سے پورے دل
تعاون کی اپیل کرتی ہوں۔"
— وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی

آزادی کا 36 واں سال —— 9 ویں ایشیائی کھیلوں کا سال

R. N. Regd 4253 64
P. T. Regd. No. Gy
Phone—432

THE Aahang URDU MONTHLY

BAIRAGI, GAYA

Price : Rs. 2/-

Aug, 1982

دی کلچرل اکیڈمی ریتہ ہاؤس جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارہ ـــــ چوبیس روپے

ایک شمارہ ـــــ دو روپے

فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹر

نوشابہ حق

رفقائے ایڈیٹرز

شفق، عبدالصمد

طباعت: ہند لیتھو پریس گیا

کتابت: کلیم القاسمی ڈنگروی

محتویات

بمبئی میں پچھلے ایک دو سال سے یہاں کی مختلف زبانوں کی اکیڈمیوں کا سیلاب آگیا ہے۔ سب کی زبانوں کے فروغ کی ہم دل و جان سے خواہش مند ہیں۔ اور ہر اس کوشش کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں ان کے فروغ کے لئے کی جاتی ہے یا آئندہ کی جائے گی۔ ہم اردو والے ان زبانوں کے ادب سے بہت ہی ہیں۔ کیونکہ یہ زبانیں براہ راست ہمارے دیہی عوام سے تعلق رکھتی ہیں۔ "شہریت" کی بناوٹی خوب صورتی خلوص کے فقدان اور جذبے کے تصنع سے یہ زبانیں پاک ہیں۔ ان میں دیہات کی معصومیت اور اظہار کی وہ راست قوت ہے جو شہری زبانوں میں نہیں ہے۔ صناعی اگر اصلیت پر اس طرح غالب آجائے کہ اصلی کا تک باقی نہ رہے تو یہ ادب میں جمود کا باعث بن جاتی ہے اور تکرار کا رواج ہو جاتا ہے ایک مضمون کو بار بار سے باندھنے کا شوق ہی تخلیقی ادب کی معراج سمجھا جانے لگتا ہے اس لئے دیہی زبانوں کی ترقی ہمارے کلچر کی نمائندگی بہتر طریقے سے کر سکتی ہے۔ — عوام سے ادب کے رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔ عوام اور عوام کے خواب ان کی خواہشیں ادب کو حسن اور وجاہت بخشتی ہیں۔

مگر جہاں پانی زراعت کے لئے ضروری ہے وہاں سیلاب زراعت کو برباد کر دیتا ہے۔ اس طرح اکیڈمیوں کا جس طرح قیام ہو رہا ہے اور ان کی باگ ڈور جیسے لوگوں کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے۔ اس سے نقصان کے علاوہ فائدہ کی توقع کم ہی ہے۔

سیاسی اقتدار کا غلبہ ان تمام اکیڈمیوں پر گہرا ہوتا جا رہا ہے اور اس سے جو نقصانات ہوئے ہیں وہ اکیڈمیوں کے کاموں اور ان کی کارکردگی سے ظاہر ہیں۔ لاکھوں کی رقم آتی ہے اور جاتی ہے بڑی رقمیں تنخواہوں یا "اعزازی تنخواہ" پر خرچ ہو رہی ہیں۔ ہم نے بروا صاحب کے زمانے میں جب اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تھا، یہ لکھا تھا کہ اکیڈمی کو بوڑھوں کا گھر نہ بنایا جائے، اس سے ہماری مراد یہ تھی کہ محض "ضرورت مندی" اور "حاجت مندی" کے تحت اراکین نامزد نہ کئے جائیں۔ کیونکہ کام تو اکیڈمی لیڈ بھی وظیفے مقرر کر کے کر سکتی ہے۔

اردو اکیڈمی سے گورنر صاحب نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ کیوں؟ ہو سکتا ہے کوئی خاص بات نہ ہو اور انہوں نے ذاتی وجوہات کی بنا پر ایسا کیا ہو۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے اب اردو اکیڈمی پر "سیاست" مکمل طور پر حاوی ہونا چاہتی ہو۔

اخبارات میں آیا ہے کہ ایک اور وائس چیرمین اردو اکیڈمی کا نامزد ہو رہا ہے خدا کرے دو چار اور بھی نامزد ہو جائیں۔ مگر کام — ستر سال کے لوگوں سے جتنے کی توقع کی جا سکتی ہے اتنا ہی تو ہوگا بہر حال ہمیں تو کام پر نظر رکھنی ہے اور اردو عوام کو بھی کاموں کا احتساب کرنا ہے اور کرتے رہنا ہے اور عملی طور پر سیاسی شخصیتوں کو مجبور کرتے رہنا ہے کہ وہ اکیڈمیوں کو تھکے ہوئے لوگوں کی انجمن نہ بنائیں۔

ہم بہار اردو اکیڈمی کیلئے نیک خواہشات رکھتے ہیں اور اسطرح دوسری زبانوں کی اکیڈمیوں کیلئے بھی دعا گو

قارئین

سواد وصوت

گرامی قدر! ہدیہ سلام

آہنگ کا تازہ ترین شمارہ ملا۔ اداریہ نہایت پرمعنی ہے آپ نے غلط اقدام کی جانب جس بے باکی سے قدم اٹھایا ہے وہ اردو ادب کے لئے فال نیک ہے۔ جب تک آپ جیسے افراد موجود رہیں گے حق کی آواز بلند ہوتی رہے گی۔ میں جولائی کے اواخر میں دہلی گیا تھا۔ میرا قیام دہلی ریڈیو اسٹیشن کے فلیٹ میں تھا۔ میرے ہمراہ دہلی ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام اگزیکٹو محترمہ مسز ٹھاکر اور ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کے پریس ایڈوائزر (مقیم دہلی) بھی تھے۔ میں اجنبی کے روپ میں کئی زرخرید نقادوں سے ملا اور عرب کے سرمایہ دار کے بارے میں تفتیش کی۔ یوپی اور دہلی میں ان کی خریداری کی رفتار بہت تیز ہے۔ جس وقت آپ کو یہ خط ملے گا۔ ایک نقاد امریکہ کی سیاحت کے لئے جاچکے ہوں گے ان کے جملہ اخراجات سرمایہ دار برداشت کر رہے ہیں۔ ملک کے ایک بڑے ادبی انعام کے لئے ممبرین پر تقریباً دو لاکھ روپے صرف ہو چکے ہیں۔ اور اور انعام کے لئے وعدے بھی ہو چکے ہیں۔ علی گڑھ کے مکتبہ کی مالی مشکلات دور ہو چکی ہیں۔ اب وہ ان کی امداد سے ایک درجن کے قریب فوٹو آفسیٹ پر کتابیں شائع کر سکتے ہیں۔ اور مالی دشواریوں کے وقت ان کی حاجت روائی بھی ہوتی رہے گی۔ دہلی کے ایک حاجی صاحب کا جریدہ ان کی بدولت لیتھو سے فوٹو آفسیٹ پر آگیا ہے۔ اور وہ ہر سال عرب جایا کریں گے انہوں نے اپنے پرچہ کا خاصہ حصہ ان کی پبلسٹی کے لئے مخصوص کر دیا ہے ان حالات کو دیکھ کر بے حد تشویش ہوتی ہے۔ اردو کے صف اول کے افراد کس قدر کم ظرف اور پست کردار ہیں؟ ان افراد کی ادبی سطح پر اہمیت تھی۔ اور ان کی آرا کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ روپے کے لالچ میں کس قدر گر سکتے ہیں۔ ان کی اصلی سطح کتنی نیچی ہے اس کا مجھے دہلی میں اندازہ ہوا۔ دہلی میں ایک ایسی ذات بھی ملی جو بوریئے پر زندگی بسر کرتی ہے۔ لیکن قرطاس و قلم کی آبرو سنبھالے ہوئے ہے۔ ان کے پاس یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہے یونیورسٹی میں اونچی کرسیوں پر براجمان افراد کی خریداری وہ نہایت آسانی سے کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مطمح نظر علم و ادب کی خدمت کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مقصد دولت کا حصول ہے جس کے ذریعہ کوٹھی اور کار کا مالک بن جانا چاہتے ہیں۔ خدا ان افراد سے اردو کو بچائے،

آپ نے جرأت مندی کا ثبوت دیا ہے مستحسن اقدام کی جانب توجہ فرمائی ہے۔ مستقبل کا مورخ آپ کے ان کارناموں کو سنہرے الفاظ میں قلم بند کرے گا۔ میری جانب سے اس عظیم کارنامے پر مبارکباد قبول فرمائیے، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیں۔

زیادہ حد آداب

رحمٰن حمیدی

مکرمی ! تسلیمات

قومی آواز بمبئی ہفت روزہ کا ۵ ستمبر ۸۳ء کا شمارہ پیش نظر ہے جس میں معراج حسین صدیقی صاحب کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ خط درج ذیل ہے۔

محترمی قومی آواز، "آہنگ" اور "جسارت" وغیرہ نے صلاح الدین پرویز کو بے نقاب کر دیا۔ اور اس کا اصلی چہرہ جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کے سامنے آگیا۔ یہ تھی صلاح الدین پرویز کی سزا جو اسے یقیناً ملنا چاہیے تھی۔ لیکن ان ادیبوں، شاعروں نقادوں ...... مدیروں کو بھی سزا ملنا چاہیے، جنھوں نے صلاح الدین کی دولت کے عوض صلاح الدین پرویز بننے میں مدد دی۔ گو کہ ان ادیبوں، شاعروں ...... مدیروں کی نقابیں بھی مقابلہ آرائی جو احمد ہمیش اور پرویز کے درمیان ہوئی میں اتر گئیں۔ مگر یہ سزا ان کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ انھوں نے جانتے بوجھتے ایسے مجرم کو جو بقول حریف اوّل پرویز ایک وبا ہے پناہ دی۔ — احمد ہمیش کو خاص کر جنھوں نے "وظیفہ" بند ہونے پر یا "تنازعہ" ہو جانے پر انتقاماً نقاب کشائی کی ان تمام خوشامدی اور ادب دشمن ادیبوں، شاعروں، نقادوں مدیروں اور کالم نگاروں کو ایسی سزا دینا ہوگی کہ جس سے وہ عبرت حاصل کر سکیں۔

مندرجہ بالا خط سے محسوس ہوتا ہے کہ صلاح الدین پرویز فراڈ ہے۔ ادبی اہلیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنا IMAGE بنائے ہوئے ہے چونکہ اس خط میں آہنگ کا حوالہ بھی تھا لہٰذا میں سوچا کہ "آہنگ" ہندوستان کا ہی نہ ہو اس لئے اپنے دوست سے آپ کا پتہ معلوم کیا اور وہ پرانا شمارہ لے کر آیا تا کہ اصل واقعہ کی جانکاری کے لئے آپ کو خط لکھ سکوں۔ بہر حال برائے کرم اگر آپ کے آہنگ نے ہی صلاح الدین پرویز کو بے نقاب کیا ہے تو وہ شمارہ ارسال کریں۔ اور اگر آہنگ کوئی پاکستانی رسالہ ہے تو آپ حقیقی واقعہ کو تفصیل کے ساتھ معلومات کرکے آہنگ میں لکھیں تا کہ پرویز REAL IMAGE ادبی حلقوں میں آسکے۔

شبیہہ پدر رامپور

محترم المقام ! سلام و نیاز

جولائی کا آہنگ بھی اپنی دیرینہ روایتوں سے سرشار ہے لیکن اس کے باوجود یہ شمارہ دوسرے شماروں سے اس لئے منفرد ہے کہ صلاح الدین پرویز کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے کئی معتبر نام بھی بے وقعت ہو کے رہ گئے، اور ان لوگوں سے گھن سی آگئی۔ جناب احمد ہمیش اور آپ کی ذات اس لئے قابل قدر ہے کہ آپ لوگوں نے جرأت و حق گوئی سے کام لے کر نہ صرف ایسے لوگوں کو بے نقاب کیا ہے بلکہ آپ لوگوں نے ایک توانا، خوب صورت اور مثالی تاریخ بھی لکھی ہے۔ میری طرف سے آپ دونوں کو مبارک باد !

یہ شمارہ اور بھی کئی لحاظ سے یادگار ہے۔ آپ کا اداریہ بڑا اہم اور روشنی کا ایک سفر ہے۔ اندھیروں کو روشن کرنا معمولی بات نہیں۔

ایک عرصہ کے بعد شردن کمار ورما کی "قفس" جیسی خوب صورت کہانی پڑھنے کو ملی جس کی خوشگوار چھاپ ایک عرصہ تک میرے ذہن پر رہے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کہانی کا آخری ٹکڑا "جب میں کھڑکی سے ہٹا تو بستر پر بیٹھا تھا" ...... شاید وہ اس پل کو ڈھونڈنے،

اور اس جنگل اور اندھیرے سے نجات پا جائے"۔
پورے افسانہ کی جان ہے اسی ٹکڑے کی تشریح
دیگر پیراگراف پر چھائی ہوئی ہے لیکن کہیں بھی اس کی دلکشی
میں فرق نہیں آتا۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس کہانی کا پیغام
ہی حاصل افسانہ ہے۔ جو دوسرے افسانوں سے اس کو ممتاز
کرتا ہے۔

ظفر ہاشمی جمشید پور

برادر محترم ! السلام علیکم
اس بار کے آہنگ میں تو بڑی سنسنی خیز خبریں ہیں۔
صلاح الدین پرویز نے پٹرول سونگھا کر اچھے خاصے لوگوں کو
خراب کیا۔ کہتے ہیں کبھی ادیب کا بھی ضمیر ہوتا تھا۔ اب مگر
حالات یوں بدلے کہ اردو قوم کے ایک بڑے حصے کا زوال
ہو گیا۔ موجودہ عہد کا یہ بھی ایک بڑا ہی المیہ ہوا۔

یوسف اختر رانچی

برادر مکرم کلام حیدری صاحب ! تسلیمات
"مورچہ" اور "آہنگ" پابندی سے مل رہے ہیں
"آہنگ" میں آپ نے جو مہم شروع کر رکھی ہے اس سے کافی
سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ بہت سی خبریں جو نہیں دیکھی تھیں ایک
ساتھ پڑھنے کا موقع ملا۔

وحید اختر علی گڑھ

مکرمی کلام حیدری صاحب ! تسلیم
"آہنگ" شمارہ جولائی ایک عزیز کی عنایت سے مجھ تک
بھی پہونچا۔ اور ٹائٹل ہی کو دیکھ کر کچھ لطف بھی آیا۔ اور کچھ رنج
بھی ہوا۔ "گوشہ" جس کے ساتھ عافیت کا خیال پہلے آتا ہے
جب "الفاظ" علی گڑھ کے گوشہ صلاح الدین پرویز کی شکل میرے
سامنے آئی تو اس کی عافیت دشمنی کا بھی قائل ہونا پڑا۔ مگر اس
پیچ و تاب کے ساتھ کہ ہم اب تک دانش و فن کے جانے پہچانے
راستے پر چل کر کیوں اپنے صبح و شام ضائع کرتے رہے۔ آخر

جب ہمارے اتنے بڑے بڑے جغادری، نقادان فن، گوپی چند
نارنگ، محمود ہاشمی، اور آشفتہ چنگیزی جن کے نام ہیں۔ صلاح
الدین پرویز کے کلام کو الوہی، معصوم اور پیمبرانہ کہہ رہے ہیں۔
تو تمہاری کیا اوقات کہ تم اسے مہمل اور بے معنی کہنے کی جسارت
کرو۔ اور اس کی شان نبوت اور ربوبیت کے قائل نہ ہو جاؤ،
بلکہ اس "شوکت پرویزی" کے سامنے میر، و غالب جیسے شاعری
کے کوہکن اور مزدوروں کو بھی ان کی "اوقات" ہی میں حدود
میں رکھتے ہوئے اس شاہ سخن کے جوتوں میں جگہ دو تو حق سخن
فہمی ادا ہوا۔ وہ خسرو شیریں سخناں جس کے تخت رواں کے
چاروں پائے گوپی چند نارنگ، محمود ہاشمی، آشفتہ چنگیزی
اور چوتھے ایک لمبی قطار میں بڑے بڑے سلیمان اقلیم ادب اٹھائے
ہوئے ہیں۔ اس دنیا میں ایک ہی بار کے لئے آیا ہے۔ وہ
اول فول بھی بکے تو اسے "آیات آسمانی" سمجھو، اب آپ ہی
بتائیے کہ جب ایک عمر کے بنائے ہوئے اصنام شعر و ادب اس
طرح ایک ٹھوکر میں چور چور ہو رہے ہوں تو ہماری ذہنی و قلبی
اذیت کا کیا عالم ہوگا۔
مگر بھلا ہو "آہنگ" کا کہ اس عذاب میں دیر تک
مبتلا رہنے سے بچا لیا۔ اور ان کا سارا رنگ و روغن اتار کر
اصلی چہرہ دکھا دیا۔ جس پر ایک دست غیر کے طمانچوں کے
نشان صاف نظر آ رہے ہیں۔ سچ ! یہ لفاظی، و بے ضمیری انہیں
کا حصہ ہے۔ بلکہ اگر بیس، بائیس سال پیچھے مڑ کر دیکھتے چلے
آئیں تو پوری ایک نسل کی خون سے ان کی آستین داغدار
نظر آئے گی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔
انہیں ہندوستان میں بے نقاب کرنے کی مبارک
باد آپ کو اور آپ کے "آہنگ" کو پہونچے۔ والسلام

خیر طلب
محمد فتح سلطانپوری

کنور سین کا خط ــــ بنام کلام حیدری

بھائی کلام حیدری!

آپ آہنگ کا کردار تو ذبح کر ہی رہے ہیں۔ ساتھ میں اپنی افسانہ نگاری، تنقید، صحافت اور مدیرانہ اوقات کو بھی مشتبہ و مشکوک بناتے جا رہے ہیں۔ آہنگ کے نئے شمارے کے علاوہ پچھلے دو تین شماروں سے یہی تاثر ملا کہ آپ اس سنجیدہ اور باوقار جریدے کو تمسخر، تضحیک، اور استہزا، کا پلندہ بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسا باصلاحیت مدیر اور نقاد، فن کار صلاح الدین پرویز کا اشتہار باز کیسے بن بیٹھا۔

آپ پرویز کے بارے میں جو کچھ شائع کر رہے ہیں۔ اس کا وہی اثر ہو رہا ہے۔ جو اس کے ٹکڑے خوروں کے پروپیگنڈے کا۔ پرویز کی امارت اور دولت کو ہدف نشانہ بنا کر آپ اسکی شعری اور دیگر فنی کاوشوں پر رکیک حملے کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے پرویز کا کام دیکھا ہے۔ اور اسے کسی حد تک قابل تحسین سمجھتا ہوں میں ادب و فن کے تئیں جھوٹ اور کذب کو گناہ سمجھتا ہوں۔ اور ایسا کرنا اپنے متبرک قلم کی توہین۔

کچھ ایسا ہی وطیرہ آپنے گوپی چند نارنگ کے ساتھ روا رکھا پہلے تو اس بھلے مانس کو بانس پر چڑھا دیا۔ پھر اسکی ڈاڑھی حسین الحق سے نچوا ڈالی۔ میں نہیں جانتا احمد ہمیش یا بلراج مین را کی کیا اوقات ہے۔ آیا وہ جینوین افسانہ نگار ہیں بھی یا نہیں۔ لیکن ان کی اپنے کو مشتہر کرنے میں آپ نادانستہ طور پر شریک ہو کر رہ گئے ہیں۔ کیا ان دونوں نے صلاح الدین پرویز کی دولت سے فیض حاصل نہیں کیا

میری دلی تمنا ہے کہ آپ اپنی دیانت، ذہانت، فطانت کو داغدار ہونے سے بچائیں۔ اور آہنگ کا سنجیدہ اور غیور کردار بحال کریں۔ نیز اسکو ادھ کچرے اور پراگندہ مضامین کا گڑھ بنانے سے پرہیز کریں [illegible] و ادب کو آپ سے بڑی امیدیں ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو کہ آپ یہ خط شائع کر دیں۔ کوئی خدمت

کلام حیدری کا خط ــــ بنام کنور سین

بھائی کنور سین!

"کیا ہی اچھا ہو کہ آپ یہ خط شائع کر دیں" ــــ یہ آخری جملہ آپکے خط کا ہے۔ سو دیکھئے آپ کی خواہش کو میں نے سر آنکھوں سے لگایا۔

آپ کے اس خط سے پہلے مجھے علم نہیں تھا کہ بلراج مینرا بھی صلاح الدین پرویز صاحب کی دولت سے فیضیاب ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ یہ اطلاع بہم پہونچانے کا شکریہ۔

مجھ جیسا معمولی آدمی نارنگ جیسے دبیز آدمی کو کیا چڑھا سکوں گا۔ وہ تو خود ہی قطب مینار ہیں۔ حسین الحق نے میری کم عقلی کے مطابق مضمون لکھا تھا۔ مگر آپ کے خیال میں انہوں نے نارنگ صاحب کی ڈاڑھی نوچی ہے تو یہ معاملہ حسین الحق اور نارنگ صاحب کے بیچ کا ہے۔ جیسے آپ کے اس خط کو میں شائع کر رہا ہوں ویسے حسین الحق کا مضمون بھی شائع کیا تھا۔ اپنی ذاتی رائے کا سایہ نہ آپ کے خط پر پڑنے دیا اور نہ حسین الحق کے مضمون پر۔

آپ کی تحریر کو چھپنے کا حق حاصل ہے تو دوسروں کی تحریر پر پہرے کیوں؟

جتنی تحریریں اب تک شائع ہوئی ہیں وہ آہنگ سے پہلے دوسرے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ انکو بھی لکھئے۔ یقیناً وہ بھی آپ کے خط کو چھاپنے کا اچھا کام کریں گے۔

آپ کا

کلام حیدری

قصّہ نروان حاصل کرنے کا

سات ستاروں والے ہوٹل میں سستے فلمی قصوں کی نقل

ادیب کو اغوا کرنے کا الزام

لفظوں کی حرمت کی پامالی ـــــ علی گڑھ کے نیک نام مرحوم

پروفیسر کی ہتک کی کوشش ـــــ الفاظ، ڈالر اور پیرویزوں

کے جعل اور جال ـــــ اردو ادب قارون کے پاس گروی؟

سی آئی اے ـــــ کراچی، لاہور، دہلی اور علی گڑھ

میں ادب کے محاذ پر مہرہ بیٹھا چکی ہے ؟

احمد ہمیش کا خط ـــــ کلام حیدری کے نام

" " ـــــ نثار احمد صدیقی کے نام

" " ـــــ اطہر پرویز کے نام

فریب

از ـــــ احمد ہمیش

[نروان حاصل کرنے کے جدید ہتھیار اور طریقے]

احمد ہمیش کا خط ـــــ کلام حیدری کے نام

محترمی کلام حیدری صاحب ! آداب

امید کہ آپ کو گذشتہ خط ملا ہوگا۔ ہاں اس خط
کے ساتھ میں اپنا وہ خط (فوٹو اسٹیٹ کاپی) نہ بھیج سکا
جو میں نے صلاح الدین پرویز کے نام Rs 1000/ کا چیک
واپس کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اب بھیج رہا ہوں اس کے علاوہ
"دو ماہی الفاظ" میں چھپے ہوئے مضمون "دوسرا نروان"
کے ضمن میں ایک وضاحتی تحریر (فوٹو اسٹیٹ کاپی) اور
"الفاظ" کے نام اس سلسلے میں لکھے گئے خط کی کاپی بھی
ارسال کر رہا ہوں

میں آپ کی دیانت اور حق گوئی کا معترف
ہوں اس لئے میری خواہش ہے کہ اصل معاملات کا
کاریکارڈ آپ کے پاس محفوظ رہے۔ والسلام

آپ کا نیاز مند
احمد ہمیش

احمد ہمیش کا خط ـــــــ نثار احمد صدیقی کے نام

جناب نثار احمد صدیقی صاحب! آداب

آپ کے حکم کی تعمیل میں "تریپ" اور "الفاظ" دو ماہی کو لکھے گئے خطاکی کاپیاں ارسال کررہا ہوں، میری کوشش ہے کہ یہ خط معہ کاغذات جلد از جلد آپ کے پتہ پر پہونچ جائے، دراصل ڈائرکٹ ڈاک دیر سے پہونچتی ہے۔ میں اکثر یہاں سے بھارت جانے والوں کی معرفت خطوط ارسال کرتا ہوں۔ اب کی بار ایک خاتون حیدرآباد دکن جارہی ہیں۔ ان کی معرفت یہ خط ارسال کررہا ہوں اتفاق سے میرے پاس بھارت کے ڈاک ٹکٹ ختم ہوگئے ہیں۔ میں نے ان خاتون سے کہا ہے اگر وہ ڈاک ٹکٹ نہ لگا سکیں تو بیرنگ ہی پوسٹ کردیں۔ بہرحال آپ اس خط اور کاغذات کے موصول ہونے کی فوراً اطلاع دیں تاکہ مجھے اطمینان ہو۔ ہاں گزارش یہ ہے کہ "آہنگ" کا صرف ایک شمارہ مجھے ملا تھا جولائی ۸۲ء کا شمارہ جس میں (میری اطلاع کے مطابق) میرا صلاح الدین پرویز کے نام خط وغیرہ چھپا ہے.......... وہ اب تک موصول نہیں ہوا براہ کرم اس کی ایک کاپی ارسال کریں۔

"ٹریپ" ارسال کرتے ہوئے میں ایک بہت بڑا RISK لے رہا ہوں، بھارت میں میرے احباب اور خیرخواہ تو بہت ہیں مگر بدخواہ اور دشمن بھی بہت ہیں۔ میرے خلاف وہ انتقامی کارروائی کرسکتے ہیں جب کہ میں اکتوبر، نومبر میں ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتا ہوں ہمت اور بے خوفی تو مزاج میں بہت ہے، مگر مالی وسائل کی کمی کہیں کہیں پسپا کردیتی ہے۔ بہرحال اللہ مالک ہے۔

کلام حیدری صاحب کی خدمت میں میرا اسلام عرض کردیں

مخلص آپ کا
احمد ہمیش

احمد ہمیش کا خط ——— اطہر پرویز کے نام

جناب مدیر دو ماہی "الفاظ" علی گڑھ! آداب

عرض یہ ہے کہ سب کچھ وہی نہیں ہے کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ مالی مسئلہ حل کرنے کے اور بھی مناسب طریقے ہیں، ضروری نہیں کہ غلط طریقے سے مالی مسئلہ حل کیا جائے۔ یہ درست ہے کہ برصغیر ہندو پاک سے شائع ہونے والے اردو رسالے مالی دشواریوں میں مبتلا ہیں۔ فنڈ حاصل کرنے اشتہار جمع کرنے اور سالانہ ممبر بنانے کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ آپ بھی یہی کریں گر مرے ہوئے ہاتھی کی ٹانگوں کے درمیان سردی سے بچنے کے لئے بہت سے بے وقوف سیاروں نے پناہ لی ہے۔ لیکن جب دھوپ نکلے گی اور مرے ہوئے ہاتھی کا جسم گرم ہوگا بدبو پھیلے گی تو ٹانگوں میں پناہ لینے والے بے وقوف سیار باہر نکلنے کے لئے زور زور سے چلائیں گے، پھر بھی نہیں نکل سکیں گے، اور اگر کوئی سیار باہر نکل بھی آیا تو اس کی حالت باعث عبرت ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے "دوسرا نروان" کس کی اجازت سے چھاپا؟ اول تو آپ کو یہ تصدیق کرنی چاہئے تھی کہ وہ میرا تحریر کردہ مضمون ہے یا نہیں، دوئم یہ کہ اگر وہ بالفرض میرا ہی مضمون تھا تو بہ حیثیت مدیر آپ کا اخلاقی فرض تھا کہ مجھ سے اس کی اجازت کے لئے تحریری اجازت حاصل کرتے، چونکہ آپ نے یہ دونوں کام نہیں کئے لہٰذا آپ اخلاقی اور قانونی دونوں حدود کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں یا خود سازش میں ملوث ہیں یا سازش کا شکار ہو ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ آپ میرے اس مراسلہ کو آئندہ اشاعت میں شامل کر کے اخلاقی جرات کا مظاہرہ کریں، ہو سکے تو معذرت نامہ بھی شائع کریں، دوسری صورت میں جلد ہی آپ کی نظر سے میری ایک وضاحتی تحریر گزرے گی، انشاء اللہ آپ کو بہت لطف آئے گا۔

والسلام

مخلص

احمد ہمیش

احمد ہمیش

ٹریپ

"نمرتا" کی اشاعت سے قبل صلاح الدین پرویز نے اپنی شہرت کیلئے جو منصوبہ بنایا تھا اس کا اندازہ ہند و پاک کے بہت سے ادیبوں اور صحافیوں کو نہیں تھا، کہ صورت سے بالکل سادہ اور معصوم دکھائی دینے والا صلاح الدین پرویز دیکھتے دیکھتے اچانک نو دولتیانہ خباثت پر اتر آئے گا۔ اس کی تفصیل میں جانے کے لئے میرے پاس کئی مستند مثالیں موجود ہیں۔ کچھ مثالیں تو میں ۲۲/۳/۸۲ء کو صلاح الدین پرویز کے نام لکھے ہوئے طویل خط میں درج کی ہیں۔ اس خط کو کراچی سے نکلنے والے اخبار "جسارت" میں خامہ بگوش نے حوالہ کے طور پر شامل کیا تھا۔ خامہ بگوش کے کالم اور اس میں شامل میرے خط کے سے صلاح الدین پرویز کی امیج متاثر ہوئی، اور ہند و پاک میں لوگ شعر و ادب کے نام پر کی جانے والی جعل سازیوں سے بڑی حد تک واقف ہوئے، اسے کاؤنٹر کرنے کے لئے صلاح الدین پرویز نے اپنی کمپنی میں ملازم کارندوں کے ذریعہ میرے نام سے میری ہینڈ رائٹنگ میں جعلی خطوں کی ڈھیروں کاپیاں تیار کرائیں میری امیج کو بگاڑنے کے لئے مجھے ایک بھکاری، لالچی اور بلیک میلر ثابت کرنے کی اسکیم کی گئی۔ اور نہ معلوم کیا کیا فرضی معاملات مجھ سے منسوب کئے گئے، پھر جعلی خطوں کی کاپیاں ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں پہونچائی گئیں۔ مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ کلیم احمد اور نسیم درّانی سے کراچی انور سجاد اور وزیر آغا...... اور ہندوستان میں شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، رام لعل، شہریار، ڈاکٹر حمید [illegible]، [illegible]، [illegible] حنفی اور

اور باقر مہدی کو جعلی خطوط کی کاپیاں ارسال کی گئیں، دراصل میری ہینڈ رائٹنگ اور میرے دستخط کی بناوٹ اتنی واضح ہے کہ کوئی بھی کاپی کرنے والا ماہر کوپی کر سکتا ہے۔ اور میں نے جو اپنے ادارہ کے سلسلے میں چند خطوط سادہ کاغذ پر صلاح الدین پرویز کے نام واقعی لکھے تھے، ان کو سامنے رکھ کر میرے الفاظ اور مخصوص جملوں سے ملتے جلتے جملے فرضی طور پر درج کئے گئے، پھر بہت سے فرضی جملوں سے میرا کیس بنایا گیا اور جعلی خطوط ترتیب دیئے گئے، اس ساری مجرمانہ کارروائی کا جب مجھے علم ہوا تو میں پریشان ہو گیا کیونکہ جس اسکیم سے "دوسرا نروان"[1] لکھوانے کے لئے مجھے صلاح الدین پرویز کے دو کارندوں نے ٹریپ کیا تھا .... اس کی وہ تمام کڑیاں میرے دھیان میں آئیں، جو بعد کے حالات میں جعلی خطوط لکھوانے کی کارروائی سے آملتی ہے۔ اس لئے کہ دو ماہی "الفاظ" میں "دوسرا نروان" کی اشاعت میں جعلی خطوط کی کارروائی کے بعد ہوئی، یاد رہے کہ دوسرا نروان کی اشاعت سے پہلے مجھ سے اجازت نہیں مانگی گئی، آئندہ یہ بھی ممکن ہے کہ میرے نام سے کوئی جعلی مضمون ہندوستان کے کسی رسالہ شائع کرایا جائے، مزید جعلی خطوط بھی شائع کرائے جا سکتے ہیں اس اذیت ناک اور خوفناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے

---

[1] میں نے ایک خط دو ماہی "الفاظ" علی گڑھ کے مدیر کے نام ارسال کیا ہے۔ جس میں میں نے "دوسرا نروان" بغیر مصنف کی مرضی و اجازت، چھاپنے کے سلسلے میں بازپرس کی ہے۔

میں نے کراچی میں اپنے ایک وکیل دوست سے مشورہ لیا ہے۔ تو انہوں نے مجھے جو مشورہ دیا۔ اس کے مطابق میں نے پہلی فرصت میں اپنے ادارہ کا لیٹر پیڈ چھپوایا۔ تب سے میں نے خطوط سے لے کر اپنی نظمیں، کہانیاں اور مضامین وغیرہ عموماً لیٹر پیڈ پر ہی درج کرنے لگا ہوں۔ ویسے دنیا میں آج کل MASTER SER کی نمائندہ پینٹنگز کی (MATATIONS) بنانے والے ماہرین کار و بار زوروں پر ہے۔ ممکن ہو ماہرین میرے ادارہ کے لیٹر پیڈ کا بھی کریا کرم کر ڈالیں۔ پھر میں جب تک زندہ ہوں۔ ہر قسم کی نامناسب کارروائی کو کاؤنٹر کرتا رہوں گا۔

اب قبل اس کے کہ میں دو ماہی الفاظ علی گڑھ میں شائع کئے گئے مضمون "دوسرا زاویہ" سے متعلق اصل معاملہ کا انکشاف کروں.......... چند کلیدی معاملات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ ہندو پاک میں جو لوگ صلاح الدین پرویز سے اب تک ملتے رہے ہیں۔ یا وہ ان سے کسی قسم کی مراسلت کرتے رہے ہیں یا وہ اس سے متعلق کسی الیوژن میں مبتلا ہیں.......... وہ اپنی پہلی فرصت میں باخبر ہو جائیں تو بہتر ہے۔ ورنہ کسی وقت بھی انہیں کسی قسم کا ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ دوئم یہ کہ ہندو پاک کے جو ادارے صلاح الدین پرویز کی نظمیں اور نثری تحریریں شائع کرتے رہے ہیں۔ یا آئندہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ پٹرو ڈالر حاصل کرنے والوں کی فہرست میں بریکٹ کئے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ایک بات عالمی حالات کی خرابی کو نظر میں رکھتے ہوئے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ کسی بھی معرفت پٹرو ڈالر حاصل کرنے والے سی آئی اے اور مافیا تنظیم کے کارندے ہیں۔ اور ان کی لائن کیمپ ڈیوڈ سے ملی ہوئی ہے۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جو مذہبی عقائد کی LIP SERVICE کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ مگر در پردہ وہ انسانی تقدس کو غصب کرنے والی کارروائیوں میں وہ شریک رہتے آئے ہیں۔ یہ

لوگ کسی نہ کسی بھیس میں حال ہی میں ہوئی فلسطینی ٹریجڈی کے ذمہ دار ہیں۔ جہاں تک صلاح الدین پرویز کا تعلق ہے تو پچھلے چار برسوں میں وہ شعر و ادب کے نام پر امریکہ سے ریاض اور ریاض سے کراچی اور کراچی سے دہلی اور علی گڑھ تک جو کچھ کرتا رہا ہے وہ بے سبب نہیں۔ اب یہ اہل نظر کا کام ہے کہ وہ اس کے قول و فعل پر نظر رکھیں۔ اور ممکن ہو تو ہند و پاک کے معصوم لوگوں کو اس کی کرم نوازیوں کے شر سے بچائیں۔ فروری ۸۳ء میں اس کے مرسلہ ایک ہزار روپے کے ڈرافٹ چیک کو میں نے اس لئے واپس کیا کہ میں اس کی کرم نوازیوں کے شر سے بہت جلد واقف ہوا۔ وہ میرے ادارہ سے اپنی کچھ کتابیں مشروط طور پر چھپوانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ۵۰۰ سو روپے قسط کے طور پر چند مہینے تک مجرد رقم دی۔ جس سے ۶۰ صفحات کی معمولی کتاب بھی نہیں چھاپی جا سکتی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کی قسطوں میں بھیجی ہوئی مجرد رقم سے اس کے شعری مجموعہ "دھوپ سرائے" کی فوٹو آفسیٹ کتابت کروائی۔ جو اب تک میرے ادارہ کی الماری میں محفوظ پڑی ہوئی ہے۔ جب میں نے اس کی شرطیں نہیں مانیں تو اس نے میرے ادارہ سے کتاب چھپوانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مگر دوسری طرف وہ ہند و پاک کے بہت سے شاعروں، ادیبوں، اور صحافیوں سے کہتا پھرا کہ وہ احمد ہمیش کو گزر بسر کے لئے ہر مہینہ ۵۰۰ روپے کی امداد دیتا ہے۔ ۸۱ء میں کراچی کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں قیام کے دوران اس نے کئی مقامی ادیبوں کی موجودگی میں کہا.......... ہندوستان کے کئی شاعروں، ادیبوں کو میں ہر ماہ وظیفہ بھیجتا ہوں۔ فلاں فلاں میرے وکیل ہیں.......... میں ان سے جو چاہے کام لے سکتا ہوں.......... میری کمپنی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی ہے .... میری کمپنی میں ہندوستان پاکستان کے بہت سے مسلمان ملازم ہیں.......... میں نے خود انہیں لوا کر کمپنی میں ملازمت دی.......... میری کمپنی ہندوستان، پاکستان کے

متعدد مسلم خاندانوں کو پال رہی ہے .... اور ہاں یہ بات بتانے کی نہیں .... آپ لوگ کسی سے کہئے گا نہیں .... میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی بیوہ کو ہر ماہ ۵۰۰ روپے بھیجتا ہوں ...

ایسے جملے سننے کے بعد مجھ پر سخت ردعمل ہوا اور اسی وقت سے میں صلاح الدین پرویز کے خلاف ہوا۔ ورنہ جب تک (۲۰، ۱۹۷۹ء) کے عرصہ میں اسے سادہ معصوم سمجھتا رہا۔ اس وقت میں نے اس کی دولت مندی سے قطع نظر اس کی شاعری اور "سترہا" پر وقیع رائے دی، اور جب سترہا چھپ گئی تو میں نے اس کی فرمائش پر ایک مختصر مضمون لکھا۔ عنوان تھا "دوسرا قدم" میں نے اس مضمون میں صرف سترہا کے اسٹائل اور ہیئت پر ہی لکھا تھا۔ صلاح الدین پرویز کی شخصیت سے متعلق کوئی مبالغہ آرائی نہیں کی تھی۔ کہیں کوئی SUPERLATIVE استعمال نہیں کیا تھا مگر واقعہ یہ ہوا کہ ۱۹۸۱ء کے ابتدائی میں جب صلاح الدین پرویز کراچی اپنی کتاب "سترہا" کے افتتاحی جلسہ کے سلسلے میں آیا اور ایک ہفتہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ٹھہرا ...... تو اس عرصہ میں اس نے پہلے مجھ سے مضمون سنا، مضمون سن کر وہ مطمئن نہیں ہوا۔ پھر بھی میٹھے لہجہ میں بولا۔ آل رائٹ..... احمد ہمیش (وقفہ دیگر) بہت کم لکھا ہے۔ کم از کم سات صفحات کا مضمون ہونا چاہئے ...... پھر سے لکھنا ہوگا...... اور ہاں عنوان بھی بدل ڈالو......... یہ کہہ کر اس نے مجھے کچھ دیر سیوٹ کے دوسرے حصہ میں بیٹھنے کی ہدایت دی۔ بہانہ یہ بنایا کہ کمپنی کے سلسلے میں ریاض سے کوئی کال آئی ہے میں دوسرے حصہ میں جا کے بیٹھ گیا۔ لگ بھگ آدھ گھنٹہ بعد صلاح الدین کے دو کارندے مسعود حسین اور اختر عادل دروازہ کھول کر اندر آئے اور مجھ سے عجلت میں بولے، صلاح صاحب نے کہا ہے کہ ہم آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آئیں ..... ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔

[illegible] میں بھی کچھ سہما ہوا تھا۔ مگر یہ سمجھنے کی خواہش میں ان کے ساتھ ہوٹل کے کمرہ سے باہر نکلا، باہر ایک میٹلک گرے رنگ کی ٹویوٹا کرولا کھڑی تھی مسعود حسین ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور مجھے ساتھ کی سیٹ پر بٹھایا۔ اختر عادل پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پہلے تو کار نارمل رفتار سے چلتی رہی۔ مگر نرسری کا موڑ کاٹتے ہی مسعود حسین نے رفتار تیز کردی۔ میرا خیال تھا کہ کار کشمیر روڈ سے ہوتے ہوئے سبزی منڈی والی روڈ سے گزرے گی۔ پھر حسن اسکوائر سے مڑ کر بس منٹوں میں جوہر آباد پہونچ جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ کوئی کام ضرور ہوگا ممکن ہو حسین کو اپنی دکان سے کچھ لینا ہو۔ ویسے بھی مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔

صلاح الدین پرویز سے اس وقت تک جو میرا ربط تھا...... اس سے مجھے ابنارمل توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ صلاح الدین کے کارندے پہلے کبھی مجھ سے ملے بھی نہیں تھے۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ اختر عادل نے کراچی ٹیلیویژن کی نوکری چھوڑ کر صلاح الدین پرویز کی چاکری قبول کی۔ چاکری ان معنوں میں صلاح الدین پرویز کو ایک ایسے آدمی کی ضرورت[1] تھی۔ جو اس کی ذیلی معاملات میں بھاگ دوڑ کر سکے، دوسرے کارندہ مسعود حسین کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ کراچی میں صلاح الدین پرویز کا رکروٹنگ ایجنٹ ہے اور وہ بھی ذیلی افرادی معاملات میں تعاون کرتا ہے بظاہر اس کی ایک کپڑے کی دوکان بہادرآباد میں واقع ہے مگر اس کے علاوہ بھی وہ بہت سے کاروبار بیک وقت کرتا ہے

---

[1] آدمی کی ضرورت کے معاملہ میں صلاح الدین پرویز کبھی کبھی حیثیت اور مرتبہ کا بھی خیال رکھتا ہے۔ بعد میں ذلیل کرتا ہے۔ حال ہی میں ایک اطلاع کے مطابق صلاح الدین پرویز نے انور سجاد کو آمدورفت کا ایرٹکٹ بھیج کر لاہور سے ریاض یعنی سعودی عرب بلوایا اہم معاملات طے کئے، انور سجاد کو ریاض کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرایا۔ اور تحائف وغیرہ دے کر لاہور رخصت کیا۔ آئندہ کا حال خدا جانے،

ان معلومات کے باوجود مجھے ان کارندوں سے کوئی منفی توقع
نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ
"جاسوسی فلمی منظر" جیسا سلوک کیا جائے گا۔ تفصیل میں
جائے بغیر میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ صلاح الدین پرویز
کی ہدایت کے مطابق اس کے کارندوں اختر عادل اور مسعود حسین
نے بہادر آباد کے کسی ڈبل اسٹوری بنگلہ (اب دن کی روشنی میں
بھی ڈھونڈ کر بتا نہیں سکتا) میں رات بھر مجھے محبوس رکھا۔ اور
زبردستی مجھ سے مضمون لکھوایا۔ میرے سامنے صلاح الدین پرویز
کا لکھا ہوا ایک ہدایت نامہ رکھا ہوا تھا اس کے مطابق مجھے
"نمرتا" سے متعلق مضمون کا عنوان "دوسرا قدم" کو بدل کر "دوسرا
نروان" کرنا تھا۔ مضمون کے ابتدائی صفحہ میں مجھے صلاح الدین
پرویز کے حق میں برصغیر کے نقادوں کو بھاری پتھر تلے دبانا تھا
اور "نمرتا" کے پروجیکشن میں انہیں ذہنی طور پر جلاوطن کرنا
تھا۔ ابتدائی صفحہ سے دوسرے تیسرے صفحات تک مجھے
"نمرتا" کو اعلیٰ ترین تصنیف ظاہر کرنے کے لئے فرائڈ، کافکا،
دانتے، ٹیگور، اور کالی داس کے حوالے درج کرنے تھے،
درمیان کے صفحات پر "نمرتا" کے کئی اقتباسات شامل کرنے
تھے، اور آخری صفحہ پر پر زور لفظوں میں یہ بتانا تھا کہ "نمرتا"
کا ترجمہ ہندوستان کی ۱۴ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مجبوراً میں
نے ہدایت نامہ کے مطابق رات کے تین بجے تک مضمون مکمل
کیا۔ کیونکہ صلاح الدین پرویز کے کارندوں نے مجھے ایسی
دھمکیاں دیں۔ جو عمل میں آنے کی صورت میں اخباروں کی
HOT NEWS بن سکتی تھی۔ سو میں نے مضمون مکمل
کرنے میں ہی اپنی عافیت جانی، گو بات اسی حد تک ختم نہیں
ہوئی، کارندوں نے جب مجھے سویرے چار بجے گھر پہونچایا
تو صلاح الدین پرویز کی ایک اور ہدایت میرے سپرد کر گئے،
ہدایت کے مطابق مجھے نمرتا کے افتتاحی جلسہ میں جوش و خروش
سے مضمون پڑھنا تھا۔ اور محبوس کئے جانے کے واقعہ کو راز
میں رکھنا تھا۔ اس کے برعکس جانے کی صورت میں مجھے ناقابل
تلافی نقصان پہونچ سکتا تھا۔ سو بے حد خوف و ہراس کے
باوجود میں نے نمرتا کے افتتاحی جلسہ میں مضمون پڑھا۔ اور
کوئی ناگوار تاثر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مگر اندر ہی اندر میں
شدید ردعمل کی حالت میں تھا۔ اصل تکلیف کو دبانا میرے
لئے مشکل ہو رہا تھا۔ صلاح الدین پرویز کے ریاض رخصت
ہونے سے ایک روز قبل ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں جو کچھ
ہوا اس کے گواہ ریحان صدیقی اور عبید اللہ علیم ہیں۔ ہوٹل
انٹرکانٹی نینٹل سے باہر نکلتے ہی نروس ہو گیا تھا۔ ....
بے ہوشی کی حالت میں مجھے عبید اللہ علیم اور ریحان صدیقی ڈاکٹر
کے پاس لے گئے، دو تین روز بعد جب میری طبیعت نارمل
ہوئی تو میں نے کراچی میں رہن سہن کے تحفظ کے لئے سماجی
تعلقات کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ کیونکہ کراچی میں شروع
ہی سے الگ تھلگ رہا۔ اپنی ادبی تخلیقی مصروفیت کے سوا
میں نے کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ اور اسی دائرہ میں میری
دوستی ریحان صدیقی سے قائم رہی۔ ورنہ کراچی میں میرا واسطہ
اکثر بدخواہوں سے ہی رہا۔ بدخواہوں سے بچنے کے لئے میں
نے الگ تھلگ رہنا پسند کیا۔ مگر ایک سنگین واقعہ کے بعد
پہلی بار میں نے اپنے سماجی تحفظ کو اہم جانا۔ اس سلسلے میں
میر رسول بخش خان تالپور سے ملا ان سے مل کر مجھے بے حد
تقویت ملی۔ وہ حاکم اور سیاست داں سے زیادہ ایک
درویش بلکہ مرد قلندر تھے۔ پاکستان کی تاریخ میں ان کی
انسان دوستی اپنی مثال آپ تھی۔ ان کی موت کے بعد اب
ان کے اہل خاندان سے میرا ربط قائم ہے۔ موجودہ صورت
حال یہ ہے کہ جہاں کراچی میں میرے ۵۰ بدخواہ ہیں۔ وہاں
۱۰۰ خیر خواہ بھی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ
اللہ مالک ہے اس لئے میں نے بے خوف ہو کر اب یہ فیصلہ
کیا ہے کہ جو کچھ میں نے عارضی اندیشہ کے کارن چھپا

اب اسے برصغیر کے ہند و پاک کے لوگوں پر ظاہر کر دوں۔ یعنی صلاح الدین پرویز اپنے کارندوں کے ذریعہ میرے نام سے جعلی خطوط نہ صرف لکھوا رہا ہے۔ بلکہ انہیں جگہ جگہ تقسیم کروا رہا ہے اور دو ماہی "الفاظ" میں "دوسلا نروان" کی اشاعت باقاعدہ سازش کے تحت ہوئی ہے۔ یہاں میں ایک بات یاد دلاتا چلوں...... کہ صلاح الدین پرویز کے نام لکھے ہوئے میرے ۲۲ ۳ ۸۲ کے خط میں کمپیوٹر شاپ میں مختلف موضوعات پر ریسرچ کرانے، مواد جمع کرلنے، اور ان کی ترتیب وغیرہ کے لئے کمپنی میں پی ایچ ڈی ملازم رکھنے، کمپیوٹر سے اگلی ہوئی مشترکہ کاوشوں کی قے پر گھوسٹ رائٹنگ (GHOST WRITING) کے الزام کا ذکر درج ہے۔ یہ معلومات مجھے مستند ذرائع سے ہوئیں۔ ورنہ شروع شروع میں مجھے "نرتا" کی تصنیف کا منظر بالکل معلوم نہیں تھا۔ اب سننے میں آیا ہے کہ "دن بھر کا تھکا ہوا پرش" کا بھی یہی پس منظر ہے۔ اور ہاں "دن بھر کا تھکا ہوا پرش" جیسا کہ پاکستان سے سلیم احمد نے چھاپی ہے۔ تو اس سلسلے میں بھی مستند ذرائع سے سننے میں آیا ہے کہ سلیم احمد کے لئے پیٹروڈالر بہت ہی نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے ان کا ہاضمہ خراب ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ بار بار ہوائی جہاز سے کراچی تا لاہور اور راولپنڈی چکر لگانے کے باوجود نمائندہ شاعر وادیب اور نقاد تو بجا کوئی فاقہ کش صحافی بھی "دن بھر کا تھکا ہوا پرش" پر تبصرہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ کچھ کو پیٹرو ڈالر حاصل کرنے والوں کی فہرست میں بریکٹ کئے جانے کا اندیشہ ہے اور کچھ کو امریکی سی آئی اے اور کیمپ ڈیوڈ کے ایجنٹوں میں شمار ہونے کا اندیشہ ہے۔ سلیم احمد کے نام ریاض سے بار بار ٹیلیکس آ رہے ہیں کہ "دن بھر کا تھکا ہوا پرش" کا کراچی میں افتتاحی جلسہ جلد از جلد کرایا جائے، مگر افتتاحی جلسہ ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ کوئی صدارت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے اور کوئی مہمان خصوصی بننے پر رضامند نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب، بہرحال برصغیر ہند و پاک کے لوگوں کے لئے اس حد تک باخبر ہونا کافی ہوگا باقی رہے نام اللہ کا۔

نوٹ۔ ابھی حال ہی میں اطلاع ملی ہے کہ صلاح الدین پرویز نے سلیم الدین احمد کے نام غضب ناک لہجہ میں ایک خط لکھا ہے کہ آخر کراچی میں "دن بھر کا تھکا ہوا پرش" کا افتتاحی جلسہ کیوں نہیں کرایا جا رہا ہے۔ اگر افتتاحی جلسہ نہیں کرایا گیا تو صلاح الدین پرویز کراچی پر پنجاب کو ترجیح دے گا۔ دوسرے معنی میں اپنی دولت پنجاب پر بانٹے گا۔ کیونکہ سلیم احمد کو USE کرنے کے بعد اس کی فہرست میں انور سجاد اور وزیر آغا رہ جاتے ہیں۔ وزیر آغا تو خود متموّل ہیں TRAP میں نہیں آئیں گے۔ مگر انور سجاد بلکہ رشید امجد کے بھی TRAP میں آنے کی توقع ہے۔

ڈاکٹر محمد منصور عالم

هٰذَا مُغْنِیْ ہٰذَا اَکْبَرْ

گو بپندارا شتری مر سوزن بگذشت
گر بگذشت ابینک اشتر اینک سوزن

کئی سال پہلے عبدالمغنی نے ایک مقالہ "عالمی ادب میں اقبال کا مقام" لکھا تھا۔ وہ "نقوش" (لاہور) کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ وہی ان کے مجموعہ مضامین "تشکیل جدید" میں شامل ہے۔ اور اب ان کی نئی کتاب "اقبال اور عالمی ادب" کا زینت بن گیا ہے اس مقالے میں انہوں نے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ سوئی کے ناکے سے گذر سکتے ہیں۔ پھر اقبال صدی آئی تو عبدالمغنی نے کلیم الدین احمد سے استدعا کر کے "اقبال اور عالمی ادب" کے موضوع پر ایک مقالہ لکھوایا۔ کلیم الدین احمد نے لکھ تو دیا لیکن وہ عبدالمغنی کے مطلب کا نہیں تھا۔ اور اول الذکر نے اس پر اکتفا نہ کی۔ "اقبال، ایک مطالعہ" ایک مستقل تصنیف بھی لکھ دی۔ جسے پڑھ کر عبدالمغنی بہت برہم ہوئے انہوں نے ہماری زبان دہلی کے شمارہ بابت ۲۲ فروری ۱۹۸۰ء میں ایک تبصرہ لکھا۔ اس میں اس مفہوم کا اعادہ کیا کہ منصور کی کہانی تو پرانی ہوئی، وہ دار و رسن کو از سر نو جلوہ بخشیں گے چنانچہ ان کی حالیہ کتاب "اقبال اور عالمی ادب" اسی حوصلے کا نتیجہ ہے۔ لیکن اردو تنقید کا دار و رسن ان کے جلوے سے محروم ہی رہا اور آوازۂ منصور کی بازگشت اب تک فضا میں گونج رہی ہے۔ عبدالمغنی سمجھے ہوں گے کہ وہ سوئی کے ناکے سے گذر گئے۔ بقول ذوق۔ یہ اونٹ ہے اور یہ سوئی ہے آپ بچشم خود دیکھ لیجئے کہ اشتر

قلم سوزن تنقید سے گذرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہے "اقبال اور عالمی ادب" اصل کتاب ۵۵۵ صفحات میں ہے۔ شروع کے دو صفحات عرض ناشر ایک صفحہ فہرست اور چھ صفحہ تعارت بعنوان "یہ کتاب" اور آخر میں اکیس صفحات پر محیط "عالمی ادب میں اقبال کا مقام" مزید ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ڈیمائی کے سائز کے ۵۸۶ صفحات رکھتی ہے۔ اس کا سال اشاعت اپریل ۱۹۸۲ء ہے اور ناشر وہی ہے جس نے پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب "اقبال، ایک مطالعہ" شائع کی تھی۔ کریسنٹ پبلی کیشنز وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ گیا ۸۲۳۰۰۱ اس طرح کتابیں شائع کرتا رہا تو مالی منفعت کے ساتھ جلد ہی شہرت بھی حاصل کرے گا۔ کتاب پیش نظر کا دام ساٹھ روپے ہے اقبال، ایک مطالعہ کی قیمت ۴۰ روپے تھی۔ ان کے دوسرے ایڈیشن کے لئے میں کہنا چاہتا ہوں ؎

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یہ کتاب تحریری اطلاع کے مطابق ایک ہزار چھپی ہے۔ مجھے یقین ہے یہ جلد ہی بازار سے غائب ہو جائے گی کیونکہ خود صاحب کتاب نے اسے جس طرح مشتہر کیا ہے اور تعارف کتاب میں جو دعوے کئے ہیں ان سے قاری کا تجسس بہت بیدار ہو جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ کسی کتاب کا دیباچہ پڑھ کر ہی اس کتاب کے متعلق ڈھیر ساری توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ یہ امر طبعی بھی ہے

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنی امید کو جتنا قوی سمجھتے ہیں۔ وہ اسی قدر ناپائیدار اور مایوس کن ثابت ہوتی ہے اس کتاب کے ساتھ کیا صورت حال ہے۔ وہ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔

اقبال میرے مطالعے کے موضوع برابر رہے ہیں لیکن اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے تو میں شناسائے اقبال ہونے کا دعویٰ کیسے کردوں۔ البتہ ایک تشنگی ہمیشہ رہتی ہے۔ اور وہ مجھے ہر دور پہ لے جاتی ہے۔ چنانچہ عبدالمغنی کی اس کتاب کے لئے میں خود رفتہ سا ہو گیا۔ یہاں تک کہ میرے ایک محترم کرم فرما نے یہ کتاب مجھے عنایت کی، جو موصوف کی خدمت میں ناشر کی طرف سے تحفتاً پیش کی گئی ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

اس کتاب پر تبصرہ سینکڑوں صفحات میں جا سکتا ہے۔ لیکن میری کوشش ہے کہ یہ مختصر ہو۔ اقبال کی شاعری سے متعلق جو بحث کلیم الدین احمد اور عبدالمغنی نے کی ہے۔ اس حتی الامکان قطع نظر کروں گا۔ اس شاعر کے فکر و فن پر اپنے خیالات فی الحال محفوظ رکھتا ہوں۔ انشاء اللہ بعد میں وہ ظاہر ہوں گے ؎

خیال من، کہ از سیل حوادث پرورش گیرد
زگرد آب سپہر نیل گوں بیروں شود روزے

پھر بھی شاید دو چار باتیں یہاں ضرورتاً آجائیں۔ بیشتر اس کتاب کی صفات ہمارے تبصرے کا مرکز ہوں گی۔

یہ کتاب کئی لحاظ سے قابل ذکر ہے یہ پوچھا جائے کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے تو آپ کو کسی ایک شاعر کا نام لینے میں دشواری ہو گی۔ لیکن کوئی یہ پوچھے کہ اردو ادب کا سب سے بڑا نقاد کون ہے تو واجب ہے کہ کہیے، "فدا مغنی فدا اکبر" جن کی تازہ ترین کتاب "اقبال اور عالمی ادب" بے نظیر خیالات پر مشتمل ہے دنیا کی ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ ہو۔

یوں تو عبدالمغنی دیباچے میں لکھتے ہیں کہ،

یہ کتاب جناب کلیم الدین احمد کی کتاب "اقبال ایک مطالعہ" کا جواب نہیں ہے بلکہ اقبال اور عالمی ادب کے موضوع پر ایک مستقل بحث ہے"

اور جناب کلیم الدین احمد کی کتاب کے مباحث کو" انہوں نے" محض گریز کے طور پر لیا ہے۔ اور ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کوشش کی ہے کہ متعلقہ موضوعات کے تمام ضروری پہلو اور بنیادی نکات میری بحثوں میں آجائیں لیکن حقیقتاً یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ یہ محض تبصرہ ہے اور اپنی طوالت کے لحاظ اردو تبصرہ نگاری میں یاد رکھا جائے گا۔

مبصر نے اقبال، ایک مطالعہ کے مباحث کو گریز کے طور پر نہیں لیا ہے بلکہ روشنیٔ طبع اس کتاب سے حاصل کی ہے اور اس کے مباحث سے الگ ہٹ کر نئی بحث کہیں نہیں کی ہے البتہ یہ کام خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ کلیم الدین احمد کی تنقید سے اپنے لئے تحسین کی راہ نکالی ہے۔ اور ان کی تحسین سے غبار نکتہ چینی افشار کیا ہے۔ یہ کام اہم ہو نہ ہو اسے عبدالمغنی ہی انجام دے سکتے تھے۔

اس کتاب کے کئی نشانات امتیاز ہیں۔ سبھوں کا احاطہ مشکل ہے لیکن آئندہ صفحات بڑی حد تک آپ کا تعاون کریں گے۔ مطالعے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کتاب میں رقیبوں کو جمع کر کے ایک تماشا کھڑا کیا گیا ہے کلیم الدین احمد کے رقیب ایک دو نہیں۔ جو کتاب خواں ہیں۔ اس نے سوئے کلیم دیکھا تو رقیبانہ دیکھا۔ اور کچھ لکھا تو کافرانہ لکھا، ۱۹۳۸ء سے جب پہلی کتاب "گل نغمہ" شائع ہوئی تھی، اب تک نہ جانے کتنے ناقدان کلیم پیدا ہوئے اور کیا کیا نہ کہہ گئے، عبدالمغنی ان کے نام ہرگز نہیں گناتے لیکن متعدد باتیں انہیں سے مستعار ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ کیجئے:۔

عبدالمغنی نے کلیم الدین احمد کو مقلد، مغرب زدہ، غلام اور مرعوب ذہن، نابالغ جاہل وغیرہ بہت کچھ کہا ہے۔ اگر آپ نے کلیمیات کا مطالعہ کیا ہے تو جانتے ہوں گے راہ ترکستان

اختیار کرنے والے اس بدنام زمانہ نقاد کو بہت پہلے ہی ان خطابات سے نوازدیا گیا ہے۔ لیکن اقبال اور عالمی ادب کی عبارت آرائی ثابت کرتی ہے کہ عبدالمغنی انہیں اپنی حکومت کا خطاب تو سمجھ کر کلیم الدین احمد کو سرفراز کررہے ہیں۔ آپ انہیں سرقہ کیوں کہیں؟ الفاظ ہمارا قومی سرمایہ ہیں، چنانچہ اس جملے کی تشبیہہ بھی سرقے میں داخل نہیں:

"اس میں ہاتھیوں کی طرح کی خوش فعلی کا بھاری بھرکم انداز ہے" ص ۴۰۳

آپ کو یاد ہوگا کہ اقبال کی طنز وظرافت کا جائزہ لیتے ہوئے پہلی بار کلیم الدین احمد نے یہ نقش ابھارا تھا۔ متعلقہ جملے یہ ہیں:

"یہاں وہ سبکی نہ تیزی نہیں۔ جو اکبر کے شعروں میں ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش طبعی پر آمادہ ہے"

سخنہائے گفتنی ص ۲۰۹ اشاعت اکتوبر ۵۵ء

خوش طبعی اور خوش فعلی کے ساتھ بڑا فرق یہ ہے کہ کلیم الدین احمد نے دبطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ اس لئے ان کا خیال زیادہ معنی خیز ہے جبکہ عبدالمغنی کے جملے میں وضاحت کے سبب سپاٹ پن پیدا ہوگیا ہے۔

خیر اس ضخیم مبحث میں کلیم الدین احمد کو کچھ نئے اعزازات بھی بخشے گئے ہیں۔ مثلاً بے تمیز، بدتمیز، اینگلو انڈین، اینڈرو، اینگلوپن، احمق، بوڑھا طوطا، مسخرہ، خبطی وغیرہ ——

افسوس ع

کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ تیرا،

ادب کا طالب علم یہ دیکھنا چاہے کہ ادبی تنقید میں ذاتیات پر حملے، رکیک اور لچر جملے کی کتنی وسیع گنجائش ہے۔ تو اسے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے؟ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب میں گلہ اور گالی دونوں کی یکجائی ہے۔ جہاں تک کم استعداد، کم نظر لکیر کے فقیر، اوسط، معمولی وغیرہ کا سوال ہے مجھے تو افسوس نہ ہوا کیونکہ کلیم الدین احمد نے بھی اردو شاعروں اور نثر نگاروں کو یہ سب کچھ کہا ہے۔ لیکن شرافت اور شائستگی ان کی ہمدم تھی، منہ چڑھانا اور گالیاں بکنا ان کا شعار نہ تھا، پھر وہ اپنے ہر تنقیدی خیال کو اپنے دلیلوں اور ثبوتوں سے ثابت کرتے ہیں۔ لیکن عبدالمغنی نے ان باتوں کو ضروری نہ سمجھا بلکہ ذاتیات پر بدترین اور شدید حملے کو اپنی تنقید میں بطور لازم استعمال کیا ہے اس روش سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ وہ بظاہر جتنے باوقار نظر آتے ہیں، اتنے ہی جذباتی اور غصیل اور جنون خیز ہیں غالباً سنجیدہ علمی گفتگو جس میں زیادہ سے زیادہ تامل کن مواد ہو ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ صرف سرسری باتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ عام راہ سے گزر کر خاص راہ پر گامزن نہیں ہوتے، وہ مریتہ الحمذین سے تو واقف ہوں گے تنقید میں بھی اس کی اشد ضرورت ہے۔

یہ ذکر فضول ہے کہ عبدالمغنی نو مشقوں کی طرح اردو لکھتے ہیں کہنے کو تو وہ پانچ کتابوں کے مصنف ہوگئے ہیں۔ مگر آخری کتاب پیش نظر میں بھی عبارت، ٹھوس، جامع معنی خیز، سنجیدہ شائستہ اور معلومات افزا نہیں، اس میں تکرار خیال بہت ہے مثلاً کلیم الدین احمد کی کم علمی اور کج فہمی، لکیر کی فقیری اور مغرب زدگی کا ذکر سینکڑوں مقامات پر ضروری نہ تھا، جب ایک جگہ اپنی رائے جو غور و فکر کے بعد قائم کی گئی ہے ظاہر کردی گئی ہے تو اب اصل ذمہ داری یہ تھی کہ مدلل علمی بحث سے اس کو ثابت کریں پر، یہ انداز انہیں نصیب نہ ہوا۔ اور ان کے جملے عموماً اتنا طویل القامت ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی اتنا لانبا کرتا پہن لے کہ بدنما معلوم ہونے لگے۔ اور اسے کانٹ چھانٹ کر خوشنما بنانا ضروری ہو۔ ان کے جملوں میں الفاظ کے مقام میں ادل بدل کر کے انہیں چست اور مستحکم بنانے کی بڑی گنجائش ہوتی ہے عبارت ادب سے بے نیاز نہ ہو۔ اس جانب ان کی توجہ نہیں جاتی، خیال جس طرح ذہن میں آتا عموماً یوں ہی ناتراشیدہ

طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر پر بازاری پن حاوی ہو گیا
ہے۔ کہیں تذکیر و تانیث کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ تو کہیں اردو املا کا مسئلہ
کھڑا کر دیتے ہیں بعض جگہ مخصوص الفاظ بھی بڑی بے پروائی سے استعمال
کر گئے ہیں۔ مثلاً ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ حمد و نعت اللہ اور
رسول اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ انہیں کسی بھی نیت سے دوسرے
کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں لیکن عبارت کی ان خامیوں پر توجہ
میں غیر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ توقع کے زیادہ خلاف نہیں ہیں
میں نے مثالیں مصلحتاً نہیں دی ہیں اگر کسی کو اصرار ہو تو میں اس
پیراگراف میں ظاہر کئے گئے تمام خیالوں کے لئے مثالیں حوالوں
کے ساتھ فراہم کر سکتا ہوں۔ وہ حسن ادا سے نثر کو نثر بنا دیتے
تو داد کے زیادہ مستحق ہوتے،

ناقد کو تنقید کے نام پر کیا لکھنا چاہئے اس کا درس
عبدالمغنی کی کتاب سے اچھی طرح مل جاتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں

(۱) انہوں نے (کلیم الدین احمد) تنقید کو تدریس
بنا دیا ہے۔ اور بالکل آئی۔ اے، بی اے
کے طالب علموں کی طرح درسیاتی تنقید (TEXT
BOOK CRITICISM) کرتے ہیں۔ وہ
پٹنہ کالج کے انگریزی کلاسوں میں اپنے انگریز معلمین
کے لکچروں کو اچھی طرح حفظ کئے ہوئے ہیں۔
اور ان کے نوٹس کا استعمال اپنی عالمانہ تنقیدوں
میں بکثرت کرتے ہیں۔ اور قطعاً نہیں سوچتے کہ
دنیائے تنقید طالب علمانہ کلاسوں سے بہت
آگے کی چیز ہے۔ ص ۴۲۹

(۲) گفتگو (کرنا) کا یہ بہترین انداز وہی
شخص اختیار کر سکتا ہے جس کے پاس کہنے کے
لئے کچھ نہیں۔ کوئی کام کی بات نہیں۔
لہٰذا وہ صرف بکواس کرتا ہے۔ چونکہ اسے امید
ہے کہ لوگ اس کی بکواس پر کان نہیں دھریں گے
لہٰذا چلانے لگتا ہے لیکن گلا پھاڑنے سے وہ
اور بھی زیادہ مسخرہ نظر آنے لگتا ہے۔ ص ۴۳۴

(۳) .... شاید وہ (کلیم الدین احمد) منیرہ
بیگم سلطانہ دختر نیک اختر علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال
کے جملہ حقوق مع حق ترجمہ میں خود کو بھی شریک
سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کاپی رائٹ کی رو سے وہ
سب "بحق منیرہ محفوظ ہیں" حق تقسیم نظم کا اضافہ
کسی منطق یا قانون کی رو سے جبر دنیا کو معلوم
نہیں کرا لیا ہو۔ اور وہ بلا شرکت غیرے انہیں
کے لئے محفوظ ہو۔

اس قسم کی وافر مثالیں آپ کو عبدالمغنی کی اس کتاب میں ملیں گی۔
آپ خود اندازہ کیجئے کہ یہ تنقید ہے یا چائے خانے کی گپ۔ عبدالمغنی
حقیقتاً کلیم الدین احمد سے بہت برہم ہیں۔ اس برہمی میں نہ وہ صرف
اخلاق کے حدود سے تجاوز ہو گئے ہیں۔ بلکہ نام نہاد تنقید لکھتے ہوئے
بھی فن تنقید کو منسوخ کر دیا ہے۔ آپ اسے انہیں کے لفظوں میں "مسخرانہ
انداز" کہہ سکتے ہیں۔ یہ کیفیت اس لئے طاری ہو گئی ہے کہ کلیم الدین
احمد نے اقبال کی بعض فنی خامیوں کی نشان دہی کی ہے۔ اور عبد
المغنی مداح اقبال ہیں۔ ان کے جہاں اقبال ایک مطالعہ کو پڑھ
کر باطن میں کس قدر تغیر رونما ہو گیا ہے اس کا اندازہ اس وقت
ہوتا ہے۔ جب خامۂ عبدالمغنی یہ جملہ لکھتا ہے:۔

"جہاں تک خیالات محض آدرشوں تجربوں
میں جو فرق ہے اس سے ناواقفیت کا تعلق
ہے یہ کم از کم کسی کلیم الدین احمد کے لئے جائز
نہیں کہ کسی اقبال کے بارے میں کہے"۔

یعنی: کسی ناقد کے لئے یہ جائز نہیں کہ کسی عظیم شاعر پر تنقید لکھے۔
اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تنقید ایک فعل عبث
ہے۔ اور اسے فن قرار دینا اور ادبی تنقید کی اہمیت و ضرورت پر
لکھ دینا سب عبث ہے۔ یہ ہے عبدالمغنی کا نظریہ تنقید۔

جناب اگر یہ کہتے کہ کلیم الدین احمد کے لئے یہ ممکن نہیں یا ان کے بس کی بات نہیں کہ اقبال کو ناواقف کہیں تو ایک بات ہوتی۔" یہ جائز نہیں" چہ معنی دارد ؟ کیا عبدالمغنی کے پاس اتنا بھی وقت نہیں کہ وہ ادبی تنقید کے منصب کو سمجھ سکیں۔ ادب کا ناتہ شخصیت کو دیکھتا ہے یا فن کو؟ اور کیا فن کار اور نقاد کا رشتہ آقا اور غلام کا رشتہ ہے گمان غالب ہے کہ عبدالمغنی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ جبھی تو وہ کلیم الدین احمد کو جتانا چاہتے ہیں۔ ع

ایاز! قدر خود بشناس

اگر ایسا ہی ہے تو عبدالمغنی بھی اپنی بساط کو پہچانیں۔ وہ ایک ہی سانس میں کالی داس، ٹیگور، دانتے گیٹے، شیکسپیر، ملٹن، ایلیٹ، رومی، حافظ غالب سبھوں پر منہ آتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ کیا یہ زلف ایاز کا خم نہیں ؟ لیکن انہیں جاننا چاہیے کہ ادب اور تنقید میں کوئی غزنوی اور ایاز نہیں ؎

یہ بزم مے ہے، بزم جم نہیں ہے۔
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

یہ جائز نہیں، تو وہی شخص کہہ سکتا ہے جو مبادیات تنقید سے ناواقف ہے۔ یا محض جوش عقیدت میں اندھا ہو رہا ہے۔ اگر دل بینا ہو تو ظاہری اندھاپن کا زیادہ افسوس نہیں ؎

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں،

اس جوش عقیدت میں عبدالمغنی نے اقبال کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر کہہ دیا ہے۔ یہ دراصل اقبال کے ساتھ تمسخر ہے کیونکہ جس شخص نے ایسی بات زبان سے نکالی جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں۔ اگر وہ ثابت کر دیتے جادو کے ذریعہ نہیں ٹھوس حقائق کی بنیاد پر تو کسی کو عذر نہ ہوتا۔ لیکن ان میں تجربہ کار وکیل کی یہ صلاحیت نہیں کہ نئی دلیلیں پیدا کریں۔ البتہ ہارے ہوئے وکیل کی طرح صرف الفاظ کا تیور دکھاتے ہیں۔

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ عبدالمغنی کو اقبال کی شاعری سے والہانہ عشق ہے۔ کہہ سکتے ہیں۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی۔

اب ذرا اس کی تاثیر ملاحظہ کیجئے، عبدالمغنی نے عموماً وہی تنقیدی جملے دہرائے ہیں۔ جو کلیم الدین احمد استعمال کر گئے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ برسر اجلاس اس ہارے ہوئے وکیل کا وطیرہ کیا ہے :-

اقبال ایک مطالعہ

اردو میں نہ تو کوئی ڈنٹے ہے۔ نہ کوئی پوپ، نہ بلیک، نہ ورڈس ورتھ، نہ ہوپکنس، نہ ییٹس نہ ایلیٹ، صفحہ ۷

غرض مغربی شاعری ایک بحر ذخار ہے جس کے مقابلے میں اردو شاعری ایک چھوٹا سا چشمہ ہے۔ صفحہ ۸

اقبال شاعر تھے، اور اچھے شاعر تھے، وہ زیادہ اچھے شاعر ہو سکتے تھے اگر وہ شاعر ہونے پر قناعت کرتے، اور پیغمبر بننے پر مصر نہ ہوتے۔ صفحہ ۷

یہ بات واضح ہو گئی کہ اقبال کا تخیل اپنے خیال صفر کی واضح منطقی متعین تصویر پیش نہیں کر پایا۔ ...... اسے نظام اقبال کہہ لیجئے لیکن جس کا نظام ایسا ہو اس کی شاعری کیسی ہو گی شاعری تن آسانی نہیں یہ شاعری دماغی کاہلی نہیں۔ جو شاعر معمولی جانے بوجھے FACTS سے اس ندر غفلت برتتا ہے۔ اس کی شاعری سے بے لطفی کے سوا کیا حاصل ہو سکتا ہے صفحہ ۲۱

اقبال اور عالمی ادب

انگریزی میں نہ کوئی درد سے، نہ اکبر، نہ

پرواہ نہیں۔ لازماً مدح میں غلو اور تنقید میں دل آزاری کا شدید پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ یہ مدح و گلہ عقل و عشق دونوں کی اپیل سے بیگانہ ہے۔ اور اس نے پوری کتاب کو نشت کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب کلیم الدین احمد کے لئے نہیں خود صاحب کتاب کی ادبی شخصیت کو DAMAGE کرنے کے لئے کافی ہو گی۔

کلیم الدین احمد تقابلی تنقید کرتے ہیں، تو عبد المغنی بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں جیسی نادر و نایاب تقابلی تنقید ملتی ہے۔ اس کے چند نمونے یہ ہیں:

> اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ئیٹس اور ایلیٹ، شیلی اور کیٹس جیسے بونوں کو تو چھوڑیے، شیکسپئر، گیٹے، اور دانتے جیسے دیوتاؤں جیسی بڑی شخصیت اقبال کی تھی اقبال کی زندگی ان سب مغربی شاعروں سے زیادہ بھرپور اور ان کا ذہن زیادہ معمور، محیط اور مرکب تھا۔ صفحہ ۳۳

> یہ (جاوید نامہ) ہر جہت سے ایک کامیاب مؤثر عظیم الشان اور ادبیات عالم میں فقید المثال شاعری ہے۔ اس میں نہ صرف اقبال اپنے عروج پر ہیں۔ بلکہ یہ مشرقی شاعری کا نقطۂ کمال اور عالمی ادب کی معراج ہے۔ اپنے مضامین کی وسعت، موضوعات کے تنوع کرداروں کی رنگارنگی، مناظر کی دلکشی، افکار کی گہرائی، اشعار کی ساحری، تصورات کی اذا حیت، اور مقاصد کی رفعت کے لحاظ سے دنیا کی کوئی شعری تخلیق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ وہ شاعری ہے جو واسے کے بس کی بات نہیں۔ صفحہ ""

> ... پوری انگریزی شاعری میں شکسپیر اور ملٹن کے سوا کوئی اور شاعر ایسا نہیں ہے جو چند منٹ بھی اقبال کے مقابلے پر ٹھہر سکے۔ ان شاعروں میں سے ہر ایک کی جملہ تخلیقات پر کا ایک اور وہ بھی پہلا مجموعہ بانگ درا بھاری ہے۔ رہے شکسپیر اور ملٹن تو ان میں سے ہر ایک کی پوری شعری کائنات کو ایک پلے پر رکھ کر دوسرے پلے پر اگر اقبال کا صرف اردو یا صرف فارسی کلام رکھ دیا جائے تو یہ پلہ جھکتا نظر آئے گا، اور اگر اقبال کا فارسی اور اردو دونوں کلام شکسپیر اور ملٹن کی تخلیقات کے مجموعی سرمائے پر ڈال دیا جائے، تو اس کے حجم اور وزن کے نیچے یہ پورا سرمایہ دب کر رہ جائے گا۔ صفحہ ۱۷

بیّن ہے کہ یہ تقابلی تنقید نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تجزیاتی اور مدلل نہیں ہے۔ اسے عبد المغنی تنقید کہہ لیں لیکن آپ نہیں کہہ سکتے جب میں اس کتاب کو پڑھتے ہوئے صفحہ ۱۷ کے مذکورہ بالا جملے تک پہنچا تو خیال ہوا کہ مبصر نے یہ نتائج غور و فکر کے بعد نکالے ہوں گے، تجزیہ اور عملی تنقید سے مصرف لیا ہو گا، شاید آگے اس کی مثال لے جس سے معلوم ہو سکے کہ عملی تنقید کی صلاحیت ان میں ہے۔ لیکن یہ قوت ہوا اور بروئے کار نہ آئے، ناممکن ہے چنانچہ کتاب از اوّل تا آخر PRACTICAL CITCRS سے خالی ہے۔ دعوے تو عبد المغنی بڑے بڑے کرتے ہیں۔ لیکن دلائل پر ان کی دسترس نہیں صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ اقبال کے آگے دانتے، گیٹے، شکسپیر، ملٹن رومی، حافظ، غالب، کالی داس، سب گرد ہیں، اسے ثابت کرنا ہو گا۔ اور اس کی پہلی شرط علمیت، دوسری محنت، اور تیسری مدلل لکھنے کی صلاحیت ہے۔ اقبال نے عظیم شاعری کی

مومن، نہ ن م راشد، نہ فراق نہ فیض، صفحہ ۱۱

غرض مشرقی شاعری ایک بحر ذخار ہے جس کے
مقابلے میں انگریزی شاعری ایک چھوٹا سا چشمہ
ہے۔ صفحہ ۱۳

جناب کلیم الدین احمد ناقد ہیں، اچھے ناقد ہیں اور
زیادہ اچھے ناقد ہوسکتے ہیں۔ اگر وہ ناقد ہونے
پر قناعت کریں۔ اور مفکر بننے پر مصر نہ ہوں صفحہ ۲۹

یہ بات قطعی اور حتمی نیز دستاویزی طور پر واضح ہوگئی
کہ جناب کلیم الدین احمد اپنے تنقیدی شعور کی
واضح منطقی معین تصویر نہیں پیش کر پائے
صفحہ ۶۱

اسے نظام دانتے کہہ لیجئے، یا بے بنیاد ہیئت
اور دقیانوسی سائنسیت کا ایک معجون مرکب
یا چوں چوں کا مربہ جس میں کچھ قاشیں زمین
کی ہیں۔ اور کچھ آسمان کی، لیکن جس کا نظام
ایسا ہو اس کی شاعری کیسی ہوگی، شاعری
تن آسانی نہیں، شاعری دماغی کاہلی نہیں،
جو شاعر معمولی جانے بوجھے FACTS
سے اس قدر غفلت برتتا ہے۔ اس کی شاعری
سے بے لطفی کے سوا کیا حاصل ہوسکتا ہے
صفحہ ۶۲،

اس تنرکی بہ ترکی جواب سے جناب مبصر فاش ہوجاتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب اپنا بھرم قائم رکھنے کیلئے ہے۔ ورنہ حقیقتاً وہ شدید احساس شکستگی اور نااہلی کے شکار ہوگئے ہیں۔ وہ گھبرائیں نہیں۔ جو اسے توبہ نہ کریں۔ پردہ پوشان وطن انہیں برہنہ نہ چھوڑیں گے جیسی ان کی خواہش ہے۔ اردو تنقید میں انہیں خلعت فاخرہ عطا کی جائے گی۔ لیکن کاش! وہ سوچتے کہ ان کے لئے لباس تقویٰ زیادہ بہتر ہے

یہ بات تیقن سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کتاب کا مقصد اول اقبال شناسی نہیں، کلیم شکنی ہے۔ پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے کلیم الدین احمد کا اردو تنقید پر غلبہ رہا ہے۔ یوں تو ان کے مخالفین ہر زمانے میں رہے ہیں۔ لیکن چند حالیہ چند برسوں میں کچھ حاسد ناقد بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ عبدالمغنی ان میں سر فہرست ہیں۔ ان کی شدید آرزو ہے کہ کلیم الدین احمد کسی صورت سے نصاب خارج کر دیئے جاتے، انہوں نے ہم اردو والوں کو بقین ایک طرح سے بشارت دی ہے کہ

> اگر درسیات سے ان (کلیم الدین احمد) کی
> کتابیں نکال دی جائیں تو زیادہ سے زیادہ
> دس سال کے اندر وہ آثار قدیمہ بن کر
> عجائب خانہ میں اپنی صحیح جگہ پہونچ جائینگی
> صفحہ ۳۱۹

اس قسم کی باتیں انہوں نے کئی جگہوں پہ لکھی ہیں۔ اور یہ بھی غور نہیں کیا کہ یہ باتیں مہمل ہیں، یا موزوں، ایسے جملوں سے ان کی نفسیات کی تہہ جھلکتی ہے، انہیں حسد کے نقصانات کا احساس نہیں، تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ درسیات سے نکال دینے کے بعد بھی کم از کم دس سالوں تک کلیم الدین احمد کو لوگ نہیں بھولیں گے، لیکن عبدالمغنی پانچ کتابوں کے مصنف ہو تو گئے ہیں، پر کتنے لوگ ان کو قابل وقعت سمجھ رہے ہیں۔ اور آئندہ ان کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو کسی کو معلوم نہیں۔ اس تلخ حقیقت پر نظر غالباً ان کی بھی ہے۔ اپنے دل میں وہ سمجھتے ہیں۔ کہ کلیم شکنی اور اقبال شناسی دونوں ان کے لئے ناممکن ہیں۔ مگر اردو حلقے کو یہ اعتراف کیسے ہو کہ عبدالمغنی کتاب خواں ہی نہیں بلکہ صاحب کتاب بھی ہیں۔ وہ اپنے وجود کا اثبات اپنا اہم اور مقدم فریضہ سمجھتے ہیں۔ نائش، غیر متوازن، نامعقول، اور بے دلیل ہو، یا تنقید تندی مزاج اور ترشی اخلاق کا مظہر، انہیں ان باتوں کی

ہے تو یہ بتائیے کہ اس کی کیا کیا خوبیاں ہیں، جو اسلام اور قرآن
کو نہیں مانتے، اور صرف شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہتے
ہیں۔ ان کے لئے وجہ کشش کون سی خوبیاں بن سکتی ہیں۔ یا
ساری دنیا کو اسلام کا پیغام دینا ہے۔ تو اسلامی لٹریچر کے
وافر ذخیرے کے باوجود کلام اقبال میں مزید منفرد اور نوع
بہ نوع کیا کچھ موجود ہیں جنہیں غیر اسلامی دنیا کو پیش کیا جا سکے
اقبال نے اپنے تخیل کو اور جبل تخیل کو کس طرح حسین اور منظم
نقش میں بدل دیا ہے۔ حیات و کائنات کا کیسا گہرا اور نیرنگ
مطالعہ و مشاہدہ اس کی شاعری سے عیاں ہے۔ لفظوں کا
انتخاب کہاں تک کامیاب ہوا ہے ان سے کس طرح معنی کی دنیا
بساتی ہے۔ اور ان میں رقص و موسیقی کی جلوہ گری کیسی ہوتی
ہے۔ صوتیات سے کیا مصرف لیا ہے۔ آہنگ میں جدت
کے لئے کیا اختیار کیا ہے۔ شعری صنعتیں کس قسم کی استعمال
ہوتی ہیں۔ اور معنویت کے کون کون سے گوشے مستور ہیں۔
پورے ہوئے یا نہیں ——— غرض اس قسم کے کئی
سوالات جو شاعری کے مواد اور ہیئت سے متعلق ہیں۔ لازماً
حل کرنے تھے۔ اور اسی طرح حل کرنے تھے جس طرح کلاس میں
ناواقف طلبا کو بتایا جاتا ہے۔ تنقید اگر تدریسی بھی ہو جائے
تو بہت بڑی بات ہے۔ اسے کامیابی کی پہلی دلیل سمجھنا
چاہئے، کیونکہ بی اے کلاس میں سب نہیں تو کچھ طلبہ ضرور
ایسے ہوتے ہیں جو استاد کو نئے نئے گوشوں کی طرف متوجہ ہونے
پر مجبور کر دیتے ہیں۔ استاد اگر ان کو تشفی نہیں کر سکا تو اسے
صاحب قرطاس و قلم بننے کا حق نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ عبدالمغنی
بی اے کے کلاسوں میں طلبہ و طالبات کی کہاں تک تشفی کر
پاتے ہیں۔ اس کتاب کے پیش نظر تو درسیاتی تنقید میں بھی
کامیابی کی توقع ان سے نہیں کی جا سکتی۔

عبدالمغنی کی عمومی تنقیدی روش یہ ہے کہ اشعار لکھ
کر چند ستائشی جملے لکھ دیتے ہیں، مثلاً یہی شاعری ہے،
ٹھوس حقائق پر مشتمل شاعری، دلنواز شاعری، "یا" یہی اقبال
کا کمال فن ہے۔ ورنہ صنمیات، و خرافات پر شعر گوئی تو بہت
آسان ہے۔ وغیرہ، اور شعریت کی وضاحت ہرگز نہیں کرتے
عملی تنقید کے ذریعے فنی باریکیوں کو روشن ہرگز نہیں کرتے،
اس کتاب میں اقبال کی جن نظموں پر اظہار خیال کیا ہے
وہ کلام اقبال کی شرحوں سے استفادہ ثابت کرتی ہیں بہرحال
بات یہ چل رہی ہے کہ عبدالمغنی تقابلی تنقید نہیں کرتے، اور صرف
چند ستائشی جملے لکھ دیتے ایک مثال ملاحظہ ہو:

> اس میں (مسجد قرطبہ) میں اردو زبان اور
> اس کے اوزان و بحور کا جو کرشمہ ظاہر ہوا
> ہے اس کی مثال نہ یونانی و لاطینی و اطالوی
> میں ہے نہ جرمن، فرانسیسی، روسی اور
> انگریزی میں، جناب کلیم الدین احمد کو ماہرین
> سے مشورہ کر کے اس صداقت پر غور کرنا
> چاہئے کہ دنیائے شاعری میں فارسی زبان
> اور اوزان و بحور کی کوئی نظیر یورپ کی
> کسی زبان و اس کے عروض میں نہیں ہے۔
>
> صفحہ ۲۰۶

جس نے کسی زبان کے اوزان و بحور کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔
وہ ان جملوں سے کیا سمجھ سکے گا۔ اور مسجد قرطبہ کے اوزان
و بحور کا کرشمہ اس پر کس طرح ظاہر ہوگا البتہ وہ یہ نتیجہ نکال
سکتا ہے کہ عبدالمغنی سے بڑا ماہر اوزان و بحور و عالم زبان
عالم کم از کم ہندوستان میں تو دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اس
لئے یہ دعوی وہی کر سکتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کو دوسرے ماہرین
سے نہیں عبدالمغنی سے اوزان و بحور کے سلسلے میں مشورہ کرنا
چاہئے، ان کے لئے سہولت یہ بھی ہے کہ عبدالمغنی پٹنہ میں
ہی رہتے ہیں۔ ویسے واقفیت کے لئے قارئین کو بتا دوں
کہ ماہر اوزان و بحور ہونے کا یہ مدعی وہی شخص ہے جس کی موزونی

طبع کا یہ حال ہے۔ ——— جہاد کے متعلق اقبال کا
دو شعر نقل کرتے ہیں ؎

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے!
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر

پھر ہدایت دیتے ہیں:

موجودہ سیاق و سباق میں "جہاد"
کو تنقید سے بدل کر شیخ کلیسا نواز کی
جگہ پر ناقد مغرب نواز کر دیجئے، اس طرح
"جنگ" کے بجائے لفظ "نجات" یا "پیغام"
پڑھئے، صفحہ ۲۸

"جنگ" کی جگہ "نجات" یا "پیغام" پڑھ کر دیکھئے تو مصرعہ موزوں
رہا یا عبدالمغنی کے شوخی طبیعت کا فریادی ہو گیا۔

عبدالمغنی لکھتے ہیں۔

جناب کلیم الدین احمد نے دانتے اور اقبال
دونوں کی اصل عبارتیں ضرور نقل کی ہیں
مگر اطالوی اور فارسی کی لسانی اداؤں اور
الفاظ و تراکیب حسن نیز مصرعوں اور شعروں
کے آہنگ کا موازنہ نہ تو وہ کرتے ہیں
اور نہ کر سکتے ہیں۔ صفحہ ۱۸

لیکن عبدالمغنی ضرور کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اطالوی میں ان کی استعداد
سے آپ واقف ہوں گے، ایک جگہ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ
"خام کاری کے بہترے نشانات دانتے کی شاعری میں موجود ہیں"
کیونکہ اس نے اس وقت اپنی زبان میں شاعری کی۔ جبکہ اس کا
سانچا خام تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں کسی ایک خام کاری کی طرف
بھی اشارہ نہیں کیا گیا۔

اصل معاملہ کیا ہے میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ کہ اپنی نااہلی
کو چھپاتے ہوئے اپنے وجود کا احساس اردو قارئین کو کرانا
ضروری ہے۔ عبدالمغنی نے دانتے کو اورجنل زبان میں تو پڑھا
نہیں۔ صرف ترجمے دیکھے ہوں گے، تو ترجمے سے شاعر کے
ذہن تک رسائی اور اورجنل ٹکسٹ کی فنی باریکیوں، اور
لسانیاتی، صوتیاتی، معنویاتی، نغماتی اور شعریاتی عناصر کا پتا
لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ بقول فضل الرحمان شاعری
میں الفاظ طبع زاد ہوتے ہیں۔ اور الفاظ ہی شاعر کے ذہن
تک پہونچنے کا ذریعہ بھی، یہ بات ایسی محتاج تشریح نہیں کہ
کچھ اور کہا جائے، تقابلی تنقید کے لئے شرط اولین ہے کہ جن
زبانوں کے شعرا کو موضوع بنایا جائے، ان کی اورجنل زبان
سے اچھی واقفیت لازمی ہے۔ عبدالمغنی یہ شرط پوری نہیں
کرتے۔

"اقبال اور عالمی ادب" یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ
جن شعروں اور نظموں کی تحسین کلیم الدین احمد نے کی ہے ان کی
تعریف عبدالمغنی بھی کر دیتے ہیں۔ غالباً تحت الشعور میں یہ بات
ہے کہ جب کلیم الدین احمد نے تعریف کر دی تو یقیناً وہ نظمیں اور
اشعار قابل تعریف تھے۔ اس کے ساتھ یہ بھی غور کرنا چاہئے
کہ کلیم الدین احمد کسی شعر یا نظم کی تعریف کریں یا تنقید، ان کے نتائج
ٹھوس ثبوتوں اور دلیلوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ وہ مواد
اور ہیئت کا گہرائی سے تجزیہ کرتے ہیں۔ گویا وہ کنواں کھود کر
پانی نکالتے ہیں۔ دوسروں کے گھڑے سے ڈھال نہیں لیتے
عبدالمغنی سے اول الذکر کام نہیں ہو پاتا۔ ان کے مزاج کو تجز
مناسبت ہے ڈھونڈنے سے بھی آپ کو اس کا ثبوت نہ
گا۔ اگر مناسبت ہوتی تو تنقید کی یہ ٹیڑھی لکیر وہ نہ کھینچتے

......جس طرح پچھلی دو نظموں کی تعریف
ترقی پسند شاعری کی مذمت کے لئے کی
گئی تھی اسی طرح اس نظم (روح ارضی آدم
کا استقبال کرتی ہے) کی تحسین اقبال ہی

کی شاعری کی عام تنقیص کے لئے کی جا رہی ہے۔ صفحہ ۳۳۴

اقبال کی تنقیص کے لئے اقبال کی تحسین ؟ دور کی یہ کوڑی عبدالمغنی کا تخیل ہی لا سکتا ہے اور یہ بھی نہیں غور کرتے کہ جب اقبال ہی کی نظم سے اقبال کی شاعری کی تنقیص ہو جاتی ہے جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔ تو یہ اقبال کی مدح ہے یا ہجو! عجیب فہم ہے۔

عبدالمغنی نے اپنی کج فہمی کے وافر ثبوت اس کتاب میں مہیا کر دیئے ہیں۔ نمونتاً ایک دو کا ذکر ہوگا، کلیم الدین احمد کے قارئین جانتے ہیں کہ انہوں نے پیغام اور شاعری میں کوئی بیر نہیں بتایا ہے۔ بلکہ واضح لفظوں میں یہ کہا ہے کہ پیغام اور فلسفہ بھی شاعری کا موضوع بن سکتے ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ پیغام نرا پیغام نہ ہو، فلسفہ محض فلسفہ نہ ہو، وہ شاعری میں گھل مل جائیں، لیکن عبدالمغنی کچھ اور ہی موتی نکالتے ہیں:

"پیغام کو شاعری بنانے کا نمونہ اقبال سے بڑھ کر کسی نے دنیائے ادب میں پیش کیا ہے۔ دانتے، گیٹے، اور شکسپیر کا پیغام ہے ہی کیا۔؟ پیغام تو اقبال کے پاس ہے ملٹن سے بھی بڑا بہت بڑا پیغام، ایک مستقل نظریہ کائنات، اور مکمل نظام فکر کے ساتھ اور اس پیغام ہی کی تحریک پر اقبال نے شاعری کی۔" صفحہ ۳۳۵

ان جملوں کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ دانتے گیٹے اور شکسپیر کے یہاں کوئی پیغام نہیں اس لئے بڑی شاعری نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے یہاں پیغام ہے۔ اس لئے شاعری ہے۔ یعنی پیغام کو شاعری کا جزو لاینفک تصور کیا گیا۔ اور یہ قول کلیم [illegible] کج فہمی کی اچھی مثال [illegible] ہے۔

[illegible] ہو [illegible] آدمی جیسا کبھی

برسوں سے پڑھا رہے ہیں۔ اب وہ بزرگ اساتذہ میں شامل ہوں گے، لیکن ان کی سمجھ معمولی باتوں میں بھی کیسے دھوکا دے جاتی ہے۔ کہ اکثر وہ الجھی ہوئی باتیں کرتے ہیں۔ اگر وہ کلیم الدین احمد کی طرح اپنا نظام فکر قائم کرتے، اور وہ صحیح ہو یا غلط اس پر قائم رہتے، تو وہ ہاں اور نہیں دونوں قسم کی باتیں نہیں کرتے، مثلاً ایک اقتباس میں ہاں اور نہیں دونوں کا جلوہ دیکھئے:

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے شاعری کو شخصیت کی الجھنوں کا تختۂ مشق نہیں بنایا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنی ذہن کی ساری کشمکش نہایت عمیق و وسیع اور مرتب و منظم غور و فکر کر کے پہلے ہی حل کر لی ہے اور فن کے لئے یکسو ہو گئے ہیں۔

یہ ہاں ہے اور اس تسلسل میں یہ نہیں دیکھئے:

ورنہ ذاتی طور پر

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں۔ کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

اس عظیم و بسیط روحانی کشمکش کے مقابلے میں جو ایک فلسفی، صوفی، فقیہہ مجاہد اور شاعر کو برداشت کرنی پڑیں غریب ہوپکنس جیسے راہب کی کشمکش ہے ہی کہاں۔؟ چنانچہ کشمکش کا لطیف و حسین اشارہ شاہین کے ابتدائی چار اشعار میں بھی ملتا ہے۔ صفحہ ۱۴۹

یہ تنقید کلیم الدین احمد کے صرف ایک جملے کے جواب میں لکھی گئی ہے وہ جملہ یہ ہے:

"لیکن اقبال کی روح ان کے ذہن میں کوئی کشمکش نہیں۔" (اقبال ایک مطالعہ صفحہ ۲۵۶)

غور کیجئے کہ عبدالمغنی نے ابتدائی جملوں میں کلیم الدین احمد کے ہاں میں ہاں ملایا ہے یا نہیں، پھر آخری جملوں میں ہوشیاری سے زیادہ کشمکش اقبال میں دکھا کر اسے رد کر دیا ہے۔ ضرورت تھی کہ کشمکش ہے یا کشمکش نہیں ہے کسی ایک پہلو کو ثابت کیا جاتا۔ اور اس کیلئے مغالطے سے نہیں اقبال کی شاعری سے مدد لینی تھی۔ اقبال کی شاعری اچھی طرح رہنمائی کر دیتی۔ اسی طرح "ایک آرزو" کے متعلق لکھتے ہیں:

ایک آرزو اقبال کی ایک معمولی سی نظم ہے
گرچہ شاعری کے معیار عام سے ایک اعلیٰ
نمونہ فن ہے۔ صفحہ ۳۹۔

اگر شاعری کے معیار عام سے اعلیٰ نمونہ فن ہے تو ایک آرزو معمولی سی نظم کیوں ہونے لگی۔؟ اصل یہ ہے کہ کلیم الدین احمد کی تنقید سے ایک آرزو کا معمولی سی نظم ہونا عبدالمغنی پر روشن ہو گیا ہے۔ لیکن وہ بزعم خود اسے اعلیٰ نمونہ فن کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے ایسی مذبذب باتیں ان کے قلم سے نپکتی ہیں۔ اگر شاعری کے معیار عام سے ایک آرزو کو اعلیٰ نمونہ فن کہنا تھا تو اسے معمولی سی نظم کہنے کی مطلق ضرورت نہیں تھی اور اپنی بات کو ثابت کرنا تھا مگر یہ کون کرنے جائے،

یوں تو کلیم الدین احمد کے مخالفوں میں سب سے زیادہ برہم گستاخ اور منکر کلیم عبدالمغنی ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن مضامین کلیم کی خوشہ چینی میں انہیں عار نہیں محسوس ہوئی، انہوں نے کلام اقبال کی تفہیم و تحسین کا جو راستہ اپنایا ہے وہ کلیم الدین احمد کا وہی "فرسودہ معیار" ہے پہلے اس معیار کی فرسودگی ملاحظہ فرمائیے:

شکسپیر نے کہا ہے کہ شاعری کا تخیل
GIVES TO AIRY NOTHINGS- A LOCAL HABITATION AND A NAME

جناب کلیم الدین احمد نے دانتے اور اقبال کا شاعر کی حیثیت سے موازنہ شکسپیر کے مذکورہ بالا بیان سے شروع کیا ہے گویا انہوں نے اس شاعرانہ بیان کو شاعری کا اصل نظریہ اور معیار بنا کر پیش کیا ہے .... شکسپیر کے شعر اور جناب کلیم الدین احمد کی تنقید دونوں میں شاعری کا جو تصور پیش کیا گیا ہے کیا کوئی بھی انسان میں اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے اسے شاعری کی تعریف قرار دے سکتا ہے۔ کیا یہ کہ اسے شاعری کا معیار بنائے، شاعر نہ ہوا، مصور ہو گیا۔ لاشئے محض کو نام اور مقام کیسے دیا جاتا ہے اور کون دیتا ہے یا دے سکتا ہے۔ شکسپیر نے کہا اور کلیم الدین احمد نے مان لیا۔ آمنّا و صدّقنا صفحہ ۴۵

اور اب یہ جملے پڑھئے:

ظاہر ہے کہ سروش کی طرح زردان کی تصویر بھی ہوائی لاشئے (AIRY NOTHI-NGS) تو ایک جسم و مکان اور نام (A LOCAL HABITATIOR AND A NAME) دیتی ہے جبکہ دانتے کی تقابلی تصویر میں صرف معلوم و مجسم افراد کے نقشے پیش کرتی ہیں۔ اس لئے خود جناب کلیم الدین احمد کے نظریہ ادب و شعر کے مطابق حسب ذیل جملے دانتے سے زیادہ اقبال کے کمالات پر صادق آئیں گے۔

دانتے کا تصور اس کی خیالی دنیا سے ایسی صاف
واضح اور ٹھوس تصویر کھینچتا ہے کہ اس کا
ایک ایک گوشہ منور ہو جاتا ہے صاف بات
یہ ہے کہ دانتے کی دنیا اتنی خیالی نہیں جتنی
اقبال کی ہے۔ غور کیجئے کہ اقبال نہ صرف جبرئیل
امین ملک وقت کو ایک شکل اور مجسم کردار
عطا کرتے ہیں۔ جبکہ دانتے صرف مجسم شخصیتوں
کے خاکے کھینچتا ہے۔ وہ محسوس کو محسوس کراتا
ہے۔ اور اقبال غیر محسوس کو محسوس، اس سلسلے
میں جہاں تک فکر و تخیل کا سوال ہے۔ اقبال
کی ہر مقام پر برتری حاصل ہوتی ہے۔ صفحہ ۱۰۲

اس صفحے تک آتے آتے شاید عبدالمغنی اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہے۔ کیونکہ آپ نے دیکھا کہ انہوں نے شکسپیر کے اسی قول کو شاعری کا معیار بنایا ہے۔ اگر وہ قول محض شاعرانہ بیان تھا اور شاعری کا ناقص تصور تو اقبال کے لئے وجہ تحسین کیسے بن سکتا ہے۔ "جاوید نامہ" کے بعض حصوں میں اسے مصدق کر کے عبدالمغنی نے اپنی تنقیدی بصیرت کو فاش کیا ہے یا اقبال شناسی کی ہے؟ ظاہر ہے کہ مبصر کا ذہن صاف نہیں وہ کہتے ہیں کہ شکسپیر نے جو کچھ کہا اس کا اشارہ درحقیقت شعری ڈرامے کی طرف ہے جسے انگریزی تنقید میں VIRSE DRAMA یا منظوم تمثیل کہا جاتا ہے۔ تاکہ منثور یا نثری ڈرامے PRASE DRAMA سے ممیز کیا جا سکے، کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ جاوید نامہ اور طربیہ خداوندی منظوم ہیں یا منثور، شکسپیر نے ڈراما کے متعلق یہ بات کہی ہے اور عبدالمغنی خود اقرار کرتے ہیں۔ کہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں۔ یہ واقعی تمثیل ہے اور حقیقتہً اس صنف ادب میں فن کار کا تخیل، وہ شکسپیر کی طرح شاعر ہو یا برنارڈ شاہ کی طرح نثار، پیکر تراشی اور مجسمہ سازی اور مصوری کرتا ہے ایک خیالی نقطے میں رنگ بھر کر اسے ایک محسوس شکل اختیار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شکل دنیا اور سماج کی چلتی پھرتی صورتوں کی مانند صاف واضح اور ٹھوس نظر آتی ہے۔ کیا عبدالمغنی کی خواہش یہ ہے کہ ع

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی،

عقل حیران ہے کہ ابھی تو شکسپیر کا قول محض شاعرانہ بیان تھا اور اس نے صرف شعری ڈرامے کی طرف اشارہ کیا تھا تاکہ نثری ڈرامے سے اسے الگ کیا جا سکے۔ اور اب شعری اور نثری دونوں ڈراموں کے لئے ان جملوں میں اس کا جواز! سچ ہے ع

ہے آدمی بجائے خود ایک محشر خیال

اور محشر خیالی ہے تو غور و فکر اور نظم و ضبط کی عدم موجودگی میں انتشار خیال لازمی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ کلیم الدین احمد شاعری میں خیالات کے ربط و تسلسل پر بار بار زور دیتے ہیں۔ اقبال کی نظم ساقی نامہ کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا:

خیالات میں ایسا بے ربط تسلسل ہے
کہ اکثر وہ VIRSE PARAGRAPH
لکھتے ہیں۔ اور جب تک یہ پیراگراف پورا
نہیں ہوتا بات پوری نہیں ہوتی۔
(اقبال ایک مطالعہ صفحہ ۲۰۶)

عبدالمغنی تبصرہ فرماتے ہیں:

شاعری اور اچھی شاعری کا معیار ان
(کلیم الدین احمد) کے نزدیک یہ ہے کہ
VIRSE PARAGRAPH کی
طرح ربط و تسلسل رکھتی ہو.......
لیکن کیا یہ اعلیٰ شاعری کا کوئی معیار ہے

(اقبال اور عالمی ادب صفحہ ۲۲۳)

اور صفحہ ۲۲۵ پر بھی پوچھتے ہیں :

......آخر نظم میں یہ ربط و تسلسل ہے
کیا جس پر اتنا زور دیا۔ اور شور مچایا جا
رہا ہے۔

یعنی عبدالمغنی کے خیال میں ربط و تسلسل شاعری کا کوئی معیار نہیں ہے۔ لیکن آپ "اقبال اور عالمی ادب" پڑھ جائیے، میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کو ضخیم کتاب پڑھنے میں خاصی زحمت اور الجھن ہوگی۔ مگر میری گذارش ہے کہ اسے پڑھئے، آپ یہ دیکھ کر متحیر ہو جائیں گے، کہ عبدالمغنی نے جتنی نظموں پر اظہار خیال کیا ہے۔ سبھوں میں خیال کا عضویاتی ارتقا اور گہرا ربط ثابت کیا ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں اور کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ بس اسی ایک خصوصیت کی بنا پر وہ نظموں کو بہترین فنی نمونہ تصور کر لیتے ہیں۔ مسجد قرطبہ کے متعلق ان کی قیمتی تنقید ملاحظہ کیجئے :

مسجد قرطبہ نہ صرف اقبال اور اردو کی بہترین
نظم ہے بلکہ دنیا کی بہترین نظم ہے....
یہ نظم اپنے نکتوں کی ترکیب اور نغموں کی
تنظیم کے لحاظ سے خیالات کے ربط و تسلسل
استعارات کی فراوانی، علامات و تلمیحات
کی معنی خیزی، اور ارتقائے خیال کی پیوستگی
نیز ہیئت کے مختلف حصوں اور تخیل کے
مختلف پہلوؤں کی ہم آہنگی کے اعتبار سے
بلا مبالغہ ایک نغمہ موسیقی ایک سمفنی
(SYMPHONY) ہے، شروع سے
آخر تک راگوں کا نظام کی طرح نظم کے تمام
اجزا نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ مربوط
بلکہ ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ اس
ہموار و ہم آہنگ قماش نغمہ کو ORCHESTRATION
کہئے یا ORGANIC
SYMMETRY کہئے۔ اگر
دنیا کی کسی نظم میں جسم انسانی کی طرح عضویاتی
پیوستگی ممکن ہے۔ تو اس کا بہترین اور عظیم
ترین نمونہ مسجد قرطبہ ہی ہے۔ صفحہ ۲۴۰

دیکھا! یہ ہے ربط و تسلسل کا کمال جس کے لئے کلیم الدین احمد اتنا شور مچاتے ہیں۔ اور یہ ہے عبدالمغنی کی تنقید جو ربط و تسلسل کی ہجو کرتے ہوئے بھی اس کی زنجیر میں جکڑی ہوتی ہے۔ اس اقتباس پر غور کیجئے، تو اندازہ ہوگا کہ ربط و تسلسل آسیب کی طرح عبدالمغنی پر چھا گیا ہے۔ کلیم الدین احمد مسجد قرطبہ میں ربط نہیں پاتے، تو عبدالمغنی کو ضد ہے کہ اس نظم میں ایسا ربط ثابت کریں، جو دنیا کی کسی دوسری نظم میں نہ ہو۔ یہ دراصل ردعمل ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ عبدالمغنی کی تنقید کلیم الدین احمد کی تنقید کا ردعمل ہے واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے خود کو ناقد کا اہل کلیم الدین احمد کی کتابیں پڑھ پڑھ کر بنایا ہے۔ لیکن چھوٹے ظرف میں اتنی بادہ نہیں آسکتی۔ کہ مے کش اترانے لگے۔ عبدالمغنی کلیم الدین احمد کی کتابوں سے تنقیدی سرمایہ لیتے ہیں۔ لیکن اعتراف و شکر گزاری کو ضروری نہیں سمجھتے، اور اعتراف کریں نہ کریں ان کی تنقید بہ ظاہر ردعمل ہے۔ تو بباطن پیروی کلیم، اور یہ ان کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ ان میں اپنی اپج اور جدت، اپنی نظر، اپنی فکر، اپنا تخیل، اپنا لہجہ ہی نہیں۔ نہ انہیں نقاد کا ذہن عطا ہوا ہے نہ ادیب کا قلم، اسی اقتباس میں خیال کا جھول دیکھئے، صفحہ ۲۲۵ پر انہوں نے یہ لکھا تھا :

کہا جاتا ہے کہ نظم کے اشعار میں عضویاتی
پیوستگی، اور ہم آہنگی ہونی چاہئے یعنی
اس درجہ کا تناسب اعضا جو احسن الخالقین
نے جسم انسانی کی تخلیق میں ظاہر کیا ہے۔

اگر ربط و تسلسل کا مفہوم یہ ہے تو صریحاً یہ
حدود فطرت سے تجاوز اور مظاہر حقیقت
کو نظر انداز کرنا ہے .... شکسپیر
ہو، دانتے ہو، گیٹے ہو، اقبال ہو، سب
شاعر و فنکار ہیں، انسان ہیں، احسن الخالقین
نہیں۔ اور ان کی حسین سے حسین مخلوق بھی
احسن تقویم نہیں ہو سکتی۔

احسن تقویم، سے مراد اس درجے کا تناسب اعضا ہے
احسن الخالقین نے جسم انسانی کی تخلیق میں ظاہر کیا ہے
اقبال کی نظم مسجد قرطبہ احسن تقویم نہیں ہو سکتی۔ لیکن
عبدالمغنی نے صفحہ ۲۲۵ کی اس انہونی بات کو صفحہ ۲۴۰ پر
ہونی ثابت کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

اگر دنیا کی کسی نظم میں جسم انسانی کی طرح
عضویاتی پیوستگی ممکن ہے تو اس کا بہترین
اور عظیم ترین نمونہ مسجد قرطبہ ہی ہے۔

اس جملے کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ اقبال ثانی احسن الخالقین
ہیں۔ عبدالمغنی خود سوچیں کہ یہ صریحاً احسن الخالقین کی ہمسری
ہے یا نہیں! ورنہ یہ بتائیں کہ صفحہ ۲۲۵ اور صفحہ ۲۴۰ کے
خیالوں میں وہ کس طرح تطبیق کریں گے۔
عبدالمغنی کہتے ہیں کہ:

شکسپیر، دانتے، اور گیٹے، کی بھی کوئی نظم
اگر مسجد قرطبہ کے ٹکر کی ہو تو جناب کلیم الدین
احمد پیش فرمائیں۔ اور تقابلی مطالعے کے لئے
مباحثہ کریں۔ اردو میں لکھیں یا انگریزی
میں تو سخن فہمی عالم بالا معلوم ہو جائے
صفحہ ۲۴۰،

کلیم الدین احمد نے تو تفصیلی تنقیدی جائزے سے ثابت کر دیا
کہ مسجد قرطبہ کوئی عظیم فنی کارنامہ نہیں ہے۔ اب تو توقع تھی جناب
عبدالمغنی سے تھی۔ انہیں تقابلی مطالعہ کے ذریعہ یہ بتانا تھا کہ ناقد
شاعری یہ ہے تو ہم اندازہ کر سکتے کہ واقعی لیلیٰ فہم و نقد عبد
المغنی پر فدا ہے انہوں نے اپنی کتاب کلیم الدین احمد کی، اقبال
ایک مطالعہ، کے جواب میں لکھی ہے اردو یا انگریزی میں لکھنا
تھا تو انہیں لکھنا تھا۔ تقابلی مطالعہ کے لئے مباحثہ کرنا تھا انہیں
کرنا تھا۔ لکھنے کو تو انہوں نے اردو میں ہی لکھا تاکہ زیادہ سے
زیادہ لوگ پڑھ سکیں۔ مگر کیا واسطہ تقابلی مطالعہ سے۔ انہوں نے
خبر کو گرم کر دی کہ ؏

غالب کے اڑیں گے پرزے

لیکن اس طویل و عریض میدان تحریر میں مقابلے کی کوئی صورت نظر
نہیں آتی۔ کتاب پڑھنے کے بعد آپ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے
بیشتر ابدل کر مقابل کو اشارے کر دیئے ہیں۔ کہ وار ہلکا کریں
ضرب کاری نہ لگائیں۔ یا اکثر ٹال گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ
۲۹۱ پر فرشتوں کا گیت، اور فرمان خدا سے بدرجہا بہتر
تخلیقات میں نظم جدائی کو شامل کرتے ہیں۔ مگر صرف نظم کی نقل
ہے کیا صرف نظم نقل کر دینے سے قارئین اسے بہتر تخلیق ہونے
کی تصدیق کر دیں گے۔ صفحہ ۲۷۴ پر لکھا ہے:

چنانچہ روح القدس کے اس ذوق جمال کی
تشریح و تمثیل کے لئے عرب و عجم کی تصویریں
حسن طبیعت اور سوز دروں کی ان ترکیبوں
کے ساتھ پیش کی گئیں، جن کی ندرت اور
معنویت پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

لیکن اس ندرت اور معنویت پر چند جملے بھی نہیں لکھ سکے۔
صفحہ ۲۸۴ پر لکھتے ہیں کہ:

اقبال کی شاعری میں فنی ارتقا اور ان کی
نظم نگاری کے تشکیلی امکانات پر بحث کیلئے
ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

لیکن ۵۸۶ صفحات کی اس کتاب میں قسم کھا لیا ہے کہ ایک

نہ لکھیں گے۔

کلیم الدین احمد نے "اقبال ایک مطالعہ" میں جن نظموں
ف کی ہے ان میں سے کسی کے متعلق عبدالمغنی کو اعتراض
نی وہ کلیم الدین احمد کی تحسین کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور اپنی
، بصیرت کی نمائش کے لئے متعدد دیگر نظموں کے نام
ات کی حیثیت سے لیتے ہیں لیکن کلیم الدین احمد کے
ہوئے رستے سے ہٹ کر اپنی الگ راہ نہیں نکالتے،
ورت میں سخن نہمی عالم بالا کا دعویٰ مہمل معلوم ہوتا ہے
و عات کی بحث میں کہیں کہیں انہوں نے زور قلم خوب
ہے۔ کلیم الدین احمد نے لکھا تھا:

۱) ایک حصے میں عقل و عشق میں تفریق کی
جاتی ہے ...... لیکن حقیقت یہ ہے
کہ عقل و عشق میں کچھ بیر نہیں۔ کوئی تضاد
نہیں، کوئی مخاصمت نہیں۔

(اقبال ایک مطالعہ صفحہ ۲۳۲)

۲) لطف یہ ہے کہ وہ اقبال پیغمبری کی باتیں
کرتے ہیں۔ اسلام کی باتیں کرتے ہیں۔ اسلام
کے نکتوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ سورۂ
اخلاص کی تفسیر لکھتے ہیں۔ اور پیغمبر
اسلام کی یہ HUMILITY نہیں
سیکھتے جنہوں نے کہا تھا "اَنَا بَشَرٌ
مِّثْلُکُمْ یُوْحیٰ اِلَیَّ اِنَّمَا اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ
وَّاحِدًا" صفحہ ۲۳۶

۳) اگر وہ کوئے دلبراں سے کام رکھتے، اگر
دل زار رکھتے، اور غم یار سے واقف ہوتے
اگر ان کی خاک غبار رہگذر ہوتی، اور
ان کی خاک میں دل بے اختیار ہوتا تو
وہ زیادہ اچھے شاعر ہوتے صفحہ ۲۳۶

ان اقتباسوں پر عبدالمغنی الگ الگ اپنی علمیت ظاہر کرتے ہیں

(۱) اقبال عقل و عشق کے درمیان ایسی کوئی
تفریق نہیں کرتے، جس کی تہمت لگائی گئی
ہے۔ وہ صرف عقل کے مقابلے میں عشق کو
اولیت دیتے ہیں۔ صفحہ ۲۶۴

پھر اقبال کے کئی اشعار جو عقل و عشق سے متعلق ہیں پیش کرتے
ہیں۔ لیکن یہ مشہور شعر شاید انہیں یاد نہ رہا ؎

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہے مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اب اسے آپ جو کہیے۔ بقول کلیم الدین "تفریق" یا بقول عبدالمغنی
"اولیت" یہ اولیت" دراصل "فوقیت" ہے ان سے لفظ
کے انتخاب میں سہو ہوا ہے۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں
کہ فوقیت میں عنصر تفریق شامل ہے۔ پھر عقل و عشق کی تفریق
کی اس سے بہتر مثال کیا ہوگی۔ جو اقبال نے پیش کی ہے۔
عقل کے لئے یہ مصلحت اندیش و ٹامن ہے اور عشق کے لئے
روگ، دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ یہاں قارئین کو بتا
دوں کہ ڈاکٹر عابد حسین کے مقالہ "عقل و عشق اقبال کی شاعری
میں" سے عبدالمغنی نے استفادہ کیا ہے۔ لیکن اشارہ تک نہیں
کیا۔

(۲) دوسرے نکتے کے جواب میں پہلے تو حسب عادت
کلیم الدین احمد کو نازاں، مغرور، متکبر، کہتے ہیں۔ اور اس طرح
یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایسا شخص خاکساری کا سبق دوسروں کو
کیا دے سکتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

مبلغ علم ملاحظہ ہو ایک تو قرآن کی آیت
کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرار
دے رہے ہیں۔ دوسرے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ نے یہ حکم دیا تھا

کہ وہ لوگوں کو بتا دیں کہ وہ بھی انہیں کی
طرح بشر ہیں۔ اور ان کی دعوت درحقیقت
ان کی نہیں خدا کی ہے۔ جو وحی کے ذریعہ
انہیں القا کی گئی ہے۔ اور وہ دعوت بھی
صرف یہ ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک اللہ
ہے۔ غور کیجئے کہ اس دعوت وحی اور اعلان
توحید کا خاکساری سے کیا تعلق ہے

صفحہ ۴۶۵

فسوس! مدرسے کی تعلیم کچھ کام نہ آئی، میں نہیں جانتا تھا کہ
عبدالمغنی آداب الوہیت سے اتنے بے بہرہ ہیں۔ کاش! انہیں
"فیضان نظر" اور "مکتب کرامت" سے رائی کے دانے کے برابر
بھی کچھ مل جاتا۔ کیا اس مرد مسلمان کو یہ بتانے کی ضرورت ہے
کہ کلام الٰہی اس کے بندوں تک بزبان رسول پہونچا ہے۔ وہ کلام
جو خود رسول کی ذات سے متعلق ہو اور بصیغہ واحد متکلم ادا
ہوا ہو اس کے متعلق ایسا کہنے میں کہ رسول اللہ نے کہا۔ کوئی
قباحت نہیں۔ ہجرت کی رات جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ
وسلم نے محاصرین کفار کو کنکریوں سے مارا تو خدا نے کہا۔ اے نبی
آپ نے نہیں مارا ہم نے مارا۔ یہاں بھی اعتراض کیجئے کہ یہ کیسا خدا
ہے جو فعل رسول کو فعل خدا کہتا ہے۔ اور اقبال نے کہا تھا

ع ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ،

یہاں بھی مبلغ علم پر اعتراض ہونا چاہئے کہ کہ دست مومن کو
"ید اللہ" کیوں کہا۔؟ انبیائے صادقین کے جو واقعات قرآن
مجید میں بیان ہوتے ہیں۔ وہ بھی تو قرآن کی آیتیں ہی ہیں۔
ان کا ذکر کیجئے گا تو کون سا پیرایہ اختیار کیجئے گا۔ کیا آپ یہ
سمجھتے ہیں کہ قل سے جو آیتیں شروع ہوتی ہیں وہی کلام الٰہی
ہیں۔ اور "قال" "قالوا" سے شروع ہونے والی آیتوں
کا دوسرا حکم ہے۔؟ حضرت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی
"تفہیم القرآن" کی کوئی جلد اٹھا کر دیکھئے کہ کوئی دوسری
تفسیر آپ کے پاس ہوتہ ہو۔ وہ تو ضرور ہو گی۔ اس میں آپ
کو آپ کے اعتراض کا شافی جواب مل جائے گا۔ تفصیلی مطالعے
کے لئے تفسیر "ابن کثیر" اور "سیرت حلبیہ" سے رجوع کیجئے۔
آپ کے پاس کوئی نہ ہو تو میں خدمت کرنے کو تیار ہوں۔
اب یہ دیکھئے کہ آیت زیر بحث کو جس طرح کلیم الدین
احمد نے بقول عبدالمغنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرار
دیا ہے بعینہ دوسرے حضرات نے بھی لکھا ہے یا نہیں۔
عبدالمغنی کی واقفیت کے لئے میں کہنا چاہتا ہوں آج سے
بہت پہلے ۱۹۳۷ء میں ماہنامہ "النجم" کے ایڈیٹر مولوی عبد
الشکور کاکوروی نے ۱۱ جون کے شمارے میں لکھا تھا:

> نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّمَا
> اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ .... میں
> تمہاری طرح ایک معمولی انسان ہوں۔
> اگر تم میں اور مجھ میں کچھ فرق ہے تو صرف
> اتنا کہ میں تمہارے پاس خدائے تعالیٰ کا
> پیام لایا ہوں۔

(بحوالہ المیزان، بمبئی، امام احمد رضا نمبر)

لیکن یہ اعتراض نہیں کیا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کیوں کہا، خدا نے فرمایا، کیوں نہ کہا۔ بلکہ اعتراض
اس آیت پاک کے مجہول ترجمے پر ہوئے جو صحیح تھے۔
آیت کریمہ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی
اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۵ قرآن مجید میں دو جگہ
آتی ہے۔ پہلے سورۂ کہف کے آخر میں (پارہ ۱۶) اور پھر
حٰم سجدہ کے شروع میں (پارہ ۲۴) ان سورتوں کے سبب
نزول، زمانہ نزول، کفار قریش کے انداز فکر اور اس آیت
پاک کے سیاق سباق پر غور کیجئے تو چشم فہم روشن ہو گی کہ
بشر کی کیا حقیقت ہے۔ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم کا خود کو مثل بشر کہنا خاکساری نہیں تو

لو کیا ہے۔ اس سلسلے میں شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی ،
اشرفی جیلانی رح کے الفاظ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو انہوں
نے حضرت ابن عباس کی روایت، امام رازی کی تفسیر کبیر،
تفسیر نیشاپوری، تفسیر خازن، تفسیر بغوی کے حوالے سے
رقم کئے ہیں:

(معترض نے) امام رازی کی تفسیر کبیر کی ایک
عبارت نقل کی ہے مگر اس منقولہ عبارت
کے اوپر متصلاً جو عبارت ہے اسے کاٹ
دیا ہے۔ (عربی متن) یعنی جب اللہ تعالیٰ
نے اپنے کلام کے کمال کو ظاہر فرمادیا تو
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ
تواضع کی شاہراہ پر چلیں۔ چنانچہ فرمایا کہ
فرمادو کہ میں آدمی ہونے میں تمہاری طرح
ہوں۔ مقالہ نگار (معترض) کو اس بددیانتی
کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ ظاہر
نہ ہو کہ یہ کلام سیدالمتواضعین کی زبان
سے بطور تواضع ادا کرایا گیا ہے حضرت
عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی
یہی روایت ہے۔ کہ یہ کلام تواضعاً ارشاد
فرمایا گیا ہے۔ تفسیر نیشاپوری میں بھی
ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان
سے بطور تواضع یہ کلام ادا کرایا گیا ہے
تفسیر خازن و تفسیر بغوی میں بھی حضرت
ابن عباس رضی کا قول منقول ہے۔

(بحوالہ ماہنامہ المیزان، بمبئی امام احمد رضا نمبر
۱۹۷۶ء صفحہ ۹۵)

مولانا اختر رضا خاں ازہری نے بھی یہی لکھا ہے کہ:
آیت کریمہ میں حضور سے فرمایا گیا کہ تم
تواضعاً فرمادو کہ میں تم جیسا ہوں۔
(ایضاً صفحہ ۱۳۹)

تواضع یا خاکساری کو اس آیت پاک کے مفہوم کا جز اس
پے علماء نے قرار دیا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی
ذات گرامی، روحانی اور جسمانی دونوں خصوصیتوں کے
لحاظ سے تمام دنیا کے انسانوں سے منفرد و ممتاز اور مخصوص
تھی۔ ہے اور رہے گی۔ بقول علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی،

علامہ زرقانی نے تو یہاں تک فرمادیا کہ
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے
کی تکمیل ہے کہ آدمی اس پر ایمان لائے
(عربی متن) یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد شریف کو اس
شان کا پیدا فرمایا کہ کوئی انسان آپ سے
پہلے اور آپ کے بعد نہ ہوا۔ صفحہ ۹۶

مگر حیف کہ عبدالمغنی نے اقبال کے لئے خاکساری ثابت کی
اور خلق مجسم کو خاکساری سے بے تعلق بتایا ـــــــ
دعوت وحی اور اور اعلان توحید کا خاکساری سے کیا
تعلق ہے؟ ـــــــ معاذاللہ! سچ ہے جسے
خدا توفیق دے۔ وہی حقیقت کو سمجھے۔ خاندان صادق
پور کا فرد تو اعتراف کرچکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
خود کو مثل بشر کہنا آپ کی خاکساری ہے۔ پر عبدالمغنی
اس صداقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

(۳) تیسرے نکتے کے جواب عبدالمغنی کئی اشعار کو
پیش کرکے ثابت کرتے کہ اقبال دل زار اور دل بے
اختیار رکھتے تھے، وہ پوچھتے ہیں کہ کیا اشعار ہمارے
مغربی نقاد کی نظر گزرے ہیں۔ پھر آخر میں لکھتے ہیں:
بلاشبہ اقبال کا عشق ہوس نہیں، ان

کی محبت لذت کے لئے نہیں ہے اور وہ
نہ تو کوئے بتاں میں۔ آوارگی کو پسند کرتے
ہیں اور نہ کسی کے کوچے سے بے آبرو ہو کر
نکلنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ صفحہ ۴۶۸

یعنی اقبال کے یہاں مجنوں گری نہیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ کلیم الدین احمد کا خیال صحیح ہے کہ اقبال کوئے دلبراں سے کام نہیں رکھتے پھر اعتراض کی گنجائش کہاں؟ لیکن اعتراض ضروری ہے اور اعتراض ہے تو اس طرح کا۔ کہ کلیم الدین احمد نے کہا کہ اقبال دل بے اختیار نہیں رکھتے۔ تو عبدالمغنی کہتے ہیں کہ اقبال دل بے اختیار رکھتے تھے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ "ان کی محبت لذت کے لئے نہیں"۔ جناب! محبت ہوس سے پاک ہو سکتی ہے لذت سے خالی نہیں ہوتی۔ کیونکہ محبت میں جان کھپتی ہے۔ اور لذت سے خالی جانوں کا کھپا جانا ——

یا تو حیات اقبال کے گوشے گوشے ریشے ریشے سے عبدالمغنی نہیں، یا ستاری کرتے ہیں۔ جو بجائے خود کار ثواب ہے لیکن ناقد کے لئے فعل مستحسن نہیں۔ ممکن ہے اقبال نے اس قسم کا خیال ظاہر نہ کیا ہو ع

بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

لیکن حیات اقبال میں ایک وقت ایسا بھی آیا ہے۔ جب وہ اس طرح کے شعر کہنے پر مجبور رہتے ہے

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے! کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

کیا یہ اشعار فاضل مبصر کو یاد نہ رہے؟

اس ضخیم تبصرے کو پڑھنے سے معلوم ہوا کہ صاحب تبصرہ محقق بھی ہیں۔ نمونہ تحقیق یہ ہے:

سب سے پہلے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ شارح
جاوید نامہ کون ہیں جن کا اقتباس کلیم الدین
احمد نے اپنی مزعومہ اقبال شکنی کی تائید
میں دیا ہے۔ پھر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ یہ
اقتباس کس کتاب کا ہے اور کتاب میں کس
مقام پر ہے۔ "اقبال ایک مطالعہ" ان
سوالوں کے جواب میں کسی حوالے سے بالکل
خالی ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ تنقیدی مطالعہ
ہے بلا تحقیق، لہذا ایسی خالص تخیلی تاثراتی
قسم کے مطالعہ میں تحقیق کے اصول و ضوابط
کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اور نہ ضروری سمجھا گیا
بہر حال تحقیق و تجسس سے دریافت ہوتا
ہے کہ یہ اقتباس جناب یوسف سلیم چشتی کی
شرح جاوید نامہ (مطبوعہ لاہور آرٹ پریس
اکتوبر ۱۹۵۶ء) صفحہ ۸۰ پر واقع ہے۔
صفحہ نمبر ۱۶۷

دیکھئے تو! کیسی بے نظیر تحقیق ہے کلیم الدین احمد کتاب میں کیا لکھتے ہیں کہیں حوالے ہی نہیں دیتے، عدیم الفرصت عبدالمغنی کو اپنا کتنا قیمتی وقت برباد کرنا پڑا ہوگا۔ تب یہ دریافت ہوا کہ مذکورہ جملے شرح جاوید نامہ کے صفحہ ۸۰ پر ہیں ——

حیرت ہے سامنے کی بات کو تحقیق و تجسس کا نام دے رہے ہیں۔ اس بندہ خدا کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کلیم الدین احمد نے جب "شارح جاوید نامہ" کہہ دیا تو یوسف سلیم چشتی کے علاوہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ کلام اقبال کے شارح صرف دو ہیں۔ یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر، جاوید نامہ کی شرح یوسف صاحب نے لکھی ہے۔ کلیم الدین احمد نے ان کا نام نہیں لیا۔ تو عبدالمغنی نے مسئلہ تحقیق کو اتنا سنگین بنا کر پیش کیا جس سے اندازہ ہو سکے کہ وہ زبردست ذوق جستجو رکھتے ہیں۔ لیکن اس معلم تحقیق کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ کلیم الدین احمد نے جاوید نامہ کا جو منظوم ترجمہ دیا ہے۔ وہ کس کا ہے (ملاحظہ ہو، اقبال اور عالمی ادب کے صفحہ ۱۳۳ کے آخری سطر) راقم الحروف نے اپنے مقالہ تنقید

ردہ گیری" میں اس کی نشاندہی کر دی ہے۔ عبدالمغنی اپنی
ت تحقیق سے اس مقالے کا پتہ لگائیں، دیگر قارئین کی
دلت کے لئے عرض ہے کہ وہ مقالہ ہفتہ وار ہماری زبان
ے کے شمارہ ۸ رجون ۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔

عبدالمغنی کو کلیم الدین احمد سے ہماری شکایت ہے
نی الذکر نے تحقیق کے اصول و ضوابط کو" اقبال ایک مطالعہ"
لحوظ نہیں رکھا۔ میں عبدالمغنی سے گزارش کرنا چاہتا ہوں
راہ کرم وہ یہ بتائیں کہ تنقید کے اصول و ضوابط کیا ہیں۔ اور
ق کے کیا۔ نیز دونوں ایک دوسرے سے کتنی بے نیاز ہیں
آپس میں کتنی محتاج۔ تنقید کو تو چھوڑیئے کہ خود تحقیق کا یہ
ل انہیں معلوم ہے؟ کہ بعض باتوں کے لئے حوالوں کی مطلق ضرورت
یں ہوتی۔ جو باتیں سامنے کی ہیں، معروف اور متفقہ اور مصدقہ
، ان کے لئے حوالہ قطعی غیر ضروری ہے۔ مثلاً بقول قاضی
الودود کوئی یہ پوچھے کہ شاد کا اصل نام کیا تھا اور وہ کہاں
رہنے والے تھے۔ تو سید علی محمد اور عظیم آباد کہنے کے لئے حوالے
ار نہیں ہوں گے۔ البتہ نام میں کسی کو اختلاف ہے یا وطن کے
ئی لوگ متفق نہیں ہیں۔ یا ان کو کئی ناموں سے یاد اور کئی جگہوں
منسوب کیا گیا ہے۔ تو حوالہ دینا ضروری ہوگا۔ یہی حال شرح
یذیا نہ کا ہے۔ کیا عبدالمغنی بتا سکتے ہیں کہ اردو میں جاوید نامہ
نی شرحیں لکھی گئیں۔ اور شارحین کے نام اور پتے کیا ہیں،
کیا کسی خاص شرح کے متعلق یہ اختلاف ہے کہ فلاں کی نہیں،
ں کی ہے۔ کاش وہ تحقیق کا نام لینے سے پہلے اس کے مفہوم
کچھ موٹے اصول کو جان لیتے۔

عبدالمغنی فخریہ کہتے ہیں،

اقبال کی عظیم الشان شاعری آفاقی شاعری
کا موضوع سالہا سال میرے زیر مطالعہ رہا
ہے۔ صفحہ ج

ان کی کتاب غماز ہے کہ ان کا مطالعہ انہیں صحیح سمت نہ دے
سکا۔ نقص مطالعہ نے انہیں بھٹکایا ہے اور غلط نتائج مرتب کرائے
ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۸۹ پر لکھتے ہیں:

یہ بات سرے سے حقیقت کے خلاف اور
محض لغو ہے کہ اقبال اپنی شاعری کے کسی بھی
دور میں وطن کے پجاری تھے۔ اور بعد میں وطن
کے مخالف ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ وطن
دوست ہمیشہ رہے شروع سے آخر تک، اور
وطن پرست کبھی نہ رہے فرق صرف اتنا ہے
کہ وقت گزرنے کے ساتھ فطری طور پر ان
کی ذہن کی وسعتیں بڑھتی گئیں۔ اور وہ روز
بروز زیادہ سے زیادہ آفاقیت کی طرف
مائل ہوتے گئے، لیکن وطن کی محبت اور اہمیت
نہ دل سے ان کے گئی اور دماغ میں کم ہوئی

کسی بھی دور میں وطن کے پجاری نہ تھے تو یہ کیا ہے ع

خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس سوال سے قطع نظر اس اقتباس کا جائزہ لیجئے، ——
پہلے جملے میں دو جز ہیں۔

(۱) "شاعری کے کسی بھی دور میں وطن کے پجاری تھے"
(۲) "بعد میں وطن کے مخالف ہو گئے"

تو کون سی بات حقیقت کے خلاف محض لغو ہے؟ پہلی یا دوسری
یا دونوں؟ آگے تشریح ہے کہ وطن دوست ہمیشہ رہے
وطن پرست کبھی نہ رہے معلوم ہوا کہ پہلی دو باتوں میں کوئی
بات صحیح نہیں۔ اور یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ:

خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے،

کون کہہ سکتا ہے؟ وطن دوست یا وطن پرست،؟ پھر کہتے
ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ اقبال کی ذہن کی وسعتیں بڑھتی
گئیں، اور وہ آفاقیت کی طرف مائل ہوتے گئے۔ تو آفاقیت
کی طرف مائل ہونے سے وطن دوستی مجروح ہوئی، یا وطن پرستی؟

وہ کہتے ہیں کہ وطن کی محبت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہاں
چالاکی دیکھئے نہ وطن پرست کہا نہ وطن دوست، بلکہ وطن کی
محبت و اہمیت کے الفاظ استعمال کئے، اب ان الفاظ کا جلوہ
وطن پرستی اور وطن دوستی دونوں کے اصنام میں ڈھونڈ سکتے ہیں
"وطن کی محبت اور اہمیت نہ ان کے دل سے گئی اور نہ دماغ میں
کم ہوئی"۔ سے وطن پرستی کی طرف اشارہ نہ سمجھا جائے، لازمی
نہیں۔ اور اگر یہ مطلب لیا جائے کہ میسر اقبال کی وطن دوستی
کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جس میں کبھی کمی نہ آئی تو یہ [illegible]
[illegible] ممکن نہیں۔ یہ کہے کہ فلاں شخص اپنی پہلی بیوی سے
بہت محبت کرتا تھا۔ پھر اس کے رہتے ہوئے اس نے دوسری
شادی کر لی، اور اس کی طرف مائل ہوتا گیا۔ اور پھر یہ بھی کہے
کہ پہلی بیوی کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی، تو لوگ زید کو جھوٹا
سمجھیں گے دوسری بیوی کی طرف زیادہ مائل ہونے کا اعتراف
ہی اس امر کی شہادت ہے کہ پہلی بیوی کی محبت میں کمی
واقع ہوئی، لیکن زید صرف تھوپ تھاپ سے کام لیتا ہے
اور مغالطہ پھیلاتا ہے یہی حال عبدالمغنی کی اس عبارت کا ہے
اسے مافی الضمیر کی ناکام وضاحت اور ژولیدہ بیانی کی عمدہ
مثال کہہ سکتے ہیں۔

اب اس اقتباس کی روشنی میں حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ
مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خیال ملاحظہ فرمائیے۔ یہ صاف،
واضح اور مستحکم ہے۔ اقبال کے ساتھ بیشتر انصاف برتا گیا ہے
اس لئے میں مولانا کے خیال کو ان ہی کے الفاظ میں پیش کرنا
چاہتا ہوں۔ دوسرے عبدالمغنی صرف یہ سمجھتے ہیں کہ مطالعہ وہی
کرتے ہیں۔ اور باقی لوگ گھاس کاٹتے ہیں۔ تو وطن دوستی
سے متعلق اقبال کی جو مجمل اور بگڑی ہوئی تصویر انہوں نے جو پیش
[illegible] اس کی تکمیل اور آرائش ضروری ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مولانا
کا یہ خیال مطبوعہ شکل میں عبدالمغنی کی نظر سے گزرا، یا انہوں نے
[illegible] سے کام لیا ہے۔ بہرکیف مولانا فرماتے ہیں:

"........ علامہ اقبال نے جو عظیم کارنامہ
انجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں وطنی قومیت
اور قوم پرستی پر ایک شدید ضرب لگائی،
اقبال نے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا
کہ قومیت وطن اور زبان سے نہیں بنتی ہے
بلکہ قومیت دین اور عقیدے سے بنتی ہے
اس نے مسلمانوں میں اس شعور کو بیدار کیا
کہ تم ایک عقیدہ اور ایک تہذیب رکھنے والی
قوم ہو۔ تمہاری قومیت ان لوگوں سے
بالکل مختلف ہے جن کی تہذیب، عقیدہ
اور مسلک تم سے الگ ہے۔ اس کے
ساتھ اقبال نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس
بھی ابھارا کہ تمام دنیا میں ملت اسلامیہ ایک
وحدت ہے۔ اور اس کو ایک وحدت ہونا
چاہئے، اس طرح انہوں نے بیک وقت
دو کام کئے .... ایک طرف تو اقبال
نے دنیا کے مسلمانوں کو اس بات کی دعوت
دی کہ تم ایک ملت واحدہ ہو، اور جس قوم
پرستی میں تم مبتلا ہو یہ ایک بالکل غلط اور مہلک
تصور ہے۔ اور دوسری طرف انہوں نے
ہندی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ تم
مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک قوم اور
ایک ملت ہو۔ تمہارا کسی دوسری قوم میں
جذب ہونا سراسر ایک باطل نظریہ ہے۔
اگر اقبال نے بروقت یہ اقدام نہ کئے ہوتا
...... تو اس پاکستان کا کہیں وجود نہ ہوتا
.... آج اگر ہندوستان میں مسلمان
ایک قوم کی حیثیت سے اپنے تہذیبی وجود

پر اصرار کر رہے ہیں۔ تو وہ بھی اسی تعلیم کی وجہ
سے کر رہے ہیں۔ جو اقبال نے اس وقت
دی تھی۔ اور یہ پاکستان بھی اسی تعلیم کی وجہ
سے معرض وجود میں آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال نے
واضح طور پر یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کو ایک وطن
صرف اس لئے چاہئے کہ وہ وہاں اسلام کے
اصولوں پر زندگی بسر کر سکیں۔ ان کی ۱۹۳۰ء
کی تقریر سے جس میں انہوں پاکستان کی اصطلاح
استعمال کئے بغیر پاکستان کا تخیل پیش کیا تھا
یہ بات صاف ہوتی ہے کہ ان کی نظر میں
اگر کوئی چیز اہم تھی۔ تو صرف یہ کہ کس طرح اسلام
اور اہل اسلام کی سربلندی نصیب ہو۔

ان جملوں سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بعد میں اقبال کے نزدیک
وطن دوستی بھی مسلمانوں کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی کیونکہ
وہ صرف ملت اسلامیہ اور ملت واحدہ کا تصور پیش کرنے لگے
۔ ان جملوں کے پیش نظر عبدالمغنی کا یہ خیال غلط معلوم ہوتا ہے
"اقبال وطن دوست ہمیشہ رہے شروع سے آخر تک"
یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ عبدالمغنی نے وطن دوست معنی
ہندوستان دوست استعمال کیا ہے۔ جبکہ اقبال آخر ہندوستان
دوست بھی نہ رہے۔ مولانا مودودی کے ان جملوں سے جیسا کہ
مترشح ہے:

> وہ (اقبال) یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان
> میں ہندوؤں کے ساتھ رہ کر مسلمان اپنی
> تہذیب پر قائم نہیں رہ سکتے۔ اس لئے انہوں
> نے صرف مسلمانوں کی تہذیب کو زندہ رکھنے
> کیلئے ایک الگ اور آزاد مملکت کے حصول
> کا تصور پیش کیا۔

انہوں نے ۲۰ [illegible] ۱۹۶ء کو یوم اقبال کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی
لاہور میں یہ خطبہ دیا تھا۔ اسے چند دوسرے مقالوں کے ساتھ
مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی نے جنوری ۱۹۷۹ء میں "اقبالیات" کے
نام سے ایک کتابچہ شائع کر دیا ہے۔ یہاں چند ضروری جملے
لکھے گئے تفصیل کے لئے اقبالیات ملاحظہ ہو۔ یہ جملے مرتجا عبدالمغنی
کے مطالعہ فاش کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے مطالعہ پر نازاں ہیں
تو آپ کیا کریں گے۔

ایک اور مثال سے ان کے مطالعہ اقبال کا حال کھلے گا
فرماتے ہیں:

> ابھی جو انہوں نے (کلیم الدین احمد نے) "فرشتوں
> کا گیت" اور "فرمان خدا" (فرشتوں سے) کا
> تجزیہ کیا ہے۔ اس میں اس حقیقت کو پس
> پشت ڈال دیا ہے۔ کہ یہ بالکل علاحدہ،
> علاحدہ نظمیں نہیں ہیں۔ بلکہ تمثیلی انداز
> میں ایک مرکب کے دو اجزا ہیں۔ دونوں
> نظمیں متعلقہ مجموعے میں مذکورہ عنوانات
> کے ساتھ ایک ہی جگہ یکے بعد دیگرے
> ترتیب وار درج ہیں۔ اور صاف معلوم
> ہوتا ہے کہ "فرشتوں کا گیت" کے جواب
> میں "فرمان خدا" (فرشتوں سے) ہوتا
> (کہنا) ہے۔ جس سے ایک تمثیلی ہیولیٰ
> ابھرتا ہے۔ مگر ہمارے مغربی نقاد کا دھیان
> بھی اس ہیولے کی طرف نہیں جاتا اور وہ
> مرکب کی دونوں اجزا کو الگ الگ نظموں
> کی طرح زیر بحث لاتے ہیں۔ صفحہ ۳۴۴

اگر دو نظموں کا ایک جگہ ترتیب وار ہونا ہی ان کے مسلسل ہونے
یا ایک مرکب کے دو اجزا ہونے کی دلیل ہے تو میں گواہی دیتا
ہوں کہ عبدالمغنی نقاد رہتے ہیں۔ لیکن اس کا امکان قطعی نہیں
ہے کہ اقبال نے ان نظموں کو ایک مرکب کے دو اجزا سمجھ کر

ایک جگہ لکھا ہو۔ ان نظموں کو سامنے رکھیے۔ یہ ہے فرشتوں کا گیت

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گر ازل تیرا نقش ہے ناتمام ابھی
خلق خدا کی گھات میں اندر فقیہہ میرا پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین، علم و دین، بندگی ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز، پردگئی نیام ابھی

اور یہ فرمان خدا ہے:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
[illegible] جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

ان نظموں میں کوئی جہت آپ کو نظر آتی ہے؟ دونوں
بالکل دو طرح کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کا ایک دوسر
سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ ایسے متن ہیں کہ حاجت تشریح
عبدالمغنی کا نکتہ قبول کیا جائے تو سوال دیگر، جواب دیگ
الزام اقبال پر عائد ہوتا ہے کہ فرشتے کچھ کہیں اور خدا کچھ ا
جواب دے، پھر یہ بھی غور کیجیے کہ فرمان خدا نظم اول کا
تو اقبال فرشتوں کی جانب سے گیت نہ گاتے، ان کی فریا
اور فرمان خدا کے بعد چند اشعار میں تعمیل فرمان پر روشنی
اور اس طرح یہ مرکب دو اجزا پر نہیں۔ تین اجزا پر مشتمل
اصل یہ ہے کہ اس ظاہر بیں آنکھ کو ا
فرشتوں کی وجہ سے ہوا ہے دونوں نظموں کے عنوانا
فرشتوں کو موجود پایا تو سمجھ گئے کہ یہ ایک مرکب کے د
ہیں۔ اور معنی و مفہوم پر غور کرنے کی مطلق ضرورت نہ سمجھ

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ،

لاگ کو لگاؤ سمجھ بیٹھے لیکن یہ نہ سوچا کہ دھکا کھانا ہے۔

ایک مثال اور ملاحظہ کیجیے۔ بس ایک مثال
مسجد قرطبہ پر تنقید کرتے ہوئے کلیم الدین احمد نے "اق
مطالعہ" کے صفحہ ۱۹۰ پر لکھا تھا:

بہر کیف اگر صرف یہی کہنا تھا کہ تمام معجزہ
ہائے ہنر فانی ہے اور کار جہاں بے ثبات
ہے یعنی کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ تو یہ
کوئی نئی بات نہیں۔ پھر خیالات کی رو میں
یہ کہہ کر "اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا"
انہوں نے زبردست مغالطہ کھایا ہے۔ وہ
بھول گئے کہ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ
وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔

عبدالمغنی اس اقتباس پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔ جو
اول یہ ہے:

اول تو ہر پرانی بات غیر اہم نہیں ہوتی۔ دوسرے
اہمیت بات کی نہیں، چاہے وہ نئی ہو
یا پرانی، بلکہ اس برتاؤ کی ہے جو شاعر اس
بات کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ تنقیدی نکتہ یقیناً
ناقد موصوف کو بھی معلوم ہوگا۔ صفحہ ۲۴۸

ناقد موصوف یعنی کلیم الدین احمد کو کہاں معلوم، البتہ علامہ دہر
یعنی عبدالمغنی کے بتانے سے اب معلوم ہوگیا ہوگا۔ لیکن اس علامہ
سے آپ پوچھئے کہ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ کے ساتھ اقبال نے
وہ کون سا انوکھا جدید اور معنی خیز برتاؤ کیا ہے۔ تو وہ کچھ نہ
بتائیں گے۔ بات بنا کر آگے بڑھ جائیں گے۔ کلیم الدین احمد نے
لکھ دیا کہ اقبال و آخر باطن و ظاہر فنا کہہ کر مغالطہ کھا گئے ہیں
تو ہمارے نقاد اعظم فرماتے ہیں کہ کلیم الدین احمد اقبال جیسے نابغۂ
عصر اور علامہ وقت پر بالکل اسی سادگی سے منہ آتے ہیں جیسے
شوخ و شریر بچے بزرگوں کی ڈاڑھی سے کھیلتے ہیں" صفحہ ۲۴۹
اتفاق سے اقبال داڑھی نہیں رکھتے تھے، البتہ ہمارے نقاد اکبر
کا روئے مبارک اس سے مزین ہے۔ نیم شرعی ہی سہی۔ ممکن ہے
کلیم الدین احمد کو تنبیہہ کرنے کا منشا تحت الشعور میں یہ ہو کہ وہ
ذرا اس مرد بزرگ کی تو تعظیم کریں۔ کیونکہ یہ علم و آگہی اور عقل
و عشق میں بلند مقام ہیں۔ اب رہی بات خوردی بزرگی کی تو
بزرگی بعقل است نہ بسال،

خیر، اقبال کے تصور زماں پر اپنے مطالعے کا عطر پیش
کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ اول
و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا۔ وہی شخص کہہ سکتا
ہے جو ہوالاول، والآخر، والظاہر
والباطن سے بھی واقف ہو۔ اب اس نکتے
کو سمجھنے میں کیوں مغالطہ ہو کہ دنیا کے اول
و آخر اور باطن و ظاہر کو فنا اسی لئے ہے کہ

دراصل خالق دنیا ہی اول و آخر باطن
و ظاہر ہے لہٰذا اس کے سوا سب فانی
ہے اور وہی باقی ہے۔ صفحہ ۲۴۹

سورہ رحمٰن میں جہاں پر کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ اس سے
متصل یہ آیت کریمہ بھی ہے۔ وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو
الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝ مسجد قرطبہ میں جہاں پر یہ کہا
گیا ہے کہ

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

تو اس کے ساتھ یہ تو نہیں کہا گیا کہ بقا صرف اللہ کو ہے۔
بلاشبہ اقبال اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے،
لیکن مسجد قرطبہ کے سیاق و سباق میں وہ ایک دوسری
ہی بات کہہ گئے ہیں یعنی ہر نقش کو فنا ہے مگر جس نقش کو کسی
مرد خدا نے بنایا ہے اسے فنا نہیں۔
اب توجہ طلب یہ نکتہ ہے کہ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ
وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ خاص خدا کی صفت ہے۔ ہوالاول
...... کہہ کر ہم ماسوا اللہ مراد ہرگز نہیں لے سکتے۔ قرآن مجید
میں سورہ الحدید (پارہ ۲۷ کی) ابتدائی آیتیں یہ ہیں:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج
وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ج
وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ هُوَ الْاَوَّلُ
وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج وَ
هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

یہ تینوں آیتیں اور آگے کی چند آیتیں بھی خدا کی حمد و تسبیح
ہیں۔ "ھو" کا اشارہ ہر جگہ صرف خدا کی طرف ہے۔ جب اول
و آخر اور ظاہر و باطن صرف خدا ہی ہے اور جیسا کہ عبدالمغنی
بھی اعتراف کرتے ہیں کہ خالق دنیا ہی اول و آخر اور ظاہر

و باطن کہنے کا کیا جواز ڈھونڈا جائے ،
اقبال نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی
اول و آخر الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ع
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر،
لیکن یہ نبوت اور رسالت کی حیثیت سے ہے اور آپ کی نبوت
و رسالت کو فنا نہیں۔ اس لئے کہ کلمہ طیب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول
اللہ، میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ نبوت ختم ہو گئی لیکن نبوت
کو بقا ہے۔ نگاہ عشق و مستی سے تصوف کی ایک خاص راہ مراد
لی جائے جس پر چلنے والے صوفی حضرات حبیب خدا کو خدا
کہتے ہیں۔ تو یہ اقبال کا مسلک نہ تھا۔

اب ایک ہی راستہ بچ جاتا ہے یہ کہا جائے کہ اقبال
نے اس مصرع میں صرف یہ مفہوم ادا کیا ہے کہ دنیا کے اول و آخر
اور ظاہر و باطن کو فنا ہے جیسا کہ عبدالمغنی کہتے ہیں۔ تو پھر نقش
کہن ہو کہ نو سارے کے سارے نقوش اور وہ مرد خدا کے ہاتھوں
انجام پائے ہوں یا کافر دین یا مغضوبین و ضالین کے ہاتھوں
سبھوں کی منزل آخر فنا ہے۔ اور باقی رہنے والی ذات صرف
خالق دنیا ہے اس صورت میں یہ شعر اسلامی عقیدے پر مبنی نہیں
معلوم ہوتا ہے

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

بات دراصل یہ ہے کہ اقبال سے لغزش خیال ہو گئی ہے۔ کہنا
وہ یہی چاہتے ہیں کہ "دنیا کے اول و آخر باطن و ظاہر کو فنا"
ہے لیکن متلاطم خیالات کے OVER FLOW نے
انہیں سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ کہ اول، آخر، باطن، ظاہر
کا اتصال قاری کے ذہن کو کھینچ کر قرآن تک لے جائے گا۔
بالخصوص اس حالت میں کہ اقبال نے قرآنی تعلیمات پیش کی
ہیں۔ تو قاری کلام اقبال اور قرآن میں ایک ٹکراؤ محسوس کریگا
اس مصرع کو آیت کریمہ کی روشنی میں نہ دیکھا جائے تو بات
یوں مبنی ہے کہ از اول تا آخر دنیا کی ہر ظاہر و مخفی شئے کو
فنا ہے۔ ایسی صورت میں اگلے شعر کا وجود ہمیں الجھاتا ہے
جس کی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ لیکن یہ کہنا مشکل
ہے کہ اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا، کہنے کے وقت اقبال کے
ذہن میں آیت کریمہ نہ رہی ہو گی۔ اگر نہیں رہی ہو گی تو کلیم
الدین احمد کا کہنا صحیح ہے کہ وہ بھول گئے "ھوالاول والآخر
والظاہر والباطن" اور اگر رہی ہو گی تو میں عرض کر سکتا ہوں
کہ انہیں اپنے خیال و علم کو ذرا سنبھالنا تھا

اب میں عبدالمغنی سے دو معمولی باتیں واقفیت کیلئے
پوچھنا چاہتا ہوں۔ مصرع پڑھئے ع

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا

پہلی بات یہ ہے کہ لفظ "باطن" جو آیت کریمہ میں ترتیب کے
لحاظ سے آخر میں آیا ہے۔ یہاں آخر میں کیوں نہیں؟ اقبال
نے اپنی ترتیب دانستہ قائم کی ہے یا نادانستہ طور پر ایسا ہوا
ہے۔ اگر آیت والی اصل ترتیب ہوتی تو مصرع میں کیا فرق
پڑ جاتا۔ شاید آپ کہیں کہ فنا ردیف ہے اور ظاہر، آخر قافیہ
ہے۔ باطن قافیہ نہیں ہو سکتا تھا۔ تو جب تبدیلی کرنی تھی تو
ایسا کیوں نہیں کیا جا سکتا تھا ع

ظاہر و باطن فنا، اول و آخر فنا

دوسری بات یہ کہ :

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات، کار جہاں بے ثبات

کیا یہاں پر ایک بات ختم اور مکمل نہیں ہو جاتی؟ اب اسی
خیال کو دوسرے لفظوں میں دہرانے کی کیا گنجائش رہ جاتی
ہے؟ ع

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو، منزل آخر فنا

حقیقت یہ ہے کہ سالہا سال کلام اقبال پر غور و فکر کرنے کا

دعویٰ عبدالمغنی محض بے ثبات: ایک متاع الغرور ہے۔
اگر عبدالمغنی اقبال شناسی میں کامیاب ہو جاتے تو مذکورہ بالا خامیوں اور کوتاہیوں کا گذر اس کتاب میں نہ ہوتا۔ اور کچھ خامیاں ہوتیں بھی تو قارئین انہیں نظر انداز کر کے کم از کم اس وجہ کہ عبدالمغنی نے اقبال کے مقام کا تعین بدلائل کر دیا ہے، سکون قلب حاصل کرتے لیکن ۸۶ ۵ صفحات ضائع کرنے پر بھی مقام اقبال کی تعین نہ ہو سکی۔ ملاحظہ ہو۔
کلیم الدین احمد نے جو لکھا تھا:

> دانتے کی تشبیہیں آرائشی نہیں۔ یہ حسین تصویریں نہیں جن وہ اپنی نظم کو سجاتا ہو ان کا ایک فنی مقصد ہے غیر مرئی کو مرئی بنانا اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہوتا ہے (اقبال ایک مطالعہ صفحہ ۱۱۱)

تو عبدالمغنی فرماتے ہیں:

> رہی یہ بات کہ دانتے کی تشبیہیں آرائشی نہیں، تو اس کا مطلب اگر صرف اتنا ہے کہ ان کا ایک فنی مقصد ہے اور وہ رہی ہے غیر مرئی کو مرئی بنانا تو اس ہی مقصد میں کامیاب صرف دانتے نہیں ہوتا، دنیا کا ہر بڑا شاعر ہوتا ہے اور اقبال بھی اپنے ناقدر کے چھوٹے پن کے باوجود ایک بڑے شاعر ہی ہیں۔ کم از کم دانتے کے اتنے بڑے شاعر تو ہیں ہی۔
>
> (اقبال اور عالمی ادب، صفحہ ۱۰۱)

یعنی اقبال دانتے کے برابر ہیں۔ لیکن اس صفحہ سے پہلے صفحہ ۱۰۰ پر اسی مرئی کو غیر مرئی بنانے کے سلسلے میں آپ نے فرمایا تھا:

> دانتے کی دنیا اتنی خیالی نہیں جتنی اقبال کی ہے۔ غور کیجئے کہ اقبال نہ صرف جبریل

> امین ملائکہ وقت کو ایک شکل اور مجسم کردار عطا کرتے ہیں۔ جبکہ دانتے صرف مجسم شخصیتوں کے خاکے کھینچتا ہے۔ وہ محسوس کو محسوس کراتا ہے اور اقبال غیر محسوس کو محسوس، اس سلسلے میں جہاں تک فکر و تخیل کا سوال ہے اقبال کی ہر مقام پر برتری ثابت ہوتی ہے۔

یعنی وہاں ایک سو چار ۱۰۴ اقبال دانتے سے برتر تھے۔ اب آگے بڑھئے صفحہ ۲۱۲ پر فرماتے ہیں:

> ادب و فن کی تاریخ میں اقبال کا ایک عدیم النظیر کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک عظیم شاعری کے ذریعہ ایک عالمی انقلاب اور آفاقی ارتقا کا بنیاد صرف اپنی قوت فکر اور طاقت حق کی بنیاد پر دیا ہے جو ایک بہترین حال میں بہترین مستقبل کی بشارت اور امن کی طرف پیش قدمی کا بصیرت افروز اور ولولہ انگیز نغمہ ہے۔ جاویدنامہ کے نغمہ ملائک سے بہتر حدی خوانی کاروان انسانیت کے اگلے مراحل سفر کے لئے پہلے کبھی ہوئی ہے۔ نہ بعد میں کبھی ہو گی۔

یعنی اقبال دنیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ وہ خاتم الشعرا ہیں۔ اب تا قیامت اقبال جیسا عظیم شاعر پیدا نہ ہو گا۔
دیکھا! یہ ہے عبدالمغنی کی تنقید۔ پہلے برتر، پھر برابر، پھر اکبر، شاید اسے خیال کا ارتقا کہا جائے۔ مانا، لیکن آخری خیال کی بنیاد کے لئے جو حجت قائم کی گئی ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے:

> حقیقت یہ ہے کہ نظام فن کی ترتیب

ہیں دانتے اور شکسپیر لاکھ بھی شہرت کے لحاظ سے اقبال کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جبکہ نظامِ فکر کے معاملے میں دانتے اور شکسپیر جیسے معمولی مطالعہ کے فنکار کسی مقام میں ہیں ہی نہیں۔ اور اقبال فکر و فلسفہ میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔

اقبال کی شاعری میں فکر و فن کی عظمتوں کا جو امتزاجِ کامل ہے وہ دنیائے شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مشرق و مغرب میں کہیں بھی نہ تو کسی شاعر نے آج تک اتنے زبردست تفکر سے کام لیا ہے اور نہ کسی مفکر نے ایسی عظیم شاعری کی ہے پھر تفکر بھی ایک منظم فکر اور محیط فلسفے کی شکل میں اور شاعری صنائع و بدائع اور فصاحت و بلاغت کے جملہ سامانِ فن کے ساتھ، پھر فکر و فن دونوں کے سالمات ایک انتہائی طاقت ور جذبے اور ذہانت سے پیدا ہونے والے سوز و گداز سے گھل کر ایک ہم آہنگ مرکب میں ڈھلے ہوئے جس کے نتیجے میں حسن و صداقت کی ایک ایسی کامل تک پہنچی کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس تک پہنچنے میں ایسی آفاقیت کہ جدید و قدیم اور مشرق و مغرب کے تمام صحیح و صالح افکار اور حسین و جمیل استفادات کا عطر مجموعہ۔ اقبال کی شاعری کا انیاس، دانتے، حافظ، رومی، شکسپیر گیٹے اور غالب کی بہترین اقدارِ فکر اور روایاتِ فن کی امانت دار اور ان ...

توسیع و اضافہ کرنے والی ہے۔ اس عظیم و بسیط و مرکب و منظم زیبا و رعنا اور دانش ورانہ اور خرد مندانہ شاعری پر تنقید صرف اس قول سے کی جا سکتی ہے

ان من الشعر الحکمۃ وان من البیان السحرا۔ (شعر سے حکمت ٹپکتی پڑتی ہے اور بیان سے جادو جاگتا نظر آتا ہے۔

(صفحہ ۲۱۱)

اصراف لفظ سے قطع نظر کرتے ہوئے آپ یہ پوچھیں کہ ان نتائجِ فکر کے لئے عملی تجزیہ PRACTILEL CITICRSN کیوں نہ کیا گیا تو یہ بجا ہے۔ اس بحث بے دلیل کا کیا اعتبار ہے۔ اگر یہی اندازِ نقد ہے تو کسی بھی شاعر کے متعلق اس سے بدرجہا بہتر پیرایہ مدات اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن وہ تعین قدر مقام نہ ہو گا۔ اصل شئے ہے مرکزِ خیال کا غیر متزلزل اور پرکشش ہونا۔ اور اس کی حمایت میں ایسے ٹھوس نشانیاں پیش کرنا کہ انہیں جھٹلایا نہ جا سکے۔

ذرا یہ تو غور کیجئے کہ جب نظامِ فن کی ترتیب میں دانتے اور شکسپیر لاکھ بھی شہرت کے لحاظ سے اقبال کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور "نظامِ فکر کے معاملے میں دانتے اور شکسپیر جیسے معمولی مطالعہ کے فنکار کسی مقام پر ہیں ہی نہیں" تو اقبال نے ان سے کیا استفادہ کیا ہو گا۔ ان کے یہاں "بہترین اقدارِ فکر اور روایاتِ فن ہیں کہاں"۔ عبد المغنی نے اپنی کتاب میں کہیں بھی تو ان کی نشاندہی نہیں کی۔ بلکہ شاعر کی حیثیت سے انہیں کسی کوٹی میں نہیں رکھا ہے۔ پھر وہ کون سے عناصر ہیں جن کی "امانت داری" اقبال نے کی۔ "توسیع و اضافہ" کیا۔ اس قسم کی سب سرد پا باتیں، نا قص و متضاد باتیں مجہول الذہن شخص کا حصہ ہے۔ عبد المغنی سے ان کی توقع نہ تھی۔ ہنگامہ خیال راحبہ بیان اس کتاب میں کہیں کوئی

اندیشے

اندیشوں کی تیز ہوائیں کرتی ہیں یلغار
سوچ رہا ہوں
اس دھرتی پہ سورج روز نکلتا ہے
لیکن یہ کرتا ہے؟
اس کو بھی ہے کھوج کسی کی؟
یا یوں ہی ہے بیکار
اندیشوں کی تیز ہوائیں کرتی ہیں یلغار،
سوچ رہا ہوں
چاند کے کندن ماتھے پہ یہ داغ
کس کے زخم کی شبنم ہے یہ؟
کس کے غم کی پھوار؟
اندیشوں کی تیز ہوائیں کرتی ہیں یلغار
سوچ رہا ہوں
اس کے دل آویز نقوش
روشن خد و خال
حسن کے پیچ و خم میں نہاں ہیں۔
معصومانہ کئی سوال
کیا میں ان کا دے بھی سکوں گا
ایسا کوئی جواب
جس سے اس کی پیشانی پر
اطمینان کی لہر
گائے کوئی ملہار
اندیشوں کی تیز ہوائیں کرتی ہیں یلغار
سوچ رہا ہوں
سڑکوں پر ڈیزل کے دھوئیں کا رقص
جس کی کوئی تال نہ تھاپ
میں اس سے بے زار
کیا میں اس سے بچ سکتا ہوں؟

(شفاق حسین (کینیڈا))

تمہاری آنکھ کے سونے افق پہ

اختر یوسف

نیلا نیلا سا آکاش
تمہاری آنکھ کے سونے افق پہ دھیرے دھیرے یوں
سمٹتا جا رہا ہے جیسے نیلے راج ہنسوں کی قطاریں
پنکھ پھیلائے کسی خاموش ٹھہری جھیل کے سونے کناروں پر
اترتی ہوں
تمہاری آنکھ کا سونا سوال دیکھتا ہوں دھیرے دھیرے
پنکھ پھیلائے اترتا ہے کہیں خوابوں کے نیلے سائبانوں میں
تمہاری آنکھ کے سونے افق پہ ایک سورج بجھ رہا ہے

غزل

داغ یوں روشن ہوا، دنیا سے ویرانی گئی،
وہ ملا تو اس جہنم کی پریشانی گئی !!

ایک ایسے ملک سے گزرا ہوں اکثر خواب میں
بات جس نے سچ کہی، وہ بات بس مانی گئی

کوئی جلوہ ہو، نظر میں گھومتی ہیں روٹیاں
قحط کچھ ایسا پڑا، سب کی حیرانی گئی

ایک مصور نے بنائی اس طرح تصویر یار!
ان کی صورت ہو کہ سیرت، کچھ نہ پہچانی گئی،

ان غزالوں کو بچاتے وحشیوں سے کب تلک؟
بھیڑیوں نے آ لیا، جنگل کی جب رانی گئی،

حسن کیوں چھوڑے گا اپنے آپ خوئے دلبری
عشق سے لیکن گئی ضد وہ نادانی گئی

لائے قالین سے اٹھا کر بوریوں کے درمیاں
تب حسن زلف غزل سے بوئے ایرانی گئی۔

حسن نعیم

غزلیں

بزم خوردگان دشت تمنا، کہاں گئے
روشن تھی جن سے محمل لیلا کہاں گئے
واماندگی ہیں، لا متناہی سراب ہیں،
تھی پیاس جن کی شوق کا دریا کہاں گئے
ہے طور راکھ اور نقش عیسوی ہے سرد
اے عصر نو، کلیم و مسیحا کہاں گئے۔
بولوں میں ہم ہیں اپنی بلندی پہ شرمسار
جن سے فلک تھے پست وہ دیوتا کہاں گئے
آشفتگی کو شہروں میں سر پھوڑنا ہے اب
جولاں گہہ جنوں تھے جو صحرا، کہاں گئے۔
کس طرح جنتیں بھی بنیں زر کی داشتہ
سرمایہ دار دولت عقبیٰ کہاں گئے،
ہر غیر معتبر کو ہے ضد مستند بنے،
جن سے تھا اعتبار ادب کا کہاں گئے

بجھ رہی ہے مفلس کی شمع در کی طرح،
ہے زندگی بھی عبث دولت ہنر کی طرح
دو دن کا ساتھ ہے پھر یہ کہاں، کہاں یہ لوگ
بچھڑتا ملتا ہے سب ریگ کی سفر کی طرح
جو ہم سے باخبر اور جن سے باخبر تھے ہم
وہ برسوں بعد ملے بھی تو بے خبر کی طرح
دلوں کی شاخ پہ کھلتی ہیں، سوکھ جاتی ہیں
نئی محبتیں ہر سال برگ و بر کی طرح
سفر مدام سفر میں ہیں، رنگ و نکہت دلنواز
ہیں انتظار کے قیدی شجر کی طرح
کبھی ہیں آگ، کبھی راکھ، خوں کبھی، کبھی چپ
ہے دل فساد کے مارے ہوئے نگر کی طرح
وحید اس لیے کچھ آشنا سی ہے یہ دنیا
ہے دشت بے سروساماں ہمارے گھر کی طرح

وحید اختر

غزلیں

لگوں سے اپنے تجسس کا بس صلہ اتنا
غنی ہو دل پہ ہمارا نہ مل سکا اتنا
ہمارے گرد اندھیرا ہے روشنی کر دو
کبھی کسی سے کہا ہے تو بس کہا اتنا
فریب رنگ کو ہم نے فریب ہی جانا
دکھوں کے زہر کا چکھا ہے ذائقہ اتنا
حدیں ہیں اپنی بہت دور آسمانوں سے
ہمارے شوق کا پھیلا ہے سلسلہ اتنا
سبھوں نے اپنی رفاقت سے پھیر لیں آنکھیں
وفا کی راہ میں تنہا وہ کر گیا اتنا
وہی جو شعلہ صفت تھا ہر ایک موسم میں
نہیں ہے اس میں شرر کوئی وہ بجھا اتنا
کہیں نہ چھین لے فکری بصیرتیں تیری
برا، شبوں کی سیاہی میں ڈوبنا اتنا

لذت بیگانگی سے آشنا ہم بھی ہوئے
قربتوں میں دوریاں تھیں فاصلہ ہم بھی ہوئے
تو بھی لرزاں پانیوں پہ نقش تھا غائب ہوا
جو نہ یادوں میں رہا وہ حادثہ ہم بھی ہوئے
اب شکستوں کی کہانی ہم سنانے سے رہے
سننے والے سرگراں ہیں بے مزہ ہم بھی ہوئے
رات کی پرچھائیوں میں کھو گیا اپنا نشاں
تیرگی کے کھنڈروں کی جب صدا ہم بھی ہوئے
بھول بیٹھے طرز شکوہ، بھول بیٹھے ہیں فغاں
پتھروں کے اس نگر میں بے نوا ہم بھی ہوئے
وہ نو شناغور تھے، مجبوریاں ان کی بھی تھیں
ایک مشکل موڑ پہ تجھ سے جدا ہم بھی ہوئے
روشنی کی راہ نے فکری جسے دیکھا نہیں
بند گلیوں میں بھٹکتی وہ بلا ہم بھی ہوئے

پرکاش فکری

علی امام

کہانی لکھی نہیں گئی

میں نے دیکھا ——— خلیج کے جسم پر
سے تار تار کپڑے اتار لئے گئے ہیں۔ اور اسے چلچلاتی دھوپ میں
اس کی بستر میں برہنہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ جیسے اشوک کے درخت
سے کسی ویرانی نے ہریالی اتار لی ہو۔ یا پھر سورج نے برف کو
پگھلا کر کے "کن جن جنگا" کو ننگا کر دیا ہو۔ یا پھر گنگا کو کسی
جٹا نے پھر اپنے اندر قید کر لیا ہو۔ اب تو صرف ریگ زار ہی ریگ
زار ہیں۔

خلیج کے جسم پر بڑی بے دردی سے جگہ جگہ برچھیاں
پیوست کر دی گئی ہیں۔ زبان تراش لی گئی ہے۔ اور کانوں
میں آہنی سینے کے ذریعہ روئیاں ٹھونس دی گئی ہیں۔ اس کے
جسم کے زخموں سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے ہیں۔ پھر بھی
وہ زندہ ہے اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ اور تعجب خیز المیہ یہ
ہے کہ اس کے زور بازو سے ساری عبیر واقف ہے۔ (لیکن
مجبوریوں کی انگلیوں میں احساس کا "رنگ" کون ڈالے)
اتنا زدوکوب اور ہراساں کئے جانے پر بھی اس کے دل و دماغ میں
سے اطمینان کی شمعیں کوئی بجھا نہیں سکا ہے۔ ایسا بھی راون کو محسوس
ہوتا ہے۔ یا پھر راون کا یہ جھوٹا مجسمہ ہو۔ (ٹھیک اسی طرح جیسے
کوئی یہ کہے کہ دارجلنگ سے میں "تو" خرید لایا ہوں۔ اور
سنی گوڑی میں برف کے کباب بکتے ہیں)
بچارے خلیج کو جسے برہنہ آدمی کے نام سے پکارا
جائے تو کوئی مضائقہ نہیں) بے چہرگی کے دشت میں اکیلا
چھوڑ دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ اندر سے بالکل تنہا نہیں ہے۔ اس
کے اندر ایک عجیب الجھاؤ ہے۔ جس میں سمجھنے کے لئے لاتعداد باہمی
ردعمل ہوتے رہے ہیں۔ اس کے اعتراف کی عبیر پر عجیب
سی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ جس کا اندازہ لگانا عبیر کی ٹوٹ
پھوٹ اور اکھڑے پن کی وجہ سے مشکل ہو رہا ہے۔ عبیر کی ساری
کیفیتیں الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی معلوم ہوتی ہیں
برہنہ آدمی زمین پر کوئی کھمبا بنا صدیوں سے کھڑا ہے
یا پھر آدمی بہروپیا بن کر جین کی چوٹی پر سیدھا کھڑا ہوا ہے
ایسا بھی راون کو محسوس ہوتا ہے۔ (ٹھیک اسی طرح جیسے اگر
کوئی یہ کہے کہ نالندہ میں گوتم بدھ کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ یا
سنہوں کے پیچھے چھپوں کے اندر تتلیوں کی لپک ہوتی ہے)
——— برہنہ آدمی میں حرکت ہوئی
شاید عبیر کی طرف سے کوئی اندیشے کی گنجائش تو
نہیں ؟ حالانکہ پہلے تمام اندیشوں پر وہ
اپنی جگہ پر جما کا جما رہا ہے۔ مگر ان دنوں اچانک چونک جانا اس
کی عادت بن گئی ہے۔

اس کا داہنا ہاتھ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔ اور سینے
میں چبھے ہوئے برچھی کے ڈنڈے پر آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ ڈنڈے
پر اس کی پانچوں انگلیاں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ وہ بائیں ہاتھ

کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کو برچھی کی ان کے دونوں طرف پھیلا دیتا ہے۔ ہتھیلی سے زخم کے اطراف کو دباتا ہے۔ اور پھر تیز ایک تیز جھٹکے سے برچھی کو سینے کو باہر نکال لیتا ہے۔ بھیڑ میں اتھل پتھل مچ جاتی ہے۔ اور بھیڑ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگتی ہے۔

ایک شور آسمان کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے ......

بھاگو ...... بھاگو .... سامنے سے ہٹو ......

غلیج کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ بھیڑ آندھیوں کی طرح اندھی دشاؤں میں پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ صرف اڑتی دھول اور بھاگے قدموں کی نشانیاں موجود رہتی ہیں۔ برچھی برہنہ آدمی کے داہنے ہاتھ میں ہے اس نے برچھی کو اپنے شانے تک اٹھا رکھا ہے اب وہ اپنے پاؤں جمے ہوئے کو دو تین بالشت آگے پیچھے کرتا ہے۔ اور برچھی کو ہوا میں تیزی سے اچھال دیتا ہے۔ برچھی ہوا کے دوش پر پہونچ کر ریزہ ریزہ ہو کر زائل ہو جاتی ہے اور ہوا کا ٹوٹا حصہ بن جاتی ہے۔ اور ایسا محسوس کرتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے اگر کوئی یہ کہے کہ آسام میں صبح نہیں ہوتی یا گولڈن ٹمپل امرت سر سے اٹھ کر دہلی آ گیا ہے) بھیڑ اس عجب خیز منظر کو اپنی اپنی پناہ گاہوں کی شگافوں سے دیکھتی ہے۔ اور اطمینان کا سانس لیتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب جمع ہو جاتی ہے۔

غلیج پہلے ہی کی طرح زمین پر جما ہوا دکھائی دیتا ہے اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی ہیں، زخموں کے منہ پر خون جم چکا ہے۔ جیسے درختوں کی سوکھی ڈالیوں پر گمان کے پیلے پیلے کونپل نکل آئے ہوں۔

بھیڑ کچھ دیر تک خوف سے سہمی سہمی سی رہتی ہے۔ پھر معمول کے مطابق مختلف کیفیتوں کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ اور عادت کی لگام منہ میں ڈال کر چھلانگ لگانے لگتی ہے۔ اب غلیج پر کہیں سے بے ہنگم قہقہوں کی بارش ہو رہی ہے۔ کہیں سے کنکریاں اچھالی جا رہی ہیں۔ اور کہیں سے لعنت و ملامت کے خزانے لٹائے جا رہے ہیں۔ غلیج حقارت کا طوق اپنے گلے میں ڈالے اپنی جگہ پر اٹل ہے۔

مگر جب اسے احساس ہوتا ہے کہ خطے کی آبادی خوف سے سہم کر موم کی مانند ذرا سی حرارت ملائم ہو سکتی ہے۔ اور پھر گرمی کی عتاب سے برف کی مانند منجمد ہو سکتے ہیں ——

تب غلیج کے اندر ریڈیائی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ کسمسانے لگتا ہے۔ کسی ایک برچھی پر اس کا ہاتھ خود بخود پہونچ جاتا ہے۔ بھیڑ میں پھر کھلبلی مچ جاتی ہے۔ کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اپنی اپنی پوزیشن لے کر چوکس ہو جاتے ہیں وہ تھوڑی سی حرکت کے بعد ایک برچھی کو اپنے جسم سے باہر نکال لیتا ہے۔ اور اسے اپنے شانے کے اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف بغیر پینترا بدلے پھینک دیتا ہے۔

برچھی روشنی کی سی رفتار سے ہواؤں پر تیر جاتی ہے۔ غلیج کی آنکھوں کی چمک ایسی لگتی ہے۔ جیسے انگارے پھوٹ رہی ہوں۔ وہ یکے بعد دیگرے کئی برچھیاں نکال کر آسمان کی طرف اچھال دیتا ہے۔ اسی درمیان تیز لو چلنے لگتی ہے۔

بھیڑ آہستہ آہستہ اپنی پناہ گاہوں میں جا دبکتی ہے حفاظت کے دروازوں پر دھیرے دھیرے سناٹوں کے تالے جڑ دیئے جاتے ہیں۔ سبزیاں جھلس رہی ہیں۔ مکانوں کی دیواروں کے پلاسٹر تڑخ رہے ہیں۔ گرد و غبار سنک رہی ہے۔ اور کولتار کی سڑک پگھل رہی ہے۔

مگر غلیج تنہا جھلسانے والی لو اور کڑی دھوپ میں کھڑا ہے۔ اس کے جسم سے پھر خون کا فوارہ جاری ہوا چاہتا ہے لیکن وہ ایسا سخت جان آدمی ہے۔ ذرہ برابر بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے وہ اسی جگہ کا حصہ ہے یا اسی جگہ سے اگ کر نکلا ہے۔

اس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ اور زمین کے اندر دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

وہ برسوں کے بعد اپنے پینترے کو تھوڑا سا بدلتا ہے۔ جس سے موسم بدل جاتا ہے۔ لو تھم جاتی ہے اور ایک بار پھر ساری چیزیں اعتدال پر آجاتی ہیں —— پھر بھیڑ دھیرے دھیرے اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر اس کے ارد گرد جمع ہونے لگتی ہے۔

اس بار بھیڑ میں ذی کو راوی دیکھ کر چونک اٹھتا ہے۔ جس کا حسن بے مثال ہے۔ اور جس کی محبت کو سمندر کی وسعت خود میں سمو نہیں سکتی۔ راوی کے جی میں آیا کہ ذی بڑھ کر پوچھے تم یہاں ——؟ مگر اسی بیچ برہنہ آدمی نے ایک برچھی پر ہاتھ رکھا۔ اور بھیڑ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگی۔ ذی بھی کہیں گم ہو گئی۔ افراتفری اور بدحواسی کے عالم میں راوی صرف یہی دیکھتا رہا۔ کہ لوگ خلیج کے نشانے کے سامنے سے بھاگ رہے ہیں۔ اور وہ صرف یہ سنتا رہا —— سامنے سے جاؤ، نشانے پر سے ہٹو۔ خلیج برچھی کو پھر اپنے شانے تک لاتا ہے اور ہوا میں اچھال دیتا ہے۔ اور یہ اس کا وہی پرانا عمل ہے وہ ہوا کو برچھی کی طرح سفاک بنا دینا چاہتا ہے۔ یا پھر برچھی کو ہوا کی طرح سیال کر دینا چاہتا ہے۔ ——

برچھیاں ہوا کے دوش پر تیر رہی ہیں۔ اور ہوا چاروں طرف پھیل رہی ہے۔

مگر برہنہ جان جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ کبھی کالی ہوائیں اس پر تھوکتی رہیں۔ کبھی درختوں کی سوکھی پتیاں ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر گرتی رہیں —— پھر ایسا ہوا کہ اس کی کسی نہ کسی حرکت کی وجہ سے تیزی کی گنجائش پیدا ہو گئی —— اور موسم معمول پر آ گیا۔ بھیڑ اس کے چاروں طرف دھیرے دھیرے جمع ہونے لگتی ہے۔

تمام ہنگاموں کے بعد اب خلیج کے سینے میں صرف ایک برچھی پیوست ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی قاعدے پر ۴۵ ڈگری کا زاویہ بنا دیا گیا ہو —— بھیڑ میں رہ رہ کر حرکت اور مزاحمت پیدا ہو رہی ہے۔ اسی وقت راوی نے دیکھا۔ ایک ہیجان برپا ہے۔ شور ہنگامے کا بازار گرم ہے۔ اسی وقت راوی نے دیکھا ہے۔ ذی بھیڑ کو چیرتی ہوئی برہنہ آدمی کے پاس آجاتی ہے۔ اور غصے میں چیختی ہے (اس کی چیخ میں اپنے پن کا شدید کرب ہے) — یہ کیسا کھیل ہے؟ ——

خلیج کی دہکتی ہوئی آنکھوں سے آنسو نکل کر بہنے لگے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ اپنی کٹی ہوئی زبان سے کہہ رہا ہو تم اسے کھیل سمجھتی ہو ذی؟ میری جان..... میری روح........ میری کائنات.........

یہ تو یہ ہے...... عین، غین، فے، قاف....

یہ تو وہ ہے...... لام، میم، نون، واؤ....

یہ ہیں!........ جس کی ذات کے اندر تم ہو....

یہ تم!........ جس کے اندر کائنات ہے....

یہ سب ہیں ——

خلیج کی آنکھوں سے کرب کی آتش فشاں چھوٹ نکلتے ہیں۔ ذی اس گرم گرم لاوے کو دیکھ کر اپنے سوال پر شرمندہ ہو جاتی ہے۔

بھیڑ پر سکوت کا عالم چھا جاتا ہے۔ ذی کا انگ انگ کانپنے لگتا ہے۔ وہ اسی جگہ ٹہلنے لگتی ہے۔ اس کے قدم بے معنی سے اٹھ رہے ہیں۔ وہ کسی رخ جانا تو نہیں چاہتی ہے۔ صرف اپنے آپ کو بہلانے کے لئے دس پندرہ قدم مغرب کی جانب جاتی ہے۔ اور پھر دس پندرہ قدم مشرق کی جانب لوٹ آتی ہے۔ اسی طرح جنوب کی سمت جاتی ہے۔ اور پھر پیچھے لوٹ کر شمال کا رخ کرتی ہے ——

م ج ے

دروازہ

وہ چوپٹ کھلے دروازے سے لگ بھگ دوڑتی ہوئی [illegible] اندر کمرے میں آتش دان کے قریب بیٹھے ہوئے مرد سے [illegible] بچا لیجئے۔ بھیڑیئے میرے پیچھے لگے ہیں۔ مرد نے اسے [illegible] ۔۔۔۔۔۔ مرد نے اٹھ کر دروازہ بند کیا آتش دان کے قریب ایک کرسی کھینچ کر اسے بٹھایا۔ لڑکی ہانپتی پسینے سے تر بتر سہمی ہوئی بیٹھ گئی۔ بھیڑیوں کے قدموں کی چاپ اور غراہٹ قریب تر ہوتی گئی —— وہ ساری عمارت [illegible] رہے تھے۔ اور لڑکی کی سماعت [illegible] ہو گئی [illegible] دیر کی خاموشی میں دوڑنے والوں کی چاپ اپنی بغل میں [illegible] رہی تھی۔ لیکن اس چھت کے نیچے آکر لگا کہ وہ مضبوط [illegible] محفوظ سا ہے۔ مجھے پنجرے میں بند کر لیجئے۔ وہ سہمی ہوئی دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔

تم پنجرے میں بند ہو۔ ڈرو مت، یہاں کوئی نہ آئے گا مگر کیا تمہارے بڑوں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ جنگل میں بھیڑیوں [illegible] ہے۔

[illegible] تو، پر دن ماں کے لئے نہارن [illegible] تھا۔

واقعی تم اتنی بڑی ہو گئی ہو کہ بھیڑیئے تم پر للچائیں۔ لوگوں کے اس طرح کے سمجھنے کے کارن نے مجھے اور بھی بڑا کر دیا ہے۔

ہاں تمہارے چہرے پر اب بھی بھولپن ہے۔ مگر صرف چہرے پر —— وہ مسکرایا۔

لڑکی کو یک گونہ قرار ملا۔ ساتھ ہی بھیڑیوں کی چاپ ڈوب گئی۔ ایک لمحہ خاموشی کا آہستہ خرامی سے یوں ڈوبا جیسے نیلے آکاش میں بادل کا ہاتھی —— بھیڑیوں کی غراہٹ دور چلی گئی تھی۔

آپ نے مجھے پنجرے میں بھی بند نہیں کیا ہے۔ گو کہ آپ نے ایسا کہا تھا۔

ارے یہ کیا؟ آپ اپنا روپ کیونکر بدل رہے ہیں آپ کا چہرہ۔

سب وہم ہے تمہارا تم بری طرح ڈر گئی ہو۔ میں نے تمہیں پنجرے میں بند کر دیا ہے۔ اور چابی بھی کھو دی ہے۔

اُف آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ میرا اسکرٹ تو یہ۔

میں اپنی ٹائی کھول رہا ہوں —— مرد مطمئن تھا۔

نہیں آپ میری بریسیر کھول رہے ہیں۔

کہہ تو دیا کہ میں اپنی ٹائی کھول رہا ہوں۔

آپ کی ٹائی تو بندھی ہوئی ہے۔

تم پاگل ہو گئی ہو۔ تمہاری بریسیر تو اپنی جگہ پر ہے۔

آپ نے مجھے پناہ دی اور سلامتی کا وعدہ کیا۔

اور اب، یہ شریفوں کا شعار نہیں۔

تمہارا سب کچھ صحیح سلامت ہے اگر وہ ہے۔

نہیں میں جو بچانا چاہتی تھی۔

تم کچھ نہیں بچانا چاہتی تھیں۔

نہیں۔ کچھ تو بچانا چاہتی تھی میں کیونکہ میں ان سے بھاگی تھی۔

تم ان سے نہیں [illegible] آپ سے بھاگی تھیں

۔۔۔۔۔۔

تم ناگ

حسبِ معمول

چھوڑ دو ــــ چھوڑ دو۔ لڑکی سارے بدن سے چلائیگی
تب بادل پھٹے دودھ کی طرح یہاں وہاں بکھرا جائیں گے۔ دور دور
تک کوئی نہ ہوگا۔ اور چاروں طرف اُگے ہوئے درخت انہیں
بری طرح بھینچ لیں گے۔ اور ایک خوشرنگ پرندہ پھڑپھڑا کر اڑیگا
تب مرد کا لڑکی کو اپنی باہوں میں بھینچ لے گا۔

چھوڑ دو چھوڑ دو لڑکی سارے بدن سے چلائے گی۔
بے شرم ... لڑکا اپنا ڈائیلاگ ادا کرے گا تمہیں
ریپ کئے بنا نہیں چھوڑوں گا۔ میں ولین ہوں۔ اور تم نے ہیرو
کو پہلے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے
کون بچا سکتا ہے۔ میں تمہیں ریپ کئے بنا نہیں چھوڑوں گا۔ ہاہا
ہاہا ... ہا بچاؤ ... لگا۔

کمینے، ذلیل ... مجھے ہیرو بچا لے گا۔ وہ صدیوں سے
مجھے بچاتا آیا ہے۔ اس مرتبہ بھی آ کر مجھے بچائے گا۔
اس کا تو کچھ مر نکل گیا۔ میری بلبل آؤ، آجاؤ،
بدمعاش، ... چھوڑ دے، بچاؤ بچاؤ۔
ــــ لڑکی کا پورا بدن ننگا ہو گیا ہے۔ پہاڑ چلا رہے ہیں
پیڑ چیخ رہے ہیں۔ ہوا جنگلوں میں زخمی کراہیں بھرتی سنسنا رہی
ہے۔ جھیل کا پانی دم سادھے پڑا ہے۔
لڑکا جنگلی بلے کی طرح جھنجھوڑتا ہے۔ میں اب تمہارے
ساتھ ... ویسا ہی کروں گا۔ جیسا کہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ کیا۔ اس
سے بدتر سلوک میں تمہارے ساتھ کروں گا۔ چونکہ میں ریپ پر
ایک تھیسس لکھ رہا ہوں۔ اس لئے ریپ میں نئے زاویے نئے
گوشے ڈھونڈوں گا ــــ

اب تک تو تمہارا ہیرو تمہیں بچانے نہیں آیا۔ بڑا اُدھرا
ہے اس پہ۔
ہاں ہاں مجھے پورا یقین ہے۔ لڑکی اعتماد کے ساتھ
کہتی ہے۔
غلطی پر ہو تم کوئی نہیں آئے گا۔ دروپدی بھری سبھا
میں ذلیل ہوتی رہے گی۔ اور اس کے پانچوں شوہر سر جھکائے بیٹھے
رہیں گے۔
وہ کائر تھے ــــ وہ بہادر ہے لڑکی تلملا جاتی ہے
بہادر ہے اور اپنی مردانگی جوئے میں ہار چکا ہے۔ مرد
تڑاک سے کہتا ہے۔
اور تم نے تو انسانیت ہی تیاگ دی ہے۔
میں ولین جو ہوں۔

یقین کرو تمہارا ہیرو مر گیا۔ لڑکا عقدہ کھولتا ہے۔
ہیرو بن کر وہ گھاٹے میں رہا۔ نہ تمہارے ان شربتی ہونٹوں
سے ایک بوسہ ہی چرا سکا نہ تمہارے خون میں بجلی بن کر دوڑ سکا
نہ تمہارے کپڑے ہی اتار سکا۔ نہ تمہارا ٹینٹوا ہی دبا سکا۔
تمہارا ہیرو مر گیا۔ ہیرو بن کر وہ گھاٹے میں رہا۔
تم جھوٹے ہو، مکار ہو۔
ــــ لڑکا لڑکی پر جھپٹتا ہے لیکن ہیرو کی انٹری
نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس کا ڈمی آتا ہے تب لڑکی ولین کے
ہاتھوں نڈھال پڑ جاتی ہے۔ اور کہتی ہے کوئی آئے نہ آئے
مجھے چلانا تو پڑے گا ہی۔

●●

مشرف عالم ذوقی

پاشان یگ

یہ ہماری سرحد ہے
سردار نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔ اب ہم لوگ
ایک بار پھر سے پاشان یگ میں قدم رکھ رہے ہیں۔
وہ پھر خاموش ہوا۔ اور چند لمحے بعد دوبارہ یوں گویا ہوا۔ بس یہی سرحد ہے۔ جہاں ہمیں اپنی تہذیب، اپنی قدریں، اپنے لباس سب کچھ اتار دینے ہوں گے۔ کیونکہ ہم پھر وہاں پہونچ گئے ہیں۔ جہاں ہم صدہا، ہزارہا بلکہ لاکھوں سال پہلے تھے، جہاں سے ہماری تہذیب نے تن ڈھکنا سیکھا تھا۔ اور جب کہ تم جانتے ہو ــــ کہ جب تمہارے ہاتھوں نے اپنے ہونے کی خواہش کو ظاہر کیا۔ پیروں نے اپنے استعمال کی فرمائشوں کو آواز دی یعنی [illegible]۔ اور کانوں نے اپنے رسوں کے مطالبے کو پورا کیا۔ گونگے دانتوں نے اشاروں اور کنایوں سے ہو کر ارتقائی منزلوں کو عبور کرتے ہوئے لفظوں اور معنویت کی سرحد میں قدم رکھا یعنی یہ سب کچھ جب پہلی بار ہوا تھا اور پھر ہوتا رہا۔ اور صدیاں گزرتی رہیں۔ ماہ و سال اپنے کپڑے بدلتے رہے۔ تو تہذیب بھی ایسے ہر موقعہ پر اپنے لبادے اتار اتار کر دوسرے لبادے زیب تن کرتی رہی۔ اور پھر تم نے جانا کہ وقت کے ساتھ قدریں بدلتی ہیں۔ قدریں لوگوں بدلتی ہیں۔ اور پھر جب تمہیں سب کچھ ملا۔ اور سب کچھ ملنے کے بعد بھی تمہاری ہوس پہلے کی طرح برقرار رہی اور عمارتوں میں تمہارا دم گھٹنے لگا تو یکبارگی پھر تم نے وہی صدہا بلکہ ہزارہا سال پہلے جیسے رہنے کی خواہش ظاہر کی۔

اور کہا کہ یہ کپڑے تو بس ڈستے ہیں۔
اور کہا کہ یہ ہاتھ پیر اب آرام چاہتے ہیں۔
اور کہا اب یہ ہونٹ مصنوعیت کے اندھے شہر میں چلاتے چلاتے تھک چکے ہیں۔
اور تم نے کہا ــــ اور تم پیچھے ہوئے ــــ صدہا ہزارہا بلکہ لاکھوں سال پیچھے ــــ اور اب قبیلے قبیلے چل کر بہت دور نکل آئے ہیں۔ ہماری تہذیب، ہمارے مذہب ہماری قدریں اب بہت پیچھے چھوٹ چکی ہیں۔ اور یہ پاشان یگ کی وہ سرحد ہے جہاں سے ہم نے اپنا سفر شروع کیا تھا اور جہاں اب ہم دوبارہ پہونچ رہے ہیں۔
سردار اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ دور تک پھیلے ہوئے گھنے جنگلوں نے بیانگ دہل اس کے خطاب کی آبیاری کی۔ ہواؤں نے اس کی پکار پر لبیک کہا۔
اور وہاں حاضر لوگوں نے کہا ــــ کہ ہاں سردار تم سچ ہو۔ کہ اب ہم اپنے کپڑے اتار رہے ہیں ــــ تم سچ ہو کہ ہم اپنی تہذیب یہیں دفن کر رہے ہیں ــــ تم سچ ہو کہ ہمارے اعضا اب آرام چاہتے ہیں۔ تم سچ ہو کہ معنویت ایک خالی بانسری کی طرح ہو کر رہ گئی ہے ــــ اور اس خالی بیکار بانسری کو ہم سرحد کے پیچھے ہی چھوڑ دینا چاہتے ہیں
تم سچ ہو
متعدد آوازوں نے نشیب و فراز کا سفر طے کیا۔

سردار نے ایک لمبی سانس لی۔ پھر دوبارہ یوں گویا ہوا ——
اور جب ہم اپنی تہذیب، اپنی قدریں یہاں اس سرحد پر چھوڑ رہے ہیں۔ تو جان لو کہ اب یہاں کوئی سردار نہیں ہے۔ سرداری بھی تہذیب کی علامت ہے۔ ہم نے جب تہذیب یہاں چھوڑ دی پس ہماری سرداری بھی ختم ہو گئی۔ اب اس سرحد کے پار قدم رکھو۔

اور انہوں نے ویسا ہی کیا۔

سب نے اپنے کپڑے اتار دیئے، اور سرحد کی لکیر پار کرنے لگے۔

انہوں نے اپنی تہذیب سرحد کے پیچھے چھوڑ دی۔

اپنے نام سرحد کے پیچھے چھوڑ دیئے،

اپنے رشتے اور انسانی جذبوں کو بھی جو تہذیب کی دین تھی۔ کپڑوں کے ساتھ ساتھ اتار دیئے،

اور سب کے سب مادر زاد برہنہ ہو لئے۔

عورتوں نے مردوں کو دیکھا —— مردوں نے عورتوں کو —— بچوں نے اپنی ماؤں کو دیکھا —— اور ماؤں نے اپنے شوہروں اور اپنے سن بلوغ میں پہونچنے بچوں کو —— مگر وہاں آنکھوں میں کم مائیگی اور جذبے کا رمانتی پرند قلانچیں بھرتا ہوا سرحد کے پار اڑ گیا تھا۔

اور وہ لوگ مادر زاد برہنہ ہو کر اس طرح ایک ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ جیسے برسوں سے بلکہ جنم سے ہی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ہوں جیسے ہر کسی کو ایک دوسرے کے جسمانی اعضا کے متعلق ہر بات دریافت ہو۔ اور جیسے ان اعضا میں ایک دوسرے کے لئے کوئی کشش نہ رہ گئی ہو۔ اور وہ سب کچھ سرحد کے پیچھے چھوٹ گیا ہو۔ جو ان کی نفس کی مہین باریک تاروں کو ایک ساتھ جھنجھنا کر توڑ دیتا تھا۔

وہ بڑے آرام سے چل رہے تھے، کہ اب ان کے پاس کوئی فکر نہ رہ گئی تھی۔

وہ بڑے خوش تھے۔ خوف اور ڈر کا قوی ہیکل پرند اب ان کے پاس پھٹکتا بھی نہیں تھا۔

وہ بڑے چین سے تھے۔ کہ کپڑوں کے قید سے باہر نکل کر دنیاوی بندھنوں اور رشتوں کو پاگل کر دینے والے احساس سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔

اور جب شام کے پہلے سورج نے [illegible] تو ایک بچہ روتا ہوا ایک عورت کے پاس آیا۔ اور اس کی چھاتی میں منہ لگا دیا۔ عورت نے اسے گھور کر دیکھا اور ایک زور کی چپت رسید کی۔ بچہ اپنے ننگ دھڑنگ جسم کو سہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا معلوم ہوا کہ اس دن سارے بچوں کے ساتھ یہی واقعہ ہوا تھا۔ تمام عورتوں نے ان بچوں کو اپنے سے دور دھکیل دیا تھا۔!

اور اس دن پہلی بار سردار کی آنکھوں نے شفق رنگ سورج کو دیکھا۔ اور اس کی آنکھیں قدرے جھک گئیں۔

الاؤ کے بڑے بڑے ڈھیروں میں بھوک سلگ رہی تھی۔ مگر اس بوڑھے پہلے نام سردار کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ ان کے اندر بھی ایک بھوک جوان ہے جو ہر کی دھوپ اور تمازت میں کھو جاتی ہے۔ جو ہواؤں کی سرگوشیوں میں زور پکڑتی ہے —— کل کا آدمی ماضی پاستان سے نکل کر مشینی گھڑگھڑاہٹ میں کھو سکتا تھا —— مگر آج یہ خواہش کے باوجود کل کے پاستان میں نہیں گم ہو سکتے۔

اور جب جب وہ ایسا سوچتا —— ہوا میں شدید رخ اختیار کر لیتیں۔ سرحد پار کے کپڑے اڑتے ہوئے میدانوں میں چھتراتے۔ لوگ ان کپڑوں کو پکڑنے کے لئے دوڑ لگاتے۔ اور کپڑے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے خلاؤں میں ٹنگ جاتے۔ اور پھر ہوا کا ایک جھونکا آتا۔ اور ان کپڑوں کو بہا کر دوبارہ سرحد پار لے جاتا۔

اور وہ خود کو تسلیاں دیتے کہ وہ خوش ہیں۔ کہ وہ آزاد ہیں۔

اور پھر ایسا لگاتار ہوتا رہا ——— ان کی سوچ گلے میں ڈالے ہوئے سکڑ سے آزاد ہوتی۔ سرحد پار بھٹکتی۔ زبان اشاروں اور کنایوں کے زنگ چھڑاتی ——— بھوک تپش بن کر صحراؤں اور میدانوں میں دوڑا کرتی ——— وحشی چیخیں آسمان جسم میں سوراخ کرتیں ——— اور جب یہ تھک جاتے ——— تو ان کی نظریں آسمان کی جانب ٹکرا جاتیں۔ جہاں ان کے لاتعداد کپڑے میدانوں میں آکر خلاؤں میں ٹنگے ہوتے۔

ان کی آنکھیں چمکتیں اور وہ بھول جاتے کہ وہ آزاد ہیں ——— اور وہ دوڑ پڑتے۔

ہوا کا جھونکا ان کپڑوں کو دوبارہ سرحد پار کی جانب اڑا کر لے جاتا۔

اور جب جب ایسا ہوتا وہ برائے نام بوڑھا سردار ان کی گہری آنکھوں کی بینائی میں جھانکتا۔ وہاں اسے کھلی ہوئی تہذیب میں سانسوں کی ہلچل نظر آتی۔ دھبوں سے صاف ہوتا برار رشتہ نظر آتا ——— رشتہ نام کے احساس کو جنبش دیتا ——— اور نام سے مذہب کی ایک روشن لکیر میدان کے بیچ و بیچ جگمگانے لگتی۔

وہ بوڑھا میدان کے گھپ اندھیروں میں جھانکتا اور وہاں پھیلا ہوا کثیف دھواں اپنے اندر سرایت کر لیتا۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ یہ لوگ اب اس زندگی کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہ رشتہ بھول چکے ہیں۔ نام ان کی زندگی سے مٹ چکا ہے۔ مذہب کی دیوتا مت دیوار بن ڈھا چکی ہیں۔ اور اب ایک نفسا نفسی کی جنگ رہ گئی ہے۔ کہ ہر کوئی اپنی روزی اور روٹی کے لئے پاگلوں اور وحشیوں کی طرح دوڑ رہا ہے۔ نہ کوئی کسی کو منہ لگاتا ہے۔ نہ کوئی کسی کو خیریت دریافت کرتا ہے۔ سب اپنے میں مست ہیں۔

مگر جلد ہی لوگ اس زندگی سے اکتانے لگے۔ ان کے چہروں پر بے چینی کی لکیریں ابھرنے لگیں۔ اور خود سردار بھی ایسا محسوس کرنے لگا۔ جیسے وہ سب رسمی باتیں تھیں جن سے وہ خود کو تسلیاں دیا کرتا تھا۔ اب وہ خود ان کپڑوں کی جانب لپکتا جو کبھی کبھار سرحد پار سے اڑتے ہوئے خلاؤں میں آکر ٹنگ جاتے۔ اور ایسے موقعے پر وہاں کے لوگوں کے اندر سرحد پار والا آدمی انگڑائیاں لیتا۔ وہ سب بھی اس کی طرف بے چین ہو جایا کرتے۔ اور خلاؤں میں ٹنگے کپڑوں کو للچائی نظروں سے گھورا کرتے، اور وحشیوں کی طرح بے ہنگم چیخوں کو کا منظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تن کو ڈھکنے کی ناکام سعی کرنے لگتے۔

اور پھر بڑی عجیب عجیب باتیں ہونے لگیں۔ جب گونگے ہونٹوں نے نظروں کی سڑک کو طے کرتے ہوئے لفظوں کے چہروں کو اوڑھ لیا۔ کوئی مرتا تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ کوئی اپنے کو دیکھ کر رشتہ اور ناموں کے احساس کو دوبارہ زندہ کر دیتا۔ تو کوئی اپنے برہنہ جسم کو دیکھ کر خود ہی ڈر جاتا۔ اور انہیں چھپانے کی شرم میں گرفتار ہو جاتا۔

اور اس دن کا سورج لال سرخ ہو گیا تھا۔ وحشی نژاد سارے لوگ میدان میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کے گونگے ہونٹوں نے بسورنا شروع کر دیا۔ ان کی چیخیں آسمان کی بسعتوں میں گھس گئیں۔ اور انہوں نے ایک ساتھ مل کر زور زور سے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔

سردار ——— سردار ——— سردار

بعد مدت کے لفظ پھر سے آزاد ہو گئے تھے۔ آنکھوں نے ایک دوسرے کا منہ چوم لیا تھا۔ اور دو عنائیوں ہوا کہ جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ شاید ان کی

اجتماعی انسانیت کا تقاضہ تھا۔ کہ ان کے سارے کپڑے سرحد پار سے اڑتے ہوئے میدانوں میں ذرا بلندی پر چاروں جانب چھتراگئے تھے۔

وہ عجیب انداز میں چیخے،

اور یوں ہوا کہ سب کو حیا کا خونخوار پرندہ نگل گیا

سب اپنے جسم چھپانے میں لگ گئے ـــــ سب کے سب ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ چھپانے لگے۔ پھر آناً فاناً کپڑوں کی تلاش میں دوڑ پڑے۔

میدانوں میں اب بھی ذرا سے فاصلے پر ان کے کپڑے اڑتے جا رہے ہیں اور وہ سب کے سب ـــــ اپنے ہاتھوں سے اپنا تن ڈھانکے ـــــ کپڑوں کی سمت دوڑ رہے ہیں۔

نہ جانے کب سے ـــ ؟

●●

بقیہ: کہانی لکھی نہیں گئی

جب وہ لوٹ کر اسی جگہ پر آرہی تھی۔ جہاں سے اس نے بے چینی میں ٹہلنا شروع کیا تھا۔ تو ٹھیک اسی وقت خلیج کا "اپنا" آدمی اس کے اندر سے نکل کر سینے میں چھپی ہوئی برچھی اپنے دونوں ہاتھوں سے پوری قوت کے ساتھ خلیج کے اندر پیوست کرنے لگتا ہے۔ ذی اس منظر کو دیکھ کر فوراً چیخ اٹھتی ہے۔ اور تیزی سے خلیج کے دوسرے آدمی کو پکڑ لیتی ہے۔ اس کے باوجود خلیج کے منہ اور ناک سے خون کی ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔

ذی ایک جھٹکے سے خلیج کے سینے میں پیوست ہوئی ہوئی برچھی کو نکال پھینکتی ہے۔ پھر بھی خلیج جو ہمالہ کی مانند اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا تھا۔ دھڑام سے زمین پر گر کر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اور چند ہی ساعتوں میں برف بن کر

موسم کو سرد کر دیتا ہے۔

وحشت زدہ ذی اپنی آنکھوں میں دہشت آلود لئے بادل کی مانند پھٹ جاتی ہے۔ اور ذی برہنہ آدمی کے اندر کہیں گم ہو جاتی ہے۔

میں نے سُنا!

خطہ میں جب کرن دھوپ کبھی ہوتی ہے جگہ جگہ نمودار ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ اس میں اگا ہوا ایک عظیم الشان درخت ہو خلیج کے سینے چبھی ہوئی ہے۔ جیسے قاعدے پر کوئی عمود ڈال د

بقیہ افسانہ دروازہ

سوال یہ ہے کہ وہ کیا سمجھ رہے ہوں گے؟

مرد بھیڑیا بن گیا ہے۔ اور وہ چیخنا چاہتی۔

وقت جیسے ساؤنڈ پروف ہو گیا ہے۔ وقت جیسے ... پروف ہو گیا ہے۔ وقت جیسے اسکریم پروف ہو گیا وقت جیسے نان میگنٹک ہو گیا ہے ـــــ

سوال یہ ہے کہ وہ کیا سمجھ رہے ہوں گے

کہ تم نے ان سے اپنی آبرو بچائی،

کیا وہ یہی سمجھتے رہیں گے،

ہاں کیونکہ ـــــ دروازہ بند ہے

مگر میں خود کیا سمجھوں،

تم بھی یہی سمجھو کیونکہ دروازہ بند ہے

R. N. Regd. 4253/61
P. T. Regd. No. Gy. 7
Phone—432

The Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

Price : Rs. 2/-

Sept 1982

ماہنامہ
آہنگ
گیا
اکتوبر ۱۹۸۵ء
قیمت دو روپے

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ ڈھنگ گیا

شرح خریداری
بارہ شمارہ ــــ چوبیس روپئے
ایک شمارہ ــــ دو، ۲ روپئے
فون نمبر، 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹر
نوشابہ حق

رفقائے ایڈیٹرز
شفق، عبدالصمد

کتابت: کلیم القاسمی ڈنگروی
طباعت: ہند لیتھو پریس گیا

محتویات

کشکول — اداریہ

ہمیں افسوس ہے کہ آہنگ کا یہ شمارہ مقررہ صفحات پر مشتمل نہیں ہے۔ وجہ چاہے جو بھی ہو، قارئین کو بتانے کی بجائے ہم معذرت خواہ ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ آگے ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

آہنگ کو داد ملتی ہے تو یہ ہمارا حق نہیں ہے۔ یہ اس میں لکھنے والوں کا حق ہے۔ قارئین کا حق ہے اور پسند کرنے والوں کا حق ہے۔

جو بے دادی بھی پڑتی ہے، اس کے لئے ہم سینہ سپر رہتے ہیں۔ کیونکہ وہی ہمارا حق بھی ہے۔ اور مقدر بھی ـــ اور ہمارا ہی مقدر نہیں۔ اردو کی ادبی صحافت بتاتی ہے کہ ہر ایماندار رسالے کو بے دادی بھی پڑی ہے ہم خود کو ان کا وارث سمجھتے ہیں۔ اس لئے بے داد سے گھبراتے نہیں۔ اور سراسیمہ بھی نہیں ہوتے، کیونکہ یہ کنول جلائے رکھنا ہے، چاہے اس میں ہمارا خون جلے،

ایمانداری کی جو بات ہم نے کہی ہے۔ اس سلسلے میں عرض کر دینا ضروری ہے کہ ایک تمکنت اور اگر ایمانداری کا بھی ہوتا ہے۔ سو شاید کبھی کبھی ہمارے یہاں بھی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کبھی زیادہ نمایاں صورت میں ظاہر ہو جاتا ہو۔ لیکن قصہ یہ ہے کہ اگر ایمانداری اپنا کل اثاثہ ہو تو اس تمکنت کا اظہار بھی کترانے کے باوجود ہو ہی جائے گا۔ اس کے لئے ہمیں بخش دیا جائے کہ ہم اس اثاثہ سے ہاتھ دھونے کو تیار نہیں ہیں۔

ہمارے بعض بہت اچھے دوست ہیں۔ جنکو یہ شکایت کبھی کبھی ہو جاتی ہے کہ ہم غیر معیاری مضمون بھی شائع کر دیتے ہیں۔ اور یہ کہ ہم یوں آہنگ کی سطح گرا دیتے ہیں ـ بات یہ ہے کہ ایسے دوستوں کی محبت قبول ـ مگر ان کا یہ خیال ان کے SUBJECTIVE انداز نظر کی پیداوار ہے۔ ورنہ "غیر معیاری" چیزوں اور آہنگ کے بیچ کوئی رشتہ کبھی رہا ہی نہیں خصوصاً نثری تخلیقات کے سلسلے میں کوئی اپنے پیارے کی بات آہنگ میں پڑھکر ہم سے رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ تو بھی ہم اس سے اپنی محبت کم نہیں کرتے، مگر ہماری دقت یہ ہے کہ ہماری محبت ادب اور ادب کے سچے تخلیقی معیار سے زیادہ ہے۔ اور اسے ہم کسی قیمت پر گنوانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ دوست کھو سکتے ہیں، مگر ادب کا ادب کرنا ہم نہیں بھول سکتے

ایک پیارے دوست نے لکھا کہ آپ فلاں ناول پر "زبردست" تبصرہ لکھئے۔ اسکی ادبی اہمیت ہوگی ـــــ مگر انہوں نے یہ بتانے کی زحمت نہیں کی اور نہ یہ خیال رکھا کہ فلاں ناول تبصرہ کرنے کے قابل بھی ہے؟ ہم دوزخ کا کھٹکا اور جنت کی کنجی، اور ایسے ناول کو چھپنے، بکنے کو روک نہیں سکتے۔ کیونکہ ان کے لکھنے والوں نے صدیوں بعد پیدا ہونے والے کالی داس، یا تلسی داس، یا ٹیگور یا قرۃ العین ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور نہ انہوں نے بڑے بڑے ناموں کا دُم چپکا کر مقالے تبصرے اور خطبۂ استقبالیہ وغیرہ کا یونیورسٹیوں میں انتظام نہیں کرایا۔ اگر وہ ادب تخلیق کرنیکے دعویدار ہو جائیں اور فی لفظ کی قیمت دیکر تبصرے لکھوانے لگیں۔ تو آہنگ وہی کریگا جو ایسی باتوں کے سلسلے میں کرتا چلا آرہا ہے ـــــ آہنگ ادب کا محرم ہے۔ وہ ادب کی ناک نہیں ہے

ایک دوست نے لکھا "ضرورت ہے کہ آہنگ کو اوپر اٹھایا جائے" ـــــ مگر ہم ابھی اسے اوپر اٹھانے کی بجائے ـــــ (کہ بہت سے رسائل اوپر اٹھتے، اٹھتے اوپر چلے گئے، اور مرحومین میں شامل ہوگئے) اسے زمین پر ہی زندہ و تازہ رکھنا چاہتے ہیں۔

ہم کو یہ حُسن ظن نہیں کہ ہم ایسا رسالہ نکالتے رہیں گے کہ یہ بس دو برس چار برس بلکہ دس دس برس پر نکال کر ہم اتنے اوپر چلے جائیں کہ ہمارے حصے میں ماتم ہی ماتم آئے۔

شاید دو ہی ہفتہ کے بعد اگلا شمارہ بھی آپ کی نذر کیا جائے۔

ہمیں اجازت دیجئے ـــــ ہمیں حوصلہ دیجئے، کہ آپ کے ہی دیئے ہوئے حوصلے سے ہم سب کچھ کر پاتے ہیں

اس شمارہ کی خاص چیز لطف الرحمن صاحب کا مقالہ "جدیدیت کا آغاز" ہے۔ لطف الرحمن اردو تنقید کو کلیم الدین احمد سے آگے لے جانے کے تمام امکانات رکھتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ لطف الرحمن تنقید کا مفہوم تشریح، تفسیر، تجزیہ کے علاوہ تخلیقات کی خوبیوں سے قارئین کو لطف اندوز ہونیکا راستہ بتانا بھی سمجھتے ہیں

لطف الرحمٰن

جدیدیت کا نقطۂ آغاز

جدیدیت لفظ جدید سے مشتق ایک ادبی اصطلاح ہے جس نے ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد اردو میں ایک ہمہ گیر ادبی تحریک کی حیثیت حاصل کی ہے۔ ترقی پسند تحریک سرمایہ دارانہ جبر و استحصال کے خلاف ایک اجتماعی بغاوت تھی۔ جدیدیت سماجی اور میکانکی جبریت کے خلاف ایک باغیانہ ردعمل ہے۔ اپنی کیفیت و کمیت کے اعتبار سے ترقی پسند تحریک ہی کی طرح یہ ایک مستحکم توانا اور طاقتور تحریک ہے لیکن یہ حقیقت ابھی تک MYTH بنی ہوئی ہے ترقی پسند تحریک کو مارکس کے کمیونسٹ مینی فیسٹو کی تائید و توثیق حاصل تھی۔ اس لئے اس کے فکری و فلسفیانہ تجربہ و تحلیل میں زیادہ دقتیں پیش نہیں آئیں اس کے برعکس جدیدیت نے جس مکتبۂ فکر سے استحکام و توانائی حاصل کی، اس کا کوئی مینی فیسٹو کبھی سامنے نہیں آیا۔ اس لئے جدیدیت حقیقت ہونے کے باوجود ابھی تک MYTH کے دائروں میں اسیر ہے۔

جدیدیت فرد کی داخلی جلاوطنی و موضوعی بے بناہی کی ترجمانی و تنقید ہے۔ جس کے نتیجے میں فرد تنہائی، الجھن، بیگانگی، اجنبیت، اکیلاپن، کلبیت، لوریت، یکسانیت، بے معنویت، مہملیت، جرم، خوف، بے سمتی، بے یقینی، ناامیدی، بے ثباتی، اکتاہٹ، بے زاری اور متلی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ ان رجحانات کے اعتبار سے جدیدیت وجودیت کی توسیع ہے، وجودیت کا بنیادی موضوع داخلیت و انفرادیت ہے۔ جو جدیدیت کا اساسی مسئلہ ہے۔ لیکن جدیدیت کے وجودیت کے علاوہ عہد حاضر کی دوسری اہم تحریکات سے بھی اثرات قبول کئے ہیں۔ جن میں اشتراکیت اور نفسیات خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ مگر جدیدیت میں وجودیت کو سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ جدیدیت کی تفہیم کے لئے اس عقبی زمین کو سامنے رکھنا ہوگا۔ جس میں وجودی طرز فکر کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے

فلسفہ وجودیت باضابطہ طور پر انیسویں صدی کے اواخر میں کرکے گارڈ کے نظریات سے سامنے آیا۔ جس نے ہیگل کی مطلقیت و عقلیت کے خلاف موضوعیت و داخلیت کی وکالت کی، ہیگل کے مطابق حقیقت عقلیت ہے اور عقلیت حقیقت سے عبارت ہے۔ وجود پر جوہر کو تقدم حاصل ہے۔ کرکے گارڈ نے صرف تصور یا آئیڈیا کو حقیقت تسلیم کرنے کی بجائے احساس قوت ارادی کو بھی اہمیت دی، اس کے مطابق صداقت، حسن اور خیر حقیقت کے تین پہلو ہیں۔ جس کو بریڈلے نے بھی تسلیم کیا ہے۔ صرف آئیڈیا کے ذریعہ حقیقت کا عرفان ممکن نہیں۔ اس لئے کہ تصور تجرید ہے یہ کنکریٹ وجود کی آگہی سے قاصر ہے۔ معروضی طریقۂ فکر حقیقت کے عرفان سے قاصر ہے۔ وجود کی آگہی تجرید اور وجدان کے ہی ذریعہ ممکن ہے۔ اس لئے مطلقیت کے مقابلے میں انفرادیت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ انسان کی خلقی آزادی انفرادیت کی رہین منت ہے۔ اس لئے ہیگل کے معروضی مطلقیت کے برعکس کرکے گارڈ نے داخلی مطلقیت کو مرکزی حیثیت دی اور یہ اعلان کیا!

"حسن، خیر اور صداقت انسانی وجود کے
لازمی عناصر ہیں، یہ مجموعہ عناصر فرد زندہ سے
خیالی یا تصوری نہیں بلکہ وجودی تعلق رکھتے
ہیں۔"

انیسویں صدی کے اواخر میں مذہب، رسم و روایات، اور سالوسیت کا ہم معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ چرچ کی اجارہ داری نے مذہب کو خارجی رسوم و آداب تک محدود کر دیا تھا۔ حقیقی مذہبی جذبات معدوم ہو چکے تھے، معصوم عوام استحصال اور جبریت کا شکار تھے، فاسق و فاجر مذہبی رہنما اختیار مطلق رکھتے تھے۔ لیکن خدا کی طرف سے ان کو کوئی سزا نہیں مل رہی تھی۔ مذہب کی اس ظاہر داری رسمیت خارجیت، اور سطحیت نے مایوسی و قنوطیت کی فضا پیدا کر دی۔ یہاں تک کہ نطشے کو اعلان کرنا پڑا کہ "خدا مر چکا ہے" اس لئے کہ وہ خدا جو ظالم و جابر اور فاسق و فاجر لوگوں کو سزا نہیں دے سکتا اور جو مکمل طور پر بدکردار اور بد اطوار پادریوں کے ہاتھوں کا کھلونا ہو اس کو مردہ ہی سمجھنا چاہئے۔ کرکے گارڈ نے روایتی و رسمی اور تقلیدی مذہب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور داخلیت و باطنیت کو مذہب کی روح قرار دیا۔ اس کے مطابق عبادت داخلی وجود یا روحانی گہرائیوں میں اترنے کے مرادف ہے۔ کرکے گارڈ مسیحی عیسائیت کا مبلغ تھا جو حضرت مسیح کی تعلیم و تلقین تھی۔ اس طرح وجودیت مذہبی رسمیت و روایتیت کے خلاف ایک باغیانہ ردعمل ہے۔

مذہبی اقدار کی شکست و ریخت نے اخلاقی انتشار و بحران کو تیز تر کر دیا، اخلاقی دائروں میں بھی خارجی قدروں کو سب کچھ سمجھ لیا گیا، تقلیدی و رسمی اخلاقیات نے من مانی، خود غرضی، ہوس پرستی نفسانیت اور آزادروی کو فروغ دیا۔ عیش کوشی اور لذت پسندی کے رجحان نے استحصال اور اخلاقی بحران کو ہمہ گیر بنا دیا۔ کرکے گارڈ نے روایتی اور تقلیدی اخلاقیات کی تردید کی۔ اور داخلی اخلاقی قدروں پر زور دیا۔ اس کے مطابق اخلاقی مخصوص و معین قدروں کو تائید و تقلید کا نام نہیں۔ یہ جبری، تقلیدی، اور مطلق نہیں بلکہ خود پسند اور بے ساختہ انفرادی اور داخلی ہے۔ سارے اخلاقی فرائض میری وجہ سے ہیں، دوسروں کی وجہ سے نہیں۔

سیاست میں بھی ہیگل کی مطلقیت نے ریاست کو اقتدار اعلیٰ کا مختار اور انفرادیت کو بے معنی بنا دیا تھا۔ ریاست خدا کے اظہار و تجسیم سے عبارت تھی۔ فرد ریاست کے مفاد کے لئے قربان کیا جا سکتا تھا۔ ہیگل کی نظریئے نے ہٹلر کی فاشزم کو راہ دی، انفرادیت کی محافظت کرنے والے، سیاسی نظریات کی اشتراکیت اور بالشویزم نے لے لی، اور فرد کو سماج کی بھینٹ چڑھا دیا۔ جمہوریت کچھ سفید پوشوں کی خود غرضانہ سالوسیت میں بدل گئی، اس طرح ریاست و سیاست سے انفرادیت کے تحفظ کی امید ختم ہو گئی۔ وجودی نقطۂ نظر نے اس کے برعکس انفرادیت پسندی پر زور دیا۔ اور فرد ہی کو حقیقی اکائی کی حیثیت دی۔ جماعت افراد ہی کی تنظیم کا نام ہے۔ زندہ اور دھڑکتا ہوا وجود سماج کا نہیں فرد کا ہوتا ہے۔ سوسائٹی کوئی زندہ حقیقت کا نام نہیں بلکہ غیر واضح اور مبہم گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو صرف ایک تصور یا امکان ہے۔ اس لئے سماج پر فرد کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

سماجی سطح پر خارجی اصول و ضوابط کی جکڑ بندیاں سخت تر ہو گئی تھیں۔ سیاسی اقتدار اعلیٰ نے تہذیب و شائستگی اور نظم و ضبط کے نام پر فرد کو سطوت اسباب و گراں باری آداب سے نڈھال کر دیا تھا۔ فرائیڈ نے SOCIETY AND ITS DISCONTENTS میں فرد کو سیمسن سے تشبیہ دی ہے جس کو اصول و آئین کی زنجیروں نے ستون سے جکڑ دیا ہے۔ ہر لمحہ اس کے لئے اذیت ناک اور کرب انگیز ہے۔ فرائیڈ کے مطابق اگر اس سخت سماجی سنسر شپ کا خاتمہ نہیں

ہوا۔ تو فرد اپنے ہی ساتھ ساتھ پوری تہذیب کی تباہی و بربادی کا سبب بن جائے گا۔

غرض کہ روایتی فلسفہ، مذہب، اخلاق، سیاست اور سماج کے خلاف وجودیت کا نقطۂ نظر سامنے آیا، کرکے گارڈ نے اس فلسفہ کا سنگ بنیاد ضرور رکھا لیکن اس کو مقبول و مروّج بنانے کا سہرا سارتر کے سر ہے جس نے مخصوص زمانی و مکانی پس منظر میں عصری وجودی فلسفہ کو عالم گیر دلچسپی و دلکشی بخش دی،

سارتر کے وجودی احساس کو جنگ کے ذاتی تجربات نے بیدار کیا تھا، جنگ کے تلخ تباہ کن تکلیف دہ اور بھیانک تجربات نے انسانی زندگی کے بے قدری و بے معنویت کے احساسات سے سارتر کو دوچار کیا۔ اس نے ناول، ڈراموں اور افسانوں کے ذریعہ وجودی طرز فکر کو پیش کیا۔ جس نے عالم گیر سطح پر لوگوں کو متاثر کیا۔ چنانچہ اس کے فلسفیانہ اور فکری پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ شروع ہوا۔ اور اس امر کی تلاش ہوئی، کہ سارتر سے قبل بھی کسی نے اس طرز فکر و احساس کا اظہار کیا ہے کہ نہیں۔ تو یہ بات عام ہوئی کہ تقریباً سو سال قبل کرکے گارڈ نے ایسے افکار پیش کئے تھے۔ چنانچہ کرکے گارڈ کی کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا۔ بعد ازاں فرانس اور جرمنی کے اس طرز فکر کے فلسفیوں کا مطالعہ کیا گیا۔ وجودیت وہ طرز فکر ہے جو ادب کی راہ سے فلسفہ میں داخل ہوئی، اس کو مقبول و مروّج بنانے کا فخر بہر حال سارتر ہی کو جاتا ہے۔

کرکے گارڈ نے جس مذہبی سیاسی، اخلاقی اور سماجی انتشار کے پس منظر میں نظریہ وجودیت کی بنیاد رکھی تھی اس کو دو عالم گیر جنگوں نے اپنی انتہا پہ پہونچا دیا تھا دوسری جنگ عظیم کے بعد تہذیبی و انتشار و بحران نے ہر شعبہ زندگی کو اپنی گرفت میں لے لیا، فرد کی ذاتی زندگی، اجتماعی وجود، اخلاقی، سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشی قدریں مسلسل شکست و ریخت انتشار اور بکھراؤ کی زد میں ہیں میں نے ایک جگہ لکھا ہے:

"آدمی حیات و کائنات میں جس طرف بھی غور کرتا ہے۔ وہ کچھ ٹوٹتا بکھرتا ہوا سا محسوس کرتا ہے۔ ہر لمحہ اس کی انگلیوں کے درمیان سے سرکتا پھسلتا اور نکلتا ہوا نظر آتا ہے کٹے پھٹے لوگ، بکھرے بکھرے مناظر اور دھجی دھجی زندگی کا احساس ایک عالم گیر بحران کا ثبوت ہے۔"

(وجودیت کے موضوعات، جواز ۱۴ تا ۱۸)

جدید صنعتی نظام اور میکانکی سماج نے وجودی بحران کو مزید بڑھا دیا ہے۔ فرد جمہوری و اجتماعی نظام کا ایک بے جان پرزہ بن گیا ہے اس کی تخلیقی و جمالیاتی شخصیت میکانکی اور مشینی حیثیت میں بدل گئی ہے۔ آزادیٔ فکر و نظر سے محروم فرد لاشخصی سطح پر اور بہ قول سارتر PROXY میں جی رہا ہے۔ آدمی کی آدمیت، انسانی قدریں اور باہمی شخصی رشتہ سب کچھ میکانکی ہوتا جا رہا ہے۔ آدمی اپنی شناخت اور پہچان سے بھی محروم ہو گیا ہے۔ بڑی بڑی فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا تخلیقی احساس شعور کند ہوتا جا رہا ہے۔ تخلیق کی بے ساختہ مسرت سے محروم آج کا فرد اکیلے پن اور جلاوطنی کے احساس کی گرفت میں ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ بھیڑ کے درمیان بھی وہ اکیلا ہے۔ کوئی اس کا ہمدرد، مخلص دوست اور غمخوار نہیں۔ اس نے اس کے اندر گھٹن کے احساس کو پیدا کر دیا ہے۔ رالف ہارپر کہتا ہے۔

"آج کا آدمی بالکل ٹوٹا ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ باہر کی دنیا سے ٹوٹا ہوا ہے۔ اور دوسری وہ اپنی خودی یا خدا سے ٹوٹا ہوا ہے"

سی جے یونگ کا تجزیہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

"نفسیاتی معالج تسلیم کرتے ہیں کہ انا بیمار ہے
اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فرد کل سے ٹوٹا ہوا
ہے اور ایک طرف انسانیت سے اور دوسری
طرف وہ روح سے بے تعلق ہے"۔

فرد کی اس بے پناہی جلا وطنی، اور کس مپرسی کا سبب میکانکی سماج میں INDIVIDUAL MAN کی تردید و تنسیخ ہے۔ اور یہ تردید مختلف سطحوں پر ہو رہی ہے۔ اس کی وضاحت دو طریقوں سے ہو سکتی ہے۔

MAN کی تردید اس طرح ہو رہی ہے۔ کہ اس کی آدمیت کو استعمال کی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ انسان کے انسانی اوصاف کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ، سائنس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی بنا پر تیز تر ہو گیا ہے۔ آدمی اب آدمی نہیں رہ گیا ہے۔ بلکہ شے یا چیز بن گیا ہے۔ جزئیت، یاسیت کے اس احساس نے آدمی کو بوریت و یکسانیت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ لاشخصیت یا لافردیت کی اصطلاحیں یہی معنوی پس منظر رکھتی ہیں۔ اس طرح MAN کی مسلسل تردید ہو رہی ہے۔

INDIVIDUAL کی تردید اس طرح ہو رہی ہے کہ فرد اجتماعیت میں کھوتا جا رہا ہے۔ فرد کے تمام رجحانات و میلانات، جماعت، گروہ، فرقہ بندی، اور تنظیم میں محدود ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی انفرادی شخصیت، اجتماعی تقاضوں، اور فیصلوں کی پابند ہو گئی ہے۔ فرد اجتماعیت و جمہوریت کے ہجوم میں گم اپنی شناخت سے محروم ہے۔ یہی نہیں انسان کے تمام کام کچھ اس طرح ہونے لگے ہیں۔ جیسے وہ جیتے جاگتے حساس باشعور فرد کی بجائے کوئی مشین ہو۔ صبح سے شام تک فرد کی زندگی، کثرت کام، و ہجوم افکار میں اس طرح جکڑی ہو گئی ہے کہ اس میں ذرا سی مداخلت بھی پوری زندگی کو متاثر کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کسی چھوٹے سے پرزے کی خرابی پوری مشین کو خراب کر دیتی ہے۔

زندگی کچھ اس طرح کی ہو گئی ہے کہ انسان کی اکتاہٹ، بیزاری یکسانیت، اور الجھن کے احساس سے دوچار ہے۔ جینے کی کوئی قدر بھی ایسی نہیں جو انسانی زندگی کو مسلسل و پیہم اپنی طرف مرکوز و منعطف رکھ سکے، اس صورت حال نے انسان کی زندگی میں NAUSEA کیفیت پیدا کر دی ہے

سائنسی ایجادات و ترقیات، رحمت و برکت کی بجائے لعنت و زحمت بن چکی ہیں۔ اس لئے کہ مادیت اور معروضیت کو حاصل ہستی سمجھ لیا گیا ہے۔ اور فرد کے EMOTIONAL INVOLVEMENT کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ فرد کا EMOTIONAL INVOLVEMENT بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔ فرد کی دانشورانہ تسکین و تسلی ہی سب کچھ نہیں ہے۔ فرد کے داخلی تقاضے مرکزی اہمیت رکھتے ہیں، امن و سکون، راحت اور مسرت، داخلیت کی تسکین و طمانیت پر منحصر ہے۔ جو سائنس کی ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی بنا پر فی زمانہ مفقود ہے۔

اس تہذیبی انتشار کا سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ فرد کی خارجی و داخلی، عقلی و احساسی اور مادی و اخلاقی زندگی ہم آہنگی و امتزاج سے محروم ہے۔ فرد کے عقل و ذہن اور اس کی اخلاقی و روحانی زندگی میں صدیوں کی حائل دوری نے فرد کو بڑی حد تک بدحواس دیوانہ اور پاگل بنا دیا ہے۔ اقبال کا تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے ؎

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں،
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہے بنکوں کی عمارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

جدید ٹیکنالوجی اور نیوکلیائی اسلحوں کی ایجاد اور سرد جنگ کی سنجیدگی وافزونی نے بھی فرد کو داخلی سطح پر ایمان اور ایقان سے محروم کر دیا ہے۔ آج جنگ کچھ اس طرح کی ہو گئی ہے کہ لاکھوں بے گناہ لوگ بغیر کسی جرم کے موت کی آگ میں جھلسنے پر مجبور ہیں۔ اس سے بحران اقدار کو تقویت ملی ہے۔ ذہنوں میں یہ سوال سنجیدگی کے ساتھ پیدا ہوا ہے کہ شرافت، انسانیت، خیر، عبادت، نیکی ہمدردی، اور بھلائی وغیرہ کی کیا اہمیت ہے۔ کیونکہ بموں کے لپکتے ہوئے شعلے اچھے اور برے میں تمیز نہیں کرتے۔ اس جہت سے ساری اخلاقی قدریں بے معنی ہیں۔

دوسری طرف اس نے خوف و دہشت اور خطرہ عدم کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ آدمی ہر لمحہ مٹ جانے کے خوف سے لرزاں ہے۔ خوف کی اس نفسیات نے بھی فرد کو شدید احساس تنہائی سے ہم آغوش کر دیا ہے۔ ISAAC ROSENFIELD لکھتا ہے:

"عہد حاضر میں خوف ہی خاص حقیقت ہو گئی ہے کیونکہ یہ ایک مثالی حقیقت ہے جنگ، جرأت کا نمونہ اور سماج کی مثالی ہئیت ہے۔ حالانکہ یہ سبھی تجریدی مسئلے ہیں۔ لیکن ایسا ہوتے ہوئے بھی وہ بالکل ظاہر ہیں۔ اور جب ہم انہیں تجربے سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں تو زیادہ پُراثر ہو جاتے ہیں"۔

آئنسٹائن نے بھی کہا تھا:

"تیسری جنگ عظیم کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن چوتھی جنگ عظیم کے متعلق میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ پتھروں کے ہتھیاروں سے لڑی جائے گی"۔

۱۹۴۵ء میں ایک خوطیت پسند اسپنر و لوجسٹ نے اس حقیقت کا اظہار کیا تھا:

"مسند ر کے ہاتھ میں ایٹم بم جیسے اسلحے کی موجودگی تہذیبی تباہی کا بیّن ثبوت ہے"۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن بھی کچھ ایسا ہی تاثر رکھتے ہیں:

"یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ انسانیت آج تاریخ کے سب سے بڑے بحران وانتشار کے نرغے میں ہے۔ اس تکلیف دہ صورت حال کا سبب سائنس اور ٹیکنالوجی کے بے پناہ ارتقا اور انسان کی روحانی زندگی میں تطبیق و ہم آہنگی میں نمایاں کمی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سائنسی ایجادات نے ہمیں فطرت کی غلامی اور جسمانی محنت کی اذیت سے نجات دلا دی ہے، ہم ایک طرح کے پاگل پن کے شکار ہیں۔ جو تہذیبی انتشار کا نتیجہ ہے...... داخلی سطح پر ہم تنہائی کے مریض ہیں"۔

عہد حاضر کا سب سے اہم اور سنجیدہ مسئلہ صرف اور صرف یہ ہے کہ اس ہمہ جہتی انتشار و بحران سے نجات کی کوئی صورت کوئی راستہ، کوئی سبیل ہے کہ نہیں؟

جدت پسندوں کے مطابق موجودہ سماج ایک سائنسی تنظیم کا محتاج ہے۔ اگر انسانیت کو مکمل تباہی و بربادی سے بچانا ہے۔ تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتاریوں کی مناسبت سے کسی نئے اخلاقی نظام کی تعمیر و تشکیل لازمی ہے۔ اس کے برعکس رجعت پسندوں کا کہنا ہے۔ یہ سارا انتشار و بحران قدیم اقدار زندگی کی تردید و تنسیخ ہی کا پیدا کردہ ہے۔ موجودہ کرائسس سے نجات کی بس ایک صورت ہے وہ یہ ہے کہ جن اقدار زندگی کو داستان پارینہ سمجھ کر موقوف و مسترد کر دیا

گیا ہے۔ اس کی از سرِ نو بازیافت و اثبات کی کوشش کی جائے،
ماضی کی طرف مراجعت ہی میں انسانیت کی تحفظ ہے۔
غور کیجئے تو دونوں ہی نظریات بہت زیادہ کارآمد نہیں
اس لئے کہ ان میں سے کوئی نظریہ مسئلہ کا حقیقی حل نہیں رکھتا
ماضی کی طرف مراجعت ممکن ہی نہیں بچہ بطنِ مادر میں واپس نہیں
جاسکتا۔ زمانہ رجعت قہقری سے ناآشنا ہے۔
دوسری طرف میکانکی سماج، صنعتی تہذیب، اور
روحانی و اخلاقی اقدار میں تطبیق و ہم آہنگی کی کوشش قطبین کو
ایک مرکز پر لانے کی سعی رائیگاں ہے۔ اور میکانکی اور سائنسی
ترقیات کی بنیاد پر کسی نئے اخلاقی نظام کی تشکیل دیوانے کے
خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ عہدِ حاضر کے المیہ
کا کوئی علاج فرد کے پاس نہیں۔ اور انسانیت تہذیبی استحصال
کی بلندیوں پر مصلوب ہو رہی ہے۔
موجودہ انتشار، بحران اور آویزش اور ... تیرگی
میں گھری ہوئی انسانیت کا سب ... تو
کرن شوخ مثال نگہ حور ——— کی تلاش و جستجو ہے۔ جو
وادیٔ ظلمت میں اس کے لئے مشعلِ راہ بن سکے۔
اس عالمِ انتشار میں جب انسان نے چاروں طرف
نگہ جستجو ڈالی تو ایک مکتبہ فکر اس دعوے کے ساتھ سامنے آیا
کہ وہ عہدِ حاضر کی اس MALADY کی تشخیص کرسکتا ہے
اگر تشخیص درست ہو تو علاج چنداں مشکل نہیں۔ اور وہ مکتبہ
فکر وجودیت کا ہے جس کے ایک اہم نقیب کی حیثیت سے
سارتر نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمگیر تہذیبی کرائسس
اور کلچرل بحران کا تجزیہ کرکے بتایا کہ ———
عہدِ حاضر کا انسان خارجی دنیا میں جیتا
ہے۔ اس نے انفرادیت و داخلیت کو نظر
انداز کردیا ہے اور یہی اس کا سب سے
بڑا مرض ہے۔ حقیقت با وجود داخلیت
سے عبارت ہے۔ داخلیت سے بے نیازی و
بے تعلقی انسان کو تنہائی، اداسی، اکیلاپن
محرومی، خوف، دکھ، درد، الجھن، پریشانی
جلاوطنی، یکسانیت، بوریت، ناامیدی،
بے ثباتی، اکتاہٹ، بیزاری، بیگانگی
کلبیت، اور بوریت وغیرہ کے احساسات
سے دوچار کرتی ہے" ———
اس نقطۂ نظر کی تصدیق ... بعد اپنے اپنے طور پر دوسرے
مفکرین نے بھی کی ہے۔
... سے داخلیت و موضوعیت کو فکروفن میں اہمیت
دی گئی ہے ... اور مذکورہ بالا وجودی SITUATIONS
کی ترجمانی ... کہانی ... رجحانات و میلان عام ہوا۔ اردو میں
۱۹۳۶ء ... ۱۹۴۷ء تک ترقی پسند تحریک کے غلبہ کا زمانہ
رہا ... ۱۹۵۰ء ... کا دور عبوری دور ہے
۱۹۵۷ء سے اردو میں وجودی ... فکر و احساس کو مقبولیت
حاصل ہوئی، میرے نزدیک ... وجودیت کا نقطۂ آغاز یہی ہے
(کتاب ... بالیاتی روایت کے
ایک باب کی تلخیص)

قمر جہاں

"کوئی روشنی"

(ایک نیا افسانہ)

تجزیاتی مطالعہ کے آئینہ میں

رسالہ "افکار" ششماہی جولائی ۱۹۸۲ء میں غیاث احمد گدی کا افسانہ "کوئی روشنی" شائع ہوا ہے۔ غیاث احمد صاحب افسانے کی دنیا میں جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہو کر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس لئے ان کی تعارف کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

البتہ آجکل اردو کا افسانوی ادب جس بحرانی دور سے گزر رہا ہے اس میں کوئی اچھی کہانی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں آج کہانی کی تعریف و تعارف زیادہ ضروری ہے ــــــ "کوئی روشنی" اچھی ہی نہیں، خاصی اچھی کہانی ہے ــــــ افسانہ کا آغاز بڑے ہی ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے۔ پہلی سطر ہی قاری کی تمام تر توجہ مرکوز کر لیتی ہے:

"مگر عورت ضبط نہ کر سکی۔ بیقراری سے
اس کی چیخ بگولے کی طرح اٹھنے کو ہوتی
ہے۔ مرد محسوس کر لیتا ہے اور گھبرا کر اندھیرے
میں ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیتا
ہے ــــــ چیخ گلے کے اندر پھڑپھڑا کر
رہ جاتی ہے۔"

اس کہانی میں دو کردار ہیں۔ ایک عورت، دوسرا مرد۔

کہانی جب شروع ہوتی ہے تو بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے کہانی جنس (SEX) کے عام موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن جنس کا بیان بھدّے طریقے پر نہیں بلکہ بڑے نکھرے ہوئے انداز میں، بڑے مہذب ڈھنگ اور بڑے محتاط انداز میں ہو رہا ہے۔ کہانی کی زیریں عبارت ملاحظہ ہو جو اپنے مصنف کے زورِ قلم کی بڑی اچھی مثال ہے۔

مرد کا مضبوط ہاتھ نیم جاں لبوں سے پھسلتا
ہوا عورت کے کندھے کو آہستہ آہستہ
تھپتھپانے لگتا ہے۔ پرخلوص ہاتھوں کا
لمس دھیرے دھیرے شانے سے ہوتا
اس کے (عورت کے) منجمد وجود کو نرم
کرتا اس کے اندر اتر جاتا ہے۔
دونوں کی آنکھیں پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
لرزیدہ خوف ایک لمحہ کو ٹھہرتا اور پھر چلا
بجھ جاتا ہے ــــــ وہ عورت ادا

مرد آنکھیں موند لیتے ہیں۔
پڑھنے والے کی آنکھیں بھی لذت میں بند ہونے لگتی ہیں گویا کو بھی
اپنے قاری کی اس کمزوری کا غالباً احساس تھا اس لئے کہانی کا
دوسرا موڑ عورت کی بےچین کروٹ اور اس کی تیکھی سرگوشی سے
شروع ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"...... ذرا دیر عورت بمشکل تمام پہلو بدلنا
چاہتی ہے تو بدن پائپ کی سخت دیوار سے
رگڑ کھانے لگتا ہے"

"مگر تم مجھے بولنے کیوں نہیں دیتے"؟

عورت تیکھی سرگوشی میں کہتی ہے ـــــ مرد کا جواب سننے
کے لئے عورت کے ساتھ ساتھ قاری بھی بےقرار ہوا تھا
ہے۔ کردار کے جذبات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ قاری
کے جذبات کا ہم آہنگ ہونا کچھ ایسا آسان کام نہیں ہے۔ یہ ہنر
لکھنے والے کو نہیں آتا ہے۔ غیاث کا قلم اپنے قاری کی دل کی
دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہاں پر وہ منٹو سے وہ
مشابہ نظر آتے ہیں۔ فن پر منٹو کی جو گرفت ہے۔ وہ غیاث کو
بھی حاصل ہے ـــــ ہاں تو جب عورت کہتی ہے۔

تم مجھے بولنے کیوں نہیں دیتے،؟

مرد کا یہ جواب دینا کہ:

"اس لئے کہ بولنا بلکہ سانس لینا بھی آج کی
رات جرم ہے"

قاری کے جذبات کو تیز سے تیز تر کرتا جا رہا ہے۔
کہانی خوش خرامی کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی ہے۔
باہر تاریک ترین رات کے جسم پر کتنی ہی خراشیں پڑ چکی ہیں۔
اور اس کے سیاہ کار خطاکار جسم سے گہرا سیاہی مائل لہو نکلنے
لگتا ہے۔ دور کہیں کتے کی ہیبت ناک بھونکار ہے۔ تو کہیں
تڑتڑاتی بل کھاتی جلتے ہوئے مکانوں کے خونیں شعلوں کی لپک۔
یہاں پر پہنچنے کے بعد کہانی کا موضوع ریشم کے
خوب صورت لچھے کی طرح آہستہ آہستہ کھلنے لگتا ہے۔ اور موضوع
کی سنجیدگی و تلخی دھیرے دھیرے قاری کے ذہن پر مرتسم ہونے
لگتی ہے۔

مرد اور عورت گہرے اندھیرے میں پائپ کے اندر
ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گھپ اندھیرے
میں دم گھٹ رہا ہے۔ عورت جو زیادہ نفیس و نازک ہوتی ہے،
وہ مرد سے شکوہ کرتی ہے:

"لیکن تم مجھے بولنے...... مجھے رونے کیوں نہیں
دیتے۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے"۔
"میرا بھی دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں بھی جانتا
ہوں کہ درد کی بھاری چٹان جو میری چھاتی
پر پڑی لحہ لحہ بھاری ہوتی جا رہی ہے....
اسے دور پھینک دوں"

لیکن مرد رکتا ہے۔ عورت کو آہستہ مگر پیار سے گلے لگا لیتا ہے
سرگوشی اور گہری ہو جاتی ہے۔ اور قاری اس مقام پر پہنچ
جاتا ہے۔ جہاں اسے کہانی کے کردار کی زبانی یہ معلوم ہوتا
ہے کہ باہر جبر کی اندھی رات ہزاروں لاکھوں سیاہ ٹڈے کھڑی
ہے ـــ اور اس کے خوف سے وہ دونوں جو کوئی اجنبی نہیں
بلکہ زن و شوہر ہیں، ایک جان دو جسم ہیں۔ ایک تنگ پائپ میں
زندگی بچانے کی خاطر چھپ گئے ہیں ـــــ زندگی سے انسان
کا یہ اٹوٹ پیار، دوسری طرف آدمی آدمی کا دشمن، یہ دنیا جو
بے حد حسین ہے۔ لیکن کبھی کبھی خود انسانیت کے ہاتھوں ہی
کیسی کریہہ المنظر ہو جاتی ہے۔ جہاں پیار، محبت اور زندگی
ہی روشنی ہونی چاہئے تھی مگر...... مگر جہاں تاریکی اور
دم گھٹا دینے والا منظر ہے۔ خاک و خون میں نہائی ہوئی
کائنات ہے۔ اور وحشتناک سیاہ ننگے شیطانوں کے رقص
کا سماں ہے۔ ایسے میں آسمان بھی کراہتا ہوا محسوس ہوتا ہے
ملاحظہ ہو غیاث صاحب کی فضا آفرینی:

"مگر مرد اس کی باتوں کا جواب نہیں دیتا،
اور پائپ سے باہر جھانک کر آسمان کی
طرف دیکھتا ہے۔ جو تاریکیوں میں ڈوبا
دھیرے دھیرے کراہ رہا ہے گویا اس
کے سینہ پر کوئی بھاری چٹان رکھ دی گئی
ہو ــــ"

ایک بہت مشہور مثل ہے کہ "من چنگا تو کٹھوت میں گنگا" یعنی
اس کائنات کی ہر شئے کا لطف انسان کے مزاج اور موڈ
سے وابستہ ہے۔ چونکہ کہانی کا ہیرو، اس وقت غم زدہ ہے
خود اس کے سینہ پر بھاری چٹان کا بوجھ محسوس ہو رہا ہے
لہٰذا اسے آسمان بھی اپنے ہی طرح دردناک نظر آرہا ہے۔
یہاں غیاث نے ایک معمولی سے جملے سے انسانی نفسیات کی
بڑی بہترین تصویر کشی کی ہے ــــ نئے کہانی کاروں
میں زبان و بیان کا یہ مناسب اور برمحل استعمال بہت کم
لوگوں کو معلوم ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں اس
شدت سے متاثر نہیں کرتی۔ ان میں منظر نگاری بھی ہوتی ہے
تو الفاظ کے کھیلے بازی سے کام لیا جاتا ہے خواہ مخواہ کے
لئے بھاری بھر کم الفاظ کا استعمال ایک ہی لفظ کی بار بار
تکرار ــــ لیکن غیاث کے یہاں ہر ماحول و منظر
اپنے لئے خود مناسب الفاظ کا استعمال کر لیتے ہیں۔ ان کے
یہاں منظر کا بیان یا کردار کے جذبات و احساسات کی ترجمانی
افسانے سے الگ نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ یہ تمام چیزیں افسانے
کے موضوع کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتی ہیں کہ ان کے
ذریعہ مجموعی تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ افسانے کے کردار
سرگوشی کے انداز میں ایک ایک کر دو چار جملے کہتے ہیں۔ مکالمے
بھی بے حد مختصر اور لطیف ہیں۔ لیکن ان ہی دو چار جملے میں
کہانی واضح ہوتی جاتی ہے۔ کہانی جب شروع ہوئی تھی، تو
ہزار حریری پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ
نقاب سرکتا جاتا ہے۔ اور موضوع سامنے آتا جاتا ہے ــــ
موضوع جو انسان کی وحشت ناکیوں اور اسکی مجبوریوں کی
داستان ہے وہ اپنی تمام تر ہیبت ناکیوں کے ساتھ قاری
کے ذہن کو متاثر کرتا جاتا ہے۔

کردار کے مکالمے کہیں کہیں ہی واضح ہو کر سامنے آتے
ہیں۔ ورنہ زیادہ تر مکالمے مبہم ہی ہیں۔ ان سے صرف ان
کرداروں کی ذہنی و جذباتی کیفیات کا ہی اندازہ ہوتا ہے
لیکن کہانی کے دو چار ہی مکالمے پوری کہانی کو اشارے
اشارے میں کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً

"...... کیا ۔ ؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو، ساری
بات کو الجھا کر ایسی سنگ صفت رات
میں، جب خوف سے میری جان، تمہاری
جان، موت اور صرف موت کے درمیان
جھول رہی ہے، تم ...... تم ایسی نرم باتیں
کیسے کر لیتے ہو؟"

"تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ سب کچھ جل کر راکھ
ہو گیا .... عورت رُندھے ہوئے گلے
سے کہتی ہے ..... ظالموں نے کچھ بھی
نہیں چھوڑا ــــ"

اس کے بعد یہ منظر:

سامنے جلتے مکانوں کی دھڑا دھڑ گرتی
ہوئی دیواروں کو دیکھ کر ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ جیسے ظلم کی اس خطاکار رات
کے پاس دور دور تک تاحد نگاہ اندھیرا
ہی اندھیرا ہے۔ وحشتناک چیخیں ہیں
درد ہے۔ بے چارگی اور سیاہی ہے۔
ــــ آہ و بکا کی دل ہلا دینے
والی آوازیں ہیں۔ قتل ہے، خون ہے

جبر ہے ---!"
"ستم کی اس خدائی میں کوئی خدا نہیں کوئی
خدا نہیں، کوئی خدا ......"

اس مقام پر کہانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہوتی ہے۔ ظلم کی داستان بھرپور انداز میں اپنے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

اسی وقت عورت کا اچانک گھبرا کر باہر نکلنے کی جسارت اور مرد کا یہ کہنا:

"تم پاگل تو نہیں ہو گئیں ......"

حالات کی سنگینی کو زیادہ واضح انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔

عورت کا اصرار باہر نکلنے کے لئے تڑپاہٹ کی مثال بن کر شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے لیکن مرد جو محض جسمانی اعتبار سے مضبوط نہیں ہوتا بلکہ جذباتی اعتبار سے بھی عورت کے مقابلے میں زیادہ قوی تر ہوتا ہے۔ بڑے صبر و تحمل سے کام لیتا ہے۔ اور عورت غیاث کے الفاظ میں:

"مرد کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں چھٹپٹا کر رہ جاتی ہے" اور پھر رونے لگتی ہے

یہاں پر اس کا رونا بھی عین فطری ہے۔ اور درد کے تاثر میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

پھر مرد کی ہمدردی عورت کے لئے ظاہر کی جاتی ہے۔ جس سے کچھ دیر کے لئے افسانے کی گرانبار فضا قدرے سبک ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر فوراً آہ و بکا کی آوازوں کے ساتھ کتے کی خونیں بھونکار ساری کائنات کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اور وہ دونوں خوف و ہراس سے ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ بند آنکھوں میں سناٹا پھیل جاتا ہے۔ اس کے بعد کہانی کے کردار کی زبانی یہ تاثر جگاتا ہے کہ

"اس بھیانک سنم بستہ رات کا کوئی انت
ہے۔ ؟ کوئی انت، کوئی انت۔ کوئی

چھوڑ رہے ....؟"

یہ مکالمہ محض ایک سیدھا سادا مکالمہ نہیں۔ یہ جملے بڑے علامتی ہیں۔ اور بڑی گہری معنویت کے حامل ہیں ——— یہ رات حقیقت میں کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے درد کا کوئی انت نہیں۔ غم لازوال ہے، کائنات کی طرح وسیع اور بہت گہرا ———

غیاث چھوٹے اور معمولی جملوں میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ اس قدر سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ گہری اور فلسفیانہ بات کہہ جانا غیاث کے فنی عظمت کی دلیل ہے۔ ان کی نظر کی باریکی، فکر کی دوربینی، اور انداز اظہار کی کامیابی کی دلیل ہیں ——— کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے اور ذہن و خیال کے بند دریچے کھلتے جاتے ہیں۔

اچانک عورت درد کی شدت سے کراہ اٹھتی ہے وہ چیخنا چاہتی ہے لیکن بے رحم وقت اسے چیخنے بھی نہیں دیتا وہ دانت پر دانت چڑھائے گہری چیخ کو دبائے ضبط کے فصیل کے گرد تڑپتی رہتی ہے۔ مرد معاملہ کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتا اور وہ پوچھتا رہ جاتا ہے:

"کیا ہوا ؟.... کیا ہوا ؟"

وہ شدت درد سے جواب نہیں پاتی۔ اور نڈھال ہو کر مرد کے بازوؤں میں جھول جاتی ہے۔ اندھیرا حسب حال سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے عورت بے ہوش ہو چکی ہے۔ اس کا وجود بے جان لاش کی طرح اس کے بازوؤں میں پڑا ہے ——— مرد چونکتا ہے اور انتہائی ہمدردی سے کہتا ہے:

"تم ہمت نہ ہارو،
اگر ہمت ہار گئیں
اگر ہار گئیں ......"

مایوسی کے درمیان یہ مختصر الفاظ جینے کی یہ نئی قوت عطا کرتے

ہیں عورت از سرِ نو ہوش میں آجاتی ہے۔ ہمت جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے ـــــ لیکن وہ درد کے ساتھ ساتھ پیاس کی شدت سے بے چین ہے۔ وہ پانی طلب کرتی ہے۔ لیکن مرد کسی اور خیال میں گم ہے۔ اس سے پوچھتا ہے،

"تم کہاں کھو گئیں تھیں ابھی ......؟"

عورت بھی پیاس بھول کر اس نورانی خیال میں گم ہو جاتی ہے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے ہاتھ اور چھوٹے چھوٹے خوب صورت پاؤں بے حد خوب صورت ہونٹ جن پہ پیاس کی شدت سے پپڑیاں جم رہی تھیں ......

عورت پیاس کی شدت سے پھر بے چین ہو اٹھتی ہے اور مرد باہر خطرات سے واقف ہونے اور عورت کے ہزار منع کرنے کے باوجود پانی کی تلاش میں باہر نکل جاتا ہے۔ کیونکہ اسے یہ خوف ہے کہ کہیں اس کی لاپرواہی سے اس کی بیوی کے رحم میں زندہ بچہ پیاس کی شدت سے اپنی جان نہ کھو دے۔

باہر چنگھاڑتی ہوئی خونخوار آوازیں، آہ و بکا، درد میں ڈوبی ہوئی کائنات ہے۔ بہت سے بھیڑیئے، خونخوار آدم خور درندے، چیختے چلاتے عفریتوں سے پھر رہے ہیں۔

اندیشوں کے گھنے اور سیاہ جنگل میں اس کا وجود لڑکھڑاتا ہوا بھٹکتا پھر رہا ہے۔ کوئی منزل نہیں۔ دور دور تک کوئی منزل، کوئی نشانِ منزل نہیں ..... کوئی روشنی نہیں

ایسے ہی اندیشوں کے سیاہ جنگل میں اس کا خاوند بھی پانی کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ کہیں ایک قطرہ پانی نہیں ـــــ دونوں کی سوچ دھارا ایک ہی محور پہ ہے۔

اگر پانی نہیں ملا ..... ؟

اگر مرد واپس نہیں آسکا ...؟

اچانک درد کی بے پناہ یورش سے وہ بوکھلا اٹھتی ہے۔ اور باہر کی سنگدل دیواروں کو جھنجھوڑنے لگتی ہے۔

دوسری طرف مرد گھنے تاریک ترین جنگلوں میں، سفاک، بے رحم پہاڑوں کی تپتی ہوئی چٹانوں پر خونخوار درندوں کے درمیان، بھٹکنے والے ہزاروں، لاکھوں نیک دل انسان اور ان کے سروں پر منڈلاتے والے گرسنہ گدھوں کی یلغار .... اور اس خونیں یلغار میں کسی آبِ حیات کی تلاش میں سرگرداں اولادِ آدم کی جہدِ مسلسل ...... کوئی روشنی ...... کوئی روشنی ..... کوئی روشنی ...

کہانی ان الفاظ کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پوری کہانی کا اصل موضوع کسی ایک فرد کا غم نہیں۔ بلکہ یہ غم سینکڑوں انسانوں کا غم ہے۔ ایک بڑی آبادی کا غم ہے۔

یہ حالات جن سے اس کہانی کا ہیرو اور ہیروئین دوچار ہیں۔ آج کی زندگی کے عام حالات ہیں۔ یہاں ہر آن زندگی خطرے میں ہے۔ انسان نئی تہذیب میں غیر محفوظ ہوتا جا رہا ہے۔ درندگی، دہشت ناکی، ظلم و جبر بڑھتا جا رہا ہے۔ آدمی صرف نام کا آدمی ہے۔ اور اس نام کی آدمیت نے پوری انسانیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان تمام باتوں کو غیاث صاحب نے بڑی خوب صورتی سے فن کے سانچے میں پیش کیا ہے۔ بظاہر یہ کہانی ایک فرد کی کہانی ہے۔ لیکن یہ ایک فرد طویل انسانی طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ دوسری طرف لوٹ مار کی جو فضا ہے۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے آئے دن ہونے والے حادثات کو پیش کرتے ہیں۔ وہ حادثات جو بہار شریف، بلچھی میں ہوئے، بھنگلا وا میں ہوئے، دا اپنی و جمشید پور میں ہوئے، مرادآباد اور بنگلہ دیش میں ہوئے ـــــ ان حادثات کی نوعیت بدل سکتی ہے لیکن صورت تو وہی رہتی ہے۔ نام بدل سکتے ہیں۔ لیکن کام تو وہی ہوتا ہے۔

غیاث کی یہ کہانی آدمیت کی اس المناک انجام

پر بھی رجائیت سے لبریز ہے۔ اور یہ ان کے قلم کا ایک
نیا رُخ ہے کہ تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں بھی وہ اولاد
آدم کو جہد مسلسل کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اور کوئی روشنی، اور
کوئی روشنی کی تکرار میں ایک خوب صورت مستقبل کا خواب
دیکھتے رہنے کا آرزو مند بناتے ہیں۔

یہ کہانی آج کے ادب میں ایک خوشگوار اضافہ
ہے۔ صرف غیاث کی کہانیوں میں ہی نہیں اسے موجودہ ادب
میں ایک امتیازی حیثیت ملنی چاہیئے، اور ضرورت اس
امر کی ہے کہ ہم ایسی کہانیوں کا ایک انتخاب شائع کریں
جو نئی نسل کی رہنمائی کر سکے۔

بہت دن قبل میں نے غیاث صاحب کی ایک
کہانی پڑھی تھی۔ غالباً عنوان تھا "خانے اور تہہ خانے"
وہ کہانی بھی ان کی بڑی کامیاب کہانی تھی۔ اس کے ان
کی بہت ساری کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ لیکن جو بات اس
تازہ ترین کہانی (کوئی روشنی) میں ہے وہ اوروں میں
کہاں ——

اس امر میں شاید دو رائے نہیں ہو سکتی کہ
غیاث احمد گدی کو صحیح معنی میں کہانی کہنے کا ہنر معلوم
ہے۔ ان کی زیادہ تر کہانی اچھی ہیں۔ لیکن "خانے اور تہہ
خانے" اور "کوئی روشنی" کو اگر ہر قسم کی تعصبات کی
عینک کو اتار کر دیکھا جائے۔ تو بہت خوب ہیں۔ فن کا
جو سلیقہ غیاث صاحب کو معلوم ہیں وہ سلیقہ کسبی نہیں
وہبی ہیں۔ اپنی ان کہانیوں کی روشنی میں وہ بھی بقول مومن
اس طرح کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ؎

سن رکھو، سیکھ رکھو اس کو غزل کہتے ہیں
مومن اے اہل فن اظہار ہنر کرتا ہے

غیاث کو بھی اظہار ہنر کا طریقہ معلوم ہے۔ کہانی صرف موضوع
کے انتخاب سے اہم نہیں ہوتی، اصل چیز اس کی پیشکش
ہے۔ اور یہ انداز پیشکش ہی اعلیٰ اور ادبی فنکار کی پہچان
کراتے ہیں۔ ●

بقیہ ایک ٹھہرا ہوا عکس

جاگ گئیں، بالکل صاف اور روشن جیسا ابھی کی ہوں۔۔۔۔
کالج کا لمبا سا کاریڈور اور وہاں کھڑی دو پرچھائیاں ۔۔۔۔۔۔
کالج کا لان ۔۔۔۔ بینچ پر بیٹھا ہوا ایک لڑکا جو ایک لڑکی کی کاپی
پر کچھ لکھ رہا ہے ۔۔۔۔۔ کالج کی لائبریری ۔۔۔۔ کالج کا فنکشن
۔۔۔۔ کالج کے بغل کا ریستوران ۔۔۔۔ اور پھر گنگا کا ساکت منظر
وقت کی ریل تیزی سے چلتی رہی۔ پرانے لمحوں نے نئے
لمحوں کا تعاقب کرنا چھوڑ دیا۔ اور لمحوں کے جگنو جو ایک سمت کو
تیزی سے بھاگتے رہے۔ اور ایک دن ۔۔۔۔

نیرو یہ میری بیوی اور بچے ہیں
سچ وشی تمہارے بچے بالکل تم پر گئے ہیں اور میں
نیرو سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا اس کے بچے میری طرح نہیں ہیں
لیکن اپنے چاروں اور سناٹوں کا زور تھا ۔۔۔۔ اور تصویریں
۔۔۔۔۔ جاگتی روشنی تصویریں ۔۔۔۔۔ میں ذہن کو جھٹک دیتا
ہوں اور ساری تصویریں اچانک اوجھل ہو جاتی ہیں۔

اور ایک بار پھر وقت نے تیزی سے دوڑنا شروع
کر دیا۔ سب کچھ بھاگنے سا لگا۔ راشی اپنی پڑھائی ختم کر کے
ایک پرائیوٹ فرم کا منیجر ہو گیا۔ ہنی ڈاکٹری کا آخری سال پورا
کر رہی ہے۔ اور آج ۔۔۔۔۔

راشی اور نیلو دولہا دولہن بنے، مجھ سے آشیرواد لینے
آئے ہیں۔ سامنے لگے آئینہ میں میں دیکھ لیتا ہوں کہ میں بوڑھا
ہو چکا ہوں۔ بال سفید ہو چکے ہیں۔ اور چہرے کی جھریاں
کافی گہری ہو گئیں ہیں۔ لیکن میرے ذہن میں ساکت گنگا کا منظر
پھر ہچکولے لینے لگتا ہے ۔۔۔۔ جہاں ایک لڑکی ایک لڑکے کے کاندھے پر
سر رکھتے ہوئے پوچھتی ہے کیا سوچ رہے ہو وشی؟ ہم بوڑھے نہیں
ہو گے کیا؟ ان کے چہرے پر جھریاں نہیں آتی ہیں؟ شاید نہیں!

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

بے زبان

رات بھر گولیاں چلتی رہیں۔ فوجی گاڑیاں شہر کا گشت لگاتی رہیں۔ ہر طرف چھائی ہوئی گہری خاموشی میں وقفے وقفے سے شور بلند ہوتا رہا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں سہمے سہمے بیٹھے رہے۔ اور فضا پر محیط تاریکی ہر لمحہ خوفناک شکل اختیار کرتی گئی،

پھر رات دبے پاؤں چلتی ہوئی صبح تک آ پہونچی، اور سورج کی پہلی کرن نے دیکھا کہ شہر کے وسطی حصہ میں واقع ایک مکان کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔

دروازے کے دونوں پٹ دو طرف فرش زمین پر پڑے ہوئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے دروازہ توڑنے کی کافی جد و جہد کی ہو۔ اور بڑی زور آزمائی کے بعد دونوں پٹ کو دروازے سے جدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں۔ چوکھٹ پر اب بھی لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے قبضے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، اور فرش زمین پر پڑے ہوئے دروازے کے دونوں پٹ مردہ خور جانور کی نوچی ہوئی، لاشوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

مکان بے حد خوب صورت تھا، مکان کے تین طرف چھوٹی بڑی سڑکیں تھیں، ان تینوں سڑکوں کے بیچ میں یہ چھوٹا سا مکان سنگ میل کی طرح کھڑا تھا۔ ٹوٹے ہوئے دروازہ کے سبب اس کی ساری خوب صورتی مجروح ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں بھی بغیر دروازہ کا گھر بے مقصد ہوتا ہے۔ کہ وہ سیلاب کے پانی کو نہیں روک سکتا۔ بغیر دروازے کا قلعہ غیر محفوظ ہوتا ہے کہ دشمن کے سپاہ جب چاہیں اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ اور بغیر دروازہ کا مکان خواہ کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو ننگا نظر آتا ہے۔ مکان میں دروازہ نہ ہو تو ہر شخص بلا روک ٹوک اندر داخل ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اپنے پرائے اور دوست دشمن کی پہچان دروازے کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید مکان میں دروازہ لگانے کی ضرورت ہی پڑتی،

مکان کا دروازہ کافی مضبوط تھا، مالک مکان۔ دروازہ بناتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہ آسانی سے نہ ٹوٹ سکے، اس خیال کے تحت اس نے چوکھٹ اور دونوں پٹ کے لئے مضبوط اور قیمتی لکڑی استعمال کی تھی۔ جب دروازہ تیار ہوا تھا اور بڑھئی نے دونوں پٹ کو چوکھٹ کے ساتھ نصب کر دیا تھا۔ تو وہ بہت خوش ہوا تھا، اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ دروازہ آسانی سے ٹوٹ جائے گا،

اس نے سوچا تھا کہ اس کے مال اور جان کی حفاظت کے لئے یہ دروازہ پہلا محافظ ہوگا۔ اور اسی اعتماد اور یقین کے ساتھ وہ نہ جانے کتنی مدت تک دروازہ بند کر کے بستر پر بے فکری کی نیند سوتا رہا تھا۔ لیکن جب اس نے

ٹوٹنے کی آواز سنی ہو گی، تو اسے کتنی حیرت اور مایوسی ہوئی ہو گی

دروازہ کے سامنے ایک تپلی سی گلی تھی، جو اندر جا کر دائیں اور بائیں دو دروازوں سے ملتی تھی، ٹوٹے ہوئے اس دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی اس تپلی سی گلی میں ایک تین چار ماہ کے بچے کی لاش خون میں لت پت پختہ فرش پر پڑی ہوئی تھی، بچے کے ایک پاؤں میں گلابی موزہ تھا، اور دوسرے پاؤں میں سرخ رنگ کا جوتا بھی تھا۔ بچے کو کسی نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ کر نصف جسم تک بے دردی سے چیر کر گلی میں پھینک دیا تھا۔ دیوار پر ایک بڑا سا خون کا دھبہ تھا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پہلے دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اور اس کے بعد فرش پر آ پڑا تھا۔ بچے کے جسم پر نیلے رنگ کا سوٹ تھا، جو جگہ بہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا، شاید کسی نے اس کی جان بچانے کے لئے مزاحمت کی تھی، اور اسی مزاحمت میں اس کا سوٹ پرزے پرزے ہو گیا تھا، دیوار سے ٹکرانے کے باعث اس کی پیشانی پر زخم کا ایک نشان تھا، لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ گہری نیند میں سویا ہوا ہو، اور کسی بھی لمحہ آنکھیں کھول کر دیکھنے لگے گا۔

جب یہ بچہ پیدا ہوا تھا، تو اس کے گھر میں بے حد خوشیاں منائی گئی تھیں، خاندان کے تمام لوگ اکٹھے ہوئے تھے، ڈھولک بجے تھے، گیت گائے گئے تھے، اور بہت ساری آرزوئیں اور خواہش سمٹ کر اس گھر میں جمع ہو گئی تھیں، مستقبل کے بہت سارے خواب دیکھے گئے تھے، اور یہ تقریب کئی دنوں تک جاری رہی تھی،

افراد خاندان نے اسے تعلیم دلا کر اسے بڑا افسر بنانے کے منصوبے بنائے تھے، اس مسئلے پر ان کے درمیان کئی دنوں تک بحث ہوتی رہی تھی، کوئی اسے انجینیر بنانے کا خواہاں تھا کسی کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے، کوئی اسے وکیل بنانے پر مصر تھا، تو کوئی اسے مجسٹریٹ بنانے پر بضد تھا، گھر کا ہر فرد اسے اعلیٰ سرکاری عہدے پر دیکھنے کا خواہش مند تھا، یہ کوئی نئی بات نہ تھی عام طور پر ہر گھر میں بچے کی پیدائش کے بعد ایسے ہی خواب دیکھے جاتے ہیں۔ اور زندگی کی گہما گہمی کے درمیان ایسے خواب بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر انسان کی زندگی میں مستقبل کے سہانے خواب نہ ہوں تو وہ دم گھٹ کر مر جائے، سبھی اپنی اپنی بات منوانے کے لئے کتنے ہی دلائل پیش کرتے رہے۔ اور ان کے دلائل اتنے وزنی تھے، کہ کوئی بھی ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکا تھا۔ اور یوں وہ سب اپنی اپنی خواہشوں کو سینے میں دبائے خاموش ہو گئے تھے،

بچے کے والدین خوش تھے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ان کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا، ان کی جائداد کا وارث ہو گا، اور ان کے مرنے کے بعد ان کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھے گا، اور چراغ جلائے گا۔ پھول چڑھائے گا۔

ماں نے سوچا تھا جب اس کا لڑکا بڑا ہو گا۔ تو وہ اپنی پسند سے بیٹے کی شادی کرے گی، چاند سی بہو گھر میں لائے گی جسے دیکھ کر سبھی عش عش کریں گے، اور بہو کے حسن اور سلیقے کی تعریف سن کر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے گی،

باپ نے سوچا تھا جب اس کا لڑکا بڑا ہو کر سماج اور سوسائٹی میں اعلیٰ رتبہ پائے گا۔ تو اس کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی، اس کا سر فخر سے تن جائے گا۔ اور جب اس کے قویٰ کمزور ہو جائیں گے تو اس کا بیٹا اس کے لئے آرام و آسائش کا سامان فراہم کرے گا اور پھر ایک دن بڑے اطمینان و سکون کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کرے گا۔ اور اس طرح اس کی زندگی کی تکمیل ہو جائے گی۔

لیکن اب وہ بچہ تمام سہانے خوابوں، ساری امیدوں اور آرزوؤں کے کفن میں لپٹا ہوا خون میں لت پت پختہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔

چند ہی دنوں قبل بچے کے سوٹ خریدنے کے سلسلے میں
رنگوں کے انتخاب پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا، دادی کو
گلابی رنگ پسند تھا، ماں کو سرخ رنگ اچھا لگتا تھا، اور باپ
کو نیلا رنگ، آخر بڑی بحث و تمحیص کے بعد انہوں نے آپس میں
سمجھوتہ کر لیا تھا پھر نیلے رنگ کا سوٹ، گلابی موزہ، اور سرخ
جوتا خرید کر تینوں پسندیدہ رنگوں کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ کئی دکان
کا چکر لگانے کے بعد شوہر و بیوی نے مل کر انتہائے شوق اور
فریفتگی کے عالم میں تینوں چیزیں انتخاب کی تھیں، اور وہاں
سے اپنے دلوں میں بے پناہ خوشیاں سمیٹے ہوئے گھر لوٹے تھے۔

گھر پہونچ کر ماں نے جلدی جلدی پانی گرم کر کے بچے
کو نہلانے سے پہلے بچے کو پالنے سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا
تھا۔ اور دیر تک اسے والہانہ انداز میں پیار کرتی رہی تھی، پھر
اس نے بچے کو نہلایا تھا، اس کے جسم کو تولیہ سے پونچھا تھا
پوڈر ملا تھا اور اس کے بعد اس نے اپنے شوہر کے پاس لے آئی
تھی، پھر دونوں شوہر و بیوی نے مل کر انتہائے شوق اور فریفتگی
کے عالم میں بچے کو سوٹ پہنایا تھا۔ موزہ اور جوتا پہنایا تھا
اور اسے پالنے پر جھلاتے ہوئے گھنٹوں اشتیاق بھری نگاہوں
سے دیکھتے رہے تھے،

لیکن رات کے پچھلے پہر جب دروازہ ٹوٹا، اجنبی قدموں
کی آواز ابھری، تو وہ دونوں چونک کر نیند سے بیدار ہو گئے
تھے، ماں نے غیر ارادی طور پر اپنے بچے کو گود میں سمیٹ لیا تھا
اور جب ان کے کمرے کا دروازہ توڑ کر چند اجنبی چہرے،
کمرے کے اندر داخل ہوئے تھے، تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ
وہ کیا کرے، پھر اجنبی ہاتھوں نے جب اس کی گود سے بچے کو
چھیننے کی کوشش کی تھی، تو وہ بپھر گئی تھی، اور بچے کی جان بچانے
کے لئے عالم دیوانگی میں کمرے سے نکل کر باہر برآمدے پر آ گئی تھی
پھر اس نے اپنے مستقبل کے سنہرے خوابوں کو اپنی آنکھوں
کے سامنے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے دیکھا تھا،

گلی کے بائیں طرف جو کمرہ تھا اس کا دروازہ بھی ٹوٹا تھا
اور کمرے کی ہر چیز بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی، اس
کمرے سے ملحق ایک دوسرا کمرہ تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا
اور اس کے اندر دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں، ایک بوڑھا مرد
تھا، دوسری ضعیف العمر عورت، دونوں کے سینے میں گولیوں
کے نشانات تھے، بوڑھا شاید دروازہ کھول کر دوسرے کمرے
میں جھانک رہا تھا۔ لیکن گولی لگنے کے سبب وہیں فرش پر ڈھیر
ہو گیا تھا۔ ضعیف العمر عورت شاید اپنے بستر کے سامنے ہی
کھڑی تھی، اس لئے گولی لگنے کے بعد اس نے پلنگ کی مچھر دانی پکڑ
کر سنبھلنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کے بوجھ سے مچھر دانی پھٹ
کر نیچے کی طرف جھول گئی تھی، اور ایک جھٹکے کے ساتھ فرش پر اس
کے گرتے وقت اس کی عینک چھٹک کر دیوار سے جا ٹکرائی
تھی۔

یہ مکان بچے کے دادا نے بنوایا تھا۔

دادا نے جب اس مکان کی تعمیر کی تھی، تو وہ کتنا خوش
تھا اور اپنے مستقبل سے کتنا مطمئن تھا،

اس کی عمر تیس سال کی تھی جب وہ اپنے بھائیوں
سے خفا ہو کر اپنا آبائی مکان چھوڑ کر اس شہر میں آ بسا تھا
نیا شہر، نئے لوگ، اور اجنبی ماحول میں وہ بہت دنوں تک
گھبرایا گھبرایا پھرتا رہا۔ روتا رہا۔ بلکتا رہا، پھر بھی اس نے ہمت
نہیں ہاری، اور جو قلیل سرمایہ اس کے پاس تھا، اس سے گڑ
کا کاروبار شروع کیا تھا، ان دنوں اس نے ایک کھپریل مکان
کرایہ پر لے رکھا تھا، جس کی دیوار بانس کے درمے کی تھی، اور
فرش کچی تھی، اور ان ہی دنوں ان کے یہاں پہلی اولاد پیدا
ہوئی تھی،

وہ مسلسل دن رات کئی سال تک محنت کر کے اپنے
کاروبار کو فروغ دیتا رہا۔ اور روکھی سوکھی کھا کر کم سے کم انداز
کرتا رہا اس سلسلے میں اس کی بیوی نے بھی اس کے ساتھ بھرپور

تعاون کیا تھا۔ اور اپنی کم مائیگی کے باوجود برابر اس کی حوصلہ
افزائی کرتی رہی۔ ان دونوں کو اپنے آبائی مکان چھوڑنے
کا غم تھا، جب یہ غم شدید ہو جاتا تو غیر ارادی طور پر ان کے
دلوں میں اپنا مکان بنانے کی خواہش مچل اٹھتی۔ پھر جیسے،
جیسے دن گزرتے گئے، یہ خواہش اور بھی شدید ہوتی گئی۔

اس عرصے میں اس کے بھائیوں نے بارہا اسے واپس
چلے آنے کو کہا کبھی کبھی خود اس کا دل بھی چاہتا کہ وہ چلا جائے
لیکن ہر مرتبہ اس کے پاؤں مٹی سے چپک جاتے، لہلہاتے ہوئے
کھیت، ہرے بھرے درخت، بل کھاتی ہوئی ندیاں، اور شناسا
چہرہ کا ہجوم قطار باندھے اس کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے
اور پھر وہ اس شہر کو چھوڑنے کے خیال سے ملول ہو جاتا۔ اس
کشمکش میں دن گزرتے رہے نئے رشتے ہموار ہوتے رہے،
اور آہستہ آہستہ وہ نئے ماحول سے مانوس ہوتا گیا۔

ایک رات جب شوہر نے کھانا کھانے کے بعد بیوی
سے مکان بنوانے کا خیال ظاہر کیا، وہ تو وفور شوق اور خوشی
سے مغلوب ہو کر شوہر کے جسم سے لپٹ گئی تھی، اس روز وہ
دونوں رات بھر نہیں سوئے۔ جاگتے رہے۔ نئے مکان کے بارے
میں باتیں کرتے رہے۔ اور اپنے ذہن میں نئے نئے خاکے بناتے
رہے۔ اب ان کے لڑکے کی عمر ۵ سال کی ہو چکی تھی۔

پھر زمین خریدی گئی، اینٹیں خریدی گئیں، سمینٹ کی
بوریاں خریدی گئیں اور مکان کی بنیاد پڑ گئی،

ایک دن شوہر زیر تعمیر مکان دکھانے کے لئے بیوی
کو رکشا پر بٹھا کر لے آیا، ______ اس مکان میں چار
کمرے ہوں گے، کمرے کے سامنے دالان ہوگا۔ دو کمرے کا
رخ شمال کی طرف ہوگا، اور دو کمرے کا رخ مغرب کی جانب
کیونکہ ایسے مکانات خوش نصیبی کی علامت ہوتے ہیں۔ مغربی
کنارے پر اسٹور روم ہوگا۔ اس کے بعد باورچی خانہ ہوگا۔
اور جنوب کی سمت کنارے میں باتھ روم ______

شوہر کی باتیں سن کر بیوی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگی تھیں
یہ تو اس کے ان خوابوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جو وہ ا
دنوں تک دیکھتی رہی تھی۔

مکان تعمیر ہوتا رہا۔ اور اس کی بیوی برابر رکشا
بیٹھ کر آتی رہی۔ اور پر اشتیاق نگاہوں سے مکان میں لگ
ہوئی ایک ایک اینٹ کو دیکھتی رہی۔ سمینٹ اور ریت
سے جوڑی ہوئی اینٹوں کو دیکھ کر اس کے دل میں اپنے مکا
کی محبت پروان چڑھتی رہی۔ مکان کی چھت کے نیچے دیوار
سے گھرے ہوئے کمرے کے اندر پر سکون اور خوش آئند ز
گزارنے کا تصور نت نئے روپ دھارتا رہا۔ اور بہتر مستق
کے بارے میں یقین و اعتماد پیدا ہوتا رہا۔

پھر مکان تعمیر ہو گیا۔ اور وہ دونوں کرائے کا مکا
چھوڑ کر اپنے مکان میں آگئے۔ نئے مکان میں آنے کے بعد
آہستہ آہستہ ان کے دلوں سے آبائی مکان چھوڑنے کا غم
ہو گیا۔

ان دونوں کی خواہش تھی کہ ان کی کوئی لڑکی بھی
لیکن ایک لڑکے کے بعد ان کے یہاں پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی
بہت دنوں تک وہ دونوں اس محرومی کی آگ میں جلتے ر
لیکن بیٹے کی شادی کے بعد جب بہو گھر میں آئی تو ان کے د
سے اس محرومی کا احساس بھی زائل ہو گیا۔

گلی کے دائیں طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شاید گ
رات اسے بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ درو
سے ملا ہوا ایک دالان تھا، دالان کے وسط میں ایک پا
چھت سے جھول رہا تھا، اور پالنے کے قریب ہی ایک جوا
اور خوب صورت عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی
چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہ تھی، اس کی شلوار الگ
پھینکی ہوئی تھی۔ اور اس کے جسم کا نچلا حصہ برہنہ تھا، ج
کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے، اور اس کے جسم و بازو پر نش

نیلے داغ تھے۔ اس کی چپل دالان سے نیچے پڑی ہوئی تھی، اور
بچے کے ایک پیر کا سرخ جوتا اس کے قریب الٹا پڑا ہوا تھا۔ اور
اس کا دوپٹہ اب تک اس کے گلے میں لپٹا ہوا تھا۔

اس عورت کی لاش کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔
جیسے اس نے بچے کی جان بچانے کے لئے زبردست مدافعت
کی ہو لیکن آخر میں تھک کر ہار گئی ہو۔ اس کے سینے میں چھرے کا گہرا
زخم تھا۔ شاید قاتل نے اس کی آبروریزی کرنے کے بعد اس کے
سینے میں چھرا گھونپ دیا تھا۔ اس نے غالباً مرنے سے پہلے تک
قاتل سے الجھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس کے سر کے بال نچے
ہوئے تھے، جیسے کسی نے اسے بالوں سے پکڑ کر قابو میں لانے
کی سعی کی ہو۔

دالان کے پہلے کمرہ کا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ اور
دروازے کے سامنے ہی ایک جوان شخص کی لاش پڑی ہوئی
تھی، اس کے سینے میں بھی گولیوں کے نشانات تھے۔ اس کے
کمرے کی ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی، البتہ دروازہ کے عین
سامنے دیوار سے لگی ہوئی، ایک میز پر رکھے ہوئے ٹرانزسٹر
کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور شیشے کے ٹکڑے کمرے میں پڑے
ہوئے تھے، ایسا لگتا ہے جیسے اس شخص نے ٹوٹتے ہوئے
دروازہ کو اپنے ہاتھوں سے سنبھالا دینے کی کوشش کی تھی
لیکن جب دروازہ ٹوٹنے کے بعد قاتلوں نے اسے اپنے مقابل
پاکر گولی چلائی تھی، تو گولی اس کے جسم کو چھیدتی ہوئی اور
ٹرانزسٹر سے گزر کر دیوار سے ٹکرائی تھی، اور اب بچنہ فرش
پر آگئی تھی۔

دیوار پر ایک خوبصورت فریم کے اندر ایک تصویر
آویزاں تھی جس میں ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ سہرا باندھے
کھڑے تھے، دوشیزہ کے چہرے پر حجاب تھا۔ اس کی نظریں
جھکی ہوئی تھیں، لیکن نوجوان مسکرا رہا تھا۔ اس تصویر کے
قریب ایک دوسرے فریم میں ٹیڑھی میڑھی تحریر میں، بسم اللہ
الرحمٰن الرحیم ٹنگا ہوا تھا۔ میز پر ٹرانزسٹر کے قریب ایک فوٹو
اسٹینڈ میں ایک چھوٹے سے بچے کی مسکراتی ہوئی تصویر لگی ہوئی
تھی۔

دادا نے اپنے بیٹے کے پہلے لڑکے کی رسم بسم اللہ کے موقع
پر اپنے پوتے کی پہلی تحریر کو فریم کرکے کمرے میں آویزاں کر رکھا تھا
یہ تقریب اس نے بڑی دھوم دھام سے منائی تھی، اس روز
دادی نے دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر "جئے ہمارا لال،
ہزاروں سال" گایا تھا۔ اور جوان کی عورتوں کی سریلی آوازوں
کے ساتھ اس کی بے جوڑ اور بے سُری آواز سن کر محلے کی تمام
عورتیں ہنس پڑی تھیں،

چار سال پہلے جب اس لڑکے کا عقیقہ ہوا تھا تو اس
موقع پر بھی اس نے شوخ رنگ کا جوڑا پہنا تھا۔ جیسے وہی
لڑکے کی ماں ہو۔ اس دن بھی اس کی ہم عمر عورتوں نے اس کا خوب
خوب مذاق اڑایا تھا۔ جوان عورتوں کے ساتھ اس کی بہو بھی
منہ چھپا کے مسکرائی تھی، لیکن وہ بڑی بے نیازی سے جھینپتی ہوئی
نگاہوں کی پرواہ کئے بغیر اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرے
پوتے کو گود میں لئے سارے گھر میں گردش کئے پھری تھی۔

اس دن دادا بھی بے حد مسرور تھے۔ اپنے مستقبل کے
سنہرے خوابوں کو آنکھوں میں بھر کر خوشی سے سرشار ہونا تو عین
انسانی فطرت ہے۔ اسے مسرور ہونا بھی چاہئے تھا۔

لیکن گزشتہ رات نے اس کے ماضی کو تاریکی کے
پردے میں ملفوف کر دیا تھا۔ حال کے سینے کو گولیوں اور چھرے
سے چھلنی کر دیا تھا۔ اور مستقبل کے سنہرے خوابوں کو بکھیر دیا تھا

ایک کوا دیر تک آنگن میں امرود کے پیڑ پر بیٹھا چیختا
رہا۔ اور بڑی بے چینی سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر
اچھل کود کرتا رہا۔ اور مکان کے روشن دانوں میں بنے ہوئے
اپنے گھونسلوں سے باہر نکل بہت ساری گوریا کمروں کا چکر کاٹتی
ہوئی شور مچاتی رہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنا

کا قتل کس نے کیا؟ مقتولوں کے جسموں پر گولیوں اور چہرے کے زخم کس نے لگائے؟ چہرے اور بندوق کا استعمال تو انسان کے سوا اور تو کوئی بھی نہیں کرتا!

پھر مکان میں مکمل سکوت چھا گیا۔

باہر لوگ اپنے گھروں سے نکل کر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ کسی نے بھی اس ٹوٹے ہوئے دروازہ کی طرف نہیں دیکھا جیسے ان کی نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

مقتولوں کی لاشیں پڑی تھیں، اور قتل کے اسباب کسی کو بھی معلوم نہ تھے، لیکن دنیا میں جب ہابیل کے ہاتھوں قابیل کا پہلا قتل ہوا تھا۔ تو اس کے اسباب کیا تھے؟ جب حضرت عثمان غنیؓ کا قتل ہوا تھا تو اس کے اسباب کیا تھے، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو جب میدان کربلا میں قتل ہوا تھا تو اس کے اسباب کیا تھے؟

جب دن نکل آیا اور سورج کی روشنی مکان کے اندر داخل ہوئی تو گھر کے کونے میں دبکا ہوا ایک چھ سالہ لڑکا باہر نکل آیا۔ اب اس مکان کا یہی لڑکا تنہا وارث تھا۔ اور قاتل کی شناخت کرنے اور ان کے خلاف گواہی دینے والے دو گواہ تھے، ایک تو وہ لڑکا جو حیران و پریشان پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اور دوسرا وہ مکان جس نے ساری واردات اپنی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ دونوں ہی بے زبان تھے!

بقیہ: چھوٹی کہانیاں

خبر پڑھ کر تمتمانے لگا، اس نے فوراً کاتب کو طلب کیا۔ اور اسے وہ خبر لکھوانے لگا۔

نئی کراچی میں ایک خوبرو عورت نے دل برداشتہ ہو کر اپنے شوہر کو چھری سے ہلاک کر ڈالا ـــــ قاتلہ آلۂ قتل لے کر خود ہی تھانے میں پیش ہو گئی، سنا ہے قاتلہ کا شوہر بدچلن تھا کاتب چلا گیا تو ایڈیٹر دل ہی دل میں مسکرا دیا، لیکن اسٹول پر بیٹھے چپراسی کو رہ رہ کر جیل کی ماحول میں پہونچ جانے والی قاتلہ کا خیال ستائے جا رہا تھا۔

یک ٹھہرا ہوا عکس

شاہد انور

ڈیڈی ان سے ملو........ یہ ہیں میری کلاس میٹ،
س نیلو کھوسلہ، اور نیلو یہ ہیں میرے ڈیڈی، اور میرے
ب سے اچھے دوست، میرا بیٹا راشی ایک سانولی نازک
ی لڑکی سے میرا تعارف کرا رہا تھا،

ہیلو، لڑکی کی طرف دیکھ کر میں ہلکے سے مسکرایا۔
اور ڈیڈی ہم دونوں کو اس سال بہترین گریجویٹ کا
طاب ملا ہے۔

راشی میرے قریب آجاتا ہے۔ اور دھیرے سے کان
یں کہتا ہے ہم دونوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے، اور پھر
لڑکی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولتا ہے کیوں ڈیڈی
یری سلیکشن کیسی ہے ؟

لڑکی شرمائی شرمائی سی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ہولے
ے مسکرا دیتا ہوں،

وش یو آل دی بیسٹ،

تھینک یو ڈیڈی، اور پھر لڑکی کو میرے قریب ہی
بٹھا کر بولنا شروع کردیتا ہے۔

دیکھا نیلو! میں کہتا تھا نا! میرے ڈیڈی کوئی پرابلم
ہیں کھڑا ہونے دیں گے...... اور راشی بولتا رہا......
میرے ذہن میں ایک تصویر شیشے کی مانند ابھرنے لگی۔

گنگا کے ساکت منظر کی تصویر،..... جہاں دو پرچھائیاں گم
صم سی کھڑی تھیں۔ ایک لڑکا گنگا کی سطح پر ابھرتے ڈوبتے چاند
کو گھور رہا تھا اور اس کے ساتھ کھڑی لڑکی دور کنارے پر جلنے
والی روشنی کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

کیوں وشی کیا سوچ رہے ہو؟ لڑکی نے لڑکے کے کاندھے
پر سر رکھ دیا۔

سچ مچ نیرو کچھ لمحے واقعی کتنے خوب صورت ہوتے ہیں
لیکن یہ بیچارے کہیں رکتے تو نہیں ہیں نا!! اور پھر تصویر دھندلی
ہوتی چلی گئی۔ پرچھائیاں تاریکی سے لپٹ گئیں، اور سارا منظر
یک بیک دھواں سا ہوگیا۔

راشی اور نیلو باہر جاچکے ہیں۔ میرے کمرے میں اندھیرا
اترنے لگا ہے میں بلب روشن کردیتا ہوں۔ کھڑکی کھول کر باہر
جھانکنے لگا۔ باہر لان میں میری بیٹی ہنی پڑوس کے پرشانت
کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل رہی تھی۔ روز کی طرح پرشانت آج بھی
ہار رہا تھا۔ اور ہنی جوش میں شاٹ پر شاٹ لگا رہی تھی۔ میں
جانتا تھا کہ تھوڑی دیر میں دونوں لڑ پڑیں گے، اور میری بیٹی
پرشانت کو رلا کر آئے گی، اور میرے پاس بیٹھ جائے گی، سینئر
کیمبرج کرنے کے بعد بھی ہنی اب تک بچی ہی ہے۔ میں کھڑکی
سے ہٹ جاتا ہوں۔

تھوڑی دیر میں ہنی میرے کمرے میں آگئی!
کیوں پرشانت شٹل لے کر بھاگ گیا؟
نہیں ڈیڈی آج تو اس نے ایک ریکٹ بھی پرزینٹ
کیا ہے۔ وہ ایک ریکٹ میرے سامنے رکھ دیتی ہے جس کے ہینڈل
پر لکھا تھا،

" وتھ لو ٹو سویٹ ہنی "

تو کیا بچے بڑے ہوچکے ہیں۔؟ میں ہنی کی طرف دیکھتا
ہوں جو تولیے سے اپنا چہرہ خشک کر رہی تھی۔ وہ کچھ بدلی
بدلی سی لگی۔ اور پھر میرے ذہن میں بہت ساری تصویریں

بقیہ صفحہ ۱۴

ممتاز احمد خان (پاکستان)

چھوٹی کہانیاں

نیکی اور قانون

ڈاکٹر صاحب !

ہونہہ ، ڈاکٹر نے بے رخی اور بے توجہی کے عالم میں جواب دیا۔

اس شخص کو بچالیں کافی خون بہہ چکا ہے ۔ پلیز ، خداترس انسان نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر نے نظریں اٹھا کر اسے مجرم قسم کا شخص گردانتے ہوئے کہا لیکن یہ تو پولیس کیس ہے جب تک اس شخص کا بیان ریکارڈ نہ ہوجائے ہم اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے سمجھے کہ نہیں ؟

لیکن اس کی حالت تو ....

بحث نہ کیجئے ہم اتنے فالتو نہیں ــــ !

یہ کہہ کر ڈاکٹر سالونے رنگ کی جاذب نظر نرس سے گفتگو میں مشغول ہوگیا۔

پھر چند لمحوں بعد ڈاکٹر نے اس خداترس انسان سے پوچھا آپ اس شخص کے کیا لگتے ہیں ۔؟

کچھ بھی نہیں ــــ لیکن انسانیت کے رشتے میں یہ میرا بھائی ہے ۔

اوہ ! فلسفہ ــــ ڈاکٹر کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ۔

اسی اثنا میں میڈیکولیگل ڈیوٹی والے قانون کے محافظ آگئے ، ڈاکٹر نے اے ایس آئی کی توجہ زخمی شخص کی طرف مبذول کرائی ، جن کی آنکھیں پتھرائی جارہی تھیں ۔

تم نے اس کو اس حالت تک پہونچایا ہے جی ؟

جی نہیں ۔ خداترس انسان نے جواب دیا ، دراصل یہ شخص سڑک پر تڑپ رہا تھا ۔ کوئی ٹرک والا اسے کچل کر فرار ہوگیا تھا ۔ بس میں اسے یہاں لے آیا ۔ معلوم نہیں بے چارہ کون ہے ؟

اے ایس آئی یہ سن کر چہکا ، بادشاہو ، بندے کو زخمی کرتے اسپتال پہنچانے پر ہر بندہ یہی بکواس مارتا ہے ۔

یہ کہہ کر اس نے آواز لگائی ، علم دین ، اوئے علم دین کتھے مرگیا ایں ،

سامنے سے ایک مریل سا شخص نمودار ہوا ۔ جو پولیس والے کے بجائے ملیشیا نظر آتا تھا ۔ اس نے اے ایس آئی سے کام دریافت کرلیا جس پر اس نے اسے روزنامچہ لانے کو کہا علم دین بڑی کسمساہٹ کے عالم میں ایک کمرے میں گیا ۔ اور روزنامچہ لے آیا ۔ اب اے ایس آئی روزنامچہ اور بال پائنٹ قلم لے کر زخمی شخص کے پاس پہونچا ، اور پوچھنے لگا ۔

اے پائی ، (بھائی) اپنا بیان لکھا (لکھا)

زخمی شخص بے حس و حرکت پڑا رہا ۔ فوراً ہی ڈاکٹر اپنی کرسی سے اچھل کر زخمی شخص کے پاس آیا ، اس کی نبض ٹٹولی ، اور اس کی قید حیات سے رہائی کا اعلان کردیا جس پر خداترس انسان کی آنکھیں بھیگ گئیں ،

چند ہی لمحوں بعد اس خداترس انسان کو ایک ان کئے جرم کی پاداش میں تھانے لے جایا جارہا تھا ۔

بُری خبر

صغیر بابو پچاس کے پیٹے میں تھے، وہاں ایک بڑے اخبار کے جرائم میں کے شعبے میں انچارج تھے. جرائم کی خبروں میں وزن پیدا کرنا اور انہیں چٹپٹا بنا کر پیش کرنا ان کے ہنر کا حصہ تھا محض اس وجہ سے بھی وہ اخبار زیادہ فروخت ہوتا تھا۔ اور لاابالی، اوباش، اور جرائم پسند، سادیت پسند اور جنسی مریض اس اخبار کے دیوانے تھے، صغیر بابو جب کبھی رائی جتنی خبر کو پہاڑ برابر کر کے لگاتے، تو بڑے بڑے عزت دار خاندان اپنی عزت کو خاک میں مل جانے کے سبب شہر چھوڑ جاتے۔

ایک دن کرائم رپورٹر نے انہیں کسی فون کیا اور ایک ایسی خبر لکھوائی کہ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اس رات وہ کافی دیر سے واپس گھر پہونچے، ان کی بیوی پر دورہ پڑا ہوا تھا۔ اور عزیز رشتے دار انہیں ہوش لانے کی سعی کر رہے تھے، اس رات وہ بالکل نہ سو سکے۔

دوسرے روز باوجودیکہ انہوں نے شہر میں نکلنے والے تمام اخبارات سے رابطہ پیدا کر کے اس خبر کو شائع نہ کرنے کی یقین دہانی حاصل کر لی تھی ——— لیکن ایک حریف اخبار نے سرخی جما ہی دی،

اخبار طوفان کے مشہور و معروف صحافی صغیر بابو کی اکلوتی بیٹی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی، پولس تفتیش کر رہی ہے۔

اس دن کے بعد صغیر بابو شعبہ جرائم سے وابستہ نہیں دیکھے گئے ●

برکت

رشید نے جب پورے مکان کو گھوم کر دیکھ لیا تو سکتے کے عالم میں گرتا ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کوئی شخص اتنی مختصر مدت میں اتنی زبردست ترقی کر سکتا ہے؟

اس اثنا میں عالم تاب اس سے انجان بنکر پوچھنے لگا. کیوں پسند آیا میرا مکان؟ اور یہ ڈاٹسن DATSUN والی ٹو نیٹو والی (1207)

مگر تم ایک بوسیدہ سے مکان میں رہتے تھے، اور کلرک ہوا کرتے تھے،

یہ اسی بوسیدہ مکان کی برکت ہے پیارے،

میں سمجھا نہیں۔ رشید نے سوالیہ نشان بنتے ہوئے کہا

عالم تاب جوش میں بولا بالکل گھامڑ ہو یار، ارے بھائی میں نے اسی بوسیدہ مکان میں بچوں کا انگریزی میڈیم اسکول کھول لیا ہے۔ اور پھر محکمہ تعلیم بھی ہمارے معاملات میں دخل نہیں دیتا

یہ سن کر رشید نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور اسی طرز پر اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کے بارے میں سوچنے لگا ●

ایمان

چپراسی نے دیکھا کہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اور ایڈیٹر ہاتھوں کے سہارے سر ٹکائے کسی گہری سوچ میں مبتلا ہے۔ اس نے آہستہ سے پوچھا،

جناب عالی آج گھر نہیں جائیں گے کیا؟

ایڈیٹر نے ناگواری سے کہا، تم جانتے ہو کہ ہمارا ایمان ہے کہ کتا آدمی کو کاٹ لے تو خبر نہیں بنتی، لیکن آدمی اگر کتے کو کاٹ لے تو خبر بن جاتی ہے۔ چٹپٹی، گرما گرم، اخبار بکوانے والی۔

چپراسی نے جواب دیا، جناب عالی جن خبروں پر آپ ایمان رکھتے ان سے میں خوفزدہ سا ہو جاتا ہوں۔

بے وقوف، ایڈیٹر نے آہستہ سے کہا، جاؤ اپنے اسٹول پر بیٹھ جاؤ،

اس اثنا میں ایک رپورٹر بڑی تیزی سے ایک خوب صورت عورت کی بڑی سی تصویر لے کر حاضر ہوا۔ ایڈیٹر کا چہرہ

بقیہ صفحہ [illegible]

رفعت نواز

سراب

میز پر چند مڑے تڑے کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ ہر کاغذ پر دو دو تین تین سطریں لکھ کر کاٹ دی گئی تھی۔ سوتیا دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھے؟ لکھنا تو بہت کچھ چاہتی تھی لیکن قلم رک رک جاتا تھا۔ ٹیوب کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ چھت کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا اور گھڑی کی ٹک ٹک خاموشی میں خلل ڈال رہی تھی۔ شام والا واقعہ اسے یاد آ رہا تھا۔ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔ مہینوں سے جو قصہ چل رہا تھا۔ ایک دم ختم ہو گیا تھا جڑتے رشتے ٹوٹ گئے تھے۔ سوتیا بے چین تھی کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے بارہا اپنے فیصلے پر غور کیا تھا۔ اور ہر پہلو سے اسے اپنا فیصلہ صحیح لگا تھا۔ لیکن ماں کی نظر میں یہ فیصلہ قطعی جذباتی تھا اور وہ سوتیا کو دوبارہ سوچنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ آزمائش ایک ہی بار ہوتی ہے۔ اپنی خوشیوں کے لئے وہ ایک معصوم کو داؤ پر کیسے لگا دے، لوگ اولاد کے لئے کیا کیا نہیں کرتے یہ بھاگ دوڑ، گھنٹوں کی مشقت، آرام دہ بستر چھوڑ کر صبح صبح بس کی لمبی قطار میں کھڑے رہنا اور نریش کو اسکول پہونچانا، اس کی کاپیوں اور کتابوں کو سمیٹ کر بیگ میں رکھنا۔ نیند آنے پر بھی اسے پڑھائے جانا، خود نہ کھا کر اسے پہلے مٹھائی کھلانا۔ اپنی خوشیوں کو تج کر اسے خوش رکھنا۔ یہ سب کیوں کرتی ہے وہ؟ کبھی کبھی سوچتی لگتا کہ یہ اس کا فرض ہے۔ وہ کوئی احسان نہیں کر رہی ہے بلکہ ایک ان لکھے دستور پر عمل کر رہی ہے یہ اس کا مقدر ہے اور کوئی مقدر سے لڑ نہیں سکتا۔

کسی چیز کی کمی نہ تھی اس کی زندگی میں۔ وجیہہ، ہنس مکھ اور چاہنے والا شوہر تھا۔ جو اتنا کما لاتا کہ کل کی فکر سے آزاد ہو کر خرچ کئے جاتی تھی۔ رہنے کو ذاتی گھر تھا۔ رویندر نے آفس سے بینک سے قرض لے کر گھر بنایا تھا۔ رفتہ رفتہ گھر میں ضرورت کی سبھی چیزیں آ گئی تھیں۔ وہ کتنی خوش تھی اور خود کو دنیا کی خوش قسمت عورتوں میں شمار کرتی تھی۔ اور خوشیوں کی تکمیل تو جیسے نریش کے آنے سے ہو گئی تھی۔ رویندر ہمیشہ قہقہے لگایا کرتا تھا اور وہ بھی خود پر نازاں تھی۔ ایک مرد، بچے کی ماں بن کر۔ لیکن اس کی ان خوشیوں کو نظر لگ گئی۔ ہزاروں آدمی سڑکوں پر اسکوٹر چلاتے ہیں۔ لیکن ہر کوئی ٹرک سے ٹکرا کر مر نہیں جاتا۔ پھر رویندر کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا تھا۔؟ اور کوئی بھی ٹرک سے ٹکرا کر مر سکتا تھا۔ اور کیا ضروری ہے کہ ٹرک کسی اسکوٹر کو ٹکر ہی مارے، ان ہونی بات ہو گئی تھی دو سال سے وہ ایسی آگ میں جل رہی تھی۔ جس کی تپش وہ اکیلی محسوس کر سکتی تھی۔ ویسے سب کچھ ٹھیک لگتا تھا رویندر کی موت کے بعد سوتیا کو اس کے آفس میں تو نوکری

مل گئی تھی۔ قاعدے کے مطابق اپنا مکان کرایہ پر اٹھا کر وہ ماں کے یہاں آ گئی تھی۔ اس طرح وہ راوندر کی غیر موجودگی میں بھی کسی کی دست نگر نہیں تھی۔ لیکن جو ایک سوچ اس کے دماغ پر جونک کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔ کہ سب کچھ ہوتے بھی وہ خود کو غیر محفوظ سمجھتی تھی۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی کسی مضبوط سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

سیکشن آفیسر بھاسکر راوندر کے ساتھ ان کے یہاں آیا کرتا تھا۔ گھنٹوں بیٹھا باتیں کیا کرتا۔ وہ ٹھیک خوش پوش تھا۔ فیشن کے مطابق کپڑے پہنتا۔ مہذب طریقے سے گفتگو کرتا۔ راوندر کی وفات کے بعد سویتا کو ملازمت دلانے کے لئے اس نے بڑی بھاگ دوڑ کی تھی۔ عرضیاں لکھوائی تھیں۔ اسے بڑے صاحب سے تین بار ملایا تھا۔ اور کہہ سن کر سویتا کا تقرری صدر دفتر کے اپنے ہی سیکشن میں کروایا تھا۔ وہ سویتا کو چھوٹی چھوٹی رعایتیں بھی دیا کرتا تھا۔ دیر سے آنے پر باز پرس نہ کرتا۔ وقت سے پہلے گھر جانے کی اجازت دے دیتا۔ اور اکثر اس کا کام بھی خود ہی کر دیا کرتا تھا۔ آفس میں وہ خود کو غیر محفوظ نہیں سمجھتی تھی۔ بھاسکر ایک تناور درخت کی طرح اس پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ بھاسکر چالیس پینتالیس کے لپیٹے میں تھا۔ لیکن ابھی تک کنوارا تھا کنپٹی کے بالوں میں کبھی کبھی سفید بال اپنی جھلک دکھلاتے تھے۔ گو وہ بڑے سلیقے سے کالی مہندی لگایا کرتا تھا۔ چہرہ بھی عمر کی چغلی کھاتا تھا۔ حالانکہ وہ روز شیو کیا کرتا۔ اور چہرے پر اسنو اور مختلف لوشن لگایا کرتا تھا۔ آنکھوں کے نیچے جھریاں، تھوڑی اور گردن کے نیچے کا لٹکتا گوشت احساس دلاتا رہتا کہ جوانی الوداع کہہ رہی ہے۔ پھر بھی وہ خود کو بنا سنوار کر رکھتا اور ایسا تاثر دینے کی کوشش کرتا کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔

سویتا کے یہاں وہ ہر اتوار کی شام کو ضرور آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سیر کو جاتے، پکچر دیکھتے۔ اور رات کا کھانا ہوٹل میں کھاتے تھے۔ سویتا کے چھوٹے بھائی سے بھی اس نے دوستی کر لی تھی۔ سویتا کی ماں کو بھی اس کے آنے اور سویتا کو ساتھ ساتھ لے کر گھومنے پر اعتراض نہیں تھا۔ شاید وہ راوندر کو بھاسکر کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ سویتا کی تنہائی کا اسے احساس تھا۔ اس کی زندگی لق و دق صحرا کی طرح سامنے پڑی ہوئی تھی۔ بغیر ساتھی کے یہ کیسے کٹے گی۔ نریش بھی بھاسکر سے گھل مل گیا تھا۔ بھاسکر اس کے لئے چاکلیٹ، بسکٹ، چیونگم اور کھلونے لایا کرتا تھا۔ اس کی توتلی باتیں دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ سویتا جب بھی بھاسکر اور نریش کو گھلا ملا دیکھتی۔ تو اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ سینے میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ اور پرانی چوٹ پھر سے ابھر آتی۔ لیکن بن باپ کا بچہ بہل رہا ہے۔ احساس تو قوی تھا۔ وہ جانتی تھی بھاسکر کیا چاہتا ہے۔ بھلے ہی اس نے زبان سے نہ کہا ہو لیکن اس کا ہر عمل اس بات کی غمازی کرتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

بھاسکر بھی اکیلا رہتے رہتے اکتا گیا تھا۔ جوانی میں اس نے بھلے ہی کئی رشتے ٹھکرائے ہوں۔ اونچی اڑان بھری ہو۔ پورے نہ ہونے والے سپنے دیکھے ہوں۔ مگر اب وہ عمر کی اس منزل میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں رک کر سستانے کو جی چاہتا ہے۔ اور آگے کا سفر اکیلے طے کرنا دشوار لگتا ہے۔

ایک دن آخر اس نے اظہار کر ہی دیا۔ سویتا پہلے تو جھلائی، روئی بھی۔ پھر سوچ بچار کے بعد اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی یوں بھاسکر میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ اچھی تنخواہ تھی۔ ذاتی مکان تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے دو بہنیں تھیں۔ جو بیاہی جا چکی تھیں۔ عمر کا مسئلہ بھی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ گو کہ سویتا اس سے پندرہ سترہ سال چھوٹی تھی لیکن نریش کی موجودگی میں بھلا یہ کہاں ممکن تھا کہ کوئی دوسرا

اسے اپنا تا۔ دیکھنے میں بھی بھاسکر اچھا خاصا تھا۔ سانولا رنگ بھلا سا رنگ نقشہ اور صحت مند، پھر وہ نریش سے وہ کتنی ہی محبت کرتا تھا۔ بلکہ نریش کو تو اس نے لاڈ میں بگاڑ دیا تھا بھاسکر جب بھی آتا۔ نریش اس سے لپٹ جاتا۔ اور چاکلیٹ بسکٹ کا مطالبہ کیا کرتا۔ بھاسکر اسے ستانے کے لئے ٹال مٹول کرتا تو خود ہی اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگتا۔ سوینا لڑکتی تو بھاسکر نریش کی حمایت میں بولنے لگتا۔ یہ بات طے سی ہو گئی تھی کہ وہ جلدی ہی شادی کر لیں گے۔ گھر والے بھی خوش تھے شہر کے تقریبات میں وہ اکثر ساتھ ساتھ رہتے۔ اور بھاسکر بڑے فخر سے نریش کو اٹھائے اٹھائے پھرا کرتا تھا۔

شہر میں ایک بڑی تفریحی پروگرام ہونے والا تھا۔ ملک کے مشہور فنکاروں کی شرکت متوقع تھی۔ پندرہ دن پہلے ہی بھاسکر ٹکٹ لے آیا تھا۔ ان دنوں وہ زیادہ تر سوینا کو اپنے ساتھ لئے پھرا کرتا تھا۔ رات کو دیر گئے واپس لوٹتے اور گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ اور آنے والے دنوں کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

تفریحی پروگرام تو رات کے ۹ بجے شروع ہونے والا تھا لیکن بھاسکر شام کے چھ بجے ہی آگیا تھا۔ اس کے چہرے کی چمک دمک دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے اس نے بننے، سنورنے میں صرف کئے ہوں گے، دودھ کی طرح اجلے سفاری سوٹ میں وقار سے چلتا جب وہ سوینا کے سامنے آیا تو وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ سوینا نے بھی جی لگا کر میک اپ کیا تھا محنت سے سر پر گھونسلے جیسا بالوں کا جوڑا باندھا تھا۔ ملکی آسمانی ساڑی اور میچنگ بلاؤز میں وہ بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور مارے گرد سے بے خبر تھے کہ نریش کمرے میں آگیا۔ اور بھاسکر سے چاکلیٹ مانگنے لگا۔ آج گڑبڑ میں بھاسکر چاکلیٹ لانا بھول گیا تھا۔ سوینا نے بسکٹ اور کھلونے سے اسے بہلانے

کی کوشش کی۔ لیکن نریش چاکلیٹ کے لئے ضد کر رہا تھا۔ اور وہ بھی بھاسکر کے پتلون کی جیب سے نکالا ہوا۔ نریش کے ہاتھ مٹی سے اَٹے ہوئے تھے۔ شاید وہ پڑوس کے بچوں کے ساتھ مٹی سے کھیل رہا تھا۔ اور بھاسکر کو دیکھ کر آگیا تھا۔

تم جھوٹ بولتے ہو پاپا، پتلون کی جیب سے چاکلیٹ میں خود نکالوں گا۔ نریش نے رک رک کر کہا تو بھاسکر چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور بڑے پیار سے بولا چاکلیٹ لانا میں بھول گیا نریش، تم باہر جا کر کھیلو ابھی لپک کر بازار سے لے آتا ہوں۔

نریش نے آگے بڑھ کر ہمیشہ کی طرح اسے لپٹنا چاہا تو وہ اور پیچھے سرک گیا۔ بھاسکر بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور نریش اس سے لپٹنے پر بضد تھا۔ بھاسکر پیچھے کھسکتا جا رہا تھا۔ کہ اس کا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ اور نریش ایکدم اس سے لپٹ گیا بھاسکر کے چہرے پر سختی آگئی۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور جب اس کی نظر پتلون پر ننھے ننھے ہاتھوں سے بنے مٹی کے دھبوں پر پڑی تو وہ بے قابو ہو گیا۔ نریش کو پرے ڈھکیل کر اس نے ایک طمانچہ مار دیا۔ نریش بھی ضد میں آ کر اس سے لپٹنے لگا۔ تو ایک گھونسہ پیٹھ پر پڑا اور نریش چیخ کر رونے لگا۔ سوینا مبہوت سی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ جب دوسرا گھونسہ نریش پر پڑا تو سوینا لپک کر آئی۔ اور نریش کو گود میں اٹھا لیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے، اور غصے کے مارے وہ کانپ رہی تھی۔

آپ یہاں سے ..... سوینا کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی اور وہ نریش کو لپٹائے کمرے سے باہر نکل گئی۔

رحمٰن حمیدی

طلوع و غروب

اس روز میں دیدہ و دانستہ پہاڑ کی طرف نکل گیا۔ فرصت کا دن تھا۔ پاؤں کے نیچے ناہموار پتھریلی اور سخت کھردری زمین، سامنے ہرا بھرا جنگل، چھوٹے بڑے پیڑ پودوں کا جم غفیر اور حدِ نگاہ کوہسار کا حسین ترین سلسلہ ——— میں کافی دیر تک چھوٹے بڑے پتھروں اور خاردار جھاڑیوں سے الجھتا ہوا چلتا رہا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ دھوپ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ چند گھنٹے بعد میں تھک گیا۔ ایک بڑے سیاہ پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہاں خاموشی اور تنہائی تھی آس پاس کانٹے دار جھاڑیاں بکھری پڑی ہوئی تھیں۔ خاردار جھاڑیاں چھوٹے چھوٹے ناہموار پتھروں پر بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ہوا کے جھونکے پر شاخیں پتھر سے ٹکراتیں۔ اور پتھر کی رگوں پر خراش کی نشانات نمایاں کرنے کی کوشش کرتی۔ نہ جانے میں کیوں سیاہ پتھر اور خاردار شاخوں کے باہمی رشتے پر غور و فکر کرنے لگا۔

پھول اور کانٹے کی باتیں ذہن میں آنے لگیں۔ فلسفیانہ کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ میں بھی تو کانٹوں کے درمیان جی رہا ہوں۔ زندگی واقعی عذاب ہے۔ یہ آگ کا دریا ہے اور ڈوب کر جانا ہے۔

کالج میں پرنسپل اپنے داماد کی بحالی کے لئے میری لکچررشپ پر سانپ کی طرح نگاہ جمائے ہوئے ہیں۔ کئی بار بے سبب بنیادوں پر کیفیت طلب کر چکا ہے۔ اس کی بازپرسی میں بھی ذاتی اغراض شامل ہے۔ ایسے عالم میں کبھی ملازمت سے ریزائن کر دینے کو جی چاہتا ہے لیکن پیٹھ سے چپکے ہوئے پیٹ کی وجہ سے ہر انسان مجبور ہے۔ دوست آشنا اس انداز سے مشقِ ستم ڈھاتے ہیں کہ کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ ہمراداران جائداد و دولت کی لالچ میں دو بار زہر دے چکے ہیں۔ یہ میری سخت جانی ہے کہ پہلی بار شربت زمین پر گر گئی، دوسری بار کافی کی پیالی میرے ہی ہاتھوں الٹ گئی، دشمنوں کے خوفناک منصوبے اور اپنوں کے خوب صورت دھوکے ——— جو بھی آیا دل پر چرکے لگا کر ہی گیا۔ رشتہ ناطہ تو مایا جال ہے۔ اس دھرتی پر کون کس کا ہے؟ ہر فرد اپنے نفس کا غلام ہے، دوستی سراب ہے۔ دشمنی ترقی کے لئے لازمی ہے یہی وجہ ہے کہ میں اکثر اداس ہو جاتا ہوں ——— میری اداسی اکثر بے وجہ ہوتی ہے

لیکن اس دن ———!

مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی، میرے اقبال کا ستارہ جگمگانے لگا۔ روشنی میرے ذہن اور جسم کے اندر بھی پھوٹنے لگی۔ اس روشنی سے میرے چاروں طرف اجالا ہی اجالا پھیل گیا دراصل یہ روشنی علم و آگہی کی روشنی تھی۔ مجھے وہ چہرہ نظر آ گیا تھا میں حقیقت سے واقف ہو چکا تھا۔ میرا دشمن کون ہے؟ میری اذیت کے اسباب کون پیدا کر رہا ہے؟ میری چھٹی حس نے سب کچھ جان لیا تھا۔ میرے ادراک کی بصیرت نے مجھے سب کچھ دے دیا تھا۔ میں نے اس ہیولیٰ کو دیکھ لیا تھا جو انسان کو انسان کا خون پلاتا ہے۔ جب انسان کو اپنی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ مٹی سے سونا ہو جاتا ہے۔ خود شناسی بہت بڑا جوہر ہے بے بسی آپ ہی آپ دم توڑ دیتی ہے۔ ایک نئی روح، ایک نئی زندگی اس کے جسم و جاں میں دوڑنے لگتی ہے۔ دراصل یہ

انسان کی ذات کا عرفان ہے انہیں جذبات سے مغلوب ہو کر میں
پہاڑ کی طرف نکل گیا تھا ——— اور اس ہیولی کا تصور کر
رہا تھا جس نے کول فیلڈ کی زمین پر علم و آگہی بخشی تھی ———
اپنی پہچان اور ذات کا عرفان ———!

اس دن میری یاد اسی بے سبب نہ تھی۔ نہ مجھے ملازمت
کا خطرہ در پیش تھا۔ نہ ہی میرے دشمنوں کو کامیابیاں نصیب
ہوئی تھیں۔ نہ ہی مجھے اپنی محبوبہ یاد آرہی تھی۔ نہ ہی وہ طوائف
ذہن میں آرہی تھی۔ جس کے سیمیں جسم میں ناگن کی طرح مقناطیسی
کشش ہے ——— یہ ہرا بھرا جنگل بے حد حسین ہے۔ اور
یہ وادی اس سے بھی زیادہ حسین ہے۔ میں تماشائی کی طرح دیدار
حسن میں محو ہوں۔ فطرت کے حسین مناظر کا میں شیدائی ہوں۔
ویران و بیابان مناظر، ساحل سے ٹکراتی موجیں، موسم بہار میں
جھومتے پیڑ پودے، جنگل کے خاموش اور پرسکون مناظر ———
——— میں بے خوف و خطر محو دیدار ہوں۔ ان حسین مناظر میں
میل دو میل کی دوری پر انسانوں کی بستیاں آباد ہیں۔ آبادی میں
ہر طرح کے لوگ ہیں۔ معمولی کسان، مزدور، جڑی بوٹی سے علاج
کرنے والے معالج، سود خور، عام اور سادہ لوح انسان، اور بے
حد خطرناک غنڈے ——— رتن مٹھ میں میں بیٹھ کر سٹہ
بازی کرنے والے لونڈے جوا بھی کھیلتے ہیں۔ پیسے گھٹ جانے پر
ریلوے کوارٹرز میں چوری بھی کرتے ہیں۔ سیاحی کرنے والوں کی
گٹھریاں اتروا لیتے ہیں۔ ریوالور دکھلا کر جیب کے سارے پیسے
رکھوا لیتے ہیں۔ یہ جھاڑیاں دن کے وقت پرسکون اور خاموش
رہتی ہیں۔ شب کے وقت ان میں زبردست حرکت ہوتی
ہے۔ غنڈوں اور رہزنوں کی جماعت اندھیرا پھیلتے ہی آجاتی ہے
یہ لوگ جی۔ ٹی روڈ پر چلنے والی بسیں اور ٹرک لوٹ لیتے ہیں۔ گرینڈ
کورڈ لائن سے گزرنے والی مال گاڑی کے ڈبے خالی کر دیتے ہیں
ان وارداتوں میں وہ تنہا نہ تھے۔ ان کے ساتھ خاکی وردی اور
سرخ ٹوپی والے افراد بھی ہیں۔ جو لوٹ کے ہر مال میں برابر
کے حصہ دار ہیں۔ رات کے وقت سیٹھ کے گوداموں کا ایک دروازہ
کھلا رہتا ہے۔ ریلوے یارڈ کا سارا سامان ان کی گوداموں میں
پہنچ کر دکان سے بازاری نرخ پر فروخت ہوتا ہے۔ گاہک کو
اس سامان کے لئے خریداری ٹیکس بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ سیٹھ
کا بینک بیلنس اور ان کی عمارت روز بروز اونچی ہو رہی ہے
رہزنوں کی آمدنی شراب اور جوا پر صرف ہو جاتی ہے۔ وہ
قلاش اور پریشان حال رہتے ہیں۔ ان کا سردار سفید ٹوپی میں
گھومتا رہتا ہے۔ لوگ خوف سے اسے جھک جھک کر سلام
کرتے ہیں۔

لیکن ایک دن ———!

ایک جیپ ان وادیوں میں ناہموار راہوں سے داخل
ہوئی۔ سفید لباس میں پولس نے چھاپا مارا۔ سفید ٹوپی والا گرفتار
ہو گیا۔ سفید ٹوپی والے کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور کمر میں رسہ
لگ گیا۔ اس کے چند ساتھی گرفتار ہوئے اور چند فرار ہونے
میں کامیاب ہو گئے، ان کے ساتھ بیل بوٹم پہنے اور لمبے لمبے
بالوں والا دبلا پتلا انسان تھا۔ اس کی ہیئت پر انسان کی نگاہیں
پیوست ہو گئیں۔ کالونی کان علاقوں میں خبر پھیل گئی کہ سکینہ
صاحب نے جوائن کر لیا ہے ——— کول فیلڈ میں غیر قانونی
دھندہ کرنے والے ایک ایک کرکے فرار ہو گئے، کالا دھندہ
کرنے والوں کے لالے پڑ گئے۔ ہر طرف رام راج کی بنسی بجنے
لگی۔ لوگوں گھروں میں چین کی نیند سونے لگے۔ اور لڑکیاں بے
خطر سڑکوں پر آنے لگیں۔ حساس ذہن فطری مناظر سے لطف
اندوز ہونے لگا۔ خطرات سے عاری حیات اصل آزادی ہے
میں نے بھی اس حیات کا تجربہ کیا اور تلخ و شیریں تجربات کی
بنیاد پر کہانیاں لکھنے لگا۔ تجربات حیات کا قیمتی سرمایہ ہے
——— نہ جانے میں کب تک کھویا رہا۔ اچانک
میرے پاس کی جھاڑی میں زبردست کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔
جنگلی بلے کے تیز نوکیلے دانتوں میں خرگوش تڑپ رہا تھا۔

میں نے غور سے دیکھا ــــــ بلّا بے دردی سے اسے زمین پر
دبوچ رہا تھا۔ اس نے خرگوش کی جان لے لی۔ اس کا منہ خرگوش
کے خون سے سُرخ تھا۔ مردہ خرگوش اس کے سامنے پڑا ہوا
تھا۔ بلّا زبان نکال کر ہونٹوں سے چاٹ رہا تھا۔ خرگوش کا خون
دھرتی پر ماتم کناں ہے۔ خاردار جھاڑی کی جڑیں خون سے لت پت
ہیں۔ شاخوں کی ہری ہری پتیاں خوف و ہراس سے کانپنے لگیں۔
مجھے ایسا لگا ورق شجر کی آنکھ سے لہو ٹپکا ہے جو کانٹوں کی نوک
پر جذب ہو گیا ہے۔ سورج کائنات کے ذی روح کے بے بسی پر
قہقہے لگا رہا ہے۔ بے زبان دھرتی دم بخود ہے۔ نباتات خرگوش
کے خون کے چشم دید گواہ ہیں۔ خون سے میری نگاہیں لت پت ہو گئیں
میں فلسفے کی پیچیدہ گتھیوں میں الجھنا نہیں چاہتا ــــــ
میں چٹان سے اٹھا، واپس لوٹنے کے لئے نیچے اترا۔
تو پلٹ کر دیکھا مردہ خرگوش جنگلی بلّے کی منہ میں لٹکا ہوا ہے۔
جنگلی بلّا جھاڑی سے نکل کر گھنے جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ اور
خرگوش کا خون زمین میں جذب ہو چکا ہے۔ اب دھرتی پر صرف
ظالم اور مظلوم کے درمیان صرف تصادم کے نشانات ہیں۔ جیسے
حشرات الارض ذاتی مفاد کی خاطر مٹا رہے ہیں۔ قتل و خون کا میں
چشم دید گواہ ہوں۔ میری زبان بند ہے۔ میری چیخ و پکار کے بعد
باوجود خرگوش کی جان بچانے والوں کا فقدان ہے۔ میں کمزور
طبقے کا انجام دیکھ چکا ہوں۔

میں نے لوٹتے ہوئے دیکھا ریلوے برج کے اس
پار نئی کالونی کے سرخ و زرد عمارتیں دکھائی دے رہی ہیں۔ ناہموار
زمین ہموار کر کے کالونی بسائی گئی ہے۔ ان عمارتوں میں ریلوے
ملازمین رہتے ہیں۔ کالونی کے بیچوں بیچ فلٹر ہاؤس ہے۔ جو پوری
کالونی کو پانی سپلائی کرتا ہے۔ کالونی کا استعمال شدہ پہاڑی،
نالے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ یہ پوری آبادی کو دو حصوں میں منقسم
کرتا ہے۔ اس پار لوکو بازار، لال نگر، آزاد نگر، اور ہٹیا ٹانڑ
کی آبادی ہے۔ جو اپنے اپنے مذاہب کی بنیاد پر آباد ہیں۔
ان آبادیوں کے درمیان مینار اور کلس جتنے اونچے ہیں۔ وہاں
باشندے اسی تناسب پست فطرت ہیں۔ امام اور پجاری حق
اور صداقت کی تبلیغ کی بجائے گندی سیاست میں ملوث ہیں
اس آبادی میں سفید پوش اور سیاہ پوش دونوں طرح کے افراد
ہیں۔ پہاڑی نالے کی دوسری جانب ریلوے اسٹاف کے لئے اونچے
سہ منزلہ فلیٹ ہیں۔ ان فلیٹ کے اینٹوں پر سال میں ایک بار
سُرخ رنگ چڑھایا جاتا ہے۔ کھڑکی اور دروازوں پر روغنی
رنگ چڑھائے جاتے ہیں۔ فلیٹ باہر سے صاف و شفاف
دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کے مکینوں میں نفاست AESTHET
SERSE (E(ا کا فقدان ہے۔ نفاست پسندی کے
لئے ذہن میں تبدیلی لازمی ہے۔ اور تبدیلی کے شعلوں پر چلنا پڑتا
ہے۔ کیا انسان شعلوں کے درمیان رہ کر زندگی گزار سکتا ہے؟
میں نے خود سے سوال کیا۔

ریلوے گراؤنڈ کے سرکس میں ایک کھیل میں نے دیکھا
تھا ــــــ لہلہاتے شعلوں نے دائرے کی شکل سے
اختیار کر لی ہے۔ ایک آدمی شعلوں سے گزر رہا ہے۔ شعلوں کا
دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اور دائرے کی وسعت کو کراس کرتا جا
رہا ہے۔ آخر منزل پر وہ نیلگوں ہو جاتا ہے کئی رنگ اس کے جسم
سے پھوٹنے لگتے ہیں۔ ــــــ معًا سائرن کی آواز بلند
ہوتی ہے۔ مرد عورت کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چند افراد
شو ختم ہونے سے پہلے دوڑ کر جاتے ہیں ــــــ پھر
اچانک ایمبولینس سے الیکٹرک ٹرین ڈرائیور کی لاش آتی ہے
چیخ و پکار بلند ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے کئی ایمبولینس آتی ہیں
عورتیں بچے غش کھا کر گرنے لگتے ہیں۔ کالونی میں کہرام مچ
جاتا ہے۔ آگ کے شعلے اور بلند ہوتے ہیں۔ انسانی جسم جھلک جھلس
کر آتے ہیں۔ ٹرین کے حادثات میں اضافہ ہو رہا ہے زندگی
موت سے گلے مل رہی ہے۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کی طرف
دیکھتا ہوں۔ بیوی اطمینان سے سوئٹر بن رہی ہے۔ اور بچیاں

ڈرائنگ روم میں کیرم کھیل رہی ہیں ۔ ــــــــ

اچانک مجھے پتھر سے ٹھوکر لگتی ہے ۔ میں ڈگمگا کر گرتا ہوں ۔ کپڑے جھاڑ کر اٹھتا ہوں ۔ ذہن سے خیالات کو جھٹک کر نکالتا ہوں ۔ یکسوئی سے اپنی قیام کی طرف چل پڑتا ہوں ۔ میں سرا مند چھا ریلوے مارکیٹ سے گزرتا ہوں ۔ ایک اجنبی نے دوسرے اجنبی کو اشارہ کیا ۔ ایک شخص تیزی سے میرے قریب آیا میں نے اسی غور سے دیکھا ــــــــ بوسیدہ لباس میں دراز قد ۔ چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی ، اور سر پر بے ترتیب الجھے ہوئے بال ــــــــ اس نے مسکراتے ہوئے میری جانب مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا ۔ میں بھی جواباً مسکرا کر ہاتھ بڑھا دیا لیکن اجنبیت کے تاثرات میرے چہرے پر نمایاں ہیں ۔ نو وارد نے خود ہی تعارف کرایا ۔ ــــــــ

میں سکسینہ ہوں ۔ آپکے ضلع کا ڈپٹی کمشنر ــــــــ

آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ، ــــــــ لیکن ،

آپ اس حال میں ــــــــ پیادہ ــــــــ اور تنہا ۔

جی ہاں تنہا ہی چلتا ہوں ۔ اور خدا کے سہارے خطرات سے کھیلتا ہوں ۔ ایک کیس کے سلسلے میں آیا ہوں ۔ سی بی آئی نے رپورٹ دی ہے کہ آپ کی جان خطرے میں ہے ۔

نہیں ایسا تو نہیں ــــــــ

سی بی آئی نے چند افراد کی تفصیلات نوٹ کی ہے جہاں آپ کی ذات اور آپ کی کہانی TALK OF THE DAY ہے ۔ میں اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہوں ۔ میں نے وہ کہانی فائل میں پڑھی ہے ۔ میں فائل پر احکامات جاری کر دیئے ہیں ۔ آپ مطمئن رہیں ــــــــ آئیے کہیں بیٹھ کر باتیں کریں ۔ خیال رکھئے میری شناخت کسی کو نہ ہو ۔ ــــــــ

میں نارائن کی ہوٹل میں چائے کے بہانے بیٹھتا ہوں ۔

آئیے وہیں چلیں ۔ ــــــــ

ہم دونوں رکشہ سے ہوٹل میں آگئے ۔ چائے کے دوران سکسینہ صاحب نے پوچھا ۔

اس دور کی سفاکیاں بیان کیجئے ــــــــ

وہ مسکرائے ، انہوں نے خود ہی جواب بھی دیا ۔

دانشور کی نگاہوں کے سامنے سب کچھ عیاں ہے

ہم دونوں بہت دیر تک فن اور فلسفہ کی باتیں کی ۔ آرٹ اور کلچر کے جدید رجحانات پر گفت و شنید ہوئی ، اور پھر ماہ میں ایک بار ہم دونوں کی ملاقات ہونے لگی ۔ ہر ملاقات میں ایک نئے موضوع پر اظہار خیال کرتے ،

ایک دن ــــــــ

صبح کا اخبار دیکھا ۔ "روزنامہ آواز" نے سکسینہ صاحب کے تبادلے کی خبر شائع کی تھی ۔ میں سوچنے لگا ٹرم پورا ہونے سے پہلے ٹرانسفر کیسے ہو گیا ۔ انہیں الوداع کہنے کے لئے میں پہلا ٹرین دھا دگیا ۔ ان کی کوٹھی کی قریب پہونچا تو بے نام و نشان لوگوں کا ہجوم تھا ۔ کوٹھی کے لان میں ممبری نوٹ بکھرے پڑے تھے ، جو سکے کے معنوی زبان کے ترجمان تھے ، فوٹو گرافر نوٹ اور نشانات کی تصویریں لے رہا تھا ــــــــ

وہ شام کے وقت شہر سے چلے گئے ، اسی رات کول فیلڈ میں چھ انسانوں کا خون ہوا ۔ دو سرکاری بسیں لوٹی گئیں ۔ تین فرم رہزنی ہوئی ، ــــــــ کالی دھرتی پر دوبارہ تاریکی پھیل گئی کالا دھندہ کرنے والے زندہ ہو گئے ، انسان کا خون پانی بھی ارزاں ہو گیا ۔ غیر قانونی دھندہ کرنے والے یکے بعد دیگرے آ گئے ، اجالے کی روشنی دم توڑنے لگی ۔ میں نئی روشنی کے طلوع کا منتظر ہوں ۔ ــــــــ ●

چیک: ماضی، حال، مستقبل

حرمت الاکرام

کہاں یہ کیش ہو گا ؟
کیسا چیک ہے ؟
دستخط کس کے ہیں ؟

پہلے سوچ لینا ہے
ڈس آنر ہو گیا تو،
جیب امیدوں کی بھی ہو جائے گی خالی،
سلگتا، تلملاتا ہاتھ پہلے ہی سے خالی ہے۔
مگر اس چیک نے خالی ہاتھ کو بھی تقویت دی ہے۔
ہزاروں ہیں دفائن ہیں۔
نہ پہنچے بینک تک یہ چیک تو اچھا ہے
کہ اس کاغذ کے ٹکڑے سے میرا بازو توانا ہے۔
یہ صبح آرائے فردا ہے۔
میں جب ماضی کی جانب دیکھتا ہوں۔
حال اس کاغذ کی لوح سرخوشی پر مسکراتا ہے
مگر کیا جانے کس کے دستخط ہیں ثبت اس پر
کون جانے چیک یہ کیسا ہے۔؟
کہ اس کے سینۂ خاموش میں
پنہاں ہیں
ماضی، حال، مستقبل
یہ ماضی، حال، مستقبل کی صورت مجھ میں
زندہ ہے۔
میری تاریخ فطرت میں زمانوں کا تسلسل ہی الٹ گیا ہے

بنا کرتا ہے مستقبل ہمیشہ لقمۂ ماضی،
مگر ماضی کو میری جنبش خامہ نے مستقبل بنایا ہے

یہ ہونگے دستخط میرے ہی۔
ماضی مجھ سے کہتا ہے۔
اک اک لمحہ جو گزرا ہے
لہو کے بینک میں محفوظ ہے (نایاب ہیرے سا)
مگر یہ سانحہ کیا ہے۔!
میں اپنے دستخط خود بھول بیٹھا ہوں۔
قلم کیا ہاتھ میں لوں
بینک کیا جاؤں
کہ ڈرتا ہوں
کہیں یہ جرم نہ کہلاؤں میں!

وہاب دانش

دُعا

پرندے کی جیسی
ہتھیلی سے اُڑ کر
سما چومتی ہے
فلک گوشہ گوشہ
زمیں بوسہ بوسہ
دعا کے سنہرے پروں سے ڈھکی ہے
دعا لب کشائی کی تتلی
دعا آنکھ کی موتی نیلی
دعا ایک تھرسی انگلی
دعا فاطمی اور بتولی
دعا آنسوؤں کی شکستہ لڑی سی
دعا زرد ہاتھوں کی سوکھی ہتھیلی۔
دعا آنکھ کی آبرو
دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی
آرزو
ایک خوشبو
دعا خواب کا ریشمی خیمہ
دعا اپنی تعبیر میں
روئے مکہ، مدینہ،
دعا سینہ سینہ،
کسکتی ہوئی۔
...جہاں کے در و بام میں گھومتی ہے ...
دعا،
اسم و اشیا سے آگے
پرے ماورار
وہ پہاڑوں کے نوکیلے
لب چومتی ہے
دعا!
آنکھ کے دائروں سے نکل کر
اماں!
لازماں
لامکاں بن گئی ہے۔

منزل شر گزیدہ

دیکھا نہیں تجھے
تیری تصویر دیکھی ہے
یہ جسم
جس میں
روح اللہ
آب آب تھی۔
پانی پہ پاؤں
برف کی مانند تھے رواں
وہ سیم تن تھا بیاباں گل پوش جھیل کا
وہ لہر لہر تھا
آنکھ کے بادام جلوہ گر
وہ ... ہجوم کہ
مہمان آگیا
جب سیر سیر
سائے تشکم سیر ہو گئے،
تو نے کہا
گلیل کی گلیوں کی آنکھ سے
بینائی چاہیے تو لے
پانی سے پاک ہو
اپنی تمام گرد غباری جاگتا ہو
لیکن شجر سیاہ کہ
بدروح تھا وہی
سینے میں جس کے ایک
تناور صلیب تھی
آخر وہی ہوا کہ
تو بے تاج بادشاہ
کانٹوں کا تاج سر پہ لیا
ہو گیا نہال
روئے زمیں پہ
پھول برسنے لگے گلال
روح اللہ تو
برق سی پرواز کر گئی
ایک جسم
جاں شکستہ زمیں بوس ہو گیا
اب آ کہ ہم گھروں میں
دھواں بند ہو گئے
روٹی ہماری کالی کلوٹی توا ہوئی
بھیڑیں ہماری کھو گئیں
جنگل کے جالوں میں نازل ہے اک عذاب
فرشتوں کی خاک پر
منزل شر گزیدہ
ہر اک سمت زرد خام
نیزے چمک رہے ہیں یہاں
دھوپ میں تمام

غزلیں

عبداللہ کمال

رنگ سا، خوشبو سا، گل منظر نشاں میرا بھی تھا
ہاں اسی بستی میں شاید اک مکاں میرا بھی تھا

وہ قیامت تھی کہ ریزہ ریزہ ہو کے اڑ گیا،
اے زمیں، ورنہ کبھی اک آسماں میرا بھی تھا

بے سماعت تو ہی تنہا تو نہ تھا ساز ازل!
دشت بے امکاں میں رقص رائیگاں میرا بھی تھا

لوگ آنسو بو گئے دیوار گریہ کے قریب!
قہقہوں کی فصل پر قرض فغاں میرا بھی تھا

انگلیوں میں تتلیوں کا لمس جاگا، تو کھلا،
سات رنگوں کی دھنک میں آٹھواں میرا بھی تھا

لے اڑا تجھکو مگر بوڑھے سمندر کا طلسم
اے گھٹا اس راہ میں صحرائے جاں میرا بھی تھا

آج سورج بھی سبک سایہ نہ تھا شاید کمالؔ
آج اس کے سر پہ کچھ بار گراں میرا بھی تھا

میں جنت بانٹتا ہوں
جہنم بن چکا ہوں

میری ہر سانس دوزخ
میں ہونے کی سزا ہوں

مجھے شاعر نہ سمجھو!!
میں شاعر سے بڑا ہوں

غزل کہتا نہیں میں
غزل میں جی رہا ہوں

میرے پیچھے نہ آؤ!!
میں خود کھویا ہوا ہوں!!

غزلیں

کرشن موہن

بزرگی بھلا تھا بس،
نکلے ہر اک سے آس،
اسے پانچ دو یا پچاس
کمینہ کیسے کم تھیں
وہ ماو سمپا لئے کس طرح،
پئے جس کے یہاں روز چائے
وہ دریوزہ گر بلکے بھیک
اسے اجنبی سی لگے!
سمجھتا ہے خود کو ولی
مجھے دے نوید نشاط
خرد تو شکایت کرے
غرض یہ تو ہنس کر ملیں

دل و جاں ہوئے محو یاس
کہ بجھتی نہیں اس کی پیاس
نکالے گا دل کی بھڑاس
سکینہ پہ ہے اس کی اساس
کہ ہے نیچتا اس کو راس
اسے بھی سمجھتا ہے داس
بکے گا لیاں بے ہراس
محبت میں جو ہے شناس
ہر اک شاعر بدحواس
ترا حسن انجم شناس
جنوں ہے سراپا سپاس
نہیں تو نہیں کوئی پاس

خرد کا چلن دیکھ کر!
ہر اک کرشن موہن اداس

آزاد گلاٹھی

قید وہ اپنے مقدر میں رہا
ایک قطرہ تھا سمندر میں رہا
ہر کہیں ملتا ہے لمس اپنا مجھے،
میرے جیسا کون اس گھر میں رہا
موتیوں کی خواہشیں دل میں لئے
عمر ساری وہ سمندر میں رہا
اس کا اپنا خوف تھا جو رات بھر
ساتھ اس کے ادھ کھلے در میں رہا
جستجو جن کی رہی اس آنکھ کو
میں ان ہی خوابوں کے منظر میں رہا
تم بدلتے زاویوں میں کھو گئے
میں تو اک نقطے کے پیکر میں رہا

غزلیں

ظہیر غازیپوری

تتلیاں، پھول، خوشبو صبا لے گئے!
ساتھ اپنے وہ اک قافلہ لے گئے

کیا ہماری نگاہیں نہ تھیں معتبر
آئینہ کس لئے آپ اٹھا لے گئے!

ہم کسی موڑ سے ساتھ گزرے نہ تھے
لوگ پھر بھی کہانی بنا لے گئے!

خواب ابھی منظروں کی حفاظت میں تھا
اور وہ ہاتھ اپنا چھڑا لے گئے،

دیکھنے والے اک دھوپ کے جسم سے
سینکڑوں رنگ اب تک چرا لے گئے

اپنی آنکھیں میں آخر کسے بخش دوں
جلنے والے تو میری دعا لے گئے

گرد آوارہ کیسی خبر لائی ہے،
گاؤں کو شہر والے اٹھا لے گئے

جتنے سجدے ہوئے پتھروں پر ہوئے
پھر بھی اعتبار خدا لے گئے!!

ڈاکٹر نریش

نغمہ ہوں، ساز ہوں نہ نوائے سروش ہوں
میں تو کسی دکھی کی صدائے خموش ہوں

بولوں تو تار تار ہو دامان خامشی!
چپ ہوں تو جیسے خود ہی سراپا خروش ہوں

ذوق سفر نے دم نہیں لینے دیا ہنوز!
صحرا و دشت و شہر و بیاباں بدوش ہوں

ایسی پلا کہ نار بغاوت بھڑک اٹھے
ساقی اک ایسا خم کہ عجیب بادہ نوش ہوں

پہلے کبھی طلب تھی بہاروں کی اے نریش
اب اتنے زخم کھائے ہیں گلشن بدوش ہوں

غزلیں

فرحت شہزاد (امریکہ)

ہاں ہم کو ستاروں سے محبت تو بہت تھی،
پستی کا بھی دل رکھنا تھا ہمت تو بہت تھی

اب جس سے کوئی ربط، نہ الفت نہ عداوت
اس نام سے کل تک ہمیں نسبت تو بہت تھی

کچھ اپنی انا کا بھی بھرم رکھنا تھا دل کو
ہونٹوں پہ بھی پیاس میں شدت تو بہت تھی

راس آ ہی گیا دل کو ترے ہجر کا موسم
ہر چند کہ اس رت میں حرارت تو بہت تھی

دیکھا جو ہمیں، دل کو قرار آ گیا اس کے
صحرا میں بھی ویرانی، وحشت تو بہت تھی

آنکھوں میں ترے ہجر کا موسم اتر آیا!
دیدار کی ورنہ ترے حسرت تو بہت تھی

خود ہم نے ہی افسانوی رنگ دے دیا ان کو
سچ یہ ہے کہ شعروں میں صداقت تو بہت تھی

دو کاٹ کے سائے میں سفر کٹ گیا ورنہ
جیون کی کڑی دھوپ میں حدت تو بہت تھی

اب ہو گیا پتھر، یہ زمانے کا کرم ہے!
شہزاد کے دل میں بھی نزاکت تو بہت تھی

رضی قریشی

دست قاتل میں لہو سے ڈوبا خنجر سامنے تھا
شہر جاں میں ہر طرف دار و رسن منظر سامنے تھا

میرے ہمسایوں کی نفرت کا سمندر سامنے تھا
میں لوٹا تو میرا جلتا ہوا گھر سامنے تھا

ہم سفر آواز دیتے ہی رہے ہر گام پر
میں پلٹ کر دیکھتا کیا، ایک پتھر سامنے تھا

خلوتوں میں بھی بھلا پاتا نہیں اس خواب کو!
دشت تنہائی میں رکھا میرا ہی سر سامنے تھا

ہر گھڑی ڈستا رہا جاں سے گزر جانے کا خوف
وقت کے ہاتھوں میں میرا ٹوٹا پیکر سامنے تھا

ہم سرابوں کے مسافر پیاس کا صحرا بنے!
ہم پہ ہنستا کھارے پانی کا سمندر سامنے تھا

ہجرتوں کی داستانیں پتھروں پہ نقش تھیں
بے گھروں کا بے سر و ساماں لشکر سامنے تھا

پھر ہم اس کا قصیدہ لکھتے بھی تو کس طرح!
یوں تو کہنے کے لئے لفظوں کا دفتر سامنے تھا

غزلیں

شاہد میر

ابر سے اترے تو کہیں دھوپ کا منظر اترا
اپنے گھر میں وہی برفیلا دسمبر اترا!

بام و در چپ ہوئے تنہائی کا اژدر اترا
رات کے ساتھ کوئی بھولا ہوا ڈر اترا

بھول بیٹھا جو ٹھکانہ تو زمیں پر اترا
آسمانوں کی بلندی سے کبوتر اترا

مضطرب چھوڑ گیا سرد ہوا کا جھونکا
جسم میں دور تک چاند کا خنجر اترا

زور جس وقت تھا بپھری ہوئی آندھی کا
اک بھٹکا ہوا طائر مری چھت پر اترا

نم دعاؤں نے اثر اپنا دکھایا آخر
قطرہ در قطرہ زمینوں پہ سمندر اترا

یوں تو کل شہر کو بادل سے شکایت تھی مگر
سارا غصہ مری دیوار کے اوپر اترا

انھیں جب بھی پڑھیں حرف رفاقت اسکا
ایک صحیفے کی طرح خطۂ دل پر اترا!

دشت کوہسار چمن زار سبھی گھوم آئے،
ذہن سے پر نہ کبھی چھوڑا ہوا گھر اترا

جو ازل سے ہی ہتھیلی پہ کچھی ہیں شاہد
ان لکیروں سے پرے اپنا مقدر اترا

مدحت الاختر

جانے والے مجھے کچھ اپنی نشانی دے جا
روح پیاسی نہ رہے آنکھ میں پانی دے جا

تیرے ماتھے پہ مرا نام چمکتا تھا کبھی
ان دلوں کی کوئی پہچان پرانی دے جا

جسکی آغوش میں کٹ جائیں ہزاروں راتیں
میری تنہائی کو چھو کر وہ کہانی دے جا

رکھ نہ محروم خود اپنی ہمکاقت سے مجھے
آئینہ مجھکو دکھا دے مرا ثانی دے جا

پرکاش تیواری

کچھ اس طرح نچوڑا حالات نے جکڑ کر
ہر پل گزارتا ہوں میں ایڑیاں رگڑ کر

چہرے پہ رہ گئے ہیں کیا کیا نشان پڑ کر
بے چہرہ ہو گئی ہے صورت مری بگڑ کر

پڑتی ہیں سر پہ آ کر محرومیوں کی اینٹیں
ایوان آرزو کی دیوار سے اکھڑ کر،

ہم لاکھ چاہیں لیکن آ جائیں گی یہ آخر
پھلواریوں سے لائے ہیں تتلیاں پکڑ کر

بیٹھے ہیں منہ بنائے کچھ کھو گیا ہو جیسے
پرکاش صاحب اپنے ہمسائے سے جھگڑ کر

THE AAHANG MONTLY GAYA OCT. 82

گھڑا پاپ کا پھوٹے گا
کالا دھندہ چھوٹے گا

- جیسے گھن لگ جانے سے کوئی ہرا بھرا پیڑ سوکھ کر ٹھونٹھ ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی کالا دھن کسی ملک کی معیشت کو کھوکھلا کر ڈالتا ہے۔
- کالا دھن مہنگائی کی آگ میں تیل ڈالتا ہے۔ اس کی روک تھام میں ہی آپ کی بھلائی ہے۔
- کالے دھن سے نپٹنے کے لئے اشیائے ضروریہ کے قانون، چور بازاری کو روکنے اور اشیاء ضروریہ کی بہم رسانی کے قانون کو سختی سے لاگو کیا جا رہا ہے۔

اس سے سماج اور معیشت کو راحت ملے گی۔

نیا 20 نکاتی پروگرام

تفصیلی معلومات کے لئے اس کوپن کا استعمال کریں

ڈپٹی ڈائریکٹر، ماس میلنگ یونٹ
ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی
بی۔ بلاک، کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی 110001
نئے 20 نکاتی پروگرام سے متعلق معلوماتی کتابچہ اردو/ہندی/انگریزی میں بھیجیں۔

نام ____________________
پتہ ____________________
____________ پن کوڈ ____________

davp 82/288

R.N REGD 4253/64 The Aahang urdu Monthly
P.T REGD No GY/7
PHONE No 432

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے — چوبیس روپئے
ایک شمارہ — دو روپئے

فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹر
نوشابہ حق

رفقاء ایڈیٹرز
شفق، عبدالصمد

طباعت: ہند لیتھو پریس گیا

ے: کلیم القاسمی ڈیہروی

محتویات

غزلیں

اداریہ

کشکول

بہار اردو اکیڈمی کے چیرمین کی حیثیت سے ہمارے گورنر صاحب نے استعفیٰ دے دیا تھا تو بہت سی غلط فہمیوں کے پھیلنے کی گنجائش ہوگئی تھی، اور غلط فہمیاں پھیلیں بھی، خدا کا شکر ہے کہ قبل اس کے کہ غلط فہمیاں یقین میں بدل جائیں، بہار اردو اکیڈمی کی نئے سرے سے تشکیل ہوگئی۔ اور گورنر صاحب EX - OFFICIO چیرمین بنے، اور اکیڈمی کو اور بھی مضبوط بنانے کے لئے چیف منسٹر چیرمین ہوگئے، مزید یہ کہ ایک وائس چیرمین کی بجائے اب دو وائس چیرمین ہوگئے، ایک ڈائرکٹر پہلے ہی سے علاوہ سکریٹری کے ہیں۔

غرض بہار اردو اکیڈمی کو سنوارنے نکھارنے والی قابل اعتماد شخصیتوں کا اچھا خاصا اضافہ ہوگیا۔ اس لئے ہم اگر یہ امید کریں کہ اس کے کارنامے بھی ملک بھر میں روشن اور مثالی ہونگے تو بے جا نہ ہوگا۔

ہماری نیک خواہشات کی چاہے کوئی قیمت ہو یا نہ ہو مگر ہم اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔

بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا کر احسان یا حق شناسی کا جو ثبوت دیا گیا ہے وہ اردو والوں کے لئے قابل اطمینان بات ہے۔ اور اس سے جمہوریت پر ہمارا اعتماد بڑھا ہے لیکن شاید اردو والوں نے یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ سرکاری قانون ہی سب کچھ ہوتا تو پھر قانون شکنی [illegible] جاتے۔ اس لئے قانون بن جانے کے بعد اردو والوں کو زیادہ بیدار، زیادہ حساس اور زیادہ ذمہ دار بنتا ہوگا۔ اس بات پر نگاہ رکھنی ہوگی کہ قانون مردہ الفاظ بن کر نہ رہ جائے ـــــ یہ خدشہ قوی ہے، اسی لئے ہم اردو

والوں سے گزارش کرنا چاہتے ہیں، کہ وہ سرکاری پرزوں کی کارگزاریوں کا احتساب کرتے رہیں، اور تحریر و تقریر کی آزادی کا استعمال اس سلسلے میں مثبت طور پر کریں،

ایسے سرکاری پرزوں کا پردہ فاش کرنا چاہئے، جو چلتے پرزے ہیں۔ اور بہانوں کے ذریعہ اردو کی ترویج و اشاعت اور تسلیم کی راہ میں کانٹے ہی نہیں بچھاتے، بلکہ سدِ سکندری حائل کر دیتے ہیں،

ابھی اردو کے مترجموں کی بحالیاں نہیں ہو پائی ہیں۔ حالانکہ یہ کام مہینوں پہلے ہو جانا چاہیئے تھا۔ مترجم کا مفہوم بھی بحال کرنے والوں کو جاننا چاہیئے، محض اردو کی سند یافتہ ہونے سے کوئی مترجم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے استعداد کا معیار اچھا خاصا ہونا چاہئے۔

راشد شاد

ادبی ممنونیت کا تصور

زندگی ادب پر اثر ڈالتی ہے۔ اور ادب زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ اس جملے کی صداقت کیلئے کچھ زیادہ ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر عہد کے ادب کو اس کے سماجی پس منظر کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی کا شعور اپنے کینوس میں پھیلتا اور سکڑتا رہتا ہے۔ ایک مخصوص عہد میں اگر چند مخصوص اقدار کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ تو یہی اقدار کسی خاص عہد میں اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ قدروں کے پیمانے بدلتے رہتے ہیں۔ البتہ چند بنیادی قدریں کم و بیش سی حالت میں ایک عہد سے دوسرے عہد کا سفر جاری رکھتی ہیں۔ ان غیر متبدل قدروں کے اجزاء سے حیات انسانی کی بنیادی قدریں (FUNDAMENTAL VALUES) حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اور ان اقدار کی روشنی میں تاریخ حیات انسانی کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

ادب اور قدر کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا کہ معاشرے میں اقدار کی تبدیلی کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ ادب ان تبدیلیوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوتا ہے۔ کسی مخصوص عہد میں معاشرے میں رائج شدہ قدروں کو مخصوص ادب اپنے یہاں سمو لیتا ہے اور پھر اس سے متاثر ہونے والا دوسرا ادب اسے اپنے معاشرے میں REPRODUCE کر دیتا ہے۔ بعض اوقات صرف مصنف کی ذاتی زندگی ادب میں چند مخصوص اقدار کو متعارف کرانے کا باعث بنتی ہے۔ داغ کے اشعار اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ جو داغ کی ذاتی زندگی یا خاندانی BACK GROUND کی عکاس ہیں۔

کسی ادب کا ترقی یافتہ ہونا اس کے ادبی سرمائے اور زندگی میں عملی پیش رفت پر منحصر ہے۔ ہر ادب نسبتاً ترقی یافتہ ادب سے اثر قبول کرتا ہے۔ اور اس عمل میں مختلف چیزیں مستعار لیتا ہے۔ یہ مستعاریت اقدار کی بھی ہوسکتی ہے۔ اور ہیئت کی بھی۔ صوتیات کی بھی ہوسکتی ہے۔ اور اسلوبیات کی بھی۔ فکر کی بھی ہوسکتی ہے۔ اور کسی ایسے خیال کی بھی جو صرف یک لمحہ متاثر کرسکے۔ غرض یہ کہ مستعاریت یا ممنونیت کے حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا۔

کون سا ادب کس ادب سے کس حد تک متاثر ہے اور اس کے محرکات کیا ہیں۔ یہ سوالات ادبی تحقیق کے لئے بڑے اہم ہیں۔ ادبی ممنونیت (LITERARY INDEBTEDNESS) ادبی تحقیق کو مختلف زاویئے فراہم کرسکتی ہے۔ لیکن افسوس کہ اب تک اسے ادبی تحقیق کے ایک اہم شعبے کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا ہے جبکہ اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ادبی ممنونیت کے اشاروں کے بغیر کوئی بھی تحقیق صحیح راہ پر نہیں

چل سکتی۔

بعض محققین اور علما اس بات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے کہ کوئی اہم مصنف کسی دوسرے مصنف کے خیالات سے اثر قبول کرے، اور اسے اپنے ہاں مختلف انداز میں یا مختلف تبدیلیوں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرے۔ ان کی نظر میں اس طرح کسی مصنف کی اپنی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ یا اصلیت ORIGINALITY متاثر ہوتی ہے۔ لیکن ایسا سوچنا قطعی حماقت ہے۔ انسانی فکر کا ارتقاء اپنے پیش روؤں کی فکر کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ ایک شخص کی اصلیت تو یہ ہے کہ کسی خاص امر پر مطمئن ہونے میں اس نے کہاں تک قدیم مروجہ افکار سے استفادہ کیا ہے۔ پرانے علوم سے اثر قبول کرنا اور اسے نئی جہت سے آشنا کرنا ہی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ بعض حالات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصنف یا محقق کسی ایسے نتیجے پر پہنچتا ہے جو اس سے پہلے کسی اور کے لئے قابل قبول تھا۔ لیکن ایسی صورت میں بھی اس کی اصلیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس لئے کہ ان نتائج پر پہونچنے میں اسے از سر نو غور و فکر کی منزلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ پیش روؤں کے کام اور اس کے نتائج بھی اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ جس کی روشنی میں وہ کسی خاص امر پر چند نئے دلائل کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اصلیت اپنی دوسری صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ ادبی ممنونیت، اصلیت کو متاثر کرتی ہے قطعی غلط ہے۔ جے ٹی شا نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مصنف کی اصلیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ نئے خیالات ہی پیش کرے، یا بہت زیادہ تخلیقی ہو۔ بلکہ اصل کمال تو یہ ہے کہ وہ دوسروں کے خیالات کو اپنا بنانے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔

"THE ORIGINAL AUTHOR[1]
IS NOT NECESSARILY
THE INNOVATOR OR
THE MOST INVENTIVE
BUT RATHER THE ONE
WHO SUCCEEDS IN
MAKING ALL HIS OWN"

اقبال نے وقت کے اہم مفکرین سے ملاقاتیں کیں۔ تبادلۂ خیال کیا۔ قدیم مفکرین اور فلسفیوں سے استفادہ کیا۔ جن میں چند ایک سے بہت حد تک متاثر بھی ہوئے، نیٹشے کا "ایگل" اور "سوپرمین" اقبال کے یہاں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ شاہین اور مرد کامل کی شکل میں نظر آتا ہے۔ انقلابی پیغاموں کے پیچھے ساتھ قرآن کا گہرا مطالعہ وابستہ ہے لیکن کیا ان چیزوں سے اقبال کی اصلیت پر کوئی حرف آسکتا ہے؟ ملٹن کی شاہکار نظم PARADISE LOST ہو یا گولڈنگ کی مشہور ناول LORD OF THE FLIES، دانتے کی ڈیوائن کامیڈی ہو، یا فلابیر کی مادام بوواری، شکسپیر کی ڈرامائی صلاحیت ہو یا ایلیٹ کی تنقیدی بصیرت، ہر جگہ ممنونیت اپنی مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے۔

تخلیقی عمل ہو یا فکری مستعاریت، تقلید خواہ ہیئت میں ہو، یا فکری رجحانات کے سوتے اس سے جا ملتے ہوں۔

---

[1] LITERARY INDEBTEDNESS & COMPARATIVE LITERATURE – BY J.T. SHAW –

مصنف کی اصلیت پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا۔ اس سلسلے میں AUSTIN WARREN نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے:[1]

ORIGINALITY IS GENERALLY MISCONCEIVED IN OUR TIME AS MEANING A MORE VIOLATION OF TRADITION, OR IT IS SOUGHT FOR AT THE WRONG PLACE, IN THE MORE MATERIAL OF THE WORK OF ART OR IN ITS MERE SCAFFOLDING _______ THE TRADITIONAL PLOT, THE CONVENTIONAL FRAME WORK .... TO WORK WITHIN A GIVEN TRADITION AND ADOPT ITS DEVICES IS PERFECTLY COMPATIBLE WITH EMOTIONAL POWER AND ARTISTIC VALUE,

کوئی ایسی زبان جو بعض صوت اور لہجے کی تبدیلی کے ساتھ دو مختلف ملکوں میں بولی جاتی ہو۔ لسانی وحدت کی وجہ سے ان دو ملکوں میں کے ادب میں ممنونیت کے عمل کو بہت آسانی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں علم و ادب کے ارتقا اور رجحانات سے انگلینڈ کا ادب بلاواسطہ متاثر ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں تیار کردہ دونوں ملکوں کے ادب میں قنوطی رجحانات اور DISILLUSIONMENT کی فضا کا احساس شاید اسی امر پر دال ہے۔

ممنونیت کی راہ میں رسائل ایک اہم رول ادا کرتے ہیں نیز کوئی ایسی زبان میں جس میں اہل ملک کی خاص دلچسپی ہو۔ INDEBTEDNESS کے دروازے کھولتی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں روس میں فرانسیسی ادب کا استقبال اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ اردو ادب میں بعض اہم رجحانات و تصورات فارسی ادب کی دین تھیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ اردو کے ارتقائی دور میں فارسی اقتدار سے منسلک رہنا اور خود اردو بولنے والوں کا اسی زبان کے بہترین ربط میں رہنا ہے۔ تو دوسری طرف اس کی ایک بڑی وجہ عربی سے مذہبی تعلق، جذباتی لگاؤ اور علمی وابستگی بھی ہے۔

ادبی ممنونیت کی مختلف راہیں ہیں۔ ذیل میں ہم ان پر الگ الگ قدرے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

ترجمہ ـــــ TRANSLATION

ترجمہ بذات خود ایک تخلیقی امر ہے۔ مترجم مختلف وقتوں کی سماجی روایات اور انداز فکر کو اپنے سماج میں موجود عناصر کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کرنے میں وہ جملے کی ہیئت بدلتا ہے۔ اسلوب میں بھی تبدیلی لاتا ہے اور مثالوں کو معاشرے کی عام ذہنی سطح

---

[1] THEORY OF LITERATURE

کا خیال رکھتے ہوئے تبدیلی کر دیتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ:

IT GIVES THE WORK A NEW REALITY BY FURNISHING IT WITH THE POSSIBILITY OF A NEW LITERARY EXCHANGE WITH A LARGER AUDIENCE, BECAUSE IT ENRICHES THE WORK NOT SIMPLY WITH SURVIVAL, BUT WITH A SECOND EXISTENCE[4]

اردو اور فارسی زبان میں فکری مماثلت کی جہاں اور بہت سی دوسری وجوہات ہیں، جن میں سے چند کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ وہیں ترجمے کے رول سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان ہی تراجم نے بعد کے عہد تک اردو زبان کو فکری اور ذہنی دونوں کے اعتبار سے فارسی کے قریب رکھا۔ ان تراجم کے ذریعہ سماجی قدریں ایک ادب سے دوسرے ادب میں جس طرح منتقل ہوتی ہیں اس کی ایک بہترین مثال میر کا یہ شعر ہے ؎

جام حکم شراب کرتا ہوں۔
محتسب کو کباب کرتا ہوں

جو دراصل ایک فارسی شعر کا لفظاً لفظاً ترجمہ ہے ؎

جام حکم شراب می خواہم،
محتسب را کباب می خواہم،

بعض اوقات ترجمہ اپنے اندر اسلوب کو بہت حد تک منتقل کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر سودا کا یہ شعر ؎

آلودۂ قطرات عرق دیکھ، جبیں دیکھ!
اختر پڑے، جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

بہت حد تک اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے ایک فارسی شعر کا آئینہ ہے ؎

آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را،
اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

انعام اللہ خاں یقین کا یہ شعر ؎

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند
برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

جن رومانی رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ وہ دراصل ایک فارسی شعر کا ترجمہ ہے ؎

ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل،
بند قبائے کیست کہ وا می کنیم ما،

ادبی روایات اور رجحانات کو متاثر کرنے میں ترجمہ ایک واسطے کا کام کرتا ہے۔ ادبی ارتقا کا راز ترجمے میں پوشیدہ،

چربہ۔ IMITATION

چربہ ترجمہ سے مختلف ہے۔ یہاں مصنف کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے۔ کہ وہ جس ادب پارے کو اپنے یہاں پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس میں اپنی زبان کے مزاج کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مناسب تبدیلیاں کر لے۔ البتہ اس امر کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اصل مصنف کی فکر مجروح نہ ہونے پائے، اس لئے کہ تبدیلی خیال کے بعد کوئی ادبی پارہ کسی ادب پارے کا چربہ نہیں رہ جاتا۔ چربے کی تیاری میں مصنف، اصل مصنف سے زیادہ فنکارانہ مہارت کا اظہار

4 COMPARATIVE LITERATURE AND LITERARY THEORY – PAGE 38

کرتا ہے۔ بقول پیشکن، تجربہ دانشورانہ تلاش کو ظاہر نہیں کرتا۔ یہ ارتقا کی راہیں دکھاتا ہے۔ اور ایک مستقل تخلیقی صنف ہے۔

بیسویں صدی کے چند امریکی شاعروں خاص طور پر ROBERT LOWELL کے یہاں غیر ملکی شاعری کے اثرات اور اسلوبیات میں تجربہ طرازی بہت نمایاں ہے یہ اور کچھ اسی قسم کا عمل گوئٹے (GOETHE) کی WEST_OSTLICHER DIVAN اور پاؤنڈ کی چینی شاعری سے متعلق تقلید میں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے IBSEN کے مشہور پرابلم پلے A DOLLS HOUSE کا مشرقی تجربہ گڑیا کا گھر موجود ہے۔ کتاب کے پہلے صفحے پر مصنف نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اسے ہنرک السن کے معرکۃ الآرا ڈرامے ڈالس ہاؤس کا مشرقی تجربہ بتایا ہے۔ اس لحاظ سے ڈالس ہاؤس کا یہ تجربہ گڑیا کا گھر بہت ہی کامیاب ہے۔ جہاں فاضل مصنف نے کرسمس کو عید سے، عورتوں کے، اور کوٹ کو برقعہ سے درو دیوار کی مغربی سجاوٹ کو مشرقی حسن سے بدل دیا ہے۔

ملیدرم کی بیشتر کہانیاں تجربہ نگاری کے ضمن میں آتی ہیں۔ اور افسانے کے ابتدائی دور میں شیخ زندگی پہ لکھے جانے والے بیشتر افسانے انگریزی کہانیوں سے اثر پذیری کا نتیجہ ہیں۔

اسلوبیات STYLIZATION

ہر اسلوب اپنے ساتھ طرز ادا کا خاص پہلو رکھتا ہے

ہر بات کی ادائیگی کے لئے خاص اسلوب کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ ہر مصنف اظہار و ابلاغ کے لئے بہترین اسلوب کو نمونہ بناتا ہے۔ یا مشہور ادب پاروں کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔ انگریزی ادب میں ایک خاص دلی کیفیت اور پیش منظر کے اظہار کے لئے PUSHKIN کے اسلوب کو مدتوں نمونہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ڈراموں کے بہترین اسالیب کے لئے ہماری نگاہیں بار بار IBSEN اور شیکسپیر کی جانب اٹھ جاتی ہیں
انگریزی اسلوب نثر کا اثر اردو اسلوب نثر پر سرسید کے عہد میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ گو یہ ایک تحقیق طلب امر ہے لیکن سرسید چونکہ انگریزی ادب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ واقف تھے، اس لئے انگریزی نثر کے اسلوبیاتی اثرات ان کے یہاں بآسانی محسوس کئے جاسکتے تھے۔

حالی کے منطقی تنقیدی اسلوب نے بعد کے نقادوں کو بہت متاثر کیا ہے جس کی ایک بہترین مثال کلیم الدین احمد کا تنقیدی اسلوب ہے۔ جہاں شخصی پسند و ناپسند سے آگے بڑھ کر اصولوں کی روشنی میں دلائل کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے اعتماد و یقین کی وہی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو حالی کے اسلوب کا خاصہ ہے:

> میرے نزدیک ریویو نگاری کا مقصد صرف اس بات کا دیکھنا ہے کہ مصنف نے [illegible] سیر کو زمانے کے ہر مذاق ہر نئی تصنیف میں اس طرح ڈھونڈا ہے جس طرح پیاسا پانی کو۔ کس حد تک اور کس درجہ تک ادا کئے گئے ہیں (اور بس) جزئیات سامنے ہیں فی نفسہ مصنف کی رائے کیسی ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام نہیں۔

۱ء مصنف عبدالشکور، مطبع علی گڑھ نامی پریس، سال اشاعت ۱۹۳۶ء

بلکہ پبلک کا کام ہے۔ البتہ ریویو نگاری کا فرض ہے کہ وہ ایسی زبان استعمال کرے کہ رائٹر اور ریڈر دونوں کے لئے راستہ صاف ہو جائے" ــــــ (حالی)[1]

بہرکیف میں نے اردو تنقید میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ اردو تنقید کی بساط کیا ہے۔ اور اس میں کیا کمی ہے کمی سب سے بڑی اس بات کی تھی کہ اس میں اصول کی تدوین نہیں تھی۔ اصولی باتیں کم تھیں۔ اور جو تھیں وہ تشفی بخش نہیں تھیں۔ میں نے اپنی کتابوں میں تجزیاتی تنقید کے علاوہ برابر اصولی باتیں بھی کیں کہیں تفصیل سے تو کہیں اختصار سے لیکن کیں ضرور۔ اور جو کچھ عملی تنقید میں نے کی ان کے پیچھے چند واضح اصول کارفرما تھے یہ محض باتیں نہ تھیں۔ دل خوش کن، یا دل آزار، بلکہ تفصیلی تجزیے تھے، پرکھ تھی، محاکمے تھے، اور یہ سب کچھ بغیر اصول کے ناممکن تھا" (کلیم الدین احمد)[2]

یہاں منطقی استدلال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اسلوب یکسانیت کو بہت آسانی کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مستعاریت BORROWINGS

اس عمل کے زیر اثر مصنف مواد اور طریقۂ اظہار دونوں سے اپنی مدد کرتا ہے۔ اس کا دائرہ کار ادبی رجحان فکری ماخذات، اسلوبیات اور ہیئت سے آگے بڑھ کر کہاوتوں محاوروں اور تشبیہوں سے جا ملتا ہے۔ اس ضمن میں ہم سجاد حیدر یلدرم کی ایک مثال پیش کرتے ہیں جس سے محاورے، ضرب الامثال اور مشہور جملوں کی مستعاریت کا اندازہ ہوگا۔

انگریزی خطوط میں THOUSAND KISSES جیسے جملوں کا استعمال کا رواج قبل سے رہا ہے۔ یلدرم نے اس سے متاثر ہو کر اپنے خطوط میں "ہزاروں چمنیں" ہزاروں پیار" جیسے الفاظ سے ساخت شدہ جملوں کا استعمال کیا۔ جو شاید اس ضمن کی بہترین مثال ہے[3]

ہمارے یہاں ایک شاعر سے دوسرے شاعر کے ہاں مصرعوں اور شعر کے مستعار لینے کا رواج بھی رہا ہے اس کی ایک وجہ اگر یہ ہے کہ بعض اوقات پرانی طرز تحریر ہی بہتر سمجھی جاتی ہے۔ اور اسے اظہار کا بہترین نمونہ مانا جاتا ہے۔ تو اس کی دوسری وجہ ان جملوں اور مصرعوں کے استعمال سے اپنی بات میں وزن پیدا کرنا بھی ہوتا ہے۔

بعض اوقات فکر اور ہیئت کے ساتھ ہی الفاظ بھی ایک ادب سے دوسرے ادب میں منتقل ہو جاتے ہیں ایسا بالعموم اصطلاحوں کے معاملے میں ہوتا ہے۔ خود ادبی مسئولیت کی اصطلاح سے ہم وہ کچھ نہیں سمجھ سکتے اور موضوع کا مکمل تصور ہم پر واضح نہیں ہو پاتا۔ جب تک کہ اس کے ساتھ LITERARY INDEBTEDNESS نہ کہا جائے۔

ماخذ - SOURCE

ادبی تحقیق میں ماخذ سے مراد وہ فکری ماخذ ہے

---

[1] اردو تنقید نگاری، مرتبہ عبادت بریلوی، ص ۱۶۶، سن اشاعت ۱۹۵۲ء، [2] میری تنقید، ایک باز دید، کلیم الدین احمد، ص ۳۰۸، [3] یلدرم کے یہ منظوم... آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے

جو تخلیقی ادب کے لئے مواد فراہم کرے۔ لیکن اس کا بذات خود
ازلی ہونا ضروری نہیں۔ ہالنشڈ کی CHRONICLES
پلوٹارک کی یونان و روما سے متعلق سیرتیں اور بوستان
خیال ماخذات کی حیثیت سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں
ماخذات ہمارے فکری ارتقا کے لئے بنیادی اجزا کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ ماخذ کی تلاش کے بعد اور یہ معلوم ہو جانے
کے بعد کہ کسی ادب پارے کی فکری رجحانات کا ماخذ کیا
ہے۔ ادیب کی اصلیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس کی
وضاحت اوپر آ چکی ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود
ہے کہ کسی مخصوص ادب کے ماخذ سے دوسرا ادب بھی متاثر ہو
سکتا ہے۔ عہد خلافت میں تیار کردہ عربی ادب کا ماخذ
قرآن مجید اور رسول اللہ کی تعلیم تھی۔ عربی ادب کے اس
ماخذ سے اردو کے ابتدائی نثر نگاروں نے بھی استفادہ
کیا ہے۔ معراج العاشقین سے لے کر انیسویں صدی کے
تیسرے ربع تک تیار ہونے والے اردو نثر میں اس ماخذ
کی جھلک بآسانی دیکھی جا سکتی ہے

ہمعصریت PARALLELS

کسی مصنف کو متاثر کرنے میں وقت کے خیالات
و رجحانات کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ادب کا ہر دور کسی مخصوص
TREND کا حامل ہوتا ہے۔ مصنف ہیئتی اور فکری دونوں
اعتبار سے اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی یہ تبدیلی
ہیئت پر براہ راست اثر انداز ہونے کے بجائے محض مواد
میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ بیسویں صدی کے ادب
نے ڈارون مارکس اور فرائڈ سے جو اثرات قبول کئے ہیں
اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑی حد تک
(NATURALISM) (SURREALISM)
اور (SOCIALIST REALISM) جیسے نظریات
کو ادب میں پیش کرنے کا رجحان عام ہوا ہے۔ اور فکری طور
پر در پردہ بیسویں صدی کا یورپین ادب اس سے پوری
طرح متاثر نظر آتا ہے۔ لیکن ان زبردست فکری اثرات
کے باوجود ہیئت یا صوتیات پر کسی اثر کا سراغ نہیں لگایا
جا سکتا۔

ہر عہد کے اپنے تقاضے اور مطالبات ہوتے
ہیں۔ ناول اور مختصر افسانے کے دور میں کوئی شخص
داستانیں نہیں لکھ سکتا۔ اس لئے کہ ادب کی دنیا میں یہ
صنف OUT OF DATE ہو چکی ہے۔ زندگی کی
بڑھتی ہوئی مصروفیتوں کے ساتھ طویل کہانیوں، طویل
نظموں اور مثنوی وغیرہ کا دور ختم ہو چکا۔ موجودہ دور
میں کچھ لوگوں نے مثنویاں لکھنے اور اسے رواج دینے کی
کوشش کی تھی۔ لیکن انہیں قبولیت نہ مل سکی۔ اس قسم کی
چیزیں جن میں وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت
نہیں ہوتی۔ اپنی موت آپ مرجاتی ہیں۔

مختلف ادب میں مختلف ہیئتی تجربے بھی ایک
دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔ بودلیر نے جب نثری نظم کو
متعارف کرایا اس کے کچھ ہی عرصے بعد مختلف زبانوں
میں اس قسم کے تجربات شروع ہو گئے تھے۔ ہمعصریت
سے اثر پذیری کے لئے یہ ضروری ہے کہ دو ادب کے جاننے
والے ایک دوسرے کے ادب سے بلا واسطہ استفادے
کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

صوتیات PHONETICS

جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ادبی اثرات کی ایک
صورت مختلف زبانوں کے قاریوں کے دلوں میں آفرینی
بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ اثر پذیری چند
مخصوص آوازوں (PHONEMES) تک ہی محدود

جدید ہند آریائی کے ابتدائی دور میں پہلی مرتبہ غ، ز، ط، جیسی آوازیں، اس زبان میں داخل ہوئیں، جس کے بعد ادب، اور اس کے صوتی نظام پر دور رس اثرات مرتب کئے۔

گ، گٹ گٹ	غ، غٹ غٹ
گ، گٹر گوں	غ، غٹر غوں
ج، جٹل OIA	ز، زٹل NIA
ت، توتا	ط، طوطا

اثرات - INFLUENCE

ادبی اثرات ایک نفسیاتی عمل ہے جو اثر پذیری ادبی تخلیق پر بظاہر کوئی اثر نہیں چھوڑتا ادبی اثرات صرف مصنف کی شخصی بصیرت (IN-SPIRATION) تجربہ، مستعاریت یا ماخذات پر محیط نہیں (اگرچہ یہ عناصر بھی اس میں شامل ہیں) اس کے کچھ دوسرے محرکات بھی ہوسکتے ہیں جن میں تکمیل اثرات ایک اہم ترین عنصر ہے۔ مثال کے طور پر پشکن کا بورس گوڈونوف (BORIS GODUNOV) کا ماخذ KAMAZINS HISTORY ہی نہیں بلکہ شکسپیر کا ڈرامائی کردار اور اس کا صنف ڈرامہ بھی ہے ادبی اثرات کسی معروف شخص کی فکر کو کسی دوسرے مصنف کے ذریعہ جدید ترتیب میں پیش کرنے کی تحریک بھی فراہم کرتی ہے یہاں اس امر کی وضاحت کرنا بھی شاید ضروری ہو کہ ادبی اثرات کے لئے کسی ادب پارے کا شہرت یافتہ ہونا یا محض شہرت یافتہ ہونا ضروری نہیں۔ کوئی ادب پارہ عوام میں مقبولیت اور شہرت کے بغیر بھی بعد کے ادب پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں دانتے کی مشہور زمانہ تصنیف DEVINE COMEDY کا نام لیا جا سکتا ہے جس کو عوامی شہرت اور مقبولیت نہ تو اپنی سرزمین میں ملی اور نہ ہی بیرون ملک لیکن اس تصنیف سے بودلیئر اور ایلیٹ کی اثر پذیری اور ان دو حضرات کی افہام و تفہیم کی کاوشوں نے اسے وہ شہرت اور مقام عطا کیا جس کی وجہ سے اس سے استفادے کا دروازہ کھل گیا۔

ادبی اثرات کے مختلف محرکات ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں ہم چند ایک کی مختصر نشاندہی کریں گے۔

ادب، زندگی کی طرح متبدل (VARIABLE) ہے اس کی قدریں خواہ اس کے سماجی محرکات کچھ بھی ہوں بدلتی رہتی ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد ہر ادب اپنا استحکام کھونے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں جہاں خود اس کے اندر ایسے ادیب پیدا ہوتے ہیں۔ جو ادب کی ڈانواڈول کشتی کو سنبھالتے ہیں۔ وہیں اس مخصوص ادب کے جاننے والوں کی نگاہیں نسبتاً ترقی یافتہ ادب کی جانب ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول کے دوران جب ادب میں اسلامی افکار پیش کرنے والے گروہ کا زوال ہوا اور یہ گروہ رفتہ رفتہ ادب کے افق سے غائب ہونے لگا اس وقت ہمارے ادیبوں نے انگریزی ادب سے قدریں مستعار لے کر ادب کو نئے سرے سے مستحکم کیا۔

ترجمہ کے ذریعہ بھی ممنونیت کی بہترین مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ کبھی کبھی مترجم اسی اسلوب کو اپنے ہاں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس سے اسلوبیاتی تجربوں کو بہتیرے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اصل زبان میں موجود تمثیلوں کو مصنف اس کی اصل شکل میں الفاظ کے سہارے دوسری زبان میں منتقل کر دیتا ہے۔ یہی اور کچھ اسی طرح کا معاملہ تشبیہوں اور استعاروں کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ایک زبان کے تشبیہہ و استعارے کا تعارف دوسری زبان سے ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ ترجمہ یافتہ استعارے اور تشبیہیں اس زبان کا جز بن جاتی ہیں۔

ادبی ممنونیت دو زبانوں کے اندرونی مزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کی روشنی میں ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ

گیا

صفدر

شعر اور تنقید کے رشتے

نقاد آہستہ آہستہ دبے پاؤں شعر و ادب کی دنیا میں داخل ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شعری ادبی فضا پر چھا گیا۔ آج شاعر اور قاری کے درمیان ناقد ایک ایسی ہستی کا روپ دھار چکا ہے۔ جس کی طرف سے آنکھ بند کرنا تقریباً ناممکن ہے جو لوگ نقاد کو ببانگ دہل فتنہ و فساد کا موجب گردانتے ہیں۔ پس پردہ نقاد سے اپنے حق میں کلمۂ خیر لکھوانے میں جٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں اس قسم کے متضاد بیانات بھی پڑھنے کو ملتے ہیں کہ آج ناقد ایک عظیم ہستی ہوتا ہے۔ تو دوسرے دن اسے ناخواندہ مہمان کا خطاب عطا کر دیا جاتا ہے۔ اگر بعض انتہا پسند شعرا کی آرا کو تسلیم کر لیا جائے اور شعر و ادب کے شہر میں نقاد کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے تو یہ نگر دیران ہو جائے گا شعرا ... کو پڑھیں گے اور سماج میں جلا وطن کر دیگا اگر ایسا نہیں ہو سکتا اور یہ نہیں ہو سکتا تو اپنے قارئین اور ان میں ذہین قاری (ناقد) کے وجود کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس المیہ سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ شعر و تنقید کے درمیان رشتوں کو تلاش کیا جائے، کہ تنقید کی اجنبیت کم ہو۔ اپنے آپ سے آنکھیں چار کرنے کے خوف پر قابو پایا جا سکے۔ اور ہر دو کیمپوں میں اعتماد اور اعتدال بحال ہو سکے۔

اس ضمن میں سب سے بنیادی بات یہ کہی جاتی رہی ہے کہ تنقید تخلیق کے ساتھ ہی عرض وجود میں آتی ہے دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ تخلیقی عمل کے متوازی تنقیدی عمل بھی جاری رہتا ہے۔ شاعر خود اپنی تخلیق کا پہلا نقاد ہوتا ہے۔ شاعر اپنی شعری تجربے کے اظہار کے لئے کسی بیرونی قوت کا دست نگر نہیں ہوتا۔ شاعر کا تنقیدی شعور الفاظ، آہنگ اور خیال کا انتخاب نیز ان کی ترتیب و تہذیب میں حصہ لیتا ہے۔ یہ نظریہ باطل ثابت ہو چکا ہے۔ کہ شاعری وحی یا الہام ہے۔ اپنے تخلیقی لمحات میں شاعر ایک روشن منور وجود ہوتا ہے۔ اور اس روشنی میں شاعرانہ ہوشمندی کے ساتھ وہ شعر کی ترتیب کا عمل انجام دیتا ہے۔ اس طرح شعر بھی ایک قسم کے تنقیدی شعور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس ضمن میں خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

> اگر شعر و ادب، محض تک بندی یا قافیہ پیمائی، محض لفظی بازی گری، ذہنی عیاشی یا بیکاری کا مشغلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک باحواس اور سنجیدہ عمل ہے تو ہر تخلیقی عمل کے ساتھ ایک تنقیدی شعور بھی کام کرتا ہے اور سب سے پہلے خود ادیب کی ذات میں ایک نقاد چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔

بات درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دلیل میں قباحت یہ ہے کہ مذکورہ تنقیدی شعور تخلیقی شعور اور تخلیقی عمل میں اس طرح پیوست بلکہ جذب ہوتا ہے کہ اسے علیحدہ سے شناخت کرنا ناممکن نہیں۔ لا محالہ ضروری ہے۔ نقاد ...

تنقیدی شعور کہتا ہے شاعر اسے اپنے باطن کی تخلیقی مشین کا عمل قرار دے سکتا ہے۔ شاعر کی اس دلیل کو رد کرنا بھی مشکل ہے ہم دیکھتے ہیں کہ شعر گوئی اور شاعری کی تنقید دو الگ الگ اور آزاد بالذات ادبی سرگرمیاں ہیں۔ لہٰذا دونوں کے آزاد وجود کو قبول کرتے ہوئے ان کے مابین مشترکہ بات تلاش کرنا چاہئے۔

ایک شخص شعر نہیں کہتا۔ شعر کی تنقید لکھتا ہے۔ نقاد مخالف، فنکار معترض ہے۔ کہ جو شخص شعر نہیں کہہ سکتا وہ شعر کی تنقید کیسے لکھ سکتا ہے۔؟ بات میں بہرحال وزن ہے شاعر گونگی حقیقتوں کو زبان عطا کرتا ہے۔ شاعر ان دشت وجبل کی سیر کراتا ہے۔ جہاں غیر شاعر کا داخلہ ممنوع ہے۔ اور بقول شخصے ان دنیاؤں میں پہونچ جاتا ہے۔ جہاں جانے کا پاسپورٹ اس کے پاس نہیں ہوتا۔ شاعر لطیف اور بے بدن احساسات کو جسم عطا کرتا ہے۔ بے نام اور ناپید حقیقتوں کو نمود کرتا ہے انہیں نام دیتا ہے۔ یہ کام کسی غیر فنکار کے بس کا نہیں ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناپید کنار وسعتوں کی سیاحی اور عمیق سمندروں کی شناوری کے بعد جو ہیرے موتی شاعر لاتا ہے۔ ان کی طرف ایک زمانہ کیوں متوجہ ہوتا ہے۔؟ شاعر کیوں انہیں سنا کر یا چھپوا کر دوسروں کو بھی اپنے تجربے میں شریک کرتا ہے؟ شاعر کے تجربے میں ایک غیر شاعر کی (شعری تخلیق کی وساطت سے) شرکت کا کیا جواز ہے۔؟ ظاہر ہے کہ کوئی قدر مشترک شاعر اور قاری کے درمیان موجود ہے۔ جن گونگی حقیقتوں کو شاعر نے زبان عطا کی تھیں انہیں سننا چاہتا ہوں۔ جن ناپید احساسات کو شاعر نے صورت بخشی ہے انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جن بے نام کیفیتوں کو شاعر نے نام دیا ہے انہیں شناخت کرنا چاہتا ہوں۔ شاعر کے تجربے میں شرکت کا ذوق و شوق جب اعلیٰ تربیت کے مدارج طے کر چکتا ہے۔ تو تنقید وجود میں آتی ہے۔ گویا شاعر اور نقاد دونوں کا گوہر مقصود ایک ہی ہے۔ اول الذکر اپنی ذات کے وسیلے سے اور ثانی الذکر شعری تخلیق کے وسیلے سے ایک ہی گوہر مقصود تک پہونچنا چاہتے ہیں۔ یعنی زندگی کے شعور و احساس پر دونوں اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں ہی کا کام تخلیقی ہے۔ شعر گوئی کی طرح تنقید بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> اعلیٰ درجے کی تنقید بھی اعلیٰ درجے کی تخلیقی نثر ہوتی ہے۔ اور ہر اچھا تنقید نگار اچھا نثر نگار بھی ہوتا ہے [1]

میتھو آرنلڈ جو شاعر کی تکمیل نقاد کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہے اس سے ہم ہزار اختلاف کریں۔ مگر جب وہ تنقید کو بھی ایک قسم کی تخلیقی سرگرمی بتاتا ہے۔ تو اس کی بات تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے۔ آرنلڈ اپنے مضمون تنقید کا منصب میں ایک جگہ لکھتا ہے:

> اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تخلیقی قوت کا استعمال آزادانہ تخلیقی سرگرمی انسان کا صحیح منصب ہے۔ انسان تخلیقی عمل سے صحیح معنی میں مسرت حاصل کرتا ہے لیکن ساتھ ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صرف عظیم ادب یا فن پارے تخلیق کرنا ہی آزادانہ تخلیقی سرگرمی کا استعمال نہیں ہے۔ یہ سرگرمی اور ذرائع سے بھی بروئے کار لائی جاسکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سوائے چند

۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، زاویہ نگاہ، گیا [illegible] ص ۱۶

آدمیوں کے باقی سب پر مسرت حاصل
کرنے کے لئے دروازے بند ہو جاتے۔ کچھ لوگ
اپنی اس لازوال تخلیقی سرگرمی کو خدمت خلق
کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ لوگ علم حاصل
کرنے میں اسے صرف کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے
تنقید میں استعمال کرتے ہیں۔ اس بات کو خاص
طور پر ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے [1]

شعر اور تنقید دونوں میں مشترک [illegible] ایک بات تو
یہ ہے کہ دونوں تخلیقی سرگرمی کا نتیجہ ہیں۔ دونوں میں تخلیقی
شان پائی جاتی ہے۔ اس لئے ہر اچھا نقاد اچھا نثر نگار
بھی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ دونوں کا منتہائے مقصود زندگی
کا شعور و ادراک حاصل کرنا ہوتا ہے اور اس کے لئے دونوں
حس لطیف کو بروئے کار لاتے ہیں۔

بحث اور اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ
شعر اور تنقید میں اولیت کیسے حاصل ہے؟ کون کس کی
رہنمائی کرتا ہے؟ میتھو آرنلڈ جو تنقید کی اولیت کا علمبردار
ہے رقمطراز ہے:

> میرا یہ ایمان ہے اور اس کے لئے قوی دلائل
> بھی موجود ہیں۔ کہ پہلی تنقید اور اس کے
> بعد تخلیقی سرگرمی کا وقت آتا ہے۔ تخلیقی
> سرگرمی کو لازمی طور پر تنقیدی شعور کا وجود
> کے بعد ظہور میں آنا چاہئے۔ جب تنقید
> اپنا کام کر چکتی ہے۔ جب تنقید فضا کو
> سازگار بنا چکتی ہے۔ اور خیالات کے
> نظام کو ایک ایسے نقطہ پر پہونچا دیتی ہے۔
> تو پھر تخلیقی فن کار اپنے اندر ایک گرمی اور
> عمل کی قوت محسوس کرتا ہے [2]

میتھو آرنلڈ کی دلیل یہ ہے کہ شاعری کا خام مواد زندہ خیالات
ہیں۔ ان خیالات کی دریافت تنقید کا فریضہ ہے۔ اور تنقید
کے مہیا کردہ خیالات شاعر کو نظم کرنا چاہیئے۔ وہ اپنے
اس مضمون یعنی تنقید کا منصب میں لکھتا ہے:

> اگر زندہ خیالات اس طور پر موجود نہیں
> ہونگے تو تخلیقی قوت اسی مناسبت سے
> کمزور اور پست ہوگی۔ تخلیقی فنکار خیالات
> دریافت نہیں کرتا۔ یہ تو نقاد کا کام ہے
> اس کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ مختلف
> خیالات کے سرود کو ملا کر ایک حسن اور
> ایک توازن کے ساتھ اس طور پر جوڑتا
> ہے۔ کہ سارا معاشرہ اس میں اپنے دل
> کی آواز سنتا ہے۔

تنقید کی اولیت کے نظریئے کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نظریہ
ساز اور نظریہ باز تنقید کے امام بن بیٹھے اور شاعروں
کے نام ہدایت نامے جاری کرنے لگے۔ شعر کی تخلیقی عمل اور
شاعر کی فکر و تخیل کے آزادانہ عمل سے جو لوگ واقف ہیں
یہ جانتے ہیں کہ شاعری کسی DICTATION
کسی ہدایت کو قبول نہیں کرتی۔ اور مصلحت آمیز قبولیت کے
نتیجے میں پمفلٹ اور اشتہارات سامنے آتے ہیں۔ تنقید
کے اس نظریئے کے دوسرے مضر اثرات کیا ہو سکتے ہیں اس
ضمن میں ورڈسورتھ نے پتے کی بات کہی ہے:

> غلط اور معاندانہ تنقید لوگوں کے ذہنوں

---

[1] میتھو آرنلڈ۔ مترجمہ جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک، جمیل جالبی، دہلی [illegible] ص ۳۶۰،
[2] ″ ″ ″ ″ ص ۳۶۷

کو بہت نقصان پہونچا سکتی ہے لیکن
برخلاف اس کے کہ احمقانہ تخلیق خواہ
وہ نثر میں ہو یا نظم میں قطعی طور پر
بےضرر ہوتی ہے۔[1]

یعنی تنقید ضرر رساں بھی ہو سکتی ہے جبکہ کسی بھی درجہ کی تخلیق یا شعر ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ تنقید کے ضرر رساں ہونے کے امکانات صرف اس صورت میں ہیں کہ تنقید کی اولیت کی نظریے کو درست تسلیم کر لیا جائے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ کسی زمانے میں ایسا نہیں ہوا کہ شاعری باہر کی آواز DICTOTION کی محتاج رہی ہو۔ بلکہ تنقید نے شعر کے رموز و نکات اور تنقید کے اصول شعری تخلیقات سے اخذ کئے ہیں۔ ارسطو کی بوطیقا جس سے باقاعدہ تنقید کا آغاز ہوتا ہے اس کی واضح مثال ہے۔ افلاطون خوب سمجھتا تھا کہ اس گھوڑے پر سواری ممکن نہیں ... لئے شعر کی قوت وصلاحیت کو قبول کرنے کے باوجود افلاطون نے اسے اپنی مثالی ریاست سے نکال باہر کیا تھا۔ کلیم الدین احمد شعر و تنقید کے رشتے سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تنقید اور ادب میں ناگزیر ربط ہے
تنقید ادب کی پیروی کرتی ہے۔ ادب
سے الگ ہو کر یہ سانس نہیں لے سکتی۔
جس زبان میں ادب نہ ہو یا اس کا
معیار پست ہو تو اس زبان میں تنقید
پھل پھول نہیں سکتی۔ ادب پہلے وجود
میں آتا ہے۔ پھر نقاد ادبی کارناموں
سے اصول فن اخذ کرتا ہے۔[2]

بہر حال شعر و تنقید دونوں میں ایک ناگزیر ربط پایا جاتا ہے۔ بہترین تخلیقات تنقید کو نئے افق مہیا کرتی ہیں اور تنقیدی محاسبہ شاعروں کو نئے عزائم اور حوصلے عطا کرتا ہے۔ تنقید سے اختلاف بلکہ نفرت، تنقید کی غیر ادبی سرگرمی کا نتیجہ ہے۔ اگر نقاد بڑا بھائی بننے کی کوشش نہ کرے۔ تو دونوں کے خوشگوار تعلقات شاعری اور تنقید دونوں کے ارتقا میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ●●

---

[1] ورڈز ورتھ، ارسطو سے ایلیٹ تک، مرتبہ جمیل جالبی دہلی ۱۹۷۷ء ص ۳۵۹
[2] کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، لکھنو ۱۹۶۹ء ص ۱۹

اسرار گاندھی

اپیندر ناتھ اشک

ایک خاکہ

میں جو بھی لکھوں گا سچ لکھوں گا۔ سچ کے سوا کچھ بھی نہ لکھوں گا۔

اس دن میں ہندی کے کئی ادیبوں کے ساتھ رویندر کالیہ کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ انہیں باتوں کے درمیان کسی نے اشک جی کا نام لیا تو میں نے کہا — بھئی اشک جی اپنی چند کتابوں سمیت پھر اردو دنیا میں کود پڑے ہیں۔!

میری بات ختم ہوتے ہی بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک صاحب بولے۔ ہاں ہاں اشک جی ضرور کود پڑے ہوں گے۔ اردو دوسری سرکاری زبان بننے والی ہے نا۔ انہیں اپنی کتابوں کے بک جانے کی امید ہو گئی ہوگی۔ ان صاحب کی بات سن کر سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے تو وہ صاحب پھر بول پڑے، نہیں واقعی میں سچ کہہ رہا ہوں۔ جب آزادی کے بعد ہندی قومی زبان بننے والی تھی۔ تو وہ اسی طرح اردو سے ہندی میں کود پڑے تھے

اشک جی ——— اور مجھے دسمبر ۳۸ء کی شام۔ یاد آنے لگتی ہے جب میں نے اشک کو پہلی بار دیکھا تھا۔ مجھے اب یاد نہیں رہا کہ وہ کوئی ادبی نشست تھی یا یونہی گٹ ٹوگیدر۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ میں قدرے دیر سے پہونچا تھا۔ اور اس گیدرنگ میں موجود لوگ الگ الگ گروپ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں بھی کسی گروپ میں شامل ہوتا میری نظریں ایک دبلے پتلے اجنبی شخص پر رک گئیں۔ جو گہرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ گردن میں میچ کرتی ہوئی ٹائی جھول رہی تھی۔ آنکھوں پر کالی رنگت کے فریم والا چشمہ تھا۔

میں نے کسی سے اس اجنبی کے بارے میں پوچھا۔ تو پتہ چلا کہ جناب کا نام اپیندر ناتھ اشک ہے۔ اشک جی گاؤ تکیہ کا سہارا لئے ہوئے مرحوم ڈاکٹر مسیح الزماں سے مسلسل باتیں کئے جا رہے تھے۔

مجھے پہلے "ڈاچی" یاد آئی، پھر "ملنگ"،

اچھا تو یہی اپیندر ناتھ اشک ہیں۔ میں نے سوچا اور کسی گروپ میں شامل ہونے کے بجائے سیدھا انہیں کی طرف چلا گیا۔

اشک جی، اپنے ضخیم ناول "گرتی دیواریں" سے متعلق باتیں کر رہے تھے، اور یہ باتیں صرف ناول کی تعریف میں ہی تھیں اچانک اشک جی نے پلٹا کھایا۔ اور پھر بڑی بے دردی سے اردو افسانہ نگاروں کی کھال ادھیڑنے لگے۔

جب محفل برخواست ہوئی اور لوگ نشست گاہ سے باہر نکلے، تو سردی شدت اختیار کر چکی تھی۔ کہرے کی ایک چادر فضا میں تنی ہوئی تھی۔ اور اسٹریٹ لیمپ کے بلب مفلس کے چراغ کی طرح بجھے بجھے سے لگ رہے تھے۔ لیکن فضا کی اس کیفیت سے بے خبر میں صرف اشک جی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس پہلی ملاقات میں اشک جی مجھے

زیادہ متاثر نہ کر سکے۔

اشک جی ـــــــــــــــ میں رویندر کالیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا ادب اور خاص کر کہانیوں سے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ یک بیک میں زبان پر آئی کہ پلٹتے ہوئے کہا کالیہ جی، ہندی والے کہتے ہیں کہ اشک دوسرے درجہ کے ادیب ہیں۔ جبکہ بقول اشک۔ ان کے ادب پر جرمن میں تھیسس لکھا جا رہا ہے۔ اور ان کے ڈرامے فرانس میں اسٹیج ہو رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کی کہانیوں کے ترجمے یورپ کے مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اور ہو بھی رہے ہیں۔

کالیہ صاحب کے چہرے پر بڑی پیاری مسکراہٹ پھیل گئی۔ بولے۔ گاندھی صاحب بات دراصل یہ ہے کہ یورپ والے ہمیشہ ہندوستان کی خراب ہی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اگر انہیں کسی ہندوستانی کی تصویر چھاپنی ہو گی تو صرف فقیر کی ہی تصویر چھاپیں گے۔ اور اگر ہندوستانی عمارتوں کی تصویر چھاپنی ہو گی تو وہ تصویریں جھونپڑیوں کی ہی ہوں گی۔ اسی طرح سے یہ دکھانے کے لئے کہ ہندوستان میں ادب بھی دوسرے درجہ کا لکھا جاتا ہے وہ اشک جی کا ادب چھاپتے ہیں۔ مجھے کالیہ جی کی بات سن کر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ پھر میرے ساتھ کالیہ جی بھی ہنس پڑے،

کالیہ جی یہ بات بھی تو ہے کہ اگر جرمن میں کہ جہاں اردو ہندی سمجھنے والے معدود چند ہیں وہاں اگر کسی ہندوستانی تخلیق کار کی تخلیق چھپ بھی گئی تو کیا اس سے اس کے ادب کے معیار پر کیا فرق پڑے گا۔

ہاں یہ بات بھی ہے وہ دھیرے سے بولے،

اشک جی ـــــــــــــــ پہلی ملاقات کے بعد ایک طویل عرصہ تک اشک جی سے پھر کوئی ملاقات نہ ہو سکی لیکن پچھلے دنوں ملاقاتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔ کبھی میں اشک جی کی طرف چلا جاتا۔ اور کبھی کبھار اشک جی میری طرف آ جاتے ہیں۔ اب اگرچہ یہ باتیں نثر میں لکھی جا رہی ہیں۔ مگر اردو کا آدمی ہونے کی وجہ سے مجھے اردو کے ایک شاعر کا اس موقع پر شعر یاد آتا ہے ؎

کبھی ہمیں نے وہاں ان کو جا کے دیکھ لیا
کبھی انہوں نے یہاں کے ہمیں آ کے دیکھ لیا

ان ملاقاتوں کے بعد بھی مجھے اشک جی کو سمجھنا خاصہ دشوار لگا۔ کبھی کبھی وہ نہایت بھولے بھالے معصوم سے انسان نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی انتہائی تیز اور عیار صفت۔

ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیماری کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ یا پھر مالی پریشانیوں کا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس بنگلہ کے مالک ہیں۔ اس کی قیمت آج دس لاکھ روپئے سے کم نہ ہو گی۔

اشک جی سے ان ملاقاتوں کے درمیان ہی میں نے ان کی کتاب چہرے انیک चेहरे अनेक پڑھی یہ کتاب بقول ان کے ایک طرح کی خود نوشت سوانح ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں اشک جی نے بے شمار ہندی اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی کھال کو بڑی بے رحمی سے ادھیڑ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ یا یوں کہیے کہ اپنی انا کو تسکین پہونچائی ہے۔ ان "مظلوم" لوگوں میں منٹو، ن م راشد، میرا جی، چراغ حسن حسرت، راجیہ مہدی علی خان، مہادیوی ورما، سمترا نندن پنت، اگیہ، بھیرو پرشاد گپت، رام کمار ورما، ڈاکٹر رگھوونش، رویندر کالیہ، دودھ ناتھ، گیان رنجن، کملیشور، نلد کشور اور موہن راکیش وغیرہ ہیں۔ غرض کہ

نا وک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

وہ آپ نے تو میر کا جگر نامہ پڑھا ہو گا جہاں میر خود کو

اژدہا اور باقی شعراء دہلی کو کیڑے مکوڑوں میں شمار کرتے ہیں جو اژدہے کی ایک سانس کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔ بس یہی مزا "چہرے انیک" میں ہے۔ اس کتاب میں لڑائی جھگڑے کے جتنے بھی قصے ہیں۔ ان میں فتح اشک جی کی ہی ہوئی ہے۔ کیونکہ بقول اشک جی ان کے باپ جو جواری، شرابی اور بے حد لڑاکو انسان تھے۔ اشک جی کو پٹ کر پیٹنا سکھا گئے تھے۔

"چہرے انیک" پڑھنے کے بعد جو پہلا تاثر ابھرتا ہے وہ یہ کہ اشک جی بے حد منتقمی[1] قسم کا... انسان ہیں۔ عموماً ایسا ہی ہوا ہے کہ جھگڑے کی ابتدا خود اشک جی ہی نے کی ہے۔ شاید اسی لئے ہندی کے مشہور افسانہ نگار گیان رنجن نے ایک بار کہا تھا۔ کہ اشک جی ہندی والوں کے سانپ ہیں۔ اور شاید اسی لئے بیدی جی یہ کہنے پر مجبور ہوئے تھے کہ "دراصل اشک کے اندر کا آئینہ ہی ٹیڑھا ہے۔ اسی لئے اسے دوسروں کے چہرے ہمیشہ ٹیڑھے میڑھے دکھائی پڑتے ہیں" (بیدی کے اس جملہ کے راوی ہندی کے ایک ادیب ہیں)

"چہرے انیک" پڑھنے کے بعد جب میری ملاقات اشک جی سے ہوئی، تو میں نے ان سے کہا۔

اشک جی، الہ آباد میں تو آپ سے اور ہندی والوں سے بے شمار جھگڑے ہوئے، مگر آپ نے ان لوگوں سے نپٹنے میں بڑے کمال کا مظاہرہ کیا۔

میری بات سن کر اشک جی برجستہ بولے، ارے یار گاندھی ان سالوں کی اوقات ہی کیا ہے۔ یہ سب تو چھوٹے حرامی ہیں۔ میں تو منٹو اور ن م راشد جیسوں سے ٹکرا چکا ہوں۔

اشک جی باتوں کے درمیان مغلظات کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں۔ حرامی تو ان کے لئے بہت ہی معمولی سا لفظ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر نا لسائی پچھہتر زبان میں گفتگو کر سکتا ہے۔ تو اشک کیوں نہیں کر سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اشک اپنے کو ٹالسٹائی سے کم نہیں سمجھتے۔

اشک جی چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ پھکڑ انسان بھی ہیں۔ اپنی عزت کی پرواہ کئے بغیر دوسروں کی بے عزتی کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ایک بار میں نے اشک جی کے اس مزاج کا فائدہ اٹھایا۔ ہوا یوں کہ الہ آباد یونیورسٹی کی جانب سے پریم چند پر ہندی اور اردو کا ملا جلا سیمینار ہونے والا تھا ہندی والوں کا رویہ مجھے کچھ زیادہ مناسب نہ لگا۔ وہ سارا کام اپنے من کا جیسا ہی کر رہے تھے،

سیمینار کے دوسرے دن کی پہلی نشست میں مجھے اشک جی بھی نظر آئے، میں ان کے پاس پہونچ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے ان سے کہا ——— اشک جی آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ پریم چند کے ہمعصر ادیب ہیں۔ اور آپ کو کسی بھی نشست کا صدر نہیں بنایا گیا۔

اشک جی بولے، یار زیادتی تو ہو رہی ہے۔ پر کیا کروں

میں نے کہا۔ آپ پریم چند پر کم سے کم تقریر تو کریں گے ہی۔!

کہنے لگے نہیں۔ میری طبیعت خراب ہے گھر جا رہا ہوں

میں نے پھر کہا۔ اشک جی۔ یہ تو غلط بات ہے کہ آپ بغیر کچھ بولے ہی چلے جائیں۔

کچھ دیر ہاں، نہیں کے بعد اشک جی بولنے پر تیار ہو گئے اور پھر جب انہیں بولنے کا موقع دیا۔ تو پریم چند پر بولنے کی بجائے انہوں نے سیمینار کے منتظمین کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ اور اس طرح کسی بھی نشست میں صدر نہ بنائے جانے کا انتقام لے لیا۔ خود مجھے بھی کسی قدر خوشی ہوئی کہ

---

[1] یہ لفظ اشک جی نے چہرے انیک میں عاشق بٹالوی کے لئے استعمال کیا ہے۔

متنفلین کی تملاہٹ قابل دید تھی۔

پچھلے سال اشک جی کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ افواہ اڑی۔ ہوا یہ کہ پاکستان سے واپس آنے کے بعد اشک جی نے اپنی اس ملاقات کا تذکرہ جو انہوں نے پاکستانی صدر ضیاء الحق سے کی تھی۔ مختلف لوگوں سے کیا۔ اسی بیچ کسی ستم ظریف نے اشک جی سے متعلق ایک کہانی گڑھ لی اور اس کہانی کا خوب پروپیگنڈہ کیا۔ کہانی یوں تھی کہ اشک جی صدر ضیاء الحق سے ملاقات کرنے کے بعد ان پبلشروں سے ملاقات کی جنھوں نے ان کی کتابیں ان کی اجازت کے بغیر شائع کر دی تھیں۔ اور روپیہ بھی نہیں دیا تھا۔ اشک جی نے تو پہلے ان پبلشروں کو اپنی اور صدر ضیاء الحق کی دوستی کے بارے میں بتایا۔ پھر اپنے پیسے طلب کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان پبلشروں کو خواب میں بھی اشک جی کوڑا لہراتے نظر آنے لگے، اور اگلے دن ہی اشک جی کو پیسے مل گئے۔

یہ افواہ میرے کانوں تک پہونچی، اتفاق سے ایک دن سرراہ اشک جی سے میری ملاقات ہو گئی۔ تو میں نے ان سے اس افواہ کے متعلق پوچھا۔ اشک جھلا کر بولے۔ پاکستانی پبلشرس مجھے کیا پیسہ دیں گے۔ میں تو خود پاکستان کے ان ادیبوں کو پیسہ دے کر آیا ہوں۔ جن کی تخلیقات میں نے شائع کر دی تھیں۔ (اشک جی سے یہ کوئی پوچھے کہ دیارِ غیر میں اتنی بڑی رقم آپ کو کہاں سے حاصل ہوئی، جو آپ ادیبوں کو بانٹتے پھرے۔ یہ کام تو وہی کر سکتے ہیں جنھیں دست غیب حاصل ہو یا سی آئی اے کی ایجنسی۔)

پھر اشک جی پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق کی تعریف کرنے لگے۔ (صدر ضیاء الحق کی تعریف ڈاکٹر محمد حسن بھی کرتے ہیں جو پچھلے دنوں ان سے مل کر آئے ہیں) جب اشک جی، ضیاء الحق کی تعریف کر چکے تو میں نے پوچھا ——

اشک جی کیا آپ بھی پاکستان کا سفرنامہ لکھیں گے؟

جواب ملا —— نہیں۔

کیوں نہیں لکھیں گے؟ میں نے پھر پوچھا۔

بس کہہ دیا کہ نہیں لکھیں گے تو نہیں لکھیں گے۔

رام لال تو غیر ممالک سے لوٹ کر دھڑا دھڑ سفرنامے لکھتے ہیں۔

اشک جی چڑھ کر بولے، رام لال تو دوسرے درجہ کا ادیب ہے۔ وہ سفرنامہ نہیں لکھے گا تو پھر کیا میری طرح "گرتی دیواریں" جیسا ناول لکھے گا۔ اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد جب وہ اشک جی کے نام سے سفرنامہ جیسی کوئی چیز ملک کے مختلف رسائل میں چھپی تو مجھے پچھلی باتیں اور اشک جی کے دعوے یاد آگئے۔

اشک جی دھن کے بھی بڑے پکے ہیں۔ جو سوچ لیا سو کر کے ہی چھوڑیں گے۔ … اب نوکری نہیں کرنی ہے تو نوکری نہیں کیا۔ پریس لگا لیا۔ پریس لگانے کے بعد ہی ایک خوب صورت رفیوجی لڑکی کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا۔ اس لڑکی کے نوکر ہوتے ہی الہ آباد کی ہندی کی ادبی دنیا میں ایک بھونچال آگیا۔ اس لڑکی کے عاشقوں کی اچھی خاصی تعداد اکٹھا ہو گئی۔ اس لڑکی کی وجہ سے اشک جی کو خاصی پریشانی اٹھانی پڑی۔ آخر کار انھوں نے ناچار اسے نکالنے کی ٹھان لی۔ اس بات کی ہر طرف مخالفت ہوئی۔ اور ہندی کے ترقی پسند ادیبوں نے اشک جی کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ہنگامہ کرنے والوں میں کملیشور آگے آگے تھے۔ مگر اشک جی نے طے ہی کر لیا تھا کہ اسے نکال دیں گے۔ سو نکال کر ہی دم لیا۔ آخر وہ لڑکی مسز کملیشور بن کر شہر ہی … گئی۔ (اس رفیوجی لڑکی کا قصہ چہرے انیک … میں تفصیل سے درج ہے)

آج کل اشک جی کو ایک نئی دھن سوار ہے۔ وہ ایک ایسی محترمہ کو ادیب بنانے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں۔

جوار دو کی معلمہ ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ادب کے بنیادی
پہلوؤں سے بھی ناواقف ہوں۔ ایک ملاقات میں ان سے
میں نے کہا ——— اشک جی! آپ یہ کس چکر میں
پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ لاکھ کوشش کیجئے لیکن وہ محترمہ تو
ذہنی طور پر دیوالیہ ہیں۔ کیا خاک ادیب بن سکتی ہیں۔
میں کسی کو کیوں ادیب بنانے لگا۔ اشک جی نے
جواب دیا۔

پھر آپ خود مضمون لکھ کر ان کے نام سے کیوں
چھپواتے ہیں۔

کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ میں نے ایسا بالکل نہیں کیا

نہیں، آپ نے بالکل کیا ہے۔ میں بھی اڑ گیا پھر
میں نے بعض ایسے ثبوت پیش کئے، کہ اشک جی چت ہو گئے
اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ یار بس میں نے تو اس مضمون
کی تصحیح کر دی تھی۔ اشک جی کو میری اس بات سے بھی متفق
ہونا پڑا۔ کہ وہ محترمہ راتوں رات ریڈر، اور پروفیسر تو
بن سکتی ہیں، پر ادیب نہیں۔

جب ان محترمہ کی باتیں چل رہی تھیں۔ تو میں نے
سوچا کیوں نہ اشک جی کو اور بھی کارنر کیا جائے، اچانک
میں نے اشک سے پوچھا ——— بائی دی وے
اشک جی آپ کے اور ان محترمہ سے کسی قسم کے تعلقات ہیں؟

تعلقات ...... تعلقات سے تمہارا کیا مطلب
ہے۔؟

کچھ بھی نہیں۔ تعلقات کے جو مطلب ہوتے ہیں۔
وہی میرا بھی مطلب ہے۔

میں اسے اپنی بہو سمجھتا ہوں۔ اشک جی بولے،

اشک جی اگر آپ اسے بہو سمجھتے ہیں۔ تو پھر اس
پارٹی میں کیا ہوا تھا۔ جو باہر سے آنے والے ایک مہمان
[illegible] کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ جس میں آپ مدعو تھے،
اور آپ کے ساتھ وہ محترمہ بھی دُم چھلا بن کر گئی تھیں۔

کیا ہوا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ پارٹی کے
حوالے پر اشک جی قدرے پریشان ہو کر بولے۔

جناب میں نے وہ فوٹو بھی دیکھے ہیں۔ جب نشے
کے ترنگ میں آپ کے ہاتھ ....

فوٹو کی بات سن کر اشک بالکل ٹوٹ گئے، اور زچ
ہو کر بولے۔ گاندھی میری عمر ستر برس سے اوپر ہو چکی ہے
تم خود سوچو اگر میں یہ سب کچھ کروں گا۔ تو کیا مجھ پر زیب دیگا
ہاں جوان ہوتا تو بات دوسری تھی۔

مجھے اشک جی کی بے بسی پر ترس آ گیا۔ اور بات کا
موضوع ہی بدل دیا۔

اشک جی کو شاعری سے بھی ہمیشہ دلچسپی رہی ہے
ہندی میں تو ان کے شعری مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ ان
کی ایک نظم "بھیڑیا" اتنی پسند کی گئی۔ کہ ایک مرتبہ تو انہیں
لینن ایوارڈ ملتے ملتے رہ گیا۔ سنا ہے کسی ہندی والے نے
بھیڑ مار دی، یوں اشک جی ASIDES میں بھشم
ساہنی اور کملیشور کا نام لیتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

ادھر اشک جی نے اردو شاعری کی طرف دوبارہ
توجہ دینا شروع کیا ہے۔ ایک دن ان سے میری ملاقات
آل انڈیا ریڈیو کے ایک آفیسر زاہد فاخری صاحب کے
یہاں ہوئی، اشک جی طرح میں بھی فاخری صاحب کی
عیادت کو گیا تھا۔ وہاں نہ جانے کیسے ہندی ادیبوں
کا تذکرہ چھڑ گیا۔ اشک جی حسب عادت شروع ہو گئے
جب میں ہندی ادیبوں کی برائیاں سنتے سنتے عاجز آ گیا
تو بولا ——— اشک جی، چھوڑیئے ان باتوں کو
یہ بتائیے کہ یہ رویندر کالیہ نے آپ کے بارے میں اپنی
کتاب "کامریڈ مونا لزا" میں کیا لکھا ہے۔

کیا لکھا ہے۔؟ اشک جی نے پوچھا۔

ادیب بھی کہ آپ ادیبوں کی دوسری شادیاں کرانے اور پھر میاں بیوی میں نااتفاقی ڈلانے کے ماہر ہیں ۔ اشک جی میری بات سن کر کھسیا گئے ۔ اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کہتے ، سالے بکواس کرتے ہیں ۔ بجلی چلی گئی ۔ اور ہم دونوں فاخری صاحب کے یہاں سے نکل پڑے ، ہم لوگ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ اشک جی ایک اسٹریٹ لیمپ کے نیچے رک گئے اور کہنے لگے ——— یار گاندھی میں نے ایک نئی غزل کہی ہے ۔ ایک شعری نشست میں پڑھنی ہے ۔ تم ذرا سن کر بتاؤ کہیں کوئی غلطی تو نہیں رہ گئی ہے ۔

میں نے کہا ——— اشک جی ، میں تو شاعری کے فن سے بالکل ناواقف ہوں ۔

نہیں تم میری غزل سنو تو سہی ۔ اور بتاؤ کیسی ہے اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا ۔ اشک جی نے کوٹ کے جیب میں ہاتھ ڈالا ۔ اور غزل نکال کر سنانے لگے ۔ چار و ناچار مجھے غزل سننی پڑی ۔ میں نے بھی غزل کی اتنی تعریف کر دی کہ میر اور غالب اپنی اپنی قبروں میں بلبلا کر کروٹیں لینے لگے ہوں گے ۔ اس رات اسٹریٹ لیمپ کے نیچے اشک جی کوئی ایک گھنٹہ مجھے اپنی غزلیں سناتے رہے ۔ اور میں کیا کرتا

ع ؛ جو کچھ خدا دکھائے وہ ناچار دیکھنا ،

اشک جی ۔

چہرے انیک میں اشک جی نے ایک واقعہ کا بڑی دلچسپی سے تذکرہ کیا ہے ۔ یہ واقعہ ہندی کے ایک مشہور افسانہ نگار اور دہلی سے آئے ہوئے ایک پبلشر کی مار پیٹ کا ہے ۔ اشک جی نے لکھا ہے کہ اس مار پیٹ سے پہلے وہ پبلشر رویندر کالیہ کے یہاں گیا تھا ۔ اور کالیہ نے ہی اس ادیب کی طرف سے کچھ اس ڈھنگ سے بات چیت کی تھی کہ نتیجہ میں ، مار پیٹ ہو گئی ۔ اشک کا خیال ہے کہ کالیہ نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا ۔ تاکہ وہ اس ادیب کو ذلیل کرا سکیں ۔ میں نے اس سلسلہ میں جب سچائی جاننے کے لئے جب کالیہ صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کچھ بھی کہنے سے انکار کر دیا ۔ اور سچائی اسی ادیب سے پوچھنے کو کہا ۔ اتفاق سے اگلے ہی دن میری ملاقات اس ادیب سے ہو گئی میں نے چہرے انیک کے حوالے سے اس واقعہ کی سچائی ان سے بھی پوچھی ، انہوں نے بتایا کہ اس میں ساری شرارت اشک کی ہے ۔ کالیہ سے تو اس دن اس پبلشر کی ملاقات ہی نہیں ہوئی ، ہاں اس پبلشر نے اس دن اس واقعہ سے پہلے اشک کے ساتھ لنچ ضرور لیا تھا ۔

اب سچائی تو خدا جانے مگر یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اس پبلشر نے لنچ اشک جی کے ساتھ ہی لیا ہو ۔ کیونکہ جب اشک جی شیلا دیوی کے نام سے فلمی میگزینوں میں آرٹیکل لکھ سکتے ہیں [۱] ۔ اور میگزین کے ایڈیٹروں کے تصویر مانگنے پر اپنے لمبے بالوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کان میں ٹالیس پہن کر عورتوں کے میک اپ میں تصویریں کھنچوا کر بھیج سکتے ہیں ۔ اور یہی نہیں بلکہ اپنی کتابوں پر دوسروں کے نام سے مقدمہ لکھ کر چھاپ سکتے ہیں تو کچھ بھی کر سکتے ہیں ۔

اشک جی

ان تمام باتوں کے باوجود بھی مجھے اشک جی بے حد پسند ہیں ان سے باتیں کر کے ہمیشہ بڑا لطف آتا ہے ۔ کہ ان کے بات کرنے کا ڈھنگ بڑا پیارا ہے ۔ وہ جس کے قریب ہو جاتے ہیں ۔ اس سے پوری طرح نبھانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

اشک جی بڑے با اصول آدمی بھی ہیں ۔ پچھلے دنوں جب ہندی ساہتیہ سملین کہ اشک جی جس کے ایک عہدیدار بھی ہیں ۔ ان سے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے

---

[۱] فلمی جھلکیاں ، مصنف اپندر ناتھ اشک

کے خلاف ایک بیان مانگا۔ تو اشک جی نے اردو کے خلاف
بیان دینے کے بجائے اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ سیملن والوں
نے ان کا استعفیٰ نامنظور کر دیا۔ اور ان سے کہا کہ آپ
جیسا بھی بیان دینا چاہیں دیں۔ اشک جی نے اپنا بیان
لکھ کر پہلے مجھے پڑھوایا۔ پھر سیملن بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ
اس بیان کو سیملن والے پڑھکر اپنے کھٹے ہو گئے ہونگے
اشک جی کریکچری کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ لوگوں کی
ایسی نقلیں اتارتے ہیں کہ آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں۔ ایسے
لمحوں میں اکثر مجھے مرحوم احتشام حسین یاد آگئے ہیں جنھوں
نے ایک بار بے حد خوش گوار موڈ میں حسرت موہانی کی
نقل اتاری تھی۔ اور وہاں موجود لوگوں کے پیٹ میں
ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ میں نے ایک بار احتشام صاحب کو
یگانہ چنگیزی کی بھی نقل اتارتے دیکھا تھا۔ لیکن اشک جی
اس فن میں شاید کچھ زیادہ ہی ماہر ہیں۔

اشک جی بے حد محنتی انسان ہیں۔ اور آج جو
کچھ بھی ان کے پاس ہے ان کی محنت کا نتیجہ ہے۔ وہ جتنا
پڑھتے ہیں اور جتنی محنت سے لکھتے ہیں۔ وہ انہیں کا کام
ہے۔ شاید یہی وہ گُر ہے جس نے انہیں ممتاز افسانہ نگاروں
کی صف میں لاکھڑا کرتا ہے۔ اور شاید یہی وہ کمی ہے
جو آج کے افسانہ نگاروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

اشک جی محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت جرأت
والے انسان بھی ہیں۔ انہوں نے ایک بار جب ترقی پسند
نظریات کو اپنا لیا تو پھر ہمیشہ اس پر اڑے رہے۔ اس
وقت بھی جب کہ بڑے بڑے جغادری ڈانواڈول ہو رہے
تھے۔ اور اس وقت بھی جبکہ ترقی پسند ادب کی راکھ بھی ادب
کے شمشان گھاٹ سے اڑ چکی ہے۔ اشک جی سچ کہنے میں
بھی کبھی نہیں جھجکتے۔ خواہ مخاطب کتنا ہی بڑا یا اہم آدمی
کیوں نہ ہو۔

اشک جی بڑے مہمان نواز بھی واقع ہوئے ہیں۔
وہ کبھی کنجوسی سے کام نہیں لیتے۔ ان کے گھر پہونچ جائیے
تو ہر طرح کی ضیافت اور خاطر داری میں کوئی کمی نہیں
اٹھا رکھتے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اشک جی
چھوٹے سے چھوٹے ادیب سے بھی اسی محبت سے پیش
آتے ہیں۔ کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہونے پاتا کہ وہ
اشک جی جیسے پائے کے ادیب سے ہمکلام ہے۔ کسی ادیب
میں یہ سیر چشمی، محبت اور فراخدلی بہت کم دیکھنے میں
آتی ہے۔ وہ بک بک تو بہت کرتے ہیں۔ اور ہر وقت
اپنی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ لیکن کوئی ان کے ساتھ
بیٹھ کر اپنے کو چھوٹا محسوس نہیں کرتا۔ جیسا کہ عموماً بڑے
ادیبوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ بالزاک کی طرح سڑک
پر ایک معمولی چائے خانہ سے لے کر تھری اسٹار اور فائیو
اسٹار ہوٹل تک آپ کے ساتھ چلے جائیں گے۔ کہیں ان
کی شخصیت آپ کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کرے گی۔
ان کی شخصیت کا ایک پہلو اور بھی دلچسپ ہے۔ مبتدی
سے مبتدی افسانہ نگار بھی اگر اپنا کوئی افسانہ انہیں سنائے
گا۔ تو اسے وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ سنیں گے۔ اور جہاں
تک ہوگا افسانہ کی خوبیوں کو ہی واضح کریں گے۔ اور
اس کا دل بڑھائیں گے۔ یہ نہیں کریں گے کہ اسے ایسے
احساس میں مبتلا کر دیں کہ افسانہ لکھ ہی نہیں سکتا۔ تصویر
کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے ایک افسانہ کی محفل میں جہاں
نئے لکھنے والے کچھ پرانے STABLISHED ادیبوں
پر الزام لگا رہے تھے کہ یہ لوگ نئے لکھنے والوں کو بڑھنے
نہیں دینا چاہتے۔ اشک جی فوراً اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔
اور کہنے لگے کہ پہلے تم میں سے کوئی منٹو، بیدی، کرشن
یا اشک بنکر دکھائے، اور تب تمہیں کوئی آگے نہ بڑھنے
دے تو تم شکایت کر سکتے ہو۔ لیکن وہ ایک بہتر افسانے

بقیہ صفحہ

شرکاءِ گفتگو
جوگندر پال، ممتاز احمد خان
شہزاد منظر، علی حیدر ملک
رحمٰن شریف، اے خیام،

افسانے پر ایک بحث

پاکستان میں

جوگندر پال نے کراچی میں محض چار دن قیام کیا۔ اس عرصے میں وہ بے پناہ مصروف رہے۔ کہیں ڈنر کہیں لنچ اور کہیں چائے، صرف پریس کلب کی تقریب انہیں افسانے کے موضوع پر تقریر کرنے کا موقع ملا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان سے افسانے کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی جائے تاکہ جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں وہ مکمل طور پر سب تک پہونچے، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان سے اس مسئلہ پر مباحثہ کیا جائے، تاکہ ایک دوسرے کے خیال [illegible] استفادے کی صورت پیدا ہو۔ شاید ادبی انٹرویو کی تاریخ کا یہ عجیب واقعہ ہے کہ تھکے ہارے جوگندر پال سے رات کے ساڑھے بارہ بجے وقت مل سکا۔ اور یہ مصاحبہ پو پھٹنے سے ذرا قبل تک جاری رہا۔

سوالات:

علی حیدر ملک: آپ سے قبل افسانے کے بڑے نام موجود تھے۔ اور آپ کے بعد جدید افسانہ نگاروں کی ایک نسل ابھری اس طرح آپ ان دونوں کے درمیان ایک اہم ستون ہیں۔ آپ کے مضامین پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ دونوں سے سمجھوتہ نہیں کرتے، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

جوگندر پال: جب میں نے لکھنا شروع کیا تو افسانے کے میدان میں بڑے بڑے نام پہلے ہی سے موجود تھے، ان لوگوں نے زندگی کا مشاہدہ بڑی گہرائی سے کیا تھا۔ یہ لوگ اپنی کہانی کو زندگی سے جوڑنے کا فن جانتے تھے، اور ادبی ذمہ داریوں کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، ان لوگوں نے بڑی بڑی کہانیاں لکھیں۔ اب غلام عباس صاحب کو لیجئے، "آنندی" اور "اس حمام میں" جیسی خوبصورت اور دل پر اثر کرنے والی کہانیاں ہمارے ادب کو دیں۔ منٹو افسانے کا زبردست جینیس GENIUS تھا۔ اس کی کہانیوں، "نیا قانون" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" وغیرہ کو کون بھول سکتا ہے۔؟ اشفاق احمد نے "گڈریا" جیسی کہانی لکھ کر سب لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی، راجندر سنگھ بیدی نے شروع ہی سے اپنے لئے ایک راستہ بنا لیا تھا، وہ بتدریج ترقی کرتے ہوئے آج بڑے منصب پر فائز ہو چکے ہیں۔ یہ افسانے کے عظیم لوگ ہیں۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے

فن کو پروپیگنڈہ نہیں بنایا۔ یہ لوگ کسی نظریئے سے
وابستہ نہیں رہے۔ بلکہ اخلاص کے ساتھ فنی ذمہ داریوں
کا بھرم قائم رکھتے ہوئے لکھتے رہے۔ اب میں کرشن چندر
کی طرف آتا ہوں۔ وہ نظریئے کی بالادستی قبول کر بیٹھے
یہ بھی ترقی پسندوں کے یہاں بڑا کنفیوژن پیدا ہوا
انہوں نے آرٹ کو استعمال کرنا شروع کیا اور اسے
پروپیگنڈے کی سطح تک لے آئے، لیکن نہیں۔ ان کی کہانی
میں زوال پیدا ہوا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کرشن
چندر نے اچھی کہانیاں نہیں لکھیں۔ انہوں نے کئی
زبردست کہانیاں لکھیں۔ خاص طور پر ان کی کہانی
"آدھے گھنٹے کا خدا" نے مجھے بہت متاثر کیا۔ یہ کہانی
آج بھی میرا پیچھا کرتی ہے۔ لیکن ان کے ساتھ سانحہ
وہی ہوا۔ وہ پروپیگنڈے کے شکار ہو گئے۔ انہوں
نے اپنا نظریہ بنایا اور اسی پر چل پڑے، یعنی زندگی
فن پر نظریئے کی بالادستی قائم ہو گئی۔ ادب کا دراصل
ایک پراسیس ہوتا ہے وقت ادب کی د[illegible]
بڑے عمل کا درجہ رکھتا ہے۔ وقت کے گزرنے کے
ساتھ ساتھ کھرا کھوٹا سامنے آتا رہتا ہے۔ یقینی طور
سے پختہ تحریریں خود اپنا مقام بنا لیتی ہیں۔ اور وہ
تمام تحریریں جن میں یہ وصف نہیں ہوتا وہ پیچھے رہ
جاتی ہیں۔ منٹو، بیدی، غلام عباس کی مثالیں میں
شروع میں دے چکا ہوں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام
لکھنے والے جو فن آرٹ کے تقاضوں کی پاسداری
کریں گے۔ وہ اپنے ہنر کے ساتھ زندہ رہیں گے۔
ایسا [illegible] حقیقت یہ
[illegible] لوگ [illegible] زیادہ [illegible] بوڑھے ہوتے ہیں
اس لئے کہ وہ [illegible] آگے ہوتے ہیں۔ [illegible]
نے اپنے تمام پہلے والے لوگوں کو پڑھا ہوتا ہے۔

پچھلوں کے تمام مشاہدات اور تجربات ان کے سامنے
ہوتے ہیں۔ وہ انہیں کو جذب کئے ہوئے ہوتے ہیں
ان کے سامنے ترغیبات ہوتی ہیں۔ انہیں اپنی راہ
بنانا ہوتی ہے۔ ان کے سامنے گزر جانے والے یا
پچھلوں کی کمزوریاں یا ناکامیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس
طرح ان کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر ان مشکلات میں
وہ مشکلات بھی شامل ہوتی ہیں۔ جو نقادوں کی پیدا
کردہ ہوتی ہیں۔ نقاد کہتے ہیں۔ ایسے نہیں ایسے
لکھو۔ یہ اچھا ہے۔ وہ برا ہے۔ کسی کی وہ تعریف
کر دیتے ہیں۔ تو کسی کو وہ رد کر دیتے ہیں۔ اب دوسرا
مسئلہ یہ ہے کہ کہانی لکھنے کے اتنے طریقے ہوتے ہیں
جتنے کہ اس کرۂ ارض پر انسان موجود ہیں۔ جدید افسانہ
نگار علامتوں اور تجریدیت سے اپنی پہچان کراتے
ہیں۔ علامتوں کے بارے میں میرا خیال ہے کہ علامت
نگاروں کو پہلے سے ایک علامت سوچ کر اس پر افسانہ
نہیں لکھنا چاہئے۔ علامت کہانی سے اگر قاری خود
اخذ کرے۔ تو بہتر ہے۔ آپ تو کہانی کی پرچھائیں
دیکھیں اور کہانی لکھ دیں۔ علامت اس میں خود ہی
آ جائے گی۔ اگر جدید افسانہ نگار ایسا نہیں کرتے تو اس
کا مطلب ہے کہ وہ وسیلوں کے خمیر کا شکار ہو گئے
ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں میں ان لوگوں کی کہانیاں
مجھے اچھی لگتی رہیں جن کی کہانیوں سے قاری خود ہی
علامت دریافت کرتا ہے۔ اس طرح قاری کو ایک
لذت ملتی ہے۔ یعنی جمالیاتی لذت۔ ——— . ———
دوسری بات یہ ہے کہ کہانی [illegible]
سامنے آتے رہتے ہیں۔

ممتاز احمد خاں: جدید افسانہ نگاروں میں آپ کا [illegible]
ہے؟

جوگندرپال: مجھے انتظار حسین کی کہانیاں پسند ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی لوگ ہیں جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں لکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاں علامتیں خاموش SILENT ہیں۔ جیسے سال بیلو SAL BELLOW کے یہاں ہے۔ اس کے یہاں یہ نہیں ہے کہ وہ خود بتائے کہ میں نے آپ کو یہ علامتیں دی ہیں۔ بلکہ قاری خود کہتا ہے حضور والا میں نے آپ کی تحریر سے یہ علامتیں دریافت کی ہیں۔

اے خیام: افسانے میں کہانی پن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جوگندرپال: آدمی دراصل وہ ہے جو اس کی روح ہے۔ اگر روح نکل جائے تو مردہ قرار پاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر روح نہ ہو تو آدمی کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح افسانہ وہ ہے جو اس کا کہانی پن ہے۔ یعنی کہانی پن کے بغیر افسانے کا کوئی تصور نہیں۔ مجھے بجا طور سے یہ کہنا ہے کہ پرانے لوگوں کے اس تصور کو میں تسلیم نہیں کرتا کہ صاحب پلاٹ PLOT ہی کہانی پن ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایبسٹریکٹ (ABSTRACT) کو CONORETE بنانا کہانی کا عمل ہے۔ سال بیلو کی مثال میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ وہ بھی یہی کرتا تھا۔ پہلے سے نتائج برآمد کر کے کہانی کیوں لکھی جائے۔ ورنہ سیدھے سیدھے عنوانات دیدیجئے۔ جیسے کہ بچوں کی کہانیاں ہیں لہٰذا یہ غلط ثابت ہوا کہ پلاٹ سے کہانی پن پیدا ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ کہانی خود تخلیق کار کے ذہن میں بیٹھتی ہے۔ اب وہ سوچتا ہے اور کہانی بناتا چلا جاتا ہے۔ کہانی پن تو خود بخود آئے گا۔ اس لئے کہ تخلیق کار نے کہانی کی پرچھائیں پہلے ہی دیکھ لی تھی۔ جارج مین یا فورمین کی مثال لیجئے جب وہ زیرتربیت ہوتا ہے تو اسے اصول سکھائے جاتے ہیں کہ ہر کام ایسے کرو۔ لیکن جب وہ سمجھ جاتا ہے تو مشینری کو اپنی مرضی سے استعمال کرتا ہے وہ تمام قاعدے اور قانون ایک طرف رکھ چکا ہوتا ہے۔ ایک نیا وکیل شروع شروع میں قوانین میں الجھا رہتا ہے۔ انصاف کی طرف اس کی توجہ اتنی نہیں رہتی لیکن ایک سمجھا ہوا وکیل قوانین کی اتنی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ نئے نئے دلائل سے انصاف حاصل کر لیتا ہے اب اس کا مسئلہ ہی درحقیقت انصاف ہو جاتا ہے۔ وہ خود کہانی سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ یعنی قاری اسے پہچان لیتا ہے۔ اس کی جانب سے کہی جانے والی بات کا ادراک کر لیتا ہے۔ یعنی کہانی کار اس لئے موجود ہے کہ وہ غائب ہے۔ بالکل خدا کی طرح جس کا ہر جگہ موجود ہونا ہر شئے پہ اس کی قدرت ہونے کی وجہ سے ثابت ہے۔ کہ وہ نظروں سے غائب ہے بات کہانی پن کے سلسلے سے چلی تھی اور میں نے سمجھے ہوئے فورمین یا میکنک اور سمجھے ہوئے وکیل کی مثال دیتے ہوئے بتایا تھا کہ فنکار بھی قوانین کو توڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح کہ اس کے افسانے میں کہانی پن زیریں رو کی طرح موجود ہوتی ہے۔ اس سے وہ کہیں غافل نہیں ہے۔ جو ابسٹریکٹ کو کنکریٹ بنا رہا ہے جو کہ ......

علی حیدر ملک: جوگندرپال صاحب! اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ ایبسٹریکشن ABSTRACTION ایک فن ہے۔ بذات خود؟

جوگندرپال: میں دراصل فن کار کی موجودگی کی بات کر رہا تھا۔ جو اس کی غیر موجودگی سے وقوع پذیر ہوتی ہی

وہ اپنی کہانی کی دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ لیکن کرشن
چندر کا عیب یہ ہے کہ اس کا ہر کردار کرشن چندر رہے
میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ کرشن چندر کا لافانی
کردار خود کرشن چندر ہے۔ لیکن دوسری طرف منٹو
اپنے کرداروں کو مارتا جاتا ہے۔ اس کے یہاں
بڑی ورائٹی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی اپنے کرافٹ
CRAFT کا احساس دلاتا جاتا ہے۔ منٹو جھٹکے
دینے کے مشہور ہوا۔ یہ اس کا عیب تھا۔ وہ جھٹکا
دینے سے بچ گیا۔ وہاں اچھی کہانی لکھ گیا۔ کاش
منٹو زندہ ہوتا۔ اس کے یہاں واردات میں
اضافے ہوتے، تو وہ عظیم کہانیاں لکھتا اور عظیم
کردار تخلیق کرتا۔ وہ نئے نئے میدان دریافت کرتا
وہ ان پرانے لوگوں میں سے نہ تھا جن کا مخصوص
پیٹرن اور اسٹائل ہوا کرتا تھا۔ آج کے فنکار کو
ویسے بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ پہلے والوں کے لئے
مخصوص اور فکسڈ FIXED تھا۔ اعتماد سے
بھرپور زندگی تھی۔ ان کے آدرش تھے، لیکن آج
ماحول تشکیک، تجسس اور کنفیوژن سے بھرپور ہے
حالات کے جبر کی وجہ سے آج کے فن کار کی بقا کا
مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس گہرائی میں جا کر بات
کرنے میں دشواری پیدا ہو رہی ہے۔ پھر آج کا
نقاد بڑا کائیاں اور چالاک ہے۔ ان لوگوں میں
بھی گروپ بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے آپ کے لئے
یہ مسئلہ پیدا کر دیا ہے کہ نماز یہاں پڑھو ادھر والی
مسجد [illegible] اے لوگو! میں تو بچپن [illegible]
کا [illegible] اپنے آپ کو [illegible]
تھا [illegible] میں کیوں نقاد سے ڈر [illegible]
[illegible] ہوں۔

آپ لوگوں کو بھی چاہئے کہ آپ بھی تخلیق
کی طرف متوجہ رہیں۔ نقادوں سے نہ ڈریں۔ مجھے دیکھئے میں
تو آزاد ہو چکا ہوں۔ (قہقہے)

شہزاد منظر: بات تخلیق سے تنقید کی طرف بڑھ چکی ہے
تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تخلیق کار شروع سے
ناقد سے اس قدر مغلوب ہو چکا ہوتا ہے کہ بعد
میں اس کی مغلوبیت فطرت ثانیہ بن جاتی ہے

جوگندر پال: یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بات تسلیم
کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ دہلی دوردرشن پر ایک مباحثے میں
حصہ لینے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے کہا تھا کہ
بھئی توقف کرو، فنکار کے جذبے کو دیکھو کو فن
آج بڑا بنے گا تو کوئی کل بنے گا۔ فن کار کو وقت
تو دو۔ لیکن یہ بات بھی [illegible] ہوئی میں
فن کار کی پیٹھ ٹھونک دی۔ اور حرف اول کو حرف
آخر قرار دے دیا۔ آج کل یہ بہت ہو رہا ہے اس
کو ناقدان [illegible] نئے لکھنے والے یہ سمجھ کر کہ
وہ بڑے فن کار بن چکے ہیں فن [illegible] صحیح سمت
میں تغافل برتنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح
ہم اچھے خاصے ٹیلنٹ ضائع کر دیتے ہیں۔ نقاد
کو مصلحت پسندی سے کام لینا چھوڑ دینا چاہئے
دوسری جانب ہم لوگوں کو چاہئے کہ ادب پہ جو
یہ نازک وقت آیا ہوا ہے۔ اس کا ہم مقابلہ کریں
زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں۔ اپنے اپنے فن میں
جاذبیت پیدا کریں۔ اور ہمہ وقت اپنے ضمیر کے
آگے اپنے آپ کو جواب دہ تصور کریں۔

ممتاز احمد خاں: کیا آپ چاہتے ہیں کہ نئے لوگوں کو نقادوں
کی بنائی ہوئی ادبی سلطنت پر حملہ کرنے کا پیغام
دینا چاہئے۔؟

جوگندر پال: ہاں بھئی ہم کو چاہئے کہ نقاد کو خوفزدہ کر دیں اس طرح جس طرح انہوں نے تخلیق کار کو کر رکھا ہے میرے پاس اکثر خطوط آتے ہیں۔ ان میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ میرا انٹرویو ہے۔ انٹرویو بورڈ میں فلاں فلاں نقاد بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اس گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔ نوکری کا مسئلہ ہے اب میں کیا کروں۔؟ اب ہوتا یہ ہے کہ اور فلانا فلانا نقاد دوسرے گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔ گروپ ٹھہرے اور وسیلے پر قابض ہے۔ یہ لوگ کھرتالیں بجاتے ہیں۔ اتنا شور و غل مچاتے ہیں کہ حقیقی ادبی آوازیں دب کر رہ جاتی ہیں اگر حقیقی آوازیں ذرا زور پکڑتی ہیں۔ تو یہ لوگ شور و غل کی مشینیں نصب کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج اشتہار اور ہٹلر کا دور ہے۔ اس قدر ہلٹر مچ رہا ہے۔ اور جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ اور اس کا ملبہ یعنی خراب تخلیقات کے ملبے کو اچھی اور جینوئن تخلیقات پر گرا دیا جاتا ہے۔ کہ وہ دب کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ خراب تحریروں کے ملبے سے اچھی تحریریں نکل ہی آتی ہیں۔ لیکن بذات خود یہ بات خراب ہے کہ اشتہار بازی کی جائے یا ہلٹر مچایا جائے۔

رحمٰن شریف: لیکن چونکہ نئے لوگوں کو اس ملبے کا سامنا ہے۔ تو وہ فطری طور پر نقاد کی گود میں جا گرتے ہیں؟

جوگندر پال: میرا مطلب ہے کہ کچھ خطرات ہیں اور ہمیں چوکنا رہنا چاہئے۔ اگر ہم تمام سچویشن کا ادراک رکھتے ہیں تو اس کا مطلب ہوا کہ ہمیں اپنی بقا کا خیال ہے۔

اے خیام: آپ نے شروع میں کہا تھا کہ پرانے لوگ اپنی ہی ناکامیاں نئے لوگوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ آ[illegible] کی مزید وضاحت کریں گے۔

جوگندر پال: مطلب یہ ہے کہ پرانے لوگ ہر چیز تو اچھی نہیں لکھتے۔ وہ اعلیٰ پائے کی چیزیں بھی لکھتے ہیں اور کہیں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اندر وہ تبدیلیاں نہیں کر پاتے۔ جس کا کہ وقت ان سے تقاضا کرتا ہے۔ ادب کوئی جامد شے تو ہے نہیں۔ لکھنے والے قاری کو نئے تخلیقی ذائقے سے بھی روشناس کرانا ہوتا ہے۔ اب یہاں کچھ ناکامیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے یہ بذات خود ایک اچھائی ہے۔ اس لئے نئی نسل کو ان کمزوریوں اور ناکامیوں سے بچ کر اپنے لئے نئی راہ تلاش کرنا ہوتی ہے۔ اور وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جس سے ادب آگے بڑھتا ہے۔

شہزاد منظر: آپ نے اپنے بزرگوں کی ناکامیوں کے پیش نظر اپنے افسانے یا فن کو کیسے بڑھایا۔

جوگندر پال: شہزاد منظر صاحب! میں نے اپنے بزرگوں کو پڑھا۔ ان سے متاثر ہوا۔ ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی روایت کو سمجھا۔ لیکن کوشش یہ کی کہ میں اپنے فن میں نیا پن پیدا کر دوں۔ ان کی کمزوریوں سے بچوں اور اپنی انفرادیت [illegible] کو زیادہ زیادہ استعمال کروں۔ اور یہ بھی خیال [illegible] پرانی لکیروں کو پیٹنے کے بجائے افسانے کو زیادہ موثر بناؤں۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوں اس کا اندازہ لگانا آپ کا کام ہے۔

شہزاد منظر: جعلی افسانہ نگاروں کی بات پر یاد آیا کہ [illegible] [illegible] نام کے ایک صاحب بھارت میں ہیں جنہوں نے گنتی کے چند افسانے لکھے۔ جن میں "کہانی پن" غائب تھا۔ انہوں نے اپنے رسالے اور ساتھ [illegible]

کے ذریعے ہلڑ بازی بھی کی۔ لیکن جب یہ افسانے ہٹ ہوئے تو حقیقی لوگوں نے آگے بڑھایا۔ اسی قسم کے ایک دو صاحبان ادھر بھی ہیں۔ جو ڈھنگ کے افسانے لکھنے کے بجائے پبلسٹی، ٹولٹو اور جعلی روداد چھپوانے کو اپنی معراج سمجھتے ہیں۔

جوگندر پال: ہاں بھئی۔ بلراج مینرا وغیرہ کا کیس وہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے لیکن جو لوگ خلوص کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں۔ وہی ادب میں زندہ رہتے ہیں۔ جب گرد بیٹھتی ہے۔ تو ہلڑ باز اور اشتہار یا نام نہاد یا غیر حقیقی نقاد کے ہاتھوں راتوں رات مشہور ہو جانے والے نظر بھی نہیں آتے،

علی حیدر ملک: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ افسانہ بہت چھوٹی صنف ہے

جوگندر پال: جو بھی یہ کہتا ہے۔ پروپیگنڈہ کرتا ہے۔ بلکہ بکواس کرتا ہے۔ افسانہ اپنی ذات میں بڑی صنف ادب ہے۔ آپ یورپ کے ماحول کو چھوڑیں۔ جہاں مادیت پرستی اور سرمایہ داری عروج پر ہے۔ اس لئے وہاں جاسوسی ادب کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ ورنہ یہی یورپ تھا جہاں سے زبردست افسانے سامنے آئے، جن سے دنیا متاثر ہوئی۔ ان سے کچھ سیکھا اور اسی کے بل بوتے پر اپنے یہاں کہانی کو مضبوط خطوط پر استوار کیا۔ دیکھئے اصل کیس کنیوس کا ہے۔ افسانے کا حجم چھوٹا ہو سکتا ہے۔ لیکن مسئلہ صحیح تناسب کی دریافت کا ہے۔ کچھ چھوٹی تصاویر ایسی ہوتی ہیں۔ کہ ان میں پورا سمندر اپنی گہرائی اور وسعت کے ساتھ سمٹ آتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ کبھی کبھی ایک چھوٹی سی نظم EPIC کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا زیادتی ہے کہ افسانہ چھوٹی یا حقیر صنف ہے۔

رحمان شریف: ہم آپ کے افسانے بھی پڑھتے ہیں۔ اور تنقیدی مضامین بھی۔ لیکن کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ تنقیدی مضامین بہت کم تعداد میں لکھتے ہیں اور شاید ذائقہ بدلنے کی خاطر۔

جوگندر پال: آپ جانتے ہی ہیں کہ میں فل ٹائم رائٹر ہوں۔ افسانہ اور ناول لکھنا میری زندگی کا مقصد ہے۔ میں تنقیدی مضامین بہت کم لکھتا ہوں۔ دراصل میں فکشن سے متعلق کسی بھی مسئلے پر سوچ بچار کرتا رہتا ہوں۔ وہ مسئلہ اندر اندر مجھے لکھنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ اور جب میں ذہنی طور پر تیار ہو جاتا ہوں تو مضمون لکھ مارتا ہوں۔

ممتاز احمد خاں: میں نے آپ کی کہانیوں میں بارہا خود کلامی پایا ہوں کیا یہ شعوری عمل ہے۔؟

جوگندر پال: دراصل کہانی لکھنے کے اتنے ہی طریقے ہیں جتنے کہ اس دنیا میں انسان بستے ہیں۔ یہ بات میں ابھی کہہ بھی چکا ہوں ہر کہانی اپنا انداز لے آتی ہے۔ میرے کرداروں میں خود کلامی فطری انداز سے خود بخود ابھرتی ہے یعنی کہانی کے تقاضوں کے منشا کے مطابق پھر ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ اس طرح اسلوب کے نئے رنگ دریافت ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں نئے دور کا ایڈیم IDIOM بھی دریافت کرنا چاہئے۔ اور پھر مینرازم MANNERISM بنا بنا کر توڑتے بھی رہنا چاہئے۔ تاکہ کہانی نئی طرز سے بھی آگے بڑھے۔ انتظار حسین کی مثال سامنے ہے۔ وہ بھی پہلے اسلوب کو توڑتا ہے۔ اور آگے بڑھ جاتا ہے اور اب انہوں نے بالکل نئے انداز سے کہانیاں لکھنا شروع کر دی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فنکار کو ہر لمحے تبدیلی کا احساس رہنا چاہئے۔

[illegible]: مجھا [illegible] نئی آواز اٹھی ہے کہ ہمیں نقادوں کی ضرورت نہیں۔ اس بارے میں آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟

جوگندر پال: نئی نسل کی اس آواز میں غم و غصہ چھپا ہوا ہے لیکن یہ نعرہ بھی انتہا پسندی کے جذبے کے تحت لگایا گیا ہے۔ تنقید ایک ضروری امر ہے۔ میں ایسا نہیں کہتا۔ اور نہ میں نے کبھی یہ کہا ہے کہ نقادوں کی ادب میں کوئی ضرورت نہیں۔ دراصل میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ نقاد کو دیانتدار ہونا چاہئے۔ وہ کسی کے عہدے اور منصب سے مرعوب نہ ہو۔ کسی فن کار کا اشتہار نہ بن جائے اور نہ ہی [illegible] فیصلے [illegible] دیانتدار نقادوں کی ہر دم ضرورت رہتی ہے۔ اس دیانتدار نقاد کا [illegible] ہونا چاہئے کہ ٹی ایس ایلیٹ T.S. ELIOT کی مانند فنی اقدار کی دریافت کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ محض نقاد نہ ہو بلکہ تخلیق کار ہو تاکہ ادب کو فروغ حاصل ہو۔

شہزاد منظر: یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ اکثر پرانے لوگ نئے لوگوں کو پڑھتے نہیں۔ لیکن ان کے فن پر بغیر مطالعے کے رائے زنی کرنے لگتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے ہی ایک محترم نقاد ہیں۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ منٹو کے بعد افسانہ پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن بعد کے لکھنے والوں پر رائے ضرور دیتے ہیں۔ اور اکثر کو رد بھی کر دیتے ہیں۔

جوگندر پال: پرانے اور مشہور ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب نئے لوگوں کو پڑھنا چھوڑ دیا جائے۔ یورپ میں تو یہ رجحان ہے کہ بوڑھے ادیب نئے لوگوں کو زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ لیکن ہما

[illegible] دوں گا۔ لہٰذا آپ اس بارے میں [illegible] نہ ہوں۔ افسانہ نگار کو تو اپنے لکھتے رہنا چاہئے نئی نسل کا یہ مسئلہ نہیں ہونا چاہئے کہ صاحب پرانے لوگ ہماری پیٹھ ٹھونکیں۔ بالفرض محال وہ اگر آپ کی پیٹھ ٹھونکیں۔ تو آپ سر جھکا کر نرم لہجے میں بول دیجئے۔ تھینک یو سر — اور پھر اپنے کام میں جٹ جائیں

علی حیدر ملک: ذرا موضوع بدل رہا ہے۔ اور ہم اس پر بات کر بھی چکے ہیں۔ پھر بھی یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا چند لوگوں کا یہ کہنا صحیح ہے کہ تجرید اور علامت نے افسانے کو نامقبول بنا دیا ہے؟

جوگندر پال: میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ کہ علامت اور تجرید قدرتی طور پر پھوٹ کر آئے تو بہتر ہے۔ اس سے کہانی اور خوبصورت ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس امر کا خیال رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں، کہ ہر قسم کے لوگوں میں جدید افسانہ مقبول نہ ہو۔ ذرا سا جو فنکار یہ سوچ کر لکھتا ہے۔ کہ علامت پیدا [illegible] تو وہ کہانی کا آمر یا جابر TYRANT بن جاتا ہے۔ اسے سوچنا چاہئے کہ خود کہانی بڑی ہوتی ہے۔ اور میں پھر کہوں گا کہ علامت و تجرید کے مقابلے پر کہانی اور اس کے فنی تقاضوں کو ترجیح دی جانا چاہئے۔

ممتاز احمد خان: آخر میں کیا آپ اپنے پڑھنے والوں خاص طور پر نئے لکھنے والوں کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

جوگندر پال: میں پہلے ہی کافی باتیں کہہ چکا ہوں۔ آپ اصرار کرتے ہیں۔ تو پھر کہوں گا کہ مطالعہ جاری رکھیں اور افسانہ نگاری کے سلسلے میں [illegible]

بقیہ ۴۴ پر

میں تیز ہو چلی۔ اور میرے اندر کی انسانیت کو لے اڑی۔ اس کے
بعد اس ادھوری ہوئی، شوخ اور بے پرواہ تتلی محسوس ہو کر
رہ گئی۔ اور اس کی ساری تیزی جاتی رہی۔ وہ میرے سامنے
روتی اور منتیں کرتی۔ مگر میں اسے دلاسے دیتا رہا۔ ہر لڑکی
اپنے دل تک پہونچنے کے لئے ایک چور دروازہ رکھتی ہے۔
جس سے کوئی بھی مرد گزر سکتا ہے۔ شاہدہ اور سیما نے میرے
واسطے وہی چور دروازہ کھول دیا تھا میں اچھلتا کودتا اس سے
گزر کر ان کے دل تک پہونچا۔ مگر دبے پاؤں خاموشی سے انہیں
ایک روز تنہا سسکنے کے لئے چھوڑ آیا۔ پھر کئی لوگ ایک ساتھ
دستک دینے لگے۔ یہ میرے دفتر کے ماتحت معلوم ہوتے تھے
جن کو میں نے ہمیشہ ناجائز دبایا۔ جن پر سختیاں کیں۔ اپنے
اختیارات کو بے جا استعمال کیا۔ اپنے ہی ایک ساتھی کے
خلاف اپنے افسر کو ورغلا کر اور خوشامد کر کے بعد ترقی
حاصل کر لی تھی۔ مجھے ان تمام دفتر والوں کے چہرے ایک ایک
کر کے یاد آنے لگے۔ دن کے اجالے میں اپنے آپ کو دوسروں
کے سامنے پیش کرتے وقت یہی احساس رہتا ہے کہ یہ مجھے
پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ پھر یکایک میرا دل بیٹھنے لگا مجھے
وہ دن یاد آنے لگا جب میری ان حرکتوں کی وجہ سے میرے ماں
باپ مجھ سے علاحدہ ہو گئے تھے۔ میں اپنی ماں کے آنسو دیکھ رہا
مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میرے وجود کے اندر سے وقت کا
پرندہ اڑ گیا تھا۔ جو محبت اور ممتا ایسے جذبوں کے لئے بھی
نہیں ٹھہرتا۔ ماں باپ کے پر سکون اور ٹھنڈے سائے کو
چھوڑ کر میں خود ہی زندگی کی تپتی دھوپ میں نکل آیا تھا
[illegible] کو تو [illegible] سمجھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو ان کا حق
نہیں دیا۔ ان ہی خیالات کے ساتھ [illegible] دروازے پر
ہلکی نرم دستک سنائی دینے لگی۔ ہر بار اس دستک پر میں
[illegible] مگر کچھ سوچ کر [illegible] رہتا۔ [illegible] ہوش نہیں تھی
[illegible] دروازہ کھول کر ان سب کو اپنا چہرہ دکھاتا۔ یہ سارے۔

کر جانور جسم کے تاریک غاروں سے نکلے ہوئے بھیڑیوں
کی طرح میرا پیچھا کر رہے تھے۔ الوزر مجھے ایسی نظروں سے دیکھے گا
کہ میں سنبھل نہ پاؤں گا۔ شاہدہ مجھے پتہ نہیں کیا کیا کہے گی
سیما کے سامنے نظریں نہ اٹھا سکوں گا۔ ممکن ہے اس جیسی
لڑکی مجھ پر جھپٹ پڑے، دفتر والے سب مل کر مجھ پر حملہ
آور ہو جائیں گے۔ اور ماں باپ، بہن بھائیوں کا سامنا
کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ میرے اعمال کے ثمرات میرے
وجود کے درخت سے ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے۔ کیونکہ ان میں
میرے اندر کا سارا زہر آمادہ ہو گیا تھا۔ وقت ٹکڑے
ٹکڑے ہو گیا۔ اس کے لمحے یوں گزر رہے تھے، جیسے سانپ
سوکھی گھانس میں سرسرا رہے ہوں۔

دستک ہوتی رہی یہ دستک۔ میرے اعصاب پر بری
طرح چھا گئی تھی۔ ہاتھ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھتا، اور
رک جاتا۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ باہر ایک ہجوم کھڑا ہوگا۔
جو مجھے جھنجھوڑ ڈالے گا۔ میری زیادتیوں کا بدلہ لے گا۔ اور
سب مجھ سے اپنا اپنا حق مانگیں گے۔ فریاد کریں گے۔ انصاف
طلب کریں گے۔ زندگی کا ہر ہنگامہ وقت کے سمندر میں
کھو جاتا ہے۔ مگر اب یہ سارے ہنگامے وقت کے سمندر
سے دوبارہ ابھر ابھر کر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتے تھے
ان کی نفرتوں کی سیاہ لہریں میرے چہرے پر ابھر رہی تھیں۔
میرے پیچھے بلکتی ہوئی ساعتوں نے آپس میں تحلیل ہو کر میرے
وجود کے گرد عجیب سا موہوم حلقہ بنا لیا تھا۔ میں اسی کیفیت
میں مبتلا تھا کہ بیوی نے اندر سے آکر حیرانی سے پوچھا۔

یہ دروازے پر کھڑے کیا سوچ رہے ہو۔

دستک! میں نے سرگوشی میں کہا۔

دستک؟

ہاں بہت دیر سے۔ میں نے بوجھل لہجے میں بولا

تو پھر کھولتے کیوں نہیں؟

نہیں ـــــــ میرے حلق سے آواز نکل کر آنے پر الجھ گئیں۔

ارے، اس نے پریشانی سے کہا، بھئی باہر پتہ نہیں بے چارہ کون ہوگا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھکر اسے چپ رہنے کو کہا تو وہ چونک اٹھی۔

آخر کیوں ؟

میں اسے پکڑ کر اندر لے آیا۔ کہ کہیں اس کی آواز سے میری آواز باہر نہ چلی جائے، دستک کی آواز مجھے برابر قریب آتی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔ میں زندگی میں اب تک اپنے سر پر ظاہر داری کا ڈراؤنا جالا لئے، سر پٹ بھاگتا رہا تھا۔

میں دیکھتی ہوں ـــــ ـ ـ بیوی نے مشکوک نظریں مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا میں اسے روکتا رہا۔ دبی دبی اور گھٹی گھٹی آواز میں منع کرتا رہا۔ لیکن اس نے دیکھتے ہی دیکھتے جاکر دروازہ کھول دیا۔ باہر کھڑے ہجوم کے تصور سے میں کانپ گیا۔ ... لمحات میں ایک گہیدا اور اب حلق سے دل کے دھڑکنے کی تیز آواز آنے لگی۔ باہر دیکھ کر بیوی بولی۔

ارے یہاں تو کوئی بھی نہیں۔

کوئی نہیں ـــــ ؟

میں یقین کرنے کے لئے مشکوک لیکن بھاری قدموں پر اپنے آپ کو لادے آگے بڑھا۔ یہ ساعتیں ایک دوسرے میں گھلی ملی، میری آنکھوں کے راستے میرے وجود کے اندر یہ چاروں طرف بہہ نکلی تھیں۔

تمھیں وہم ہوا ہوگا۔

یہ کہکر بیوی پھر کسی کام میں لگ گئی۔ میں آگے بڑھا اور ادھ کھلے دروازے سے گردن نکال کر دیکھنے۔ جسم اور دھڑکتے دل کے ساتھ باہر جھانکنے لگا۔ پھر اندر واپس آنے کی بجائے میں باہر ہی نکلتا چلا گیا۔

رات گئے جب میں واپس آیا تو گھر میں داخل ہوتے وقت میں جو پہلے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اب دوبارہ مجتمع ہو گیا۔ بیوی نے دیکھتے ہی فکرمندی سے پوچھا۔

کہاں چلے گئے تھے، اتنی دیر لگادی۔ ؟

اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سب سے پہلے میں نے گھر کی ساری کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے بیوی تعجب سے کھڑی دیکھتی رہی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تم نے ٹھیک کہا تھا، باہر کوئی بھی نہیں ہے۔ ●

نیا سفر

ایوب جوہر (بنگلہ دیش)

اور پھر یوں ہوا کہ اس کے اندر کا سویا ہوا شخص جاگ پڑا۔ اور آناً فاناً آگ کے شعلے میں تبدیل ہو گیا۔

تم ...... تم ...... ذلیل کتے ...... اس نے چاہا کہ بڑھ کر کرسی سمیت آفیسر کو اٹھا کر بارہویں منزل کی کھلی ہوئی کھڑکی سے نیچے پھینک دے، کہ اس مکروہ چہرہ انسان دشمن اور قوم و ملک کے غدار کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔

لیکن وہ کچھ نہیں کر سکا۔ وہ اپنی جگہ یوں جامد و ساکت ہو چکا تھا۔ جیسے اس کے جسم میں حرکت کی کوئی لہر باقی ہی نہ رہی ہو۔

آئی ایم ویری ساری سر جسیم، آئی ٹرائیڈ مائی بیسٹ ٹو سلیکٹ یو بٹ ......

آفیسر کے منہ سے الفاظ کی برچھیاں نکل کر اس کے کانوں کو لہولہان کر گئیں۔ اور وہ یوں آنکھیں پھاڑے آفیسر کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ جیسے آفیسر کے چہرے پر کوئی اور چہرہ فٹ ہو گیا ہو۔

اور پھر یوں ہوا کہ اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں لیسے جیلے تو وہ بارہا سنتا رہا ہے۔ آئی ایم ویری ساری ــــ پھر آج کوئی نئی بات تو نہیں ہو رہی ہے۔ اور دراصل نئی بات تو ہوتی بھی نہیں۔ باتیں تو صدیاں پرانی ہی ہوتی ہیں۔ البتہ ان باتوں کے لہجے بدل جاتے ہیں۔ اشارے کنائے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً کسی سڑک کا نام جناح ایونو کی جگہ بنگو بندھو ایونو ہو جاتا ہے۔ سادھو موہن کی مسٹر صدرالدین ہو کہ کسی نہ کسی

فرم کا مالک ہو جاتا ہے۔ کوئی میٹریکولیٹ کسی گریجویٹ پر سبقت لے جاتا ہے۔ یہاں سب ہوتا ہے یہاں سب ہوتا رہا ہے۔ یہاں سب ہوتا رہے گا۔ پھر بے چارے آفیسر کا کیا قصور! اس نے اپنے آپ کو سلجھانے کے انداز میں سوچا۔ اور پھر یوں ہوا کہ اس نے اپنی ایڑیاں اونچی کیں۔ اباؤٹ ٹرن ہوا اور آفیسر کے کمرے سے یوں نکلا جیسے بھری بندوق سے گولی نکلے ــــ!

باہر ویسی ہی زندگی تھی، جیسی وہ کچھ لمحے پہلے چھوڑ کر گیارہ منزلہ عمارت کے اندر داخل ہوا تھا۔ وہی لوگوں کا اژدہام وہی ٹریفک کی دھکم پیل، اور وہی فٹ پاتھ کے کتوں کی دھینگا مستیاں۔ کچھ تو نہیں بدلا تھا۔ لیکن وہ ــــ شاید وہ بدل گیا تھا۔ کہ وہ جو چال چل رہا تھا۔ اس کی اپنی چال نہ تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ خود نہ چل رہا ہو بلکہ اسے سڑک چلا رہی ہو۔ ...... جبکہ کچھ دیر پہلے کی ہی بات ہے کہ اس نے گیارہ منزلہ عمارت کے اندر داخل ہوتے ہوئے یہ اچھی طرح محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی چال چل کر ہی اس اونچی عمارت میں داخل ہوا ہے۔ اونچی عمارت جو اس سے اونچی نہ تھی۔ کہ اسے اچھی طرح احساس تھا کہ اس کی اونچائی، لمبائی چوڑائی کے تھنکتے میں، اس کے جوان ولولوں کا قطرہ خون بھی شامل ہے۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر اس کا نام لکھا ہوا ہے۔ تو یوں تازہ اور نمایاں ہے جیسے ابھی ابھی لکھا گیا ہو۔

بات کچھ غلط بھی نہیں۔ یہ تو کل کی بات ہے کہ اس نے اپنی انگلیاں لہو میں ڈبو لی تھیں۔ اور عمارت کی ایک ایک اینٹ پر اس کا نام درج کیا تھا۔ پھر اتنی جلدی یہ تحریر کیسے مٹ سکتی تھی۔ لیکن نہیں اگیارہ منزلہ عمارت سے نیچے اترتے ہی اس کا ذہن خالی ہو چکا تھا۔ وہ ذہن جس میں لہو میں ڈوبی ہوئی انگلیاں تھیں۔ اور اس کا قد عمارت سے بھی اونچا تھا۔ اور پھر یوں ہوا کہ لفٹ سے اترتے ہوئے اس نے یہ اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ کہ وہ لفٹ کے ذریعہ زمین پر نہیں آ رہا ہے۔ بلکہ زمین کے اندر آ رہا ہے اتنا اندر جہاں تک بھی اپنا وجود کھو بیٹھے۔

لیکن وہ تو بڑا ہٹ دھرم تھا۔ انتہائی مصروف ترین راستے پر تھا۔ اور زندگی اسی طرح [illegible] لہرا رہی تھی جیسی کچھ دیر پہلے ____ [illegible] اسے محسوس ہوا کہ کوئی بھاری شے اس کی پیٹھ سے ٹکرائی اور وہ سڑک سے فٹ پاتھ پر اس طرح چلا آیا جیسے [illegible] کیا ہوا فٹ بال اوپر کی جانب اچھلے۔ اور پھر دھپ سے زمین پر آ رہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ رکشہ والا مسکراتا ہوا اس کے سامنے سے نکل رہا تھا۔ اور کوئی ادھیڑ عمر کا شخص اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے ہمدردی کے لہجے میں مخاطب تھا۔

بابا۔ فٹ پاتھ پر چلا کرو۔ فٹ پاتھ لوگوں کے چلنے کے لئے ہی بنایا گیا ہے۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے محسن کی جانب دیکھا۔ اور اپنی نظر نیچی کر لی۔

اور سنو۔ فٹ پاتھ پر چلا کرو ___ وہ بڑبڑایا اور جب اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا فٹ پاتھ سے اٹھا تو ادھیڑ عمر کا شخص آگے بڑھ چکا تھا۔ البتہ جاتے جاتے اس کے ہونٹوں پر جھنجھلاہٹ کی ایک لہر چڑھا گیا تھا۔ جس پر کھولتا سوال ہو کر جھنجھلانے لگی تھیں۔

اور سنو۔ فٹ پاتھ پر چلا کرو۔ جسے دیکھو وہی ایک عدد نصیحت جھاڑ جاتا ہے۔ فٹ پاتھ پر چلا کرو۔ [illegible] بازار کے آڑھت سے پھل یا آم خرید کر لاؤ۔ اور کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کبھی درواڑی کر لو۔ کہ چند چار پیسے آنا شروع ہوں۔ یعنی یعنی کہ اب میں صرف نصیحتوں کے لئے رہ گیا ہوں۔ یا نصیحتیں سننے کے لئے ہی پیدا ہوا ہوں۔ یہ .... یہ بے ہودے لوگ ...... وہ آگ کے شعلے میں لپٹے لپٹے اچانک ٹھنڈا ہو گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ اس کے کان بہت دور سے آنے والی سرگوشیوں سے دکھنے لگے .... دائیں ہاتھ سے منہ دھوؤ، دائیں ہاتھ سے لقمہ لو۔ دائیں ہاتھ سے پانی پیو یہ اس کے بابا کی نصیحتیں تھیں۔ اور یہ نصیحتیں اس وقت کی تھیں جب اس کے ہاتھ ننھے ننھے سے تھے۔ پاؤں چھوٹے چھوٹے سے اور زبان الفاظ سے محروم۔ لیکن اس وقت بھی اس کا ننھا ذہن یہ ضرور سوچ لیتا تھا۔ کہ سب کام دائیں ہاتھ ہی سے کرنا چاہئے۔ تو بائیں ہاتھ کا وجود کیوں؟ وہ سوچتا اور جھنجھلا جاتا۔ جس طرح وہ آج لوگوں کی نصیحتیں سنتا ہے۔ سوچتا ہے اور جھنجھلا جاتا ہے۔ جیسے اس کے سوا اس میں کچھ کرنے کی سکت ہی نہ رہی تھی۔ جبکہ صرف چند سال قبل کی بات ہے۔ اس نے اپنے بابا کو تقریباً ڈانٹ دیا تھا اور تعجب کی بات تو یہ تھی کہ اس کے بابا نے وہی باتیں اس سے کہی تھی جو وہ بچپن میں اکثر اسے کہا کرتے تھے، کہ دائیں ہاتھ سے پانی پیو، دائیں ہاتھ سے ...... وغیرہ۔ البتہ اس کے بابا کے لہجے میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی تھی۔ یعنی انہوں نے یہ جملے کچھ اس طرح کہے تھے کہ دائیں راستے پر ہی چلنا چاہیے کہ دائیں راستے پر اس کے بزرگ چلتے آئے ہیں۔ دایاں راستہ جہاں سلامتی ہے۔ امن و تحفظ ہے۔ اور بائیں راستہ پر فتنہ ہی فتنہ ہے۔ غلاظت ہی غلاظت ہے۔ وہ غلاظت جس میں پھنس کر خود اپنی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ بڑی سیدھی سادی سی بات تھی۔ لیکن وہ اس سیدھی بات پر تب برہم ہو گیا تھا

...اس نے ترکی بہ ترکی اپنے بابا کو جواب دیا تھا۔ بابا تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ تمہارے رگ و پے میں جو خون گردش کر رہا ہے وہ نہ صرف بے جان بلکہ غلیظ بھی ہو چکا ہے اور میں، میں نہ صرف جوان ہوں۔ بلکہ میرے جسم کی نالیوں میں جو خون بجلی کی طرح رواں دواں ہے۔ وہ نہ صرف جاندار ہے بلکہ باشعور بھی۔ اور یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے اپنی دنیا کیسی بسانی چاہئے۔ اور یہ کہہ کر اس نے ایل ایم جی اپنے ہاتھوں میں اٹھایا تھا۔ اور خوشی سے لہراتے ہوئے پوری فضا کو چھلنی کر ڈالا تھا...... لیکن آج، آج اس کے ہاتھوں میں نہ ایل ایم جی ہے اور نہ روسی ساخت کا وہ پستول جسے ہاتھ میں لے کر اس نے سوچا تھا کہیں یہ بچوں کا کھلونا تو نہیں —— ہاں اس وقت اس نے یہی سوچا تھا۔ اور اب جب اپنی سوچ پہ وہ دوبارہ سوچ رہا تھا تو اسے ہنسی آ رہی تھی کہ اس نے جسے بچوں کا کھلونا سمجھا تھا یہ کھلونے کتنے کارگر ثابت ہوئے۔ کہ انہوں نے ہزار فوجیوں نے اسے سلامی دی۔ اور پھر ان ہی کھلونوں سے وہ اپنی دھرتی کی کوکھ سے وہ سرخ سویرا ابھارنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جس کی دہکتی ہوئی کرنوں نے کرشنا چوڑا کے پھولوں میں آگ لگا دی تھی۔ وہ آگ جو اس کی زندگی تھی۔ ماں کی ممتا، بہن کے سر کا آنچل، اور باپ کے —— اچانک باپ کا خیال آتے ہی وہ مرجھا کر رہ گیا۔ اسے یاد آئی —— وہ خوشی سے سرشار دیوانہ وار ایل ایم جی فضا میں لہراتا ہوا اپنے گاؤں لوٹ رہا تھا۔ کہ راستے میں چاچا کریم سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ اس نے خوشی و مسرت کا نعرہ لگاتے ہوئے فضا کو گولیوں سے چھلنی کر ڈالا تھا۔ اور پھر بڑھ کر چاچا کے سینے سے لگ گیا تھا۔ خوشی سے اس کے ہونٹ کانپ اٹھے تھے، اس نے جھٹ زمین سے ایک مٹھی خاک اٹھائی اور اسے اپنے چہرے پر ملتے ہوئے کہا تھا۔ چاچا میں اپنی اس مٹی کی قسم کھا کر گیا تھا۔ اور آج اس مٹی کی لاج بچا کر واپس آیا ہوں اور اب اس مٹی پر کوئی دشمن آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا کہ میں نے دشمنوں کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں۔ اور یہ مٹی جو میری ماں کی طرح پوتر اور قابل احترام ہے۔ اس کی حرمت پر اب کبھی آنچ نہیں آئے گی، پھر اس نے چاچا کریم کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا چاچا میرے بابا کہاں ہیں؟ آج میں انہیں بتاؤں گا کہ دیکھو تمہارے بیٹے نے اپنی دنیا بنا لی ہے اور وہ کچھ اور کہتا کہ چاچا کریم نے کہا۔ بابا، تمہارا باپ تو اس روز ہی ہم سبھوں سے بچھڑ گیا تھا جس روز انہوں نے ہزار فوجیوں نے ...... کیا......؟ اچانک وہ چیخ پڑا تھا۔ پھر چاچا کریم نے اس سے کہا تھا —— ہاں بیٹے۔ جس طرح تم اپنی دنیا بنانے کے لئے برسرپیکار تھے، ٹھیک اسی طرح تمہارا باپ اپنی دنیا بچانے کے لئے خود سے الجھا ہوا تھا۔ اور وہ جو دائیں راستے کا مسافر تھا۔ دایاں راستہ جو اس کی زندگی، اس کا ایمان اور سب کچھ تھا۔ جب وہ دایاں راستہ ہی نہ رہا۔ پھر وہ کس کے سہارے جیتا...... نہیں ...... اچانک وہ راستہ چلتے چلتے زور سے چیخ پڑا۔ اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ راستے کی فٹ پاتھ پر چل رہا ہے اپنے بس میں نہیں ہے جو وہ لوں......

اور پھر یوں ہوا وہ اپنا خیال بٹانے کی خاطر جگمگاتی ہوئی دوکانیں جھانکنے لگا۔ وہ دوکانیں جو کبھی کباڑئے کی دوکانیں لگتی تھیں لیکن اب وہ دوکانیں بیت المکرم جیسی لگ رہی تھیں۔ ہر دوکان جگمگاتی ہوئی اور ہر دوکاندار کا چہرہ کھلا ہوا گلاب، لیکن دوسرے لمحے اس نے سوچا ایک کا مال دس میں بکے۔ تو دوکانیں کیوں نہ جگمگاتی نظر آئیں۔ اور دوکانداروں کے چہرے کھلے ہوئے گلاب کی طرح خوشنما اور تروتازہ کیوں نظر آتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ میری طرح بے وقوف نہیں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پہچانتے ہیں

کیا یہ آپ کو پہچاننا ہی آپ [illegible] دور کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔
اور میں اعزاز کے تمغے دوسروں کے سینے پر لگانا چاہتا ہوں۔ اور آدرش کی لالٹین اٹھائے سایہ کے پیچھے دوڑ رہا ہوں۔ سراب جو حقیقت نہیں ہوتے اور حقیقت دیتے ہیں جو کچھ دیر پہلے آفیسر کے کمرے میں نظر آیا تھا۔ آفیسر کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں ایک گندی گالی لپکی۔ ــــ حرام خور، سور کے بچے نے اپنی مٹھیاں گرم کر لیں۔ ورنہ ایک ایک ہیڈ کلرک سیٹ میری جگہ۔
ــــ چلتے چلتے ایک بار پھر وہ فٹ بال کی طرح اچھلا لیکن اس بار وہ فٹ پاتھ پر بچھا نہیں۔ صرف تلملا کر رہ گیا۔ اور پلٹ کر آنے والے دھکے کی جانب دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت سی اسٹریٹ گرل تھی۔ جس کے ہونٹ بازاری تبسم سے حرکت کر رہے تھے۔ آنکھوں میں دہکتے انگارے اور بدن ٹپکتا ہوا شعلہ سا لگ رہا تھا۔ اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اور پھر خود ہی لرز کر رہ گیا ــــ یہ سپنا تو اس نے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے تو اپنے تصور میں اپنی بہنوں کے نئے خوب صورت سے آنچل سجائے تھے۔ اور ان کے ہاتھوں میں حنا کی خوشبو بسائی تھی۔ پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔ آج ہر گلی ہر چوراہے اور ہر سڑک پر میری بہنیں آنچل سے بے نیاز کیوں ہو گئیں۔ اور ان کے ہاتھ حنا کی خوشبو سے محروم کیوں ہو گئے۔ ؟؟

اور پھر یوں ہوا کہ اسے اپنی بہن یاد آ گئی۔ گاؤں سے ڈھاکہ آنے کے لئے جب وہ اپنی بہن سے رخصت ہوا تھا تو اس کی بہن نے بڑے پیار سے اس سے فرمائش کی تھی۔ بھیا نوکری ہو جانے کے بعد اپنی پہلی تنخواہ سے میرے لئے سر کا ایک جوڑا ضرور لائیے گا۔ اس پر اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ ارے پگلی۔ جوڑا تو دو تین ٹکا کی چیز ہے۔ میں تیرے لئے پوری دنیا خرید کر لا سکتا ہوں۔ لیکن آج بہن سے بچھڑے ہوئے [illegible] دو سال کا عرصہ گزر رہا تھا [illegible] وہ اپنی بہن کے لئے پیدا دنیا خریدتا۔ خود اپنی دنیا ہی کھو بیٹھا تھا۔ گاؤں سے آتے ہوئے اسے پوری توقع تھی کہ بس مہینے ڈیڑھ مہینے میں ہی اسے کوئی اچھی سی نوکری مل جائے گی۔ اس لئے کہ اب اس کی پیشانی پر آزادی کا سرخ نشان ہی نہیں جھلملا رہا تھا بلکہ اس کے پاس گریجویشن کی وہ ڈگری بھی تھی۔ جو اس نے باپ کی چھوڑی ہوئی بچی کچھی [illegible] پونجی سے حاصل کی تھی۔ لیکن اس کی تمام خوش فہمیاں دھری رہ گئیں اس لئے کہ وہ زندگی سے مفاہمت نہیں کر سکا تھا۔ اور مفاہمت کرنے کی کوئی سبیل بھی نہ تھی۔ کہ کسی بڑے عہدے پر اس کا کوئی ماموں نہ تھا۔ اور نہ ہی جیب اتنی بھاری تھی کہ وہ ماموں خرید لیتا۔ اور پھر یہ کہ وہ دراصل ماموں خریدنے کے حق میں بھی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دھرتی پر جب ہل چلایا جائے۔ تو دھرتی کچھ نہ کچھ ضرور دیتی ہے۔ اور اس نے نہ تو صرف ہل چلایا تھا بلکہ اپنے خون سے دھرتی کی آبیاری بھی کی تھی۔ اور یہی اس کی خوش فہمیاں تھیں۔ جسے وہ محسوس کرنا نہیں چاہتا تھا یا محسوس کر کے اس سے الگ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے ملنے جلنے والوں نے اسے کئی طرح کے مشورے دیئے تھے۔ اسمگلنگ، بھیکنگ اور دوسری کاروبار کے مشورے، جن مشوروں پر وہ آج عمل پیرا ہو جائے، تو آج اس کی زندگی کے آنگن میں دھن برسنے لگے۔ لیکن وہ ایسا کرے ہی کیوں؟ کہ ایسا کرنے کے لئے اس نے اپنی انگلیاں لہو میں نہیں ڈبوئی تھیں۔ اور ایسا کرنے کے لئے تو اس نے اپنے باپ کو نہیں گنوایا تھا باپ جو اس کے لئے آسمان تھا۔ باپ پڑا ان کے لئے ــــ باپ یاد آتے ہی اسے احساس ہوا۔ کاش بابا زندہ ہوتے، تو آج اسے شہر کی سڑکوں پر یوں مارا مارا نہ پھرنا پڑتا۔ اور والدہ کو یہ خط بھی نہ لکھنا پڑتا کہ آ کر اپنی جوان بہن کو سنبھالو۔ میں بد [illegible] ہو چکا ہوں۔ اور گھر کی دیواریں مجھ سے زیادہ [illegible] ہو چکی ہیں۔ اور مجھے خوف ہے کہ تمہاری بہن نے ان دیواروں [illegible]

کو چھو بھی لیا تو یہ گر جائیں گی ــــــ ماں کا یہ خط جو اسے گزشتہ مہینے ملا تھا اس نے پڑھا تو حواس باختہ ہو گیا تھا لیکن اس خط کا جواب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس لئے وہ لکھتا بھی کیا اس طرح کے جملے تو وہ بار بار لکھ چکا تھا۔ ماں نوکری اب جلد ہونے والی ہے۔ تم کوئی فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس لئے اس بار بھی اس نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ بلکہ انتظار کر رہا تھا کہ نوکری ہو جائے تب ہی خط لکھوں گا۔ اور اس بار تو اسے نہ صرف توقع تھی بلکہ ایمان تھا کہ نوکری ہو ہی جائے گی کیونکہ انٹرویو کے درمیان خود آفیسر نے کہا تھا۔

مسٹر جسیم یو آر سلیکٹڈ......

لیکن اپائنٹمنٹ لیٹر اس بار بھی کسی اور کو مل گیا۔

ــــــ اور آفیسر حسب معمول وہی آئی ایم ویری سارری

ــــــ آفیسر کا خیال آتے ہی ایک بار پھر اس کے ذہن میں گندی گالی لپکی ــــــ کمینہ ــــــ سؤر کا بچہ ــــــ

اور ابھی وہ اپنی گالی پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ پیچھے سے ہارن کی تیز آواز پر وہ اچھل پڑا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ٹویوٹا یو ماڈل کار اسے ہارن دیتی نظر آئی۔ اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ بے خیالی میں ایک بار پھر فٹ پاتھ سے نیچے سڑک پر چلا آیا ہے۔ سڑک جو کاروں کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور فٹ پاتھ، لیکن وہ یہ سوچ کر فٹ پاتھ پر بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ کار کے جانا سے ایک چہرہ جھانکا۔ اور آواز اس کے کانوں میں اتری۔

جسیم اے وہ جسیم، وہ آواز کی طرف پایا تو لتے حیرت ہوئی کہ یہ کون شخص ہے۔ جو اسے اس طرح بے تکلفی سے آوازیں دے رہا ہے۔ وہ کار کے قریب پہنچ کر چہرے کو ٹٹولنے لگا۔ کہ چہرے پر شگفتگی کی لہر دوڑی اور مانوس آواز اس کے کانوں میں اتری۔

ارے یوں کھڑا ہوا منھ کیا دیکھ رہا ہے۔ چل کار کے اندر بیٹھ، پھر پہچانتے رہنا۔

ارے کلیم، میرے یار اتنے دنوں......

اچھا اچھا کار میں بیٹھ، پھر جی بھر کر باتیں کرنا۔ اور کہہ کر کلیم نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ اور وہ گدے کار میں آن گرا۔ کار میں بیٹھتے ہی اس نے کلیم سے پوچھا،

ارے یار تو نے ڈرائیوری کب سیکھ لی، اور یہ نوکری کب پکڑی؟ کلیم اس کی باتوں پر مسکرایا اور کہنے لگا۔

معلوم ہوتا ہے تیری کھوپڑی میں تجسس بھر گیا ہے! ارے بنیا یہ اپنی کار ہے اپنی،

اپنی؟ جسیم دوستانہ لہجہ میں آگیا،

ہاں اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ مگر تو بتا ان دنوں کیا کر رہا ہے اور ہاں تو نے یہ اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ لگتا ہے تو نے شاعری وائری کا دھندہ شروع کر دیا ہے

ہاں۔ اس نے ایک لمبی سانس بھری، تو نے ٹھیک ہی کہا ہے دوست، بی اے کی ڈگری لے کر آدمی یا تو شاعری کرتا ہے۔ یا پھر سڑکیں ناپتا ہے۔

کیا اب تک تو بیکار ہے؟

ہاں۔ بی اے کی ڈگری جو پاس میں ہے۔

یہ تیری کمزوری ہے۔ دراصل تو کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا اب دیکھ میرے پاس نہ کوئی ڈگری ہے۔ نہ کوئی نوکری، چاکری۔ اور نہ ہی کوئی آفس عدالت، مگر زندگی ٹھاٹ سے گزر رہی ہے۔

وہ کیسے؟

تھوڑی سی عقل کی ضرورت ہے بیٹے۔ بس اور کیا۔ سال بھر میں ملک سے باہر دو چار ٹرپ لگاتا ہوں۔ اور ان شاء اللہ خیر صلا۔

یعنی اسمگلر!

پھر وہی لکیر کے فقیر ——— ابے یہ اسمگلنگ نہیں۔ کاروبار ہے کاروبار۔

کلیم گاڑی روک دے مجھے یہیں اترنا ہے۔ کلیم نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا، پھر کار روک کر دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا یہ میرا کارڈ ہے۔ ضرورت پڑی تو بنگلے پر آکر مل لینا۔ اور یہ کہکر کلیم نے کار آگے بڑھا دی۔

کارڈ لیکر وہ ایک لمحہ اسے گھورتا رہا۔ پھر کارڈ پر اس کے ہاتھ سخت ہوگئے۔ جیسے کارڈ نہ ہو۔ کسی کی گردن ہو۔

اور پھر یوں ہوا کہ وہ تقریباً بھاگتا ہوا اپنے میس میں پہونچا۔ لیکن میس کے دروازے پر ہی ٹھٹھک پڑا۔ دروازے پر اس کا میس، پارٹنر نعیم صلیب بن کر لٹکا ہوا تھا۔ پژمردہ، غم زدہ اداس اداس سا نعیم۔ اس نے نعیم کی جانب نظر اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر انتہائی تھکے ہوئے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

خیریت تو ہے۔ یہ آج تو نے میرا روپ کیوں لے لیا پریشان تو میں ہوں، لیکن تو اس با ختہ تو نظر آرہا ہے۔

نعیم نے بہت سرد لہجے میں کہا۔ نہیں کچھ نہیں۔ بس یوں ہی تجھے دیکھکر اداس ہو گیا تھا۔

لیکن تیرا لہجہ کہہ رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے کہا۔ اور نعیم ابھی اس کی بات کا کوئی جواب دیتا، اس کی نظر اس لفافے پر پڑی جو چھوٹی سی میز پر کھلا پڑا تھا۔ اور جو اس کے نام کا ہی تھا وہ لفافے کو دیکھ کر مسکرایا۔

سمجھا۔ ماں نے [illegible] میں [illegible] ہی [illegible] ہوگا۔ اب مشکل سے ایک وقت [illegible] ضرور ہوتا [illegible] بہن ......

نہیں۔ اچانک نعیم جیسے چیخ پڑا۔ اس نے بڑی حیرت سے نعیم کو دیکھا۔ اور اپنی قمیص کھول کر ایک طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

تو پھر بات کیا ہے؟ تو کہتا کیوں نہیں؟ میرا تو کچھ تجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اور نہ ہی تیرا کچھ مجھ سے چھپا ہوا ہے۔ پھر ......

نہیں، جمیم میں یہ خط پڑھکر تمہیں نہیں سناؤں گا۔

کیا ——— نعیم اس بار اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

میرے دوست تو لٹ گیا۔ میرے دوست تیری بہن کسی کے ساتھ فرار ہوگئی۔ اور اس غم میں تیری ماں ہمیشہ ہمیشہ ......

کیا؟ اس کے [illegible] اس طرح چیخ نکلی، جیسے جبڑوں کو چیر پھاڑ کر نکلی ہو۔

نہیں، نہیں، نہیں ......

اور پھر یوں ہوا کہ وہ پاگلوں کی طرح کمرے کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کرنے لگا۔ لیکن چند لمحے بعد ہی وہ ہانپتا ہوا ایک اونچے ستون کی طرح ایستادہ ہو گیا۔ پھر سوچ کی کئی صدیاں گزر گئیں۔ اور جب وہ ان صدیوں سے باہر نکلا، تو اس کی پیشانی نئے عزم کے پسینے سے چمک رہی تھی۔ اور ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ کا پایہ ایل ایم جی بن چکا تھا۔ ●●

بقیہ : ادبی ممنونیت کا تصور

دو زبانوں کے بولنے والے کب ربط میں آئے، ان کے یہاں الگ الگ کلچر کا تصور کیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں کتنے ترقی یافتہ تھے، کوئی مخصوص ادب کسی مخصوص ادب کا کس حد تک ممنون ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اور اس کی مدد سے زبان و ادب کی مکمل تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ ●●

سرد لہو کا نوحہ

علی امام نقوی

میں [illegible] زمین پر اپنا ایک نائب [illegible]۔

یعنی تو پیدا کرے گا ان لوگوں کو جو زمین پر فساد کریں گے؟
اور خون ریزیاں کریں گے۔ جبکہ ہم تسبیح کرتے ہیں تیری۔ اور تقدیس کرتے رہتے ہیں۔

میں جانتا ہوں اس بات کو ـــــ جس کو تم نہیں جانتے،
سو بس...... جیسے ہی میں حکم دوں تم سب سجدے میں گر جاؤ آدم کے سامنے

اور جب حکم ہوا تو سب سجدے میں گر پڑے، بس وہ کھڑا رہا۔ جب اس سے سوال ہوا تو کہنے لگا میں اسے سجدہ نہیں کروں گا ـــــ کیونکہ.......

سفید نسل کے لاکھوں چوہے اپنی ہی نسل کے ان خطرناک چوہے کی بربریت سے بڑی مشکلوں کے بعد بچ پائے تھے۔ جو اپنے وجود کے بھورے بالوں کی بنا پر علیحدہ شناخت رکھتا تھا۔

پہلے تو اس چوہے نے یکے بعد دیگرے آس پاس کے چھوٹے موٹے بلوں پر قبضے کئے، پھر وہ اپنے حواریوں کی مدد سے اہم بلوں اور بڑے بڑے بھٹوں پر قبضہ کرتا چلا گیا۔

سفید چوہوں نے اس سے مقابلے کی خاطر متحد ہونے میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی۔ اور پھر ان کے اتحاد نے ان بھورے بالوں والے خطرناک، جابر، فاشسٹ چوہے کو خودکشی پر مجبور کر دیا۔

سفید نسل کے لاکھوں چوہوں کے بزرگ سرپرست سر جوڑ کر بیٹھے، دو سرداروں نے مل کر اس موذی چوہے کے بھٹ کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد اپنی اپنی مرضی کے چوہوں کو وہاں کا سردار مقرر کیا۔ اور پھر پنجے جھاڑ کر اس موذی چوہے کے ساتھیوں کی تلاش شروع ہوئی، جو سفید چوہوں کی نسل کشی میں موذی چوہے کے شریک کار تھے۔

پانچ چھ سال بعد ساری زمین پر بکھرے ہوئے چوہوں نے مل کر ایک روز اپنی قوم کی سربرآوردہ ہستیوں کو اس بزرگ کی جانب بھیجا۔

ہم کب تک...... دوسروں کے بلوں میں رہیں گے؟

پھر......؟

آپ...... ہمارے محافظ ہیں...... پھر ہماری خدمات سے آپ واقف ہیں۔ ہم سارے عالم کے ذہنوں سے اصل جوہر نکال کر آپ کی نذر کرتے ہیں۔ اور اب اس کے عوض آپ سے آپ جیسوں سے ایک بھٹ چاہتے ہیں۔

ہوں۔

ایک لمبی ہنکاری کے بعد بزرگ رخصت ہوا۔ عرصے تک اس نے دنیا کی زمین پر نظریں دوڑائیں۔

مشرق، مغرب، شمال، جنوب، ـــــ

اور پھر انہیں مشرق میں دولت سے مالا مال ایک قطعہ زمین نظر آ گیا۔ ماہرین سر جوڑ کر بیٹھے۔

اگر...... ہم انہیں یہاں بسا دیں:
لیکن یہاں تو یہ لوگ رہتے ہیں؟

وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں! ...... لیکن تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ تعمیر کے لئے تخریب بہت ضروری ہوتی ہے۔

لیکن دنیا......

دنیا........ ہنہ........ ذرا سوچو یہاں ہمارے کتنے فوائد ہیں........ یہاں ان کی حکومت ہوگی۔ مگر ان کی حکومت نہیں ہوگی...... وہ...... وہ سب کہیں گے جو ہم نہیں کہیں گے، مگر دراصل ہم بھی وہی کہیں گے......

یعنی ان کا ہر فعل ہمارا فعل ہوگا........ یہاں کی معدنی دولت........!

وہ تو آج بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے

ہاں! لیکن کل ہم ان سے محروم بھی ہو سکتے ہیں۔

کیونکہ اس قطعہ کے آس پاس کی زمین پر سؤر کی نقل بھی ہوئی ہیں

ٹھیک ہے،

اور ______ سفید چوہوں کے بزرگ محافظین نے ان چوہوں کو اس قطعہ زمین پر آباد کر دیا۔ زمین کے اس ٹکڑے پر بسنے والوں نے احتجاج کیا۔ مقابلے کیلئے ______ آئے دن جنگیں ہوتی رہیں۔ سفید چوہے اپنا بچاؤ و سیع کرتے رہے۔ اور اس زمین پر بسنے والی مخلوق بے گھر ہوتی رہی اور آج..........

آپ یہ شکتی کس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

نفس کشی کے کڑے امتحان سے گزرنے کے بعد آدمیت کی حدوں سے گزر کر بھگوان کے پراسرار وجود میں سما جانے والی ہستی سے اس کے ایک شاگرد نے پوچھا۔ تو وہ ہنتی مسکرائی،

کیا آپ ملکوں کو فتح کرنا چاہتے ہیں۔؟

نہیں۔

کیا آپ کا مقصد [illegible] کرنا ہے؟

نہیں۔

تو پھر شکتی حاصل کرنے کا کارن؟

ایک نئی دنیا بسانی ہے اس شکتی سے ..... ●●

بقیہ، اپیندر ناتھ اشک

لکھ کر اگر تم یہ چاہو کہ منٹو اور بیدی بن جاؤ، تو ادب کی دنیا میں یہ نہ ہوا ہے۔ اور نہ ایسا کبھی ہوگا۔

اشک جی کی یہ خوبیاں ہی اشک جی کو ہر دل عزیز بناتی ہیں۔ اور ہمیشہ بناتی رہیں گی۔ لوگ ہمیشہ دوران گفتگو تذکرہ کرتے رہیں گے ______ وہ تذکرہ خواہ ان کی خوبیوں کا ہو۔ یا زیادتیوں کا۔ مگر اشک جی بہر حال موضوع بحث رہیں گے۔ اور ان کی دیوپیکر شخصیت بار بار ابھر کر سامنے آتی رہے گی۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ سچ لکھا ہے۔ سچ کے سوا کچھ بھی نہیں لکھا۔ کہ انسان سیاہ و سفید کا آمیزہ ہے۔ اس میں شیطان بھی چھپا ہے۔ اور فرشتہ بھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اشک جی کے دونوں ہی رخوں کو ایمانداری سے پیش کروں۔ ●●

بقیہ: افسانے پر ایک بحث

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں۔

والا معاملہ درکار ہیں۔ لیکن فیشن کے طور پر نہیں بلکہ انہی کی پرچھائیں اپنے مشاہدے اور تجربے میں تلاش کریں

فکشن کے لئے اس سے اچھا اور کوئی وقت نہیں۔ اب فکشن کے سلسلے میں بڑی دلچسپی سے گفتگو کی جاتی ہے

میں علی گڑھ، پٹنہ، اور دیگر شہروں میں جلسے [illegible]

میں دیکھ رہا ہوں کتنے نئے سوالات افسانے [illegible]

س، م، ساجد (بنگلہ دیش)

انہونی

کہتے ہیں کہ کپڑا نیا اچھا اور دوست پرانا اچھا ____
لیکن جب پرانا دوست جب دشمنی پر اتر آتا ہے۔ تو انتہائی
خطرناک دشمن ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ رغبت جس قدر گہری
ہوتی ہے۔ اسی قدر نفرت کے جذبات بھی شدت اختیار کر لیتے
ہیں ____ شاید یہی وجہ تھی کہ آج ماسٹر رحیم قاسم صاحب
کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔

ماسٹر رحیم دشمنی کے ایک ایسے مقام پر پہونچ چکا تھا
جہاں کبھی کبھی موت بھی صلح کرانے میں ناکام ثابت ہوتی ہے
اور یہ بات محلے سے نکل کر اس چھوٹے سے شہر میں اس قدر
تیز رفتاری کے ساتھ پھیل گئی۔ جیسے تاریک کمرے میں دشمنی
کا وجود!

جن لوگوں تک یہ خبر پہونچی ان لوگوں کو اس کی
صداقت پر یقین نہ آیا۔ اور جب یقین آیا تو وہ لوگ انگشت
بدنداں ہو گئے۔ اور اپنے اپنے دوست پر شک لانے
لگے ____ دوستی کے نام سے نفرت کرنے لگے ____!

قاسم صاحب کے چند شناساؤں نے تو بلند آواز
میں یہ بھی کہہ دیا۔ اب اس ملک میں کس امید کے سہارے
جینے اور بننے کی کوشش کی جائے، جب ماسٹر رحیم جیسا دوست
قاسم صاحب کے ساتھ اس انداز سے دشمنی پر اتر آئے،

یہ حقیقت بھی ہے کہ ماسٹر رحیم اور قاسم صاحب
کی دوستی پر شک لانا اپنے وجود سے انحراف کرنے کے،
مترادف تھا ____ ان دونوں کے تعلقات بہت ہی پرانے
تھے۔ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ اور اس نیم پڑھے
لکھے افراد پر مشتمل محلے میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے ____
ماسٹر رحیم کی عظمت دولت پر قائم تھی۔ اور قاسم صاحب
کی عزت اس کی قابلیت اور شرافت پر۔ قاسم صاحب کی
قابلیت اور شرافت کا چرچہ صرف محلے تک محدود نہ تھا۔ بلکہ
شہر کے دوسرے دانشور اور پڑھے لکھے لوگ بھی ان کی قدر
کرتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ماسٹر رحیم کا سامنا جب بھی قاسم
صاحب سے ہوا کرتا۔ تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا۔
اور اسے یہ احساس شدت سے ستانے لگتا کہ دولت کی فراوانی
کے باوجود اس میں کسی ایسی چیز کی کمی ضرور ہے جس کے نہ ہونے
سے وہ خود کو کھوکھلا محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے وہ اکثر مایوس
کن انداز میں سوچا کرتا۔ قاسم صاحب کس قدر خوش نصیب
ہیں، ان کے پاس نہ دولت ہے اور نہ بہت بڑا کاروبار۔ نہ
یہاں کے مقامی ہیں۔ اور نہ اب تک ملازمت کر کے اتنی دولت
حاصل کر سکے کہ اپنی ایک چھوٹی سی جھونپڑی بھی بنا سکیں
اس کے باوجود لوگ ان سے مشورے طلب کرتے ہیں۔ اور
ان کی گفتگو غور سے سنتے ہیں۔ اور ایسا جب وہ سوچتا
تو اس کے سینے میں بھی یہ خواہش جنم لیتی کہ کاش وہ بھی ٹھیکہ
داری اور فضول قسم کی نوعیت کے علاوہ دوسرے موضوع
پر گفتگو کر سکتا۔

اپنی اسی خواہش کی تکمیل کی کوشش میں وہ رفتہ رفتہ قاسم صاحب سے قریب ہوتا گیا۔ اور جوں جوں وہ قریب ہوا اسے محسوس کیا کہ قاسم صاحب کی صحبت میں رہ کر نہ صرف اس کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ اسے قیمتی مشورے بھی حاصل ہوئے ہیں —— اور یہ قاسم صاحب کے مشوروں کا ہی اثر تھا کہ جب محلے میں ابتدائی تعلیم کی ایک درسگاہ قائم کی گئی تو انتظامیہ کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل کر لیا گیا —— اور بچوں نے ٹھیکہ دار رحیم کو ماسٹر رحیم کے نام سے مشہور کر دیا۔ اور بچوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے والدین نے بھی اسے سلام کرنا شروع کیا۔ اس اچانک تبدیلی اور اعزاز سے وہ دل ہی دل میں بے حد خوش ہوا کرتا۔ اور اس کی یہ کوشش ہوا کرتی کہ وہ فرصت کے بیشتر اوقات قاسم صاحب کی صحبت میں گزار سکے۔ تاکہ قاسم صاحب کی تمام تر خوبیاں اس میں منتقل ہو جائیں۔ اور اس کی شہرت اس کے نام و نمود میں مزید اضافہ ہو۔

اسی طرح برابر کے میل جول سے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ اور تعلقات نے دوستی کی شکل اختیار کر لی —— لیکن —— دوستی میں ابھی پختگی بھی نہ آئی تھی کہ آزمائش کی گھڑی آ پہونچی —— اور —— ۱۹۷۱ء کی تحریک آزادی نے جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور آگ پر قابو پانے کے لئے جب فوجیوں نے عملی اقدام شروع کیا تو ملک کے ہر مقامی شخص نے اپنی جان بچانے کی تدبیر اختیار کی۔ ماسٹر رحیم نے بھی خود کو غیر محفوظ سمجھ کر پاس ہی کے ایک گاؤں میں پناہ لے لی۔ اور اس بات کا علم قاسم صاحب کو چار پانچ دنوں کے بعد ہوا جب ماسٹر رحیم نے خود ہی بڑی مشکلوں سے ان تک خبر بھجوائی۔ اور یہ گزارش بھی کی کہ وہ اس کی بیوی بچوں کا خیال رکھیں۔

ماسٹر رحیم کی اس گزارش کو قبول کرنا تو انتہائی معمولی سی بات تھی۔ لیکن اس دور میں کسی مقامی شخص کے اہل خاندان کا خیال رکھنا تو در کنار کسی مقامی شخص کے ساتھ کسی قسم کے تعلق کا اظہار بھی ایک زبردست مصیبت کا باعث بن سکتا تھا کیونکہ ایسے علاقے میں جہاں مقامیوں کی تعداد کم تھی۔ جہاں غیر مقامی لوگ فوجیوں سے کچھ زیادہ ہی سرگرم عمل تھے۔ اور وہ لوگ کسی شخص پر بھی جھوٹے سچے الزام عائد کر کے سزا دلوا سکتے تھے۔

ایسی صورت حال میں ماسٹر رحیم کے خاندان کی حفاظت کرنا قاسم صاحب کے لئے ایک ناممکن العمل فعل تھا —— پھر بھی انہوں نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ نہ کیا۔ اور رونما ہونے والے تمام تر خطرات کی پروا کئے بغیر انہوں نے چند اپنے ہم خیالوں کو اپنی سازش میں شریک کر کے ماسٹر رحیم کے خاندان کو شہر سے باہر نکل جانے میں کامیاب بنایا۔

اس کامیابی سے انھیں ایک قسم کی ذہنی اور روحانی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ اور وہ واقعہ انہیں جب بھی یاد آتا تو انہیں اندرونی سکون میسر ہوتا تھا۔

لیکن سکون کی گھڑیاں بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکیں —— تاریخ بدل گئی اور ملک آزاد ہو گیا —— جنگل کی آگ بجھ گئی۔ لیکن اس کی حدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی —— جنگ آزادی ختم ہو گئی۔ لیکن گولیوں کی آواز نہ تھمی۔ صرف فرق اتنا ہوا کہ اب مقامیوں کی بجائے غیر مقامی گولیوں [illegible] —— اور مقابلے کی بھی صورت باقی نہ رہتا۔ [illegible] کرنے کی نہ تعداد تھی اور نہ طاقت، سرکار کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اور نہ اندرونی یا بیرونی حمایت —— حتیٰ کہ غیر مقامیوں کی بندوقیں بھی خود [illegible] نکل کر [illegible] کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئیں۔

مفتوح سے بندوق چھیننے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ کیونکہ تاریخ بدلنے کے ساتھ ساتھ اقدار بھی بدل گئے تھے ——— پہلے جس گھرانے میں بندوق ہوا کرتی تھی۔ اسے معزز گھرانہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اب بندوق رکھنے والوں کو قاتل کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ اور قاتل کو چونکہ سزائے موت دیجاتی ہے اس لئے موت سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر شخص نے اپنی جائز بندوق بھی تالاب میں پھینک دی۔ یا سڑکوں کے کنارے دفن کر دیا۔ اس کے لئے بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ خود کو دفن کرنے سے کس کس کو نجات ملے گی ——— مفتوح نے ایک مارا تھا اب دس کی تعداد میں مارے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک اینٹ کھولی تھی۔ اب ان کی سنگ بنیاد بھی اکھاڑ پھینکی جا رہی تھی ——— ہر شخص اپنی اپنی موت کو اپنے اپنے دروازے سے لوٹا دینے کی فکر میں مرا جا رہا تھا۔ اور تقریباً ہر شخص کی یہ کوشش تھی کہ وہ کسی نہ کسی مقامی شخص سے تعلقات قائم کرے، اور اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کر کے موت سے زندگی کے چند اور لمحے قرض لے سکے ——— لیکن قرض کی ادائیگی اگر بساط سے باہر ہو تو قرض لینا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قرض دینے والا آنگن میں گندم پھیلا ہوا دیکھ کر ہی آٹا قرض دیتا ہے۔

موت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی زندگی کے ان لمحات میں ماسٹر رحیم کو نہ جانے قاسم صاحب کے آنگن میں گندم کا کون سا دانہ نظر آیا۔ کہ اس نے کھل کر ان کی حمایت کی

ماسٹر رحیم کے رویئے سے قاسم صاحب کو تقویت پہونچی تھی۔ اور صدق دل سے ماسٹر رحیم کے احسان مند تھے کہ کم از کم پرانے تعلقات کا اس نے بھرم رکھ لیا۔ ورنہ گزشتہ دنوں ماسٹر رحیم جب نشے کی حالت میں اپنے کاندھے پہ لٹکائے محلہ سے شہر آیا تھا۔ تو اس کی حرکات سے محلے کے لوگ کانپ گئے تھے۔ اور اس سے

چند اس قسم کی غلطیاں بھی سرزد ہو گئی تھیں۔ کہ قاسم صاحب بھی ذرا مایوس ہو گئے تھے ——— اور ان کی بیگم نے تو ایکدن دبے الفاظ میں اپنی نفرت کا بھی اظہار کر دیا تھا۔

دیکھئے سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے۔ اس سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر ہے۔

تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ ؟ قاسم صاحب نے متعجب انداز میں دریافت کیا۔ تو ان کی بیگم نے آہستگی سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

یہی کہ ماسٹر رحیم سے زیادہ تعلقات رکھنا ٹھیک نہیں

کیوں ؟

آپ تو اس انداز سے گفتگو کر رہے ہیں۔ جیسے آپ کو کسی بات کا علم ہی نہیں .... ان کی بیگم کے لہجے میں ذرا برہمی آ گئی۔ اور انہوں نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔

...... کیا آپ کو یہ خبر نہیں کہ ماسٹر رحیم نے ادریس کے مکان پر قبضہ کر لیا۔ ؟ شمشو کی دوکان اپنے نام کرالی ——— ہر وقت شراب پی کر لوگوں کو مارتا پیٹتا رہتا ہے ——— وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اور اس کا ہم لوگوں کے یہاں زیادہ آنا جانا ٹھیک نہیں ......

تم تو خواہ مخواہ کی باتیں کرتی ہو۔ ...... وہ اگر دوسروں کے لئے بُرا ہے۔ تو ہوا کرے، ہم لوگوں کے ساتھ اس نے کیا برائی کی ہے ——— ؟ قاسم صاحب کے اس سوال پر ان کی بیگم خاموش ہی رہیں۔ تو انہوں نے اپنی بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا کسی پر انگلی اٹھاتے وقت یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ جب ہم کسی پر اپنی ایک انگلی اٹھاتے ہیں۔ تو اس وقت اپنی ہی تین انگلیاں خود ہم پر اٹھی ہوئی ہوتی ہیں ———

آج اگر ماسٹر رحیم جیسے لوگ مظالم ڈھا رہے ہیں تو کل ہم نے بھی انہیں معاف کرنے سے متعلق غور کرنے کی زحمت نہ

کی تھی ——

ہم لوگ کب کسی کو مارنے لوٹنے گئے تھے —— ؟

قاسم صاحب نے ایک سرد آہ لی۔ اور انہوں نے انتہائی سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ یہ باتیں صرف تمہاری، میری اور ماسٹر رحیم کی نہیں ہیں بیگم —— جنگ جنگ ہوتی ہے۔ اس میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں ہوتا —— ہم نے جنگ میں حصہ لیا اور ہماری شکست ہوئی —— اگر ہم جیت جاتے تو شاید ہم بھی اسی سلوک کا مظاہرہ کرتے، جو سلوک ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں —— اس لئے ہمیں بھی بہتر سلوک کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ کیونکہ بہتر سلوک کی ذمہ داری ان پر عائد بھی نہیں ہوتی —— یہ ذمہ داری تو ان کی ہے جن کے لئے ہم نے جنگ میں حصہ لیا جن کی حمایت میں ہم نعرے بلند کئے، اور جن کے نظریے کی تحفظ کی خاطر اپنے مستقبل کو تاریکی کے حوالے کر دیا....

اتنا کہنے کے بعد قاسم صاحب کو احساس ہوا کہ وہ جذباتی ہوتے جا رہے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ...... دیکھو نا ماسٹر رحیم نے ہم لوگوں کے متعلق کبھی برا نہیں سوچا۔ اس پر آشوب دور میں جب کہ نہ زندگی کی ضمانت ہے اور نہ مستقبل کا کوئی تصور، ایسی حالت میں ماسٹر رحیم نے ہماری مدد کی ہے..... سہارا دیا...... قاسم صاحب کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی ان کی بیگم نے مایوس کن انداز میں پوچھا ——

تو کیا اب ہمیں ہمیشہ ماسٹر رحیم کے ہی رحم و کرم پر زندہ رہنا ہوگا۔

نہیں۔ ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا جب حالات معمول پر آئیں گے —— آج اگر صورت حال بگڑ گئی ہے تو کل سدھر جائے گی۔ —— اس بات پر مجھے مکمل یقین ہے ——

لیکن —— قاسم صاحب کا یقین اس وقت خواب کی طرح بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔ جب ایک دن ماسٹر رحیم نشے کی حالت میں جھومتا جھامتا قاسم صاحب کے گھر میں داخل ہو گیا۔ پہلے تو قاسم صاحب کو اپنی نگاہوں پر شک ہوا اور جب شک نے یقین کی صورت اختیار کی تو انہیں اپنا وجود خلا میں معلق نظر آتا محسوس ہوا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے خود پہ قابو پاتے ہوئے انتہائی مصنوعی انداز میں ماسٹر رحیم کا خیر مقدم کیا۔

آئیے آئیے رحیم صاحب! اس وقت ادھر کا رُخ کیسے کیا؟ ——

بس یوں ہی —— ایک ضروری بات ہے۔

ایسی کون سی ضروری بات ہے۔ جو ابھی ہی کرنا لازمی ہے ؟

ماسٹر رحیم نے اپنی خمار آلود نگاہوں سے قاسم صاحب کے چہرے کو تکتے ہوئے جواب دیا۔ ضروری ہی نہیں۔ بلکہ بے حد ضروری.... اور اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اور اس کا سر خود بخود ایک جانب لڑھک گیا۔ جیسے اسے شدید بوجھ کا احساس ہو۔ اور پھر اس نے دوبارہ اپنا سر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں دراصل کافی دنوں سے اس مسئلے پر گفتگو کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن کوشش کے باوجود حوصلہ نہ ہوا اور جب حوصلہ ہوا تو چلا آیا......

آپ تو پہیلیاں بجھانے لگے۔

یہ پہیلی نہیں بلکہ ایک خواہش ہے جس کی [illegible] چاہتا ہوں...... اتنا کہہ کر وہ پھر خاموش [illegible] اسے خاموش دیکھ کر قاسم صاحب ایک انجانے [illegible]

سہم گئے۔ اور انہوں نے تشویش کن انداز میں میں پوچھا۔
آپ ... کیا چاہتے ہیں؟ قاسم صاحب کے اس
سوال پر ماسٹر رحیم نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اٹھایا۔ اور قاسم
صاحب کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
آپ اپنی لڑکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیں ۔۔۔۔
قاسم صاحب کے اندر جیسے کوئی دھماکے ہوئے اور
انہیں محسوس ہوا کہ ان کا وجود پاش پاش ہو کر فضا میں
بکھر گیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے
اور انہوں نے ماسٹر رحیم کا بازو پکڑ کر جھنجلائے ہوئے انداز
میں کہا۔
آپ شاید اپنا ہوش و حواس بھی کھو چکے ہیں ۔۔۔
چلیئے میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ آؤں۔
نہیں۔ ماسٹر رحیم نے بے رخی سے قاسم صاحب کا
ہاتھ اپنے بازو سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ آئی۔ ایم۔ سیریس
اور اتنا کہہ کر انہوں نے قاسم صاحب کا گریبان پکڑ لیا۔ اور
ذرا بلند آواز میں کہا۔ میرے ہوش و حواس سلامت ہیں
اس لئے کوئی گناہ نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ شادی کرنا چاہتا ہوں
شادی ۔۔۔۔ ماسٹر رحیم نے اپنے آخری جملے پر زور دیتے
ہوئے قاسم صاحب کو کرسی کی طرف دھکیل دیا۔ اور کہا۔!
میں دو منٹ کا وقت دیتا ہوں۔ آپ اچھی طرح غور کرلیں
۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ میں خود اندر جا کر ۔۔۔۔۔
اس سے پہلے کہ ماسٹر رحیم کا جملہ پورا ہوتا اندر
سے قاسم صاحب کے بیوی بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں
آنے لگیں ۔۔۔ شاید ان لوگوں نے معاملے کی نزاکت
کا اندازہ لگا لیا تھا ۔۔۔ اور جب ماسٹر رحیم کی توجہ
ادھر مبذول ہوئی تو قاسم صاحب بھی چیختے چلاتے بچاؤ
بچاؤ کی ایک بلند آواز فضا میں بکھیرتے ہوئے کمرے سے
باہر نکل گئے۔

قاسم صاحب کی چیخ اور اس کی بیوی بچوں کی گریہ زاری
نے پورے ماحول کو دہشت ناک بنا دیا۔ اور دوسرے
گھروں سے بھی چیخ و پکار کی آوازیں ابھرنے لگیں ۔۔۔
جیسے دشمنوں نے نہتوں پر حملہ کر دیا ہو۔ یا پھر موت نے اپنی
آمد کا اعلان کر دیا ہو۔
لوگوں کا ایک ہجوم اپنے اپنے چہرے خوف و ہراس
اور اشتعال کے ملے جلے جذبات لئے گھر سے نکل کر قاسم
صاحب کی طرف دوڑ پڑا ۔۔۔ اور ابھی قاسم صاحب
ابھی اپنی کپکپاتی ہوئی آواز میں لوگوں کو اپنا المیہ سنا ہی
رہے تھے کہ ماسٹر رحیم بھی ایک آدم خور شیر کی طرح غصے
میں گرجتا ہوا ہجوم کی طرف لپکا۔ اور اس نے گالی گلوچ
کرتے ہوئے قاسم صاحب کا بازو پکڑ کر اپنی پوری قوت
سے تقریباً انہیں گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش
کرنے لگا۔ کہ سالے تم نے مجھے ذلیل کیا۔ آج تمہیں زندہ
نہیں چھوڑیں گے۔
ماسٹر رحیم کے اس وحشیانہ عمل سے لوگوں کا سرد خون
ان کی رگوں میں منجمد ہو گیا۔ اور کسی نے بھی مدافعت کی کوشش
نہیں کی۔ کیونکہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ ان کی کوئی
بھی ناگوار حرکت پورے خاندان کی موت کی باعث بن سکتا
ہے ۔۔۔ ایسی حالت میں کون کسی کی مدد کرتا ۔۔۔؟
پھر بھی اس لمحے نہ جانے خود قاسم میں اتنی ہمت کہاں سے
آئی کہ انہوں نے ماسٹر رحیم کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ ماسٹر
رحیم کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور وہ زمین پر گر پڑا ۔۔۔
اب قاسم صاحب اور بھی زیادہ خوفزدہ ہو گئے۔ کیونکہ اب
مقامی لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔ ۔۔۔ لیکن
اس سے پہلے کہ وہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑتے۔ قاسم صاحب
کی نگاہ جس شخص پر پہلے پڑی وہ اس کے قدموں میں ڈھیر
ہو گئے۔ اور تقریباً گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

دیکھئے! خواہ مخواہ انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔

ہنگامہ میں نے کیا ہے ـــــ یا تو نے ـ ماسٹر رحیم اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر قاسم صاحب کی طرف لپکتے ہوئے بولا۔ تو نے مجھے مار ڈالنے کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ مجھے ذلیل کیا

نہیں، نہیں یہ غلط ہے۔ قاسم صاحب نے ملتجی انداز میں کہا اور مختصر الفاظ میں پورے واقعہ کا ذکر کرنا چاہا لیکن ان کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مقامی لوگوں کے ہجوم میں سے ایک شخص نے مداخلت کی۔

ممکن ہے ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ لیکن تم لوگوں کو تو کم از کم یہ سوچنا تھا کہ وہ نستے ہیں۔

نہیں میں نے کوئی غلطی نہیں کی ...... رحیم نے گرجتے ہوئے کہا...... میں تو شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے مار ڈالنے کی غرض سے اپنے لوگوں کو جمع کر لیا۔

دیکھیے، آپ لوگ خود ہی انکے الفاظ سنئے، اور فیصلہ کیجیے کہ غلطی کس کی ہے؟ قاسم صاحب نے عاجزی کی، تو پھر وہی مقامی شخص ہمکلام ہوا۔

اگر آپ ہی غلطی کا اعتراف کر لیں اور معافی مانگ لیں تو آپ کا کیا بگڑ جائے گا۔

عزت و آبرو کی تحفظ کا نام اگر جرم ہے ـــــ اور آپ لوگوں کا یہی فیصلہ ہے۔ تو ٹھیک ہے میں خود ہی معافی مانگ لوں گا ـــــ لیکن انہوں نے تو معافی مانگنے کی بھی مہلت نہ دی ـــــ یہ تو مارنے مرنے پر........

قاسم صاحب کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ماسٹر رحیم آپے سے باہر ہو گیا۔ اور اس نے اپنی شعلہ بار نگاہیں قاسم صاحب کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

[illegible] لیکن ایسا نہیں ہو گا ـــــ تم لوگ سمجھتے ہو کہ تم لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میں ڈر گیا ـــــ ابھی مجھے بندوق [illegible] [illegible] تم میں سے کس کی [illegible]

سی اولاد میری بندوق کا سامنا کر سکتی ہے..... اتنا کہہ کر وہ تقریباً دوڑتا ہوا اپنے مکان کی طرف بھاگا اور اس کے ساتھ ہی غیر مقامیوں کا ہجوم بھی منتشر ہو گیا۔

قاسم صاحب نے ملتجی نگاہوں سے مقامی لوگوں کی طرف دیکھا۔ لیکن سبھی خاموش تھے، اور کسی نے بھی یہ زحمت گوارہ نہ کی۔ کہ ماسٹر رحیم کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کی کوشش کرے ـــــ اور ماسٹر رحیم وحشیانہ انداز میں دوڑتا ہوا اپنے گھر تک پہونچ گیا ـــــ اس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس لئے وہ غصے سے اور بھی زیادہ مغلوب ہو گیا اور اس نے دروازے پر ایک زوردار لات مارا۔

دروازہ کھولو، جلدی دروازہ کھولو ـــــ لیکن دروازہ نہ کھلا۔ البتہ کھڑکی کا پٹ دھیرے سے وا ہوا اور اس کی بیوی کی ایک کرخت آواز ابھری،

پاگل کی طرح چیخ کیوں رہے ہو۔؟

پہلے دروازہ کھولو، بعد میں باتیں کرنا۔

دروازہ نہیں کھلے گا۔ اس کی بیوی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟ ان مردوں سے ڈرتی ہو۔

مجھے خوف ان سے نہیں بلکہ تم سے ہے۔

کیا بکتی ہو ـــــ؟ ماسٹر رحیم نے کھڑکی کی آہنی سلاخوں پر اپنا بھرپور ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ مجھ سے کس چیز کا خوف۔؟ ماسٹر رحیم کی بیوی نے کھڑکی کے پٹ کو ایک زوردار جھٹکے سے بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

میرے گھر میں بھی جوان لڑکی ہے ـــــ

⚫⚫

فاصلے کے درمیان جلتی ہوئی ایک لالٹین

مشرف عالم ذوقی

زندگی کیا ہے۔؟ بظاہر یہ سوال کتنا معمولی عام اور گھسا پٹا معلوم ہوتا ہے۔ مگر ٹھہرو، کیا تم اس کا مطلب بتا سکو گے۔؟

ہاں ہاں میں تمہیں سے کہہ رہا ہوں۔

حیرت ہے تم زندگی کے نام سے کتنے ناآشنا ہو۔

اور سنو — تمہارے جسم پہ یہ کیسا لباس ہے۔؟ ہماری گزری دہائیوں سے مختلف سا! گزرتے وقت کے ساتھ کیا زندگی جینے کا طریقہ اور آرجی کی شکل بدل جاتی ہے —؟

شکل وہی رہتی ہے۔ حادثوں کی یورش میں انسان اپنی سماعت کھو بیٹھتا ہے۔ اپنی بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر اسے ساری زندگی بے چہرگی کا نوحہ گانا پڑتا ہے۔

— آؤ — تمہارا تعارف میں اپنے وقت کے کچھ حادثے سے کراؤں۔

ابھی کچھ دیر قبل تم نے مجھے چھیڑا ہوا اور رد کیا تو سی کہا ہے نا۔!

دن کون سا تھا۔ یاد نہیں۔

مجھے اتنا ضرور یاد ہے، چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی تھی۔ آگ ہمارے محلہ میں بھی سلگ رہی تھی۔ اور آسمان زمین کے بیچ بارودی شور سے طبعی سماعت کھو رہا تھا۔ ہم گھر میں دبکے پڑے تھے۔ آس پاس کے گھروں سے آگ کے بڑے بڑے شعلے آسمان کی سرکش بلندیوں کو چھو رہے تھے، بم، بارود، اور گولوں کے بیچ کسی آنسوؤں کا ایک سیل رواں تھا۔ جو بہتا چلا جا رہا تھا۔ یہ میرے ماں باپ تھے، بھائی تھے، بہن تھی، ہم سب کمرے میں خوف سے سہمے ہوئے نئی صدی کے طوفان کا دھواں پی رہے تھے

ٹھہرو۔ تم نے غلط کہا۔

یہ آگ نہ نسل کی تھی، نہ قوم کی، نہ ذات کی،

یہ آگ تو وحشی طبقے نے لگائی تھی، جو نہ ہندو ہوتا ہے۔ نہ مسلمان، جس کا کسی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جو کسی قوم کا۔ کسی نسل کا بھی نہیں ہوتا۔

جو صرف جانور ہوتا ہے۔ آگ لگانے والا جانور، شعلے پینے والا جانور،

ہاں تو آگ لگ گئی۔ اور یہ آگ ایٹم کی، بارودوں کی، توپوں کی، چیخوں کی، آہ و بکا کی، یہ آگ بڑھتے بڑھتے ہمارے گھر تک پہونچ گئی،

بس اتنا ہی علم تھا۔ جوتے کی ٹھک ٹھک، دندناتے وحشی قدموں کی چاپ، ہمارے گھر کا دروازہ توڑا گیا — اور پھر وہی ہوا۔ جلتی سانسوں کو چلمن میں داب دیا گیا۔ بہنوں کے جسم کے ٹکڑے کھینچ دیئے گئے۔ وحشیوں نے اپنی پیاس بجھائی۔ پھر جلتے، گھٹتے دم توڑتے سانسوں کے بیچ ایک اکیلا میں بچ گیا۔

سنو! لالٹین کچھ اور دھیمی کر دو، کہو تو میں ہی اس کی بتی دھیمی کر دوں۔ اف کتنا ہولناک سناٹا ہے۔ تمہارے چہرے پر کتنی لکیریں اور شکن ہو گئی تھیں۔ میں کہتا نہ تھا گزرتا وقت انسان کی شبیہ اور فطرت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔

دیکھو لالٹین کی روشنی ماند پڑ گئی ہے۔ اس کی بتی کس طرح ہلکے ہلکے کانپ رہی ہے۔ شیشہ بھی صاف نہیں ہے۔ پگلے شیشہ تو صاف کر دیا ہوتا۔

غلطی تمہارے سوچ کی نہیں ہے۔ ایسا میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اس وقت جب میرے ماں باپ اس فسادی آگ کے حوالے نہیں ہوئے تھے۔ اور تم جانتے ہی ہو جب جسم میں گرم خون دوڑتا ہے۔ تو کیا ہوتا ہے۔

بس وہ گرم خون کی یورش تھی۔ اور وہ تھی بھی بہت خوبصورت۔ بالکل مونالیزا سی۔

ایک آگ یہ بھی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں ممی سے کہا۔ ڈیڈی سے کہا۔ اور پھر ان کی آنکھوں میں ایک آگ کوندی۔ خاندانی وضع داری، خاندانی عزت، خاندانی وقار کی آگ، وہاں ایک Gap کا کالا سیاہ پردہ میرا منہ چڑھا رہا تھا۔ میں نے نفرت سے منہ سکوڑا۔ تیکھی گولیاں زبان کے حوالے کیں۔ اور خودکشی کے مرتکب اس غیر فطری عمل نے اسے میرے قریب کر دیا۔

اس وقت میں یہی سوچتا تھا۔ کہ جب میرے اندر خود اچھا برا سوچنے کی تمیز ہے۔ تو ہر ماں باپ بے جا اخلاقیات کی سلاخوں میں کیوں جکڑ جاتے ہیں؟

پھر آسمان کثیف دھوئیں میں لپٹ کر گہرا ہو جاتا۔ میرا اپنے بزرگوں اور اپنے اسلاف کی تنگ نظری کی آگ میرے جسم کے اندر اندر بھٹی کی طرح سلگنے لگی۔

سنو! دیکھو کتنی سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔ لالٹین کی بتی ہلکے ہلکے کانپ رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں یہ بتی بجھ نہ جائے۔

ہنستے ہو۔؟ میں بھی یہی سوچا کرتا تھا۔ کہ میں جو سوچتا ہوں۔ وہ میرے ماں باپ کیوں نہیں سوچتے۔

اور وہ دن جب میرے ماں باپ، میرا پورا خاندان اس وحشی آگ کے حوالے ہو چکا تھا۔ جب آگ ٹھنڈی ہوئی، کرفیو کے کالے ناگ نے ڈسنا بند کیا۔ بارودوں، بموں، اور گولوں کی آندھیاں رخصت ہوئیں۔ تو میں جیسے ایک بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے چونک پڑا۔ اور اپنی بیوی کو اس اکیلے گھر میں لا کر قید کر دیا۔ ڈرو نہیں۔ اکیلے گھر میں تنہا دو آدمی قیدی ہی تو ہوا کرتے ہیں۔

اور سنو! اس وقت میں تمہاری ہی طرح بیکار تھا یوں سمجھو، میرے ہاتھ میں ایک خالی بانسری آ گئی تھی۔ جسے میں بجانے کی کوشش کرتا تھا۔ اور وہ بجائے بجنے کے میرے خول میں بند سانسوں کے دھوئیں کو باہری سنگا فسے باہر نکال دیتی۔ ایک بیج اب کھل رہا تھا۔ جب بیوی کی آنکھوں میں دوبارہ ایک نامعلوم آگ کے جراثیم کو کوندتا دیکھتا، محبت کے کونپل مرجھا چکے ہوتے، صنوبر کا حسین سایہ بھی دم توڑ چکا ہوتا۔ اب وہاں صرف دھنسے ہوئے پیٹ، اور مرجھائی ہوئی آنکھوں کی آگ ہی رہ گئی تھی۔ جو تیسرے وجود کے ارتقا کا ماتم کر رہی تھی۔ تب مجھے اس بیج کا احساس ہوا تھا۔ یہ بھی میری زندگی کا ایک حادثہ تھا۔ میں نے سوچا بیج وہیں کہیں تھا۔ جہاں میرے اور میرے ماں باپ کے بیچ ایک نفی کی مضبوط دیوار کھڑی تھی۔ بیج اسی بیچ زخمی پڑا تھا۔ جہاں ہم ذرا اس نفی کی دیوار کو توڑ کر اور اس کے اندر جھانک کر اسے بخوبی دیکھ اور پرکھ سکتے تھے، مگر وہاں جہاں اخلاقی اور خاندانی وقار کا سوال ناگ بن گیا تھا۔

وہیں میرے eaa کے بے مائگی کے احساس کی پتلی رسی
آہستہ آہستہ گھستی ہوئی ٹوٹ رہی تھی۔

اف لالٹین کتنا روشن ہو گیا ہے۔ شاید کوئی تیز
ہوا چلی ہے۔ تمہارے چہرے پر کتنی عجیب و غریب آڑی ترچھی
لکیریں اُگ آئی ہیں۔ شکر ہے تم میری بات غور سے سن رہے
ہو ـــــــ ورنہ ایک وقت وہ بھی آ سکتا ہے۔ جب تم ان
باتوں کو دقیانوسیت کا میلا جھاگ کہہ کر آگے بڑھ جاؤ گے
اور eap کی کالی سرکش عمارتیں فضا میں معلق ہو جائیں گی

ہاں ہاں، دقیانوسی، تمہیں حیرت ہے نا، اس نے
مجھے یہی کہا تھا۔ ٹھیک وہی بات جو میں نے اپنے ماں باپ
کو کبھی کسی زمانے میں کہی تھی۔ وہ ایک نوجوان اور فیشن زدہ
واہیات سی لڑکی کو اٹھا لایا تھا۔ جس کا چہرہ غازے کے
دھبوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور جہاں مصنوعیت کسی ناگن کی
طرح بل کھا رہی تھی۔ اس کے بال پیشانی پر آوارہ جھونکوں
کے نوحے سے چھتر لئے ہوئے تھے، اور آنکھوں میں گونگی شرم
کا طائر آہستہ آہستہ قلابازیاں بھرنے کی تیاری میں مصروف نظر آ رہا تھا
یہ کیا ہے۔؟ میرے چہرے پر غصے کا تیور تھا
اور اس کی آنکھوں میں بلا کی خودداری، میں نے
اسے اپنی زوجیت میں لے لیا ہے۔ یہ میری بیوی ہے۔
بغیر رسم و رواج کے شادی نہیں ہوتی۔ میں نے کہا
اور اس نے میرے بچکانے خیال کو بلبلے کی طرح
ہوا میں اڑا دیا۔ اِن اولڈ فیشنڈ OLD FASHIONED
سی باتوں کو گولی ماریئے، شادی بیاہ جیسی رسمیں محض
ڈھونگ، خیال اور سوچ سے پرے ہیں۔ صحیح وہی ہے
جو ضرورت ہو۔ اسے پکڑ لو، بغیر اجازت اسے اپنی زوجیت
میں لے لو، میں نے وہی کیا ہے
اس کی آنکھیں نہ جھکی تھیں، اور چہرے پر خفگی کا
اظہار تھا۔

میں نے آنکھیں جھکا لیں۔
کیونکہ وہاں مجھے eap والے سانپ کی کالی زہریلی
زبان نظر آ رہی تھی۔ مجھے اپنے دقیانوسی بننے پر ڈر تھا۔

سمجھ رہے ہو نا،! یہ پہلی، پہل تھی، جو میرے بیٹے
نے شروع کی۔ اور پھر حادثوں کی پرورش میں، میں واقعی بونا
ہو گیا۔ بچیوں نے بھی رسم و رواج کے ڈھکوسلے کو بے بنیاد کہہ کر
اپنی راہ لی، میری بیوی مجھے پچھلے سوچ کا جانور کہہ کر میرے رستے
سے ہٹ گئی۔

اور وہاں بس دور تک راستوں کی ایک لمبی راہداری تھی
راستہ۔ ٹیڑھا، میڑھا، کنکریلا راستہ
اور میں اس کے ایک کنارے پر کھڑا اپنے احساس
کے کم مائگی کے پرندے کو آزاد کر کے دور کے راستوں پر نظر
دوڑا رہا تھا۔

ان پگڈنڈیوں پر غور کر رہا تھا۔ جنہیں مجھے عبور کرنا تھا
اور ان راستوں میں پچھلے وقت کی کتنی ہی مہیب دھندلی شکلوں
سے میرا سابقہ پڑا۔ سب eap کے خونخوار پرندے کی زد
میں آ کر لہولہان پڑے تھے،

ہاں اب میں تم سے پوچھتا ہوں۔ تم نے مجھ پر میرے
پچھڑے پن کا الزام لگایا ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں یہ
eap کیا ہے۔؟

ہاں یہ eap کیا ہے۔؟
اف کتنی تیز ہوا چلی ہے۔
مجھے علم تھا، لالٹین بجھ جائے گی۔
روشن کمرہ اپنی سماعت سے محروم ہو جائے گا۔
تم جا کر بھی کچھ نہ پاؤ گے،
کیونکہ حقیقت یہی ہے۔ آنے والی صدیاں گونگی ہوں گی

انجمن زن مریداں

رضا نقوی واہی

جب ہوا ناقابلِ برداشت استبدادِ زن!
صدر دفتر اک کھنڈر کی چار دیواری میں تھا
دور آبادی سے مرکز اس لئے رکھا گیا
وقتِ شب جب محوِ خوابِ ناز ہوتیں بی بیاں
آہٹوں پر کان دھرتے، رک کے چلتے، دوڑتے
چند ساعت کی یہ آزادی تھی۔ اتنی جاں نواز
شیرنی کی زد سے بچ کر، توڑ کے زلفوں کا دام
سب کے سب اک دوسرے سے حالِ دل کرتے بیاں
ڈرتے ڈرتے ایک دن سب نے یہ کی تجویز پاس!
بی بیوں کے سامنے اب دُم ہلائیں گے نہ ہم
بی جمالو کو نہ جانے کیسے سُن گُن مل گیا،
پھر تو کانوں کان سارے شہر میں پھیلی یہ بات
انتقامی کارروائی کی مہم جاری ہوئی
میرِ مجلس جیسے ہی تقریر کرنے کو اٹھے
منچ کے چاروں طرف گھیرا کچھ اتنا سخت تھا
صف بہ صف بیٹھے ہوئے تھے ایک سے ایک نامور
شاعرانِ نیم وحشی، ناقدینِ بے مہار
گھر کے باہر جو بنے رہتے تھے قالینوں کے شیر
بیگموں نے اپنے اپنے شوہروں کو ڈھونڈ کر
منچ پر چاروں طرف منظر تھا دار و گیر کا
الاماں وہ بی بیوں کی زن مریدوں سے چخ پخ
الغرض سب پٹ پٹا کر اپنے اپنے گھر چلے

زن مریدوں نے بنائی اک خفیہ انجمن!
طائرانِ تیرہ شب کی جو عمل داری میں تھا
بیگموں کو اس بغاوت کا نہ چل جائے پتا
مثلِ چوروں کے گھروں سے باہر آتے کل میاں
نصف شب تک سب پہنچ جاتے وہاں سہمے ہوئے
بھول بیٹھے اپنے حق میں نیک و بد کا امتیاز
"زیست کے ٹیلے پہ آہو کا وہ بے پروا خرام"
کس نے کس حد تک کیا برداشت جورِ بیگماں
اسٹرائک کرکے ہم دل کی نکالیں گے بھڑاس
جھڑکیاں کھا کھا کے ان کی سہ سکیں گے نہ ہم
جھٹ سے ایک بی بی کے گھر آئیں اس کا تذکرہ
کس طرح یہ سرکشی برداشت کرتیں بیگمات
انجمن پر دفعتاً شب خوں کی تیاری ہوئی
ہر طرف ڈائس پہ چھاپہ مار دستے چھا گئے
بھاگنے کا ایک بھی شوہر نہ موقع پا سکا
کیسے کیسے مولوی، فاضل، محقق، لکچرر
ماہناموں، روزناموں کے مدیرانِ کبار
یوں تھے نرغے میں کہ جیسے بند پنجروں میں بٹیر
بیلن و کفگیر سے جی بھر کے لے ڈالی خبر
"سینۂ شمشیر سے باہر تھا دمِ شمشیر کا"
"آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ"
سرکشی کا شوق تھا، وہ شوق پورا کر چلے

گھر کے باہر لاکھ اکڑیں، ایں جناب و آں جناب
گھر کے آنگن میں رہیں گے وہ سدا خانہ خراب

تیرتے لمحوں کی قطاریں

(۱)

تمام جسم ہے میرا گناہ آلودہ
مگر نگاہ گنہ گار کچھ زیادہ ہے

(۲)

تمہاری انگوٹھی کا یہ سرخ پتھر،
حقیقت یہی ہے کہ میرا نہیں ہے
کسی ایک دوکان کی ملکیت ہے
مری جیب روپوں سے بھاری تھی اس دن
جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے سونے کی قیمت بھی
دو سو سے زیادہ نہیں تھی
مری آرزو تھی،
کہ یہ سرخ پتھر
تمہارے حسین داہنے ہاتھ کی ایک انگلی میں چمکے
وہ دوکان اب بھی ہے آراستہ زیوروں سے
مری خواہشوں، آرزوؤں کی شدت بھی کچھ کم نہیں ہے
تمہیں تو خبر ہے۔
بہت خوب ——
تم تو سبھی کچھ سمجھتی بھی ہو
جانتی ہو!

(بھاسمان بنگو کیتی پادھی)

بنگلہ: اسد چودھری
اردو: احمد سعدی

ایک بہت معمولی آدمی کی باتیں

ان کے ہاتھ میں گھڑی نہیں تھی۔
ان کی گھڑی تھی روشن سورج
تھوڑے سے چاول کی خاطر
دال کی خاطر، سرگرداں تھے
سبزی، غلہ، تیل، نمک اور لکڑی حاصل کرتے کرتے
کرتے کرتے
ڈاڑھی پک گئی، بال بھی پک گئے،
مصائبوں کے ہاتھ ہوئے کچھ اور بھی پختہ
لیکن سبزی، تیل، نمک اور لکڑی، غلہ
پھر بھی حاصل ہوتا نہ تھا، پھر بھی حاصل ہوتا نہ تھا،
ہوتا نہ تھا، ہوتا نہ تھا، ہوتا نہ تھا، ہوتا نہ تھا، ہوتا نہ تھا
ان کے ہاتھ میں وقت نہیں تھا
گھڑی نہیں تھی،
ان کی گھڑی تھی روشن سورج
سبزی، غلہ، تیل، نمک اور لکڑی، حاصل کرتے کرتے، کرتے کرتے
کرتے کرتے، کرتے کرتے، کرتے کرتے، کرتے کرتے ....

(اوتی ساما لو، ایک جو نیر کو تھا)

بنگلہ: اسد چودھری
اردو: احمد سعدی

فضا ابن فیضی،

غزل

جو زمیں سے تھا عبارت، وہ مکاں غائب ہوا
اب کسے یہ ہوش، سر سے آسماں غائب ہوا

ہم مکمل ہو کے اندر سے بہت خالی لگے
شخصیت کا وہ ادھورا پن کہاں غائب ہوا

یک کف خاکستر ول ہے، ہمارا جسم کیا
کیا ہوا اٹھی، بجھ گیا شعلہ، دھواں غائب ہوا

یہ سمندر کا سفر تجھ کو کہاں لے جائے گا
رہ گئی کشتی اکیلی، بادباں غائب ہوا

مدتوں پر شہر میں اس کو ملا اذن قیام
چلئے، اپنی لامکانی کا نشاں غائب ہوا

بس وہیں سے ہم بنے لامنظری کا آئینہ
آنکھ سے خوابوں کا پس منظر جہاں غائب ہوا

ہم ہی اس دولت کے مالک بادشاہ ہو گئے
کب فقیروں کا زر نقد زیاں غائب ہوا

اب اسی قوس قزح کے رنگ میں چلتے رہو
دفعتاً پلکوں پر سجا کر تتلیاں غائب ہوا

ہے ابھی موقع، مجھے محفوظ کر لے، ورنہ میں
آنکھ جھپکی، صورت خواب رواں غائب ہوا

ہم کو اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی نہیں
سب ہنر، عرض ہنر کے درمیاں غائب ہوا

رائگانی کا نشہ اترے تو پھر سوچوں فضا
کس جگہ سرمایہ عمر رواں غائب ہوا

غزلیں

مخمور سعیدی

چاند، چھت پر مری اتر آیا
رات، منظر یہ کیا نظر آیا

جو گیا تھا ترے تعاقب میں
پھر وہ لمحہ نہ لوٹ کر آیا

دل بھٹکنے لگا، قدم بہکے،
راستے میں یہ کس کا گھر آیا

پیاس بڑھنے لگی مسافر کی
دور، دریا کوئی نظر آیا

دل آوارہ، آ، کہاں تھا تو؟
مدتوں بعد راہ پر آیا

زرد پتہ ہوا کی بانہوں میں
شاخ لرزاں سے ٹوٹ کر آیا

خوف کی آہٹیں، قدم بہ قدم
راستہ کتنا پُر خطر آیا

منزلوں منزلوں اداسی ہے
کیا سفر اپنا ختم پر آیا

کہہ کے آج اپنے دل کا دکھ مخمور
میں اسے بھی اداس کر آیا

دل کی روش روش سے گزرتی یہ تتلیاں
خوابوں میں آ کے پھول کترتی یہ تتلیاں

ہیں جانے کس طلب میں ہواؤں کی ہمسفر
پھولوں کی بستیوں سے گزرتی یہ تتلیاں

جھونکوں کی ہم رکاب، چمن در چمن خراب
خوشبو کے ساتھ ساتھ بکھرتی یہ تتلیاں

اک دشت بھی ہے منتظر ان کے ورود کا
گل پوش وادیوں میں اترتی یہ تتلیاں

روپوش، کل غبار بیاباں میں ہو نہ جائیں
آئینۂ چمن میں سنورتی یہ تتلیاں

بے رنگ موسموں کے بھی منظر دکھا گئیں
اک رنگ سا فضاؤں میں بھرتی یہ تتلیاں

گزری ہیں دو گھڑی کے لئے صحن باغ سے
اک ایک شاخ گل پہ ٹھہرتی یہ تتلیاں

لے جائیں گی اڑا کے انہیں آندھیاں ادھر
صحرا کی سمت اڑان نہ کرتی یہ تتلیاں

مخمور چھو نہ پائیں گی رنگوں بھرا افق
پرواز کی تکان سے ڈرتی یہ تتلیاں

غزلیں

لطف الرحمن

بے سبب ہم بھی نہیں ہیں ہر شخص کی تائید میں
کچھ مزا ملنے لگا ہے اپنی ہی تردید میں

اور پھر ایسا ہوا کہ وقت رخصت ہو گیا
بات جو کہنے کی تھی رہ گئی تمہید میں

اسکو برسوں کی مسافت نے کیا ہوگا نڈھال
اب کے اک پیغام بھی آیا نہ اس کا عید میں

جسم سورج کی کرن ہے، چاندنی کا پیرہن
بے سبب پاگل نہیں ہیں لوگ اسکی دید میں

زندگی سرمایہ صحرا تھی، رزق ریگ ہے
لفظ کا لشکر ہے لیکن سایہ تجرید میں

تجھکو دعویٰ تھا بہت پیغمبری شعر کا
ذکر بھی تیرا نہ آیا حلقہ تجدید میں

معرکے اپنی جگہ پر ہیں، تھکن ہے کیسی؟
ہے سرابوں کا سفر دور، جلن ہے کیسی؟

کس نئی رت میں ہوئی ریت کا لوحِ بینا
کرب آنکھوں میں، یہ سینوں میں گھٹن ہے کیسی؟

نشہ زہر ہوس سر میں چڑھا ہے کتنا
رات سفاک سیاہی میں مگن ہے کیسی؟

دل کو چٹکی میں کوئی جیسے مسل جائے
پہلوئے درد میں اب کے یہ دکھن ہے کیسی؟

تشنگی روح میں اتری ہے انی کی صورت
کیا ببولوں کو پتہ اب کے چبھن ہے کیسی؟

غزلیں

فرحت قمر

زندگی مانا کہ مائل بہ ستم ہے یارو
میرے اعصاب میں لیکن ابھی دم ہے یارو

جن کو دعویٰ ہے زمانہ کی مسیحائی کا
ہاتھ میں ان کے بھی سودے کا قلم ہے یارو

وقت ہر جرم تمہارا تمہیں لوٹا دے گا
وقت کے پاس ہر اک طرز ستم ہے یارو

مدتیں بیت گئیں چند لفافوں میں مگر
اب بھی محفوظ محبت کا بھرم ہے یارو

اور اک فصل اندیشوں کی اگائیں آؤ
اپنے اس دیش کی مٹی بڑی نم ہے یارو

آج مرہم کے لئے اتنے پریشان کیوں ہو
میرے یہ زخم تمہارا ہی کرم ہے یارو،

انگلیاں سونے کی کانوں میں دیئے بیٹھے ہیں
کس کو یاں فرصت شنوائی غم ہے یارو

ہم اندھیرے میں بھی کچھ دیکھ ہی لیں گے فرحت
کیا ہوا راہ میں گر روشنی کم ہے یارو ؟!

عبدالمتین نیاز

جب پہلی بار لوگ تری رہ گزر چلے
بے اعتباریوں نے کہا تھا کدھر چلے

دھرتی پہ تھے تو ہم کو اڑانوں سے خوف تھا
آئے ذرا ہوا کے مقابل، تو پر چلے

سورج کا سامنا بھی ذرا کیجئے حضور
اب رات ختم ہونے کو آئی تو گھر چلے

گھر میں ہمارے ہے خس و خاشاک کا جماؤ
یہ دیکھ کر پھر آگ لگانے شرر چلے

آنکھیں لہولہان لئے لوٹ آئیں گے
دنیا کی دید کے لئے اہل نظر چلے

یہ سانحہ بھی دیکھ لیا ہم نے اے نیاز
جینا جو چاہتے تھے وہی لوگ مر چلے

اشفاق حسین گیدیڑا

شب کسی مہرباں کی یاد آئی
صبح تک جاگتی تھی تنہائی
روشنی تھی چراغ چہروں کی!
تیرگی کھو چکی تھی بینائی
نیند ناراحتی کے حجرے میں
رت جگوں کے کنول پرو لائی
آنسوؤں کی پھوار کے نیچے،
خامشی لے رہی تھی انگڑائی
منتظر رقص نوحہ گری تھی
درد کی بے قرار انگنائی
مضمحل، اجنبی اندھیروں میں
کھو گئی تھی شب شناسائی!
دل کو اشفاق یوں جو دکھنا تھا
کیوں پھر اس مہرباں کی یاد آئی

نثار محمد نثار، سعودی عربیہ

اوج بھی ہے اور پستی بھی
دیکھ مزاج ہستی بھی
پہلے دل آباد تھا، اب
ویراں ہے یہ بستی بھی
ایک سی کب ہے جنس وفا
مہنگی بھی ہے سستی بھی
یوں ہی گئی بیکار گھٹا!
اٹھی تھی تو برستی بھی
ناصح کی نظروں میں ہے زہر
میری بادہ پرستی بھی
اس نے سنبھالا خود بین کو
کام آئی ہے مستی بھی

R. N. Regd. 4253/64
P. T. Regd. No. Gy 7
Phone—432

The Aahang **Urdu Monthly**
BAIRAGI, GAYA

Price : Rs. 2/-

Nov. 1982

December 1982 **Price—Rs. 2-00**

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارے — چوبیس روپئے
ایک شمارہ — دو، روپئے

فون نمبر، 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹر
نوشابہ حق

رفقاء ایڈیٹرز
شفق، عبد الصمد

طباعت: ہند [illegible]

کتابت: کلیم القاسمی ڈنگروی

محتویات

اداریہ

کشکول

دسمبر کے اس شمارے کے لئے یہ سطور لکھتے ہوئے محترم جناب احتشام حسین مرحوم کی یادیں آرہی ہے کہ دل دکھتا ہے۔ بس یوں ہی اچانک ٹہلتے ٹہلتے —— وہ دل جو بہت وسیع تھا، وہ دل جس میں کائنات کی محبت تھی، وہ دل جس میں اپنوں کے دیئے ہوئے زخم مسکراتے تھے، وہ دل جس میں انسان کے مستقبل کی روشنیاں جگمگاتی رہتی تھیں، جس میں بڑوں کے لئے احترام، ہم عمروں کے لئے محبت، اور چھوٹوں کے لئے شفقت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا —— اچانک —— وہ دل چلنا بھول گیا۔ اور بند ہو گیا۔

اور علم و دانش کی کرنیں بکھیرنے والے احتشام حسین مرحوم ہو گئے۔ ہم ایک مشعل راہ سے محروم ہو گئے۔ انکسار اور تمکنت، علم اور حلیمی —— احتشام حسین کے یہاں، یوں تھی کہ وہ ہمیشہ ہر جگہ ہر مجلس میں ممتاز دکھائی دیتے تھے، مگر کہیں بھی خود کو ممتاز بنانے کی سعی نظر نہیں آسکتی تھی۔ وہ علم و دانش کی نعمت پاکر جیسے سب کچھ کھونے پر ہر وقت تیار رہتے تھے، اور انہوں نے واقعی سب کچھ کھو یا بھی —— مگر یہ تو ہم محسوس کرتے۔ انہوں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔

ادب کے علاوہ دیگر علوم پر بھی محیط یہ شخصیت ہندوستان، اردو اور اردو والوں کے لئے تا قیامت سرمایہ افتخار رہے گی۔ اس شخصیت سے پھوٹتی کرنوں نے ادب کے کن کن تاریک گوشوں کو روشنی دی، یہ بیان کرنے کی یہ جگہ نہیں ہے —— کیوں کہ ابھی تو —— ابھی تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے احتشام حسین ہم سے دس سال پہلے نہیں بلکہ آج ہی جدا ہوئے ہیں۔

—— ہم اس سوگواری کے عالم میں کیا لکھیں۔؟

احتشام حسین لکھنؤ کے تھے، وہ اردو کے تھے، ہندی کے تھے، گیا کے تھے، رانچی کے تھے ——

—— اور آج تقریباً ہر ریاست میں اردو اکیڈمیاں ہیں —— مگر ——

مگر لکھنؤ میں اردو اکیڈمی ان کے مضامین کے مسودے کو جو ہم سب کی امانت ہے۔ اپنی تحویل میں لئے ہوئی ہے اور شائع نہیں کر کے اس نے ہمیں ان روشنیوں سے محروم کر رکھا ہے۔ جن کی ہمیں آج بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس قومی سرمایہ کو ہمارے حوالے کر دینا یو پی اردو اکیڈمی کا فرض ہے نئے سال میں ہی سہی۔ مگر ہو نہ پائے

ہم اس کے لئے کس کس کو پکاریں ؟

علی جواد زیدی کو ؟

محسنہ قدوائی کو ؟

حیات اللہ انصاری کو —— ؟

رام لعل کو؟ کس کس کو آواز دیں ؟

کلام حیدری

جوش کی انقلابی شاعری

(مطبوعہ نگار ۱۹۵۳ء)

نوٹ، از نیاز فتحپوری

دیکھا جاتا ہے کہ آج کل بعض نقاد جب کسی شاعر کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہیں تو تقابلی مطالعہ کے لئے کسی اور شاعر کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کسی چیز کے پرکھنے اور نقد وغیرہ کی تمیز کے لئے یہ طریق عمل غلط نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اس حقیقت کو اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ہم جن دو شاعروں کا کلام پہلو بہ پہلو رکھکر ایک کی فوقیت دوسرے پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دونوں ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ یا ان کی راہیں الگ الگ ہیں ــــ مومن کے ساتھ غالب کا، اور میر کے ساتھ درد کا ذکر کیوں کیا جائے، جب داغ پر بات چلے تو امیر کیوں سامنے لایا جائے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے۔ اور غلط ہوتا ہے یہی غلطی اس مضمون میں بھی کی گئی ہے۔ کہ جوش کے ساتھ اقبال کو بھی لے لیا گیا ہے۔ اگر یہ غلطی اس قبل بعض نقادوں کی طرف سے ہو چکی ہے تو یہ اس کے جواز کی دلیل نہیں۔ اقبال اور جوش دونوں کی راہیں بالکل جدا ہیں تخیل، معنویت، احساس، تاثر، غرض ہر لحاظ سے جدا، دونوں کا زاویۂ نگاہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اور دونوں کی زبان ایک دوسرے سے الگ، اس میں شک نہیں، سیاست و مذہب کے متعلق دونوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن موضوع کا اتحاد اس کو مستلزم نہیں کہ دو شاعروں کے کلام کو سامنے رکھکر ان میں ایک پر دوسرے کو ترجیح دی جائے، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ دونوں کا مقصود ایک دوسرے سے جدا ہو۔ ایک کے یہاں مذہب کی رندانہ تخفیف ہے۔ دوسرے کے یہاں حکیمانہ رشد و ہدایت، ایک کے یہاں سیاست وقتی و جذباتی کھیل ہے۔ اور دوسرے کے یہاں ملت و قوم کی بنیاد، ایک کے یہاں زبان معنی کی پابند ہے، دوسرے کے یہاں معنی زبان کا پابند، ایک کا مقصود دنیا سے صرف کھیلتے ہوئے گزر جانا ہے، دوسرے کے یہاں دنیا کے لئے سر دھننا، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جوش و اقبال کا ذکر کیوں ساتھ ساتھ کیا جائے ـــ جوش بھی ایک آرٹسٹ ہے خطوط کا اور اقبال فنکار ہے رنگوں کے مزاج کا، جوش کے سنگستانی نغمی کا شور و ہنگامہ ہے، اور اقبال کے یہاں اوقیانوس کا سا سکون و عمیق، جوش کا کلام بازیگاہ الفاظ کا، اقبال کا کلام طلسم کدہ ہے معنویت کا، جوش کی شاعری ایک منظر ہے کبوتر کی مانند تیزی کا جو فضا میں چکر لگا کر چھتری پر آکر بیٹھ جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری ایک عقاب کی سی پرواز ہے جس کے تعاقب میں پہلے ہماری نظریں کھو جاتی ہیں اور پھر ہم خود ـــ جوش از صحن خانہ تا بہ لب بام انسان ہے کا شاعر ہے، اور اقبال از بام خانہ تا بہ [illegible] کا، اس لئے یہ غلطی ہے کہ ان دونوں کا موازنہ کر کے ایک کا تفوق دوسرے پر ظاہر کیا جائے، جوش کے میدان عمل کا [illegible] اقبال کی جولان گاہ میں جوش کا گزر نہیں۔ دیوار کے نقش و نگار کو کرید کرید کر دیکھنا [illegible] کر دیوار کے نقش و نگار کو دیکھنا دونوں بے محل باتیں ہیں)۔

اردو شاعری کے نشاطیہ دور کے بعد حالی نے اخرت تنقید حیات شروع ہوئی۔ اور زندگی کو سنوارنے نکھارنے کی جیاہ ... کا آغاز بھی ہوا۔ لیکن ہمیں اس کا اثر پہلی جنگ عظیم سے قبل اتنا نمایاں نہیں ملتا جتنا اس کے بعد۔ جنگ عظیم کے بعد شاعری وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوئی۔ شاعری سے پیغام کا کام لیا جانے لگا۔ اور اقبال جیسا عظیم شاعر پیدا ہوا۔ اقبال کے یہاں جو تضاد ملتا ہے۔ اس سے قطع نظر اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے، تو وطنیت، قومیت وغیرہ کے محدود تصورات سے آگے وہ ایک ایسے مقام پر نظر آتے ہیں جہاں سے انہوں نے عالمگیر اخوت، مساوات اور محبت کا پیغام دیا۔ اقبال نے اپنی فکر و اجتہاد سے دنیا کا جو وسیع مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس نے ہماری نئی نسل کو بہت متاثر کیا۔ اقبال ذہن کے اندیشوں سے نہ بچ سکے۔ اور وہ سرمایہ دارانہ نظام بھی لوٹ کھسوٹ سے بھی غافل نہ رہ سکے۔ مزدوروں کی بدحالی بھی ان کے پیش نظر رہی۔ اب اردو شاعری میں نئے عنوانات بھی آئے نئے خیالات اور تصورات نے بھی جگہ لی، لب و لہجہ بھی بدلا، قنوطیت کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی، اور رجائیت نے اسکی جگہ لے لی، جبر و استبداد کے آگے سرنگوں ہونے کی بجائے اب مظلوم میدان میں ہتھیار باندھ کر اتر آیا تھا۔ ہندوستان انگریزوں کی غلامی کے تلے سسکنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آزاد ہونا چاہتا تھا —— حالات بدلنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ ہمارے شاعروں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ انگریزوں کی غلامی کی نجات کا مسئلہ تھا۔ اقبال اور جوش کے یہاں یہ سیاسی رجحان دوسرے رجحانات پر غالب ہے۔ مگر اقبال کے یہاں جو گہری مفکرانہ سنجیدگی ملتی ہے۔ جوش کے یہاں وہ مفکرانہ سنجیدگی نہیں ہے۔ جوش کے انقلاب کا تصور محدود اور زیادہ جذباتی ہے۔

یہاں مقصد جوش اور اقبال کا موازنہ نہیں ہے بلکہ جوش کی انقلابی شاعری کو پرکھنا ہے۔ عام طور پر جوش کو "شاعر انقلاب" کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ جوش کی انقلابی شاعری بڑی حد تک مکمل ہے۔ اور ان کی شاعری کا بیشتر کامیاب حصہ انقلاب ہی سے متعلق ہے۔ اگر تعمیری مقصد کے بغیر تخریب کا نام انقلاب ہے۔ تو جوش واقعی انقلابی شاعر ہیں۔ اور اگر خطابت نام شاعری ہے تو کسی کو جوش کی شاعری میں شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ نہ تو محض تخریب کا نام انقلاب اور نہ خطابت کا نام شاعری۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں جوش ہی پہلے ہیں جنھوں نے مذہب، سماج، محکومی اور خدا کے خلاف بغاوت بلند کیا ہے۔ لیکن ہمیں جوش کو نعرہ لگانے والے کی حیثیت سے نہیں دیکھنا ہے۔ بلکہ شاعر کی حیثیت سے پرکھنا ہے۔ جوش کی نظموں میں بہت زیادہ بلند آہنگی ہے۔ اس قدر بلند آہنگی ہونے کے باوجود ان میں واقعیت نظر نہیں آتی۔ ستائے ہوئے، گرے ہوئے بدحال عوام کے نادار پر رونے کے لئے آنسو نہیں ہیں۔ محبت بھرے الفاظ بھی نہیں۔ اگر ان کے پاس کچھ ہے تو صرف ان کے آتشیں الفاظ، ان کے انفرادی جذبات اور بیان کی تمام شگفتگی و لطافت کو جھلساتے چلے جاتے ہیں ؎

گرم ہے سوز بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

یا

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اور

آہ اے ہندوستاں اے مفلسوں کی سرزمیں
ایک دو تنکا بھی تجھے ملتا نہیں

یہ آتش فشاں خطبہ ہو تو ہو مگر شاعری نہیں ہے۔

جوش اور جوش کے سامعین کے درمیان بڑی اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ کوئی رشتہ نہیں، کوئی تار نہیں۔ جو ان دونوں کو ملا سکے۔ دونوں کے درمیان ایک خلیج ہے جس کو پاٹنے کے لئے جوش کے پاس کچھ نہیں ہے۔ جوش ایک آگ بھڑکنے والا باغی ہے۔ جو کسی بہت ہی اونچی چٹان پر کھڑا ہو کر آگ اور خون کی بارش کر رہا ہے۔ ہر لفظ ایک انگارہ ہے۔ ایک شعلہ۔ جوش ایک آتش فشاں کی طرح آگ اگلتے چلے جاتے ہیں۔ اور عام سطح کا انسان مرعوب ہو کر محض تماشائی بن کر دیکھتا رہ جاتا ہے وہ ان سے مرعوب ہوتا ہے مگر متاثر نہیں ہوتا۔ جوش کے سامعین جوش کی آواز کو اپنی آواز نہیں سمجھ سکتے جس سے وہ شاعر کی آواز کو اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ پالیں، اپنے پن کا وہ رشتہ جو شاعر اور سامعین کے درمیان ہونا چاہئے غائب ہے۔ فنکار اپنے فن سے اس وقت تک عوام کو متاثر نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے تصورات کو موزوں جامہ نہ عطا کرے شاعر جو کہنا چاہتا ہے وہ یقیناً بہت اہم ہے مگر یہ کم اہم نہیں ہے کہ وہ اپنی بات کس طرح کہتا ہے۔ جھنجھلاہٹ اور غصہ نے مل ملا کر جوش کی شاعری کو خطیبانہ رنگ میں اس حد غرق کر دیا ہے کہ شعریت مردہ ہو گئی ہے۔ وہ بیان و انداز بیان انقلاب میں خوشگوار توازن قائم نہیں کر سکے۔ وہ واعظ ہیں، باغی ہیں، مگر شاعر نہیں۔

جوش کے اس خطیبانہ انداز بیان کے علاوہ جو چیز ان کے موضوع کی سطحیت کی ذمہ دار ہے۔ وہ ان کی سماجی علوم سے ناواقفیت ہے۔ جوش کی انقلابیت کو کسی سماجی عالم کا سہارا نصیب نہیں ہے۔ جوش کے یہاں موجود سماج سے بغاوت، مذہب سے انحراف، اور حکومت سے نفرت کی کوئی ٹھوس اور اثباتی بنیاد نہیں ہے۔ جوش کی بغاوت ایک جذباتی چیز ہے۔ ان کی بغاوت میں جتنا دخل ان کے جذبات کو ہے۔ اتنا عقل کو نہیں۔ یہ جذباتیت موضوع میں کوئی گہرائی پیدا ہونے نہیں دیتی۔ اس لئے جوش شوکت الفاظ میں پناہ لیتے ہیں جن سے ظاہری طور پر تو بڑا دبدبہ اور وقار ظاہر ہوتا ہے۔ مگر ان کا اثر جلد زائل ہو جاتا ہے۔

وہ سرمایہ دار کو پرشکوہ الفاظ میں گالیاں اور کوسنے دے سکتے ہیں۔ مگر اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتے۔ وہ کسی کو کنکر کوٹنے پر مجبور دیکھ کر ایک خالص جذباتی نظم کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ اس نظام کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکتے۔ جو اس کا ذمہ دار ہے ——————

وہ اس کالکنکر کوٹنا گوارہ نہیں کر سکتے محض اسلئے کہ وہ حسین ہے۔ اور جوان، لیکن چھوٹا ناگپور کی سیاہ فام جھریاں پڑی بڑھیا کو مٹی ڈھوتے ہوئے دیکھ کر ان میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ جوش کے انقلاب کا تصور دراصل رومانی ہے۔ اور اس میں مفکرانہ گہری اور سنجیدگی نہیں ہے، جو انقلابی شاعری کے لئے ضروری ہے۔

میں نے ابھی ظاہر کیا ہے کہ جوش کی شاعری میں خطیبانہ جلال ہو تو ہو مگر شاعرانہ جمال نہیں ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ میں جلال و جمال کے درمیان ایک دیوار حائل کرنا چاہتا ہوں۔ اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے متعلق نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ جلال جو چنگیز کی آنکھوں سے شعلہ فشاں ہوتا ہے۔ اور وہ جلال جو ایک شاعر کی آنکھوں سے محبت کے پھول برساتا ہے۔ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جوش کے یہاں معنوی جلال کا پتہ نہیں چلتا۔ جو کچھ شان و شکوہ اور جلال ہے۔ وہ الفاظ تک ہی محدود ہے۔ ان کی نظم "کارل مارکس" کے چند اشعار دیکھئے ؎

نخل خوشحالی کی بیخ و بن ہے تو
عقدہ ہائے زیست کا ناخن ہے تو

——————

اے خطیب منبر، فیض عمیم!

اے ضیائے مشعل رزق کریم!

ہمدم شبیر و بہزاد "یزید"
موسیٰ نو، بہزاد دوران جدید

اس میں کارل مارکس سے کسی دلی محبت کا پتہ نہیں چلتا۔ اس نے دنیا کو کیا دیا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی پیغمبر تھا، مصلح تھا؟ یہ بھی معلوم نہیں۔ ایک مصنوعی اور پر تکلف قسم کا اظہار عقیدت ہے اور بس! کارل مارکس کو دانائے راز، مریض انسانیت کا چارہ ساز، عقدہ ہائے زیست کا ناخن، خطیب منبر، فیض عمیم اور ضیائے مشعل رزق کریم کے خطابات دیکر جوش نے سمجھ لیا کہ انہوں نے انقلابی شاعری کا حق ادا کر دیا۔ الفاظ کے جلال کے نیچے محض ایک کھوکھلا دماغ ہے۔ جس میں کوئی روح نہیں ہے کوئی زندگی نہیں، کوئی حرکت نہیں،

جوش کے نعرۂ انقلاب کو شعور کی رہبری حاصل نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سلسلے میں جوش کا اتنا قصور نہیں جتنا شعور کی اس کمی کا ہے۔ جس کی بنا پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ انقلاب اور موسیقی کا کوئی تعلق نہیں ہے ؎

یا رقص کی محفل میں سجا تال سے گھنگھرو
یا جنگ کے میدان میں سنا تیغ کی جھنکار

پڑھنے والے سوچتے ہیں تیغ کی جھنکار اور گھنگھرو کی چھنا چھن میں آخر کیا بُعد ہے۔؟ شاعر دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب پر کیوں زور دے رہا ہے؟ کیا گھنگھرو کے تال پر انقلابی ترانے نہیں گائے جا سکتے،؟ یا رقص کی محفل یا جنگ کا میدان کیوں؟ یا گھنگھرو یا تلوار کیوں؟ اگر غور کیا جائے تو اس "یا" کے پیچھے فکر کا اوتھلا پن نظر آئے گا، شعور کی سطحیت دکھائی دیگی، فکر کا چھچھلا پن اور شعور کی سطحیت کیوں؟ شعور کی پختگی اور فکر کی گہرائی مطالعہ کی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جوش اس نعمت سے محروم ہیں جو شاعر جذباتی طور پر انقلابی ہو جاتے ہیں۔ ان کے یہاں فکر کا انقلابی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، سماجی علوم سے ناواقفیت حالات کا تجزیہ کرنے سے روک دیتی ہے۔ مطالعہ سے میری مراد کتابی مطالعہ اور زندگی کا مطالعہ دونوں ہیں۔ جوش کے یہاں، زندگی کو نزدیک سے دیکھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اور نہ کوئی ایسی تڑپ ملتی ہے جس کا سرچشمہ زندگی ہو۔ انہوں نے ہندوستان کی تمام سیاسی تحریکات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا ہے، ظاہری حالات کو دیکھکر رد عمل کا ہونا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کی سیاسی نظمیں ناکام ہیں۔ انہوں نے ان تحریکات کا اثر محض جذباتی طور پر قبول کیا ہے، تحریکات سے یہ دوری ہی جوش کو تحریکات کی بنیاد سمجھنے نہیں دیتی، اور وہ سماجی، سیاسی مسائل کا تجزیہ کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی شوکت کی نقاب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

> "اقبال نے اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے اصطلاحی
> الفاظ اور مخصوص محاورے منتخب کر لئے تھے
> جو فلسفیانہ نکات کے بیان کرنے میں ایک
> خاص سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ جس میں پوری فضا
> حکیمانہ انداز سے سامنے آ جاتی ہے۔ جوش نے
> اپنے بیانات کو پیش کرتے وقت اس قسم کا
> کوئی ماحول پیدا نہیں کیا۔"

جوش اس قسم کا کوئی ماحول پیدا نہیں کر سکتے اس لئے کہ ان کے موضوع میں وہ گہرائی نہیں ہے۔ جس سے وہ پر شکوہ انداز بیان کو نباہ سکتے، اگر موضوع میں گہرائی نہ ہو۔ فکر میں رچاؤ نہ ہو، یا موضوع میں گہرائی کم ہو اور فکر میں کم رچاؤ ہو تو حسین سے حسین الفاظ اس میں جان پیدا نہیں کر سکتے۔ شاہانہ الفاظ انہیں عظمت نہیں بخش سکتے۔ رنگ و روغن محض بناؤ سنگار سے نہیں آتا۔ بلکہ رگوں میں تو ان خون بھی ہونا چاہئے زرق برق پوشاک ہی سے حسن نہیں نکھرتا، بلکہ جسم کو جامہ زیب بھی ہونا چاہئے۔

جوش کی چند سیاسی نظموں کو لیجئے، اور ان کا تجزیہ کرکے دیکھیے جوش کا سیاسی شعور کیا ہے۔ (۱) وقت کی آواز (۲) کانگریس سے خطاب (۳) لیگ سے خطاب (۴) کمیونسٹ سے خطاب۔

مادرِ ہندوستان کہتی ہے:

میرے قوس میں تین چمکے ہوئے نگیں
اک کانگریس کہ جو وہ ملوکی کی نازنیں
اور لیگ اس کی پیٹ کی بچی قمر جبیں
اور کمیونسٹ ہے مرا فرزند نکتہ چیں

یہ ہے مادرِ ہند کا شجرہ، اس میں تفکر کی سنجیدگی کا دور دور کا پتہ نہیں ہے۔ ان نظموں میں بھی وہی سطحیت نمایاں ہے جو محدود مطالعہ اور ناپختہ شعور کی پیداوار ہے۔ اب مادرِ ہندوستان کی زبان سے سنئے، جوش کیا کہلواتے ہیں ؎

آؤ سنو بھی مادرِ ہندوستاں کی بات
بیٹا وہی شریف ہے جو مانے ماں کی بات
وہ کہہ رہی ہے دل میں کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے،

کانگریس، لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی اختلافات اور نظری تفاوت کو جوش نے بھائی بہنوں کی رومانی کھٹ پٹ سمجھا ہے۔ اور وہ نہیں جانتے کہ کانگریس کی باگ ڈور کن ہاتھوں میں ہے، ان کی طبقاتی بنیاد کیا ہے۔ اور وہ لیگ کی مذہبی سیاست اور فرقہ وارانہ طریق کار کو کوئی تجزیہ نہیں کر سکے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کو اپنی سیاسی سمجھداری کی بنا پر ایک نابالغ بچہ تصور کرتے ہیں جو بڑا ذہین ہے۔

اور ـــــــ "اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیئے" جوش نفرت و محبت کے فلسفہ سے بھی بیگانہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اگر نفرت شدید نہ ہو تو محبت کی بنیاد ٹھوس نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم ایٹم بم سے شدید ترین نفرت نہ کریں تو ہمیں امن و شانتی سے دلی محبت نہیں ہو سکتی۔ جب ہم بری چیز سے نفرت کرتے ہیں۔ تو یہی نفرت اچھی چیز سے محبت کا سبب بن جاتی ہے۔ یہاں پر جوش گاندھی جی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں مجھے تو ہمیشہ جوش سے یہی ڈر معلوم ہوتا رہتا ہے کہ پتہ نہیں کب کس چیز سے متاثر ہو جائیں گے۔ ایک طرف تو وہ لینن سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی شاعری کا ایک حصہ ان کے نام معنون کر دیا۔ اور دوسری طرف گاندھی جی سے متاثر ہیں۔ اور پھر باغی اور انقلابی ہیں۔

مذہب کی بنیاد پر ہندوستان میں دو قومی نظریہ کو سہارا دینے کے لئے جوش نے جن غیر حقیقی دلائل کو پیش کیا ہے۔ وہی لیگی رہنماؤں کے تھے۔ ان کے خیال میں اس کی بنیاد مذہب ہے حالانکہ قوم ایک ایسی ملت ہے جو تاریخ کے ارتقا سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جس کی زبان جس کا وطن اور جس کی اقتصادی زندگی ایک ہوتی ہے۔ اور جو ایک مخصوص نفسیاتی ساخت رکھتی ہے۔ اور اس کا اظہار اس کے مشترکہ کلچر سے ہوتا ہے۔ جوش کی زبان سے ہندوستانی مسلمان اور ہندو کا فرق ملاحظہ ہو ؎

قصوں میں اختلاف، فسانوں میں اختلاف
لہجوں میں اختلاف، زبانوں میں اختلاف
وضع و طریق، حرف و حکایت گفتگو خصال
اندازِ نطق، طرزِ عمل، جادۂ خیال،
رسم و رواج، دین و روایات، قیل و قال
اٹھ بیٹھ، بات چیت، لب و لہجہ چال ڈھال
تم میں ہر ایک چیز جدا، ہر چلن جدا
دونوں کے پھول پات جدا ہیں، چمن جدا

اگر یہاں جوش سے یہ سوال کیا جائے کہ بنگال کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی زبان میں کیا فرق ہے اور پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے؟ تو جوش کوئی

فرق نہیں بتا سکے۔ جوش فرقہ واریت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح کیوں بہہ گئے، کیونکہ ان کی سمجھداری کی کوئی ٹھوس اور اثباتی بنیاد نہیں تھی۔ انہوں نے کبھی حالات کا کسی اصول کے تحت تجزیہ نہیں کیا۔ انہیں نعرے پسند ہیں اس نے نعرے لگاتے بھی ہیں۔ اور نعروں کا ساتھ بھی دیتے ہیں اس کے پیچھے کوئی ٹھوس شعور نہیں ہوتا۔

اب اگر اوپر کے اشعار میں انداز بیان پر غور کیجئے، تو پتہ چلتا ہے کہ جوش نے ان اشعار میں بھی عادت کے مطابق الفاظ کا ایک میلہ لگا دیا ہے۔ جہاں خیال ایک بچے کی طرح کھو گیا ہے۔ اور جس طرح میلہ میں دوکانوں کی کوئی خاص ترتیب تنظیم اور قرینہ نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح یہاں بھی الفاظ کی ترتیب، تنظیم اور قرینہ پر دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ پہلے مصرعوں کے دونوں حصوں میں کون سی الگ بات کہی گئی ہے "لہجہ، زبان انداز نطق، بات، جیت، لب و لہجہ" ان الفاظ کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ جن سے ایک ہی معنی نکلتا ہے۔ الفاظ کے کثرت استعمال سے کلام میں تکرار اور اعادہ کا نقص پیدا ہو گیا ہے۔

خیر ——— اب نفس مضمون کی طرف آئیے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرق کو بیان کرنے کے بعد کانگریس کے سامنے حرف مدعا زبان پر لاتے ہیں ؎

چھوٹی بہن مرا جہیز تک کہاں پائے گی
بیٹا یہ روز روز کی کل کل نہ جائے گی

یعنی مطالبہ پاکستان کو مان لینا چاہیے۔ دیکھا آپ نے سیاسی تحریکات کو اوپر ہی اوپر سے دیکھنے کا نتیجہ۔ ؟ مطالعہ کے فقدان اور شعور کی ناپختگی کا عطیہ ؟

"کانگریس سے خطاب" اور "لیگ سے خطاب" میں جوش کے شعور کی بے بسی اور بے کسی کا جو مظاہرہ ہوتا ہے وہ "کمیونسٹ سے خطاب" میں مکمل ہو جاتا ہے۔ پہلا ہی شعر ہے ؎

اور تو اداس اداس ہے کیوں کمیونسٹ لال
صورت دھواں دھواں ہے تو الجھے ہوئے ہیں بال

بہت سے ادیب تھا یعنی تیکھے خیال سے کمیونسٹ کی تصویر کشی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ بڑے بڑے اور الجھے ہوئے بال رکھتے ہیں۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی، ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی رہتی ہیں۔ اس گمراہ کن اور غلط خیال سے جوش اس قدر متاثر ہیں کہ انہوں نے اس پر صاد کر دیا۔ اس میں جوش کی بدنیتی کو دخل نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنی معصومیت سے ایسا کیا ہے۔ کاش جوش نے کسی کمیونسٹ کو نزدیک سے دیکھا ہوتا اور عمل اور جدوجہد کی سرخیوں سے تابناک چہروں پر امید اور یقین کی جھلکیاں دیکھی ہوتیں۔ آگے چل کر انہوں نے کمیونسٹ لال کو اپنی بڑی بہنوں، کانگریس اور لیگ کے آگے جھکنے کی مادرانہ تلقین کی ہے ؎

جھکتے ہیں ماں سمجھ کے اکڑتے نہیں ہیں بھائی
بہنوں کی جھڑکیوں پر بگڑتے نہیں ہیں بھائی

اس نظم نے جوش کی انقلابیت نے اصلاح پسندی کا روپ دھار لیا ہے۔ پوری نظم میں جو روح کارفرما ہے اس پر اصلاح پسندی کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ پچھلی تین نظموں میں سمجھوتہ بازی کا جو پرچار کیا ہے۔ وہ اس نظم میں آ کر اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔ اصلاح پسندی کا یہ رجحان اس بات کا غماز ہے کہ سماج کے طبقاتی نظم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی آئیڈیلوجی اور کانگریس کے عام کو سمجھے بغیر ان کے اغراض و مقاصد کو سمجھنا محال ہے آگے جوش کی تمنائیں ملاحظہ ہوں ؎

میری دعائیں جب تجھے دولہا بنائیں گی،
برسے گا نور ڈومنیاں گیت گائیں گی
بچوں کے غل میں سالیاں جوتے چرائیں گی
بہنیں بھی نیگ مانگنے اس وقت آئیں گی۔

سمجھوں گی مجھ پہ حق کا یہ احساں بڑا ہوا۔
دیکھوں گی تجھ پہ ان کا جب آنچل پڑا ہوا

[کم]یونسٹ لال کے سر پہ کانگریس دیدی اور آپا لیگ کے آنچل کا
تماشہ بس جوش کی ایجاد ہے۔

کمیونسٹوں پر مخالف کیمپ سے ایک الزام یہ قائم کیا
جاتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی ماسکو سے بن کر آتی ہے۔
اور یہ کہ ان میں نیشنلزم نہیں ہوتی وہ الزام جوش نے براہ راست
تو نہیں دیا مگر اس کا اثر ضرور قبول کیا ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر
پند و نصائح کا ایک دفتر کھول دیا ہے ؎

پردیسیوں کی بوتلوں میں ڈالٹ ہو تیری
کپڑا تو روس کا ہو مگر کاٹ ہو تیری

جوش نے کمیونسٹوں کی پرخلوص حب الوطنی اور کانگریس کی نیشنلزم
کے فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

ایک اور غلط بات جسے شروع میں پھیلانے کی کوشش
کی گئی یہ ہے کہ کمیونسٹ تمام قدیم چیزوں کو قابل اعتنا نہیں تصور
کرتے، گویا انہیں ماضی سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ یہ بات جوش
کے دل میں کھٹکتی ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل غلط
اور بے بنیاد ہے۔ دراصل ماضی ہی کی زندگی کے تجربات پر
تو مستقبل کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اور ان سے بڑھکر اور کوئی ماضی
کی روایات کا سچا قدردان نہیں۔ قدیم روایات کی پوجا کرنا اور
بات ہے اور انکو لیکر آگے بڑھنا اور بات ہے جوش کا خدشہ ملاحظہ ہو

اس کا مگر خیال رہے وقت سرخوشی
خم میں نئی شراب ہو ساغر رہیں یہی
میری ہی کنگھیوں سے بنے زلف زندگی
میرے ہی جملہ ساز ہوں میری ہی راگنی
تازہ ہوں اصطلاحیں، مقولے یہی رہیں
شانیں نئی ضرور ہوں، جھولے یہی رہیں
کا، کی جبیں پہ نقش ہو اک گونہ آج کا

دستور نو میں رنگ ہو تیرے مزاج کا
ان نظموں میں بھی وہی مصنوعی وقار پایا جاتا ہے جو سامعین
اور جوش کے درمیان ہمیشہ حایل رہتا ہے

جوش کی نیچرل شاعری کو دیکھا جائے تو وہاں بھی جوش
کی جذباتیت اس حد تک مسلط ہے کہ مناظر قدرت کی عکاسی
مکمل اور موثر طور پر نہیں ہو پاتی۔ الفاظ کا ایک دریا ہے جو
تمام حسن و جمال کو بہاتا ہوا بڑی تیزی کے ساتھ نظروں کے
سامنے سے گزر جاتا ہے۔ اور دیکھنے والا حیران اور مبہوت رہ
جاتا ہے۔ جذباتی شاعری کا درجہ قدرتاً پست ہوتا ہے۔ کیونکہ
اس میں گہرائی اور سنجیدگی پیدا ہونا ممکن نہیں۔

نئی تشبیہات سے شاعری میں ایک کیف ضرور پیدا
ہو جاتا ہے۔ خوشگوار اور نکھری ہوئی تشبیہات تو نظم کو
دلفریبی عطا کرتی ہے۔ لیکن جوش کے پاس الفاظ اور تشبیہات
کا جو خزانہ ہے وہ یہاں بھی کامیاب ہونے نہیں دیتا۔ زیادتی
ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔ یہی حال جوش کے تشبیہات کا ہوتا
ہے۔ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری اس طرح تشبیہات
کا ایک بے ترتیب ریلا آتا جاتا ہے۔ اور ایک مصور کا اثر
زائل ہوتا جاتا ہے۔ جوش نے گرچہ مذہب کے خلاف بغاوت
کا علم بلند کیا ہے۔ مگر یہاں بھی ان کا شعور کارفرما نہیں ہے۔ بلکہ
انہوں نے محض جذباتی طور پر خدا اور مذہب کے خلاف لکھا
ہے۔

جس طرح مذہب نے انسان کو برا بھلا اس کی موت سے
ڈرایا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ دنیا فانی ہے۔ انسان کی زندگی
بہت مختصر ہے۔ اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس دنیا میں
رہ کر عیش و آرام کی بات سوچنا غلط ہے۔ اور گمراہی ہے
اصل فکر آخرت کی ہونی چاہئے۔ اس دنیا کے آرام کا خیال
عبث ہے۔ آخرت کو سنوارنے کی لگن ہونی چاہئے۔ اس طرح
جوش نے بھی بتایا ہے کہ یہ زندگی کچھ بھی نہیں۔ کمال زندگی بس

موت ہے۔ اس طور پر شکست کا احساس پیدا ہوتا ہے۔
بددلی پھیلتی ہے۔ اور انسان کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے
نظم جنازہ میں: ؎

دیکھ اے انسان یہ کیا شئے جا رہی ہے دوش پر
ہاں خدارا اک نظر اس پیکرِ خاموش پر
کون یہ اوڑھے کفن تا حشر سونے کے لئے
جا رہا ہے قبر کی خوراک ہونے کے لئے

اس سے پہلے یہ پیکرِ خاموش کیا تھا ؎

اس کی راتیں بھی تبسم کی طرح شاداب تھیں!
اس کے دل میں بھی بہت سی حسرتیں بیتاب تھیں

اور پھر ؎

موت کے آتے ہی چہرہ زرد ہو کر رہ گیا
ایک جھونکے سے یہ شعلہ سرد ہو کر رہ گیا۔

نتیجہ — ؟

اب تو افشا ہو گیا رازِ کمالِ زندگی!
اور غلام زندگی دیکھا مآلِ زندگی!

چنانچہ اسی کے پیش نظر جوش نے راہ فرار اختیار کی ؎

بجلیاں جس نخل پر رقصاں ہوں پھل سکتا نہیں
تیری اس دنیا کا مجھ سے کام چل سکتا نہیں
میں پروں کو تولتا ہوں آشیانے کو سنبھال
یہ ہے دنیا اور اپنے کارخانے کو سنبھال!

جس طرح مذہب نے دنیا کے عیش و آرام سے متنفر کر کے عوام کی قوت عمل کو شل کر دیا۔ اور ایک طبقہ نے اپنے مفاد کے لئے مذہب کی تعلیمات کو عام کر کے فائدہ اٹھایا اسی طرح جوش بھی انسانوں کے سامنے موت کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ چند روزہ زندگی سے ان کو نفرت ہو جاتی ہے۔ اور سلسلہ آغاز کو بھیانک انجام دیکھ کر دنیا کو سنوارنے کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سب محض اس بات کا نتیجہ ہے۔ کہ جوش نے کبھی مذہب کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا۔ اور انہوں نے محض جذبات کے بہاؤ میں مذہب اور اور خدا کی مذہب کی مخالفت کا صحیح تجزیہ ان کے یہاں نہیں ہے مذہب کے تاریخی کردار کو انہوں نے کبھی جاگر نہیں کیا۔ اس کو کس طرح لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے نے اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا، اور کر رہا ہے۔ ان ساری باتوں کا جوش کے یہاں پتہ نہیں ملتا۔ اور یہیں سے ان کی شاعری نعرہ بازی کی سرحدوں سے جا ملتی ہے۔ جس میں تفکر کی گہرائی اور شعور کی سنجیدگی کا فقدان ایک قدرتی امر ہے۔

دوسرے مسائل کے سلسلے میں بھی جوش کا زاویہ نگاہ بہت کھوکھلا اور غیر حقیقی ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جوش سماج سے نابلد ہیں۔ انہیں سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ انہوں نے ہر مسئلہ کی سطح کو دیکھا۔ اور کبھی اس کی گہرائی میں نہیں اترتے ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں کے مسئلہ پر جوش کی رائے ملاحظہ ہو وہ مغربی عورتوں کو بے حیا تصور کرتے ہیں۔ اور مشرقی عورتوں کو نہایت ہی پاکباز مقدس دیوی ؎

جب کرے گی صنفِ نازک اپنی عریانی پہ ناز
صرف اک تو اس تلاطم میں رہے گی پاکباز

تعلیم نسواں سے متعلق ان کے خیالات ملاحظہ ہوں، مشرقی عورت کو جہالت پر قانع رہنے کی تلقین کرتے ہوئے جوش اور مسجد کے ملا میں کیا فرق رہ جاتا ہے ؎

علم سے ہر چند تجھکو کم کیا ہے بہرہ مند!
لیکن اس سے ہو نہ اے معصوم عورت آزردمند
جب ضرورت سے زیادہ ناز فرماتا ہے علم
عارضِ تاباں کے جوبن کو کھا جاتا ہے علم
علم سے بڑھتی ہے عقل، اور عقل سے وہ بد دماغ
جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ
چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار

علم کے ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار
عورت کی تعلیم کو جوشؔ کے اس نرم و نازک شانوں پر ایک بار تصور کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ علم کی وجہ سے اس کے سینہ میں "محبت کا چراغ" گل ہو جائے گا۔ عقل کے بڑھنے کو بھی جوشؔ گوارا نہیں کرتے۔ وہ یہ سمجھ نہیں پائے کہ نزاکت عورت کا ایک پہلو ہے۔

خاتون مغرب کے متعلق جوشؔ کے خیالات اور رجعت پسند مولوی کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انہوں نے مغربی عورت کی بے باکی اور بے حیائی کا سبب سماج کے نظام میں تلاش کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ اخلاقی گراوٹ کو اگر جوشؔ دوسرے سماجی مسائل سے الگ تھلگ مسئلہ تصور کرتے ہیں تو یہ محض کوتاہ بینی ہے۔ یہ ساری خرابیاں جو مشرق و مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک میں مشترک ہیں ———— اس سماج کی ہیں جس میں اخلاق محض منافع کا نام ہے۔ اور ہر بات کی تان منافع پر ٹوٹتی ہے۔ مغربی عورت کے متعلق جوشؔ کی رائے کی تان یہاں ٹوٹتی ہے ؎

نازکی، عزت، محبت، آبرو، کچھ بھی نہیں
نام تو ہے پھول، لیکن رنگ و بو کچھ بھی نہیں

جوشؔ کی پوری انقلابی شاعری میں فکر کی سطحیت سمایاں ہے انہوں نے جس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے۔ اسے نزدیک سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مطالعہ کے فقدان، اور سیاسی و سماجی تحریکات سے دوری، یہی چیزیں ہیں، جنہوں نے جوشؔ کو موضوع کی گہرائیوں میں اترنے نہیں دیا ہے۔ الغرض جوشؔ شاعر کم ہیں خطیب زیادہ، مفکر کم ہیں۔ اور جذباتی زیادہ۔ ●●

محمد اشتیاق

پاکستان کے تین اردو ناول

۱۹۵۸ء میں پاکستان میں کئی ناول شائع ہوئے لیکن اس وقت جن تین ناولوں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے ان میں سب سے پہلا ناول نگار عزیز بٹ صاحبہ کا "کاروانِ وجود" ہے یہ نگار عزیز کا تیسرا ناول ہے۔ اس سے پیشتر ان کے دو ناول، "نگری نگری پھرا مسافر" اور "نئے چراغ نئی گلیاں" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے ناول "نئے چراغ نئی گلیاں" کی کہانی ۱۹۴۷ء تک کے سیاسی سماجی اور معاشرتی حالات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس نئے ناول کاروانِ وجود کے شروع میں ہی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ ۱۹۵۱ء کا زمانہ ہے۔ اور اس ناول کی ہیروئن ثمر صالحہ یعنی ثمر فردوس بیگم کی عمر ۱۸ برس ہو چکی ہے۔ ان کو ہندوستان سے ہجرت کئے ہوئے ابھی چار سال ہوئے ہیں۔ اب وہ پشاور خیبر کالج میں سیکنڈ ایر کی طالبہ ہیں۔ ثمر اپنے بچپن سے اب تک مختلف جگہیں تبدیل کرتی رہی ہے۔ یعنی ہندوستان میں اپنے باپ کے گاؤں پھر وہاں سے دہلی، دہلی سے کراچی، کراچی سے پشاور۔ اس کی مصنفہ اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ شاید آئندہ بھی اسے برابر جگہ بدلنی پڑے، کیونکہ ع

"ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود"

اور ناول کے آخر تک اس کے تمام کردار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

یہ ناول ۱۹۵۱ء کے بعد پاکستان کے ایک خاص طبقہ کی سماجی اور معاشرتی کیفیت کا ترجمان ہے۔ جس کا ہر کردار اوپر سے اچھا خاصا لگتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر ایک ناآسودگی گھٹن، بے چینی، بے یقینی اور بیزاری کا شکار ہے۔ وہ ایک طرح کے خوف و خدشہ غم و غصہ میں مبتلا ہے۔ آج کیا ہو رہا ہے؟ کل کیا ہوگا؟ اس ناول میں قدم قدم پر اس طرح کے منطقی اور فلسفیانہ سوالات ابھرتے ہیں جس میں زندگی کے بہت سے تجربات اور المیے بھی شامل ہیں۔

اس ناول میں دو اہم کردار ہیں۔ ثمر اور سارہ جن کے گرد ناول کے واقعات چلتے ہیں۔ پاکستان کا صوبہ سرحد جہاں خود مصنفہ کا قیام ہے۔ وہ اپنے ناول میں سارہ کو بھی وہیں پروان چڑھتے ہوئے دکھاتی ہیں۔ یہ کردار اس لئے اہم ہے کہ اس سے مصنفہ کے افکار و خیالات واضح ہوتے رہتے ہیں ایک طرح سے سارہ ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ ثمر جیسا کہ اوپر کہا گیا وہ دہلی سے ہجرت کرکے پشاور پہونچی ہے۔ ثمر اور اس کے گھر والے جسمانی لحاظ سے تو پاکستان میں ہوتے ہیں لیکن ذہنی اعتبار سے وہ اپنے آپ کو وہاں SETTLE نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس کا اثر ثمر کے کردار پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ نہایت ہی سنجیدہ، ہر وقت گہرے خیالات میں ڈوبی ہوئی، دنیا کی رنگینیوں سے الگ تھلگ سماج کے تقاضوں سے کسی قدر بے نیاز اور یہاں تک کہ شادی

کرنے اور گھر بسانے کا خیال کرنا بھی حرام سمجھتی ہے۔ اس کے متعلق
اس کی سہیلی کا خیال ہے کہ ــــ جیسے ثمر کے ارد گرد "داخلہ
منع ہے" کا بورڈ لگا ہے" پاکستان سے دور امریکہ جیسے ملک
میں بھی اس کی یہی کیفیت دیکھ کر اس کو رلائے دی جاتی ہے کہ وہ کسی
مرد میں دلچسپی لے ، اس بات پر وہ عمل کرنا چاہتے ہوئے بھی ناکام
رہتی ہے ۔ مصنفہ نے اس کی کیفیت یوں بیان کی ہے :

"کیتھرین نے اس سے کہا تھا کہ صحت حاصل کرنے
کی ایک امید شاید محبت تھی ــ وہ تو خود اپنے
آنسوؤں میں غرق ہونے والی تھی ، گھنٹوں
وہ اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے اونچی
آواز سے روتی رہتی ۔ جب آنسوؤں کا
طوفان ختم ہو جاتا تو وہ رات کے اندھیرے
میں یارڈ کے درختوں تلے گھاس پر جا کر
بیٹھتی ، ایسے میں اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے
دنیا طوفان نوح میں ختم ہو چکی ہے ۔ اور یارڈ
اس کی آخری پناہ گاہ ہو۔"

ثمر کی والدہ شروع ہی سے اس کے لئے تیار نہیں تھیں
کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اس سوسائٹی میں کریں جس کا انجام
یہ ہوا کہ ثمر نے اپنی سہیلی کے ہی شوہر کے ساتھ اس شرط پر
نکاح کیا کہ وہ اس شادی کو پوشیدہ رکھے گا۔ اور ثمر جب
چاہے اس رشتہ کو ختم کر سکے گی۔ اور چند دنوں میں ہی یہ رشتہ
ٹوٹ جاتا ہے ۔ لیکن یہ واقعہ ناول کے بالکل آخری حصوں
میں رونما ہوتا ہے ۔ جب قاری یہ سمجھ لیتا ہے کہ ثمر تمام عمر
کنواری ہی رہے گی ۔ پاکستان میں یہ کیفیت اکثر دیکھنے کو
ملتی ہے ۔ کہ وہ پاکستانی جن کو آج بھی مہاجر کہا جاتا ہے ۔ وہ
پاکستان کے مقامی لوگوں سے رشتہ جوڑنے میں بہت احتیاط
سے کام لیتے ہیں ۔ اس ناول کے ابتدا میں ہی ہجرت کے ان
نقصان دہ پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ ثمر کی خالہ اپنی
بہن (ثمر کی والدہ) کے لئے مندرجہ ذیل باتیں سوچتی
اور کہتی ہے :

کیا ہجرت نے آپا کی رہی سہی عقل بھی ماؤف
کر دی ہے ؟ .... اکلوتی اولاد شادی
کو منع کر رہی ہے ۔ تو اس کے کہے کو گلے میں
تعویذ بنا کر ڈالے رہی ہیں ....
آپا اتنے بڑے انقلاب کے بعد پاؤں جمانا
ہی کا ہے وارد ہونا ہے ۔ وطن میں ہم ہیں
لیکن ایک لحاظ سے بے وطن بھی ہیں۔ وہ جیسے
جائے شہر، قصبے، محلے، قریئے سب پیچھے
رہ گئے ...... اتنے بڑے زمین داری کے
عوض آپ کو کیا ملا ؟ اندرون سندھ چند
مربعے (؟) وہ تو شاہنواز کی نوکری کی وجہ
سے پھر بھی ہمیں سہولت ہے ۔ ورنہ خدا جانے
ہمارا حشر کیا ہوتا۔"

سب کچھ کھو کر کچھ نہ پانے اور صرف نوکری پر گزارہ کرنے والی
کیفیت آج بھی ان لوگوں میں پائی جاتی ہے ۔ جو مہاجر کہلاتے
ہیں ۔

ملک کے تقسیم ہونے کا تعلق زینب اور آمنہ کو اس لئے
ہے کہ ان کو وطن سے بے وطن ہونا پڑا ۔ جائدادیں چھوڑ کر
امیر بے نوا ہو گئے ۔ اور بے ٹھکانہ لوگوں نے لاکھوں کی جائدادیں
الاٹ کروالیں ــــ دوسری طرف صوبہ سرحد میں پیدا ہونے
والی لڑکی سارہ بھی ایک طرح کی کسک اور قلق کا شکار ہے ۔ مصنفہ
کا کہنا ہے کہ :

"اب تو سبھی کچھ چھن گیا ۔ ساری وسعت، ہمالیہ کا نگینی
سب تنوع، تاج محل، لال قلعہ، دہلی اور لکھنؤ، ہمالیہ کی بیشتر
چوٹیاں شملہ مسوری، نینی تال بھی کے ساحل، ایلورا، اجنتا
کے غار، سب کچھ جو سارہ کا تھا اور اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔"

وہ سب چھین گیا پشاور سے کراچی تک کی
تنگ خاکیلے کا وہ خیال کرتی تو اسے لگتا
وہ محصور ہو گئی ہے"

حقیقت میں یہ ایک فطری تقاضہ ہے، زمین بھلے ہی تقسیم کر لی جائے، لیکن اس پر بسنے والوں کا جو تہذیبی و ثقافتی سرمایہ ہوتا ہے اور اس سے جو ذہنی اور جذباتی لگاؤ ہوتا ہے ان سے علیحدہ کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ اور یہ کیفیت دونوں ملکوں کے عوام میں پائی جاتی ہے۔ اس ناول میں پاکستان کے کئی اہم شہروں کا ذکر ملتا ہے۔ وہاں کی سوسائٹی، آب و ہوا، اور لوگوں کی معاشرتی زندگی سے متعلق بہت ہی عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ کراچی شہر سے متعلق چند سطریں ملاحظہ ہوں جن سے اس شہر کی طبقاتی زندگی کا بھرپور نقشہ ہمارے سامنے ابھر کر آتا ہے:

"کراچی میں اللہ کوئی ایسا مرکز نہ تھا جس کے
گرد شہر کی ثقافتی زندگی گھومتی ہو، نہ
ہی کوئی ایسا مضبوط ثقافتی گروہ تھا جس
کی طرز زندگی کے دوسرے سب زیر اثر رہیں
آبادی رنگا رنگ تھی، بہاری، بنگالی،
لکھنوی، دہلوی، الہ آبادی، حیدرآبادی
پنجابی، پٹھان، بمبئی، میمن، پارسی، بلوچ
سندھی سبھی یہاں موجود تھے، اور اپنے
اپنے مخصوص مزاج کے مطابق زندگی بسر
کر رہے تھے، مقامی، مہاجر کی تخصیص موجود
تھی، اور اقتصادی طبقات کی، چنانچہ کلفٹن
باتھ آئی لینڈ، اور مختلف سوسائٹیز میں
متمول، اور اونچے اور متوسط درجے کے
لوگ رہتے تھے، جبکہ ناظم آباد، لالوکھیت
پیر الٰہی بخش کالونی، اور دوسرے اس قسم کے
کے مضافات میں متوسط اور نچلے متوسط
طبقے کے لوگ رہتے تھے، لیکن محنت کشوں
کے تمدن کے آثار شہر بھر میں پھیلے ہوئے تھے"

ناول کے درمیان کئی ابواب ایسے ہیں جو سارہ اور ثمر کے انگلینڈ اور امریکہ کے سفر پر مشتمل ہیں۔ ان کو اگر ناول سے الگ کر لیا جائے تو وہ ایک ذہین اور حساس مصنف کے سفرنامے کا مزہ دیتے ہیں جن میں مختلف طرح کی جزئیات کا بیان اور ہر طرح کے لوگوں کی ذہنیت ان کے عادات و اطوار ساتھ ہی ساتھ ان کی زندگی نیز سفر کی زندگی سے متعلق حقیقت پر مبنی تنقید بھی ملتی ہے۔ انگلینڈ سے متعلق مصنف کے تاثرات چند سطروں میں ملاحظہ ہوں۔

"بیسویں صدی کے انگلینڈ میں چند ماہ گزار
کر سارہ کو اس ٹھوس حقیقت کا احساس
ہوا کہ آج کی دنیا بدوؤں کی دنیا نہیں۔
بلکہ نقشوں کی لکیروں میں جکڑی ہوئی،
خانوں میں تقسیم قومیتوں کا مجموعہ ہے۔ جہاں
آپ کا پیدائشی وطن آپ کے گلے میں شناختی
پٹے کی طرح سجا لیا جاتا ہے۔ اور اپنی تاریخ
و جغرافیہ میں قید آپ کوڑھی کی گھنٹی کی طرح
دونوں کو ساتھ ساتھ بجاتے ہیں بیسویں
صدی کے کرۂ ارض پر فرد صرف اپنے اعمال
و اطوار کا ہی ذمہ دار نہیں۔ بلکہ اپنے گروہ
ہم وطنوں کے اعمال کا بھی ذمہ دار گردانا جاتا
ہے"

اس ٹھوس حقیقت سے آج شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ ملک کی سیاست سے متعلق بھی کہیں کہیں چند سطریں ملتی ہیں۔ مثلاً جنرل ایوب خاں سے پہلے ایک مرتبہ ہونے والا انتخاب پھر ۶۵ء کی ہندو پاک جنگ اور تاشقند معاہدہ وغیرہ اور

منفہ کا یہ سوال کہ :

"بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی طرزِ فکر یا
کوئی طرزِ حکومت اکثریت کی مرضی کے بغیر
ملک پر اوپر سے مسلط کر دیا جائے" ؟

لیے ایسا سوال ہے جو کل تھا اور آج بھی ہے۔

آخر میں ناول نگار کے چند جملے توجہ طلب ہیں۔ جو کہ
بقت پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد ہی یہ ناول اپنی آخری منزل
قریب پہونچتا ہے۔ مری سمجھ سے یہ جدید دور کی واضح تصویر
پورے ناول کا حاصل ہے۔

بلاشبہ شیطان بہت طاقت ور ہو گیا
ہے۔ اور شر کی قوتیں خیر کی قوتوں پر
حاوی ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ لیکن تہہ میں
اگر انصاف کی تلاش جاری ہے تو پھر کیا کلام
کہ جیت بالآخر خیر کی قوتوں کی ہو۔ ایک
طرف بیسویں صدی خود غرضی، ننگی طاقت
استحصال کی صدی ہے تو دوسری طرف
یہ بے درد حقائق، بے پناہ سچائی، اور
بے پناہ تنہائی، بے پناہ دیانت کی بھی
صدی ہے"

بیشی ان ہی کیفیات کی کشمکش پورے ناول میں دیکھنے
تی ہے۔

دوسرا ناول "دیوار کے پیچھے" مارچ ۱۹۸۰ء میں
شائع ہوا۔ اس کے مصنف آنیس ناگی ہیں۔ یہ ناول
ایسے شخص کی داستانِ حیات ہے۔ جس کی گھریلو زندگی
لے کر سماجی اور شہری زندگی تک تلخی ہی تلخی ہے۔ جو اپنی
ب چھوٹی بڑی بات نہایت ہی صاف واضح اور بے تکلفی
ہ میں بیان کرتا ہے۔ اپنے گھر، خاندان، دوست، احباب

میز وہ خود اپنی کسی برائی پر پردہ نہیں ڈالتا۔ بلکہ تمام واقعات
جیسے جیسے سامنے آتے ہیں، سناتا چلا جاتا ہے۔ ایک بات
سے دوسری بات سلسلہ وار نکلتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح
سے کبھی وہ آج کی بات کرتے ہوئے کل کی باتیں کرنے لگتا ہے۔
کبھی یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کے بعد کل کیا ہو سکتا ہے۔ اس
کو آس بھی ہے۔ یاس بھی ہے۔ خوف و خدشہ بھی ہے،
اور وہ اس سے دور بھی ہے۔ وہ اگر کوئی جرم کرتا ہے۔ تو
اس سے منکر نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے اس جرم کا احساس بھی ہے
وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔
لیکن واقعات اور حالات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس
شخص کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اس کے خاندان میں، اس کی ماں، دو بھائی، امجد
اور رشید، امجد کی بیوی شمیم اور دو بچے، ان کے علاوہ
دو بہنیں کوثر اور رضیہ ہیں۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ
ناول کے شروع میں ہی لگ جاتا ہے۔ جبکہ اس کو کالج کی
ملازمت سے اس الزام کے تحت نکال دیا جاتا ہے کہ وہ ایک
مشتبہ اور خوفناک قسم کا آدمی ہے۔ وہ لڑکوں کو بھڑکاتا
ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ وہ کمیونسٹ ہے
یہی اس کا جرم ہے جس سے وہ شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے
لوگ اس کو سُرخا کہتے ہیں۔ ملازمت سے نکالے جانے کے بعد
وہ بیکاری اور بے سروسامانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ
اپنے گھر والوں اور سماج کی نظروں میں ملزم ہے۔ اس سے
اس کا ذہن داخلی اور خارجی دونوں طرف سے انتشار میں مبتلا
ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گھر کی حالت کا بیان یوں کرتا ہے:

اس وقت میرے گھر میں وہی طوائف الملوکی
ہے۔ جو آمریت کے خاتمے پر ہوتی ہے۔
.... آپ کی وفات کے بعد جو نقشہ
میرے گھر میں ہے۔ اسی کا عکس باہر کا تھا

میں نظر آتا ہے .... دراصل میرا گھر
ایک نفسیاتی کلینک کی مانند ہے۔ سب
ایک دوسرے سے تنگ بجنگ، زود مشتعل
اور ایک دوسرے کی ضرورتوں سے لاتعلق، ہر
ایک دوسرے کو اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار
متصور کرتا ہے۔"

وہ دیکھتا ہے کہ اس سماج کا ایک بھی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی حالت پر مطمئن ہو، اگر کسی کے پاس تھوڑا ہے تو وہ زیادہ کی خواہش رکھتا ہے۔ زیادہ رکھنے والا اس سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔ قناعت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک انسان ہونے کے ناطے اس کی بھی کچھ فطری خواہشیں ہیں لیکن اس کو ان سے محروم کیا جارہا ہے۔ ایسا کرنے والا بھی انسان ہیں اور دونوں ایک ہی زمین پر بستے ہیں۔ اس لئے اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ وہ اس زمین سے شکایت کرتا ہے۔ جس پر ناانصافی، نابرابری، اور ظلم و زیادتی عام ہے۔ جہاں انسان اور انسان میں فرق کیا جاتا ہے۔ نوکری سے برخاست کئے جانے کے بعد کئی دنوں تک جگہ جگہ مارے مارے پھرتے رہنے کوئی راستہ نظر نہ آنے کے بعد مجبوراً وہ اپنے دوستوں اور شناساؤں کے پاس جاتا ہے۔ لیکن ہر جگہ سے مایوس لوٹتا ہے۔ وہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، لوگوں سے ملتے جلتے ہر وقت نہ صرف ایک ایک نکتے پر غور و فکر کرتے رہتا ہے بلکہ اپنے آپ سے باتیں بھی کرتا رہتا ہے۔ اس طرح مصنف نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ قاری کو ان تمام جزئیات کے بیان میں اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے۔ جن کا ذکر وہ کرنا چاہتا ہے۔ اس مرکزی کردار کی خود کلامی ہی ہمارے لئے تمام بیانات جو اس سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے دیکھنے سمجھنے اور محسوس کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ ناول کا قاری دلچسپی کے ساتھ اس کے ہر سفر میں شریک رہتا ہے

شہر کی مصروف ترین زندگی جو کہ بھیڑ بھاڑ، شور شرابے سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں ہر طرف انسانوں کا ایک سیلاب نظر آتا ہے۔ لیکن اس شہر میں کوئی کسی کا پرسان حال، بہی خواہ اور مددگار نہیں دکھائی پڑتا۔ مفاد پرستی عام ہے۔ انسانوں کا انسانوں سے لاعلمی، لاتعلقی اور اجنبیت نے اس قدر بدگمانی پیدا کر دی ہے۔ کہ ان کے ظاہری بھلے فریب معلوم ہوتے ہیں اس نے ان کی شناخت کو ختم کر دیا ہے۔ ناول کا ہیرو پروفیسر ایسے لوگوں کے درمیان رہنے سے ڈرتا ہے۔ وہ نہایت ہی صاف اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ:

"اب اس شہر کے لوگ چھوٹے چھوٹے مفادات
کی خاطر ایسے کمینے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ
اپنے انسان ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے"

یہی وجہ ہے کہ وہ اس بھرے ہوئے شہر میں خود کو بالکل اکیلا محسوس کرتا ہے۔ آگے چل کر مصنف اپنے شہر کی تصویر نہایت ہی دلچسپ، پُراثر اور حقیقی انداز میں پیش کرتا ہے:

ہر طرف قدموں کی کھٹ کھٹ، ہر طرف
موٹروں، ٹیکسیوں، رکشوں، اور بسوں
کی گھوں گھوں .... شور ہی شور اور
عجیب طرح کی بے ترتیبی کا غیر مترنم آہنگ
ہر طرف کالے سفید اور گنجے سروں کا لامتناہی
سلسلہ، ہر ایک عجلت میں ہے ....
نفسا نفسی کا عالم، یہ شہر بھی خاندانی بہروپیا
ہے۔ ہر موسم میں چڑھتے سورج کو سلام
کرتا ہے .... اس شہر کے دو چہرے
ہیں، ایک عفونت، غربت اور پستی میں
جکڑا ہوا ہے۔ اور دوسرا نئے تمدن کی
تصویر .... دیکھتے ہی دیکھتے ایک
شہر میں دو شہر بس گئے ہیں۔ نیا شہر پرانے

شہر کا عوامی تجزیہ ہے۔ "سب نسب مشکوک،
نہ سر نہ پاؤں .... ہر طرف ہجوم ہی
ہجوم ہے۔ مگر رونق نہیں ہے۔ اس شہر
میں عظمت نہیں، امان نہیں، محض طمع اور
سفلہ پن ہے"

یہ نہ صرف ایک شہر کا نقشہ ہے، بلکہ اس میں بسنے والے لوگوں کی خصوصیات کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہے جب اس کو اس شہر میں روزی کمانے اور زندگی گزارنے کا کوئی ذریعہ ہاتھ نہیں آتا، تو پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایسے لوگوں کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ جن کا کام استحصال اور لوٹ مار ہوتا ہے۔ احمد، چودھری، ملک مقبول وغیرہ ایسے لوگ ہیں جن کا کام اپنے علاقوں میں سیدھے سادے لوگوں کو لوٹنا، بے گناہوں کو ملزم بنانا، ان کو غلط مقدموں میں پھنسا اپنے ذاتی قید خانوں میں اپنے سپاہیوں اور کارندوں کے ذریعے سزائیں دلوا کر جرم قبول کرانا ہے۔ حقیقت میں یہ پاکستان کی اس سوسائٹی کے ترجمان ہیں، جو جرائم پیشہ ہیں اور اپنے اپنے علاقوں میں خود مختاری اور آزادی کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ طرح طرح کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ اور جوا شراب وغیرہ ان کے تفریحی مشاغل ہیں۔ ناول میں پروفیسر بھی ملک مقبول، چودھری، اور احمد وغیرہ کے لئے کام کرنے کو مجبور ہے۔ وہ کچہری میں ان دیکھے واقعات میں پھنسے ہوئے لوگوں کی شناخت کرتا ہے۔ ان کے خلاف شہادتیں دیتا ہے جس کے عوض اسے کچھ روپے مل جاتے ہیں۔ ایسا کرنے کو وہ اس لئے مجبور ہے کہ اس کے بھائیوں نے کنارہ کشی کر لی ہے۔ اس کی بہن رضیہ بیمار ہے۔ مکان کی قسطیں اس کو ادا کرنی ہے۔ چھوٹی بہن کی شادی کرنی ہے۔ یہ آجکل کے عوامی مسائل ہیں۔ جن سے اکثریت دوچار ہے۔ پھر اس کردار کے ساتھ جو مصیبتیں ہیں ان میں اضافہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ وہ شہر میں کھلے عام چل بھی نہیں سکتا۔ سب کی نظروں میں وہ مشتبہ ہے۔ اور ہر وقت اس کی نگرانی ہوتی رہتی ہے۔ اس کو اس گروہ کے ساتھ اس لئے رہنا ہے کہ وہ ان کے درمیان اپنے آپ کو محفوظ پاتا ہے۔ آخر میں وہ جب ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہیں آنا جانا بند کر دیتا ہے تو اس کے خلاف جو سازش چل رہی ہوتی ہے، وہ مکمل ہو جاتی ہے۔ وہ جس کو اپنا دوست سمجھ کر چلتا ہے وہی اس کا دشمن نکلتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ختم کر لینا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

"میں نے دوغلی حقیقت کا آخری روپ
دیکھ لیا ہے .... میں دوغلی حقیقت
کا دوبارہ بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتا
جھوٹ بول بول کر میری زبان پر چھالے
پڑ چکے ہیں۔ یہ میری نہیں اس عہد کی شکست
ہے، میں اپنا خمیازہ ہوں، یقیناً میرے
زمانے کو مجھ جیسے شخص کی ضرورت نہیں"

حقیقت میں یہ ناول اس سماج کی جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں آدمی کی زندگی بے بسی اور بے کسی کے جال میں جکڑی ہوئی ہے۔ جس میں زیادہ تر لوگ اپنے مفاد کے لئے جی رہے ہیں۔ جو پریشان حال ہے وہ اور پریشان ہو رہا ہے اور جو خوشحال ہے وہ اپنی خوشحالی میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ آخر میں مصنف کے چند جملے اور دیکھتے چلیں:

" اولاد بڑھ گئی ہے، اور جیب سکڑ گئی
ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ پریشان ہے۔ جو
خوشحال ہے وہ پریشان حال سے لاتعلق
یہی نظام زیست ہے، اور اس کی تبدیلی
کے بے شمار نسخے ہیں۔ لیکن مجھے ان سے
زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میں ایک خود غرض

معاشرے کا باشندہ ہوں۔ جس کی سوچ صرف
اپنی ذات تک ہے۔ مجھے دوسروں سے صرف
اس حد تک دلچسپی ہے کہ وہ مجھے کس حد تک
فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔"
حقیقت میں یہی آج کے انسان کا مزاج بن چکا ہے۔

۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والا اس سلسلہ کا تیسرا ناول جناب امتیاز علی کا "پاگل خانہ" ہے۔ جس کا موضوع جدید سائنسی ایجادات اور اس سے ہونے والے ہلاکت خیز نتائج ہیں جو کہ بالکل نیا اور اہم موضوع ہے۔ اس ناول کی مصنفہ سائنس کی افادیت سے انکار نہیں کرتیں۔ کیونکہ اس نے انسانی زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کی ایجادوں سے آج کا انسان بے شمار فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن جناب امتیاز علی کا کہنا ہے کہ اس کا دوسرا رخ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انسان اور کائنات کی تباہی کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنے اس ناول کے ذریعہ اسی مسئلے پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اس طرح یہ عام ناولوں سے بالکل الگ منفرد قسم کا ناول ہے۔

ان کے اس ناول کا کردار کم و بیش وہی ہیں۔ جو اکثر ان کے افسانوں میں آتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر گار، شوشو ئی، جو فلسفہ کی طالبہ اور ایک نفسیاتی مریضہ، روحی جو کہ خود مصنفہ ہیں اور اپنے تلاش امن کے سفر کی روئداد بیان کرتی ہیں۔ وہ ایک ماہر نفسیات بھی ہیں۔ اور شوشو ئی کا نفسیاتی مطالعہ کرتی رہتی ہیں۔ اس طرح سے اس ناول میں سائنس، تخریب کاریوں، اور ناول کے کرداروں کا بہت نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنا سفر جہاز کے ذریعہ شروع کرتی ہیں۔ اور یہیں سے آج کے سفر کے اچھا اور برے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتی ہیں۔ مثلاً جہاز کا سفر کتنا آرام دہ ہے۔ اور اگر خدانخواستہ جہاز اغوا کر لیا جائے تب کیا حالت ہوتی ہے؟ وہ جاننا چاہتی ہیں کہ جہاز کا اغوا کیوں ہوتا ہے؟ آج کے ترقی یافتہ سماج میں جرائم کی کثرت ہے۔ قتل کر دینا، عمارت کو نذر آتش کر دینا۔ دن دہاڑے بھرے بازار میں فائرنگ، کسی کو یرغمال بنا لینا، معصوم بچوں کو اغوا کر لینا، وغیرہ اس سماج میں ہونے والی بالکل معمولی اور غیر اہم باتیں ہو گئی ہیں۔ مصنفہ ناول کی کہانی کے ذریعہ بڑے دلچسپ انداز میں اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ہماری زندگی کے ہر شعبے میں کیمیاوی اجزا کا استعمال ایک ضرورت بن کر رہ گیا ہے۔ روزانہ استعمال کی چیزیں بنانے کے لئے فیکٹریوں کی تعمیر، کھیتی کیلئے کیمیاوی کھاد اور کیڑے مار دواؤں کا استعمال، ایٹمی تجربات اور دھماکے، جو کہ آج دنیا، دنیا کے بیشتر ممالک اپنی حفاظت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس میدان میں سب ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ سبھی چیزیں اس دور میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے مہلک بیان کا اثرات بھی مصنفہ نے ڈاکٹر گار کی زبانی کیا ہے۔

"انسان کے تحفظ کے لئے زمین کے گرد لپٹی
ہوئی آکسیجن گیس کی تہہ کمزور پڑتی جا رہی
ہے۔ اور ہم براہ راست تابکاری کی لپیٹ
میں آ رہے ہیں۔ پیچیدہ جلدی امراض اور
کینسر بھی عام ہوتی جا رہی ہے۔ موسم بے قابو
ہو چلے ہیں۔ موسموں کی جو بے اعتدالیوں کے
اثرات انسانی ذہن اور صحت پر پڑ
سکتے ہیں۔ انہیں عام آدمی قابل اعتنا
نہیں سمجھتا، مگر وہ اہل نظر کے لئے اظہر من
الشمس ہیں"

نیوٹران بم کی تباہ کاری سے اگرچہ آج کی دنیا کے بہت سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں، لیکن اس کی خوفناک تصویر اس ناول میں جس طرح پیش کی گئی ہے، اس کو پڑھ کر

عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ واقعہ ابھی گزر
چکا ہے۔ اور ناول کے کرداروں کے ساتھ ساتھ ہم بھی اس
کے اثرات ایک طرف سے دیکھتے چلے جا رہے ہیں۔ جہاں تمام
شہر اپنی جملہ آرائش و زیبائش کے ساتھ موجود ہے۔
اور ضروریات کی تمام بے جان چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن
شہر جانداروں کی جگہ مردہ خانوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔
ایک چھوٹی سی مثال دیکھئے۔

"کرۂ ارض پر لاکھوں دفعہ رات اتری ہوگی
—— مگر جیسی عجوبہ رات ہم نے اس
خطۂ زمین پر دیکھی —— وہ کسی نے
نہ دیکھی ہوگی۔ نہایت اہتمام اور شان اور
شکوہ سے آراستہ طویل الیوان۔ بیش
قیمت قالینیں، مخملیں کرسیاں، منقش
مزین اور چھت پر بڑے بڑے جھاڑ فانوس
ان رنگین فانوسوں کے نیچے اور بیش قیمت
قالینوں کے اوپر بے شمار مردوں اور
عورتوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔"

اسی ناول کے آخر میں سائنس کی ایک
اور حیرت انگیز اور دلچسپ ایجاد کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ
نہ ہوگا۔ جس کی طرف اس ناول میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ
جب سائنس داں ایسے آدمیوں کی تخلیق کرنے لگیں گے۔ جو
کہ بجلی کے ذریعہ وہ سبھی کام کریں گے۔ جو ایک انسان کرتا ہے
اس ناول میں ڈاکٹر میم اس طرح کے تیرہ آدمی بناتے ہیں۔ اس میں
سے ایک نمبر ۱۳ مکمل آدمی بنتا ہے۔ اور وہ ڈاکٹر میم کے باورچی
خانے میں ان کی بیگم کے ساتھ کھانا پکانے میں ہاتھ بٹاتا ہے۔
لیکن اس میں ایک فنی غلطی ہو جاتی ہے۔ اور وہ انڈا تلنے کے
بعد بچا ہوا گھی کڑھائی میں انڈیلنے اور کڑھائی دھونے کے
بجائے گرم گرم گھی ڈاکٹر کی بیگم کے چہرے پر انڈیل دیتا ہے

اس طرح سے اس کا انجام پر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک
سوال بھی پیدا کرتا ہے جو کہ مصنف نے ڈاکٹر کی بیگم کی زبانی کیا
ہے۔ یعنی:

"اگر وہ کسی فنی غلطی سے مجھے اٹھا کر آگ
میں ڈال دیتا تو ——؟"

یہ اور اس طرح کے بہت سے نقصانات دہ اقدام ہو سکتے ہیں
اور پھر جب ان مشینی آدمیوں کی بہتات ہو جائے گی۔ تو ان
کے ذریعہ جرائم بھی بڑھ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس سے قتل بھی
کرایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے پکڑے جانے پر بھی کیا ہو
سکتا ہے۔؟ یہ سبھی باتیں عمدہ افسانوی انداز میں بیان کی گئی
ہیں۔ یہ ناول نہایت ہی دلچسپ اور حقائق پر مبنی ہے۔ جس
کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا واقعی ایک پاگل خانہ
ہے۔ جس کا ہر فرد اپنے اپنے اعمال و افعال اور انجام سے بے
خبر ہے۔

اس طرح سے یہ ناول تلاش امن کا خیالی سفر ہی نہیں
بلکہ نہایت ہی نازک اور خطرناک موڑ پر پہونچی ہوئی اس نئی دنیا
کی تصویر ہے۔ ناول کے ابتدا میں مصنف کا نوٹ اس بات
کی تصدیق کرتا ہے:

"اس کتاب کا نام "پاگل خانہ" ہے۔ سوچ کر
رکھا اور اس میں جو کچھ لکھا یہ محض میرے
ذہنی اختراعات اور شاعرانہ تصورات کا
نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ میری اور آپ کی بدقسمتی
سے ٹھوس اور عبرت ناک حقائق کا نچوڑ
اور سخت محنت اور گہری تحقیقات کا
نتیجہ ہے"

ان ناولوں کے علاوہ کچھ اور ناول ۱۹۸۰ء میں
پاکستان میں شائع ہوئے۔ یہ ناول بھی پاکستان میں قدر کی
نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور اپنے موضوع و مواد کے

بقیہ صفحہ ۴۳ پر

تاج پیامی (آرہ)

مزاحیہ شاعری کی خصوصیت اور اہمیت

طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی بھی اپنی ایک روایت ہے
یورپ کا ادب ہو، یا ہند کا اردو ادب۔ یورپ کی ادبیات میں
ہوریس (HORACE) کوپر (COWPER) ڈرائیڈن
(DRYDEN) وغیرہ کی شاعری میں طنز و مزاح ہلکا، پھلکا اور
لطیف ہوتا جبکہ لوسیئس (LUCIUS) جووینل (JUVENAL) - مارسٹن (MARSTON) ہال (HALL)
پوپ (POPE) وغیرہ کی ہجویات سے نفرت، غصے اور تلخی کا
اظہار ہوتا ہے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح کے سرسری جائزہ ہم اکبر الہ
آبادی، اقبال، دلاور فگار، رضا نقوی واہی، وغیرہ کو پہلے
گروپ میں، سودا، کسی حد تک نظیر اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی،
تیر آروی وغیرہ کو دوسرے گروپ میں رکھ سکتے ہیں۔

مزاحیہ شاعری کو ہمیشہ دوسرے درجہ کی شاعری سمجھا
گیا۔ انگریزی زبان کے ایک مشہور ناقد میتھو آرنلڈ، چوسر
(CHAUCER) کی شاعری کی تعریف تو کرتا ہے۔ مگر چونکہ چوسر
کی شاعری میں نمایاں عنصر مزاح کا ہے۔ اس لئے آرنلڈ کو چوسر
کے یہاں HIGH SERIOUSNESS کی سخت کمی محسوس
ہوتی ہے۔ جو آرنلڈ کے نزدیک کسی بزرگ سنجیدہ شاعری کا طرۂ
امتیاز ہے۔ یہی میتھو آرنلڈ شاعری کی تنقید حیات سے تعبیر کرتا ہے
مزاحیہ شاعری میں اس کی گنجائش اور بھی زیادہ ہے۔ طنزیہ اور

مزاحیہ شاعری پُرخلوص تنقید حیات ہے جس میں تلخی اور شیرینی
کی لطیف آمیزش ہوتی ہے۔ مزاحیہ شاعری کی بھی اپنی جگہ
وہی اہمیت ہے جو سنجیدہ شاعری کی ہے۔ دنیا کے بیشتر بزرگ
شعرا نے اپنے بعض افکار کے اظہار کے لئے طنزیہ اور مزاحیہ
شاعری کا سہارا لیا۔ مثلاً شکسپیر، غالب، نظیر اکبرآبادی، اقبال
وغیرہ،

انگریزی ادب میں ڈرائیڈن اور پوپ کے بعد طنزیہ
اور مزاحیہ شاعری کی روایت آگے نہ بڑھ سکی۔ ڈرامے
اور مضامین میں طنز و مزاح تو ملتا ہے۔ لیکن انگریزی شاعری میں
ڈرائیڈن اور پوپ کے درجہ کا ایک بھی طنزیہ یا مزاحیہ شاعر
پیدا نہ ہوا۔ لیکن اردو شاعری میں، سودا، نظیر اکبرآبادی،
اور اکبر الہ آبادی کے بعد بھی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی روایت
قائم رکھی گئی۔ اقبال جو بیسویں صدی میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر
گزرا ہے۔ اس نے بھی مزاحیہ شاعری کی روایت کو جاری رکھا
یہ سوال قطعی غیر متعلق ہے کہ اقبال نے مزاحیہ شاعری میں اکبر
پر اضافہ کیا یا نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اقبال جیسے مفکر شاعر
نے بھی مزاحیہ شاعری کی اہمیت کو سمجھا۔ اور اپنے بعض افکار کے
اظہار کے لئے اس کا سہارا لیا۔ مثلاً اکبر مغربی نظام تعلیم کو جو
اس وقت کالجوں میں دی جا رہی تھی۔ خاموش نسل کشی کے
مترادف سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور اقبال کہتے ہیں ؎

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم !!!!
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

بہرکیف، اکبر اور اقبال کے مزاحیہ شاعری میں بنیادی فرق ہنگامی اور دائمی شاعری کا ہے۔ اکبر نے وقتی موضوعات پر طنز و مزاح کے تیر چلائے، جبکہ اقبال نے بنیادی اصولوں پر ظریفانہ شاعری کے نشتر چلائے، مثلاً اکبر کہتے ہیں ؎

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہی کہ گویا آب زم زم مئے میں داخل ہے

اور اقبال کہتے ہیں ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

اکبر اور اقبال کی شاعری کے اس پہلو سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری دوئم درجہ کی شاعری نہیں اس کا بھی ادب عالیہ میں وہی مقام ہے جو ایک بزرگ سنجیدہ شاعری کا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شکسپیر اپنے ڈراموں میں اور غالب اپنی غزلوں میں انہیں جگہ نہ دیتے۔ سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری دونوں جذبات اور احساسات کے ذریعہ اظہار ہیں۔

شکسپیر اپنے عظیم المیہ ڈرامہ کنگ لیر میں دکھلانا چاہتا ہے کہ انسان اگر ظلم پر اتر آئے تو وہ حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ کنگ لیر کی بیٹیاں اپنے باپ کے ساتھ جس ظلم و ستم کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ حیوان بھی حیوان کے ساتھ روا نہیں رکھتے۔ اسی ڈرامہ میں ایک مسخرہ (FOOL) کا کردار بھی ہے۔ جو اپنے مسخرہ پن سے لوگوں کو ہنساتا بھی ہے، اور کبھی کبھی بڑے پتہ کی بات بھی کہہ جاتا ہے۔ کنگ لیر کے ساتھ اس کی بیٹیوں کی ناروا سلوک کے پیش نظر جب مسخرہ کہتا ہے

"جب سے آپ نے اپنا بیٹیوں کو اپنی ماں بنا لیا ہے"

تو اس جملہ سے شکسپیر نے بیک وقت طنز و مزاح دونوں سے کام لیتے ہیں۔ طنز کنگ لیر کے لئے اور مزاح سامعین کے لئے۔

غالب ایک جگہ کہتا ہے ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اور دوسری جگہ کہتا ہے ؎

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

پہلا شعر سراپا غم و اندوہ کا ترجمان ہے۔ بلکہ اس سے قنوطیت بھی ٹپکتی ہے۔ جبکہ دوسرے شعر میں طنز بھی ہے۔ اور مزاح بھی، یہ واعظ پر بھرپور طنز ہے۔ واعظ جو مے نوشی یا جن غلط باتوں سے روکتا ہے۔ اگر خود وہی اس قسم کی حرکتیں کرنے لگے تو صورت بڑی مضحکہ خیز ہو جائے گی۔ واعظ کی ریاکاری پر شاعر کا یہ طنز ایک طرح کا احتجاج ہے۔ معاشرہ میں وہ لوگ جو رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ رہنما مذہبی ہوں، یا سیاسی، اگر اپنے قول سے پھر جائیں تو ان پر شاعر کا طنز احتجاج کا مترادف ہے۔

نظیر اکبرآبادی جو اپنی نظم بنجارہ نامہ میں زندگی کے بے ثباتی پر عبرت انگیز خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہی آدمی نامہ میں آدمی کے مختلف کردار کو طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ہم مذکورہ باتوں سے دو نتیجے اخذ کرتے ہیں اول یہ کہ مزاحیہ شاعری بھی سنجیدہ شاعری کے برابر درجہ رکھتی ہے۔ دوئم کوئی شاعر فطری ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ فطری طور پر سنجیدہ یا غیر سنجیدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی اور ماحول کے مطابق جس قسم کے خیالات و جذبات اس کے ذہن و دل میں پیدا ہوتے ہیں، سنجیدہ یا غیر سنجیدہ۔ انہیں وہ بڑے خلوص کے ساتھ پیش

کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکسپیئر، غالب، نظیر اکبر آبادی، اقبال وغیرہ کے یہاں دونوں طرح کے خیالات و جذبات پائے جاتے ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے۔ کہ شاعر اظہار خیال کے لئے جسے مناسب سمجھتا ہے اس پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شاعر طنزیہ یا مزاحیہ شاعری کیوں کرتا ہے؟

ابھی میں نے کہا ہے کہ ایک فطری شاعر سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں قسم کی شاعری پر قادر ہوتا ہے۔ لیکن وہ جسے اظہار خیال کے لئے مناسب سمجھتا ہے۔ اس پر زیادہ توجہ دیتا ہے مگر کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔

فضل الرحمن اپنے مضمون "فلسفۂ برگسوں" میں کہتے ہیں:-

> "اعلیٰ ہجو میں شاعر ہمیشہ خود کو مصلح قرار دیکر اخلاق کی بہبود کا دعویٰ دار ہوتا ہے لیکن نظر تجسس سے دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہوگی کہ شاعر کو دراصل اصلاح کی کوئی ایسی دھن نہیں ہوتی۔ اگر کوئی معاشرت بالکل ابھی زندہ کامل ہو جائے، انسان سمجھدار متین، لائق و فائق ہو جائے تو ہجوگو کی موجودگی سوسائٹی میں بالکل بے معنی ہو جائے، لیکن کوئی شخص اپنی ہلاکت کا خواستگار نہیں ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل اس طرح کا شاعر چاہتا ہے کہ دنیا میں چند بے وقوف لوگ رہیں۔ اور معاشرتی نقائص موجود رہیں۔ تاکہ وہ اپنی فراست اور مصوری کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکے"

طنزیہ یا مزاحیہ شاعری کے لئے یہ مفروضہ قطعی غلط ہے۔ دنیا کا کوئی شاعر نہیں چاہتا۔ (اگر واقعی وہ شاعر ہے) کہ دنیا احمقوں کی قیام گاہ ہو۔ وہ ان پر طنز کرے، اور ان کی حماقت پر خوش ہو۔ اگر دنیا سے برائیاں، خامیاں، کوڑھ پن، اور حماقتیں ختم ہو جائیں۔ تو اس سے شاعر کی موت واقع نہیں ہو جائے گی کیونکہ ان کے ختم ہونے پر ان کی جگہ حسین اور خوشنما چیزیں لے لیں گی۔ جنھیں دیکھ کر شاعر خوشی و طمانیت محسوس کرے گا۔ ایک شاعر کو اپنی فراست اور مصوری کا نمونہ پیش کرنے کے لئے ہزاروں موضوعات ہیں۔

"سو جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے"

شاعر حسن کا دلدادہ ہوتا ہے۔ اور صرف حسن ہی اکیلے ایک ایسا موضوع ہے۔ جس کے کوائف پر دنیا کے تقریباً سارے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اب تک ایک بھی شاعر اس کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنے سے کماحقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکا ہے شکسپیر اور غالب بھی نہیں۔

فضل الرحمن کا یہ مفروضہ برگسوں کے اس خیال کے خلاف ہے۔ جس میں وہ اپنی تصنیف LE MIRE پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے:

> "ہنسی کی ایک وجہ غیر معقولیت ہے اس طرح غیر معقولیت پر اپنی دانائی کا اظہار بھی برگسوں کے مطابق مزاح کا تعلق براہ راست ذہانت سے ہے"۔

ایک مزاحیہ شاعر کسی فرد کی حماقت اور نامعقولیت پر یقیناً ہنستا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی حماقت یا نامعقولیت قائم رہے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کی حماقت اور نامعقولیت دور ہو جائے، تاکہ معاشرہ میں ان کی موجودگی سے جو کوڑھ پن پیدا ہو گیا ہے نہ رہے۔ فضل الرحمن کا مفروضہ انگریزی زبان کے مشہور ناقد اور ہجو نگار (SATIRIST) ڈرائیڈن (DRYDEN) کے اس قول کے بھی خلاف ہے

جس میں وہ کہتا ہے:

"THE TRUE AND OF SATIRE
IS THE AMENDMENT OF
VIEES BY CORRECTION AND
HE WHO WRITES HONEST-
LY IS NO MORE AN ENEMY
TO THE OFFENDER THE THAN
PHYSICIAN TO THE PATI-
ENT WHEN HE PRESCRI-
BBS HARSH REMEDIES
TO AN INEVITABLE DI-
SEASE"

ڈرائیڈن کے نزدیک ہجو کا مقصد ہی برائیوں کو دور کرنا ہے ہجو نگار کا کام اذیت پہونچانا نہیں۔ بلکہ ڈاکٹر کی طرح ہے جو بیماریوں کو دور کرنے کے لئے تلخ دوائیاں تجویز کرتا ہے۔

اگر فضل الرحمٰن کے مفروضہ کو مان لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ ڈاکٹر کا کام مریض کو اچھا کرنا نہیں۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں مریض رہیں۔ تاکہ وہ زندہ رہ سکے اور یہ بات ڈاکٹر کے پیشہ پر بہت بڑا طنز ہوگا۔ مزاحیہ شاعر یا ڈاکٹر بڑے خلوص سے چاہتے ہیں کہ دنیا میں برائیاں اور بیماریاں نہ رہیں۔ لیکن دنیا کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ انسان برائیوں کا بھی مرتکب ہوگا۔ اور وہ بیمار بھی پڑے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مزاحیہ شاعر کبھی نہیں چاہتا کہ دنیا میں چند احمق اور نامعقول لوگ رہیں۔ اور نہ ایک ڈاکٹر چاہتا ہے کہ دنیا مریضوں کی قیام گاہ بنی رہے۔ جہاں تک دونوں کے زندہ رہنے کا تعلق ہے اگر برائیاں اور بیماریاں نہ ہوں تو وہ زندہ رہنے کے لئے دوسرا طریقہ یا پیشہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہئے۔ کہ وہ دنیا سے برائیوں اور بیماریوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ برائیوں یا نامعقولیت کی وجہ سے مزاحیہ شاعر تنگ نہیں بلکہ دنیا میں پھیلی ہوئی برائیاں یا نامعقولیت دیکھ کر اسے طنزیہ یا مزاحیہ انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایک مزاحیہ شاعر اپنی شاعری میں حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ اور حقیقت تلخ ہوتی ہے۔ مزاحیہ شاعر حقیقت کی تلخی کو کم کرنے کے لئے مزاحیہ انداز بیان سے کام لیتا ہے۔ تاکہ بات ناگوار نہ گزرے۔ بلکہ لطف محسوس ہو۔

اور پوپ کا ہجو کے بارے میں قول ہے:

"O SACRED WEAPON
LEFT FOR TRUTH DEF-
ENCE"

پوپ ہجو کو ایک متبرک ہتھیار سمجھتا ہے۔ جس سے حق کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے، شاعر ہجو طنز اور ظرافت سے حق کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ معاشرہ میں ریاکاری، کوبڑپن، نامعقولیت اور حماقتیں قائم رہیں۔ اگر اس قسم کی برائیوں نے اپنا قدم جما لیا تو وہ کسی معاشرہ کا معیار بن جائے گی۔ پھر حق و ناحق اور نور و ظلمت، نیکی و بدی، روشنی و تاریکی میں فرق کرنا مشکل ہو جائے گا۔

ایک بات اور عرض کرتا چلوں جہاں تک نامعقولیت اور حماقت کا تعلق ہے۔ مختلف انسان اور مختلف ماحول کے مطابق ان کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ ایک ہی بات ایک کے لئے باعث عبرت ہو سکتی ہے۔ لیکن وہی دوسرے کو حماقت معلوم ہوگی۔ مثلاً شیکسپیر کے ڈرامہ میں کنگ لیر کا کردار، ہمارے کے لئے ایک المیہ کردار ہے۔ جسے دیکھ کر ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور خوف کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ہمدردی کا جذبہ اس لئے کہ اچھا بھلا شخص اپنے فیصلہ کی غلطی (ERROR OF ONDGEMUNT) کی بنا پر عبرت ناک مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اور خوف اس لئے کہ

ہم بھی انسان ہیں۔ ہم سے بھی اس قسم کی غلطی ہو سکتی ہے۔ کہیں ہم بھی اس قسم کی مصیبت سے دو چار نہ ہو جائیں۔ لیکن اس ڈرامہ میں ایک مسخرہ (FOOL) کا کردار ہے۔ اسے کنگ لیر کی فیصلہ کی غلطی حماقت معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ بادشاہ پر طنز کرتا ہے۔ اس پر ہنستا ہے۔ ایسے طنزیہ اور مزاحیہ جملے بولتا ہے کہ سامعین جو بادشاہ کے المیہ کردار پر چشم نم ہیں تو مسخرہ کے مسخرے پن پر تبسم زیرلب بھی نظر آتے ہیں۔

ایک روسی مصنف - ANATOLY LUNAC
-MORSYY - کہتا ہے:

'SATIRE MUST BE JOOLY
......AND WRATHFUL"

اور کلیم الدین نے اپنے مضمون "اردو ادب میں طنز و ظرافت" میں کہتے ہیں کہ:-

"ہجو کی بنیاد برہمی پر ہے۔ ہجو نگار جب
کسی شخص یا بات پر برہم اور غصہ ہوتا ہے
تو ہجو کہتا ہے"

کلیم الدین ہوں یا لیونا کرسکی، ان کا یہ مفروضہ کہ ہجویہ شاعری کے لئے برہمی لازمی ہے۔ قطعی غلط ہے۔ ہجویہ شاعری بغیر غصہ اور نفرت کے اظہار کے بھی کی گئی ہے۔ اور کی جاتی ہے۔ جن شعرا کی ہجویہ شاعری میں غصہ اور نفرت کا اظہار ملتا ہے مثلاً پوپ، اور سودا، کہ ان کی شاعری سے غصہ اور نفرت کا اظہار ہوتا ہے ان کی ہجویہ شاعری کے بھی یہ بنیادی عناصر نہیں ہیں والدین اپنی اولاد کی غلطی پر غصہ بھی ہوتے ہیں۔ اور انہیں تنبیہ بھی کرتے ہیں۔ تاکہ وہ آئندہ غلطی نہ کریں۔ اسی طرح ایک شاعر جو عوام کے مقابلہ میں زیادہ حساس ہوتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ کسی فرد میں کسی قسم کی خامی یا کوتاہی رہے۔ اس کے لئے کبھی غصہ کا بھی اظہار کرتا ہے۔ اور نفرت کا بھی۔ لیکن غصہ یا نفرت ہجویہ شاعری کے بنیادی عناصر نہیں۔

اب سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ ہجویہ شاعری یا ظریفانہ شاعری کا بنیادی عناصر کیا ہے؟ اس کا جواب ہے خلوص۔! خلوص ایک ایسا جذبہ عظیم ہے۔ جو کسی شاعر کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہجویہ یا ظریفانہ شاعری کے ذریعہ دنیا کی نامعقولیت، حماقت کوڑپن، وغیرہ کو دور کرے، ہجویہ شاعری میں عنصر یا نفرت کا اظہار خلوص ہی کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ جیسے شکسپیر کے ڈرامہ کنگ لیر میں مسخرہ (FOOL) کا کنگ کے بارہ میں اظہار خیال وہ کنگ لیر سے متعلق جو کچھ کہتا ہے۔ وہ محض بہ بنائے خلوص کہتا ہے۔ مثلاً:

لیر: کوئی ہے جو مجھے بتائے کہ میں کون ہوں؟
مسخرہ: لیر کی پرچھائیں،
لیر: ٹھیک سمجھا۔ اس لئے کہ اپنے شاہی اقتدار
اپنے علم، اپنی عقل، ان علامتوں سے مجھے
مشکل ہی سے یقین ہوتا ہے کہ کبھی میں
بیٹیوں کا باپ تھا۔
مسخرہ: اب وہ آپ کو اپنا فرمانبردار باپ بنائیگی

ڈرامہ کے سیاق و سباق کو مد نظر رکھا جائے تو مسخرہ کے آخری جملہ میں برہمی اور نفرت کی لہریں موجزن ملیں گی۔ اسے کنگ لیر کی حماقت پر غصہ بھی آتا ہے۔ اور نفرت بھی ہوتی ہے۔ اور وہ بھی خلوص کی بنا پر۔ اگر بادشاہ اپنی سلطنت کو اپنی بیٹیوں کے درمیان تقسیم کرنے کی حماقت نہ کرتا تو اسے یہ بُرے دن دیکھنے کو نصیب نہ ہوتے۔ یہ مسخرہ کا خلوص ہی ہے کہ بادشاہ جو اپنی بیٹیوں کو جانور سے بدتر سمجھتا ہے۔ مسخرہ کی تلخ باتوں کا کچھ اثر نہیں لیتا۔

میرا ایک شعر ہے ؎

نہیں خلوص تو میٹھی زبان بھی تلخ لگے
خلوص ہو تو کڑی بات ناگوار نہیں

اور اکبر کہتے ہیں ؎

"دل اچھا ہو تو بجھ جاتی ہے اکثر بلا باں ہو کر"
ڈرائیڈن، پوپ، سودا، اکبر کی طنزیہ یا مزاحیہ شاعری میں
نفرت یا غصہ کا اظہار جہاں جہاں ہوا ہے۔ وہ محض بربنائے
خلوص ہوا ہے۔ شاعری کسی قسم کی ہو سنجیدہ یا مزاحیہ،
بنیادی چیز خلوص ہے، اگر کسی شاعر میں خلوص نہیں تو اس
کی شاعری بھی بے اثر ہوگی۔ یہ خلوص ہی ہے کہ ایک مزاحیہ
شاعر اگر دوسروں کی مضحک باتوں کو اپنی شاعری کا موضوع
بناتا ہے۔ تو وہ اپنی ذات کو بھی نہیں چھوڑتا۔ ابھی میں نے
غالب کا یہ شعر پیش کیا تھا ؎

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یہی غالب جو شراب نوشی کی بنا پر واعظ پر طنز کرتا ہے۔
خود اپنے کو بھی نہیں چھوڑتا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اور وہ جانتا ہے کہ بادہ خواری کی اسے کتنی بڑی قیمت ادا
کرنی پڑی ہے ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب ایک جگہ کہتا ہے ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں!

اور یہی کام ایک مزاحیہ شاعر بھی کرتا ہے۔ اسے ضرور تاً مزاحیہ
رنگ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ اپنا مذاق
بھی اڑاتا ہے۔ شیکسپیر کے ڈرامہ AS YOU LIKE IT
میں ایاگو (IAGUE) جو کچھ کہتا ہے۔ اس سے میرے اس
قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ مزاحیہ شاعر دوسروں کے ساتھ
اپنا خاکہ بھی اڑاتا ہے۔ تاکہ جب وہ حقیقت بیانی سے کام
لے تو اسے قابل گرفت نہ سمجھا جائے، اور دنیا پر برائیاں
بھی آشکارا ہو جائیں۔ بہر کیف جیک (JAQUE)
اس ناپائیدار دنیا کے تجربات و مشاہدات سے حاصل شدہ
نتائج کو عوام سے چھپانا نہیں چاہتا۔ لیکن وہ جانتا ہے لوگ انہیں
سیدھے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے وہ ایک مسخرہ کا سوانگ
بھرتا ہے۔ بظاہر اس کی باتیں مہمل معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن بالکل
درست ہیں۔ وہ اپنی حماقتوں کو ٹٹی کے آڑ کی طرح استعمال
کرتا ہے۔ اور ان کے اظہار کے لئے اپنی ذہانت کو بروئے کار
لاتا ہے، وہ کہتا ہے:۔

"O THAT I WERE A FOOL"
کاش میں احمق ہوتا!

یعنی وہ خود احمق بن کر دنیا کی حماقتوں کو دور کرنا چاہتا ہے
جس طرح دوا جسم کو بیماریوں سے پاک کر دیتی ہے۔

I AM AMBITIOUS FOR
A MOTLEY COAT .....
IT IS MY ONLY SUIT
PROVIDED THAT MOR
WEED YOUR BETTER
JUDGEMENTS OF ALL
OPINION THAT GROWS
RANK IS THEM THAT
I AM WISE .....
INVEST ME IN MY MOTL-
EY GIVE ME LEAVE TO
SPEAK MY MIND AND
I WILL THROUGH AND
THROUGH CLEANSE
THE FOUL BODY OF THE

INFECTED WORLD OF
THEY WILL PATIENTLY
RECEIVE MY MEDICINE"

یہی بات ایک مزاحیہ شاعر پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ دنیا کی کوتاہیوں اور خامیوں سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ محض انہیں بیماریاں سمجھتا ہے۔ جن کا علاج اگر کسی کے پاس ہے تو صرف اسی کے پاس ہے۔ وہ اپنی ذہانت کو بروئے کار لاتا ہے اور بڑے دلچسپ اور پُر مزاح انداز میں پیش کر کے انہیں دور کرنا چاہتا ہے۔

دنیا کا نظام کچھ اس قسم کا ہے۔ کہ یہاں ہر جگہ نامعقولیت ناتمامی، خامی اور بے ڈھنگے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ایک حساس شاعر اسے شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اور اپنی شاعری کا انہیں موضوع بناتا ہے۔ وہ بظاہر ہنستا اور ہنساتا ہے، لیکن دراصل ان پر کڑھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ جس دنیا میں وہ رہتا ہے وہ نامکمل رہے۔ اور اس میں بسنے والے افراد حماقت کے مرتکب ہوں۔ مزاحیہ شاعر کے ہاتھ میں خلوص کا ایک سراج منیر ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے وہ ظاہری اور سطحی بے ڈھنگے پن اور کوڑھ پن پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان باتوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے جن پر تصنع اور ریاکاری کا پردہ پڑا ہوتا ہے۔ اس کا ذہن دنیا کی عدم تکمیل اور اس کے نقائص کی گہرائیوں تک پہونچ جاتا ہے۔ اور ان حقیقتوں کا پتہ لگا لیتا ہے۔ وہ جس دنیا میں رہتا ہے اس کے مقابلہ میں ایک نئی دنیا کا تصور پیش کرتا ہے۔ جو ہر طرح مکمل اور نقائص سے پاک ہو، جہاں راست باز، ایماندار، حقیقت پسند اور مہذب لوگ رہتے ہیں۔

ایک پرانی کہاوت ہے۔ "ہنسا ہنسا کر مارنا" لیکن مزاح نگار کسی کو ہنسا ہنسا کر نہیں مارتا، کیونکہ اس کا منشا محض ہنسانا نہیں۔ وہ بھانڈ یا لطیفہ گو نہیں۔ وہ شاعر ہے جس کی

ہنسی میں بھی ایک بات ہوتی ہے۔ اور ہنسنے والا جب اسے سمجھ لیتا ہے تو صرف مسکرا کر رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے لب پر آئی ہوئی ہنسی یوں غائب ہو جاتی ہے۔ جیسے بادل آنے سے دھوپ، اور ہنسی سے وہ شخص بھی نہیں مرتا، جو مزاح کا مرکز ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جس خامی پر وہ ہنس رہا ہے۔ وہ اس میں نہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اسے اس کا احساس ہوتا ہے تو اسے دور بھی کر لیتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کی ظریفانہ شاعری نے اس سلسلہ میں مثبت کارنامے انجام دئے ہیں۔

ہنسی پیدا کرنے کے لئے بھی کئی طریقے ہیں۔ ایک اچھوتا خیال اور نیا انداز بیان ہماری دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ کسی غیر معمولی بات کو معمولی اور معمولی بات کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنے پر بھی ہنسی آتی ہے۔ ڈرائیڈن (DRYDEN) ایک (CARCATURIST) ہے جو تل کو تاڑ بنا کر خاکہ اڑاتا ہے۔ اور پوپ (POPE) (MINIATURIST) ہے وہ تاڑ کو تل بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور یہی کام سودا بھی کرتا ہے۔ اس نے گھوڑے کو گدھا بنا کر پیش کیا۔

ہم اس وقت بھی طمانیت محسوس کرتے ہیں جب کسی مسئلہ کا حل نکل آتا ہے۔ ایک غیر اہم بات کو اہم مسئلہ کی شکل میں پیش کیا جائے تو یہ ہمیں الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن کچھ غور و فکر کے بعد حقیقت پر سے جب پردہ اٹھ جاتا ہے تو ہم خود بخود ہنسنے لگتے ہیں۔ مثل مشہور ہے "کھودا پہاڑ، نکلی چوہیا" بہرکیف! اہم مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں جو تحفظ کا مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔ اور اس سے جو ذہنی تناؤ پیدا ہوا تھا، وہ یک بیک ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور ہمیں طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کی ہنسی کو نفسیاتی ہنسی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ہنسی نفسیاتی الجھن، یا اعصابی تناؤ سے چھٹکارا حاصل کر لینے پر آتی ہے۔ وہ اہم مسئلہ جو ہماری الجھن یا اعصابی تناؤ کا باعث ہوتا ہے۔ یک بیک حل ہو جائے تو ہمیں نجات پانے کا

کا احساس ہوتا ہے اور ہم خوشی سے چیخ پڑتے ہیں۔

ایک کامیاب مزاح نگار کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ جس شخص کو مزاح کا مرکز بناتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس بھی دلاتا جاتا ہے کہ مرکز مزاح وہ نہیں۔ اس لئے اسے بھی اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ خوش نظر آتا ہے۔ جب ہم کسی کی خامی پر ہنستے ہیں۔ تو یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ ہم اس سے بہتر ہیں۔ اور یہ احساس خود ہی بہت مضحکہ خیز ہے کہ کسی شخص کو اپنے سے کمتر سمجھا جائے، اس طرح ہنسنے والے کی ہنسی خود اسی کے لئے قاتل بن جاتی ہے۔

بظاہر ایک مزاحیہ شاعر اپنے مخالف پر ہنستا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ مزاح طنز میں بدلتا جاتا ہے۔ اور یہ طنز کا تیر اوپر سے نہیں برستا۔ نیچے سے چلتا ہے۔ اور سب سے پہلے اس کا شکار خود مزاحیہ شاعر ہوتا ہے۔ ایک بات اور عرض کرتا چلوں، مزاحیہ شاعر خود اپنا قاتل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مخالف پر ذہنی برتری کے سہارے اخلاقی فتح حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جسمانی برتری حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ طنز و مزاح کا سہارا ہی کیوں لیتا۔ اس طرح مزاح ایک اخلاقی فتح تو بخش سکتا ہے۔ مادی نہیں۔ اور ایک مزاحیہ شاعر اخلاقی فتح ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ وہ مخلص ہوتا ہے۔ اور وہ خلوص کو بروئے کار لا کر خامیوں اور برائیوں پر فتح حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جسمانی طاقت سے نہیں۔

سب سے بہتر مزاح اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب حقیقت پر مبنی ہو، یعنی جیسی بات ہو ویسی ہی ہوبہو پیش کی جائے، بعض حسین پیشکش اسے دلچسپ بنا دے،

ہنسی کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے کچھ کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان کے علاوہ آسودگی کی ہنسی، کھسیانی ہنسی، اعصاب کی کمزوری کی ہنسی، وغیرہ بھی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ہنسی کو ہم دو طرح سے تقسیم کر سکتے ہیں؛

(۱) ہمدردانہ ہنسی — اس قسم کی ہنسی میں خوشدلی اور ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

(۲) قاتلانہ ہنسی — اس قسم کی ہنسی کدورت آمیز اور قاتل ہوتی ہے۔

بہتر ہے کہ ہم طنز و ظرافت کے اقسام پر بھی گفتگو کرتے چلیں۔

میں اردو کے لفظ ہجو کے لئے انگریزی لفظ SATIRE مناسب سمجھتا ہوں۔ اور یہی طنز و مزاح کی بنیادی قسم ہے۔ اور باقی ہجو (SATIRE) کی مختلف قسمیں ہیں۔ آئیے ان پر غور کریں۔

(۱) ہجو (SATIRE) :- ہجو ایک ایسی صنف سخن ہے۔ جس میں ایک مخلص شاعر بظاہر بے رحمی مگر دلچسپ اور فنکارانہ خوبیوں کے ساتھ کسی فرد یا سماج، سیاسی جماعت یا حکومت کی کوتاہیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ تو اس کے ذاتی جذبات ہمہ گیر اور عالمگیر بن جاتے ہیں۔ سودا کی ہجویات اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

(۲) طنز (IRONY) IRONY کے مقابلے میں طنز کا لفظ استعمال کرنا میں بہتر سمجھتا ہوں۔ IRONY میں شاعر جو لفظ یا واقعہ یا ماحول پیش کرتا ہے۔ ٹھیک اس کے برعکس مفہوم مراد لیتا ہے۔ اور طنز کے ذریعہ بھی یہی مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص سیاہ فام ہو اسے گلفام کہہ کر پکاریں۔

اکبر الہ آبادی کا شعر ہے ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے، اور حرم سے بیبیاں نکلیں

یہاں ترقی کی نئی راہیں "طنزاً" کہا گیا ہے۔ میاں کا مسجد سے نکلنا اور بیبیوں کا حرم سے نکلنا ترقی نہیں تنزلی کی علامت ہے۔ طنز کے ذریعہ شاعر یا ادیب خود یا معاشرہ

کی کوتاہیوں اور خامیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ لیکن ہجو کے مقابلہ میں اس میں تلخی یا نشتریت کی کم ہوتی ہے۔ طنز کو تیز تر کرنے کے لئے شاعر رمز و کنایہ سے بھی کام لیتا ہے۔

(۳) ظرافت (WIT) انگریزی زبان میں WIT کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈرائیڈن (DRYDEN) نے اپنی ہجو میں اسے نفرت کے لئے اور برنارڈ شا نے اپنے ڈراموں میں ظرافت کے لئے استعمال کیا ہے۔ اور میں یہاں لفظ WIT کو ظرافت ہی کے معنی میں استعمال کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ گو WIT کے لئے نغز کا لفظ بھی مستعمل ہے۔

ظرافت (WIT) کا تعلق ذہن سے ہے۔ اور اس کی زد پر نامعقولیت ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں شوخی بھی ہوتی ہے۔ اور متانت بھی، ظرافت نگار کا ذہن بہت تیز اور دور رس ہوتا ہے۔ وہ کسی چیز میں ہنسی اڑانے کے قابل برجستہ اور برمحل نکتہ نکال لیتا ہے۔ پہلے تو اسے سن کر حیران ہوتا ہے پھر سمجھ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ مثلاً اکبر کا یہ شعر

ہم ریش دکھاتے ہیں کہ اسلام کو دیکھو
مس زلف دکھاتی ہے کہ اس لام کو دیکھو

بعض شعر یا مصرعہ میں مضحکہ انگیز تصرف (PARODY) سے بھی ظرافت کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ میر انیس کا شعر ہے

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
ساتویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

اکبر کہتے ہیں

عمر گزری ہے اسی بزم کی سیاحی میں
دوسری پشت ہے چندے کی طلبگاری میں

کسی کمیونسٹ شاعر کا مصرع ہے

چاہا مگر نہ لکھ سکا افسانہ حیات

کسی دوسرے شاعر نے پہلا مصرع یوں لگایا۔

"روسی لیلیوں نے لکھے ہیں ناول ہزار ہا"

اب مکمل شعر پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

روسی لیلیوں نے لکھے ہیں ناول ہزار ہا
چاہا مگر نہ لکھ سکا افسانہ حیات

(۴) مزاح (HUMOUR) مزاح کا تعلق جذبات سے ہے اس کا شکار حماقت ہے۔ فرائڈ نے اسے SENSE IN NONSENSE سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی بے تکی بات میں تک کی بات، مزاح نگار کسی چیز کے مضحک پہلو کو اتنے دلچسپ انداز سے پیش کرتا ہے کہ قاری یا سامعین کو اگر بے ساختہ ہنسی نہ آجائے تو کم سے کم مسکرا ضرور دے، مثلاً اکبر کا یہ شعر

دختر رز نے اٹھا رکھی ہے آفت سر پہ
خیریت یہ ہے کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

(۵) طعن (SARCASM) شاعر کسی شخص یا چیز کی خامی پر طعن و تشنیع سے بھی کام لیتا ہے۔ اور اس میں طنز سے زیادہ شدت ہوتی ہے۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں،
حجاب ان کو نہیں آتا، انہیں غصہ نہیں آتا

(۶) ہزل اور ضلع جگت (رعایت لفظی) سے بھی مزاح پیدا کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن ادب و تہذیب میں شمار نہیں کیا جاتا۔ ہزل کی مثال:

پہلے عورت جنتی تھی اب سارا بھارت جنتا ہے۔

ضلع جگت کی مثال:

قیمت بوسہ جو پوچھی بولے بے قیمت ہے یہ
آج بے قیمت ہی لیں گے جبتی بے قیمت کو ہم

طنز و مزاح، مذہبی، اخلاقی اور سماجی نقطہ نظر سے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن اسے خلوص اور دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے تو ہر نقطہ نظر سے درست اور صحیح ہے۔ ●●

حسین الحق

"ہُوہُو"

قصبہ میں داخل ہو چکا ہوں

کہاں سے آیا ہوں، کب آیا ہوں، کیوں آیا ہوں، کیسے آیا ہوں۔ کچھ خبر نہیں۔ اور خبر کا کیا سوال کہ بے خبری وجود کا ایک الوٹ انگ، لہٰذا خبر اور بے خبری کے درمیان کسی قسم کی غیریت بھی نہیں۔ کہ عین کی تلاش ہو......... گویا تزکیۂ نفس ممکن نہیں کہ غیر کا تصور شرک ہے۔ اور تزکیۂ نفس لازم کہ تطہیر کے بغیر تنزیل محال۔ لہٰذا وجود کے تمام اطراف بے خبری کا تناور درخت سایہ دار بھی اور وجود کی گہرائیوں اور لاشعور کی تہوں میں خبر طوفان کے مثل بھی۔

لیکن یہ خموشی کیا طوفان سے پہلے کی خموشی ہے؟

یا طوفان گزر جانے کے بعد کی؟

سوال ہنوز شاہ راہ عام پر رسولا ہے۔ اور میں شاہراہ عام سے گزر کر دیہات کی پگڈنڈیاں طے کر رہا ہوں۔ اور نزدیک دور جدھر جدھر نظر دوڑاتا ہوں، یکتائی نغمہ سرا......... حد نظر تک جاگتا، سنسناتا (جاگتا یا سوتا؟) پاک پروردگار... ایک اکیلا بے قرار......... مثل شعلہ پر پیچ و تاب......... افتاں و خیزاں......... رواں دواں......... اور اس ایک اکیلے آدمی کے پیچھے اس کی روندی کیاریاں، دیکھے کھیت، محسوس کی گئیں خوشبوئیں، اور بدبوئیں، ہاتھ سے ہٹائی گئی گرد و غبار[1] سلسلۂ دور دور تک کھیت، اور بہت دور پردہ دھند میں کھوئے کھپریل کے مکانات، مسجد کا نیم روشن ہیولا، دائیں کھیت......... اور کھیت کے سوا کچھ بھی نہیں، بائیں کھیت...... اور کھیت کے سوا کچھ بھی نہیں، اور سر پر...... بھڑکتا اور بھڑکتا ہوا انگارہ، اور پیروں کے نیچے......... کسی گندگی کے آثار نہیں......... اور حد نظر تک جاگتا سنسناتا، جاگتا (یا سوتا؟) پاک پروردگار......... اور ایک اکیلا بے قرار

.... تو یہ ایک اکیلا بے قرار.........

جو کبھی عین، کبھی ظل، کبھی ہاں، کبھی نہیں، کبھی یہ، کبھی وہ.........

یہ کون ہے۔!

سوال چپکے سے سر اٹھاتا ہے۔ اور جتنی آہستگی سے سر اٹھاتا ہے۔ اتنی ہی سرعت گونج، اور ایک اجتماعی شور کے ساتھ جواب چاروں طرف سر پٹختا ہے۔ تھک ہار کر دم توڑ دیتا ہے۔ اور میں مسجد کے بغل سے گزرتا ہوا اس اونچے مکان کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔

مسجد چھوٹی سی ہے۔ اونچی فصیل، تھوڑا سا صحن، اور اس کے بعد تین در، مسجد پختہ ہے اور کہیں ذہن کے کسی کونے کھندرے میں۔ سعدی پور کی مسجد......... سعدی پور کی مسجد کا جملہ کلبلا رہا ہے......... [illegible] سے آگے بڑھ کر میں اونچے مکان کی طرف [illegible]

۱ـــ خواب کی ایک روداد ہے۔ سارے خواب تھے، خوابوں کے تھے ہم

اچانک سب گیا۔ جیسے کبھی روشن ہی نہ ہو۔ اور مجھے یہ بھی یاد [illegible] مڑکر سعدی پور کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کہ اب تو میں [illegible] اونچے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا جو میرے تصوراتی نگارخانے میں آمذاری میں واقع تھا۔

سعدی پور مغربی بہار میں، ضلع گیا کے جہان آباد سب ڈویژن کا ایک انتہائی پس ماندہ قصبہ ہے۔ اور آمذاری مشرقی یوپی کے بلیا ضلع میں، بلیا چھپرہ لائین پر واقع ساگر پالی اسٹیشن سے آدھ گھنٹہ کی مسافت پر۔ ملے ملا سعدی پور سے بھی زیادہ پسماندہ، غریب اور غیر ترقی یافتہ دیہات، گویا دونوں دو کناروں پر بستے تھے، اور میں مسجد چھوڑ کر آگے بڑھا تو پورا صوبہ پیچھے چھوٹ گیا۔

لیکن حیرت اس پر نہیں ہے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ بلیا مشرق میں واقع ہے۔ اور گیا مغرب میں، اور انتقالِ مقام کا ایک مسلمہ یہ بھی ہے کہ انتقال ہمیشہ مشرق سے مغرب کی جانب ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ مغرب میں واقع سعدی پور سے بچھڑا تو مشرق میں واقع آمذاری سے منتقل ہو گیا۔ کیا وہ سعدی پور ہی تھا۔؟ یا کہیں کچھ گڑبڑ گھٹالا ہے ؟

فیصلے کی تو میں سکت نہیں ؟

صرف شہادت دے سکتا ہوں کہ اب میں اس اونچے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جو گویا آمذاری میں واقع تھا۔

مکان خام تھا یا پختہ، اس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں۔ البتہ اس مکان کی سب سے نمایاں چیز اس کا خوب بڑا سا پھاٹک تھا۔ جسے دیکھ کر مجھے بیساختہ "HAPPY VILLA" یاد آگیا تھا۔ یعنی وہ مسرت آباد شام غزیباں جو انگریزی میں HAPPY VILLA تھا اور اردو میں بولنے والے کے والد مولوی عشرت علی عشرت سہسرامی کے نام پر عشرت کدہ "عشرت سہسرامی اردو اور فارسی دونوں کے شاعر تھے، اور ان کے صاحبزادے عشرت کدہ

کے مالک، مولوی خیرالدین احمد خیر، ترمذی سہسرامی پولس انسپکٹر دوران فرنگیاں نے ان کے کلام "تحفۂ عشرت" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ جس کی کچھ خستہ حال اور دیمک زدہ جلدیں اس حقیر فقیر کو میسر آگئیں، تو ان کو نئے سرے سے جلد سازی کرا کے محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی،

تو یہ پھاٹک جس مکان کا نگراں تھا۔ اس مکان کے لئے میرے وجود کی لوح پر ایک لفظ ثبت تھا۔..... آمذاری، ..... اور یہ مکان جس فضا میں واقع تھا اس کے لئے ایک اصطلاح روشن تھی،....... سعدی پور...... اور پھاٹک پر کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی۔ لیکن کہیں ایک علم جگمگا رہا تھا۔

"عشرت کدہ"......

اور جب میں پھاٹک سے گزر کر اندر احاطے میں پہونچا تو سامنے کی بڑی سہ دری والی دالان کے کنارے ایک بزرگ صورت انسان وضو کرتے دکھائی دیئے،

سہ دری دالان کے بیچوں بیچ پھول کا اوسط درجے کا لوٹا جس سے پانی بڑی ہم آہنگی کے ساتھ گر رہا تھا۔.....

اور اس پانی سے وضو کرتے ہوئے بزرگ ...... انہوں نے میری جانب ایک نگاہ کی، جو زبانِ ہر نگاہ سے کم تھی۔.....

پھر سوال کیا..... آگئے..... ؟

جواب میں نے دیا یا نہیں۔ اگر دیا تو کیا دیا،.....

سب لاشعور کی گہرائیوں میں سو چکا ہے۔

واضح صرف اتنا ہے کہ میں اسی تین دروں والی دالان سے گزر کر مکان میں داخل ہوا...... مکان اپنی بڑی سی دالان اور بڑی سی دالان کے بڑے بڑے تین دروں کی مناسبت سے خاصا بڑا تھا...... اور تب ایسے میں ایک پرندہ سر نیہوڑائے اپنے من ہی من جانے کس کتھا کی جلپ کرتا رہا...... پرندے کی شناخت بھی

محال کہ کبھی غٹرغوں غٹرغوں کی آواز آتی، کبھی پی کہاں پی کہاں
کا پردرد اور پرسوز نغمہ دل میں آگ لگانے لگتا، کبھی کو .....
کوکی صدا آم کے کچے ٹکوروں (بور) کو پل بھر میں خوشرنگ بناکر
خوشبوؤں سے بھر دیتی۔ اور پھر خوشش ذائقہ بنا دیتی......

پھر یہ ہوا...... اور وہ ہوا...... اور کیا ہوا....
(تفصیل صیغۂ راز میں ہے)

کٹربیچ...... کٹربیچ...... کٹربیچ کٹربیچ.........

میں چونک اٹھتا ہوں...... یہ آواز..... کہاں سے آئی یہ
آواز؟..... صداؤں کی بازگشت؟....... کیا بات ہے
اور جو سالے تجسیمیت کے تدریجی عمل میں کامیابی حاصل کرلی
ہے۔؟...... جوسہ (دبکسر) کے قاضی شمس الدین حضرت
مخدوم جہاں سے اکتساب فیض کرتے کرتے بے زین کے گھوڑے
پر کب سوار ہوگئے ؟ یہ نہیں مکتوبات صدی میں قاضی شمس الدین
کے نام حضرت مخدوم جہاں کا ایسا کوئی مکتوب ہے یا نہیں جس
میں نفس کے گھوڑے پر سوار ہونے اور اسے پالتو بنانے کا مشورہ
دیا گیا ہو۔ مگر اتنا طے ہے کہ عمل تجسیمیت وجود کے لئے ایک
بہلاوا ہے۔ اور لوح بدن کا ہر حرف دھوکا...... ہر نقطہ فریب

شعور بھی فریب اور لاشعور بھی فریب،

میں اسی فریب زندگی کا شکار ہوکر مصروف بے عمل...

کبھی یہ عمل بیداری کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اور
کبھی خواب کا...... خواب جو سوال کی طرح میرے پورے وجود
کا احتمالی کل ہے...... یہ خواب طرح طرح سے مجھے پریشان
کرتا ہے۔ راتوں کو جانے انجانے جہانوں کی سیر کراتا ہے
اور جب صبح اپنی مندی مندی آنکھیں کھولتی ہے۔ تو میرے ہاتھوں
میں قلم پکڑا دیتا ہے...... لکھ...... لکھ ان جہانوں کے
احوال کہ جو تیرا خواب ہیں۔

شاید میری تقدیر صرف خواب ہیں۔

تو وضو کرتے بزرگ نے مجھ سے پوچھا "آگئے"؟

اور میں بلند سہ دری دالان کے بلند در سے گذرتا
ہوا آگے بڑھتا گیا۔

دالان بلند تھی، دیواروں پر نقش و نگار بنے ہوئے
تھے، چھت میں جھاڑ فانوس لٹکے ہوئے تھے، اور یہ اچھی طرح
یاد ہے کہ دن کا وقت ہونے کے باوجود سارے جھاڑ فانوس
روشن تھے۔ ایک لمحے کے لئے یہ فضول خرچی بُری لگی، پھر یہ سوچکر
خوش ہوا کہ بہرحال میں یہاں نووارد ہوں"

دالان سے جیسے ہی آنگن میں قدم رکھا، کسی جانب
سے اچانک ایک سانڈ دوڑتا ہوا اسی جانب آتا دکھائی دیا
جس طرف میرا رُخ تھا...... میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا
...... پھر شاید بوکھلاہٹ طاری ہوگئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں
آرہا تھا۔ کہ اس بپھرے ہوئے سانڈ سے بچنے کی کیا سبیل ہو
سکتی ہے...... کہ اسی بحرانی عالم میں ایک پرندہ اپنا سر سہلاتے
اور اسی کی انتم سیما پر کھڑا جانے کس کتھا کی جاپ کرنے لگا......
میں نے چونک کر دالان کی طرف دیکھا، مگر آواز وہاں سے نہیں
آرہی تھی...... دائیں، بائیں، آگے پیچھے، نیچے اوپر.....
آواز کہیں سے نہیں آرہی تھی...... مگر آواز کہیں آرہی تھی
....

غٹرغوں غٹرغوں...... پی کہاں پی کہاں.........
کوکو..... کوکو...... حق سرہٗ حق سرہٗ.....

آواز کہاں سے آرہی ہے؟ میں نے بے تابانہ اپنے
آپ سے سوال کیا تو جواب کے بدلے اور ایک اور سوال نے
سر اٹھایا...... ایک اکیلا بے قرار...... جو کبھی ہاں،
کبھی نہیں، کبھی عین، کبھی ظل، کبھی یہ کبھی وہ.....

یہ کون ہے؟ یہ کون ہے؟

تو میں ڈرا کہ کہیں پھر وہی آواز جاندار فرشتہ کی [illegible]
گے، اور میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ [illegible]
کی طرف بھاگا جو سامنے نظر آرہا تھا مگر جس میں [illegible]

جہاں پہونچنا ہے ۔ کچھ اور لوگ بھی پہونچ گئے ،
...... جہاں داخل ہونے والے دروازے میں کواڑ نہیں
تھے ، اور باہر نکلنے والے دروازے میں کواڑ لگے ہوئے تھے
...... اور دروازہ بند تھا ...... تب ایک سوال نے
پھر سر اٹھایا ۔ کہ یہ مکان کون سا زمان میں واقع ہے ۔ جہاں
شمولیت واقع ہے ۔ لیکن خروج ممکن نہیں ۔

تو اب صورت حال یہ ہے کہ پیچھے کا دروازہ بند ہے
لہٰذا خروج نا ممکن ...... سامنے جو منظر کھلا ہے ۔ وہاں
پاگل سانڈ دندناتا پھر رہا ہے .... پیچھے کے دروازے
کے اس پار کا منظر دھند میں گم ہے ......

اور ایک پرندہ اداسی کی انتم سیما پر بیٹھا جاپ
کر رہا ہے ...... حق بسترہ ، حق بسترہ ، ....

حق اگر بسترہ ہے تو غیر حق کیا ہے ؟
جی کچھ کہا آپ نے ؟ میں چونک کر مڑا اور حیران و
ششدر رہ گیا ، اس پورے بے معنی مگر پیچیدہ زمان میں
میرے سوا کوئی نہ تھا ۔

وہ سب پناہ کے متلاشی کدھر گئے ، ؟ میں نے
بڑی بے بسی اور بے پناہی کے ساتھ سوچا ،
کہ باہر دندناتا سانڈ اب اس مکان کی طرف رُخ
کر چکا تھا ۔ جو میری آخری پناہ گاہ تھا ۔

اور تب ایسے میں ایک آواز ابھری ، پی کہاں ، پی کہاں
...... اور صدیوں کے فاصلے پر محیط ذبح ہوتے ہوئے
ایک کبوتر کا عکس جھلملایا جو قاتل کی آنکھوں سے آنکھیں لڑا رہا
تھا ۔ اور میرے ارد گرد ایک آواز ابھر رہی تھی اور ڈوب رہی
تھی ...... حق بسترہ ، حق بسترہ ....

تو حق بسترا اور دھند میں گھویا ہوا ہے ۔ میرے ارد گرد
کوئی ہے ہی نہیں ۔ پیچھے کا دروازہ بند ہے ۔ آگے کے دروازے
سے میں اور دوسرے لوگ داخل ہوئے ہیں ۔ مگر اب اس مکان
میں صرف میں ہوں ۔ اور زمان میرے ہاتھوں سے نکل کر فضا
میں اڑ چکا ہے ۔ اور اندر ہی اندر کوئی پرندہ سر مار رہا ہے ۔
اور اداسی کی انتم سیما پر بیٹھا من کی کتھا کا جاپ کر رہا ہے
اور باہر دندناتا سانڈ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہے
تب ایسے میں خروج کی تمنا عبث ...... لہٰذا میں بے
تابانہ مراجعت اختیار کرتا ہوں ۔

میں سانڈ کے سامنے سے کیسے گزرا ...... یاد نہیں
لمبا چوڑا آنگن کیسے پار کیا ...... یاد نہیں ۔
یاد صرف اتنا ہے کہ جب میں سہ دری ملبند دالان
سے گزر رہا تھا تو رات آ چکی تھی اور کوئی جھاڑ فانوس روشن
نہیں تھا ...... کوئی بزرگ صورت شخص وضو نہیں کر رہا تھا
میں سہ دری ملبند دالان سے گزرتا رہا .... گزرتا
رہا ...... گزرتا رہا .... مگر دالان ختم نہیں ہوئی ...

اور ایک پرندہ اپنا سر پھوڑتا ہے اداسی کی انتم سیما
پر کھڑا جانے کاہے کی جاپ کرتا رہا ۔
اور سب جھاڑ فانوس بجھے پڑے رہے ۔

وہ مکان جس زمان میں واقع تھا اور زمان جس
مکان میں سفر کر رہا تھا سب پر سیاہی کے امٹ رنگ
ثبت تھے ۔

اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے کے کوئی آثار نہ تھے
پتہ نہیں اب کیا صورت حال ہے ـــــ ؟ ؟ ؟ ●

قلم کار حضرات مسودے کی خوشنویسی
میں خصوصی توجہ سے کام لیں ۔

خدیجہ جلال (پاکستان)

برگد

کتنے بوڑھے برگد کے سائے تلے کھڑی نواڑ کی چارپائی پہ بیٹھا میں ماہ و سال کا شمار کرتا ہوں۔ کتنی رتیں بدلیں۔ کتنے زمانے گزرے۔ وقت اور حالات کی گردش نے ایک بے آسرا یتیم کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں جوانی کی آخری حدود کو جا پہونچا ہے۔ قصبے کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا شمار ہوتا ہے جس کی باتوں میں وزن ہے۔ دولت کے اونچے ڈھیر نے اسے اونچا مقام دیا ہے۔ کہ اب انسانوں کے ناپنے کے پیمانے بدل گئے ہیں انسان کی قدر و قیمت اس کے معاشرتی رتبہ اونچے سٹیٹس اور بینک بیلنس سے ہوتی ہے۔ اس مقام پر پہونچنے کے لئے میں نے شہروں کی خاک چھانی، ملک ملک کی صعوبتیں جھیلیں، مادی طور پر تو میں کامیاب رہا۔ لوگوں کے لئے قابل رشک بنا۔ مگر سکون طمانیت اور شانتی کی دولت مجھے کہیں نہ ملی۔ قریہ قریہ، شہر شہر اور ملک ملک گھوما۔ میں سمجھا تھا کہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھا پرکھا اور برتا ہے۔ اور آج سوچتا ہوں۔ سفر میں، قیام میں، منہ بند کتابوں کے خاموش نقطوں میں ادراک و آگہی کا متلاشی تھا۔ اور اب یہ منکشف ہوا کہ روح کی تشنگی ہنوز باقی ہے۔

برسوں کی مسافت کے بعد تھکا ماندہ مسافر ماں کے بار بار تقاضوں کے بعد ان پکھیروؤں کی طرح گھونسلے کی طرف لوٹتا ہے کہ تازہ دم ہو کر نئی صبح نئے سفر پر روانہ ہو۔

قریہ قریہ گھوم چکے اب دشت کو لوٹیں بن کو چلیں
شام ہوئی آوارہ غزالو آؤ کہ اپنے وطن چلیں

آوارہ مسافر بوڑھی ماں کے بار بار تقاضوں اور پکار پہ بھی نہ لوٹتا۔ اگر ماں نے بھول جانے کا طعنہ نہیں دیا ہوتا۔ اب ماں کو بہلانا مشکل تھا۔ اور میں اسے ناراض کرکے مزید بے سکون نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ورنہ میں نے سوچا تھا جب تک اپنا کھوج نہ لگالوں۔ اپنے آپ کو نہ پالوں پیچھے نہ مڑوں گا۔ چلتا چلوں گا کہ اس کا کھوج لگانا تھا۔ مگر آگہی و ادراک کے بھید مجھ پر منکشف ہوتے چلے گئے۔ جیسے کھل جا سم سم کی طرح۔ اندھے غار کا منہ کھل گیا۔ اور پوشیدہ خزانے کی چکا چوند نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ یہ روشنی یہ ادراک کیسے مل گیا؟

میرے معصوم بچپن کے لمحے لمحے کا راز داں یہ بوڑھا برگد جو باپ کی شفقت کی طرح میرے سر پر سایہ فگن رہا۔ میں بہت چھوٹا تھا جب میری ماں کو بیوگی کی چادر اوڑھنی پڑی۔ ایک بالک کو سہارا بنا کر اس عورت نے بیوگی گزارنے کا عہد کیا جس کا نظریہ تھا کہ بیٹے کی ماں کبھی بیوہ نہیں ہوتی۔ ایک محبت نے اسے جوانی کی سرحد سے اٹھا کر سمجھ اور تجربے کی اس دہلیز پر لا کھڑا کیا۔ جس کے لئے سالوں کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ مگر وقت اتنا بڑا استاد ہے۔ اور حالات ایسی درس گاہ جن کے آگے سالوں کا شمار بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس عورت نے عہد کیا کہ اس کی اس سہارے کو اتنا مضبوط بنائے گی۔ کہ ماضی کی تلخیاں اور

اور مستقبل کے اندیشے ننھے ہیں۔ اور پھر اس نے اس کے ہاتھ میں کتابیں تھما دیں۔ اور نصیحت کی، "علم اس دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہے" اور بچے نے اس خزانے کو پانے کا عہد کیا۔ اور وہ اسے ایسا چیک بنانا چاہتی تھی جسے من مانی قیمت پر بھنا سکے۔ وہ نور کے تڑکے اٹھتا، تیار ہو کر دوسرے گاؤں کے اسکول میں پڑھنے جاتا۔ اسکول سے واپسی پر اس بوڑھے برگد کے نیچے بیٹھ کر اسکول کا کام ختم کرتا۔ یوں ہی مرحلہ مرحلہ، درجہ درجہ تعلیمی سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ اور میٹرک کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کر کے وظیفہ حاصل کیا تو اس ماں میں نہ جانے اتنا حوصلہ کہاں سے آیا کہ ماں سے باپ کا روپ بھر لیا سلائی کڑھائی اور محنت مزدوری سے حاصل شدہ تمام پونجی اس کے آگے ڈھیر کر کے کہنے لگی۔

زندگی کی شاہراہ پر سرپٹ بھاگنے والے ہی زندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جو رکا پیچھے ہی نہیں رہا تیز رفتار زمانے نے اسے کچل کر رکھ دیا۔ میں تمہیں شاہراہ حیات پر بھاگتا دوڑتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر تم نے منزل پالی تو میں سمجھوں گی میری ریاضت ٹھکانے لگی۔

ذمہ دار اور دور رس سوچوں کے مالک اس لڑکے نے عہد کیا تھا اب ماں کو کبھی کام مزدوری نہ کرنے دے گا کہ اب تیرا بیٹا اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ تیرے لئے کما سکتا ہے۔ مگر وہ ایک بار پھر ہار گیا۔ اپنے قول کے ہاتھوں کہ اس نے عہد باندھا تھا ماں کی آرزوؤں کی تکمیل کا۔ اس کی خوشی مطلوب اور اس کی رضا مقصود تھی۔ اس کو آزردہ دیکھنا اس کے بس میں کہاں تھا؟

اب وہ کالج کا ہونہار طالب علم تھا۔ اپنی صلاحیتوں کو آزمانے اور اپنا آپ منوانے کا وسیع میدان تھا۔ اور جب بی ایس سی کے امتحان میں نمایاں کامیابی کے بعد اس نے عملی زندگی میں قدم رکھنے کا سوچا، تو ماں ایک بار پھر جھولی پھیلائے سامنے آگئی۔

میں تمہیں تعلیمی زینے کی آخری سیڑھی پر سربلند دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس نے لاکھ سر پٹکا، مگر آخر ماں کی آدرش کی تکمیل اسی طرح ہو سکتی تھی۔ اور یوں وہ جامعہ میں پہونچا، اور جب اس نے شجرِ علم کی ایک شاخ کے آخری سر کو چھوا، تو اس نے سوچا وہ ماں کو زندگی کی ہر آسائش دے گا۔ اونچا اسٹیٹس اور زندگی کی سہولیات وہ ماضی کی کلفتیں اور دکھ بھول جائے گی۔ اس نے اپنی خواہش اور اہلیت کے مطابق جو خواب دیکھے تھے۔ ریزہ ریزہ ہو گئے کہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ اس کے چلن نرالے ہیں۔ اونچی سفارش اور رشوت ہی اہلیت کا معیار ہے۔ جس سے گوہر مقصود کو پایا جا سکتا ہے۔ تو اس نے مایوس ہو کر ماں کے زانو پر سر رکھ کے دل گرفتہ ہو کر اپنا فیصلہ سنایا۔ ماں! میرے ملک کو میری صلاحیتوں کی ضرورت نہیں۔ تیری آرزو کی تکمیل کے لئے مجھے اس وطن کو چھوڑنا ہو گا۔ مسلسل ناکامیوں اور نامرادیوں نے مجھے کم حوصلہ کر دیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے تھے۔ اور ایک قطرہ سر مژگاں یوں پڑا تھا جس طرح اکیلا مسافر راہ بھول کر بھٹک رہا ہو۔ اور جب اس نے اپنی دھرتی سے رشتہ توڑ کر دیارِ غیر میں پناہ لی تو۔ تو یوں لگا جیسے وہ چوری کر رہا ہے۔ خیانت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے وہ سمجھ نہیں سکا۔ اس نے علم اور تجربے میں اضافہ کیا۔ دولت کے انبار لگائے، اتنی دولت کہ اس کے قصبے کے ارد گرد دور تک ایسا شاندار گھر کسی کا نہ تھا لوگ اس کی سعادت مندی، دیانت داری، اور ہونہاری و لیاقت کے قصیدے سناتے تھے، مگر وطن کی طرف لوٹنے کا حوصلہ نہ پاتا۔ اس نے ملک ملک کی خاک چھانی، وہ اپنے زعم میں سوچتا کہ اس نے ملک ملک گھوم کر زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ اس نے جن آسائشات کی تمنا کی تھی، پائی تھیں، دولت اس کے گھر کی باندی تھی۔ اور پھر دولت سے کیا نہیں خریدا جاتا اسے دولت کی اہمیت کا احساس تھا کہ اس کی

بہت سی آرزوئیں اسی وجہ سے تشنہ تھیں۔ آج جب اس کا
بینک بیلنس تھا۔ جائداد تھی، علم تھا۔ ماں کے تقاضے تو واپس
آئے کہ ہر ماں کی طرح اس نے بھی اس کے ماتھے پہ سہرا سجانا تھا، اپنی
آخری خواہش کی تکمیل کرنی تھی

لیکن وہ سوچتا اس ملک میں جا کر کیا کرے، جس
نے قدم قدم پر مایوسیاں دیں۔ ناکام کیا، چھوٹی چھوٹی خواہشوں
کے آگے بے بس بنایا۔ جس نے اس کی قدر نہ کی، اسے پناہ
نہ دی، ماں نے بھول جانے کا طعنہ دیا۔ تو وہ اپنی ماں کیلئے
اس سرزمین کو چلدیا جسے وہ بھول جانے میں کوشاں تھا۔
سکون، شانتی اور اطمینان کی وہ دولت اسے دنیا کے کسی
کونے سے میسر نہ آئی تھی، نہ جانے کیوں؟

آج جب قصبہ کے لوگوں سے میل ملاقات کر کے
مجھے فرصت ملی، تو قدم گھر سے باہر خود بخود اٹھتے چلے گئے
وہ مدہوشی کی کیسی کیفیت اور انجانی کشش تھی، جس
نے مجھے اس بوڑھے برگد کے نیچے پہنچا دیا۔ جس کے نیچے
کتنے قافلے رکے، تھکے ماندے لوگ تازہ دم ہوئے۔ اور
آج برسوں کی مسافت سے لوٹنے والا مسافر جب لوٹتا ہے
تو اسے انوکھا تجربہ ہوا۔ یہ بوڑھا برگد جو میرے لمحوں لمحوں
کا رازداں ہے۔ جب میں نے پاؤں چلنا سیکھا تو اپنے
معصوم ساتھیوں کے ساتھ یہاں آتا، کھیلتا، وہ وقت
جب میں زندگی کے فلسفے سے آگاہ نہ تھا، جب زندگی آتے
جاتے سانسوں کے سلسلے کا نام تھا ماہ و سال کی قید میں مقید
لمحے وقت کہلاتے تھے۔ اور اس راز کا بھی آمین تھا۔ جب
میں مسلسل جدوجہد سے دنیا میں اپنے نام کا آرزومند تھا
ایسا نام جو میری شناخت اور پہچان ہو۔

اور آج جب میرا نام ہے۔ مقام ہے۔ پہچان ہے،
شناخت ہے، اور اس سب کچھ کے باوجود میری روح کو
وہ شانتی نہ ملی جو منزل پہ پہنچنے والے مسافر کا مقدر بنتی ہے

اور جب میں نے اپنی بوڑھی ماں کی آغوش میں سر رکھ کر
آنکھیں موندیں، تو دو موتی میرے چہرے پہ ٹپکے۔ جو انتظار
کی سیپ میں بند تھے، کہ اس نے جس کی خواہش کی تھی
پالیا تھا۔

کیا میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ اور پھر عجیب سی محرومی
کیوں۔؟ جب ماں نے کہا اب واپس نہ جانا۔ میں تیرے بغیر
زندہ نہیں رہوں گی۔ اس گھر کو سنبھالو۔ اس کی تکمیل کرو، یہ
ادھورا سونا گھر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ تو ماں کے
آگے سر جھکا دینے والا بیٹا اس کی خواہش کے آگے ہتھیار نہ
ڈال سکا۔ کہ کامیاب، و بامراد انسان والا سکون میری زندگی
میں نہیں ہے۔ اور اس کی تلاش میں مجھے ایک دفعہ پھر دنیا
کے سمندر میں اترنا ہوگا۔ ماں نے میرے اٹل فیصلے کے آگے ہتھیار
ڈالے، تو چہرے پر مصنوعی خوشی کا رنگ بھرنے کی کوشش
کی تو میں نے سوچا ماں اولاد کی خوشی کے کتنی بے بس و
مجبور ہوتی ہے۔ میں نے تو ماں کو ناخوش کرنے کا کبھی سوچا
بھی نہ تھا۔ اپنے دھیان میں مگن، سوچوں میں الجھا بےخودی
میں قدم اٹھاتا مجھے برگد کے نیچے پہونچ کر میرے قدم رک
جاتے ہیں۔ کھری نواڑ کی چارپائی پڑی ہے میرا ماضی کھلی
کتاب کی طرح سامنے ہے۔ حال وسوسوں میں گھرا ہے مستقبل
کی کیا ضمانت ہے۔ میں اتنا بے سکون کیوں ہوں؟

سوچوں کے الجھے تانوں بانوں نے مجھے بے قرار کر دیا
ناگاہ میری نظر برگد کے موٹے تنے سے نیچے الجھی ایک دوسرے
میں گم پیوست جڑوں میں اٹک کر رہ گئی۔ ان الجھی پیوست
ایک دوسری میں گم زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے
جڑی شاخوں نے اس بوڑھے درخت کو سرسبز و شاداب
اور مضبوط بنایا۔ انہی گرم سرد زمانے کے جھکڑ سہے۔ تھکے
ماندہ مسافروں کو ٹھنڈک اور سایہ دیا۔ قافلے رکتے، ٹھہرتے
اور آگے بڑھتے رہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

چہرہ

مرتو سنجیونی کی بڑی بوتل ختم ہوگئی۔ تو امجد نے اختر کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا ــــ کیا خیال ہے ایک بوتل اور منگوائی جائے۔؟ پوری بوتل ختم ہوگئی مگر ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

معلوم ہوتا ہے دکان دار کارک کھول کر پانی ملا دیتا ہے۔ اختر نے جواب دیا ــــ پہلے ہم تینوں کے لئے ایک بوتل ہی کافی ہوتی تھی۔

آج کل جب ہر شئے میں ملاوٹ عام ہے۔ تو پھر اتنی قیمتی شئے بغیر ملاوٹ کے کیسے رہ سکتی ہے۔ انور نے تائید کی۔

بڑی بوتل منگواؤں یا چھوٹی۔؟

بڑی ہی منگوائی جائے، اختر نے جواب دیا۔ ورنہ پھر تشنگی رہ جائے گی۔ اور سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔

امجد نے پرس کھول کر پچاس روپے نکالے۔ اور انور کے حوالے کرتے ہوئے کہا ــــ ایک بڑی بوتل اور ساتھ میں تین چاپ اور ایک پاؤ چنا چور بھی لے لینا۔

انور نے روپے لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور آہستہ سے کمرہ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی ہوا کا ایک سرد جھونکا کمرے میں در آیا۔ اور ایک لطیف سی لہر پھیل گئی۔ باہر آسمان ابر آلود تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے تھوڑی ہی دیر میں بارش ہونے والی ہو۔

امجد نے کھلے ہوئے جنگلہ سے باہر جھانکتے ہوئے اختر کو دعوت دی، باہر کا موسم بڑا سہانا ہے۔ آؤ ہم دونوں جنگلے کے پاس بیٹھ کر تھوڑی دیر موسم کا لطف اٹھائیں۔

پھر دونوں جنگلے کے سامنے کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے،

یہ جگہ بڑی پرسکون ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا۔؟ امجد نے پوچھا،

اس میں کیا شک ہے۔ اختر نے جواب دیا ــــ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے یہ تمہارا یہ بنگلہ دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک ایسا گوشۂ عافیت ہو۔ جہاں کسی رنج و غم کا گزر نہ ہو۔ کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ مجھے تو یہ سکوت، یہ خاموشی فرحت بخش معلوم ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے یک گونہ بے خودی کے عالم میں تصور جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہیں۔ یہ رات یوں ہی دبے پاؤں دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی رہے۔ ہر طرف یہ چھائی ہوئی یہ گہری خاموشی یہ سکوت یہ احساس تنہائی کسی دوسری جگہ کہاں میسر ہوتی ہے۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ امجد نے کہا ــــ اسی لئے میں نے یہ بنگلہ اپنے قبضہ میں رکھا ہے۔ ورنہ تم تو جانتے ہو کہ بیوی بچے برسوں سے میرے ذاتی مکان میں رہتے ہیں۔ اور مجھے اس بنگلہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب میرا

دل دنیاوی ہنگامہ سے اکتا جاتا ہے۔ اس کمرے میں آ کر مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ بڑی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

پھر اس بنگلہ کا ایک فائدہ اور بھی ہے۔ امجد مسکرایا۔ ایسی مخصوص محفلوں کے لئے اس سے موزوں کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی۔

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو جب امجد کو تنخواہ ملتی۔ وہ یہ محفل ضرور سجاتا۔ اور خاص طور پر وہ اختر کو ضرور مدعو کرتا اور یہ محفل رات گئے تک جمی رہتی۔ دونوں پیتے کم تھے اور باتیں زیادہ کرتے تھے۔ ان کا موضوع زیادہ تر بیتے دنوں کے قصے ہوتے۔ رومانی اور رنگین داستانیں ہوتیں۔ کبھی کبھی امجد کوئی ایسی بپتی کہانی شروع کر دیتا کہ یہ محفل ایک دو بجے رات سے پہلے ختم نہ ہوتی۔

اس دن بھی امجد بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو کرنے کے بعد ہی موضوع بدل دیا اور ماضی کی داستان چھیڑ دی۔

وہ بڑی بے فکری کے دن تھے۔ میں محکمہ سول سپلائی میں افسر تھا۔ پیسوں کی فراوانی تھی۔ اس لئے چھٹی کے دن دارجلنگ چلا جاتا۔ سنیچر کی شام کو روانہ ہوتا اور اتوار کی رات گزار کر واپس آ جاتا۔ ان دنوں پہاڑی لڑکیاں بڑے سستے داموں مل جاتی تھیں۔ ان کا صحت مند گٹھا ہوا جسم بڑی بڑی قیمتوں پر حاصل کی ہوئی لڑکیوں سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا تھا۔ پھر یہ کہ وہ بڑی کوآپریٹو ہوتی تھیں۔ بلیک اینڈ وہائٹ کے ساتھ یہ لڑکیاں سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھیں

امجد نے اپنی باتیں ختم کر کے ایک لمبی سانس لی۔۔۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ کہ ان بیتی راتوں کی یادیں اب بھی مجھے بے چین کر دیتی ہیں۔

تو گویا تمہارا مزاج لڑکپن ہی سے عاشقانہ ہے؟ اختر نے چھیڑا۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان بیتے دنوں کی یاد میں اب تک کیوں جلتا رہتا۔ امجد نے جواب دیا۔

امجد کہانی سناتا رہا۔ اور اختر خاموشی سے سنتا رہا۔ اور ایک کے بعد دوسری کہانی جنم لیتی رہی۔

ان دنوں میں محکمہ خوراک کے سپلائی گودام میں تعینات تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔ امجد مسکرایا۔ وہاں ایک بڑی طرح دار بھنگن جھاڑو دینے آتی تھی۔ اس کا رنگ روپ اتنا تیکھا تھا۔ کہ کسی طرح بھی یہ یقین کرنے کو دل نہ چاہتا تھا کہ وہ بھنگن ہے۔ ویسے وہ تھی بھی بڑی نفاست پسند، صاف ستھرے کپڑوں میں نک سک سے درست جب وہ جھاڑو لگانے آتی تو شہزادی دکھائی دیتی۔

پھر تم نے اس کے حسب و نسب کا پتہ تو ضرور لگایا ہوگا اختر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کیسے نہ لگاتا۔ امجد نے جواب دیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی یہ صرف میرا ہی خیال نہ تھا۔ تمام لوگوں کا یہی خیال تھا۔ میں نے پتہ لگایا تو میرا خیال سو فیصد درست نکلا۔

اچھا! اختر نے حیرت کا اظہار کیا۔۔۔ تو کیا وہ واقعی بھنگن کی اولاد نہیں تھی۔؟

نہیں! امجد نے فخریہ لہجہ میں جواب دیا۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ بھنگی کالونی کے قریب ہی ایک پشاوری پٹھان رہتا تھا۔ جو ریلوے ملازمین کو سود پر روپے دیتا تھا۔ لانبا قد، گورا چٹا رنگ، وہ بڑا تنومند اور رجیلا پٹھان تھا۔ قمیص اور شلوار پر زرکاری کی ہوئی صدری اور سر پر کلغی لگا کر باہر نکلتا۔۔۔ تو لوگوں کی نگاہیں خود بخود اس پر مرکوز ہو جاتیں۔ وہ بھنگیوں کو بھی سود پر قرضے دیتا تھا۔ اور اس بھنگن کا چہرہ اس پٹھان سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔

پھر کیا ہوا ؟ اختر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

ہوتا کیا ۔ امجد نے جواب دیا۔ اس کو رام کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے ، وہ اتنی تنک مزاج تھی کہ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہ کرتی تھی ۔ ایک شان بے نیازی سے ہاتھ میں جھاڑو لیتے ہوئے گودام میں داخل ہوتی ، اور جھاڑو لگا کر اسی تمکنت سے واپس چلی جاتی ۔ ادھر تمام عملہ کا یہ حال تھا کہ وہ سب اس کے انتظار میں پہریں گنتے رہتے۔ اور اس کے آتے ہی جیسے بہار آجاتی ۔ سبھوں کی نگاہیں اس کی ایک ایک حرکت ، ایک ایک انداز ، ایک ایک ادا کا جائزہ لینے کے لئے اس کے گرد طواف کرتی رہتیں ۔ اس کی راہوں میں بچھی رہتیں ۔ اور لوگوں کے اس انداز فریفتگی نے اسے اور بھی مغرور بنا دیا تھا

پھر تم نے اسے رام کیسے کیا ؟ اختر نے بے چینی سے پوچھا

ریلوے ملازم ہونے کے سبب بھنگیوں کو بھی اسی گودام سے راشن دیا جاتا تھا۔ امجد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا لیکن راشن لینے اس کی ماں آتی تھی ۔ سو میں نے اس کی ماں سے دوستی پیدا کی ۔ اور اکثر و بیشتر اسے مفت راشن کے علاوہ قرض بھی دینے لگا۔ کبھی کبھی اسے سرکہ سنجوبلی کی بڑی بوتل کی قیمت بھی دے دیتا۔ اس طرح وہ تھوڑے ہی دنوں میں میرا احسان مند ہو گئی ۔ اور پھر اس قدر بے تکلف ہو گئی کہ پشاوری پٹھان سے اپنے تعلقات کا اعتراف بھی کر لیا۔

تم بڑے شاطر نکلے ، ؟ اختر نے ٹوکا۔

یہ سب ذہانت اور تجربے کی بات ہے پیارے ، !

امجد نے جواب دیا ۔ ایک روز شام ہو چکی تھی ۔ گودام بند ہو چکا تھا۔ تمام عملہ جا چکا تھا ۔ اور میں گودام کا سیل چیک کر کے باہر نکلنے ہی والا تھا ۔ کہ وہ مدہوشی کے عالم میں میرے پاس آئی ، اور سو روپیہ قرض مانگا ۔ اور جب میں نے اسے روپیہ دے دیا۔ تو وہ احسان مند نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی ۔

آپ کا مجھ پر بہت احسان ہے صاحب ! وہ تشکر آمیز لہجہ میں بولی ــــ ہم جیسے بھنگی آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں پھر بھی اگر کوئی کام ہو تو ضرور بتانا ،

وہ روپیہ لے کر جانے لگی ۔ تو میں نے کہا ــــ اگر میرا کوئی کام ہو تو کر دوگی ؟

وہ جاتے جاتے رک گئی ۔ اور پلٹ کر میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی ۔

کیا کام ہے صاحب ؟ بھنگی ہوئے تو کیا ہوا ، میرا باپ ایک ، میری زبان ایک ،

میں اپنی تنہائی سے بہت اکتا گیا ہوں ۔ میں نے پہلا تیر پھینکا۔

کیوں ؟ آپ کی بیوی بچے ، ؟ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

تین ماہ سے ہندوستان میں ہیں ۔ میں نے بے چارگی کے لہجہ میں جواب دیا۔

وہ چند لمحوں تک سوچتی رہی ۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی ــــ آپ کا بہت احسان ہے صاحب ، میں تیار ہوں ۔

وہ میرا مطلب غلط سمجھی ۔ اسے سمجھنا بھی چاہئے تھا۔ کیونکہ اس عمر میں بھی اس کے چہرے پر نکھار باقی تھا۔ اور جسم گداز اور دلکش تھا۔

میں نے اس کی نگاہوں میں خود سپردگی کا انداز دیکھ کر اپنے ترکش کا آخری تیر ہوا میں اچھال دیا۔

تو پھر تم لبنتی کو میرے پاس پہونچا دو ۔ میں تمہارا اسی جگہ انتظار کروں گا ۔ اتنا کہہ کر امجد خاموش ہو گیا۔

پھر کیا ہوا ۔ ؟ اختر نے جلدی سے پوچھا۔

تیر نشانہ پہ بیٹھا تھا ۔ امجد نے فتح مندانہ لہجہ میں جواب دیا ۔ نصف گھنٹہ بعد وہ لبنتی کو گودام میں پہونچا کر واپس چلی گئی

اتنے میں دروازہ کا پٹ وا ہوا۔ اور انور ہاتھ میں
تھیلا لئے کمرے میں آگیا۔ انور نے تھیلے کو ایک خالی کرسی پر رکھنے
کے بعد جیب سے بچے ہوئے روپے نکال کر امجد کی طرف بڑھا دیا
اسے تم رکھ لو۔ امجد نے بڑی اپنائیت سے کہا۔
میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ یہ غیریت کا انداز مجھے پسند
نہیں۔ بچے ہوئے روپے مجھے لوٹانے کی ضرورت نہیں۔
انور نے قدرے جھجکتے ہوئے روپے پھر اپنی جیب
میں رکھ لئے۔
بوتل کا کاگ کھولا گیا۔ اور تھوڑی دیر تک تینوں
ٹھہر ٹھہر کر گلاس میں انڈیلی ہوئی سیال کی چسکی لیتے رہے۔
اور چاٹ کھاتے رہے۔
پھر امجد نے اچانک کچھ یاد کرتے ہوئے اختر سے
پوچھا ــــ تمہارے محکمہ کا نیا کام کب تک شروع ہو رہا ہے؟
اسکیم منظور ہو چکی ہے۔ بس ایک یا دو ماہ میں کام
شروع ہو جائے گا۔ اختر نے جواب دیا۔
اب کے جب کام شروع ہو۔ تو انور کا خیال رکھو گے
امجد نے پہلا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا ــــ کوئی بھی کام ہو
اچھا یا معمولی، اسے لگا دو گے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ انور
ہمیشہ دفتر میں جونیئر کلرک تھا۔ لیکن قیام بنگلہ دیش کے بعد
اسے دوبارہ نوکری نہیں ملی، بے چارے کی مالی حالت بہت
خراب ہے۔ دس سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ بے کاری کتنی بڑی
عذاب ہے یہ تم بھی جانتے ہو۔ اور میں بھی۔ اتنی طویل مدت
اس نے کس طرح اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ گزاری ہوگی
تم خود اس کا اندازہ لگا سکتے ہو۔
امجد کا گلاس خالی ہوتے ہی انور نے اس کا نصف
گلاس بھر دیا۔ اور اختر نے دیکھا انور کے چہرے پر اس کے
اندرونی کرب کی پرچھائیاں بڑی نمایاں تھیں۔ اور اس کے
بوسیدہ کپڑے اس کی بدحالی کی غمازی کر رہے تھے۔

میں وقتاً فوقتاً اس کی مدد کرتا رہتا ہوں۔ امجد نے
پھر کہنا شروع کیا ــــ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس گرانی
کے دور میں دس بیس روپے تو اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر
ہیں۔ تمہیں اس کے لئے کچھ کرنا ہی ہوگا۔
ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا۔ اختر نے جواب دیا
نہیں کوشش نہیں، تمہیں وعدہ کرنا ہوگا۔
ٹھیک ہے چلو۔ وعدہ رہا۔
وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور دور چلتا
رہا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی، تقریباً ایک گھنٹہ بعد
جب بوتل خالی ہو گئی۔ تو امجد نے معنی خیز نگاہوں سے اختر
کی طرف دیکھا۔
کہو یہ دور کیسا رہا۔؟ تشنگی دور ہوئی یا نہیں؟
ہوئی کیوں نہیں۔ اصل لطف تو اب آیا ہے۔ آج
صحبت بری نہیں رہی۔
پھر باہر بارش ہوتی رہی۔ اور وہ دونوں گرانی پر گفتگو
کرنے لگے۔ چیزوں کی قیمت اتنی گراں ہو گئی ہے۔ کہ روپے کی
کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔
تم ٹھیک کہتے ہو اب تو سو روپے کی قیمت سابقہ
دنوں کے دس روپے کے برابر بھی نہیں رہی۔ اختر نے تائید کی
میری تو پوری تنخواہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی ساتھ
چھوڑ دیتی ہے۔ امجد نے کہا ــــ مہینے کی آخر میں بہت ساری
ضروریات دوسرے ماہ پر اٹھا رکھنی پڑتی ہے۔
جب آمدنی محدود ہو تو اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے
اختر نے جواب دیا۔ پھر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ پڑتے ہی
اٹھ کھڑا ہو گیا ــــ باتوں میں وقت کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ رات
کا ایک بج چکا ہے۔ اب مجھے چلنا چاہئے۔
بارش تو ابھی تھم چکی ہے۔ موسم بھی ٹھنڈی ٹھنڈی
ہواؤں میں بھیگ کر سہانا ہو گیا ہے ــــ امجد نے کہا۔

ایسے میں گھر کیسے جاؤ گے ، ؟

یہ بارش کب رُکے . اختر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ـــ لیکن اس بارش میں بغیر چھتری کے اتنی دور جانا بھی تو ممکن نہیں ۔

پھر کیوں نہ شب بیداری کی جائے ، امجد نے چمکتی ہوئی نگاہوں سے اختر کی طرف دیکھا ـــ کہو تو انتظام کیا جائے ۔ ؟

کیسی شب بیداری ، ؟ اختر نے استفسارانہ لہجے میں پوچھا ـــ

امجد مسکرایا ۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے ، سب اسی زلف کے اسیر ہوئے ،

اتنی رات گئے زلف سیہ دراز کہاں سے لاؤ گے تم ؟

اختر حیران تھا ۔

تم انور کو کیا سمجھتے ہو ۔ امجد نے جواب دیا ۔ یہ بڑے کام کا آدمی ہے ۔ پھر امجد نے انور سے مخاطب ہو کر پوچھا ـــ کیا خیال ہے تمہارا ، ہو جائے گا انتظام ، ؟

کوشش کرتا ہوں ۔ انور ایک فرمانبردار خادم کی طرح اٹھ کھڑا ہو گیا ۔

تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد انور واپس آیا ۔ تو امجد نے سرگوشیانہ لہجہ میں پوچھا ـــ لے آئے ، ؟ سب ٹھیک ہے نا ؟

میں جتنے گھر جانتا تھا ۔ ہر جگہ دیکھ آیا سبھی انگیج ہے ۔

انور اپنی ناکامی پر قدرے پریشان دکھائی دے رہا تھا

ایک بار پھر کوشش کرو ، امجد بے چین ہو اٹھا ،

ریٹ زیادہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں ۔

انور پھر کمرے سے باہر نکل گیا ۔

اب کے وہ جلد ہی واپس آ گیا ۔ لیکن اس بار اس کے کمرے میں داخل ہونے کے انداز ہی سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کامیاب لوٹا ہے ۔

لے آئے ، امجد نے پھر سرگوشی کی ۔

ہاں ! انور نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ۔ صبح کی اذان سے پہلے گھر واپس بھیج دینا ہو گا ۔ دو سو میں بات کی ہے ۔ اور رکشا والے کو بیس روپے دینے ہونگے ۔

کوئی بات نہیں ۔ امجد نے بڑے مطمئن لہجہ میں جواب دیا

اس کو کھانا بھی کھلانا ہو گا ۔ انور نے آہستہ سے کہا ۔ !

کھانا کھلانا ہو گا ۔ ؟ امجد حیرت سے انور کا چہرہ دیکھنے لگا

شریف عورت ہے ۔ مجبوراً اس لائن میں آئی ہے ۔ انور نے جواب دیا ۔ اس نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے

باہر کی تمام لائٹ آف کر دی گئی ۔ صرف امجد کی خواب گاہ میں روشنی پھیلی رہی ۔ اور انور نے سیاہ برقعہ میں لپٹی ہوئی اس عورت کو امجد کی خواب گاہ میں پہونچا دیا ۔

بارش تیز ہو گئی تھی ۔ اور رات خنکی میں ڈوب چکی تھی اور ہوا کے جھکڑ چلنے لگے تھے ،

جب اختر کو پہل کرنے کو کہا گیا ۔ اور وہ کمرے میں پہونچا تو اس عورت کا چہرہ دیکھ کر اسے اس پر ترس آنے لگا ۔ عورت بے حد حسین تھی ، گداز اور صحت مند جسم ، گورا رنگ ، معصوم چہرہ ، اسکی عمر تیس بتیس سال سے کم نہ تھی ۔ مگر چہرے سے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ کم عمر دکھائی دے رہی تھی ۔ ایک معمولی سی ساڑھی میں لپٹی ہوئی وہ اس پھول کی طرح نظر آ رہی تھی جسے وقت کی تمازت نے جھلس کر رکھ دیا ہو ۔ اختر کے دل میں اس عورت کے لئے جذبہ ترحم ابھر آیا ۔ اور وہ الٹے پاؤں واپس آ گیا ۔

پانی برستا رہا ۔ ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہیں ۔ سیاہ لبادے میں لپٹی ہوئی رات دھیرے دھیرے ڈھلتی رہی ۔ اور وہ دونوں امجد کی خواب گاہ کا پھیرا لگاتے رہے ۔

صبح کو جب اس عورت کو رخصت کر دیا گیا تو امجد

اختر کو بتایا ـــــ اس عورت نے تو مجھے پہاڑی لڑکیوں کی یاد دلا دی، واقعی بڑی شریف عورت تھی۔ اس نے تو میرے ہر حکم کی تعمیل یوں کی تھی جیسے وہ میری منکوحہ بیوی ہو۔ اس نے تو کسی بات پر بھی تو اعتراض نہیں کیا تھا۔

اس واقعہ کے تین ماہ بعد ایک شام وہ عورت اختر کو ایک دکان میں ساڑھی خریدتی ہوئی دکھائی دی، وہ ایک عمدہ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک وینیٹی بیگ بھی تھا۔ اختر پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھی۔ اور جلدی سے اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

اس کی اس حرکت پر اختر کے لبوں پر غیر ارادی طور پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے اور اختر کی نگاہوں میں وہ بھیگی ہوئی رات گردش کرنے لگی تھی اور وہ سوچ رہا تھا۔ یہ چہرے بھی کبھی کبھی کتنے مخفی راز افشاء کر دیتے ہیں۔ اور یہ چہرے بھی کتنی جلدی بدل جاتے ہیں۔ اس عورت کے چہرے پر ایک نیا خول چڑھ گیا تھا۔ اور اب وہ اپنا پہلا چہرہ کھو بیٹھی تھی۔ جو اس کے نئے چہرے سے زیادہ دلکش اور قیمتی تھا۔

اس نے اپنا وینیٹی بیگ کھولا، اور ساڑھی کی قیمت ادا کرنے کے لئے روپے نکال ہی رہی تھی کہ ہاتھوں میں کھلونے لئے دو بچے عقب سے آ کر اس کے جسم سے لپٹ گئے۔ اختر چونک کر دیکھا۔ الوزا الٹے پاؤں بھاگا جا رہا تھا۔

●●

بقیہ: پاکستان کے تین اردو ناول

لحاظ سے بھی نئے اور منفرد ہیں۔ ان میں روشن آرا زہت کا ناول "روشنی کے پاؤں" نشاط فاطمہ کا "پھول گرتے ہیں" اور رضیہ انور کا ناول "ایک اور سومنات" قابل ذکر ہیں۔ ان کا ذکر کرنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں پاکستان میں مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے ناول اردو کے افسانوی ادب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں یہ بھی ممکن ہے ان میں سے کچھ ناول جو کہ اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے بالکل نئے ہیں۔ آئندہ ناول نگاروں کے لئے نئی راہیں دکھائیں۔ اور ان موضوعات پر اس سے بھی اچھے ناول لکھے جائیں۔

●●

بقیہ: جرمانہ

بازوؤں میں جکڑ لیا۔ یوں جیسے وہ کوئی مقناطیسی مشین ہو۔ اور پھر وہ دونوں ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح دھپ سے بستر پر گر پڑے۔ اس عورت کی بازوؤں کی گرفت اتنی سخت، اور اس کے جسم میں حدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ موم کی طرح پگھل کر ڈھیر ہو گیا۔

صبح جب اسسٹنٹ ماسٹر الوزحسین کی آنکھ کھلی، تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ اس کے پہلو میں وہ عورت نہیں تھی، کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ کہاں چلی گئی۔ اس نے برآمدے میں دیکھا، آنگن میں دیکھا وہ کہیں نہیں تھی۔

پھر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ جب اس نے الماری کی طرف دیکھا، تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ الماری کے سیف بکس میں جو بھی نقدی اور سونے چاندی کے زیورات تھے سب غائب تھے۔

●●

ڈاکٹر عزیزی (بنگلہ دیش)

جرمانہ

آج صبح ہی سے اس کی طبیعت بڑی کسل مند تھی ۔ اور اس کے جوڑ جوڑ میں ایک عجیب سی بے چینی سما گئی تھی ۔ اور سارے جسم میں میٹھا میٹھا درد محسوس ہو رہا تھا ۔

رات کے دو بجے جب آخری ٹرین چلی گئی ۔ اور اسٹیشن ماسٹر انور حسین کی ڈیوٹی آف ہوئی تو وہ آفس سے نکل کر ایک لمحہ کے لئے پلیٹ فارم پر رُک گیا تھا ۔ پلیٹ فارم ایک دم ویران و سنسان پڑا ہوا تھا ۔ اور اداس بجھتے ہوئے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں سارا ماحول سحر زدہ سا لگ رہا تھا تھرڈ کلاس ویٹنگ روم کے سامنے پہونچکر اس نے اندر کی طرف غیر ارادی طور پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی ، اندر دو تین مسافر گھوڑا بیچ کر سو رہے تھے ، اور ایک کنارے نیم تاریک گوشے میں ایک جوان عورت دیوار سے ٹیک لگائے بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی ۔

پہلے تو انور حسین کو اس عورت کو اتنی رات میں تنہا یوں ویٹنگ روم میں تنہا بیٹھے ہوئے دیکھکر سخت تعجب ہوا تھا کون ہو سکتی ہے یہ عورت ۔؟ اس نے دروازے پہ کھڑے ہو کر غور سے اس عورت کا چہرہ دیکھا ۔ وہ متناسب جسم اور قبول صورت عورت تھی ۔ جو چہرہ مہرہ سے کوئی شریف عورت معلوم ہوتی تھی ۔ اس نے سوچا شاید وہ آخری ٹرین سے اُتر کر ویٹنگ روم میں آگئی ہے ۔ لیکن وہ تنہا سفر کیوں کر رہی تھی؟

پھر اس نے اپنے ذہن میں اس ابھرتے ہوئے سوال کو جھٹک دینا چاہا ۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا ۔ یوں تو ویٹنگ روم میں اکثر و بیشتر جوان عورتیں ٹرین سے اتر کر صبح ہونے کے انتظار میں یا صبح کی ٹرین پکڑنے کے لئے دور دراز کے علاقے سے آکر ٹھہر جایا کرتی تھیں ، لیکن ان کے ساتھ کوئی مرد یا کوئی چھوٹا بچہ یا دوسری عورت ہوا کرتی تھی ، ویسے وہ بازاری لڑکیوں اور عورتوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا ۔ جو ہر روز پلیٹ فارم پر ادھر ادھر کتیوں کی طرح ماری ماری پھرا کرتی تھیں ۔ اور ان عورتوں کو دیکھ کر اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی تھی ۔ اور نہ جانے کیوں بناؤ سنگار کے باوجود ان کو دیکھکر اسے کراہت ہوتی تھی ۔

یہ عورت بظاہر شریف معلوم ہو رہی تھی ، لیکن اس کے اس طرح ویٹنگ روم میں تنہا ہونے پر اس کے دل میں شبہ پیدا ہونے لگا ۔

پھر وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا ویٹنگ روم کے اندر داخل ہو گیا ۔ ویٹنگ روم میں اسے داخل ہوتے دیکھ کر وہ عورت ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی ، اور چند لمحوں تک وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ۔

اسٹیشن ماسٹر انور حسین نے بغور اسے دیکھا وہ

جوان تھی، ایسی جوان کہ اس کے انگ انگ سے شباب کی بو
آرہی تھی، وہ حسین تھی ایسی حسین کہ جیسے شبنم کی بوندیں پڑنے
سے پھولوں میں نکھار آجاتا ہے۔ گداز جسم اور جسم کے نشیب
و فراز ایسے کہ اچھے بھلے زاہد بھی اپنا راستہ بھول جائیں۔ اور
ایک لمحہ کیلئے انور کے منہ میں پانی آگیا۔ دل خود بخود دھڑکنے
لگا۔ اس نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا، آس پاس کوئی بھی
نہیں تھا۔ اس نے ہمت کرکے اس عورت سے ایک سوال کیا

کون ہو تم ؟

جی! میں تو مسافر ہوں، عورت سہم گئی۔

وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ لیکن تم یہاں تنہا کیوں بیٹھی
ہو ؟ اور کون ہے تمہارے ساتھ ؟

میرے ساتھ ؟ میرے ساتھ تو اور کوئی بھی نہیں، !
عورت نے اس طرح سہمے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

پھر تم یہاں کیا کر رہی ہو ؟ انور نے مشکوک لہجہ
میں پوچھا!

میں دو بجے کی گاڑی سے کھلنا جارہی تھی، عورت
نے کہا۔ لیکن گاڑی میں رش ہونے کے سبب ڈبے میں
سوار نہ ہوسکی۔ اور گاڑی چھوٹ گئی۔ میری ماں اور بھائی
پتہ نہیں کس ڈبے میں سوار ہوگئے، میں انہیں ڈھونڈتی رہی
اور ٹرین چل پڑی۔

پتہ نہیں کیوں پھر بھی انور کو اس کی باتوں پر یقین نہ
آیا۔ اور وہ اسے نگاہوں سے ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ اس عورت
میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ اسے تنہا دیکھ کر نہ جانے کیوں اس
کے رگ و پے میں گرم گرم خون تیزی سے دوڑنے لگا تھا۔ اور
اس کے سارے جسم میں ایک ایسی حرارت پیدا ہوگئی تھی۔
کہ اس کی تپش سے اس کا سارا وجود جھلس رہا تھا۔ پھر اس
نے دل میں سوچا کہ اگر یہ شریف عورت ہوتی تو پھر اتنی رات
کو تنہا ویٹنگ روم میں کیوں بیٹھی رہتی۔ اپنے گھر نہ لوٹ جاتی

مگر یہ بھی کوئی ایسی ویسی عورت ہے۔ اور انور حسین نے ٹوہ
لینے کے لئے ایک بار پھر اس سے سوال کیا۔

لیکن یہاں تمہارا تنہا رہنا ٹھیک نہیں۔

پھر میں کیا کروں ؟ عورت نے بڑی بے بسی سے جواب
دیا۔ اس وقت تو تنہا گھر جانا بھی ممکن نہیں،

کہاں رہتی ہو ؟

افسر کالونی کے آخری سرے پر،

انور چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے اس
عورت سے کہا!

ایسا کرو۔ تم آج کی رات میرے کوارٹر میں بسر کرلو ،
پھر صبح چلی جانا،

انور کے یہ جملے سنتے ہی اس عورت کے تیور بدل
گئے۔ جیسے گلابی رنگ میں کسی نے تارکول ڈال دیا ہو۔ اور
بپھرے ہوئے انداز میں اس نے کہا۔

آپ نے مجھے کوئی آوارہ عورت سمجھا ہے کیا ؟

اس عورت نے کچھ ایسے تیز و تند لہجہ میں جواب دیا
کہ اسٹیشن ماسٹر انور حسین ایک لمحہ کے لئے سٹپٹا کر رہ
گیا تھا۔ اس نے سوچا وار خالی گیا۔ تیر نشانے پر نہ لگا۔ اور
وہ ایک دم اول جلول کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کہیں
کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ کہیں کوئی اس کی گفتگو سن
تو نہیں رہا ہے۔ مگر وہاں آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ اور
ویٹنگ روم کے اندر سوئے ہوئے مسافر اب بھی گہری نیند میں
خراٹے لے رہے تھے،

اس بار انور حسین نے بڑے ہی نرم و نازک لہجہ میں
اس سے کہا

یقیناً تم آوارہ عورت نہیں ہو۔ کسی شریف گھرانے
کی عورت ہو۔ اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ رات میرے
کوارٹر میں گزار لو۔ میں بھی ایک شریف آدمی ہوں

اور میرا فرض ہے کہ میں تمہاری مدد کروں۔
اتنا کہہ کر انور خاموش ہو گیا۔ اور اپنی باتوں کا جیسے پر ردِ عمل دیکھنے لگا۔ لیکن وہ نظریں جھکائے خاموش رہی۔ تو انور حسین نے پھر کہا۔
مگر تمہیں نہیں معلوم کہ یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ آخری گاڑی جا چکی ہے۔ پلیٹ فارم سنسان پڑا ہے۔ ایسے میں کوئی غنڈہ تمہیں اٹھا کر لے جائے گا تو کیا کرو گی؟
انور کی باتیں سن کر وہ عورت جیسے ایک دم سہم گئی اور پھر اس نے انور کو یوں دیکھا جیسے وہ اس کے حکم کی تعمیل کرنے پر رضامند ہو۔ پھر اسٹیشن ماسٹر انور حسین آگے بڑھ گیا تھا۔ اور وہ عورت اس کے پیچھے یوں چل پڑی جیسے اس عورت کی تکمیل انور حسین کے ہاتھ میں ہو۔
تھوڑی دور چلنے کے بعد نیم تاریکی میں انور حسین نے اس عورت کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اس کے لمس سے اس نے اپنے اندر ایک چنگاری سی چھوٹتی ہوئی محسوس کی۔ اس عورت نے نہ تو اس کے ہاتھ کو جھٹکا۔ اور نہ تو اپنی زبان ہی سے کچھ کہا۔ تو انور حسین نے اپنے ہاتھ کی گرفت اور بھی مضبوط کر لی۔ اور اس سے کہا۔
تم گھبرانا نہیں۔ میں صبح تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ آؤں گا
مگر اس نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اسی لمحہ انور حسین اپنے گھر پہونچ گیا۔ دروازے کا تالا کھول کر اس عورت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے آنگن میں داخل ہو گیا۔ پھر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اس نے اس سے کہا۔
اندر آ جاؤ۔ ان دنوں میں یہاں تنہا ہوں۔ کیونکہ بیوی اور بچے چاٹگام گئے ہوئے ہیں۔
لیکن میں یہاں آپ کے ساتھ اس کمرے میں کیسے رہوں گی؟
مجھ جیسے نوجوان فضول باتوں کو۔ ایک رات سو لینے میں کیا بگڑ جاتا ہے۔ پھر مجبوری میں ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔ ویسے تم

میری بیوی کے بستر پر سو جاؤ۔ اور مچھر دانی کھینچ دو۔ کمرے میں مچھر بہت زیادہ ہے۔
اور وہ عورت یوں خاموش ہو گئی۔ جیسے ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ اور جرمانہ بھرنے کے ڈر سے خاموش ہو گئی ہو۔
پھر انور حسین نے اس سے کہا۔
تم بلا جھجک اس پلنگ پر لیٹ جاؤ۔ میں تھوڑی سی دوا پی لوں۔ مجھے گذشتہ کل سے ٹھنڈک لگ گئی ہے۔
مگر اس میں اتنی جھجک تھی کہ وہ پلنگ پر لیٹ جانے کی بجائے دونوں پاؤں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور اپنی تیکھی نظروں سے انور حسین کو دیکھتی رہی۔
اس دوران انور حسین نے پلنگ کے سرہانے سے کنجی نکال کر الماری کو کھولا۔ پھر الماری سے 'بلیک ہورس' کی بوتل نکال کر میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر رکھے ہوئے گلاس میں بوتل کو انڈیلا۔ اور وہ گلاس اٹھا کر غٹاغٹ پی گیا۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد ایک گلاس اور پی گیا اس طرح کئی وقفے کے دوران کئی پیگ پی گیا۔ تو اسے ایک سرور سا محسوس ہوا۔ اس کا انگ انگ جھنجھناتا ہوا سا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اور آنکھوں میں نشہ کچھ ایسا غالب آیا کہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی وہ عورت خلاؤں میں پریوں کی طرح اڑتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔
جب وہ کرسی پر سے اٹھا، تو اس وقت اس کا جسم اس کے قابو میں نہیں تھا۔ وہ اس عورت کے قریب سے گذرتا ہوا اپنے پلنگ کی طرف جا رہا تھا۔ کہ وہ عورت اٹھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس عورت کی یہ ادا اسے بہت اچھی لگی۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اس کا ذہن ایک دم جھنجھنا اٹھا۔ اور اس کے جذبات ایک دم شعلہ کی طرح دہکنے لگے۔ اور ابھی وہ کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ اس عورت نے اچانک اسے اپنے

(باقی ۴۴۳ پر)

شاہد انور

نکڑ پر کھڑا ایک لڑکا

کتاب محل سے نکلتی ہوئی وہ پھر دکھائی پڑی۔

مدن کے بدن میں وہی پرانی لہر دوڑ گئی، اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اور گلاس سے چھلک کر چائے کی دو تین بوندیں سامنے بیٹھے ہوئے بابو کی سفید پینٹ پر گر گئیں۔ اور وہی مانوس ڈانٹ کا ہے بے، اندھا ہو گیا ہے کیا۔ ؟ چل پانی لا۔ سالے نے اچھی، خاصی پینٹ برباد کر ڈالی، اور اس کا وہی پرانا جواب۔ انگلیوں سے دھیرے دھیرے ٹپکتا ہوا پانی چائے سے ابھرے ہوئے پیلے داغ کو دھونے لگا۔ بابو اب بھی گالیاں بکے جا رہا تھا۔

باہر دھوپ اتنی شدید نہیں تھی، لیکن اس کے اندر گرمی عجیب انداز سے پنپنے لگی تھی۔ پورے بدن پر پسینے کی لکیریں دوڑنے لگیں۔ اور وہ لڑکی اس کی نگاہوں کے تعاقب سے، بے نیاز اپنے گرد ٹھنڈا ٹھنڈا دریا بہائے چلی جا رہی تھی۔

تقریباً ایک ماہ سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ چولہے پر کیتلی چڑھاتے ہوئے راکھ سے بھری بالٹی کوڑے دان میں الٹتے ہوئے، یا کسی گاہک کو چائے دیتے ہوئے اس کے بدن میں ایک عجیب سی لہر اٹھنے لگتی۔ اور نظریں خود بہ خود سامنے کتاب محل کی سیڑھیوں سے جا ٹکراتیں۔ جہاں وہی لڑکی آتی یا جاتی دکھائی پڑتی۔ نظریں جھکائے ہوئے ایک ایک قدم کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہوئے اور مدن اسے تب تک دیکھتا رہتا، جب تک کہ وہ کالج کے ترسے گیٹ میں داخل نہ ہو جاتی۔ پھر تو سارا دن مختلف قسم کی تصویروں کے ناچ کی نذر ہو جاتا۔ کبھی لڑکی کا تمتمایا ہوا چہرہ سامنے آتا، تو کبھی دلکش زاویے بنائے ہوئے ہاتھ، اور پورے دن رہ رہ کر کانپ جانے والے ہاتھ۔ مانوس ڈانٹ اور اس کے پرانے جواب کا سلسلہ چلتا رہتا

رات کو دوکان بند کرنے کے بعد جب وہ سڑک کے کنارے بچھی بینچ پر اپنی پھٹی ہوئی چادر بچھانے لگا۔ تو اچانک اس لڑکی کا بڑا سا ایک چمک دار بلو آپ نہ جانے کہاں سے آ کر اس کے ذہن سے چپک گیا۔ اور وہ آنکھیں مضبوطی سے بند کئے اس بلواپ کے ساتھ اپنی ایک پرانی تصویر جوڑنے لگا لیکن جب جب وہ اپنی تصویر اس چمکدار فوٹو کے قریب لاتا وہ غائب ہو جاتی، اور پھر پوری سطح پر صرف اس کی تصویر پڑی رہ جاتی، اور جیسے ہی اپنی تصویر وہاں سے ہٹاتا وہ بڑا سا بلواپ چمکنے لگتا۔ اس لگاتار جوڑ توڑ سے اس کا ذہن تھک گیا۔ اور اسے نیند آ گئی۔

اچانک ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھوں کے لمس سے اس کی آنکھیں کھل گئیں، اس کا یار بھیکو سامنے کھڑا تھا۔ بھیکو دن بھر دیواروں پر سینما کا پوسٹر چپکاتا اور رات میں شہر کی کوئی [illegible]

کیا بات ہے۔ [illegible]

بڑی پھر کلاس چیز دیکھا تا ہوں۔

ادں، چھوڑو، صبح میں دیکھ لیں گے ۔ نیند آ رہی ہے [illegible] جگہ بناتے ہوئے کہا۔

ارے اسے دیکھ لوگے تو رات اور بھی مزے میں گزرے گی ۔ بھیکو نے ایک بنڈل کی اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا۔

دونوں لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے ہو گئے ۔ بھیکو نے بنڈل سے ایک پوسٹر نکالا ۔ اور بلب کی روشنی میں زمین پر پھیلا دیا۔ پوسٹر میں ایک رنگین تصویر چھپی تھی ، جو کسی نیم برہنہ لڑکی کی تھی ، اور نیچے لکھا تھا ـــــ "سونپور کے میلہ میں ساؤتھ کی مس ڈائمنڈ کا کیبرے"

کیوں مزہ آیا۔ اور بھیکو ہو ہو کر کے ہنسنے لگا ۔ اسے بھیکو پر غصہ بہت آ رہا تھا ۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی الم غلم تصویر یا کتابیں لا کر اس کو دکھایا کرتا تھا ۔ لیکن تھا دل کا دھنی آدمی اپنی ماں کو بھیجے جانے والے پچاس روپوں میں جب بھی کمی ہوتی تو بھیکو ہی مدن کی مدد کرتا تھا۔

کل بجّو بابو کا جہاز سونپور جا رہا ہے ۔ سو لو اسے کہہ کر دو ٹکیٹ کل ہی منگوا لوں گا ۔ اس بار تو اور بھی زبردست بھیڑ ہوگی ، کیوں تو چلے گا نا ؟ "نہیں" مدن نے سختی سے منع کیا

ابے بڑے بڑے بلبوں میں جب مس ڈائمنڈ کو دیکھے گا نا ، تو مزہ آجائے گا مزہ ، بھیکو پھر بھونڈے پن سے ہنسنے لگا

میں نے کہہ دیا نا ! مجھے یہ سب نہیں دیکھنا ۔ اور مدن منہ پھیر کر سونے لگا:

لیکن یک بیک اس کے اندر سانپ کی پھنکار جیسی کوئی چیز سر اٹھانے لگی ۔ ایک بجاسے اگ وپے میں تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا ۔ اور وہ بڑا اسا اضطراب ہوا میں سر ہلانے لگا ۔ اس نے پلٹ کر دیکھا بھیکو سو چکا تھا ۔ اور وہ بنڈل بغل میں دبا ہوا تھا ۔ اس نے آہستہ سے ایک پوسٹر نکالا ۔ اور لیمپ پوسٹ کے نیچے جا کھڑا ہوا ۔ رنگین تصویر اور بلب [illegible] جلتی ہوئی روشنی ، لڑکی کے جسم کا ایک ایک حصہ اس کے سامنے ناچنے لگا ۔ کوئی عضو ایسا نہیں تھا جو نظروں سے اوجھل ہو ۔ اور اچانک ایسا ہوا کہ مس ڈائمنڈ کا سر اس کی تصویر سے غائب ہو گیا ۔ اور وہاں اس لڑکی کا چہرہ آ بیٹھا ، مدن کی انگلیاں تیزی سے تصویر پر دوڑنے لگیں ...... اور لمحہ بہ لمحہ اس کی ہتھیلیوں کی گردش تیز ہوتی گئی ، ...... تیز ...... اور تیز ،

اس نے جھنجھوڑ کر بھیکو کو اٹھایا ۔ اور ایک ہی سانس میں کہہ گیا ۔ کل میرے لئے بھی ایک ٹکٹ منگوا لینا ،

بھیکو کے چہرے پر بے یقینی اور حیرت نے مل کر عجیب سی سیاہی مل دی تھی ۔

●●

بقیہ : برگد

جب جوانی میں حوصلہ ، جوش اور ہمت تھی ، اس زمین سے رشتہ توڑ کر دیار غیر کو سدھارا ، تو پرسکون و صحت مند زندگی کی ضمانت کس سے چاہتا ہے ،

شعور ، آگہی اور ادراک کے کتنے پٹ خود بخود کھلتے گئے ، وہ خزانہ جس کا سراغ نہ مل رہا تھا ، کھل جا سم سم کی طرح منہ بار غار کا دروازہ خود بخود وا ہو گیا ۔ اور میرا گم شدہ خزینہ ڈھیر بنا میرے سامنے ہے ۔

یہ میرے وطن کی کشش ، میری دھرتی کی خوشبو ، میرے دیس کی پکار تھی ، جو مجھے کہیں چین نہ لینے دیتی تھی ، اس سے کٹ کر سکون پانا کیسے ممکن تھا ۔

یہ راز بوڑھے برگد نے اس کان میں انڈیلا ، تو ہلکا پھلکا خوش و مسرور ہو کر چل دیا " ماں اب [illegible] تجھے چھوڑ کہیں نہیں جاؤں گا " اس نے ماں کی گود میں رکھ کر آنکھیں بند کر لیں ، سکون ہی سکون تھا ۔!

●●

رؤف صادق

کانچ کا گلاس، شب

نور نور جسم میں
خواہشوں کا در گزر
کھڑکیاں، دیوار و در
کھلے سر
سڑک پہ
برہنہ پا
خاموشی سانپ کی
سرسراتی گھاس میں
پرس میں
جیب میں
آنکھ میں
لفظ میں
لفظ لفظ پھول میں
سرد سرد لاتت کی
گرم گرم خوشبوئیں
دھول میں اٹی ہوئیں،
دبی ہوئی کتابیں تھیں
لفظ لفظ چیختا
نکالو کھینچ کر مجھے،
مگر صدا ہے بے صدا
ایک عجیب خاموشی
دھڑکنیں — خاموشی
کانچ کا گلاس، شب
لمس کے فرش پہ
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی،
سرخ سرخ خون میں
کرچیوں میں بٹ گئی،
بوند بوند آنکھ سے
آسمان ٹپک پڑا
قلب میں نہیں کوئی
دور تک اندھیرا ہے
کس کو کیا سجھائی دے
قبر ایک مقدر ہے
جیسے گھر ہو مفلس کا
میں وہاں نہ جاؤں گا
دور تک اندھیرا ہے
قلب میں نہیں کوئی
یہ خواہشیں
یہ الفتیں
ذرا ذرا سی بات پہ
لٹا پڑا
مکھیاں مٹھائی سے
بھنبھنا کے سارے گھر میں پھیلی ہیں
پھر عجیب خاموشی
سمندروں کی خاموشی
کچھ ہوا — ہوا نہیں
صرف لفظ لڑ پڑے
لفظ لفظ زخمی ہیں
وہ لفظ بھی ادھار تھے
پیار کے
خلوص کے
آستیں پھٹے ہوئے
دل میں سانپ چھپ گئے
اے ہواؤ، بتلاؤ
سانس میں اتر جاؤ
تم پہ نام لکھا ہے
بادبانی سمتوں کا
ایک پیام لکھا ہے
جان لیوا تنہائی
پھول تن کر جوڑے میں
سوکھ سوکھ جاتی ہے
نیند کس کو آتی ہے
شب گزیدہ ہاتھوں میں
کشکول کیسا ہے
خود کو ڈال کر دیکھیں
پھینک دے کر جسموں کی
جسم کھوٹے سکے ہیں۔
دھول میں اٹے ہوئے
ورق ورق جھاڑ دیں
شاید لفظ معتبر
تازہ تازہ سانسیں لیں!

....لہورو، کے لکھا.....

نفیس قریشی

(نذرِ کلام حیدری۔ کہ اس کی تحریک ان کے
افسانوی مجموعے کے نام سے ملی)

سانحہ دل پہ جو گزرا ہے، لہو رو کے لکھا
یاد جو کچھ ہمیں آیا ہے، لہو رو کے لکھا
قہر، طوفانی ہوا، سیلِ بلا کا قصہ
خشک آنکھوں کا جزیرا ہے، لہو رو کے لکھا
سایہ، سائے کا ہے قاتل، تو کہیں قتلِ وفا
ہم نے جو کچھ یہاں دیکھا ہے، لہو رو کے لکھا
گھر سے بے گھر ہوئے ہر لمحہ قیامت گزری
درد کا، کرب کا قصہ ہے، لہو رو کے لکھا
ایک لشکر کہ جو پیچھے ہی لگا ہے کب سے
سامنے آگ کا دریا ہے، لہو رو کے لکھا
چاند زیبائی کا چمکے، یہ کہاں شب کا نصیب
اپنا [illegible] بھی [illegible] سا ہے، لہو رو کے لکھا
ہم نے منظوم عبارت جو لکھی ہے یارو
دیکھ لو اپنا ہی کتبہ ہے، لہو رو کے لکھا
ہم پہ بھی بارشِ الطاف و کرم ہو جائے
وقت یہ تیرا قصیدا ہے، لہو رو کے لکھا
شاعری تنہر کی مدحِ لب و رخسار نہیں
جو ہے۔ احوالِ زمانہ ہے، لہو رو کے لکھا

جنت نہیں چاہیئے......

مری زندگی ٹوٹتے لمحوں کی خونچکاں داستاں ہے
زمیں خواب کی، وصل کی لذتوں کی، طلب سمتی چلی جا
رہی ہے
کوئی داستاں خود کو لکھوا رہی ہے
سحر ایک پنجرے کے پنچھی کی مانند پر پھڑپھڑائے
زمیں پر جھکا ہے، مگر آسماں کس قدر بے اماں ہے
خلاؤں کا اندھا سفر درمیاں ہے
تمناؤں کے سنگریزوں سے دامن بھرا ہے۔
نعمتیں، جاہ و حشمت، محبت، رفاقت
متاعِ جہاں، میرا حصہ کہاں!
مقدس کتابوں میں دنیا کے مالک کا ارشاد ہے
زمیں پر غموں کو جو سہن کر سہے گا
"وہ جنت کا حقدار ہے"
اگر میرے حصے میں جنت کا اک چھوٹا سا گوشہ بھی آیا
تو میں رب کون و مکاں سے کہوں گا
مجھے اپنی یہ ملکیت غم کے ماروں میں تقسیم کرنے دے مولا
ایسے لوگوں میں تقسیم کرنے دے یا رب!
جن میں جنت کی خواہش کا یارا نہیں
جن کو جھونکا غموں کا گوارا نہیں
مجھ کو جنت نہیں چاہیئے۔

صداقتوں کا امیں

جعفر عسکری

(سید احتشام حسین کی دسویں برسی کی نذر)

نگاہ نقد و دل حق شناس رکھتا تھا!
خزاں میں بھی وہ بہاروں کی آس رکھتا تھا
وہ دشت فن میں تھا مثل حسین ابن علیؑ
کہ وہ بھی صرف حقائق کی پیاس رکھتا تھا
وہ چاک دل تھا، مگر چاک پیرہن کب تھا؟
جنوں میں بھی تو بدن پر لباس رکھتا تھا
نہ تھے نگاہ میں اُس کی فقط گلاب و سمن
مشام جاں میں وہ ہر گل کی باس رکھتا تھا
وہ اپنے درد سے ہوتا نہ تھا حزیں پھر بھی
جہاں کے درد میں خود کو اداس رکھتا تھا
ہزار وقت کے طوفاں گزر گئے، لیکن
وہ صبر و ضبط سے قائم حواس رکھتا تھا
وہ ایک قصر تھا جس کا کہ ہر ستون یا در
شعور و فکر کی محکم اساس رکھتا تھا
یہ گفتگو کہ مضامین نقد و فن جعفرا
صداقتوں کا وہ ہمیشہ پاس رکھتا تھا

غزل

پاکر خطاب، یا کوئی انعام بک گئے،
بندے ہوس کے شہر میں بے دام بک گئے
اپنا ہنر ہے آج بھی، اک جنس بے بہا،
ورنہ ہزار غالب و خیام بک گئے
خانہ خراب ہو کے رہے سر بلند ہم
اونچے مگر تھے جن کے در و بام، بک گئے
اس شہر بے وفا کی نہ لکھائیں الاماں
یوسف رہوں پہ آکے سر شام بک گئے
ہستی کے کاروبار کی قیمت نہ پوچھئے
اب اک درم پہ سینکڑوں گلفام بک گئے
پیاسے اسی لیے ہیں کہ خوددار ہیں بہت
کچھ لوگ پی کے مفت کا اک جام بک گئے،
ہم کو بھی کس نے نہ ہوں رسوائیاں عزیز
وہ محترم تھے جن کے بہت نام، بک گئے
جعفر ہے روز و شب کی اذیت ہمیں قبول
ورنہ ملا جنھیں یہاں آرام، بک گئے،

پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کا انتقال یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو ہوا تھا۔

حمید الماس

تلاش

صبح کی روشن فضا میں
رات کی سرگوشیاں
سب غلط ثابت ہوئیں
وہ مرے آسودہ پہلو سے کہیں غائب ہوئی
مجھ میں کل تحلیل ہونے کی تمنا کو بھی
شاید اپنے پہلو میں چھپا کر لے گئی
اس نے سب کچھ تو بتایا تھا مگر
وہ مجھے یہ بھی بتاتی
کس طرف
کس راستے پر ڈھونڈنے نکلوں اسے ،

حمید نورش (پاکستان)

قد

بلند پرواز طائروں
ایک فتور نخوت نژاد
جب بھی
تمہاری سطحی بصارتوں کی صلاحیت
منقلب کرے
اور تمہیں لگے
میرا قد سمٹ کر حقیر نکتے میں ڈھل گیا ہے
تو یاد رکھنا
کہ فاصلوں کا اثر دو طرفہ ہے ـــــ
عین اس وقت ـــــ تم بھی مجھ کو فضا میں
ایک مختصر سا دھبہ ہی لگ رہے ہو !

غزلیں

اکرام الحق اورنگ
(بنگلہ دیش)

وہ اٹل اپنی جگہ تھا، میں بجا اپنی جگہ
ٹھیک دونوں میں نہ جانے کون تھا اپنی جگہ
خم سری سے سہہ گیا موسم ہوائے تیز کا !
اس لئے وہ پیڑ ثابت رہ گیا اپنی جگہ
کتنی چیخوں کا نمائندہ تھا اپنی ذات میں
آپکی محفل میں میرا قہقہہ اپنی جگہ
سمت منزل راہرو آتے رہے جاتے رہے
اور ٹھہرا رہ گیا، یہ راستہ اپنی جگہ
کوئی سمجھے گا درون تن شکستہ جاں مجھے
اتنا خستہ بھی نہیں پیکر مرا اپنی جگہ
قامت کردار میں پستہ ہے تو کچھ بھی نہیں
قد میں کوئی لاکھ ہو جائے بڑا اپنی جگہ
حیطۂ مشعل میں جب اورنگ سورج ہی نہیں
کیا عجب جو ایک ہے کھوٹا کھرا اپنی جگہ

نجم عثمانی

میں بھی چلوں گا سنگ تمہارے اک پل ٹھہرو
گھر کو آگ لگا لوں پیارے اک پل ٹھہرو
ایک مدت کے بعد کھلا ہے بند دریچہ
کوئی مجھے کرتا ہے اشارے اک پل ٹھہرو
میں دریا کی تہہ میں اتر کر لاؤں گا موتی
اور تم سب بے خوف کنارے اک پل ٹھہرو
کمرے میں ننھا سا دیا تو روشن کر لوں
رات کھڑی ہے پنکھ پسارے اک پل ٹھہرو
تم جاؤ گے ساتھ، بہاریں بھی جائیں گی
کہتے ہیں پُر کیف نظارے اک پل ٹھہرو
لمحے دو لمحے کا ہے مہمان اندھیرا
توڑ رہا ہوں چاند ستارے اک پل ٹھہرو

غزلیں

ساحل احمد

○

ایک مسافر آیا تھا
پھول کی خوشبو لایا تھا

شاخ سجی تھی پھولوں سے
ابرِ کرم کا سایا تھا

رنگ برنگے پھولوں کا
موسم تحفے لایا تھا

چن کر تیری گلیوں سے
دکھ کے کنکر لایا تھا

خط یہ ساحل بارش کا
ایک پرندہ لایا تھا

○

نام زمیں پر لکھا تھا
نیچے پانی ہنستا تھا

رنگ لہو کا تازہ تھا
زخمی گل کا شانا تھا

زرد پرندہ خوشبو کا
رنگ چرانے نکلا تھا

دھول میں لپٹی یادوں کا
ایک غبارہ اڑتا تھا

تیشہ ساحل پانی کا
موج ہوا نے پھینکا تھا

○

خوف کا سایہ چمکا تھا
جس دن شیشہ ٹوٹا تھا

شہر بسا تھا یادوں کا
ناگ بدن سے لپٹا تھا

تیز ہوا میں سایہ بھی
بھاگا بھاگا پھرتا تھا

راکھ جمی تھی پلکوں پر
نیند کا چہرہ جھلسا تھا

شام شفق نے ساحل پر
چہرہ میرسا غازا تھا

غزلیں

فارغ بخاری (پاکستان)

کس قدر آس سے تکا ہوں کو
کوئی آواز دے صداؤں کو
کس سے مانگے کوئی طلب کی بھیک
آگئی نیند سب خداؤں کو!
ایسے ٹوٹے ہیں آس کے بندھن!
ہاتھ اٹھتے نہیں دعاؤں کو!
از دہر بت کی طرح صرحپہر،
جیسے روکے ہوئے ہے راہوں کو
آج اٹھتا نہیں ہے کوئی قدم!
موچ آئی ہر ایک پاؤں کو!
ایسی ویرانیاں برستی ہیں
یاد کرتے ہیں شہر گاؤں کو
اس قیامت کی دھوپ ہے شجر!
اب ترستے ہیں اپنی چھاؤں کو
جب سے وہ پیڑ کٹ گیا فارغ
سب ترستے ہیں دھوپ چھاؤں کو

پروین شاکر (پاکستان)

آواز کے ہمراہ سراپا بھی تو دیکھوں
اے جانِ سخن میں ترا چہرہ بھی تو دیکھوں

دستک تو کچھ ایسی ہے کہ دل چھونے لگی ہے
اس حبس میں بارش کا یہ جھونکا بھی تو دیکھوں

صحرا کی طرح رہتے ہوئے تھک گئیں آنکھیں
دکھ کہتا ہے اب کوئی دریا بھی تو دیکھوں

اب تک تو مرے شعر حوالہ رہے تیرا
اب میں تری رسوائی کا چرچا بھی تو دیکھوں

یہ کیا کہ وہ جب چاہے مجھے چھین لے مجھ سے
اپنے لئے اس دل کو تڑپتا بھی تو دیکھوں

اب تک جو سراب آئے تھے انجانے میں آئے
پہچانے ہوئے رستوں کا دھوکہ بھی تو دیکھوں

غزلیں

جمال الدین ساحل
(آکاش وانی پٹنہ)

دن ہے بنجاروں کی طرح، اور رات ہے آواروں جیسی
اپنی گردش چاروں پہر، آکاش کے سیاروں جیسی

پھوٹ کے روئیں، سر ٹکرائیں، تھک کر بیٹھیں یا مر جائیں
اس کے سوا اب چارہ کیا، تقدیر ہے دیواروں جیسی

جلتی دھوپ، ڈگر پتھریلے، جیون کے آزار بہت
خواہش اٹھتی ہے دل میں، یرقان کے بیماروں جیسی

چادر اوڑھ کے بستر پہ، جب سویا تو محسوس ہوا
نازک ہونٹوں والی کی، ہر بات ہے انگاروں جیسی

جنس گراں ہو یا سستا ہو، دیکھ لے تو اپنی اوقات
رکھتے ہیں دوکان سجا کر، چیز خریداروں جیسی

حسن اگائیں پتھر پتھر، اپنے آپ سے بے پرواہ
جنگل کے باشندوں کی بھی، زلیت ہے فنکاروں جیسی

ہم خود ہی اپنی ذات کا پردہ بنے رہے
رسوائیوں کے ڈر سے فرشتہ بنے رہے

اظہار شوق کر نہ سکے ہم تمام عمر
قرطاس لب پہ حرف شکستہ بنے رہے

ہر خواب منہ چڑھا کے گزرتا چلا گیا
ہم شہر آرزو میں تماشا بنے رہے

کس طرح، کس مقام پہ بجھتی نظر کی پیاس
جب جب ملے نگاہ میں شعلہ بنے رہے

ان کو گماں ہوا نہ کوئی سرد آنچ کا
ہم خواہ مخواہ آگ کا دریا بنے رہے

وہ آشنا ہوئے ورق زر نگار سے
ہم حاشیہ میں لفظ حوالہ بنے رہے

سواد و صوت

مکرمی کلام صاحب! تسلیم

"آہنگ" کا تازہ شمارہ جناب لطف الرحمن کے مقالے
دیت کا نقطۂ آغاز" کی وجہ سے کم صفحات رکھنے کے
جود بھرپور لگتا ہے۔ مقالے سے ذہن کے گوشے منور
تے ہیں۔ اور موضوع اچھے انداز تحریر کے لباس میں
ی کو متوجہ کرکے اپنی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ اداریہ
کے بھی آپ کے تیکھے انداز کا آئینہ دار ہے۔ اور حقائق پر
۔ آہنگ نے ہمیشہ ادب کی آتی جاتی لہروں کی تصویر
ینکی ہے۔ طوفانوں سے ٹکرانا تو اس کا مزاج بن چکا ہے
ریروں کا نور سیاہ کاغذ کو بھی نورانی بنا دیتا ہے۔

نصر قریشی

برادر محترم! السلام علیکم

اکتوبر کا آہنگ کل ملا۔ ستمبر کا بھی ملا تھا۔

اس بار بھی حسب دستور کشکول میں بڑی اچھی
یں ہیں۔ خدا کرے آپ اپنے نیک ارادوں میں ہمیشہ
میاب رہیں۔

تازہ شمارہ میں لطف الرحمن کا مضمون بے حد پسند
[illegible] تنقید۔ اتنا COMPALET اور منفرد
[illegible] لطف الرحمن کو مبارک باد دیتا ہوں
[illegible] ادارہ کے دیگر احباب کو

میرا آداب!

اختر یوسف

محترم جناب کلام حیدری صاحب!

اکتوبر ۸۲ء کا آہنگ گرچہ ضخامت کے لحاظ سے
گزشتہ شماروں سے کم ہے۔ مگر معیار بے حد بلند ہے خصوصاً
شعری حصہ اور مضامین بے حد متاثر کرتے ہیں۔ جناب لطف
الرحمن صاحب کے مضامین جدید ادب کی تفہیم میں بے حد
معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ زیر نظر مضمون "جدیدیت کا
نقطۂ آغاز" بے حد معلوماتی ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر عام
قاری بھی جدید ادب کی تہہ تک با آسانی پہونچ جائے گا۔
جدیدیت کا اتنا واضح تعارف میری نظر سے آج تک نہیں گزرا تھا
اداریئے میں آپ نے بالکل صحیح کہا ہے "کہ لطف الرحمن تنقید
کو کلیم الدین احمد سے آگے لے جانے کے تمام امکانات رکھتے
ہیں"۔ خدا کرے ان کی کتاب "جدیدیت کی جمالیاتی روایت"
جلد از جلد منظر عام پر آئے۔ قمر جہاں کا "کوئی روشنی" کا تجزیاتی
مطالعہ نامکمل ہے۔ موصوفہ نے کہانی کی صرف بالائی سطح تک
ہی پہونچنے پر اکتفا کیا ہے۔ جبکہ اس کی تہہ میں اترنا چاہئے تھا
انہوں نے غیاث احمد گدی کی صرف ...کیا... اور تہہ
خانے" اور "کوئی روشنی" کی ہی ... [illegible] ... قمر جہاں
[illegible]

R. N. Regd 4253/64
P. T. Regd No. Gy. 7
Phone—432

THE Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

THE CULTURAL ACADEMY
Gaya
OUR PUBLICATIONS

APNI TALASH MAIN
By :—Kalimuddin Ahmad — 30/-

ZAVIA—E-NIGAH
By :—Dr. K. R. Azami — 20/-

EHTESHAM HUSSAIN Number of Aahang
Compiled By :—Kalam Haidri — 25/-

SHAD KI—NASAR NIGARI
By :—Dr. Wahab Ashrafi — 40/-

MAZAMEER
By :—Kalam Haidri — 10/-

BARMALA
By :—Kalam Haidri — 15/-

AKS
By :—Nesar Ahmed Siddiqui — 10/-

NAYE AFSANE KA SILSILA—E—AMAL
By :—Mehdi Jafar — 30/-

FARAZ—E—DAR
By :—Kalam Haidri — 30/-

A F S A N E

BABA LOG
By :—Ghayas Ahmad Gaddi — 10/-

SIFAR
By :—Kalam Haidri — 10/-

ROSHNAI KI KISHTIYAN
By :—Ahmad Yousuf — 15/-

ALIF LAM MEEM
By :—Kalam Haidri — 15/-

FICTON NUMBER of Aahang
Compiled By :—Kalam Haidri — 35/-

IRTAQA
Compiled By :—Kalam Haidri — 20/-

DARAKHSHAN
By :—Hafiz Banarsi — 5/-

NAWA—E—RAZ
By :—Mahjoor Shamsi — 5/-

LAMHON KA SAFAR
By :—Narmdeshwar Prasad — 10/-